Brown and Pages Missings Book



ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

لام محمد خاں ایم-اے

ہندستانی ادب

اشتہار کی اجرت

صفحہ	ایک سال	چھ مہینے	تین مہینے	ایک مہینہ
پورا صفحہ	۸۰ لنہ	۴۲ رللعہ	۲۲ رعہ	۱۲ رعہ
آدھا صفحہ	۴۰ للعہ	۲۲ رعہ	۱۲ رعہ	۸ عہ
پاؤ صفحہ	۲۰ عنہ	۱۱ لعہ	۶ لے	۴ للعہ

مینجر "ہندستانی ادب"

(پتہ)

چنچلگوڑا حیدرآباد دکن



اسفندار ۱۳۵۱ف مطابق جنوری ۱۹۴۲ء

فہرست

ہمارے خیالات

انجمن ترقی اردو کی تحقیقات اس مسئلے پر ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ انجمن کا حساب کتاب ٹھیک نہ ہونے کے باعث بد اعتمادی کے اظہار کو قبول کرتے ہوئے حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا لیکن اس کمیشن کے تقرر میں ایک اصولی غلطی کی گئی تھی جس شخص سے حساب طلب کیا جانے والا تھا خود اس کو رکن بنایا چنانچہ اس سلسلے میں مجلس اصلاح نظم ونسق طلباے قدیم جامعہ عثمانیہ نے حسب ذیل قرار داد اپنے ایک اجلاس میں منظور کی تھی:-

"مجلس اصلاح نظم ونسق طلباے قدیم جامعہ عثمانیہ حکومت کے اس اقدام کو بنظر استحسان دیکھتی ہے کہ مجلس کی تحریک پر انجمن ترقی اردو کو (۴۵) ہزار کی امداد کے صحیح مصرف کی جانچ کے لیے ...... ایک کمیشن مقرر فرمایا جاے لیکن مجلس محسوس کرتی ہے اور اس چیز کو قبل از قبل حکومت پر واضح کر دینا اپنا فرض تصور کرتی ہے کہ کمیشن میں بحیثیت رکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن کا وجود نہ صرف کمیشن کی تحقیقات کو آزادانہ نہ بنا سکیگا بلکہ خود ڈاکٹر صاحب کو بھی ایک ناخوشگوار پوزیشن میں ڈالدیگا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی حیثیت فریق کی ہے ...... مجلس متوقع ہے کہ حکومت اس پر دوبارہ غور کریگی" مگر صد افسوس کہ حکومت نے مجلس مذکور کی اس اہم اور ضروری یادداشت کی طرف توجہ نہیں کی، سنتے ہیں کہ مقرر کیا ہوا کمیشن بیٹھا اور "نشستند و گفتند و برخاستند" کے مصداق اپنا کام بھی ختم کر چکا کمیشن کی رپورٹ غالباً انجمن کی موافقت میں ہے جانچ پڑتال کا تو کہیں ذکر مذکور نہیں بلکہ عبدالحق صاحب کی کارگذاری کی تعریف و توصیف ہی کیگئی ہے اگر یہی لیل ونہار رہے اور اسی طرح ہمت افزائی کی گئی تو ہم کامل یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ۱۳۵۲ف سے پہلے ہی عبدالحق صاحب انجمن کی رجسٹری اپنے نام کرا لیں گے۔

حکومت سے مکرر اپیل ہم ہماری حکومت سے مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ انجمن مذکور کے حسابات کی جانچ کیلیے ایک آزاد کمیشن پھر سے مقرر کرے جس میں حکومت سرکار عالی کا ایک عہدے دار اور پبلک کے دو نمایندے ہوں عبدالحق صاحب کی حیثیت فریق کی رہے انھیں کسی طرح ایسے کمیشن میں شریک نہ کیا جاے۔ حکومت ہر سال انجمن کو ایک بھاری رقم بطور عطیہ دے رہی ہے کئی سال سے بلکہ شروع سے اب تک اس رقم کی کوئی جانچ نہیں ہوئی رقم جن مقاصد کیلیے اور جن شرطوں کے ساتھ دیجا رہی ہے اسکی بھی تنقیح نہیں کی گئی لہذا ایسی صورت میں حکومت سے ہمارا یہ تحقیقاتی مطالبہ بیجا نہیں ہے۔

ہم اپنے نئے صدر اعظم بہادر کی فرض شناس توجہ اس خصوص میں مبذول کرانے کی جرات کرتے ہیں اور آنجناب سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان رعیات کو نظر انداز نہ فرماتے ہوئے جو ایک نوٹ کی شکل میں پیش ہوئیں تحقیقات کے جائز مطالبے پر غور فرمائیں تاکہ حکومت سرکار عالی کی رقم غلط طریقے پر خرچ ہونے سے بچ رہے اور اس کا کوئی بہتر مصرف ہو سکے۔

کاغذ اور حکومت اس مسئلے پر ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور حکومت سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے سابقہ فیصلے پر مکرر غور کرے ورنہ اندیشہ ہے کہ ادبی رسالے بلکل بند ہو جائیں۔

کاغذ کی قیمت میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس سے حکومت ناواقف نہیں۔ تاجر بے دریغ طریقے پر قیمت بڑھاتے جا رہے ہیں لیکن اب تک حکومت نے کوئی مداخلت نہیں کی تاجروں کی اس زیادتی سے تنگ آکر حکومت بمبئی نے سخت ترین احکام نافذ کر دیے ہیں بہتر ہوتا اگر ہماری حکومت بھی ایسی ہی کوئی شکل اختیار کرتی یا کاغذ کے بازار اور اس کے کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی۔

ہم پچھلی دفعہ بھی لکھ چکے ہیں کہ اخبار اور رسالوں میں فرق پیدا کرنا اصولِ صحافت کے خلاف اور صحافتی دنیا کے حق میں ایک قسم کی زیادتی ہے۔

اس نوبت پر جب کہ کاغذ کی قیمت ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی حکومت کو چاہیے کہ رسالوں کے ساتھ بھی وہی رعایت برتے جو اخباروں کے ساتھ۔ اگر سرپور کاغذ کی گرنی کا کام قریب میں شروع ہو جاے تو ہم حکومت کو مشورہ دیں گے کہ پہلے ہماری ضرورتوں کا لحاظ کرے اور بعد میں بچا ہوا کاغذ باہر بھیجنے کی اجازت دے۔ مگر اس سے پہلے موجودہ نازک دور میں مذکورہ بالا رعایت کی سخت ضرورت ہے۔

رسالے کا حجم کاغذ کی بڑھتی مہنگائی سے کون واقف نہیں۔ جو کاغذ جنگ سے پہلے تین روپیے ریم تھا آج بیس روپیے ریم ہے اسی طرح چھاپے کی سیاہی اور دوسری چیزوں کی قیمتیں بھی بڑھ گئی ہیں لیکن اس کے باوجود رسالے کی قیمت وہی ہے جو پہلے تھی قیمت میں اضافہ کسی کو گوارہ نہیں اور مسلسل نقصان ہمیں گوارا نہیں۔ اس لیے ہر دو کو خوش اور مطمئن ر
کہ رسالے کا حجم کم کر دیا جاے چنانچہ ہم نے یہ فیصلہ

جلد (۲) نمبر (۴) — ہندستانی ادب — اسفندار ۱۳۵۱ف جنوری ۱۹۴۲ء

غزل

ہوتے ہم اگر واقف اسرار محبت
بھولے سے نہ کرتے کبھی اظہار محبت

اک روز کیا تھا کہیں اظہار محبت
اظہار محبت ہوا آزار محبت

ہے حسن کا ماحول سزاوار محبت
جنت ہی میں جائیں گے گنہگار محبت

یوسف سا حسیں ہے نہ زلیخا سا خریدار
لیکن ہے وہی گرمیٔ بازار محبت

پائی ہو اسی دل نے غم عشق کی لذت
جو دل کہ ہوا خوگر آزار محبت

ای چارہ گرو دور رہو بالیں سے مری تم
اچھا بھی ہوا ہے کہیں بیمار محبت

اس ان کے تغافل کی محبت کوئی حد ہے
انکار محبت ہے نہ اقرار محبت

عظیم الدین محبت ایم اے عثمانیہ

غزل

جوانی سے ہے احترام محبت
جوانی نے بدلا نظام محبت

جوانی بصد شاد کام محبت
لیے آرہی ہے پیام محبت

ہے صبح محبت جوانی کا آنا
جوانی کا جانا ہے شام محبت

ندامت کے مٹکر بنا چاہتا ہوں
ہے منجملہ سب اہتمام محبت

رسائی تصور کی ہے عرش ہی تک
ہے اس سے بھی بالا مقام محبت

فضاوں پہ بھی مستیاں چھا رہی ہیں
یہ چھلکا دیا کس نے جام محبت

محبت نے صابر کی دنیا بدل دی
نہ بھولے گا تا حشر نام محبت

صابر القادری

ٹوٹا ہوا تارہ

سپاہی کی زندگی کی یہ درد کہانی تم سے نہ سنی جائے گی فرزانہ! اس کی کہانی کا انجام تو تمہارے بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیگا۔ مجھے اس کا ہوش تک نہ رہا کہ میں کب اور کیسے ہسپتال پہنچا۔ اور کتنے دن اس تنگ و تاریک گوشے میں پڑا ہوا "فریب زیست" کھاتا رہا۔ ہاں اتنا مجھے یاد ہے کہ میرے سارے اعضا معطل ہو چکے ہیں۔ صرف سانس کی بے ترتیب آمد و رفت باقی ہے، کل نرس کے توسط سے مجھے تمہارے کئی خطوط ملے، جو ایک بنڈل کی صورت اختیار کر گئے تھے، اور میں نے انہیں سب بغیر پڑھے تمہاری جذبات انگیز تحریر کا اندازہ لگا لیا، تم نے وہ سب لکھا ہوگا، جو ایک محبوب ترین شوہر کی جدائی میں اس کی چاہتی بیوی لکھ سکتی ہے، ارادہ تو تھا کہ تمہیں اپنا حال نہ لکھ بھیجوں، دل ہی تو ہے، کہیں خون پانی نہ ہو جائے، مگر تمہارے ان مسلسل خطوط نے میرے پائے استقامت کو ڈگمگا دیا، بڑی منت کے ساتھ میں نے نرس کو مجبور کیا کہ وہ میرے آنسوؤں" کو تم تک پہونچائے، نرس بھی عورت ہے اور اس کے سینے میں تمہارے جیسا دھڑکتا ہوا دل موجود ہے اس نے اپنے نمناک پلکوں کے ساتھ میرے بے ربط الفاظ کے جملے بنا بنا کر خط کی صورت میں تم تک پیش کیا ہے۔

ہاں تو ——— آج سے تین مہینے پہلے حسرت و یاس کے عالم میں اسٹیشن پر تم سے وداع ہو کر ٹرین میں سوار ہوا، اور پھر ایک طویل بحری راستہ طے کر کے سرحدی مقام پہنچایا گیا، جہاں دور تک کوہستانی سلسلہ پھیلا ہوا وحشت ناک طریقہ پہ دعوت اجل دے رہا تھا، بحری بیڑوں کی حفاظت، توپوں کا نصب کرنا، بم گیر طیاروں کی زد سے اپنے آپ کو بچانا گویا موت سے بازی لگانا ہے، فرزانہ! تم سمجھتی ہوگی سپاہی موت سے ڈرتا ہے، نہیں، مری عزیزہ! یہ نہیں بلکہ اسی مصروفیت کی آڑ میں! تم تک اپنی خیریت نہ بھیجنے کی معذرت چاہی ہے، تم خیال کروگی، سپاہی محبت کرنا نہیں جانتا، اس چیز کو آج میں تم سے منوانا چاہتا ہوں، "سرفروشی کا جذبہ" جو سپاہی کے دل میں امنڈ رہا ہے اور موت سے برسر پیکار بنانے کے لیے اسے اس میدان کارزار میں جو کشاں کشاں لایا ہے کیا "محبت کا خدا" اس سے بھی زیادہ ایثار چاہتا ہے، مرے خیال میں سپاہی اپنی زندگی کا سودا جس مسرت اور خندہ پیشانی کے ساتھ موت کے ہاتھوں کرتا ہے، شاید دنیا بہت کم ایسی شاندار مثال پیش کر سکے گی۔

میری عزیزہ! تم کہوگی چند مقررہ سکوں کے عوض، تم نے سپاہیانہ پیشہ اختیار کیا، ہم مانتے ہیں، مگر حضور! سرفروشی والی بات رہ جاتی ہے، ایسا حوصلہ کن جذبہ جو موت کے خون ریز ساحلوں سے ٹکرانے کے لیے اس کے سپاہیانہ جوش و خروش کو ابھار سکتا ہے، فتح و شکست کے حدود سے گذر کر بھی چین لینے نہیں دیتا، حسن و شباب کی رنگینیوں ساغر کی کھنک اور رنگ و بو کی جھرمٹوں میں رہ کر بھی وہ تلواروں کی جھنکار کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا بہادر سپاہی صرف ایک مرتبہ مرنے کے لیے زندہ رہتا ہے، موت کے ناخوشگوار الفاظ سنتے سنتے اس کے کان عادی ہو جاتے ہیں وہ اپنے دل اور روح کی طرح وطن کے ذرہ ذرہ کو آزادانہ مسرت میں ڈوبا ہوا دیکھ سکتا ہے، اور یہی جذبہ ایثار رگ گلو کو خون آشام تلواروں سے گلے ملنے کے لیے ابھارتا ہے، جہاد، فتح و کامرانی تشدد و مدافعت کی خاطر سپاہی اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دینے کے لیے کبھی دریغ نہیں کرتا، وہ عزت دولت اور شہرت کے لیے نہیں، بلکہ آزادی کی دیوی کے آگے

اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ تمہیں میرے جذبات کی فراوانی پر اتنی زیادہ حیرت نہ کرنی چاہیئے، تم خیال کروگی، ایک بے حس دل میں اتنا ایثار کا مادہ کہاں سے آگیا۔ سچ بتانے میں مجھے عار نہیں، یہ سب کچھ میں نے تم سے سیکھا ہے۔ تمہاری چھوٹی چھوٹی قربانیاں اب اجتماعی شکل میں نمودار ہو کر مجھے درس ایثار دے رہی ہیں میں نے جس طرح اپنے آپ کو دشمن کے مقابلہ میں بہادرانہ حیثیت سے پیش کیا ہے اس "احساس مسرت" سے میری آنکھیں چمکنے لگتی ہیں! مرے دونوں بازو بم کے زہریلے اثرات سے معطل ہو چکے ہیں، اور میں ایک مجبور انسان کی طرح ہسپتال کی تنگ و تاریک زندگی بسر کر رہا ہوں، پھر بھی میں اپنے آپ کو خوش نصیب و مظفر سمجھا ہوا ہوں۔

اچھی فرزانہ! میں نے یہ قطعی طور پر فیصلہ کر لیا ہے کہ اس وقت تک وطن کی سرزمین پر قدم نہ رکھوں گا جب تک اس کا ذرہ ذرہ آزادی کا نغمہ نہ الاپے۔

خط طویل ہو رہا ہے، استقلال کے ساتھ اپنے دل کو تھامے رہو، اشکوں کو رائگاں نہ جانے دو —— دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے، مجھے تمہاری صحت کا بڑا خیال ہے، اس لئے کہ تمہاری تندرست آغوش میں دو سپاہی زادوں کی زندگیاں ہیں — اور یہ زندگیاں کبھی آزادی کی راہ پر قربان ہونگی۔

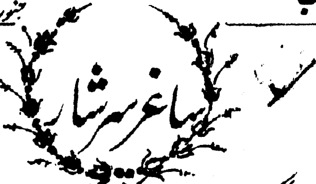
اچھا خدا حافظ — تمہارا شوہر۔ جانباز۔

صابر کوسگوی

نیا سال نمبر

یہ ہندستانی ادب کا دوسرا خاص الخاص نمبر ہے اعلیٰ پایہ مضامین و نظموں کے علاوہ نو سادہ و اور ایک رنگین تصویر موجود ہے، حجم (۱۴۴) صفحے۔ قیمت صرف ۸ علاوہ محصول ڈاک

مینیجر ہندستانی ادب جنجل گوڑہ حیدرآباد دکن



ہم صحن گلستان سے جو دامن کشاں چلے
کانٹے پکارتے تھے سنو تو کہاں چلے

دل کی رگوں میں ڈوبنے والوں سے پوچھیے
کیا ٹھنڈے ٹھنڈے آئے تھے آتش بجاں چلے

تم سے کہوں کہاں کا ارادہ ہی کیا مجال!
میں آنسوؤں سے پوچھ رہا ہوں کہاں چلے

یہ کیا کہ موج موج پہ حسرت بھری نگاہ
سنجیدگی سے کشتی عمر رواں چلے

وہ گفتگو وہ ناز بھری مسکراہٹیں
آئے تو دل میں لیکے نئی چٹکیاں چلے

ایک پیکر خلوص کا پیغام ناز تھا
دنیا سے ہم یکایک اُٹھے ناگہاں چلے

یہ کیوں کسی کی مست خرامی کا دیجواب
جس طرح چل رہا ہے نظام جہاں چلے

اس راہ میں کسی کا بھروسہ نہیں مجھے
مجھ سے قدم ملائے ہوئے رازداں چلے

پہلے تخیلات کی دنیا میں آئیے
پھر ساغر نشاط نظر درمیاں چلے

جس رخ پہ چل رہی ہو ہوائے خدا شناس
اُس رخ پہ زندگی کا مری کارواں چلے

سرشاریوں نہ کوچہ جاناں میں جائیے
جس طرح بے شعور کوئی نوجواں چلے

سرشار کمنڈوی



زید اور بکر آپس میں ایک دوسرے سے سخت نفرت رکھتے ہیں۔ زید ایک مضمون شایع کرواتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ راست بازی اور سچائی سے کام لینا چاہیے خواہ اس میں اس کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔ زید کا یہ مضمون بکر کی نظر سے گذرتا ہے اب چونکہ بکر کو زید سے نفرت ہے اس لیے فوراً وہ بھی ایک جوابی مضمون شایع کرواتا ہے جس میں وہ یہ بیان کرتا ہے کہ انسان راست بازی اور سچائی سے کبھی دنیاوی ترقی نہیں کر سکتا۔

خالد اور عمرو ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ خوش قسمتی سے خالد کو ترقی ملتی ہے۔ عمرو اس سے بہت خوش ہوتا ہے اور دوسروں کے سامنے بھی خالد کی ترقی پر اپنی خوشی اور دلی مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ چند دنوں بعد عمرو سنتا ہے کہ خالد نے اپنے دفتر میں کئی اصلاحیں کی ہیں اور ہر ایک ماتحت سے نہایت نرمی سے پیش آتا ہے اور کبھی کسی سے بدسلوکی یا سختی کا برتاؤ نہیں کرتا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ تمام اہل دفتر اسے دل سے چاہتے ہیں اور اپنا مفوضہ کام بخوشی اور بروقت بلا شکایت انجام دیتے ہیں یہ سن کر عمرو اپنے اور احباب سے کہتا ہے اس میں شک نہیں نرمی بری چیز نہیں ہے لیکن خالد کی نرم پالیسی شاید آیندہ کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہو سکے۔

ایک گورنمنٹ یہ قانون پاس کرتی ہے کہ جب تک ملک سے جہالت نہ دور نہ کیا جائے اور ہر فرد کے ہاتھ میں اس کے تاریک مستقبل کو روشن کرنے کے لیے مشعل علم نہ دی جائے ملک ترقی نہیں کر سکتا لہذا جبری تعلیم کو لازمی قرار دیا جاتا ہے اس قانون کے نافذ ہوتے ہی مخالف اور موافق عناصر پیدا ہو جاتے ہیں۔ موافقین کو تو چھوڑ دیجیے۔ مخالفین اس نئے قانون کو بے کار بے معنے غیر ممکن العمل غرض ہر طرح برا ثابت کرنے کی ممکنہ کوشش کرتے ہیں۔

ہم نے مذکورہ بالا تین ایسی مثالیں پیش کی ہیں۔ جو اپنی اپنی قسم کی نمایندہ مثالیں کہی جا سکتی ہیں قبل اس کے کہ ہم ان مثالوں کے متعلق کچھ عرض کریں سطور ذیل کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ ایک ہی بیماری کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً بخار ہی کو لیجیے۔ اس کے اسباب سردی گرمی، پھوڑا پھنسی، ٹیکہ زنی یا اور کسی قسم کی شدید تکلیف ہو سکتی ہیں۔ غرض عارضہ تو وہی ایک بخار ہے لیکن اس کے اسباب متعدد ہیں۔ جس طرح انسان کی جسمانی بیماریاں ہیں ویسے ہی اس کی اخلاقی بیماریاں بھی ہو سکتی ہیں اور یہ واضح رہے کہ اخلاقی بیماریاں جسمانی بیماریوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

اخلاقی بیماریوں کی چند عام شکلیں بیان کرنے سے قبل اس امر پر غور کر لینا ضروری ہے کہ بیماری عرف عام میں کس کو کہتے ہیں۔ غالباً اس مضمون کے ہر پڑھنے والے کو معلوم ہوگا کہ بیماری خواہ وہ جسمانی ہو یا اخلاقی اس غیر معتدل حالت کا نام ہے جس سے اخلاط کے توازن یا اخلاق کے معیار میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ خواہ وہ اعتدال میں کمی ہونے سے پیدا ہو یا زیادتی سے۔ اسی لحاظ سے ہم نے اخلاقی کمزوری یا معایب کو بیماری سے تشبیہہ دی ہے۔

عام اخلاقی بیماریاں جھوٹ، غیبت، تہمت، چوری، ظلم، وغیرہ ہو سکتی ہیں۔ یہاں آپ اس بات پر غور کریں کہ جس طرح بعض جسمانی بیماریاں متعدی ہوتی ہیں اسی طرح اخلاقی بیماریاں بھی

متعدی ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا اخلاقی بیماریاں کم و بیش متعدی ہیں۔ ان ہی متعدی بیماریوں میں ایک نہایت عام بیماری جو دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے ہر ذی شعور مرد، عورت، بچے اور بوڑھے میں پائی جاتی ہے وہ "اعتراض" ہے۔

ہم اس مضمون میں علم النفس کی ٹھیٹھ اصطلاحات سے ہٹکر عوام کی دلچسپی اور تفہیم کے لیے "اعتراض" کے جذبہ کو ایک نہایت عام فہم شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن "اعتراض" کے متعلق کچھ جاننے سے قبل اس کو جان لینا ضروری ہے کہ "اعتراض" کا جذبہ انسان میں کب پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس امر پر توجہ کیجائیگی کہ وہ کن جذبات سے مشتق ہے۔ اور اس کی اصل کیا ہے۔

جبکہ اوپر کہیں بیان کیا جاچکا ہے اعتراض نہایت عام جذبہ ہے اور یہ انسان میں بچپن ہی سے پیدا ہوجاتا ہے۔ "اعتراض" ہر اس بچے میں پایا جاتا ہے جس میں ذرا کچھ بھی شعور ہوتا ہے اور جب وہ اپنے کو "میں" یہ سمجھ کر کہنے لگتا ہے کہ "میں" سے مراد اس کا جسم ہے اور جب وہ "میں" کہنے کے قابل ہوجاتا ہے تو اسی وقت وہ ان چیزوں کو جو اس سے متعلق ہوتی ہیں "میری" یہ سمجھ کر کہتا ہے کہ وہ چیزیں اسی کی ملک ہیں اور وہ انھیں توڑ پھوڑ سکتا ہے اور کوئی بچہ یا کوئی اور شخص ان چیزوں پر کسی قسم کا حق نہیں رکھتا۔ اور جو بلکلیہ اسی کے تصرف میں ہوتی ہیں اسی کو سمجھنے کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں —— زید کے دو لڑکے ہیں۔ حامد اور محمود اور دونوں چھوٹے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کو "میں" اور "میرا" سمجھ کر کہنے کا شعور پیدا ہوگیا ہے۔ زید ان دونوں کو مختلف کپڑوں کی ایک ایک شیروانی بنواتا ہے۔ جب یہ دونوں بچے —— حامد اور محمود —— پہلی مرتبہ شیروانی پہنینگے تو وہ ایک دوسرے کی شیروانی کو دیکھ کر کچھ اس طرح کے جملے کہیں گے۔ "آپ کی شیروانی کا کپڑا خراب ہے اور یہ سلی بھی اچھی نہیں ہے۔ کیا کہیں سے مانگ کر تو نہیں پہنی آپ نے —— وغیرہ وغیرہ"۔ اور یہ وہ ظاہری اعتراضات ہیں جو اس عمر کا ایک بچہ پہلی نظر میں بلا سوچے سمجھے کرسکتا ہے۔

اب ہم اپنے معزز قارئین کی توجہ ان تینوں مثالوں کی طرف منعطف کراتے ہیں جو اس مضمون کی ابتدا میں بیان کی گئی ہیں۔

زید اور بکر میں نفرت ہے جس کا لازمی اور بدیہی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں کسی کی کوئی چیز یا سلوک خواہ وہ بہ نفسہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو دوسرے کو نہایت برا معلوم ہوگا اور اس کے کہ وہ اپنے مخالف کی اس چیز یا برتاؤ کو اچھا سمجھتا ہے چونکہ وہ اس کے مخالف سے متعلق ہے اس لیے وہ اسے برا ثابت ٹھہرانے کی ہر ممکنہ کوشش کریگا۔ چنانچہ یہی جذبہ نفرت تھا جس کی وجہ زید کے اچھے مضمون لکھنے کے باوجود بکر کو اس مضمون کے خلاف نہایت نامعقول مضمون لکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور اس نے ایسا مضمون لکھنے میں اس کے متعلق پروا نہ کی کہ خود اس کا مضمون کیسا ہے اور اس مضمون کی وجہ سے اس کے متعلق دوسرے کیا خیال کریں گے۔ تو گویا اس کے اعتراض کا باعث جذبہ نفرت تھا۔ لہٰذا یہ ظاہر ہوا کہ جذبہ اعتراض نفرت سے مشتق ہے۔

اب دوسری مثال لیجیے خالد اور عمرو آپس میں دوست ہیں لیکن خالد کی ترقی سے عمرو میں نامعلوم طور پر خالد کے خلاف (گو اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں) ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات خود اس کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ جذبہ اس میں پیدا ہوا ہے اور یہ جذبہ "رشک" کہلاتا ہے۔ جو تقریباً ہر شخص میں ہے۔ خالد کی ترقی سے عمرو کو رشک پیدا ہوا اور اسی رشک کی وجہ عمرو نے خالد کی اصلاحات اور اس کے سلوک پر جو بہرحال اچھا تھا ایک اچھا خاصا اعتراض ان الفاظ میں کیا کہ "خالد کی نرم پالیسی شاید آیندہ کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہو"۔

تو گویا وہ اعتراض "رشک" کی وجہ سے پیدا ہوا۔

تیسری مثال میں گورنمنٹ "جبری تعلیم" کا قانون نافذ کرتی ہے۔ اس کے نفاذ کے ساتھ ہی ایک مخالف پارٹی پیدا ہو جاتی ہے اور اس مخالف پارٹی میں کوتاہ اندیش اور جہلا کے ساتھ ساتھ ذی فہم اور تعلیم یافتہ حضرات بھی شامل ہوتے ہیں جیسا کہ آئے دن کے مشاہدات سے ظاہر ہے لیکن یہ مخالف طبقہ بلا کسی غور و فکر کے قانون کی اندھا دھند مخالفت شروع کر دیتا ہے اور اس پر اعتراضات کی بوچھار کر دیتا ہے۔ گو اس میں اس طبقے کو آخر میں ہار ماننی پڑتی ہے لیکن یہ اپنے اس جذبے کا اظہار کرتا ہے جو انسان کو ہر نئی چیز کی مخالفت کرنے پر آمادہ کرتا ہے خواہ وہ چیز بذات خود کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو اور اس کے نوایجاد کو خود وہ طبقہ اچھا ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔

ان تینوں مثالوں سے قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ ہر صورت میں ایک ہی جذبہ "اعتراض" کارفرما ہے لیکن ساتھ ساتھ اس امر پر بھی غور کیا ہوگا کہ اس جذبے کے پیدا ہونے کے اسباب ایک سے زیادہ ہیں۔ مثلاً نفرت، رشک وغیرہ۔ یہاں یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ جس طرح ایک ہی جسمانی بیماری مثلاً بخار کے اسباب مختلف ہیں اسی طرح اخلاقی بیماری مثلاً اعتراض کے پیدا ہونے کے اسباب بھی متعدد ہو سکتے ہیں۔

ان ہر دو قسم کی بیماریوں (یعنی جسمانی اور اخلاقی) میں ایک اور مماثلت ہے وہ یہ کہ ایک ہی بیماری مثلاً بخار مختلف اشخاص میں ان کے قوا ریا اور دیگر اسباب کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتا ہے اسی طرح مختلف اشخاص کے فطری رجحانات یا ماحول وغیرہ کے اعتبار سے اس کی اخلاقی بیماری مثلاً اعتراض کے ارتکاب میں بھی کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات ایسے ہوتے ہیں جو نیش عقرب کی طرح خواہ مخواہ جا و بیجا اعتراضات کر بیٹھتے ہیں اور نہایت تلخی اور بیمروتی کے ساتھ ـــــ اسی سلسلے میں ہم اپنے ایک کرم فرما کا حال سنا دیتے ہیں۔ جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

میرے کرم فرما کسی اور مقام کے رہنے والے ہیں اور ظاہر ہے کہ فطرتاً انسان اپنے مقام یا وطن کو دوسرے مقامات سے زیادہ پسند کرتا ہے خواہ اس کا وطن کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو۔ تو گویا ہم دونوں میں باوجود دوستی کے اختلاف مقامی کی وجہ سے اکثر اوقات اختلاف خیالی بھی واقع ہو جاتا ہے۔ صاحب موصوف کی یہ عادت ہے کہ جب وہ اپنے احباب کے گھر جاتے ہیں تو وہاں کے مکان کی ان تمام اشیا کا بالتفصیل جایزہ لے لیتے ہیں جو بدقسمتی سے ان کے نظر کے سامنے پڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ جب کبھی میرے گھر آتے ہیں اور دیوان خانے میں بیٹھتے ہیں تو مجھے ہر چیز کا جو دیوان خانہ میں رکھی ہوئی ہو اور جس کو انھوں نے پہلے نہ دیکھا ہو ہسٹری بیان کرنی پڑتی ہے اور اس بدبخت چیز پر اعتراض کے اتنے تیر برسائے جاتے ہیں کہ اس کا سینہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ سوے اتفاق سے سمجھ لیجیے کہ میری میز پر ایک نئی کتاب رکھی ہے جس کو انھوں نے اب تک دیکھا نہیں۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی ان کی زبان سے یوں پھول جھڑنے لگتے ہیں۔ "لاحول ولا، یہ کتاب کس گدھے نے لکھی ہے۔ جناب آپ نے یہ کتاب کیوں خریدی۔ کتاب کا نام خود مصنف کا حوصلہ بتا دیتا ہے"۔ اب کہیے کہ ان جملوں سے میرے دل کو کس قدر ٹھیس لگتی ہوگی۔

خیر! تو یہ ہوا ان کا اعتراض۔ لیکن ایک اور دلچسپی ملاحظہ فرمایے۔ انھوں نے اپنی عادت و فطرت کی وجہ اعتراض تو کر دیا گویا ان کو لاجواب کرنے کا میرے پاس ایک چٹکلا ہے جو ممکن ہے کسی ایسے ہی یا اس سے مماثل موقع پر آپ کے بھی کام آئے ـــ اعتراض مذکورہ کے ساتھ ہی میں اگر کہہ دوں "جناب عالی! آپ بجا ہیں

ہم وطن کی تصنیف ہے" تو وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جائیں گے اور آخر میں کسی قدر دھیمی آواز میں آپ فرمائیں گے "خیر! اس سے کیا بحث کہ یہ کتاب لکھی کس نے ہے خواہ میرے ہم وطن کی لکھی ہوئی ہو یا آپ کے — ہمیں صرف اس کے مضمون سے کام ہے — (وقفہ) — کہاں ذرا دیجیے وہ کتاب میں ایک نظر دیکھوں تو سہی — (ذرا طویل وقفہ — کتاب پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر) — واللہ کتاب تو بڑی اچھی ہے دوست! عنوان بھی کچھ نامناسب نہیں — اخاہ! یہ ان صاحب کی تصنیف ہے۔ بس اب مت پوچھیے — ان کا نام خود کتاب کے اچھے ہونے کی دلیل ہے" سنا آپ نے! — ایسے معترضین کی بھی دنیا میں کچھ کمی نہیں —

میرے ایک اور دوست کی معترضانہ روش بہت دلچسپ ہے۔ اس میں تلخی یا بے مروتی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا لیکن وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہر نوع برتر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور کسی بات کو ہرگز ماننے پر تیار نہیں۔ ان کے انداز کچھ اس طرح کے ہیں — اگر میں کہوں "آج کل بارش بہت زور دار ہو رہی ہے" تو وہ فوراً ایک نرم لہجے میں نفی کرتے ہوئے کہیں گے "نہیں — بات یہ ہے کہ اب کی دفعہ گرما بہت شدید ہوا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لازماً بارش بھی شدید ہوگی" — اگر میں کہوں "آج کل بازار کا بھاؤ بہت چڑھا ہوا ہے" تو آپ اسی انداز میں فرمائیں گے "نہیں — وجہ اس کی یہ ہے کہ باہر سے مال نہیں آ رہا ہے — جنگ کی وجہ — اور مانگ زیادہ ہی۔ اس لیے تاجروں نے قیمتیں بھی بڑھا دی ہیں" — آپ نے غور کیا ہوگا کہ میں نے جو جملے کہے ان میں بادی النظر میں کوئی چیز قابل اعتراض نہ تھی۔ بلکہ ہر دو جملے ایک حقیقت پر مبنی ہیں۔ لیکن میرے دوست کے معترضانہ روش نے ان کو یہ جملہ سن کر خاموش رہنے نہ دیا بلکہ کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہی کر دیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان جملوں میں اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اپنے جذبہ اعتراض کی تشفی کے لیے پہلے "نہیں" سے نفی کی اور پھر اسی جملے کو ذرا ہیر پھیر کر دوسرے الفاظ میں کہہ ڈالا۔ لیکن کہیں سختی یا بے مروتی نہیں برتی —

اب ایک اور مثال پر ذرا غور کیجیے جو بہت عام ہے۔ میرے ایک محترم مشفق میرے گھر آتے ہیں اور میرا لڑکا کھلے سر ان کے سامنے آ جاتا ہے اور ان کو سلام کر کے چلا جاتا ہے۔ لیکن میں اپنے مشفق کے بشرے سے محسوس کر لیتا ہوں کہ انھیں کوئی چیز ناگوار ضرور گذرتی ہے۔ جس کو وہ چھپانا چاہتے ہیں — خیر! وہ بیٹھ جاتے ہیں اور مختلف عنوانات پر گفتگو ہوتی ہے۔ اثنائے گفتگو میں وہ کسی نہ کسی طرح دور حاضرہ کے رسم و رواج کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں "بھائی اب تو جگ دنیا میں عنقا ہے۔ نہ بڑوں میں چھوٹوں کا لحاظ باقی ہے اور چھوٹوں میں بڑوں کا ادب — ہر بچہ اپنے آپ کو اپنی جگہ ایک بڑا تجربہ کار اور سیاس سمجھتا ہے اور ہر جوان اپنے آپ کو سورما تصور کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ" غرض اس کے بعد کچھ اور گفتگو ہوتی ہے۔ اور خدا حافظ۔ میرے مشفق کی گفتگو کے انداز میں ایک تلخی ہے اور وہ ایک دوسرے پیرایے میں میرے لڑکے کے کھلے سر آ جانے کے عمل کو برا ثابت کر رہے ہیں —

اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بوڑھوں کو نئی پود اور نئی روشنی کا زمانہ نہیں بھاتا۔ اس سے ہمارا مطلب کسی کی دل آزادی نہیں ہے۔ یہ جذبہ پیشینے زمانے سے نفرت کرنا ہمیشہ سے پایا گیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس جذبہ کے تحت کس صورت میں اعتراض کیا جائے لیکن اعتراض کی وجہ یہی جذبہ ہے۔ موجودہ بوڑھے جب جوان یا بچے تھے تو ان کا زمانہ ان کے بوڑھوں کو

پسند نہ تھا اور بہت ممکن ہے کہ ہم میں سے اکثر جب بوڑھے ہو جائیں گے تو آیندہ زمانہ کو جب کہ ہمارے چھوٹے اپنے لیے ایک الگ راستہ بنائیں گے ہم ناپسند کریں گے ۔

اعتراض کی عمدہ مثالیں ہم پیشہ و ہم مشرب فن دانوں میں ملتی ہیں خصوصاً فن دانان موسیقی ایک دوسرے سے بہت رقابت رکھتے ہیں اور ان کے مذہب میں دوسرے فن دان پر اعتراض کرنا فرض اولین ہے

"اعتراض" بہ نفسہ اچھی چیز ہے یا بری اس کا تصفیہ حالات کے اعتبار سے کیا جا سکتا ہے ۔ دنیا کی ہر چیز اپنی حد تک نہ بری ہوتی ہے نہ اچھی لیکن اس کا استعمال وغیرہ اس کو اچھا یا برا ٹھیراتا ہے ۔ غور کیجیے — نشیب اور فراز دونوں ایک ہی ہیں صرف اضافی تغیرات ہیں جو نشیب کو فراز یا فراز کو نشیب ٹھہراتے ہیں ۔ ہم اوپر چڑھتے ہیں تو وہ راستہ ہمارے لیے چڑھاؤ ہے لیکن چڑھ جانے کے بعد وہی راستہ ڈھلاو ہے — اسی طرح بچھو کا زہر — بچھو کی نیش زنی اور اس کا زہر ہمارے لیے نہایت مضر شے ہے لیکن خود بچھو کے لیے بری نہیں بلکہ اس کے لیے تو یہ ضروری ہے کہ وہ ڈنک مارے اور زہر خارج کیا کرے ۔ بیماری انسان کے لیے مضر ہے لیکن ان جراثیم کے لیے جو اس بیماری کا باعث ہیں مفید جس کی وجہ وہ بڑھتے ہیں اور انھیں پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے — اسی طرح اعتراض پانی کے مثل ہے ۔ پانی میں جو رنگ ملایا جائے وہی رنگ پانی بھی اختیار کر لیتا ہے اور خود پانی کا کوئی رنگ نہیں ہے ۔ اگر اعتراض بجا ہو تو وہ بھلا ہے اور اگر بیجا ہو تو برا ۔

بیجا اعتراضات معترض کو اوروں کی نگاہ میں ذلیل کر دیتے ہیں اور اس سے لوگ اجتناب کرنے لگتے ہیں ۔ اوپر جس قدر مثالیں ہم نے دی ہیں وہ کم و بیش بیجا اعتراض ہی سے متعلق ہیں اور دنیا میں حشرات الارض کی طرح انہیں کی بہتات بھی ہے ۔ درحقیقت بیجا اعتراض ہی کو ہم "اعتراض" کہتے ہیں اور بجا اعتراض کو "اعتراض" کہنا خود قابل اعتراض ہوگا ۔ بجا اعتراض کو ہم عرف عام میں "تنقید" کہتے ہیں ۔

اعتراض انسان کے لیے ایک بیماری ہے جس کا وجود بادی النظر میں دنیائے اخلاق کے لیے قطعی بیکار ہے ، اس کے بلکل برعکس تنقید ایک نہایت مفید چیز ہے جس کا وجود آیندہ ہر قسم کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے ۔ غرض ایک دوسری بحث ہے جو بجائے خود نہایت وسیع ہے اور فی الحال ہم اس کو چھیڑنا نہیں چاہتے ۔ انشاءاللہ تعالیٰ کسی آیندہ صحبت میں اس پر ہم کچھ عرض کرنے کی جرات کریں گے ۔

توثیق
بی ۔ ایس سی (عثمانیہ)

غزل

ہم نہ جانے ان سے کیا کیا کہہ گئے
زیر لب وہ مسکرا کر رہ گئے

وہ مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
ایک عجب رنگیں فسانہ کہہ گئے

اللہ اللہ عشق کی بے چارگی
نالے بھی لب پر تڑپ کر رہ گئے

محتسب اور بہکی بہکی گفتگو!
آ کے میخانے میں حضرت بہہ گئے

دل میں تھے دو چار قطرے خون کے
وہ بھی غم کی نذر ہو کر رہ گئے

اب کے ساون میں نہ جانے کیا ہو
ابر اٹھا جب تھام کر دل رہ گئے

زندگی مجبوریوں کا نام ہے
جو نہ سہنی تھی وہ کاوش سہہ گئے

کاوش (عثمانیہ)

حضور ...... میں

چل دیے تم جانے کیا تسکین فرماتے ہوئے

رہ گئے واماندہ منزل ہاتھ پھیلاتے ہوئے

"پاُرزندہ" یوں لب رنگیں پہ تھا وقت وداع

جھولتی شاخوں پہ جیسے پھول تھراتے ہوئے

ہائے وہ آنکھیں ہیں اب درمنظر یاس و حراس

تم کو جن آنکھوں نے دیکھا جھومتے گاتے ہوئے

المدد ای آفتاب زندگی تیرے بغیر

آنکھ والے پھر رہے ہیں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

شام کی مٹتی ہوئی لالی افق پر دیکھیے

آیئے ایک ایک منظر نظم فرماتے ہوئے

بیٹھ کر کشتی کے فرسودہ کنارے کی طرف

سیر کیجیے پاؤں کو پانی میں سہلاتے ہوئے

دیکھیے اس سمت رنگیں تتلیوں کے غول میں

روح شاعر کے مناظر پھول برساتے ہوئے

چھوڑنے آئے ہیں شاید پھر وہ پانی میں چراغ

اینٹھتے تن تے ہوئے اتراتے بل کھاتے ہوئے

وہ ہوئے آمادہ، وہ اترے نہانے کیلیے

آگ کو بھی دیکھیے پانی میں اتراتے ہوئے

وہ اٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے پھر گھاٹ سے

وہ چلے اک برق سی رگ رگ میں دوڑاتے ہوئے

دیکھیے رہ رہ کے پھر وہ کرتے جاتے ہیں سلام

نرم و نازک انگلیوں سے زلف سہلاتے ہوئے

غیر ممکن ہے نگاہوں سے تعقب دور تک

آؤ پھر اٹھ کر چلیں ساحل سے گھبراتے ہوئے

پھر لب شپر اہے جم گھٹ "کفر خیز و جاں نواز"

دم گھٹا جاتا ہے اس منظر کو دہراتے ہوئے

اس میری خوش اعتمادی پر تصدق جام جم

دیکھ لیتا ہوں تمھیں ہر سمت سے آتے ہوئے

بن کے پھر سلطان اقلیم تمنا و خیال

آیئے دنیائے دل کو وجد میں لاتے ہوئے

چھیڑ کر علم و ادب کے تذکرے پھر دیکھیے

میرے نغمے میرے ہی ہونٹوں پہ شرماتے ہوئے

پھر بغیر عزم ہی آجاؤ میری بزم میں

پھر چلے جانا مرے ساغر کو ٹھکراتے ہوئے

ساغر چشتی

له بیہ راجین کی ایک مشہور ندی کا نام ہے

بکھرے ہوئے پھول

قانون کی آنکھ جھونپڑیوں میں سب کچھ دیکھتی ہے، مگر قصرو ایوان میں اسے کچھ نظر نہیں آتا۔

آزاد کے آنسو غلام کی مسکراہٹ سے زیادہ روشن اور شاداب ہوتے ہیں۔

حسین عورت، آئینہ دیکھتے وقت، آنکھوں سے مسکراتی ہے۔

دنیا میں بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ لوگوں کو غلطی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ فارسی کا مشہور شعر ہے:-

کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر، باز با باز

مصرعہ ثانی کا آخری حصہ، واقعاتی نقطہ نگاہ سے غلط ہے، کبوتر تو کبوتروں کے ساتھ اڑتے ہیں، مگر باز ہمیشہ اکیلا ہی اڑان بھرتا ہے۔ آپ کبوتروں اور مرغابیوں کی طرح "بازوں" کے پرے کبھی اڑتے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔ ظن غالب ہے کہ دوسرا مصرعہ شاعر نے اس طرح کہا تھا:-

"کبوتر باکبوتر، قاز با قاز"

قازیں البتہ کبوتروں کی طرح ایک ساتھ مل جل کر اڑتی ہیں۔ اب اگر کوئی "باز با باز" کی جگہ "قاز با قاز" پڑھ دے تو سننے والے بے اختیار مسکرا دیں گے ——— نہ جانے کتنی غلطیاں ہماری "عادت ثانیہ" بن چکی ہیں:-

بالکل یہی حال فارسی کے اس شعر:-

حب الوطن از ملک سلیمان خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر

کا ہے۔ شاعر نے مصرعہ اولی کے پہلے ٹکڑے میں "حب الوطن" باندھا تھا، عربی میں "جب" گڑھے اور کنویں کو کہتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "خار وطن" کو "سنبل و ریحان" کے مقابل پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح پہلے مصرعہ میں شاعر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ وطن کا گڑھا ملک سلیمان سے بہتر ہے۔ ملک سلیمان کے مقابل حب الوطن کو پیش کرنا فنی غلطی ہے، مادی اور محسوس شے کے ساتھ غیر مادی اور نامحسوس چیز کا پیوند جوڑنا اور تشبیہ دینا، شاعری کا نقص ہے۔ شاعر نے وطن کے گڑھے کو (جو منظر کے اعتبار سے کوئی دلکشی نہیں رکھتا) ملک سلیمان سے بہتر کہا ہے، اور یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن غلطی کے اس احساس کے باوجود جمہور "حب الوطن" کو "جب الوطن" کہنے پر کبھی رضامند نہیں ہوسکتا ——— دنیا غلطی پر اصرار بھی کرتی ہے۔

یونان کے فلاسفہ، فلسفے کی زبانی تعلیم دیا کرتے تھے، فلسفیانہ مسایل کے املا کرانے کا رواج نہیں تھا، لیکن ارسطو نے بعض مسایل کو کتابی صورت میں مرتب کر دیا، سکندر کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے ارسطو کو لکھا کہ ہم یونانیوں کو علم فلسفہ پر ناز ہے، کتابی صورت میں ان مسایل کے آجانے سے، عام لوگ واقف ہو جائیں گے اور یونانیوں کا امتیاز مجروح ہو جائیگا۔ ارسطو نے سکندر کو جواب دیا کہ:-

"آپ مطمئن رہیے، جو کچھ میں نے لکھ دیا ہے، اسے کوئی سمجھ سکتا نہیں"

یہ ہے اس فلسفے کا "پس منظر" جس پر ارباب عقل کو ناز ہے۔

دل کی کھوٹ، اور نفس کی چوری بہت دنوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

۴ کنواری لڑکیاں، دلھنوں کے شکن آلود لباس اور مسہری پر بکھرے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔

کالج کے پرنسپل نے ایک پروفیسر کے پاس چپراسی کو بھیجا کہ تھوڑی دیر کے لیے یہاں ہو جاو کام ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے چیمبر میں بیٹھے ہوئے، کچھ سوچ رہے تھے:۔

چپراسی۔ صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔
غایب دماغ پروفیسر۔ میرا کتا وہاں پہونچ گیا ہوگا۔
چپراسی۔ کتا ...... جی .... :۔
پروفیسر:۔ بدتمیز کہیں کا! یہ ریلوے بکنگ آفس ہے، چوپال نہیں ہے۔

جھوٹ اور سچ ملی ہوی بات کا فریب، خالص جھوٹ سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔

پانی کے بلبلوں کو مٹھی میں پکڑنے کی کوشش میں، ڈر ہے کہیں تم بھی کسی تند و تیز موج کی لپیٹ میں نہ آجاو۔

مرکزی دفتر خطوط لاوارثی (دی ڈیڈ لیٹرز آفس) میں ایک خط بہ ایں مضمون وصول ہوا:۔

آج میں انتہائی مختصر خط لکھ رہی ہوں، تمہاری نگاہ لطیف سے بھی زیادہ مختصر، وہ محبت جس میں ہوس شریک ہو ترک بہ اختیار اور ترک کی جا سکتی ہے۔ تم مجھے ترک محبت پر الزام دو گے، مگر میرے ضمیر کی نگاہ بیدار ہو چکی ہے، اور میں ایک لمحہ کے لیے بھی، اس آلودگی میں رہنا نہیں چاہتی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں گڑھے میں گرتے گرتے رہ گئی۔

تمہارے مجرم اور ہوس آمیز ہاتوں کا "لمس" میرے ر..کا

ی ادب
اسفندار ۱۳۲۱ ف
جنوری ۱۹۴۳ء

شعر اور شاعری

شاعری پیغمبری کا ایک جز مانی جاتی ہے شاید اسی لیے کہ شاعر بھی الفاظ کا مصور ہے اور وجدانیات کا پیغمبر۔ جس طرح پیمبر عالم مثال کی خبریں دیتا ہے اور ان دیکھی چیزوں سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح شاعر بھی عالم خیال کی سیر کراتا اور بن دیکھے مناظر کی جیتی جاگتی تصویریں دکھاتا ہے۔ پیمبر پہ وحی آتی ہے تو شاعر پر بھی الہام ہوتا ہے۔ پیمبر پر حقیقت کے راز کھلتے ہیں تو شاعر پر بھی فطرت کے نکات منکشف ہوتے ہیں۔
شاعر قدرت کا ترجمان او حقیقت کا محرم ہوتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کے آگے اپنا دل چیر کر رکھ دیتی ہے اور وہ معمولی سی معمولی شے جو چشم ظاہر بین میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی شاعر کی نگاہ میں اہم ترین ہوتی ہے وہ عالم امکان کے وزہ ذرہ کو اجازت کی ظاہری نظر سے نہیں بلکہ بصیرت کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس کی حالت کو باطن کے کانوں سے سنتا ہے اور آپ اس کے تاثرات کو اپنی پیمبری زبان میں ادا کرتا ہے۔

شاعری وجدان اور لطیف جذبات کی زبان ہے۔ عالم محسوسات میں جن موثر کیفیات اور حالات سے دل متاثر ہوتا ہے ان کے اظہار کے لیے انسانی فطرت شاعری کا اسلوب ، وزن وترنم ، اختیار کرتی ہے۔

اس عالم کون وفساد میں کبھی کچھ ہے اور اس سبھی کچھ کے لیے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ واردات قلب نظم ونثر دونوں میں بیان کیے جا سکتے ہیں لیکن جذبات، وجدان اور نازک تصورات کے اظہار کے لیے نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ موزوں ہوتی ہے۔ نثر کی انتہا نظم کی ابتدا ہے۔ جہاں نثر ختم ہوتی ہے۔ یعنی جب نازک جذبات کی ترجمانی نثر کے بس کی بات نہیں رہتی وہیں سے نظم شروع ہوتی ہے، چنانچہ لطیف تاثرات کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے تو نثر اپنی سنجیدگی اور وقار کی بدولت اس کے لیے بھدی اور ناموزوں ثابت ہو کر اکثر خیال کی نزاکتوں کو پامال کر دیتی ہے، برخلاف اس کے

نظم تخیل کی حسین اور نازک پیداوار کو ترنم کے ملایم پروں پر لے کر اڑتی ہے اور منزل مقصود تک صحیح سلامت پہنچا دیتی ہے۔

چونکہ منظوم زبان التزام وزن رکھتی ہے اور اس میں وہ ترنم پایا جاتا ہے جو نثر میں مفقود ہے۔ اس لیے نظم زیادہ دلنشین اور اثر انداز ہوتی ہے۔

بعض دفعہ یہ کام صرف ترنم صوت (آواز کا ترنم) سے بغیر الفاظ اور معانی کی امداد کے لیا جاتا ہے۔ جس طرح موسیقی کے ماہرین اکثر تاثرات کی ترجمانی کا کام غزل۔ ٹھمری۔ ٹپہ کے بغیر صرف ستار کے بول اور بانسری کی دلکش لے سے لیتے ہیں جس طرح موسیقی جذبات کی مختلف کیفیتیں سامع کے ذہن میں منتقل کرتی ہوئی دماغ اور روح میں ایک ارتعاشی کیفیت پیدا کر دیتی ہے سامع کبھی جذبات کے سطحی تاثرات سے متاثر ہو کر بیخود ہو جاتا ہے تو کبھی محویت خیال اور روحانی ترقی کو محسوس کرتا ہے اسی طرح شعر بھی جذبات اور خیال کے انتقال کا ایک موثر ذریعہ ہے بلکہ عالم معانی کی وسعتیں اور تصوری تلازم کی جو کیفیتیں شعر پیدا کر سکتا ہے وہ موسیقی اور مصوری سے ممکن نہیں۔ اشعار ذیل میں تغزل کے رنگ میں جو معانی اور مطالب ہیں اور استعارات سے جو تصوری تلازمات پیدا ہو رہے ہیں ان کا اظہار بجز اشعار کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔

غالبؔ ؎

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دل افتادگاں کنج خال دہن کے
سویدا میں سیر عدم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغ تف نالہ لے داغ دل سے
کہ شب رو کا نقش قدم دیکھتے ہیں

ان دلی تاثرات اور دماغی تخیلات کے علاوہ شاعری ان وجدانات کے اظہار کا بھی ذریعہ ہے جن کا تعلق اس نقطہ سے ہے جو معتقدات، مذہبی جذبات اور خدا اور بندے کے باہمی ربط سے ہے۔ اس لحاظ سے شاعری کے محرکات اور وجدانات کو دو دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دائرہ وہ ہے جس کو ہم عالم ظواہر سے تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسرا وہ جس کو عالم باطن کہنا چاہیئے۔

فطرت انسان زیادہ تر اسی عالم ظواہر سے متاثر ہوتی ہے۔ تاہم کبھی کبھی یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ اس پردے کے پیچھے کوئی حقیقت ضرور ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت کسی حکیمانی تحقیق یا منطقی استدلال اور نظریات سے منکشف نہیں ہو سکتی۔ ؏

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

اور یہی وہ اہم منزل ہے جہاں مخلوق کا خالق سے، عبد کا معبود سے ایک خاص ربط قائم ہوتا ہے۔ اور یہیں شاعر کو عالم ظاہر کی نہیں بلکہ عالم باطن کی ترجمانی کرنی پڑتی ہے اور شاعری ہی وہ بلند مرتبہ زبان ہے جس میں ان باطنی کیفیات اور روحانی تاثرات کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور حقیقت میں یہی وہ نازک موقع ہے جہاں شاعری سچ مچ پیمبری کرتی نظر آتی ہے اور اس عالم کون و فساد میں عالم مثال اور عالم حقیقت کی سیر کراتی ہے۔

لطیف النسا ایم۔ اے (عثمانیہ)

دعوت و پیغام

اے حیرتیِ حسن نظر سوز ادھر دیکھ
غماز ہے وارفتگیِ چشم و نظر دیکھ

کس دن کیلیے ہے یہ ترا ذوق نظر دیکھ
خود جلوہ سراپا ہے تقاضا ہے ادھر دیکھ

اٹھنے کو ہے محفل میں قیامت کی نظر دیکھ
کچھ دیر میں ہے کار جہاں زیر و زبر دیکھ

وہ آئی مرے دل میں ادھر دیکھ ادھر دیکھ
وہ مست وہ رنگین۔ وہ دزدیدہ نظر دیکھ

کچھ موت نہیں منزل انجام سفر دیکھ
عقبیٰ بھی ہے دنیا کی طرح راہگذر دیکھ

مرنا تو کجا عشق میں آساں نہیں جینا
حسرت ہے ترے دل کو تو یہ کام بھی کر دیکھ

پتھر کی چٹانوں میں ہے انگڑائی کا عالم
جادوگریِ کیف جو اپنی نظر دیکھ

ہر شے پہ جو اس جان تماشا کا ہے دھوکا
یہ ذوق نظر ہے کہ مرا سحر نظر دیکھ

منظر جسے کہتے ہیں ترا رنگ نظر ہے
اس رخ سے کبھی آئینہ شام و سحر دیکھ

اعمال کا انعام ہے فردوس و جہنم
افسوں گریِ کارگہ خیر و شر دیکھ

پردے تری آنکھوں سے نہ اٹھ جائیں تو کہنا
تنہائی میں اک روز کبھی رقص شرر دیکھ

قربت کی جلالت سے فضا کانپ رہی ہے
جلتے ہیں پر جبریل سر پردہ در دیکھ

آوارہ ہیں کیوں تیرے لیے شام و سحر بھی
تکتے ہیں تجھے دور سے کیوں شمس و قمر دیکھ

مستوں کو تو آئینہ ہے ہر قطرہ صہبا
ساغر کے تموج میں رم شام و سحر دیکھ

ساغر نظامی

اردو کی تین مایہ ناز کتابیں

(۱) شہر خموشاں

اردو دنیا کے نامور ادیب در کہنہ مشق صحافی جناب سید محمود صاحب مورخ بی۔ اے کے سات لرزہ خیز سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ "شہر خموشاں" کے نام سے شائع ہوا ہے اردو میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل پہلی چیز ہے "شہر خموشاں" "آب حیات" "نوجوان بوڑھا" "سائنسدانوں کی جنگ" وغیرہ افسانے بیحد دلچسپ پر از معلومات ہیں اس کتاب کا مقدمہ جناب شاہد احمد صاحب مدیر مجلہ ساقی دھلی نے لکھا ہے، پاکیزہ کتابت و طباعت۔ قیمت عہ ر

(۲) مورخ کے افسانے

اس کتاب میں جناب سید محمود مورخ بی۔ اے کے ایک درجن انتہائی دلچسپ کامیاب افسانے ہیں جو نقادان ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اگر آپ کو افسانوی ادب سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ کریں اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ اردو کے افسانوی ادب نے کس قدر ترقی کر لی ہے ضخامت ۱۳۲ صفحے کتابت و طباعت پاکیزہ قیمت عہ ر

زہریلی مکھی

جناب سید محمود صاحب مورخ بی۔ اے کی افسانہ نویسی کے عروج کا زندہ ثبوت یہ کتاب ہے اس میں دس بیحد دلچسپ پاکیزہ افسانے ہیں جو اپنی جذبات نگاری ترقی پسندی کیلئے مقبول ہو چکے ہیں ان افسانوں کی زبان ادب نہایت پاکیزہ ہے اسلوب بیان دلکشی اور کردار نگاری حد درجہ کامیاب ہے ضخامت ۲۸ صفحے دو رنگی اور جاذب توجہ ٹائٹل پیج کتابت و طباعت عمدہ قیمت عہ ر

نوٹ ۔ خریداران "ہندستانی ادب" رسالہ کا حوالہ دیکر ۲۸ جنوری ۱۹۴۲ء تک یہ تینوں کتابیں صرف دو روپیہ میں طلب کر سکتے ہیں محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا

مینیجر گلفروش پبلشنگ ہاؤس لال کنواں دھلی

نظم طباطبائی کی شاعری اور ان کی مثنوی شستقیہ

(بہ سلسلہ گزشتہ)

قاآنی اور خاقانی کو چھوڑیے، سودا اور ذوق کی تشبیبیں پڑھیے اور میر انیس و مرزا دبیر کے مراثی کے چہروں کا خد و خال ملاحظہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت ان لوگوں نے فن شعر کو کس کمال تک پہنچایا ہے ۔ مراثی کی صنف بھی اگرچہ اصطلاحی حیثیت سے قصیدے سے الگ ہے لیکن میں معنوی حیثیت سے اسے قصیدہ ہی سمجھتا ہوں، ان لوگوں نے مصوری، محاکات، بلندی خیال، مضمون آفرینی، اور جدت تراکیب کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے، منظر کشی کے وہ وہ نمونے انہوں نے چھوڑے ہیں کہ دنیا متحیر ہے، ابر کا اٹھنا، بارش کا زور و شور، رات کی سیاہی، صبح کا نمود، چاندنی کی بہار، ستاروں کا خرام ناز، شفق کی رنگینی، آفتاب کی زرپاشی نسیم کی اٹکھیلیاں، صبا کی شوخی، سواری کی دھوم دھام، اولاد کی محبت، تلوار کی کاٹ، شراب کی مستی، میکدہ کا شور، معشوق کا سراپا، اولوں کی گہر ریزی دریا کا بہاؤ، پھولوں کی نزاکت، پانی کی چادر، شمع کی سوزش، شام کی آمد، کے نقشے اس خوبی سے دکھائے ہیں کہ جدید وضع کی نظمیں بھی ایسے نمونے پیش کرنے سے قاصر ہیں ۔

نظم کے قصاید قصیدہ کے متعلق میرا جو خیال تھا وہ ظاہر کر چکا عام طور پر قصیدے سے متعلق جو خصوصیات ضروری سمجھی جاتی ہیں وہ یہ ہیں ۔

پُرشکوہ الفاظ، عمدہ اور نادر تشابیہ، ادیبانہ طرز بیان، دلکش تشبیب، اگر قصیدہ مدحیہ ہو تو ممدوح کے مراتب کا لحاظ، گریز ایسی کہ بات میں بات پیدا ہو جائے، وغیرہ وغیرہ ۔

ہم نظم مرحوم کے قصاید کو اسی معیار پر جانچیں گے کیونکہ درباروں سے تعلق ہونے کی وجہ سے انھیں بھی مداحی سے سابقہ رہا ہے، وہ قصیدے میں سودا و ذوق اور خاقانی و قاآنی ہی کے متبع تھے، لہذا دیکھنا یہ ہے کہ وہ دوسرے شعرا کے مجمع میں کیسے نظر آتے ہیں ۔

طلوع صبح عام طور پر قصیدہ گو شعرا نے اپنی تشابیب میں طلوع صبح کو نہایت عمدہ پیرائے میں ادا کیا ہے اور خوب زور طبع دکھایا ہے، ذیل میں میں فارسی و اردو کے چند شعرا کا کلام پیش کرتا ہوں اس کے بعد نظم کا کلام پیش کروں گا تاکہ ان کا حقیقی مرتبہ ظاہر ہو سکے ۔ لیکن مراثی کے چہرے اور قطعات بھی میں قصیدے ہی کے ضمن میں نقل کروںگا ۔

قاآنی

صبح است و بر طرف افق خونست عمدا ریختہ
یا اطلس چینی فلک بر فرش دیبا ریختہ
شنگرف بر قرطاس بین بیجادہ بر الماس بین
گر وز مرد طاس بین یاقوت حمرا ریختہ
تیغ سحر پرتاب شد نجم فلک پرتاب شد ۔
زان زہرہ شب شد زہرہ صفرا ریختہ
افراخت فرور دین علم شد لشکر دے منہزم
صبح از شفق آتش زدم بر دفع سرما ریختہ
یا خون شب ناگہاں کز رے سواد شد عیاں
از نشتر خور آسماں بر دفع سودا ریختہ

قاآنی ۔ ملک الفاظ ہے، نئی نئی تشبیہوں کے استعمال میں اسے ید طولی حاصل ہے اس نے مختلف قصاید میں طرح طرح سے

طلوع صبح" کے مضمون کو باندھا ہے، افسوس اس وقت میرے
س اس کے کلام کا صرف انتخاب موجود ہے، کلیات نہیں ورنہ میں
ہ اشعار اس کے اور نقل کرتا حقیقت یہہ ہے کہ کوئی شاعر اس
ب میں اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا ۔

میر انیس

طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح ۔ ہونے لگا افق سے ہویدا نشان صبح
ردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح ۔ ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح
پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

رشید نے جو رخ سے اٹھائی نقاب شب ۔ در کھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب
لم کی فرد فرد سے لیکر حساب شب ۔ دفتر کشائے صبح نے الٹی کتاب شب
گردوں پہ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطان شرق و غرب کا نظم و نسق ہوا

نظم طباطبائی

ظلمت سے نکلا رخ سلمائے سحر ۔ ناقہ گردوں کی کھینچی لیلی شب نے مہار
فق یا وادی فیروزہ گوں میں لالہ زار ۔ ہے یا سبزہ زار آسماں میں آبشار
سے نکلے ہیں یوسف یا ید بیضا صبح کا ۔ یا زلیخا گوش لیجا میں ہو درشاہوار
تاب یا نظر سر در گریبان افق ۔ ہو گئی غائب شب اعلیٰ ہوئی صبح آشکار
ن افروزی جو کی مشرق میں صبح نے ۔ ہو گیا مغرب میں پنہاں ساحر نابکار
ان شعبدہ گر نے یہہ کی افسونگری ۔ مہرہ مشرق میں اگل کر چھپایا مغرب میں مار

ایضاً

پیر فلک کے ہاتھ میں جام شراب ۔ یا کورہ مشرق میں ہے یا قوت ناب
ملکے ہوئے صبح پھولا ہے گلاب ۔ یا یہہ خورشید نے الٹی ہے نقاب

یہ جو کرن کی آمیں تارے زمیں ۔ ذرے ہوئے رشک قطرات پرویں
لبریز نور ہو زمیں ۔ گردش جو فلک نے کی بسان گلاب

ہے خط شعاعی میں لکھی سر تا سر ۔ ایک آیت نور جس سے خیرہ ہو نظر
آڑی ترچھی شعاعیں ہیں زیر و زبر ۔ ہو سورۂ والشمس میں جیسے اعراب

ظلمت نے کیا فرار چمکی جو کرن ۔ بھاگا آذر گشپ سے اہرمن
خنجر کھولے کنوئیں سے نکلا بیژن ۔ نیزہ لیے باختر سے پہونچا سہراب

نکلی مشرق سے بیرق خسرو شرق ۔ مغرب میں قشون ظلمت ہوئی غرق
جس طرح سحاب کے عقب میں ہو برق ۔ یا جیسے غرا کے تعاقب میں عقاب

چہرہ جو ہے سرخ کہہ رہی ہے یہ ضیا ۔ از بسکہ طلوع بحر مشرق سے کیا
اور بوسہ عارض لب ساحل نے لیا ۔ اس وجہ سے کچھ حجاب ہے کچھ عتاب

کیا صبح ہے کیا نور ہے کیا جلوہ گری ۔ لائی ہے نوید تازہ باد سحری
گل کو ہے دوشینہ سے ہے بے خبری ۔ شبنم نے چھڑک دیا ہے چہرہ پہ گلاب

ازہار و ریاحین سے زمین ہے ہر ہفت ۔ پھولوں ہی پہ کرتی ہے صبا آمد و رفت
ہنس ہنس کے بچھائی ہے گلوں نے زربفت ۔ اور نرگس بیدار نے فرش کمخواب

کیا دھوپ نے کی چمن میں زر افشانی ۔ سونے کا پھرا ہے ہر ورق پہ پانی
مرغان سحر ہیں محو خوش الحانی ۔ پڑتے ہیں زبور جس طرح اہل کتاب

ابر و باران کی کیفیت

قاآنی کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع یہہ ہے ۔

بگردوں تیرہ ابرے بامداداں بر شد از دریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

اس قصیدے میں قاآنی نے وہ وہ زور طبع دکھایا ہے کہ بیان
سے باہر ہے، نئی نئی تشبیہیں، محاکات کی خوبی ۔ الفاظ کا ترنم ان سب

ں کر کلام کو معجزہ بنا دیا ہے ۔

م مرحوم نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی فرمائی ہے اور ایسی
صنعت ترصیع کی خوبی، الفاظ کی ہم آہنگی اور تشابیہ کی ندرت
ہے ۔

(۱)

یو سیہ سرشار و مست و خشمگیں
خنداں رخ و گریاں تُرہ روشن دل و تیرہ جبیں
ں انداز جنوں پیتوں میں شور ارغنوں
بام ہوا ہے تیرہ گوں صحن گلستاں زمردیں
قطرہ لیے پانی سمندر سے سپے
گذرا جدھر بکھرا دیے گلہائے در دریا میں
گوہر فشاں قطرہ زناں دامن کشاں
مانند زلف مہوشاں تاریک و تار و عنبریں
لیے فغاں سر بر کف و کف بر دہاں
انداز میں پیل دماں آواز میں شیر عریں
یدہ سر دیو سیہ مست الحذر
پرچھائیں جس کی دیکھ کر چھپتا پھرا مہر مبیں

(۲)

سری جگہ اسی سماں کو نئے انداز سے دکھاتے ہیں ۔

یہ گھٹائیں ہیں کہ ہیں لیس ایل
بن گئی یا شب دیجور سمٹ کر بادل
بال و پر شاہیں کا ہے رنگ
کر جھکا پڑتا ہے سبزہ کو سمجھ کر ہر ڈل
یہ جمتے نہیں دیکھی مسی
یوں کسی آنکھ میں گھلتے نہیں دیکھا کاجل

ان کی صفائی اور روزمرہ، اعجاز کی حد تک پہنچا ہوا ہے
س باب میں ان کا کسی سے مقابلہ نہیں ہو سکتا ۔

آگے فرماتے ہیں ۔

ہو گیا مہر جہاں گرد نظر سے اوجھل — ڈھونڈھنے برق چلی ہاتھ میں لے کر مشعل
ابر کو لغزش مستانہ ہر اک گام پہ ہے — رعد کہتا ہے اندھیرا ہے ذرا دیکھ کے چل
نکل آیا درۂ کوہ سے کالا اک ناگ — ہیں سوار اس پہ کشن عشوہ نمائے گوکل
خیمۂ ابر سے جھلکی سی کبھی آتی ہے نظر — رقص پریوں کا وہ ہے اور یہ اندر کا محل
یا ہے سرگرم پرستار [illegible] آتش زردشت — وہ ہے عنبر کا دھواں یہ ہے شرار مشعل
یا کڑکتی ہے یہ ارجن کی کماں رہ رہ کر — یا چمکتی ہے کنہیا کے گلے کی ہیکل

یہ قصیدہ محسن کاکوروی کی تتبع میں لکھا گیا ہے، اس زمین میں ہندستان کے اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے لیکن محسن یہ کی مقبولیت کسی کو نہ نصیب ہوئی، تاہم نظم کا قصیدہ بلحاظ صنعت گری کم نہیں ہے ۔

ابر و باراں کے موضوع پر بعض قصائد کی تشبیب میں قتال نے بھی طبع آزمائی کی ہے، یہاں چند اشعار نقل کرتا ہوں ۔

سحاب رحمت باری بچرخ شد پیدا — غلاف بہ پوشید گنبد خضرا
سواد دیدۂ اردی بہشت و فروردی — ضیائے چشم خرابات و رونق صہبا
دم مسیح و نوید حیات بخش بہار — عصائے موسی عمران کحیۂ تعلی
گہے بود ارنی گوے چوں کلیم طور — گہے شود شرر انگن چو شعلہ سینا
سیاہ روے و سیہ مست چوں شب تاریک — سیاہ پوش و سیہ گوں چو گیسوے عذرا
گہے چو قیس کند نالہ و بگرید راز — گہے خروش بر آرد چو ناقہ لیلی
ہزار مستی رنداں بہر رگش پنہاں — ہزار لغزش مستاں بہر قدم پیدا
ہزار موج بہر موج کوثر و تسنیم — ہزار قطرہ و ہر قطرہ عدن پیرا

گھوڑا

میر انیس مرحوم نے گھوڑے کی توصیف اور سواری کی شان میں خوب خوب زور طبع دکھایا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں ان کا کوئی ثانی نہیں، فرماتے ہیں ۔

وہ جست و خیز و سرعت چالاکی سمند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند

سم فرس ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و شوخ و چشیم و سر بلند
گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا
آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال
کبک دری خجل دل طاؤس پائمال
بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابر گہر بار بن گیا
گہ قطب گاہ گنبد دوار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا

اس گھوڑے کے ساتھ ہی نظم مرحوم کا گھوڑا بھی ملاحظہ فرمایئے :-

وہ ترارے وہ دم رفتار وہ انداز خرام
وہ کنوتی وہ بر و دوش وہ گردن وہ کفل
دے سکی ساتھ روانی میں نہ وقت گلگشت
دو قدم چل کے نسیم سحری ہو گئی شل
آگیا سبزۂ خوابیدہ اگر زیر قدم
یوں اٹھا اسپ کہ جس طرح سے خواب مخمل
دم جولاں کہیں ملتا نہیں سایے کا پتہ
ڈھونڈتی پھرتی ہیں پریاں اسے جنگل جنگل
لے اڑی گرد قدم نکہت گل کو ہمراہ
لے گئی آنکھ سے نرگس کی چرا کر کاجل
یہ گذرتا ہے تو غنچوں سے یہ آتی ہے صدا
دل ہوئے جاتے ہیں پامال اس طرح سے چل
جو ٹھہرتا ہے نگاہوں میں تو کہتی ہے پری
گل نرگس نہیں آنکھیں ہیں یہ نہ قدموں سے مل

تلوار مرزا دبیر نے تلوار کی تعریف میں تیغ زبان کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو۔

یاں تیغ رواں غل دھر آئی ادھر آئی — وہ چمکی وہ تڑپی وہ چھپی وہ نظر آئی
وہ تیر گئی خود میں وہ سر میں در آئی — گردن سے پڑی سینہ لیا تا کمر آئی
سن اس کا گھٹا تھا جو دلیرانہ بڑھا تھا
منہ کی وہی کھاتا تھا جو منہ اس کے چڑھا تھا

چمکی جو خود سر پہ تو سر سے نکل گئی — شانہ پہ جو پڑی تو جگر سے نکل گئی
سینہ میں دم لیا تو کمر سے نکل گئی — حیراں تھا خود بدن کے کدھر سے نکل گئی
اونچی ہوئی تو فرق عدو کو فرد کیا
گر کر اٹھی تو راکب و مرکب کو دو کیا

اب اس تلوار کے ساتھ ہی نظم مرحوم کی تیغ زبانی بھی دیکھیے

نہا کر خوں میں دشمن کے وہ تیغ اور بھی نکھری
کہ پہلے خضری تھا رنگ اب ہے احمر کانی
وہ تھی پرکالہ الماس جب کاٹھی سے نکلی تھی
لہو میں ڈوب کر اب ہو گئی لعل بدخشانی
لپک ایسی جسے کہیے زبانہ نار دوزخ کا
چمک ایسی جسے کہتے ہیں برق قہر یزدانی
ہوئے آتش کدے خاموش جب اس نے ہوا باندھی
بجھایا آنچ نے اس کی چراغ پیر یزدانی

(۲)

وہ چمک تیغ کی اور جوہروں کی وہ سبزی
آب الماس میں صانع نے زمرد کو کیا حل
آگ میں آب ہے ایسی کہ بجھا دے آتش
آب میں آگ ہے ایسی کہ جلا دو مشعل
جوہر ایسے خم گیسو میں ہوں جیسے موتی
خون بالوں میں بھرا مانگ میں جیسے صندل
چمک ایسی ہے کہ آنکھوں سے یہ دیکھا سب نے

کہ ابھی کھیل رہی تھی سر شرک پا جل

جوہروں کی ہے یہ کثرت کہ نظر آتی ہے

ساتھ زنار کے کافر کے گلے کی ہیکل

خیال تھا کہ اسپ و شمشیر کا مقابلہ بھی نقل کروں لیکن طوالت کے خیال سے چھوڑتا ہوں اہل نظر کے لیے اتنا ہی کافی ہے دیدہ ور اتنے ہی سے سمجھ سکتے ہیں کہ نظم مرحوم کا شاعری میں کیا رتبہ ہے، میں ان کو کسی پر ترجیح نہیں دیتا لیکن وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔

گریز قصیدہ کی تشبیب سے اصل مقصد کی طرف رجوع کرنے کو کہتے ہیں، بہترین گریز وہ ہے جس میں شاعر تشبیب کے اشعار کہتے کہتے مقصود کو اس طرح شروع کر دے کہ جیسے بات میں بات پیدا ہوگئی۔

فارسی شعرا متاخرین میں قاآنی کو گریز میں بہت ملکہ حاصل تھا وہ مضامین عاشقانہ یا بہاریہ سے گریز کر کے اچانک اس طرح مقصود کی ابتدا کرتا ہے کہ بے اختیار منہ سے واہ واہ کی صدا نکل جاتی ہے۔ مثلاً اس کا مشہور قصیدہ ہے۔

فرو گرفتہ گیتی را باغ و راغ و کوہ و در

نم ابر و دم باد و تف برق و غو تندر

بہار کی تصویر کھینچتے کھینچتے معشوق کی تعریف کرنے لگتا ہے

سمند خوی و سمن بوی و سمن روی و سمن سیما

پری طبع و پری زاد و پری چہر و پری پیکر

آخر میں لکھتا ہے۔

ز عشقش چو انار و نار و مار و اژدہا دارم

برے کفتہ دل تفتہ تنے خفتہ قدے چنبر

یعنے معشوق مذکور الصدر کے عشق میں میری یہ حالت ہو گئی کہ قد حلقہ ہوگیا جسم مرجھا گیا اور دل جل گیا اور جسم زخمی ہے۔

لیکن

ولیکن بازا نہ و شادم کہ سال و ماہ و روز و شب

بطوع طبع و جان و دل ثنائے شہ کند ازبر

یعنے وہ بادشاہ کی ثنا و صفت ہر وقت کیا کرتا ہے اس لیے میں اس سے خوش ہوں۔ لیجیے بادشاہ کی مدح شروع ہوگئی بتلایئے اس سے بہتر گریز کیا ہوگی۔

اب اسی کے ساتھ نظم کی بھی ایک گریز ملاحظہ فرمایئے شب معراج کے متعلق ان کا قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

ہے ابر باد و سیہ سرشار و مست و خشمگیں

خندان رخ و گریاں مژہ روشن دل تیرہ جبیں

اس میں ابر و باراں بہار کی تصویر کھینچتے چلے جاتے ہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں۔

کچھ جھوم کر آنا بھی ہے کچھ چال مستانہ بھی ہے

دریا یہ لہرانا بھی ہے بکھرا کے زلف عنبریں

رنگت سیاہ اور یہ پھبن جس پہ فدا حسن چمن

صد نافۂ مشک ختن صد گلۂ آہوے چیں

ہیں روز و شب ہم پیرہن اور نور ظلمت جان و تن

ہے برق شاخ یاسمن اور ابر مار یاسمیں

برق جہندہ شعلہ زا اور ابر بالائے ہوا

وہ ہے براق مصطفےٰ یہ شہپر روح الامیں

دیکھیے کس صفائی سے گریز کر کے نعت شروع کر دی سننے والوں کو محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ کوئی نئی بات شروع ہوگئی۔

اعلیٰ درجے کی مصوری تشبیب کے بیان میں جو نمونے دیے جاچکے وہ بھی مصوری ہی کے نمونے تھے جذبات کی مصوری بھی مصوری ہی ہے بلکہ اعلیٰ مصوری اسی کو کہا جاسکتا ہے لیکن یہاں اعلیٰ درجے کی مصوری سے میری مراد یہ ہے کہ کسی شئے کی تصویر ایسی کھینچی جائے کہ زیادتی و کمی نہ ہونے پائے

اصلی تصویر میں اور اس میں زیادہ فرق نہ ہو، مبالغہ اور تشابیہ کے زور سے محاکات میں شوخی نہ پیدا کی گئی ہو لیکن پھر بھی وہ نقشہ «

دندان تو جملہ در دہانند

کا مصداق نہ ہو اور دلکشی پورے طور پر باقی رہے، مثلاً میر حسن مرحوم ایک موقعہ پر چاندنی رات، سنسان جنگل اور جوگن کی بین کے اثر کی تصویر کھینچتے ہیں:۔

وہ سنسان جنگل وہ نور قمر — وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اجلا سا میدان چمکتی سی ریت — اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے سایہ میں مہ کا ظہور — گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

نظر جو کہ پڑتی تھی بوٹی جڑی — ہر اک عالم شوق میں تھی کھڑی
سن آواز کی اسکی شان و شکوہ — نکلنے لگی دب کے آواز کوہ
تحیر کا تھا وان ہر ایک کو مقام — زباں کا نکلتا تھا ہونٹوں سے کام

یا مثلاً فردوسی ایک موقعہ پر رستم کی وہ حالت دکھاتا ہے جبکہ اس نے اشکبوس پر پیادہ پا حملہ کیا ہے۔

بمالید چاچی کمارا بدست — بہ چرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست — خروش از خم چرخ چاچی بخاست

مذکورہ بالا اشعار میں نہ مبالغہ ہے نہ مبالغہ آمیز تشابیہ نہ دقیق کنایہ لیکن تصویر ایسی کھینچی ہے کہ مصور بھی دیکھ کر حیران رہ جائے۔

اب مولانا نظم کی زبان سے ایک جاسوس کی نقل و حرکت کی کیفیت سنیے:۔

سپیدہ میں سحر کے دیکھا اک غول بیابانی
کبھی بڑھتا تھا تھم تھم کر کبھی تھم جاتا تھا بڑھکر
کبھی مانند سایہ آڑ میں چھپتا نظر آیا
کبھی وہ بڑا بگولہ کی طرح کھاتا ہوا چکر
کبھی موج ہوا کی طرح اس نے راہ کترائی
کبھی گذرا نظر کے سامنے سے جس طرح صرصر

نہ کوئی دیکھ لے ہر گام پر تھا اس کو یہ کھٹکا
قدم تھے راہ پیما اور نظر دیوار پر در پر
ابھی تک شبہہ تھا آیا قریب اب کچھ یقیں آیا
وہ بھاگا وہ گرا وہ اٹھتے اٹھتے کھائی پھر ٹھوکر

کفار رسول خدا کے مقابلے میں آتے ہیں:۔

دکھا کر آگ سیدھی کی کمانیں بھی کبادی بھی
بھرے ترکش ہیں ناوک خنجروں پر باڑھ ر[illegible]
چڑھالیں تیوریاں چلے چڑھا کر خود پسند دل نے
کمندوں میں تھی جو گتھی وہ بل کھا کھا کے سلجھ[illegible]
ہوئی یہ رائے لو زکبر یا کو رد کیے بڑھ کر
سواد شہر سے باہر چلے بہر پذیرائی

ایضاً

اٹھیں باگیں بڑھے توسن کھنچیں تیغیں چلے تیر[illegible]
کیئے جوشن چھپیں زرہیں دم رزم و صف آرائی
وہ نیزوں کا لچک جانا کمندوں کا وہ بل کھانا
وہ سوفاروں کی ہچکی اور کمان دہ کی وہ انگڑائی

تشبیہ و استعارہ

تشبیہ دنیا کے ہر زبان میں مستعمل ہے جا[illegible] و عالم ہر شخص اس سے کام لیتا ہے۔ لیکن شعر و ادب میں تشبیہ و استعارہ کو وہی درجہ حاصل ہے جو [illegible] کے موقلم کو فن مصوری میں بسا اوقات ایک عمدہ تشبیہ [illegible] مطلب ادا کر دیتی ہے، جو متعدد صفحوں کو سیاہ کرنے کے بعد بھی ادا نہیں ہوتا لیکن عمدہ تشابیہ سے جس قدر شعر میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے اسی قدر بعید اور دور از کار تشابیہ سے شعر معمہ بن جاتا ہے اور پڑھنے والے بجائے مسرور ہونے کے مکدر ہوتے ہیں۔ مولانا نظم طباطبائی نے خود استعارات و تشبیہات کے متعلق اپنے دیوان کے مقدمہ میں ایک مختصر

تحریر فرمایا ہے میں یہاں بجنسہٖ نقل کرتا ہوں ۔

"دیکھو استعاروں اور کنایوں کی تاریکی میں مضموں کی جھلک اس طرح نظر آئے جیسے کالی گھٹاؤں میں بجلی کوند کر آنکھوں کو خیرہ کر دے یا پچھلے کے اندھیرے میں پو پھٹنے سے روشنی پھیلے یا ابر گھر کر آئے اور برس کر کھل جائے نسیم صبح کا چلنا جھومتی ہوئی ڈالیوں سے سبزے پر پھولوں کا بکھرنا اس قدر لطف نہیں رکھتا جس قدر ایک برجستہ شعر سے لطائف کا پیدا ہونا وجد میں لاتا ہے لفظ و ترکیب کی شان و شوکت حیرت انگیز تو ہے لیکن معنیٰ کی بے تکلفی کی کچھ اور ہی دلآویزی ہے تاروں کی چھاؤں سہانی ہے لیکن نور کا تڑکا اس سے زیادہ دلکش ہے یاقوت و زمرد کی جھوت آنکھوں کو لبھا لیتی ہے لیکن ہیرے کے کنول میں سیماب کی تڑپ اور ہی کچھ عالم رکھتی ہے شعر سے معنی مطلب نکلنے کا لطف وہی جانے جس نے چینی کا کھنکنا سنا ہو یا ریتی کا ٹپکنا دیکھا ہو"

تشبیہ ایسی ہونی چاہیئے جس سے مصوری کی شان بڑھ جائے ۔ مثلاً ملا آنی ایک موقع پر لکھتا ہے ۔

خوش آندمے کہ یار بود یار من دو زلف مشکبار از چشم اشکبار من

چو چشمہ کہ اندر و شنا کنند مارہا

یا نظم ایک موقع پر ابر کی تصویر کھینچتے ہوے کہتے ہیں ۔

یوں کسی ہونٹ پہ جمتے نہیں دیکھا مسّی

یوں کسی آنکھ میں گھلتے نہیں دیکھا کاجل

چونکہ استعارہ بھی فی الحقیقت تشبیہ ہی ہے اس لیے استعارہ میں بھی وہی برجستگی ہونی چاہیئے ورنہ مطلب مغلق ہو جائیگا۔ استعارہ کی نہایت لطیف مثالیں دوسری زبانوں میں مشہور ہیں

جن میں سے ایک امرؤ القیس کا شعر بھی ہے جس میں اس نے رات کی درازی اور اس کے جانے کی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ شب نے انگڑائی لی اور سینہ ابھار کر پیٹھ ٹیڑھی کر لی ۔

فقلت له لما تمطی بصلبه

واردف اعجازا وناء بکلکل

جب میں امرؤ القیس کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو نظم مرحوم کے دو شعر ضرور یاد آجاتے ہیں ۔

شعاع مہر آئی جب گریباں صبح نے کھولا

کھلے تارے شب دیجور نے جب زلف بکھرائی

نکالا اپنا لاٹھنڈی سانسیں صبح نے بھر کر

خمار اپنا جو ڈالا کہکشاں نے لیکے انگڑائی

ملکی تشابیہ شعراے اردو زیادہ تر فارسی و اردو تشابیہ سے کام لیتے ہیں لیکن اکثر جب ہندی الفاظ یا ہندی تشابیہ کی طرف توجہ کرتے ہیں تو اور ہی لطف پیدا ہو جاتا ہے ۔ مثلاً سودا کہتے ہیں ۔

ترکش الینڈ سینۂ عالم کا چھان مارا

مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

یا انشا کہتے ہیں ۔

صنم خانہ میں جب دیکھا بت و ناقوس کا جوڑا

لگا ٹھا کر کے آگے ناچنے طاوس کا جوڑا

اسی طرح محسن کاکوری اپنے نعتیہ قصیدہ میں لکھتے ہیں ۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

دوش پر باد صبا کے لئے گنگا جل

نظم مرحوم نے بھی اکثر مقامات پر اسی قسم کی تشابیہ کا استعمال کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں ۔

نہ کیوں ہندوستاں کی خاک میں ہو راگ و رنگ ایسا

کنھیا کی سنی ہے بانسری میری غزل خوانی

نکل آیا درۂ کوہ سے کالا اک ناگ
ہیں سوار اس پہ کشن عشوہ نمائے گوکل

نظم کی غزل گوئی فلسفہ قصائد اور عام شاعری پر ایک نظر

نظم طباطبائی مرحوم غزل گو بھی تھے، لیکن ایسے زبردست عالم کی غزلوں میں وہ بات نہیں پیدا ہوسکتی جو میر، سودا یا داغ وغیرہ میں تھی، یہ لوگ شاعر محض تھے اور تمام دنیا کے علوم و فنون کو چھوڑ کر صرف غزل گوئی کو اپنا معیار قرار دیا تھا، دماغ میں عشق و محبت کی چاشنی موجود، طبیعت میں اسی نوعیت کے جذبات موجزن جو عاشقانہ شاعری کی جان ہیں اس کے ساتھ زبان کی خوبی اور شعر گوئی کے ملکے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ لہذا اس زاویہ نظر سے نظم کو دیکھنا میرے خیال میں ظلم ہے اگر غزل گوئی کو معیار قرار دیا جائے، تو امرؤ القیس، مہلہل، متنبی، ابو نواس رودکی، منوچہری، عنصری، فرخی، فردوسی، خاقانی اور قاآنی، اقبال، ٹیگور، کوئی بھی شاعر نہیں کہلایا جاسکتا لیکن اگر شاعری نام ہے عمدہ تخیل، بہترین محاکات حسن ادا شیریں بیانی کا تو یہ تمام لوگ شاعر تھے اور نظم بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں،

مرحوم اپنے قصیدہ لامیہ کا مقطع فرماتے ہیں۔

داد دیتے تجھے اے نظم جو ہوتے اس وقت
عرفی و محسن و سودا و جریر و اخطل

میں نے جریر، سودا، عرفی، محسن، کے لامیہ قصاید بھی دیکھے ہیں، قدر بلگرامی کا قصیدہ لامیہ بھی دیکھا ہے حق یہ ہے کہ ان تمام شاعروں سے طباطبائی کم نہیں۔

میں نے اخطل کا قصیدہ دیکھا ہے اور شنفرا کے مشہور عالم قصیدہ لامیۃ العرب کی خوبیاں بھی پیش نظر ہیں جس کا مطلع یہ ہے

اقیموا بنی امی صدور مطیکم
فانی الی قوم سواکم لامیل

بیشک ان قصاید کی نوعیت، طرز بیان، اسلوب ادا، بلکہ خیالات بالکل الگ ہیں، ان پر کسی عجمی نظم کو قیاس کرنا خام خیالی ہے لیکن عجمی شعرا میں نظم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ غزل گوئی میں ان کے رنگ میں لکھنو اسکول کا رنگ جھلکتا ہے وہ محاورات پر جان دیتے ہیں روزمرہ کی صفائی ان کا شعار ہے، ساتھ ہی صنائع لفظی و معنوی اور ضلع جگت سے بھی کام لیتے ہیں لیکن چونکہ نہایت عالی رتبہ ذی علم تھے اس لئے مضامین فلسفیانہ اور ندرت تشابیہ و جدت تراکیب سے کلام کو رونق دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ غزل میں وہ شوریدگی اور جذبات آفرین نہیں پیدا ہوئی ہمیں چاہیے کہ ہم ہر شاعر کے کلام پر اسی حیثیت سے غور کریں۔ جو حیثیت وہ رکھتا ہو، برخلاف اس کے ہم مختلف غزل گو حضرات تک میں کچھ عجیب طرح موازنہ کرتے ہیں، مثلاً اگر کوئی صاحب غالب کا رنگ پسند کرتے ہیں تو اسی کے انداز کو پیش نظر رکھ کر مختلف شعرا کے کلام کو جانچتے ہیں ایسے ہی اگر کوئی صاحب ذوق کے موافق ہیں تو ان کی طرز ادا کو معیار قرار دے کر دوسروں کے کلام کو پرکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ اصول یہ ہونا چاہیے کہ جس شاعر میں جو خوبی ہو اس کا اعتراف کیا جائے۔

لہذا ہم کو چاہیئے کہ نظم پر محض غزل گو ہونے کی حیثیت سے نظر ہی نہ ڈالیں اور اگر ایسا کریں بھی تو ان اس معیار پر لانے کی کوشش نہ کریں جو غزل گو حضرات کے لئے مخصوص ہے کیونکہ یہ تو بعینہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی دیا شنکر نسیم کو داغ کے مقابل کھڑا کرے۔ میں سردست نظم کی غزلوں سے بحث نہیں کرنی چاہتا، میرا مقصود تو نظم کی تمام شعر گوئی پر ایک اجمالی نظر ڈالنی ہے۔ اور اصل میں تو میں ان کی مثنوی شعشعیہ پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

نظم ایک زبردست عالم اور فلسفی تھے، اسلامی فلسفہ میں کمال رکھتے تھے، فلسفہ کی مطولات ان کی نظروں سے گذری تھیں جیسا کہ آگے چل کر میں ان کی مثنوی سے ثابت کروں گا۔ اسی فلسفیانہ کمال کی وجہ سے وہ اکثر اپنے اشعار میں مصطلحات فلسفہ استعمال کرتے ہیں، مثلاً

تعین نے مکاں کے بیڑیاں کیوں پاؤں میں ڈالیں
تسلسل نے زماں کے کیوں مجھے زنجیر پہنائی

حواس خمسہ میں گھر کر میں سیر لامکاں بھولا
جہات ستہ میں پھنس کر طبیعت میری گھبرائی

وہ اپنی سادگی کی وضع اکثر یاد آتی ہے۔
کہ یہ رنگیں قبائے کیف وکم مجھ کو نہ بھائی

شکنجہ میں مجھے کھینچا ہے ابعاد ثلاثہ نے
رہے پابند وہ کیوں کر سدا کا ہو جو ہرجائی

مرحوم نے صرف مصطلحات فلسفہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خیالات بھی فلسفیانہ رکھتے تھے۔ ان کے اکثر اشعار، غالب و بیدل کی ٹکر کے ہیں مثلاً فرماتے ہیں۔

نفس سے یوں ہے مرغ رشتہ بر پا ہستی انسان
کہ ہے نبض جہندہ جس کی اک موج پریشانی

نہ تھا دامن تو کانٹے بھی نہ دامن سے الجھتے تھے
لباس عاریت سے تو کہیں بہتر ہے عریانی

یہ تھا ایک مختصر سا خاکہ اس خیال کا جسے میں علامہ نظم طباطبائی مرحوم کی عام شاعری کے متعلق ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

محمد حامد خاں ہندی

مشعل راہ

نگاہ حسن کے معصوم حربے کارگر نکلے
فقط میں کیا دو عالم اسکے مجروح نظر نکلے

فریب خواب ہستی کے وہ لمحے معتبر نکلے
مری ویران نظر کے آپ جب حد نظر نکلے

وہ تصویر سکوں بن کر فضا میں بیشتر نکلے
مگر ہم اپنی محویت میں ان سے بیخبر نکلے

بنا دیتی ہے گہرا نقش لوح عرش اعظم پہ
وہ آہ نیم شب جو خوان دل سے ڈوب کر نکلے

تمہیں شاید محیط کائنات ہر دو عالم ہو
جدھر بھی میں نے دیکھا تم ہی تا حد نظر نکلے

کرم آمیز نظروں ہی نے یہ نشو نما بخشی
ہوے اتنے ہی پیدا دل میں ارماں جسقدر نکلے

براہ راست دل کو دل سے اک گہرا تعلق ہے
مگر اس پر بھی ان کے جلوے پابند نظر نکلے

یہی طے کرتے کرتے میں گذر جاؤں گا ہستی سے
تلاش منزل مقصود میں کتنے سفر نکلے

وہ دنیا تھی جہاں پرساں نہ تھا کوئی ہنر والا
یہ محشر ہے یہاں شاید کوئی اہل نظر نکلے

فضا میں اور کچھ ترمیم ہو جاتی تو اچھا تھا
کہ دل بجھنے لگا جس دم ستارے چرخ پر نکلے

محبت ارتباط باہمی کا نام ہے **نخشب**
مگر دنیا میں یہ معنی بعنوان دگر نکلے

نخشب جارچوی

حدیث فانی

وہ شاعر بیکسی کے ساز پر نغمے سناتا تھا
وہ شاعر دل سوزش دیکھتا اور مسکراتا تھا

وہ شاعر جو مزاج انقلاب دہر سے واقف
وہ شاعر یاس میں دل کو جسے بہلانا آتا تھا

وہ شاعر بجلیوں کو جو پتہ دیتا تھا خرمن کا
ہوا دیکر بگولوں آندھیوں کا دل بڑھاتا تھا

وہ شاعر آشیاں میں جسکے تاریکی اجالا تھی
شب تاریک میں جو داغ دل اپنے جلاتا تھا

وہ شاعر جو نوازشہائے بیجا پر نہ اترایا
دل بخشش کو جو ہر دم ٹھکرا کر مسکراتا تھا

وہ شاعر حسن تک جس پر تخیل پر تفخر ہو
یم امواج کی تہ سے در یک دانہ لاتا تھا

وہ شاعر آشیاں کے چار تنکے تھے جسے دو بھر
انھیں بھی بجلیوں کی نذر کر کے مسکراتا تھا

وہ شاعر جو شریک درد و غم تھا دو بشر کا بھی
وہ شاعر اپنے غم میں بھی سکون کے گیت گاتا تھا

وہ شاعر اب ترسے گی جس کیلیے برسوں
مسرت سے الگ رہ کر جو غم کے ناز اٹھاتا تھا

چلو اسکی مزار پاک پر آنسو بہا آئیں
حیات جاوداں کا مژدہ آج اسکو سنا آئیں

ذرا دیکھیں کہ بزم قدس کن لوگوں کی بستی ہے
ذرا دیکھیں کہ بہشتی ایسی بلندی ہے کہ پستی ہے

وہاں بھی ہے یہاں کی طرح کیا روح رواں شاعر
بنا ہے بنتے بنتے نور بخش لامکاں شاعر

فراز عرش پر تیری نظر ہے جانتا ہوں میں
تیری پرواز کو اے روح شاعر مانتا ہوں میں

زیادہ کیا کہوں اللہ بس باقی ہوس فانی
بقا تیری مسلم ہے تو پھر کیوں پیش و پس فانی

سید واجد علی واجد دہلوی (عثمانیہ)

غزل

دل نے ایسی خراب کی دنیا
میں ہوں اور اضطراب کی دنیا

دہر کی اک نئی ہوی تخلیق
دیکھ ان کے شباب کی دنیا

دونوں عالم سے بھی نرالی ہے
نگہ انتخاب کی دنیا

جز تو ہم نہیں کچھ اس کا وجود
زندگی ہے سراب کی دنیا

وہ نہ دنیا میں ہوسکا اپنا
جس کی خاطر خراب کی دنیا

دل کی وسعت ارے معاذ اللہ
لخت لخت اضطراب کی دنیا

جی لگے کیا قفس میں اے عاجز
بھا گئی انقلاب کی دنیا

راے گروچرن اس سکسینہ عاجز

بچوں کی نفسیات

جس گھر میں دیکھیے یہی شکایت ہے کہ بچے کہا نہیں مانتے! کبھی آپ نے اس بات پر غور بھی کیا کہ ایک چھوٹا سا بچہ جو اپنے بڑوں سے کہیں چھوٹا ہوتا ہے کیا عقل اور کیا جسم میں لیکن پھر بھی وہ ضد کرتا ہے اور ایک سمجھدار شخص اس کو نہیں منا سکتا! ہم انہیں اسباب وعلل پر بحث کریں گے۔ جس کی وجہ سے بچے ضدی ہوجاتے ہیں۔

بچے کی ابتدائی تربیت کا مقام اس کا وہ گھر یا ماحول ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا اور پروان چڑھتا ہے۔ اس بات کو تو غالباً ہر شخص مانتا ہے کہ بچہ کی تربیت اور اخلاق واطوار کی درستی میں اس کے والدین کا ایک خاصا حصہ ہوتا ہے۔ اور خصوصاً ماں کا ـــــ ماں باپ کافی حد تک اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت میں بہترین والدین ثابت ہوں۔ وہ نقش اولین جو کسی بچہ کے دماغ میں مرتسم ہوجاتا ہے۔ بہت ہی مشکل سے مٹتا ہے، مثلاً اگر بچے کے خوف ہی کو لے لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ خوف جو کسی سبب سے بچپن میں اس کے دماغ میں جاگزیں ہوجاتا ہے وہ آخر عمر تک باقی رہتا ہے۔ خوف کے بھی کئی اسباب ہوتے ہیں، مثلاً ایک خوف ان دہشتوں کا نتیجہ ہے جو رات میں پیش آجاتی ہیں۔ جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ اتفاقاً رات گئے نیند سے بیدار ہوتا ہے اس وقت اس پر اونگھ طاری ہوتی ہے رات کے لمپ سے خارج ہونے والی شعاعیں مختلف شکلوں میں اچھلتی کودتی نظر آتی ہیں باہر سے بارش کی آواز اور ہوا کی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ بچہ ماں کو آواز دیتا ہے اگر ماں کچھ عقلمند ہے تو اسے تسکین دلاتی ہے اور سلانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن اکثر مائیں ایسے موقع پر جھڑک دیتی ہیں، اس طرح وہ خوف اور زیادہ گہرا ہوجاتا ہے اور بچہ چونکہ بہ نسبت بڑوں کے نیم وحشی انسان ہوتا ہے، اس لئے اس کا رات میں ڈرنا فطری چیز ہے۔ اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ صاحب اس کم عمری کے ڈر سے کیا بچہ تمام عمر ڈرپوک رہتا ہے؟ یہ بالکل واقعہ ہے کیونکہ جب بچہ رات کی تاریکی میں خوف زدہ ہوکر والدین کو پکارتا ہے اور والدین اس کو جھڑک کر خاموش کردیتے ہیں، تو اس سے بچہ کے دل دماغ اور ضمیر میں خوف مخفی صورت اختیار کرلیتا ہے جب وہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو یہی خوف اکثر اوقات عود کر آتا ہے اور کسی موقعہ پر اس میں کسی وجہ سے اشتعال پیدا ہوجاتا ہے اور اس پر دہشت کا غلبہ ہوجاتا ہے۔

اس دنیا میں ہمیں ایسے سپوتوں کی ضرورت ہے جو بہادر ہوں اپنے دلوں میں عزم مستقل رکھتے ہوں جو اپنی مادر وطن کی مدافعت میں کٹ مرنے کے لئے تیار ہوں ظاہر ہے کہ ایسے سپوتوں کی ابتدا ہی سے عمدہ تربیت ہونی چاہیے۔ ان کے دماغوں میں ان کی کم سنی ہی سے عمدہ خیالات کا پیدا کرنا ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ماں باپ اور بالخصوص ماں اولاد کی سیرت کا عکس ہوتی ہے وہ جس طرح چاہے اس کی تربیت کرسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اس نظریہ کے قایل ہوں کہ بچوں کو مار پیٹ کرکے ان کے اخلاق درست کیے جاسکتے ہیں لیکن اس بات کو متمدن ممالک میں مان لیا گیا ہے کہ جسمانی سزا بچہ کے لیے نہایت ہی مہلک ہوتی ہے جسمانی سزا تعلیمی اداروں میں بھی غالباً اسی لیے رائج کی گئی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے اس طرز سے اس کی خرابیوں کو دور کریں گے۔ سزا دینے والا یہ سمجھتا ہے کہ مارنے سے بچہ اس کی برتری بہت آسانی سے تسلیم کرلے گا۔ اور یہی غالباً وہ وجہ ہے جو لوگ

جسمانی سزا کی اچھائی کی وکالت کرتے ہیں یہ ممکن ہے کہ جسمانی سزا بچے کو وقتیہ اطاعت پر مجبور کر دے ۔ اس میں شک نہیں کہ جسمانی سزا بچے کی اکثر رہنمائی کرتی ہے ۔ لیکن اس سے بچے کے احساس خودی کو زبردست دھکا پہنچتا ہے ۔ جو کہ نہایت ہی قابل قدر چیز ہے سزا دینے والا اس کی شخصیت کا کوئی خیال نہیں کرتا ہمیں اپنی غلطیوں کا ذمہ دار ہونا چاہیے لیکن ذمہ داری کے یہ معنی نہیں کہ اس کو جسمانی سزا دی جائے محبت و نرمی کیلئے نہایت ہی ضروری ہے ۔ کیونکہ بچے کو ابھی نمو پاتا ہے اور خلوص و محبت ایسی ضروری ہیں جیسے نوخیز پودے کے لئے دھوپ اور پانی ۔

ماں باپ کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ بچہ حوصلہ مند چست وچالاک ہو سست و کاہل نہ ہو یاد رکھیئے کہ کوئی بچہ فطرتاً سست نہیں پیدا ہوتا بلکہ تساہل پیدا ہوتا ہے اس کی حوصلہ کی کی ہمت پست کرنے سے یقین جانیے کہ اگر کوئی بچہ سستی و کاہلی کا اظہار کرے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی امنگوں اور حوصلوں کا خون کیا گیا ہے اور دبا دیا گیا ہے اس کے حوصلوں کو کبھی دبانے کی کوشش نہ کیجیے اس کی زندگی میں ہر چیز کی طرف سے تشویق کی حس پیدا کیجیے ۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ آپ اسے غیر معمولی ناز و نعمت میں پالیں کیونکہ انتہا درجہ کی شفقت و ناز و آرام بھی ایک قسم کی پست ہمتی ہے ، ماں عموماً یہ خیال کرتی ہے کہ بچہ اس سے وابستہ اور متعلق ہے اور رہے گا ، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ ہمیشہ کسی کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اور کبھی خود اپنے پاؤں پر نہیں کھڑا ہو سکتا ۔

بچے عموماً تخیلی دنیا میں رہتے ہیں انھیں کھیلنے کے لئے ایسی چیزیں دیجیے جن سے ان کی دماغی قوت کی نشو و نما ہو اگر وہ کسی چیز کے بنانے میں غلطی کریں تو ان کا مضحکہ نہ اڑائیے بچہ غلطی کرنے کے بعد خود اپنی اصلاح کر لینے کا زیادہ مادہ رکھتا ہے غلطیاں ان کا تجربہ ثابت ہوتی ہیں اور اس طرح سے ان میں تشویق کی حس پیدا ہوتی ہے ۔

پانچ چھ سال کی عمر تک بچہ الفاظ و گفتگو سے زیادہ مرو مصروفیت میں پاتا ہے یہ وہ زمانہ ہوتا ہے کہ جبکہ وہ نمو پانے کے آغاز میں آتا ہے اس عمر میں اس میں اس قسم کے کھیلوں کی تشویق پیدا کرنا چاہیے جو اس کی نمو کے لئے مدد و معاون ثابت ہوں ماں باپ کو چاہیے کہ وہ بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کریں ۔

کسی بچے کو برے کام سے روکنے کے لئے کبھی جسمانی تادیب نہ تجویز کیجیے بلکہ اس بات کی کوشش کیجیے کہ اس کے دماغ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے کہ واقعی یہ کام برا ہے انسان کی فطرت کا تقاضا رہا ہے کہ وہ اسی کام کو شوق سے کرتا ہے جس کے لئے اس کو منع کیا جاتا ہے اور بچہ تو پھر بچہ ہی ہے ۔ بہترین تربیت بچہ کو صاحب فہم نہیں بنا سکتی البتہ صاحب عقل رہنمائی ضرورت ہے جس کی مدد سے وہ اپنی پوشیدہ استعداد کو حاصل کر سکے ہر شخص جانتا ہے کہ فطرت کا بہترین عطیہ بچہ ہے جو دنیا کی لاقیمت دولت ہے اور ایک ماں کا عزیز ترین خواب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بہترین بچہ کی ماں بنے جو اپنی قابلیت و ذہانت ولیاقت میں ایک ہو ۔ لیکن ان کی استعداد اور ان کی قوت ارادی کی بالعوائیت کو ضائع کرنے میں زیادہ تر ماں کی اندھی محبت ہوتی ہے آپ نے اکثر ماں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ میں اپنے بچہ کو ایسا بنانا چاہتی ہوں کہ جس پہ مجھے ناز ہو لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ میں ایسا نہ کر سکی ! آپ اس کو سونے کے لئے مجبور کر سکتے ہیں ۔ اس کے شور و غل کرنے پر اس کو روک سکتے ہیں آپ کی یہ پابندیاں اس کی اس عمر تک کو روک دیں گی لیکن اس کو کسی قابل نہ بنا سکیں گی

بچے کی تمیز خود اس کی جدوجہد و کاوشوں میں مضمر ہے ۔ وہ اپنی دنیا چھوکر، چل کر، چیک کر، اور ہر وہ چیز جو اس کی دسترس میں ہے حاصل کرنے محسوس کرسکتا ہے وہ اپنی پسند و ناپسند کو خود ہی نہایت آزادی کے ساتھ مخصوص کرسکتا ہے، بچوں میں ایک دم اعلیٰ ذہنیت پیدا کرنے سے وہ کچھ بھی حاصل نہیں کرسکتے فطرت خود انھیں پالتی اور حالات و ماحول کے لحاظ سے سنوارتی ہے بہ الفاظ دیگر ان میں تشویق کی حس خوشگوار و مناسب طریقہ سے ان کے خیالات سے ہم آہنگی کا اظہار اور سچائی کی طرف عاقلانہ رہنمائی ہی ایک ایسی شاہ راہ ہے، جو انھیں کچھ ایسا ہی بنا سکے گی جس پر بجا ناز و غرور کیا جاسکتا ہے یہ سب باتیں اسی وقت ہوسکتی ہیں جبکہ آپ تربیت کے ساتھ ساتھ انکی تعلیم کا بہترین انتظام کرسکیں دنیا کی بہترین تربیت بھی جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کسی کو ذکی نہیں بنا سکتا سائنسداں اس بات سے متفق ہیں کہ تربیت ہی ان فطری قوای ذہنی کو جو بچہ ورثہ میں حاصل کرتا ہے بڑھانے میں ایک حد تک ممدو معاون ثابت ہوتی ہے بعض جانیے کہ ایک بچہ کو ہنکار، یا سچا، دیانتدار یا بددیانت، آزاد خیال یا متعصب، مذہبی یا دہریہ بنا لینا صرف اپنی قوت ارادی پر منحصر ہے بہ الفاظ دیگر آپ اس کی بالیدگی و نشو و نما نہیں کرسکتے لیکن جیسے جیسے وہ بڑھتا ہے آپ اس کے کردار کو حسب مرضی بنا سکتے ہیں۔ اور یہی اس کی زندگی کا اہم ترین جز و مقصد ہے اس بات کو یاد رکھیئے کہ وہ آپ کی تادیبی یا نصیحت آمیز مثالوں سے زیادہ آپ کی روزمرہ زندگی کی مثالوں سے سبق حاصل کرتا ہے اس دنیا میں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جبکہ کسی بچے کے میلان طبع کو احمقانہ تخیل تصور کیا جاتا تھا اور ابتدا میں اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی لیکن اب اس کی کافی اہمیت ہے اور بچے کے رجحان کو زیادہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جب تک کہ آپ اس کے ارادوں میں یقین اور اولوالعزمی نہ پیدا کرا دیں گا اس وقت تک وہ خوف و جذبات کے طوفان میں بہا چلا جائیگا۔ بچوں کے دماغوں میں ایک دم بڑوں کی مرضی کا دخل دینا ان کے ارادوں کو تباہ کر دیتا ہے اولوالعزمی کی طرف خود اس کی بڑھتی ہوئی قوت ارادی خود کسی دن اس قابل ہوگی کہ اس کو کچھ بنا سکے سب سے زیادہ عام اور عالمی خرابی جو بچوں کے استعداد کے لیے شگون بد ثابت ہوتی ہے ۔ وہ ہماری گھریلو اور اسکول کی مروجہ تعلیم ہے کہ جس کی وجہ سے ہزاروں کے کیریر تباہ ہوجاتے ہیں۔

آج کل انھیں تعلیمی نقایص کو دور کرنے کے لیے بہت کوشش کی جارہی ہے ، مانٹیسوری طریقہ تعلیم بھی ایک حد تک کامیاب ہو رہا ہے جو بچے کی فطری خاصیتوں پر مبنی ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ مشکل زمانہ ماں باپ کو بچہ پر قابو رکھنے کا بارہ سے اٹھارہ سال کا ہوتا ہے اس عمر میں نفسیاتی نقطہ نظر سے بچہ خاندانی افراد سے ایک قسم کی علحدگی کی کوشش کرتا ہے بچہ کی تربیت شروع سے اس قسم کی ہونی چاہیے کہ اس عمر میں ایک فرمانبردار بچہ جو ماں باپ کے سہارے ہو اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکنے کے قابل ہو اور اسے اپنے فیصلہ پر اعتماد ہو اس عمر میں عموماً ماں باپ کی جا و بیجا نگرانی کے خلاف بچے ایک قسم کی بغاوت کرتے ہیں وہ ایسی چیز کو ہرگز گوارا نہیں کرتے جو ان کے تصورات تخیلات کو جو وہ ماحول سے حاصل کرتے ہیں، کے خلاف ثابت ہوں ۔ ماں باپ کا جا و بیجا شک بھی ان کے افعال و حرکات پر کافی اثر انداز ہوتا ہے اس عمر میں وہ خود مختاری کی ایک خاص حالت میں پہنچ جاتا ہے ذاتی احساس اور اپنے قویٰ کے استعمال کی خوشی میں اضافہ ہوتا ہے خود اعتمادی رسائی کے ساتھ، اعلیٰ تر و افضلیت، نخوت اور خودستائی میں تبدیل ہوجاتی ہے وہ اس عمر میں یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا چاہیے ۔

اگر اس کے نصب العین کے ساتھ ہمدردی نہیں کی جاتی ہے تو وہ بد دل ہو جاتا ہے جوانی کی امید افزا تمنائیں مستقبل کے شکوک سے باسانی منتشر ہو جاتی ہے تاوقتیکہ اس کا احساس نہ ہو جائے کہ دنیا کی عام رفتار ترقی پر ہے ورنہ حقیقت واقعات کے منطقی احساس کے مقابلہ میں علم کمزور پڑ جاتا ہے۔ معلم یا والدین کا فرض ہے کہ وہ اس کمزوری کو پورا کریں۔ یہ ظاہر کرکے کہ دنیا تمام امکانات سے پُر ہے اور اسی طرح دنیا کے کاروبار میں شریک ہونے کی خواہش پیدا کرے مدنیت کی تربیت کے لیے یہ زمانہ بہت موزوں ہے چونکہ اب بچہ کی دلچسپیاں مدنی الطبع ہیں۔ اس طرح وہ خطرہ دور کرسکتا ہے، جس کا اندیشہ بدولی جلکی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کا وجود اس زمانہ اور آیندہ زمانہ میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

بچے کی نفسیات پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ یہاں چند موٹی موٹی سطحی چیزیں بیان کی گئی ہیں آپ آج ہی سے بچہ کی نفسیات کا مطالعہ کیجیے اور پھر اس کے مطابق عمل کیجیے اس طرح آپ کو ایک دو دن میں اگر کامیابی نصیب نہ ہو تو گھبرائیے مت! اس لیے کہ آفتاب کی شعاعیں بھی سیکڑوں برس محنت کرنے کے بعد ہی پتھر کے ریزہ کو الماس بنانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ اچھا یا برا بچہ قسمت کا عطیہ ہے آپ قسمت کو خود بنا سکتے ہیں یہ جانیے کہ قسمت کے عطیے سے محنت کا پھل زیادہ شیریں ہوتا ہے۔ آپ اپنی قوت ارادی سے کام لیجیے اس لیے کہ انسانوں کے کردار کا عکس ان کی قوت ارادی ہے اور عمل اس کا تنہا ثبوت۔

سید علی جعفر۔ بلگرامی

غزل

غیر پر لطف و کرم آخر یہ کیوں
اس طرح ہم پر ستم آخر یہ کیوں

بن رہی ہے دم پہ یوں ہی عشق میں
آپ کیوں دیتے ہیں دم آخر یہ کیوں

کوچہ قاتل سے جانے کے لیے
کیوں نہیں اٹھتے قدم آخر یہ کیوں

یاد کس کی دل کو تسکیں دے گئی
تھم گئی ہے چشم نم آخر یہ کیوں

دل کسی کا گھر ہے اس میں ای فلک
ہو ہجوم رنج و غم آخر یہ کیوں

جب ہی ساقی مہرباں پھر میکشو
تم کو فکر بیش و کم آخر یہ کیوں

دیدہ و دل کیا ڈبو دینگے مجھے!
ہو گئے دونوں بہم آخر یہ کیوں

منھ میں جو کچھ آئے کہتے جائیں آپ
اور رہوں خاموش ہم آخر یہ کیوں

پڑ گیا کیا اس شہ خوبی کا عکس!
جام مے ہے جام جم آخر یہ کیوں

تم سمجھ لو دیکھ کر صورت مری
میں کروں اظہار غم آخر یہ کیوں

وہ تو ٹھہرے دشمن جاں ای عزیز
دوستی ہوگی بہم آخر یہ کیوں

عزیز یار جنگ عزیز

جلد (۲)
نمبر (۴)
ہندستانی ادب
اسفندار سنہ ۱۳۵۱ ایرانی
جنوری سنہ ۱۹۳۲ء



تحفہ

میں اپنی خوابگاہ میں بستر پر لیٹی ہوئی ڈاکٹر کا انتظار کر رہی تھی۔ انجم صبح سے کسی ضروری کام پر باہر گئے ہوئے تھے۔ باغ میں بوڑھا مالی ناشپاتی کے نئے درختوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ شیراز میرے سونے کے کمرے کی سیڑھی پر بیٹھی یاسمن اور بیلے کا خوبصورت ہار گوندھ رہی تھی ۔

یہ اوایل مارچ کی ایک دلفریب اور مسرت زا شام تھی بہار کی آمد کے خوشگوار آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ہوا کے روح پرور اور جان بخش جھونکے باغ کے دروازے پر لٹکے ہوئے ارغوانی پردوں سے کھیل رہے تھے ۔ باغ پر ایک کیف انگیز رومان چھایا ہوا تھا۔ میری صحت اب پہلے سے بہتر ہو چلی تھی۔ زندگی کی اداسیوں میں اب کہیں کہیں امید کی جھلک نظر آنے لگی تھی ۔

گیلری میں تجمی، سوسن کے شاداب پھولوں کا بڑا سا گلدستہ لیے سنرلی کے ساتھ کھیل رہا تھا ۔

قصر انجم کے آفتاب نما گیٹ پر کار کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی خوبصورت برآمدے اور خوشنما گیلری میں سے ہوتے ہوئے ڈاکٹر اور ان سے تھوڑے فاصلے پر موء بانہ انداز میں چلتی ہوئی شیراز ان کا چھوٹا بیگ تھامے پرفضا باغ میں داخل ہوے۔ باغ کے بیچوں بیچ حوض تھا جس کے پانی پر بہت سارے خوشرنگ پھول تیر رہے تھے ۔ میرا سونے کا کمرہ باغ کے اس طرف واقع تھا۔ اس کے مزین برآمدے میں ایک رنگین فوارہ جاری تھا۔ اور کمرے کے اندر خوبصورت تپائیوں پر تازہ پھولوں کے گچھے جابجا رکھے ہوے تھے۔ ان کی جانبخش اور دلنواز خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ شام کی ہلکی روشنی نیلے رنگ کے شیشوں سے چھن چھن کر کچھ اس طرح اندر پھیل رہی تھی جیسے صبح کے دھندلکے میں افق مشرق پر سحر نمودار ہوتی ہے۔ دور سے آنے والوں کو ایسا دکھائی دیتا تھا گویا شاعر کے تخئیل میں بسنے والے فردوس کا کوئی نرالا اور دلکش خواب پردے کے قریب آنے کے بعد انہوں نے میرا نام لے کر پکارا اور سکون کامل کے ساتھ آہستہ چلتے ہوے کمرے میں داخل ہوے۔ رومی قالین پر ان کے قدموں کی آواز گم ہو چکی تھی۔

میں نے تعظیم کے لیے اٹھنا چاہا لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ بیگ کو شیراز نے عجب طرح کی احترام آمیز نزاکت کے ساتھ میز پر رکھ دیا، اور واپس چلی گئی۔ پر محبت انداز میں وہ میرے قریب آے۔ ان کے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا تازہ، سرخ، شاداب بہت بڑا گلاب تھا۔ بہت ہی خوش رنگ اور دلفریب بھی تھا جس کے چند ہی درخت خاص خاص باغوں میں پاے جاتے ہیں۔ میں بے حد تعجب اور اشتیاق سے اس کی طرف دیکھنے لگی اس کی پتیوں میں ایک عجب طرح کا یاقوتی رنگ جھلک رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا گویا اس کو ابھی تازہ اور سرخ خون میں ڈبو یا گیا ہے ۔ مجھے پھولوں سے حد درجہ محبت ہے میرا دل اسے چھونے کے لیے بیقرار تھا۔ مگر میں نے صبر سے کام لیا اور چپ چاپ اس کی جانب پرشوق نگاہوں سے تکنے لگی۔ انہوں نے ملاقات کے ابتدائی الفاظ ختم کر کے وہ پھول میرے بالوں میں لگانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن عین اس وقت سرد ہوا کے ایک گستاخ جھونکے نے دریچے سے داخل ہو کر اسے فرش پر گرا دیا اور اس کی پتیاں منتشر ہو گئیں میں نے تیزی سے جھک کر ان بکھری ہوئی پتیوں

کو فرش پر سے اٹھا لیا۔ آہ! وہ سرخ گلاب ان پنکھڑیوں کو ہاتھ میں لینے سے میرے دل کو بیحد مسرت حاصل ہوئی۔ دیر تک غور سے میں اس کے خوش نما اور شگفتہ رنگ کو دیکھتی رہی۔ اس کی نرم اور ریشمی پتیاں اس کی جاں نواز خوشبو میری آنکھوں میں عجب طرح کا فرحت آمیز اثر پیدا کر رہی تھی۔

آخر کار میں نے شکریہ ادا کر کے اس تازہ ترین پھول کو اپنے سنہری بالوں میں لگا لیا۔ اکثر شام کو وہ یا تو میرے پاس بیٹھے اپنی زندگی کے گذرے ہوئے دلچسپ افسانے سنایا کرتے۔ یا ہم دونوں شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ ان کے محبت آمیز انداز میں کچھ اس طرح کا شفقت آمیز خلوص پایا جاتا تھا جو جی کو تسکین دینے والا تھا۔ اس لیے ان کے آجانے سے مجھے کسی قسم کے افسردہ اور منتشر خیالات گھنٹوں نہ ستاتے تھے۔ اس شام بھی ہم لوگ دیر تک شطرنج کھیلتے اور باتیں کرتے رہے۔ شیرازی میرا بیگ لیجاؤ۔

انہوں نے بڑی شیریں آواز میں اس کا نام ایک خاص ادا سے لیتے ہوئے کہا گو ان کا لہجہ مربیانہ انداز سے خالی نہ تھا۔ جس کا اظہار کسی نوکر کے روبرو مالک کا ہونا چاہیے۔ کھیل ختم ہو چکا تھا وہ معذرت چاہتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے مجھے یاد ہی نہ رہا شام ایک اور مریض کو دیکھنے جانا ہے۔ "خدا حافظ نازلی" ان کی یہ دلنشین آواز کمرے میں گونج گئی "خدا حافظ ڈاکٹر" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اوہ آپ اس قدر جلد جا رہے ہیں۔ لیکن یہ تو کہیے پھر کب ملاقات ہوگی؟ "کل صبح" مجھے تسلی دیتے ہوئے انہوں نے کہا نہ گھبراؤ اب تم جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ میں سنجیدہ انداز سے بول اٹھی۔ آہ! ڈاکٹر کیا سچ مچ ایسا ہی ہوگا؟ آہ وہ دن کب آئے گا؟ میں مذاق تو نہیں کرتا نازلی۔ میرا خیال ہے شاید اسی ہفتے میں تمہیں باغ میں جانے کی اجازت دے سکوں۔ خدا کرے یہ سچ ہو ——

میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ وعدہ ان کے شیریں بول سے کس قدر روح پرور اور دل نواز معلوم ہو رہا تھا۔ فردا کے مسرت آمیز تخیل میں جھومتی ہوئی میں اپنی خوابگاہ کے فرانسیسی دریچے کی طرف مڑی اور اسے پوری طرح کھولدیا۔ ملاح اپنی کشتیاں ساحلوں کی طرف لا رہے تھے۔ دریا کی لہراتی ہوئی شفاف موجوں میں سورج کی آخری کیف بار کرنیں عجب طرح کا دلفریب منظر پیدا کر رہی تھیں۔ ملاحوں نے پریشان نظروں سے انہیں دیکھا اور تیزی سے اپنی پتوار چلانے لگے۔ دریائے ٹیمز کے کناروں پر خوبصورت اوکس کے رنگین شگوفے مسکرا رہے تھے۔ ایک لمحے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نہ جانے کب کی کمرے سے جاچکے تھے۔ میری نگاہ سامنے رکھے ہوئے قد آدم آئینے پر جا پڑی تیز رنگ کا نو شگفتہ سرخ گلاب اب بھی میرے بالوں میں اسی طرح جگمگا رہا تھا۔ نیچے فرش پر اس کی چند ریشمی پتیاں بکھری ہوئی پڑی تھیں میں نے جھک کر آہستہ سے ان کو چن لیا اور محبت بھری نگاہوں سے اپنے مخملی تکیہ پر رکھ کر غور سے دیکھنا شروع کیا۔ یہ ایک خوش رنگ اور پرخلوص تحفہ تھا جو سچے اور مخلص دوست کی طرف سے ملا تھا۔

نزہت سلطانہ

مقناطیسی سرنگ کا موجد

دنیا میں والٹر بوجن آتشگیر مقناطیسی سرنگ کا موجد اپنے
ن آشام کارناموں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس کی
ر ۵۰ سال ہے۔ شادی شدہ تین بیٹیوں کا باپ ہے یوں تو
س میں غیر معمولی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ البتہ وہ کیمیاگر
روسے ہے اور ڈاکٹر بھی جنیا یونیورسٹی میں پہلے وہ شہرت اور
ہوری سے ہمکنار رہا لیکن چند افواہوں کے باعث جو اس کی
زت اور عظمت میں بٹہ لگانیوالی تھیں، اسے مستعفی ہونا پڑا۔
ور یہ الزام اسقدر سنگین تھے کہ طالب علموں نے اس کے
لاف اظہار غیض وغضب کرتے ہوئے اس کے محل خانے
ں کھڑکیاں توڑ ڈالیں، پردے پھاڑ دیے، اور بوجن کا مجسمہ
لا بنا کر راستوں پر اسے جلایا گیا۔ آخر میں ان لوگوں نے
کے پاس براہ راست ایک درخواست بھیجی جس میں
ٹی سے اس نام نہاد پروفیسر کے اخراج کے طلبگار
ے۔

یوں تو بوجن کے جرائم اس قدر انتقام انگیز ہیں کہ اگر
ن کا کچا چٹھا آپ پر ظاہر ہو جائے تو دم لینا بھی آپ کو ناگوار
۔ مگر یہاں ان میں سے چند نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے
(جن) سے آپ کو اس کی بداعمالیوں کا کچھ اندازہ ہو ہی
جائے گا۔

یہ طالب علموں کی ٹولیاں اور اسکول کے بچوں نے اس کی
کامیاب۔ اس کے مکان میں جانا قبول کیا جہاں ان کو خصوصیت
ہا۔ جتا کر روک لیا گیا کہ انہیں خاص مضامین میں مہارت
ہو جائے گی۔ اس کے بعد کئی ہفتوں تک وہ اس کے عظیم الشان

قصر میں جو سیلیشیا میں واقع ہے، مقید رکھے گئے اور بچوں کو نہ
معلوم کدھر غایب کر دیا کہ ان کا پتہ ہی نہ چلا۔

کچھ دنوں بعد حالات اس قدر خوفناک ہو گئے کہ اس جگہ
کے رکٹر (پادری)، ہیڈ ماسٹر) نے جو بہت ہمت والا آدمی
تھا، صدائے احتجاج اسکی مخالفت میں بلند کی، اس وقت
ہر بوجن کو آئی جی فاربن فیاکٹری میں تبدیل کرکے بھیجد یا گیا
یہ کارخانہ بہت وسیع تھا، سینکڑوں ہی مزدور اس میں کام
کرتے تھے، یہاں وہ خاموشی سے کچھ عرصے تک کام کرتا رہا،
کسی نے اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی۔ ایک روز فیاکٹری سے
ملحق اسکول کی ایک ننھی طالبہ غایب ہو گئی۔ اگرچہ سبھوں نے
مشکوک نگاہیں اس پر ڈالیں۔ مگر اس پر اس واقعے کا قطعاً
اثر نہ ہوا۔

یہ جس زمانے کا ذکر ہے اس وقت جنگ وجدل نہ
تھی بلکہ امن کے پرلطف دن تھے ہر طرف شانتی اور اطمینان
نظر آتا تھا۔ مگر اس کے بختہ رس دماغ میں ایجاد! ایجاد!
———— ہاں اس خون آشام ایجاد کی پکار ہو رہی تھی۔
———— اس وقت ———— ہاں اس وقت صلح اور
آشتی کے دنوں میں وہ جنگ آزمائیوں کی تیاریوں میں مصروف
تھا۔ موجودہ آلات حرب اس کے ذہن میں ہلاکت کے لیے
ناکافی تھے ———— چنانچے وہ ایک طویل عرصے تک مشینوں
اور آتش گیر مادوں کی مشق کرتا رہا۔ اور ہلاکت خیزیوں کا
آلہ کار بنا تا رہا ———— کئی مہینے کی شبانہ روز محنت کے
بعد اس کو اپنی مہلک مقناطیسی سرنگ بنانے میں کامیابی حاصل
ہو گئی۔ اور ان آتشگیر سریع التاثیر مادوں کو تیار کیا جو آج دنیا
وحشیانہ طور پر بے گناہوں کے خلاف استعمال کر رہی ہے۔

ایک ہفتے کی متواتر کوشش میں اس نے بارود کے
ذریعے ایک ایسا مادہ تیار کیا، جو پہاڑوں کو تک صرف چند منٹ میں

اڑا دیتا ہے چار سال پہلے والڈر بوجن کو اس کی کیمیاوی تحقیقات کے صلے میں نوبل پرائز ملنے والا تھا۔ مگر سویڈش ارباب اس نتیجے پر پہنچے کے بوجن کی چند اخلاق سوز اور بہیمانہ حرکتوں کے باعث یہ اہم اعزاز اس کو نہیں دیا جانا چاہیے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو جب ہر بوجن ایک خطرناک تجربے میں مصروف تھا اس کے تینوں بیٹے باپ کے ساتھ کام کرتے تھے بیٹوں کو باپ کے احکام کے آگے سرتابی کی مجال نہ تھی ۔۔۔ انہیں کبھی باپ کے ساتھ اور کبھی تنہا کام کرنا پڑتا تھا۔

۱۹ ستمبر کی رات کو یہ تینوں نوعمر لڑکے اس آتش فشاں مشین پر کام کر رہے تھے کہ یکایک سخت ہولناک دھماکہ ہوا اور آتش گیر مادوں کے بے پناہ بھوج نے اس عمل میں آگ لگا دی ۔۔۔ اس سے سارے شہر میں خونناک روشنیاں پھیل گئیں۔ اور آس پاس کے دیہاتوں میں بھی نظر آئیں ۔۔۔ اس سنگین حادثے میں اس کے تینوں بدنصیب بیٹے ہلاک ہو گئے۔ والڈر بوجن اس وقت ہیمبرگ میں تھا ۔۔۔ اس سانحے کی اطلاع اسے ٹیلیفون سے کی گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ سن کر اس نے کیا کہا۔

"اوہ! اور میرے تمام اوزار!"

اس کے بیٹوں کے ایک دوست نے بیان کیا کہ اس واقعے نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی کہ اس وقت بھی کمبخت کو اپنے اوزاروں اور ہتھیاروں کا خیال سب سے پہلے آیا۔

اس سانحے نے واقعی اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ کیونکہ نومبر ۱۹۳۷ء میں اس نے ایک سریع الاثر آتش گیر تباہ کن مادہ کی ایجاد کی جو پہاڑوں کو ڈھانے میں لاجواب ہے۔ اس کے بعد سے والڈر بوجن برابر ہٹلر سے ملتا رہتا ہے۔ اور ہمیشہ انسانیت کش ایجادات کے نت نئے آلہ کار کو پیش کر کے اس سے خراج تحسین وصول کرتا رہتا ہے۔ اور دولت کثیر بھی۔ یہ وہی شخص ہے جس نے مقناطیسی سرنگوں کو استعمال کرنے کے لیے مکمل کرنے میں کامیاب ہوا ۔۔۔ یہ خونخوار انسان معلوم نہیں پرانی جرمن پریوں کی کہانیوں کا دیو نام عفریت ہے۔ جو اپنے دہشتناک کارناموں کی وجہ سے نازیوں کے سنگ دل گروہ میں قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔

جمیلہ بیگم (کلکتہ)



میرے ارمانوں کی نوخیز کلی پھر دو دری
ہائے رہنے بھی دو انداز پشیماں نظری

بے سبب ہی نہ پڑا آتش نمرود میں عشق
کیا اسے یاد نہ تھی حسن کی بے پروا گری

ہم کو معلوم ہے اے دوست حقیقت تیری
ہم نے بھی طور پہ دیکھی ہے تری جلوہ گری

آپ آئیں تو بھی فرش نظر ہے تخمیں
مجھ کو منظور ہے سب آپ کی یہ عشوہ گری

اس کی آغوش بھی یا جلوۂ نظارۂ گل
کاش میرے کہ شوق نہ جیب بھری

کنیز فاطمہ۔ کاش، ایم۔ اے

انجام شاعری

وہ ہر روز علی الصباح اٹھا کرتا تھا اس کی نہ ختم ہونیوالی بڑ کسی کو گوارہ نہ تھی۔ سب اس کو مخبوط الحواس جنونی ہوش و حواس سے بیگانہ ہی کہا کرتے اس کی نرالی دنیا عجیب پراسرار تھی وہ سب میں رہتا مگر سب سے الگ اسے کسی چیز کی احتیاج نہ تھی —

وہ دنیا میں خوش نصیب نہیں تو بدقسمت بھی نہ تھا۔ قدرت نے اسے سب کچھ عطا فرمایا تھا جس کا یہ نہایت شکرگزار اور احسان مند رہا کرتا تھا۔ بے وجہ استغنا محض اوروں کے لیے تھا۔ اسباب خود بسری اپنے لیے بالکل مختصر رکھا کرتا تھا۔ یہ سب کی سنتا اور اپنی کہا کرتا تھا۔ ہنگاموں سے دور بہت دور اپنی ایک جھونپڑی بسالی تھی اور گھنٹوں اسی پرامن کونے میں بسر کرتا۔ اوقات کے دو حصہ کر ڈالے تھے۔ کبھی سب میں مل کر ہمہ اقسام کے امور میں حصہ لیا کرتا۔ روتوں کے ساتھ روتا ہنستوں کے ساتھ ہنستا اور پھر اپنی تخیلی دنیا بساتا۔ دنیا اسے دیوانہ کہتی اور یہ دنیا والوں کو دیوانہ کہا کرتا۔

گھنٹوں سوچتا اور پہروں گم ہوجاتا۔ پھر یکایک چونک اٹھتا کچھ بڑبڑانے لگتا۔ بچے اس سے انس کرتے اور بوڑھے افسوس کرتے۔ جوان طبیعت اس پر رحم آمیز نظریں ڈالتے۔

عورتیں اس کے احوال سے حیران رہتیں۔ اس کے چہرے پر کبھی کبھار بہت سی بے پایاں مسرت ٹپکتی اور پھر یکایک اداسی چھاجاتی۔ اسے قدرت کی ہر چیز سے انس تھا۔ پھول سونگھتا۔ کبھی خوش رنگ پتھر اکٹھا کرتا۔ سبزہ زاروں میں گھومتا جنگل میں پھرتا۔ زمانہ حال و ماضی مستقبل کی اسے کوئی فکر نہ تھی۔ اس کی نظریں ہر ایک چیز پر بہت گہری پڑتیں۔ پھول کی ہر پنکھڑی درخت کے ہر پتے کو گھنٹوں گھورتا اور گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ اس کے پاس تھا تو صرف یہ کہ کاغذات کا ایک بہت بڑا ڈھیر ہر روز کئی کئی گھنٹے یہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزے لکھ لکھ کر جمع کرتا اور خود ہی دیکھکر محظوظ ہوتا تھا۔ اس کے کلام کا آج کوئی قدرداں نہ تھا۔ اور نہ ہی کسی نے اس کے کلام کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے اس کا احساس تک نہ تھا یہ اپنے آپ ہی خوش رہتا تھا۔

اس کی زندگی عرصہ دراز سے اسی طرح بسر ہورہی تھی اور دنیا والوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شہر کے تمام بڑے بڑے شعرا نے یہ تجویز کی کہ مجلس مشاعرہ منعقد کی جائے تاکہ اہل کمال کے جوہر ظاہر ہوسکیں۔ یہ آئے دن کی نوک جھونک اچھی نہیں۔ جانچ پڑتال کے لیے دیگر ممالک سے اعلیٰ پایہ شاعر بلوائے گئے مشاعرہ اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہوا۔ شہر کے چھوٹے بڑے سب ہی شاعر اس اہم مشاعرے میں شریک ہوئے سامعین کی تعداد بھی کافی تھی۔ ہر ایک شاعر یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میداں میرے ہاتھ رہے گا۔
جلسے کی کارروائی شروع ہوئی اور ہر شاعر نے داد و تحسین حاصل کی اس کا قطعی تصفیہ نہ ہوسکا کہ اس مشاعرے کا میر کون ہے۔

حسب معمول آج بھی ہمارا گمنام شاعر اپنے میلے بستر پر دراز ہے اور آنکھیں میچ کر کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ اس نے بھی سب سن رکھا تھا۔ شہر کے ہنگاموں سے غافل نہ تھا۔ اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اس مشاعرے میں شریک ہوتا۔ اس کا نحیف و لاغر جسم لرز رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سنگ مرمر کی طرح سفید ہوگئے

تھے مگر اس نے اسی حالت میں چند شعر لکھے اور مشاعرے کے میر مجلس کے نام روانہ کر دیا۔ اس کے بعد ہی اس نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے کلام لازوال کی یادگار چھوڑ کر اس دار فانی سے منہ موڑ لیا۔

مشاعرہ خوب زوروں پر تھا پبلک واہ واکر رہی تھی ایسے میں کسی نے میر مشاعرہ کے ہاتھ ایک لفافہ دیا۔ وہ اس کو دیکھ کر بہت ہی عجلت و مسرت کے ساتھ اسٹیج پر کھڑے ہوے اور ہمارے گذرے ہوے شاعر کا تعارف پبلک سے کرایا۔ خدا جانے کلام میں کیا تاثیر تھی۔ برق تھی یا بجلی جس کسی نے سنا مرغ بسمل کی طرح تڑپ نے لگا کوئی سر پٹیا تھا کسی کو وجد آتا تھا۔ ہر طرف سے استفسار ہونے لگا وہ کہاں ہے وہ کہاں ہے، ایک دوسرے کو لوگ مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ آیا کہیں وہ ہی شاعر نہ ہو۔ سب کو ہمارے شاعر کی تلاش تھی۔ مگر کسی نے اسے نہ دیکھا خود وہاں شہر کے کسی شاعر کو اس کا پتہ معلوم نہ تھا۔ جس وقت مشاعرہ ختم ہوا لوگ منڈوے سے باہر ہو رہے تھے۔ اچانک کیا دیکھا ایک جنازہ تھا شاعر کے جس مصرع پر ابھی ابھی لوگوں نے سر دھنا تھا وہی مصرع جلوسی اس جنازہ کے سامنے پڑھ رہے تھے۔ ایک ماتم تھا۔ شہر بھر میں دنیا نے اس کی قدر کی مگر کب جبکہ شاعر اس سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ یہ تھا اس کی شاعری کا انجام۔

مسز، باری داور

غزل

اثر دعا نہ کرے فائدہ دوا نہ کرے
خدا کسی کو محبت میں مبتلا نہ کرے

نگاہ ناز تمہاری جسے نشانہ کرے
تمہیں بتاؤ کہ پھر کیا کرے وہ کیا نہ کرے

ستم نواز تری جور پروری کی قسم
جفا جفا نہ رہے، دل اگر وفا نہ کرے

سہارا دیکے فراموش کر دیا جس کو
وہ بدنصیب کرے کیا، اگر گلا نہ کرے

جنون عشق ترقی پذیر ہوتا ہے
وہ میرے دامن صد چاک پر ہنسا نہ کرے

مشام عشق ترس جائے تازگی کیلیے
تمہاری زلف سے شوخی اگر صبا نہ کرے

نشاط بادہ گلرنگ و ساقی مہ رو
تصورات کی دنیا مٹے خدا نہ کرے

یقین نہ آئے قیامت، یقین آئے غضب
وہ روز وعدہ کرے، روز اک بہانہ کرے

یہ کون اس کو بتائے یہ کون اس سے کہے
یہی جفا ہے ستمگر، کہ تو جفا نہ کرے

بہانہ ڈھونڈتی پھرتی ہے رحمت باری
بڑی خطا ہے جو بندہ کوئی خطا نہ کرے

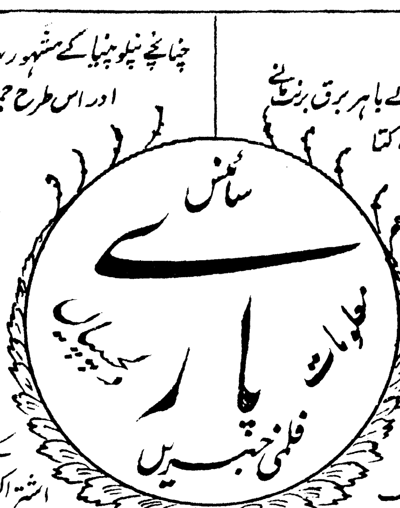
مجھی تغافل بے حد، عزیز ہے خنجرؔ
خیال مہر و کرم ہوا نہیں خدا نہ کرے

خنجرؔ لکھنوی

سائنس

کل کا کتا

واشنگٹن ہاؤس امریکہ کے باہر برق بنانے صرف الیومینیم سے ایک کتا بنایا ہے۔ یہ کتا دم ہلاتا، کان کھڑا کرتا، بھونکتا، روتا اور بیٹھ سکتا ہے۔ دو پیر پر کھڑا رہتا اور دوڑ بھی سکتا ہے۔ اس کا نام "اسپارکو" رکھا گیا ہے۔ یہ وزنی بھی نہیں ہے صرف (۶۰) پونڈ کا وزن ہے۔ اس کی اونچائی کندھوں کے پاس ایک فٹ ہے اور ناک سے لے کر دم تک (۲۹) انچ لمبا ہے۔ دم تین انچ لمبی ہے، اس کے بیرونی خول کے اندر دو خاموش الکٹرک موٹر ہیں۔ ایک دل، دوسرا پیٹ کے لیے ہر ایک موٹر ۱/۲ ہارس پاور کا ہے۔ ایک موٹر اس کو چلاتا ہے۔ دوسرے سے وہ خود چل سکتا او بیٹھ سکتا ہے۔ چلانے والی موٹر کی ایک زنجیر ہوتی ہے جو اگلے اور پچھلے پیروں کو حرکت دیتی ہے اس کی حرکت سے "اسپارکو" چل پھر اور دوڑ سکتا ہے۔



معلومات

بلا ٹکٹ ۲۰ ہزار میل کا سفر

کسی معذور کے ایک دوست نے اس کو ایک کشتی بطور تحفہ دی کشتی پرانی اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔ معذور کو خیال ہوا کہ کشتی کو کسی طرح کام میں لایا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک پرانی سیکل کے پہیے اور دوسرا سامان لیا۔ اس کو ایک موٹر سیکل کا اسپیڈ بھی لگا دیا کشتی کے تختوں کی مدد سے سیکل کو کرسی نما بنایا اور اسی سیکل پر سفر کے خیال سے چل پڑا چنانچہ نیلوپنیا کے مشہور پہاڑ انگائی کو بھی اس نے طے کیا اور اس طرح جملہ ۲۰ ہزار میل کا سفر کیا۔

لینن گراڈ

۱۷۵۲ء میں روس کے شاہ پیٹر اول نے اس شہر کو بسایا اور نام سنیٹ پیٹرسبرگ رکھا تھا۔ لیکن زار ثانی نے اس کا نام پیٹرو گراڈ کر دیا زار اور اس کے خاندان کے قتل کے بعد اشتراکی جماعت نے اشتراکیت کے بانی لینن کے نام پر اس شہر کا نام لینن گراڈ رکھا۔ شہر چونکہ قدیم وضع کا تھا۔ اس لیے یہاں کلیساؤں کی کثرت تھی جن میں سے اکثر انقلاب روس کے دور میں ڈھا دیے گئے۔ باقی جو ہیں ان کو یا تو عجائب خانوں میں تبدیل کر دیا گیا یا سرکاری دفاتر وغیرہ کے کام میں لایا گیا۔

یہ شہر دریائے نیوا کے دہانے پر ہے۔ قدیم ترین شہر کا حصہ ایک جزیرے کی شکل میں ہے۔ یہاں پر روس کے جہاز بنانے کے بڑے کارخانے ہیں۔ یہاں پر ایک جامعہ بھی ہے۔ جو ۱۸۱۹ء میں وجود میں آئی۔ ۱۸۱۹ء تک یہ شہر روس کا پایہ تخت تھا۔ اس کے بعد ہی آبادی میں مسلسل کمی ہوتی گئی اس وقت آبادی ۲۰ لاکھ کے قریب ہے۔

نہر پناما

شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیانی حصہ ملک کے نام سے موسوم ہے ۱۹۰۳ء میں ممالک متحدہ امریکہ نے حکومت پناما سے ایک خاص معاہدے کے بعد نہر کا کام شروع کیا۔ یعنے نہر کے ہر دو کناروں سے ۵ میل تک ممالک متحدہ امریکہ کا عمل دخل ہے۔ اس نہر کی لمبائی ۴۰ میل اور

چوڑائی ۲۰۰ سے لے کر ۱۰۰۰ فٹ تک ہے اور کم سے کم گہرائی ۴۰ فٹ ہے۔ اس نہر کے کاٹنے سے دو بڑے سمندر اوقیانوس اور کاہل کو ملا دیا گیا ہے اور اس طرح سمندری راستہ میں ہزاروں میل کی کمی واقع ہوئی۔

جہاز اور بیڑوں کی طرح اس نہر سے بھی کم رفتار کے ساتھ گذرتے ہیں چنانچہ صرف ۴۰ میل کا فاصلہ طے کرنے کیلیے ایک جہاز کو ۷ یا ۸ گھنٹے گذر جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۴ء سے شروع ہوکر ۱۵ راگسٹ سنہ ۱۹۱۴ء میں نہر کاٹنے کا کام ختم ہوا۔ نہر بالکل کچی حالت میں تھی۔ لیکن اس کے باوجود غیر رسمی طور پر جہازوں کو گذرنے دیا جاتا تھا جب نہر کے پختہ ہونے کا یقین ہوگیا تو ۱۲ رجون سنہ ۱۹۲۰ء میں افتتاحی رسم نہایت ہی شاندار پیمانے پر انجام دی گئی۔

صرف سنہ ۱۹۳۲ء میں اس نہر سے ۵۰۰۰ جہاز گذرے۔

زیر زمینی شہر نمک

یہ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ اسکی غذا کا جزو لاینفک جیسے نمک کا نام دیا گیا ہے، دنیا میں آزادانہ حالت میں بکثرت پایا جاتا ہے چشائر کی نمک کی کانیں آج دنیا بھر میں مشہور ہیں، اور نہ معلوم اب تک کتنے لاکھ ٹن نمک ان کانوں سے نکالا گیا ہے۔ لیکن سلانیکا میں جو کان پائی جاتی ہے وہ بہت زیادہ طویل اور بڑی ہے اور یہاں سے ہر سال ۷۵۰۴۰۰۰ ٹن نمک نکالا جاتا ہے اور اس کان کے ذریعے اتنا نمک نکالا جاسکتا ہے کہ وہ دو سال تک کافی ہو (اگر سالانہ ۱۰۰۰۰۰ ٹن نمک خرچ کیا جائے)

دنیا میں سب سے زیادہ تعجب خیز نمک کی کانیں گلیشیا (آسٹریا) میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کی ایک کان کی لمبائی ۵۰۰ میل، چوڑائی ۲۰ میل اور موٹائی ایک ہزار دو سو فیٹ ہے۔ —— اس ویلیشکا کی کان میں تقریباً ایک ہزار سال سے کئی مزدور کام کرتے چلے آرہے ہیں اور انہی کی محنت کا نتیجہ آج ہم "شہر نمک" کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ جو آج پورے یورپ میں ایک عجوبہ بنا ہوا ہے۔ یہاں سطح زمین سے کئی سو فیٹ نیچے سڑکیں، مکانات، گرجائیں، ہوٹلیں وغیرہ ہیں اور یہ سب خالص نمک کے ہیں۔

لوگ اس بڑی تعداد میں اس شہر کو دیکھنے آنے لگے کہ حکومت کو اس پر خاص نگرانی رکھنی پڑی جب ہم سیڑھیاں اترتے ہیں تو سب سے پہلے ایک بال روم ملتا ہے۔ یہ غیر معمولی کمرہ لوگوں کے تعجب میں اور اضافہ کر دیتا ہے اس کی دیواریں چمکدار ہیں اور چھت خوبصورت ستونوں پر قایم ہے اسمیں صناعی کا کام بھی کیا گیا ہے۔ آرٹ کا ایک عجیب نمونہ موجود ہے۔ دیواروں پر گلکاریاں انسان کی نظروں کو فرحت بخشتی ہیں۔ اس کمرے کی ایک جانب ایک چمکدار اور خوبصورت تخت ہے جس کو نمک ہی سے تیار کیا گیا ہے اور نمک کے دانے مثل ہیروں کے چمکتے ہوے دکھائی دیتے ہیں یہ تخت محض دکھاوے کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ جب کبھی وہاں کا حکمران آتا ہے تو اس شاندار تخت پر متمکن ہوتا ہے۔

یہ بال روم جو سطح زمین سے ۲۱۶ فیٹ نیچے ہے صرف پہلی منزل ہے۔ اس کے بعد اور چھ منزلیں باقی ہیں۔ لیکن ان میں صرف تین آدمیوں کے لیے کھلی ہیں۔ اس عجیب وغریب کمرے کے بعد دوسرا عبادت کا کمرہ ہے اور اس کے بعد سنٹ انتھونی کی عبادت گاہ ہے۔ جو سنہ ۱۶۹۵ء میں تیار کیا گیا۔

جب کبھی کوئی بڑا آدمی اس شہر کو دیکھنے آتا ہے تو یہ تمام منزلیں بقعہ نور بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد ویلیشکا کی دوسری منزل ہے جہاں اترنے کے لیے خوبصورت سیڑھیوں کی ایک قطار ہے۔ انسان نیچے اترنے کے بعد

حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ اب اس کے سامنے میکا لو ائس، ہے، جسے "شیطانی کمرہ" کہا جاتا ہے۔ یہ بہت وسیع اور عجیب وغریب ہے۔ یہ ۱۶۲۱ء میں بنایا گیا اس کی لمبائی ۵۹ فیٹ، چوڑائی ۴۹ فیٹ اور اونچائی ۱۱۸ فیٹ ہے! اور چھت کو لکڑی کے ستون سے سہارا دیا گیا ہے۔

اس کمرے کے بعد چند چھوٹے اور بڑے کمرے ملتے ہیں جو سب کے سب خوبصورت اور نظر فریب ہیں۔ ان کی دیواروں پر بھی گلکاریاں کی گئی ہیں۔ ان کمروں سے کچھ فاصلے پر ایک پل ہے۔ اس کے سامنے دو مخروط نما اجسام ہیں جو اس خموش و سنسان جگہ کے نگہبان معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا درمیانی حصہ پھولا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہنشاہ اسٹریا فرانز اول اور اس کی بیوی کیبرولینا کی یادگار ہیں۔ (۱۸۱۲ء)

اس کان کے تیسرے فرش پر ریلوے اسٹیشن اور ہوٹل ہیں۔ ان تمام عجیب وغریب چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز ہے جسے دیکھ کر انسان مجسمہ حیرت بن جاتا ہے اور وہ "زیر زمینی جھیل ہے" جو سطح زمین سے ۷۰۰ فیٹ نیچے ہے۔ اس جھیل کا پانی سیاہ گہرا اور وزنی ہے۔ اور اس جگہ موت کی سی خموشی چھائی ہوئی ہے اس جھیل کو پار کرنا چاہیں تو چھوٹے چھوٹے ناؤ کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس جھیل کو پار کرکے واپس آنے میں ۱۵ تا ۲۰ منٹ لگتے ہیں۔ اگر کوئی بیچ جھیل میں بندوق اڑائے تو اس سے ہزاروں آوازیں ہوتی ہیں! اور اگر کبھی ناؤ کا کھیتے اپنی آواز بلند کی تو ہزار بار اس کی آواز سنائی دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کئی شیطان اور روحیں مل کر پکارتی ہیں۔ اس قسم کی جھیلیں اس کان میں سولہ ہیں۔ (جے۔ آر۔ دیسائی)

دلچسپیاں

امریکہ میں پہلا عریاں رقص

شہر نیو جرسی میں بمقام اشٹاک ہوم امریکہ کا پہلا عریاں رقص ہوا۔ اس دفعہ پولیس نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ اس رقص میں سیکڑوں ننگے مرد اور عورتوں نے حصہ لیا۔ دوران رقص میں کرتب کمالات بھی ہوئے چنانچہ لومڑی کی چال اور قلابازیوں کو بہت پسند کیا گیا۔

اس محفل میں سب سے نمایاں ہستی ننگوں کے کلب کے صدر ریورنڈ الزلی بوم کی تھی جو ارکان انجمن کی کارگذاریوں کو نہایت ہی پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

عریاں رقص کے ختم پر بطور مضحکہ پورے لباس کے ساتھ عدالت کا سین پیش کیا گیا۔ مدعی علیہ ایک شوہر جس پر اس کی بیوی نے یہ الزام لگایا تھا کہ اس نے ایک عریاں محفل میں شرکت کی تھی اس لیئے وہ طلاق چاہتی ہے۔

مقدمے کی سماعت کے بعد جیوری نے مدعی علیہ کو جب بری کر دیا تو جیوری جج اور اس کی حسین ٹائپسٹ گرل نے قہقہے لگاتے ہوئے کپڑے اتار پھینکے۔

انڈے پر سورج کا عکس

سیلون کے ایک مقام بیرہ والا میں آج کل ایک انڈا عوام کی دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ انڈا نہ تو کمیاب ہے اور نہ ہی قیمت میں زیادہ بلکہ معمولی قسم ہی کا ہے۔ لیکن اس پر سورج کا عکس نمایاں ہے۔ یعنے سورج نما گول حلقے کے اطراف بارہ بڑی اور ان کے درمیاں کئی ایک چھوٹی چھوٹی لکیریں ہیں۔ اس انڈے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ جب اس کو سورج کی طرف بتایا جائے تو اس پر ایک کمال دعب

نمایاں ہوتا ہے اور جب اوندھا دیں تو سفید دھبا دکھائی دیگا اور جب سورج نما جسے کو سورج کی طرف کر دیں تو سفید دھبا سورج کے حلقے میں دکھائی دیگا۔ بہرحال یہہ ایک عجیب وغریب چیز ہے جس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے سیلون کے عقلمند حیران ہیں۔

روحیں بھی کھاتی ہیں

آسام کے ایک مقام دھوبری سے اطلاع آئی ہے کہ عبدالغنی سرکار باشندہ پہاکو چاکو مرے بارہ سال گذر چکے تھے۔ اس کے ایک بیوی اور ایک چھوٹا بچہ تھا۔ ایک روز شام کے کھانے کے وقت ان دونوں نے دیکھا کہ دروازے سے قریب کوئی آدمی کھڑا ہے جو شکل وشباہت میں بلکل سرکار جیسا تھا اور اس نے ان دونوں سے کہا کہ تم تو اچھے اچھے کھانوں سے اپنا پیٹ بھر رہے ہو اور مجھ پر سات روز کا فاقہ گذر چکا ہے یہ سنتے ہی ماں اور بیٹا گھبرا گئے اور چلا کر رونا شروع کر دیا اس گریہ وزاری کے ساتھ ہی وہ شخص وہاں سے غایب ہوگیا۔ مرحوم کا بھتیجا عبدالغفور سرکار جب مکان لوٹا تو اس کو یہ قصہ سنایا گیا اس نے پورا گاوں چھان مارا۔ مگر کچھ نشان تک نہ ملا۔

دوسرے ہی روز عبدالغفور نے مولود شریف پڑھوایا اور اپنے ہمسایوں کو دعوت بھی دی۔ دعوت کے ختم پر ایک آواز آئی کہ ہاں آج مجھے پیٹ بھر کھانا ملا۔ یہ آواز عبدالغنی مرحوم کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔

قابض کا قبضہ بحال

ممالک متحدہ امریکہ میں اسلحہ سازی محض ایک حاملہ کتیا کی بدولت بند ہے یہ عجیب وغریب انکشاف نیویارک کے اخبار سے ہوا۔

اخبار مذکور لکھتا ہے کہ ۰۰۰،۰۰۵،۲۲۴ ڈالر کے

اسلحہ کی تیاری ..... سینٹ لوئی میسوری کا ایک کارخانہ بل ٹیریر (ایک قسم کی کتیا) کے بچے جننے کے انتظار میں بند ہے۔ کتیا کی مالکہ مسز مارٹ بونڈی سے ممالک متحدہ کی حکومت نے درخواست کی ہے کہ وہ فوری طور پر اپنا گھر خالی کر دے۔ اس لیے کہ وہ اس جدید فیاکٹری کا ایک حصہ ہے۔

لیکن حاجت وطن کی سب التجاؤں کو ٹھکرا کر مسز بونڈی ایک آرام کرسی پر بیٹھی یہی دھراتی ہیں کہ یہاں سے اس وقت تک نہ ٹلوں گی جب تک کہ میری عزیز کتیا مسٹری بچے نہ جنے اعلی عہدداروں نے بہت سی التجائیں کیں مگر مسز بونڈی ان سے یہی کہتی ہے پہلے میری مسٹری (؟) قانونی چارہ جوئی کے ختم ہونے کے بعد اب ایک تحریک ہوئی ہے کہ پریزیڈنٹ روزولٹ خود اپنی ذاتی درخواست اس عورت کے پاس روانہ کریں۔

فلمی خبریں

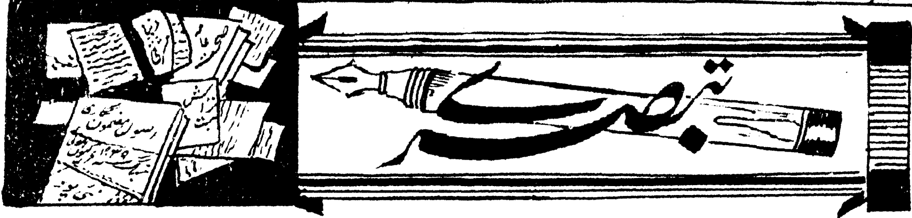
عشق اول در دل معشوق پیدا می شود

سانگر کی ایک لڑکی سلوچنا گاندھی نے پرکاش کے ایکٹر پریم ادیب کو ایک فلم میں دیکھا۔ اور دل وجان سے اس کی عاشق ہوگئی۔ پریم ادیب اس کے مکان سے دس میل کے فاصلے پر رہتا تھا۔ لڑکی اس کے گھر پہنچ گئی اور اس سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ چند ہی روز کی ملاقات میں پریم کا دل بھی اس پر آگیا۔ آخر میں شادی طے پائی۔ لڑکی نے پریم ادیب کو یاد کرایا تھا کہ وہ کنواری تھی۔

شادی کی غرض سے دونوں ایک مقامی آریہ سماج کے دفتر گئے پہنچے ان کی خواہش پر نکاح کی رسم بھی شروع ہو چکی تھی۔ اتنے میں ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور پروہت سے بیان کیا کہ یہہ نکاح جائز نہیں ہے اسلیے کہ سلوچنا ایک سیٹھ کی بیوی ہے اس خبر کے سنتے ہی آریہ سماج پروہت نے نکاح باندھنے سے انکار کر دیا۔ اسلیے کہ خاوند والی عورت کسی سے نکاح نہیں کر سکتی

تحقیقات پر معلوم ہوا کہ سلوچنا کی شادی ضرور ہوئی تھی لیکن اس کو شوہر سے علحدہ ہوئے چھ سات سال ہو گئے تھے۔ اور اب وہ اپنے شوہر سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اس کے دل میں سوائے پریم ادیب کے کسی اور کو جگہ نہیں مل سکتی۔ اس وقت بیچارے پریم ادیب کا حال مچھلی بن پانی کا سا ہے۔

جلد (۲) — ہندستانی ادب — اسفندار ۱۳۵۱ ف
نمبر (۴) — جنوری ۱۹۴۲ء



رسالے

صحت عامہ

بڑی تقطیع چندہ سالانہ للعہ قیمت، ایک پرچہ ۳ ر ایڈیٹر حکیم لئیق احمد خایق نعمانی، مقام اشاعت متصل ناکہ پل چادر گھاٹ حیدرآباد دکن۔

یہ پندرہ روزہ جریدہ تین مہینے سے نکل رہا ہے۔ جس کا مقصد ملک میں صحت عامہ سے متعلق پرچار کرنا ہے۔ اب تک جتنے بھی نمبر نکلے ہیں ان سے اس مقصد کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔ چونکہ اس جریدے کی ادارتی باگ ایک حکیم کے ہاتھ میں ہے اس لیے ہماری توقع بیجا نہ ہوگی کہ آگے چل کر یہ جریدہ اپنے اصلی مقصد میں کامیاب ہوگا۔

مشرقی دنیا

تقطیع کراؤن ۱/۸ چندہ سالانہ (سے) قیمت ایک پرچہ ۵ ر ایڈیٹر حرماں، خیرآبادی۔ لاہور کے اور رسالوں کی طرح یہ بھی ایک علمی ادبی، ماہوار رسالہ ہے جو تقریباً تین سال سے نکل رہا ہے ہمارے پیش نظر اکتوبر نومبر ۴۱ء کا مشترک نمبر ہے، جو ۸۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس نمبر کے مضامین اور نظموں سے ایڈیٹر کے پاکیزہ مذاق اور ذوق سلیم کا پتہ چلتا ہے رسالے کی لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے کاغذ کی اس طوفان خیز مہنگائی کے دور میں مذکورہ چندہ بہت ہی کم ہے۔ ہر صاحب علم کا فرض ہے کہ اس رسالہ کا خریدار بن کر ادب کی خدمت حقیقی معنی میں کرے

تعمیر

بڑی تقطیع قیمت ار چندہ تین روپیے —— ملنے کا پتہ۔ دلی ——

فینکس فاونڈیشن کا یہ ہفتہ وار چو صفحہ اخبار کچھ عرصہ سے نکل رہا ہے اس میں جنگی خبروں کے علاوہ مختصر سے مضامین اور بعض وقت نظمیں بھی ہوتی ہیں۔ اگر وقت کا خیال نہ ہو تو ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔

ہم اس اخبار کے اجرا کے اصلی مقصد سے واقف نہ ہوسکے۔ غالباً اس کا مقصد بھی وہی ہوگا جس ادارے کے تحت یہ اخبار نکلتا ہے۔ بہتر ہوتا ادارے کے مقاصد کو واضح کردیا جاتا۔

کتابیں

بت تراش

از اشتیاق حسین صاحب قریشی ام۔ اے صفحے ۲۴ قیمت ۴ ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دھلی

زیر نظر مختصر ڈرامہ اپنے موضوع بحث کے لحاظ سے دلچسپ ہے۔ ڈرامہ کا ہیرو بت تراش بخیال خود نازاں تھا کہ اس کے مجسمے جس طرح حسن ظاہری میں اکمل ہیں اسی طرح اگر اس میں روح پڑجاتی تو وہ اپنی حسن سیرت میں بھی کچھ کم نہ ہوتے آگے چل کر خلاق عالم پر اس نے چوٹ کی کہ اس نے دنیا میں انسان کے لیے رنج و آلام پیدا کرکے ایک بڑا ظلم کیا۔ اپنی مخلوق کے ساتھ اسے ایسی ہی محبت ہونی چاہیئے تھی، جیسی کہ اس بت تراش کو اپنے مجسموں سے ہے لیکن بت تراش کو اگرچہ عملاً نہیں ایک خواب کے ذریعہ یہ درس دیا جاتا ہے کہ خدا خیر محض ہے رنج و مصائب ہمارے افعال کا نتیجہ ہیں —— ہماری رائے ہے کہ اس قسم کے چھوٹے اور سستے ڈرامے سنجیدہ غور و فکر کے لیے [illegible]

ر۔ع۔م

اصول مضمون نگاری

اے ایچ ۔ صدیقی، امرت سری ۔

صفحے ۴۸ قیمت ۶ ر ۔ اس مختصر سی کتاب میں مضمون نگاری کے اصول صرف چار صفحے ہی میں بیان کیے گئے ہیں ۔ باقی ماندہ حصے میں چند غیر ضروری عنوانات مثلاً "لکچراروں اور واعظوں کے لیے ہدایتیں"، "شعر و شاعری کے اقسام" "حروف شمسی و قمری" وغیرہ درج ہیں اس کے ماسوا کتاب کے بیشتر حصے میں اردو کی "تشبیہات و نکات" اور "تلمیحات" کی ایک لمبی فہرست مع اس کی شرح کے دی گئی ہے، جس کی یہاں کوئی ضرورت ہی نہیں تھی ۔ بہتر ہوتا اگر قابل مصنف، مضمون نگاری کے اصول کی تحقیق کر کے اس کتاب میں مبسوط طریقہ پر بیان کرتے ۔

جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی

شیخ رحمن بخش ۔ بی، اے ال ال ۔ بی ۔ (عبد الحق اکیڈمی ۔ حیدرآباد دکن) قیمت عہ ۸ ر صفحے ۱۹۲

زیر نظر کتاب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ۔ مسائل حاضرہ پر ایک دلچسپ کتاب ہے ۔ کتاب کے شروع میں تقریباً پچاس صفحوں تک ہٹلر اور فرعونیت کے عنوان سے ایک غیر دلچسپ تعریف کتاب ادارے کی جانب سے تحریر کیا گیا ہے اس سے اصل کتاب میں قارئین کو واقعی دلبستگی پیدا ہو سکتی ہے ۔ قابل مصنف نے دوران جنگ میں یورپ کے حالات کو تو تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن "جنگ اور ہندستان" کے مسئلے کو حد درجے تشنہ رکھا گیا ہے ۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے جنگ کے نقطہ نظر کی بھی وضاحت نہیں کی گئی ۔ تاہم جو لوگ اخبار ہی سے نہیں پڑھتے انہیں جنگی خبروں کا ایک دل ... ہی مل جائے گا لیکن باوجود اس کے ہم اس ... [illegible] ... کے

کہ "جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی" ؟

نئی پود

از ہر قدوائی ۔ شرکت ادبیہ دہلی ۔
قیمت عہ ر ۱۶۶ صفحے

ٹائیٹل پیج پر ایک طرف ایک خشک پیڑ دکھایا گیا ہے جس پر بجلی گر رہی ہے ۔ اور دوسری طرف "نئی پود" خط کوفی میں کچھ اس انداز سے لکھا گیا ہے کہ یہ مجموعہ اضداد ظرافت کا پہلو نمایاں کرتا ہے ۔ یہ کتاب ازہر قدوائی صاحب کے مضامین اور افسانوں کا ایک حسین مرقع ہے جس میں "نئی پود" کے نام سے ایک مختصر سا ڈرامہ بھی ہے جو اس کتاب کا عنوان ہے ۔

یوں تو سب افسانے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہتر ہیں لیکن ہمیں "ابن رئیس"، "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ ....."، "دادی اماں" اور "موت" زیادہ پسند آئے ۔ ازہر صاحب اپنی خاص طرز کے مالک ہیں ۔ جس سے ان کی ادبی قابلیت کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ ان کے طرز بیان کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے کردار سے سارے واقعات کچھ اس طریقے پر کہلواتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا خود اس کے سامنے بیٹھا سن رہا ہے ۔ پورے مجموعے میں قدیم اور جدید تسم کے لوگوں کی اچھائیاں اور برائیاں اس خوبی سے دکھائی گئی ہیں کہ مجاز بھی حقیقت نظر آتا ہے ۔ محاورے، ضرب الامثال، زبان کا چٹخارا، اور ظرافت کی چاشنی بھی جابجا مزا دیتی ہے ۔ ہم مصنف کو ان کی اس کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں ۔ (ا ۔ ح)

ادب حیدرآباد دکن
قیمت فی پرچہ ۶

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۸۴)
رجسٹرڈ برطانیہ (ایم ۴۴۴۳)
چندہ سالانہ (للعہ)

ہندستانی ادب

ایڈیٹر ۔ غلام محمد خاں ایم۔اے (عثمانیہ)

جلد (۲) نمبر (۵)

فروردی ۱۳۵۱ ف فروری سنہ ۱۹۴۲ عیسوی

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

ہندستانی اور گاندھی جی

ہم کہتے تھے زمین گول ہے۔ پر آپ نہ مانتے تھے۔ کیوں گاندھی جی اب تو آپ کا شبہہ دور ہو گیا نا؟ ہر پھر کر آخر آپ خود ہی مرکز پر آ گئے جس پر آپ کو آنا چاہیے تھا۔

"آگے چل کر انہوں نے فارسی آمیز اردو، سنسکرت آمیز ہندی کے رجحان پر اظہار افسوس کیا اور اپیل کی کہ یہہ روش چھوڑ دیں اور سادہ ہندستانی زبان بنائیں جو عام طور سے سمجھی جا سکے۔"

یہہ ہے وہ خبر جو یونائیٹڈ پریس نے دی ہے اور جس کو گاندھی جی نے بنارس کی سلور جوبلی کے موقع پر اپنے خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا۔ گاندھی جی یہہ تو آپ نے سچے کی بات کہی جو ایک محب قوم کو وطن کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہنی چاہیے تھی۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں اور ہر ہندستانی کو بھی یہی چاہیے کہ اسی جذبے اور خیال پر عمل کرے۔ ہم ان تمام نام نہاد لیڈروں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر زبان کے مسئلے کو پہلے حل کر لیا جائے تو ہندستانی سیاست کی نصف سے زیادہ الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔

مگر گاندھی جی ہم آپ سے یہہ دریافت کرتے ہیں کہ اگر واقعی آپ ایک سیدھی سادی زبان یعنی ہندستانی کے قایل ہیں اور اس طرح ملک کا ایک بڑا جھگڑا چکانا چاہتے ہیں تو پھر آپ نے طلبا کو یہہ کیا مشورہ دیا کہ "تم ہندی، ہندستانی، اردو، سنسکرت یا کوئی دوسری زبان اس موقع پر استعمال کرتے"۔ گاندھی جی سنسکرت کو ایک مستقل زبان ہم بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن آپ نے ہندی اردو اور ہندستانی میں تفریق کیوں پیدا کی۔ کیا یہہ بہتر نہ ہوتا کہ آپ صرف ہندستانی کا لفظ ہی استعمال کرتے اور اس طرح ہندی اردو کے قضیے کا اعادہ نہ ہوتا۔ یہہ آپ کی گول گول باتیں نہ کسی کی سمجھ میں آ سکیں اور نہ ہم ہی سمجھ سکے۔ جب یہہ تصفیہ کرنا ہے تو صرف ایک لفظ استعمال کیجیے جو ان تمام جھگڑوں کو دور کر سکتا ہے۔ اور وہ صرف "ہندستانی" کا لفظ ہے۔

آپ نے اس خصوص میں اب تک کئی رنگ بدلے تھیا۔ پہلے آپ شدّ و سنسکرت آمیز ہندی کے دلدادہ تھے اس کے بعد آپ نے ہندی کا پرچار فرمایا جب یہاں بھی کچھ نہ چلا تو "ہندی ہندستانی" یا "ہندی یعنی ہندستانی" پر اتر آئے تھے اور یہہ ایسی مرکب المرکب ترکیب تھی کہ جس کو شاید خود آپ نہ سمجھ سکے چونکہ فرمایا ہوا آپ کا تھا اس لیے عرصے تک آپ اس پر اڑے رہے۔ اور جب دال گلتی نظر نہ آئی تو "سادہ ہندستانی زبان" بنانے کا صحیح، نیک اور صائب مشورہ دیا۔ ہم آپ کے اس زریں مشورے کا پرجوش اور دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور آپ سے ہماری درخواست ہے کہ اب آپ اپنے اس اعلیٰ خیال پر قایم ہو جائیں اور اپنے تمام پیروں کو ہدایت فرمائیں کہ ملک اور قوم کی بھلائی کی خاطر وہ ہندی اردو کے جھگڑوں کو چھوڑ کر ملک کی عام فہم زبان یعنی "ہندستانی" کے بنانے میں مصروف ہو جائیں۔

گاندھی جی! آپ ہندستان کے مسلمہ طور پر ایک بڑے لیڈر ہیں۔ ممکن ہے مذہبی اختلافات کے باعث ایک طبقہ اس نظریے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو لیکن اس کے باوجود آپ کی عظمت و بزرگی اور آمریت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ایک ایسی بڑی ہستی سے ہمارا اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ زبان کے جیسے ٹیڑھے مسئلے کو سلجھا کر ملک میں امن عامہ کا باعث بننے کی بیجا نہ ہوگا۔

گاندھی جی! آپ چراغ سحری ہیں۔ آپ کی عمر کا جام لبریز ہوئے عرصہ ہوا اس لیے آپ اس موقع کو غنیمت جان کر زبان کے جھگڑے کو مٹا دیجیے اور یہہ کام صرف آپ ہی سے ہو سکتا ہے۔ آپ کے بعد نہ کوئی گاندھی پیدا ہو سکتا ہے اور نہ یہہ قضیہ ختم ہو گا۔ یہہ مسئلہ زیادہ مشکل نہیں۔ یہہ ایک سیدھی سادی بات ہے کہ ہر ملک کی زبان اسی ملک کے نام سے موسوم ہوا کرتی ہے اس لیے ہندستان کی زبان کا نام سوائے "ہندستانی" کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اب رہا یہہ سوال کہ زبان کیسی اور کیا ہونی چاہیے، اس کا حل ماہرین فن کی ایک ملی جلی کمیٹی معلوم کر سکتی ہے۔ اگر یہہ کام بھی جلد سے جلد شروع ہو جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ نام اور زبان کی نوعیت کا جھگڑا چکانے کے بعد رسم خط کا ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے۔ اس بارے میں ہمارا یہہ مشورہ ہے کہ فارسی اور ناگری دونوں قسم کے رسم خط کی اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن کسی حال رومن رسم خط کو معرض بحث میں نہ لایا جائے جیسا کہ بعض مشاہیر کا خیال ہے ہم کہتے ہیں کہ فارسی، ناگری نہ سہی تلنگی رسم خط کیوں نہ ہو --- ہونے دو اپنا ہی تو ہے پردیسی تو نہیں۔ اس لحاظ سے رسم خط کا مسئلہ بھی آسانی کے ساتھ طے ہو جا سکتا ہے صرف ضرورت ہے توجہ کی اور وہ بھی آپ کی خاص نظر عنایت کی۔

ہمیں کامل یقین ہے کہ جس طرح خود آپ نے ایک اہم اور دیرینہ مسئلے کے سلجھاؤ کی چھیڑ کی ہے آخر کار اس کی یکسوئی فرمادیں گے ۔

صنعتی نمبر } اگرچہ حالات اجازت نہیں دیتے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے معمولی اور مقررہ حجم میں ایک جز کی کمی کرنے پر مجبور ہوے ۔ آج کاغذ کی قیمت بیس روپیے ریم ہے نہ معلوم کل کیا ہو ۔ اس کا بھی اندیشہ لگا ہوا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ دام دینے پر بھی کاغذ نہ مل سکے ۔ بہر حال ان تمام مشکلوں اور اندیشوں کے باوجود ہم نے اپنا ایک خاص تیسرا نمبر نکالنے کا فیصلہ قطعی طور پر کرلیا ہے اور جیسا کہ اس پرچے میں اعلان بھی کیا گیا ہے ۔ ہمارے آنے والے مہینے کا پرچہ "صنعتی نمبر" ہوگا ۔

اس زمانے میں اہل صحافت اور خصوصاً ماہوار رسالوں کو سوا ے گنوانے کے چارہ ہی نہیں ۔ روزانہ اور ہفتہ وار پرچے اگر اپنی قیمت بڑھا بھی دیں تو ہاتھوں ہاتھ نکل جائیں گے ۔ لیکن اگر کوئی ادبی رسالہ اس گستاخی کی جرأت کر بیٹھنے کا خیال ہی کرلے تو پھر خریداروں کی طرف سے گرم جوشانہ طریقے پر بائکاٹ مہم شروع ہو جاتی ہے ۔

حجم میں کمی } ہم نے پچھلے نمبر ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ ہمارا اس مہینے کا پرچہ صرف تین جز پر نکلے گا ۔ چنانچہ اسی اعلان کی اتباع میں ہم یہہ نمبر ۴۸ صفحے کا پیش کر رہے ہیں ۔ جی تو نہیں چاہتا تھا کہ کسی طرح حجم میں کمی کیجاے مگر افسوس کہ حالات نے ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا اس میں شک نہیں (۱۶) صفحے کی کمی بظاہر کردی گئی ہے لیکن اصل میں اس کمی کا ازالہ بڑی حد تک کر دیا گیا ہے وہ اس طرح کہ پہلے ہمارا صفحہ ۲۰ سطری تھا مگر اس نمبر سے ۲۹ سطری کر دیا گیا ہے لہذا ۲½ صفحے کی تکمیل اس طریقے پر ہو گئی ۔ اس کے علاوہ لکھائی بہت زیادہ گتھی ہوئی ہے تقریباً چار صفحے میں ایک صفحے کے مواد کی گنجایش نکالی گئی ہے ۔ بہر حال اس طرح ۸ صفحے کی پابجائی کر دی گئی ہے ۔ اس حساب سے حقیقت میں ۱۶ نہیں بلکہ صرف ۸ صفحے کی کمی عمل میں آئی ہے ۔ حالات حاضرہ اور کاغذ کی بڑھتی ہنگائی کا لحاظ کرتے صرف ۸ صفحے کی کمی ہم سمجھتے ہیں کہ ہر طرح سے قابل نظر انداز ہے ۔ ہمیں قوی ترین توقع ہے کہ ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں کو ہمارے اس طرز عمل سے ہرگز شکایت کا موقع نہ ملے گا ۔

شاعروں سے } ہر شاعر اپنا مقام بنانے کی کوشش کرتا ہے ۔ نظم یا غزل کے ساتھ یہ لکھا جاتا ہے کہ "اسکو کسی خاص مقام پر جگہ دیجاے" ۔ ایسے حضرات سے ہم یہہ عرض کرتے ہیں کہ ہندستانی ادب کے صفحے اپنی حد تک مساوات کا سبق دیتے ہیں ۔ کسی کو خاص کسی کو عام بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی ۔ چنانچہ اس نمبر میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ایک کہنہ مشق اور مشہور و معروف شاعر علی اختر کے کلام کے برابر برابر ایک نوجوان مگر اچھے شاعر سلام کے نتایج فکر کو جگہ ملی ہے ۔ اس میں ہماری کوشش کو کوئی دخل نہیں ۔ بلکہ نوجوان شاعر کے کلام کو کہنہ مشق شاعر کے کلام نے خود اپنی طرف کھینچا ہے ۔ بہر حال ہندستانی ادب کے لکھنے والے شاعروں کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ جب تک کسی کا کلام ہمارے معیار پر نہ اترے ہم اس کو جگہ نہیں دیتے ۔ اب جب چھپ جاے تو پھر یہاں اور وہاں کے فرق کو مٹا دینا چاہیے سچ تو یہہ ہے کہ کاغذ کی غیر معمولی قیمت نے ہمیں بہت زیادہ کفایت شعار بلکہ کنجوس بنا دیا ہے ۔ اس لحاظ سے آپ ایسی جزیات کو خاطر میں نہ لائیں ۔

شکایتیں } حیدرآباد سے باہر رہنے والے بعض حضرات اور غیر عثمانیوں کی ہم سے یہہ شکایت ہے کہ رسالے میں زیادہ تر عثمانین یا حیدرآبادیوں کے مضامین اور کلام کو جگہ دیجاتی ہے اور دوسروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے اس قسم کے دو چار خط پہلے بھی آے تھے لیکن ہم نے ٹال دینا ہی مناسب سمجھا تھا اب جبکہ پچھلے دو مہینوں میں اور بھی دو چار خط اس قسم کی شکایتوں کو لیے ہوے آے تو آخر ہم یہہ جواب دینے پر مجبور ہو گئے ۔

اول تو یہہ شکایت ہی غلط ہے کہ عثمانین یا حیدرآبادیوں کو جگہ دینے کی خاطر دوسروں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ اگر لکھنے والوں کو کسی رسالے کے ادارے سے دور کا بھی لگاو ہوتا تو وہ ایسی شکایت کبھی نہ کرتے وہ کیا جانیں کہ مشہور مشہور شاعروں کا کلام اور مضمون نگاروں سے مضامین حاصل کرنے میں کتنی بھیانک اور پرخار وادیوں میں سے ہو گذرنا پڑتا ہے لیکن ان صعوبتوں کے برداشت کرنے کے بعد بھی ہم کامیابی کے ساتھ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے ۔ ایسی صورت میں کسی کا ہم پر یہہ الزام دھرنا کہ ہندستان کے چوٹی کے شاعروں اور مضمون نگاروں کے افکار عالیہ کیوں نہیں حاصل کیے جاتے ــــ کس حد تک بجا ہو سکتا ہے ؟ رہا یہہ سوال کہ عثمانین کے مضامین زیادہ کثرت سے دیے جاتے ہیں تو ہم یہہ عرض کریں گے کہ یہہ بیچارے [illegible] کے میدان میں زوروں پر چوگان بازی کر رہے ہیں [illegible] یہہ ہو سکتا ہے اس لیے اکثر میدان انہیں کے ہاتھ رہتا ہے اور [illegible] جدا ہوتا ہے ۔ اگر ایسی صورت

کارناموں کو اجاگر کرنے کے لیے مادر جامعہ کا حوالہ دیتے ہیں اور کسی کی آنکھوں میں ان کا یہ فعل کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ لہذا نام کے ساتھ (عثمانیہ) لکھنا کوئی جرم یا گناہ تو نہیں ہو سکتا، شاید ہمارے معترضین بھول رہے ہیں کہ ہندستانی ادب میں جامعہ علیگڑھ کے اکثر فارغ التحصیل کے مضامین نیز دلی، لکھنو، الہ آباد، سی پی، یو۔پی اور پنجاب کے اکثر مضمون نگاروں اور شاعروں کے نتایج فکر وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہتے ہیں۔

خواتین } اس طبقے سے ہم بارہا اپیل کر چکے ہیں کہ وہ اپنی قلمی کاوشوں سے ہندستانی ادب کے صفحوں کو زینت دیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خواتین میں بہترین شاعر اور مضمون نگار بھی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ خالص علمی ادبی رسالے ان کی عنایتوں سے محروم رہتے ہیں۔ خواتین کے لیے بعض مختص رسالے موجود ہیں جن میں کثر و بیشتر مضامین انہیں کے قلم سے ہوتے ہیں لیکن ہمارا یہہ کہنا ہے کہ وہ رسالے ہمارے مقصد کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ اس لیے تعلیم یافتہ اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کا فرض ہے کہ وہ اعلیٰ ادبی رسالوں کی ہر وقت قلمی معاونت کرتے رہیں۔ اس خصوص میں "ہندستانی ادب" انہیں دعوت عمل دیتا ہے اور خاص طور پر درخواست کرتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین اس طرف ضرور توجہ فرمائیں۔

ہم طبقۂ اناث کی ہر جہتی فلاح و بہبود کے دل سے آرزومند ہیں اور ہماری یہہ تمنا ہے کہ عورتیں بھی ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش خدمات انجام دیں۔

آخر میں ہم ان حضرات سے مخاطب ہیں جنہیں اس بات کی شکایت ہے کہ "خواتین کے چھوٹے چھوٹے مضامین دینے سے کیا حاصل۔ کیا اس طرح ان کی ہمت افزائی ہو سکتی ہے اس سے تو بہتر یہہ ہوتا کہ چار چھوٹے مضامین کی بجائے کسی ایک مرد کا بہتر مضمون دے دیا جاتا"! ہمیں مردوں کی ایسی تنگ نظری اور کوتاہ ذہنیت پر افسوس ہے۔ ہمارا مسلک یقیناً اس طبقے کی حوصلہ افزائی ہے اور ہم خواتین کے ہر قسم کے مضامین کو جگہ دینے کے لیے ہمکنا ہے۔ "ہندستانی ادب" صرف مردوں ہی کے لیے مختص نہیں ہے بلکہ ہر دو آ ب نے یافتہ افراد کی آؤ بھگت کے لیے تیار رہے۔

سنسکرت آمیز ہندی کے بیت | ہمیں یہہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ بعض رسالوں اور خصوصاً بمبئی کے ہفتہ وار پرچوں نے غیر ضروری طریقے پر انگریزی کے استعمال کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ مثلاً سرورق پر خصوصیت کے ساتھ انگریزی کی بچہ کاری کی جاتی ہے۔ ایڈیٹر کا نام، رسالے کا نام، نمبر، جلد اگر تصویر ہو تو اس کا نام اور تفصیل۔ رسالے کا مقام اشاعت دفتر کا پورا پتہ، آخری صفحے کی ہر تحریر اور خصوصیت کیساتھ ہر تصویر کے نیچے نام اور اس کی وضاحت محض انگریزی میں ہوا کرتی ہے ـــــ ہم یہہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس بے تکے فیشن کی بھرمار کیوں ـــــ کیا مطابع میں اتنی محتاجی ہے کہ اس معمولی سی ضرورت کے لیے اس رسم خط میں ٹائپ نہیں ملتا یا ان حضرات کا یہہ نظریہ اور تصور ہے کہ ان کے رسالوں کے سو میں سو پڑھنے والے انگریزی جانتے ہیں یا ان کے رسالوں کی خاطر جاننا ضروری ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہہ ایک قسم کی بدعت بلکہ ہندستانی صحافت پر ایک دھبہ ہے جس کو دور کرنا ایسے سب حضرات کا اولین فرض ہے۔ بعض رسالے اپنے خاص نمبر نکالتے ہیں اور خاص طور سے خاص نمبر کا نام صرف انگریزی میں دیتے ہیں۔ اسی طرح رسالوں کے کمر بند اور خطوں پر پورے کا پورا پتہ انگریزی ہی میں لکھنا ضروری ہے بھی یا نہیں ـــــ غور طلب ہے! ہم یہہ کہتے ہیں کہ ـــــ ہندستانی زبان میں پتہ لکھا کیجے اور دیکھیے ٹپہ خانہ آپ کی خدمت بجا لاتا ہے یا نہیں جب آپ کی ضرورت اس سے پوری ہو سکتی ہے تو پھر انگریزی میں پتے لکھنے کی زحمت کیا معنی رکھتی ہے؟

ہمیں توقع ہے کہ ہماری اس تحریر کو پڑھنے والا ہر شخص آیندہ سے ہمارے ناچیز مشورے پر ضرور عمل کرے گا۔ اس لیے کہ یہہ طریق عمل بھی زبان کی حقیقی خدمت کا باعث ہو سکتا ہے۔

خریداروں سے | ہم نے بارہا اپنے خریداروں کو توجہ دلائی ہے کہ نقل مقام کی صورت میں ہمیں ساتھ ہی اطلاع دیدیں تاکہ آپ کے نئے پتے پر رسالہ بھیجا جا سکے۔ لیکن افسوس ہے کسی صاحب نے اب تک اس کی پابندی نہیں کی۔ ہم رسالہ تو ہر مہینہ پابندی کے ساتھ آپ کے لکھائے ہوئے پتے پر روانہ کر دیتے ہیں۔ لیکن آپ کی عدم موجودگی کے باوجود وہ رسالہ ہمارے دفتر کو واپس نہیں کر دیا جاتا ایسی صورت میں ہمیں ٹپہ خانے سے بھی بجا طور پر شکایت ہو سکتی ہے۔ بہر حال ہم اپنے خریداروں سے مکرر درخواست کرتے ہیں کہ پتہ بدلنے کی صورت میں دفتر کو فوراً اطلاع دیدیں۔

رباعی اور اس کی اہمیت

رباعی شاعری میں سب سے چھوٹی نظم ہے جو کسی معین موضوع پر لکھی جاتی ہے۔ یہ نظم کی مختصر سی صنف ہونے کے باوجود اس کوزے میں سمندر بند ہوتا ہے جس کے جزرومد کی کوئی انتہا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی کو دوسرے اصناف کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دقیق فلسفیانہ خیال، باریک سے باریک صوفیانہ مسئلہ یا نازک ترین اخلاقی نکتہ ان چار مصرعوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ صنف، شاعر کے صرف ایک تصور کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے وجود میں آنے کی خاص وجہ یہی ہے کہ بعض وقت شاعر کی طبیعت کسی طویل نظم لکھنے کے لیے تیار نہیں رہتی، ایسے لمحے میں اگر کوئی شدید احساس تصور یا خیال اس کے ذہن میں آجاسے تو وہ آسانی سے چار مصرعے موزوں کرکے اس خیال کو ظاہر کرسکتا ہے۔

فنی حیثیت کے اعتبار سے بھی رباعی کی صنف شاعری کی تمام اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، قطعہ اور مثنوی سے مشکل ہے اور اپنی اصطلاحی خصوصیات جیسے قافیے کی ترتیب وزن اور تکمیل کے علاوہ آرٹ یعنے خیال کو موزوں جامہ پہنانے میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان امور کا تذکرہ بلاغت کی بعض کتابوں میں جستہ جستہ اور منتشر ملتا ہے تاہم ایک پس منظر کے طور پر ان خصوصیات کا یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

رباعی میں سب سے اہم چیز اس کا وزن ہے جو بحر ہزج سے مشتق ہے۔ اس بحر میں رباعی کے علاوہ غزل، قصیدے، قطعے وغیرہ بھی لکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس کے چند اوزان قدیم ہی سے رباعی کے لیے مخصوص کردیے گئے ہیں اور عام طور پر ان میں دوسری صنفوں کا کلام نہیں لکھا جاتا۔ وزن کی اس تخصیص کی وجہ سے رباعی کو دوسری تمام صنفوں سے ممیز کرنا بہت آسان ہوگیا ہے خاص طور پر دوبیتی قطعے سے جو اتفاقاً بعض وقت رباعی سے مشابہ وزن اور قافیے کی ترتیب اختیار کرلے، ایسے قطعات پر بعض وقت رباعی کا دھوکا ہوگیا ہے۔ چنانچہ دیوان درد اور دیوان اثر میں ایسی دوبیتی غزلوں کو بھی جو رباعی نہیں ہیں رباعی کے عنوان کے تحت شامل کرلیا گیا ہے لیکن یہ سارے شبہے اس کے وزن کی وجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔

رباعی کی ایک دوسری خصوصیت قافیے کی ترتیب ہے ردیف کو ہم نے یہاں اس لیے نظر انداز کردیا ہے کہ وہ شعر کا کوئی لازمی جز نہیں۔ رباعی میں قافیے کی ترتیب ذیل کے نقشے سے آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہوسکتی ہے۔

.... ا .... ا

.... ب .... ا

اس میں اگویا ایک پورے قافیے کا قائم مقام ہے اس میں رباعی کی شکل کی حدبندی ہوجاتی ہے۔ قافیے کی یہ ترتیب ممکن ہے کسی ایسی غزل میں رونما ہوجاسے۔ جس میں شاعر نے صرف دو شعر یعنے مطلع اور ایک شعر لکھدیا ہو یا کسی انتخاب کرنے والے نے مطلع اور ایک شعر کا انتخاب کرلیا ہو جیسا کہ غالب کے منتخب دیوان میں بعض جگہ ہوا ہے۔ ایسی صورت میں رباعی کا وزن تصفیہ کن جز ہوگا۔ رباعی کے وزن پر قصیدے یا غزلیں نہیں لکھی جائیں لیکن اس میں شک نہیں کہ بعض شعرا نے ایسی جدت سے کام لیا ہے مگر اساتذہ کے پاس ایسی چیزیں بہت زیادہ مستند نہیں سمجھی گئیں۔ قصیدے کے دو اشعار کا انتخاب کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ قصیدے مربوط ہوتے ہیں۔ غزل میں یہ ہوسکتا ہے لیکن عام طور پر غزل کے ہر شعر کا موضوع جدا ہوتا ہے۔ اگر ایسی صورت

کسی مسلسل غزل میں پیش آسے (؟) اس کا وزن رباعی کے مماثل ہو تو ہم سمجھتے ہیں (؟) اس کو رباعی کے تحت شمار کرنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن ہماری شاعری میں ایسا اتفاق آج تک نظر نہیں آیا۔

رباعی میں ردیف کا التزام نہیں رکھا جاتا تاہم اس کی ممانعت بھی نہیں ہے بلکہ شاعر کے لیے یکساں آزادی ہے (؟) چاہے وہ ردیف رکھے یا محض قافیہ پر اکتفا کرے۔

اساتذہ نے رباعی کے لیے مضمون کی کوئی قید مقرر نہیں کی چنانچہ فارسی میں بھی اور خاص طور پر اردو میں شعرا نے نہایت وسیع مضامین پر رباعیاں لکھی ہیں۔ یہ طرہ امتیاز صرف رباعی ہی کو حاصل ہے کہ اس میں ہر نوع کے مضامین باندھے جا سکتے ہیں۔ اس صنف میں شاعر کی جولانی طبع کبھی بھی محدود ہو کر نہیں رہتی۔ یہ چیز قصیدے، غزل یا مثنوی کو حاصل نہیں۔ قصیدے میں حمد، مدح، یا ذم کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ غزل ابتدا ہی سے عشق و عاشقی اور محبت کے سچے جذبات کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس میں قلبی کیفیات اور احساسات سے بہت کم گریز کیا جاتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک اس میں محبت کی چاشنی نہ ہو وہ بے مزا معلوم ہوتی ہے۔ مثنوی کی حیثیت داستان گوئی سے بڑھ کر نہ تھی۔ مولانا روم نے مثنوی کو تصوف کے سانچے میں ڈھال کر حسن معراج کمال پر اسے پہنچایا اس کے بعد سے ادب میں اس کو ایک خاص درجہ حاصل ہو گیا۔ جس کے نمونے دنیا کے دوسرے ادب میں بھی شاید کم دستیاب ہوں۔ برخلاف اس کے رباعی میں مضامین کی کوئی حد بندی نہیں۔ اس میں عشق و محبت، شکایت زمانہ، تصوف و اخلاق وغیرہ ہر قسم کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔ تاہم ان وسیع موضوعوں میں ایک چیز جو مشترک معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ رباعی کا موضوع یا کم سے کم اس کے پیش کرنے کا انداز راجع الی الفاعل ہوتا ہے۔ فارسی میں عمر خیام نے رباعی کو خمریات اور سرمد نے تصوف کے لیے مخصوص کر لیا تھا اردو میں سوائے امجد کے تمام شعرا جن کو رباعی لکھنے پر قدرت حاصل ہے۔ عام مضامین ہی پر رباعیاں لکھتے ہیں۔

تکمیل یعنی رباعی کا سرانجام ایک نہایت ہی نازک اور مشکل مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس کا وزن ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے مصرعہ مقررہ اوزان سے خارج ہو سکتا ہے بعض رباعی گو شعرا پر نقادوں نے بری طرح اعتراض کیے ہیں۔ وزن کا خیال شاعر کے ذہن میں زندہ احساس کے طور پر اگر موجود رہے تو یقین ہے کہ شعریت کے لحاظ سے عمدہ رباعی نہیں لکھ سکیگا اس لیے اس وزن کا اس کی روح میں پیوست ہو جانا ضروری ہے جیسا کہ خیام اور سرمد اور امجد کا حال ہے۔ جب یہ وزن طبیعت پر چھا جاتا ہے تو عموماً دیکھا گیا ہے کہ شاعر کو کسی اور صنف میں لکھنے کا لطف نہیں آتا۔

اردو زبان میں امجد ہی ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے رباعی کو اپنا مستقل فن بنا لیا ہے۔ اردو کے تمام قدیم اور جدید شاعروں میں اپنی رباعی کی بدولت انہوں نے ایک خصوصی مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ ہندستان کے گوشے گوشے میں ان کی شاعری کی ساحری پہنچ چکی ہے۔ درحقیقت ان کے پاکیزہ اور حکیمانہ کلام نے اس صنف کو معراج تک پہنچا دیا ہے۔ اردو میں تو انکی ٹکر کا کوئی رباعی گو شاعر نہیں البتہ فارسی اساتذہ کے مقابلے میں ان کا اپنا خاص ممتاز رنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کے انمول نمونوں کو پڑھ کر لوگ سر دھنتے ہیں۔

اس صنف میں ایک اور چیز مضمون ہے۔ رباعی میں صرف ایک مضمون اور ایک نکتہ بیان کیا جاتا ہے۔ اگر اس میں کئی مضامین آجائیں تو اسکو اس صنف سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں مضمون کو روشناس کیا جاتا ہے، بعد کے دو مصرعوں میں انکو نشو و نما دیکر آخری مصرعہ میں شاعر اسکو ختم تک پہنچا دیتا ہے۔ اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ شاعر کو نہایت اختصار اور سمجھ بوجھ سے کام لینا پڑتا ہے۔ اسے جو کچھ کہنا ہو صرف چار مصرعوں کے اندر اندر کہنے پر مجبور رہے اسی لیے عام طور پر شعرا رباعی کو اپنی مخصوص صنف نہیں بنانا چاہتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکے لیے مخصوص طبعتیں ہوتی ہیں۔ جب تک شاعر کو اس صنف سے فطری لگاو نہ ہو وہ ایک کامیاب رباعی کا شاعر نہیں بن سکتا۔

امیر محمد حنیف
ام۔ اے (عثمانیہ)

آہ جوانی!

یاد ہیں اختر مجھے اب بھی جوانی کے مزے
وہ جوانی کے مزے تھے زندگانی کے مزے

زندگی افسانہ ہے، عہد جوانی شام عیش
ہیں اسی شب کی فضا میں اس کہانی کے مزے

عشق اور اس کے لطایف خواب ہو کر رہ گئے
بجھ گئے وہ ولولوں کی پرفشانی کے مزے

اف کسی کا خندۂ پنہاں وہ ہنگام سکوت
ہائے وہ تقریریں گوہر فشانی کے مزے

التفات یار پر اکثر گمان اجتناب
وہ ہجوم شوق اور وہ بدگمانی کے مزے

اب کہاں وہ عیش کی راتیں بہاروں کے وہ دن
بادہ نوشی کے لطیفے، یاد خوانی کے مزے

وہ کمال غم میں ہونٹوں پر تبسم کی جھلک
وہ ہجوم بیکسی میں کامرانی کے مزے

زندگی طوفان کی موجوں سے ٹکراتی ہوئی
وہ کلاہ فخر میں تاج کیانی کے مزے

درد پنہاں میں سکون زندگی کی لذتیں
زہر غم میں وہ شراب ارغوانی کے مزے

وہ نظر ملتے ہی نظروں میں ہجوم رقص برق
دل فروشی کے زمانے، جاں فشانی کے مزے

ہائے وہ بیتابیاں وہ اہتمام شام وصل
میزبانی کی وہ خوشیاں، میہمانی کے مزے

وہ حدیث شوق سن سن کر کسی کی شوخیاں
مسکراتی جھومتی، گاتی، جوانی کے مزے

خاک ہو کر رہ گئیں عہد طرب کی لذتیں
درد بن کر مٹ گئے وہ شادمانی کے مزے

حسن بھی اختر نہیں اب مژدۂ ذوق حیات
اب کہاں وہ زخم قلب و خونچکانی کے مزے

علی اختر

مرے جلے

پھر یوں مرے خیال میں آنے لگے ہو تم
اک حشر ہر قدم پہ اٹھانے لگے ہو تم

دامان ضبط ہاتھ سے پھر چھوٹنے کو ہے
یعنی پھر اپنا رنگ جمانے لگے ہو تم

پھر ڈھونڈنے لگی ہے تمہیں ہر طرف نگاہ
پھر ہر طرف مجھے نظر آنے لگے ہو تم

پھر وہ نیاز و ناز کی دلچسپ صحبتیں
بھولا نہ تھا کہ یاد دلانے لگے ہو تم

پھر ایک گریز کی سی ہے ملاقات میں جھلک
پھر میرا اشتیاق بڑھانے لگے ہو تم

پھر ایک کشمکش میں گذرنے لگا ہے دن
پھر ساری ساری رات جگانے لگے ہو تم

پھر لب پہ سرد سرد سی آہیں ہیں بار بار
پھر دھیمی دھیمی آگ لگانے لگے ہو تم

پھر دل بجھا بجھا سا نظر ہے اداس اداس
احساس زندگی ہی مٹانے لگے ہو تم

پھر ہیں وہی ستم وہی بے التفاتیاں
پھر وعدے اپنے بھولتے جانے لگے ہو تم

پھر میں اٹھا رہا ہوں کشش انتظار کی
پھر مجھ کو اپنی راہ دکھانے لگے ہو تم

پھر جس قدر "قریب" ہوا چاہتا ہوں میں
اتنا ہی اور "فصل" بڑھانے لگے ہو تم

اک "قصر" بے پناہ امیدیں لیے ہوئے
تعمیر کر رہا تھا اسے ڈھانے لگے ہو تم

توہین اور میری محبت کی الاماں
ہر بات کا مذاق اڑانے لگے ہو تم

پھر اک حسین فکر سے دو چار ہے سلام
پھر نت نئے شگوفے کھلانے لگے ہو تم

سلام

ادھوری تصویر

آتالی آج پہلی بار دیوتا کے سامنے رقص کرنے والی تھی۔

مندر میں آدمیوں کا ایک بے پناہ سیلاب امنڈ آیا تھا اور ہر شخص کی اولین خواہش یہی تھی کہ وہ جلد از جلد پہلی صف میں دیوتا کے قریب پہنچ جائے اور رقص کا زیادہ سے زیادہ لطف اٹھائے۔ آتالی کے پتا سردار پریتم سنگھ دیوتا کے قریب ہی ایک اونچے پتھر پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا متبنیٰ لڑکا بادل رقص کے لیے ضروری انتظامات میں مصروف تھا۔ سب کی نگاہیں مضطربانہ آتالی کا انتظار کر رہی تھیں۔ انتظام یہہ کیا گیا تھا کہ ماہتاب کی شعاعوں کے پھیلتے ہی آتالی اپنے پازیبوں کی جھنکار سے سوئی ہوئی فطرت جگانے کی کوشش کرےگی۔

سردار پریتم سنگھ نے پیچھے مڑ کر مشرقی دروازے سے باہر کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہیں ایک اجنبی کی نگاہوں سے ٹکرائیں ایک لمحے کے لیے انہوں نے سوچا؟ لیکن پھر فوراً ہی مطمئن ہوگئے کہ اس مجمع میں سب کے سب تو اجنبی ہی ہیں۔ کس کس کے متعلق واقفیت حاصل کی جائے؟ مگر اجنبی کی نگاہیں بہت دیر تک سردار صاحب کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں۔ جیسے وہ ان کے ضعیف اور وجیہہ چہرے کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی ہیں۔

اجنبی ملک کا مشہور و معروف مصور تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ماہتاب کائنات عالم پر اپنی سیمیں شعاعیں بکھیرنے لگا۔

بڑے پجاری نے زنجیر کھینچی اور مندر کا سکوت گھنٹے کی کرخت آواز سے تار تار ہوگیا۔ پھر کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی اور ہر شخص کی نگاہیں دیوتا کے سامنے جاکر رک گئیں۔ بادل نے سازندوں کو حکم دیا اور دھیمے دھیمے سروں میں ساز اپنی آواز پھیلانے لگا۔ اب پازیبوں کی جھنکار بلند ہوئی اور سارا مجمع چونک اٹھا...... ساز کی آوازوں کے زیر و بم پازیبوں کی لفریبی جھنکار اور آتالی کی قیامت خیز لچکوں نے مندر میں ایک عجیب خواب آور فضا کر دی۔ تمام لوگ نہ جھپکنے والی آنکھوں اور کھلے منہ سے آتالی کے رقص پر اظہار حیرت کر رہے تھے اور آتالی...... ان کی محویت سے بے نیاز۔ ان کی حیرت سے بے خبر۔ ان کے جمود سے لاپروا اپنے رقص کو انتہائی کمال پر پہنچانے میں مصروف تھی۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد اس کا خواب عالم بیداری کا حسین خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے خواب کی یہہ دلکش تعبیر جلد ہی لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ جس طرح وہ ایک مدت سے اس خواب کو دیکھتی آئی ہے۔ اسی طرح ایک مدت تک لوگ بھی اس کی تعبیر سے لطف اٹھاتے رہیں۔

رقص اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا۔ اس بلندی پر جہاں آرٹ اپنے آپ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ایک باکمال مصور اپنی تصویر کو شاہکار کے درجے پر پہنچانے کے بعد اپنی قوت فیصلہ کو گم کر دیتا ہے اس قوت فیصلہ کو جس سے وہ خود اس تصویر کو پہچان سکے اس کی وقعت کو جان سکے اور اپنی انتھک کوششوں کا کوئی صحیح معاوضہ قایم کر سکے۔ بعینہٖ یہی حالت اس وقت آتالی کی تھی۔ اس کا رقص اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن وہ خود اس کی وقعت سے قطعی بے نیاز ہو چکی تھی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ متحرک رہا تھا پازیبوں کی آواز دھیمے دھیمے گونج رہی تھی اور فطرت۔ فن نواز فطرت ہلکے ہلکے اس کے ساتھ رقص کر رہی تھی...... فردوسی رقص۔

بالآخر رقص کا یہہ بے پناہ سیلاب جو اپنے ساتھ ہزاروں دل و دماغ کو بہائے لیے جا رہا تھا رک گیا۔ آتالی تھکاوٹ اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں دیوتا کے سامنے سرنگوں ہو گئی۔ بڑے پجاری نے

زنجیر کھینچی اور گھنٹے کی کرخت چیخ نے رقص کے اختتام کا اعلان کر دیا لوگ آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگے اور کچھ ہی دیر بعد مندر کے اس وسیع ہال میں چار آدمی باقی رہ گئے۔ صرف چار ایک دیوتا کے سامنے بیٹھی اپنے سانسوں کے توازن کو درست کرتی ہوئی اتالی۔ دوسرا دیوار کا سہارا لیے کھڑا ہوا بادل۔ تیسرا پتھر پر بیٹھے ہوئے سردار پریتم سنگھ اور چوتھا مشرقی دروازے کے پاس چبوترے پر بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

سردار پریتم سنگھ نے مسرت بھری نگاہوں سے اتالی کو دیکھا اور آہستہ چلتے ہوئے مشرقی دروازے کے نزدیک پہونچے "میرے دوست!" انہوں نے مصور کو مخاطب کیا۔ "رقص ختم ہو چکا ہے۔"

مصور چونک پڑا اور جلدی سے اٹھ کر ایک سمت روانہ ہو گیا۔ اب ہال میں صرف دو آدمی باقی رہ گئے بادل اور اتالی

اتالی نے دیوتا کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر بادل کو دیکھا اور مسکراتی ہوئی بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو بادل؟"

بادل آہستہ آہستہ چلتا ہوا اتالی کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔

"اتالی"۔ بادل نے اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ آج جب تم نے اپنے رقص کے ذریعے دیوتا کی ساری خوشنودیوں کو حاصل کر لیا ہے۔ نہ جانے تم اپنے وعدے پر بھی قایم رہ سکو گی یا نہیں"

"کیسی باتیں کر رہے ہو بادل"۔ اتالی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرے لیے سوائے تمہارے اس دنیا میں اور ہے کون؟ پتاجی ضعیف ہو چکے۔ نہ جانے کب ہوا کا جھونکا آئے اور اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھا جائے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ ایسی صورت میں میں سوائے تمہارے اور کس پر بھروسہ کر سکتی ہوں؟"

"خدا کرے تمہارا یہ بھروسہ ہمیشہ قایم رکھے۔ آتالی"۔ بادل نے کہا۔ "تم جانتی ہو کل میں ایک مہینے کے لیے اس گاؤں کو چھوڑ کر شہر جا رہا ہوں اپنی خوشی سے نہیں بلکہ سردار صاحب کا حکم ہے اور ان کے حکم کی تعمیل کو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کیا میں یقین رکھوں کہ اس ایک مہینے کے بعد بھی تم ویسی ہی رہو گی۔ جیسا آج پا رہا ہوں؟"

"سمجھ میں نہیں آتا بادل کہ آج تم اتنے ناامید کیوں ہو رہے ہو؟" اتالی نے کہا۔ "پتاجی کے اس حکم میں ہماری اور تمہاری دونوں کی بھلائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے بعد اس مندر کی سرپرستی تمہیں کو کرنی پڑیگی اور اس کے لیے لازم ہے کہ تم شہر جا کر مذہب کی ساری باتوں پر اچھی طرح عبور حاصل کر لو۔ اب رہا میرا سوال؟ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ شہر سے تم جب بھی واپس لوٹو گے میں تمہارا اسی گرم جوشی سے استقبال کرونگی یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی۔ لو اب تو یقین آ گیا"

"یقین تو میں کبھی کا کر چکا ہوں اتالی"۔ بادل نے کہا "لیکن کمبخت اس دل کو کیا کروں جو ہمیشہ نئے نئے شبہے پیدا کرتا رہتا ہے۔ آؤ آج ہم دیوتا کے سامنے اس بات کا عہد کر لیں کہ ہماری زندگی ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ رہیگی۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں گے اور کسی قسم کا شبہ۔ کسی طرح کی بدگمانی دل میں پیدا نہ ہونے دیں گے"

دونوں دیوتا کے سامنے دو زانوں ہو کر بیٹھ گئے بادل کے لب ابھی تھرتھرانا ہی چاہتے تھے کہ یکایک پشت پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اتالی نے گھوم کر دیکھا اس کا نوکر تیمبر کھڑا تھا "سردار جی کے گھٹنے میں چوٹ آ گئی ہے وہ سیڑھیوں سے پھسل گئے ہیں"۔ تیمبر نے خبر دی۔ اور دونوں بغیر کسی عہد و پیمان کے مندر سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

مصور —— جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اسکی نگاہیں اس تصویر سے ٹکرائیں جسے وہ نمایش کے لیے مکمل کر رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ اور پھر نوچ ناچ کر باہر پھینک دیا۔ وہ اب تک مصوری میں کس حد تک کامیاب رہا ہے؟ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ لوگ اندھے ہیں جو آرٹ کا صحیح معیار قایم کرنا نہیں جانتے۔ اگر

ان میں آرٹ کی کچھ بھی تمیز ہوتی تو وہ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کو پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھتے۔ ان کی قدر نہ کرتے۔ مسلمہ طور پر وہ ملک کا بہترین مصور مانا جا چکا ہے۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے؟۔ کیا وہ حقیقی معنوں میں ایک کامیاب مصور ہے؟ نہیں۔ غلط اور بالکل غلط۔ دنیا نے اب تک اس کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اسے بیوقوف بنایا ہے۔ اس کی توہین کی ہے۔ وہ فن مصوری میں اب تک بڑی حد تک ناکامیاب رہا ہے اور اس وقت تک ناکامیاب رہیگا۔ جب تک وہ دنیا کے سامنے آتالی کا وہ صحیح خدوخال نہ پیش کر دے اور انہیں یہ کہنے پر مجبور نہ کر دے کہ اس مصور نے آتالی کی تصویر بنا کر آرٹ کو انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔

اس نے اپنی تمام بنائی ہوئی تصویروں کو ایک ایک کر کے جلا دیا۔ اور مایوس نڈھال ہو کر پلنگ پر گر پڑا۔ اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی اس ناکامی اور مایوسی پر خوب پھوٹ پھوٹ کر روے۔ اور سچ مچ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس نے کروٹ بدل کر تکیے کو پیچھے لیا اور کچھ ہی دیر کے بعد نیند کی دیوی نے اسے آہستہ آہستہ تھپکیاں دیکر اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

صبح ہوئی اور روزانہ کی طرح آج بھی اس میں ساری دلکشیاں پائی گئیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلیں۔ پرندے چہچہائے کسان اپنے دیہاتی نغموں کے ساتھ کھیتوں پر گئے۔ مسجدوں میں اذانیں دی گئیں۔ مندروں میں ناقوس پھونکے گئے۔ الغرض وہ سب کچھ ہوا جو روزانہ صبح کو ہوتا تھا اور سب کے لیے ویسی ہی صبح ہوئی جیسی روزانہ ہوتی تھی۔ لیکن اس مصور کے لیے آج کی صبح اور صبحوں سے بہت زیادہ مختلف تھی۔ وہ حسب معمول سویرے اپنے [illegible] ایک کسک۔ آنکھوں [illegible] انتہائی غم کا اثر لیے ہوئے وہ آج دیوتا [illegible] کے لیے بھی نہ گیا اور نہ ہی اس نے اشنان کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ مکان سے باہر ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا ماضی و حال کی بہت سی باتیں اور اس کے علاوہ اور بھی نہ جانے کیا کیا؟ یہاں تک کہ سورج کی اولین کرنوں نے اس کے پریشان، مضمحل اور درد میں ڈوبے ہوئے جسم کو گدگدانا شروع کیا اس نے نظر گھما کر مشرق کی طرف دیکھا جھلملاتا ہوا سورج قہقہے لگا کر کہہ رہا تھا "تم بھی عجیب آدمی ہو مصور۔ ذرا ذرا سی باتوں سے گھبرا اٹھتے ہو۔ اس میں سوچ اور فکر کی کیا بات ہے۔ اٹھو ہمت سے کام لو۔ ناممکن ہے تمہاری مشکل آسان نہ ہو جاے مجھے نہیں دیکھتے میں ناامید ہونے پر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ روزانہ شام کے وقت بصد حسرت و یاس مجھے دنیا والوں سے جدا ہونا پڑتا ہے۔ لیکن میں تمہاری طرح ناامید نہیں ہوتا۔ کوشش کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ صبح ہوتی ہے اور مجھے اپنی کوششوں کا صلہ مل جاتا ہے۔ میں دنیا والوں سے پھر بغلگیر ہو جاتا ہوں تم بھی اسی طرح کوشش کرو۔ کیے جاؤ۔ یقیناً کامیابی ہوگی سمجھے"

مصور خود ہی یکایک چونک پڑا اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دل میں یکایک ایک نئی امنگ۔ نیا حوصلہ اور نئی آرزو لیے ہوئے

آتالی کمرے میں بیٹھی سردار صاحب کے زخم پر پٹی لگا رہی تھی کہ ایک نووارد دروازے پر نمودار ہوا۔

"کیا میں اندر آنے کی اجازت حاصل کر سکتا ہوں"؟

اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔

سردار صاحب نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اور بول اٹھے۔ "آجاؤ بھائی آجاؤ۔ میں نے رات بھی تمہیں دیکھا تھا۔ کہو رقص پسند آیا؟"۔

"کیوں نہیں جناب"۔ نووارد نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "زندگی میں پہلی بار میں نے رقص کو اپنے صحیح معیار پر دیکھا ہے۔ اور اگر اسے تصنع پر محمول نہ کیا جاے تو میں بلا خوف کہونگا کہ رات کے رقص کو "فردوسی رقص" کا عنوان دیا جا سکتا ہے"۔

"تم شاعر معلوم ہوتے ہو!" سردار صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ اتنی برجستہ شاعری سواے شاعر کے اور کون کر سکتا ہے

"آپ اسے شاعری ہی کہہ لیں" نووارد نے کہا۔ میری باتیں حقیقت سے بالکل قریب ہیں اور سچ پوچھیے تو آرٹ کی صحیح تعریف سوائے مصور اور شاعر کے اور کر بھی کون سکتا ہے۔

"خوب تو گویا تم شاعر کے علاوہ مصور بھی ہو" سردار صاحب نے اسی لہجے میں کہا۔

"شاعر تو نہیں لیکن ہاں مصوری سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور رکھتا ہوں" نووارد نے جواب دیا۔

"اچھا تو تمہارا نام"؟ سردار صاحب نے پوچھا

"آپ نے شاید مشہور مصور کا نام سنا ہوگا" نووارد نے جواب دیا۔

"کون النیکار؟ کیا وہ تمہیں ہو؟" سردار صاحب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بھئی تمہاری تصویروں نے تو فن مصوری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"جی نہیں! آپ نے غلط کہا" مصور نے جواب دیا "النیکار اپنی مصوری میں اب تک بہت حد تک ناکام رہا ہے اور اب وہ اسی ناکامی کا ایک تصویر کے ذریعے ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں آپ لوگوں کی مدد درکار ہے۔ کیا میں اعانت کی توقع رکھوں"؟

"اچھا کس طرح؟ بتاؤ بتاؤ" سردار صاحب نے کہا "بھئی ہم تمہاری ہر خدمت کے لیے تیار ہیں"

"تو پھر اجازت دیجیے کہ میں آتالی کی ایک تصویر تیار کرسکوں" النیکار نے جواب دیا۔

سردار صاحب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ آتالی نے شرما کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ النیکار نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا:—

"آپ اسے مذاق پر محمول نہ کریں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حقیقت ہے اور بالکل حقیقت"

"تو بھی اس سلسلے میں تمہیں بذات خود آتالی سے اجازت لینی ہوگی"

سردار صاحب نے ہنستے ہوئے کہا اور آتالی ایک بار پھر شرما گئی

اب النیکار آتالی کی طرف مخاطب ہوا

"کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گی؟"

اور دیوی نے کچھ دیر کے توقف کے بعد [illegible]ت میں سر ہلا دیا۔

دوسرے روز علی الصباح دونوں تصویر [illegible] ہی کے جنگل میں مناسب جگہ کی تجویز میں روانہ ہو گئے۔ [illegible] دیر کی تلاش و جستجو کے بعد انہیں ایک ایسی جگہ مل گئی جہاں پانی سے لبالب بھری ہوئی ایک ندی۔ اس [کے کنا]رے چھوٹے چھوٹے پودے۔ ان پودوں کے درمیان پختہ چبوترہ اور چبوترے پر بھگوان کرشن کی ایک خوبصورت سی مورتی......

آتالی اس چبوترے کے ایک کنارے بیٹھ گئی اور سامنے مصور النیکار تصویر کشی کا سامان لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آتالی کو غور سے دیکھا اور پھر اسے ہدایت دی۔ آ[illegible]وں کو بکھیر دیں اور ہونٹوں پر تبسم لانے کی کوشش کریں۔ آتا[illegible] اس کی ہدایت پر عمل کیا تصویر کشی شروع ہو گئی۔ آفتاب [illegible]تا ہوا افق مغرب سے آلگا اور اس وقت تک کاغذ پر [illegible]ل کی چند لکیریں کھینچ سکیں۔

سات رو[illegible] گذر گئے۔

آٹھویں [illegible] جب آتالی چبوترے پر آکر بیٹھی تو اس کی نشست درست نہ تھی [illegible]کار نے اسے ہدایت دی لیکن پھر بھی درست نہ ہوسکی۔ مجبوراً وہ نشست درست کرنے کے لیے نزدیک آیا اور آتالی کے باز[و] کو پکڑا وہ لرز گئی۔ چہرے پر شرم و حیا کی ایک شوخ لہر دو[illegible] جسے مصور نے بھی دیکھا اور دیکھ کر مسکرا دیا اب پنسل اپنا [کا]م کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد مصور النیکار نے آتالی کی طرف د[illegible] ہوئے کہا:—

"آتالی اد[illegible] صحیح خدوخال کاغذ پر پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں [illegible] ہونا آج آٹھ روز ہو گئے۔ لیکن اب تک [illegible] چہرہ [illegible] تو بہ [illegible] نہیں بنا سکا ہوں نہ جانے ان [illegible] گی؟"

"تم بہت زیادہ شاعری سے کام لیتے ہو مصور" آتالی نے

ہ کون سی خوبی ہے جو تمہیں اتنی
مسکراتے ہوئے کہا۔ بھلا مجھ
وقت محسوس ہو رہی ہے یقین دلاؤں اتالی کہ تم کتنی حسین ہو؟"
" کاش تم میری بجائے نہیں خود اس کا احساس ہوتا تاکہ
مصور لگا سکیں کہ میری باتیں کس حد تک درست ہیں اب تک
نے متعدد تصویریں بنائی ہیں۔ لیکن بار کر وجو کسی میں دو روز سے
بھی زیادہ وقت صرف ہوا ہو۔ اپنی مصوری کی زندگی میں پہلی بار
میں تمہاری ہی تصویر کے بنانے میں اتنا وقت اور اتنی محنت صرف
کر رہا ہوں۔"

" بس اب بہت ہو چکا" اتالی نے ہنستے ہوئے شرمیلے انداز
میں کہا۔ "تمہارا کام شاعری نہیں مصوری ہے۔ اس لیے مصوری ہی
کی طرف دھیان دو۔"

التیکار مسکراتا ہوا پھر تصویر کشی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چودہ روز اور گزر گئے۔

اب اتالی کا چہرہ تیار ہو چکا تھا۔ اور التیکار نے اس
میں رنگ بھرنا شروع کر دیا تھا۔ اتالی دن بھر چبوترے پر بیٹھی رہتی
اور مصور ہر دو چار منٹ کے بعد اتالی کو دیکھ دیکھ کر رنگ بھرتا
رہا۔ شام ہوتے ہوتے یہ بھی ختم ہو گیا۔ اور دونوں گھر جانے کی تیاری
کرنے لگے۔ اتالی چبوترے سے اٹھ کر آہستہ آہستہ تصویر کے نزدیک
آئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ مصور نے اس کی طرف دیکھ کر
مسکراتے ہوئے کہا۔

" اپنی صورت پسند آئی اتالی۔"

" میں آئینہ لانا بھول گئی ہوں" اتالی نے مسکراتے ہوئے
جواب دیا۔

اچھا ہی کیا جو نہ لایا۔ ورنہ وہ بھی رشک سے پانی پانی ہو جاتا
مصور نے ہنستے ہوئے کہا۔

" آخر اس تصویر کے سوائے تمہاری اور تعریف کرے گا کون؟
اتالی نے کہا۔ ہر شخص کو اپنی چیز عزیز ہوتی ہے۔ اس لیے تمہیں بھی
یہ یقیناً عزیز ہوگی۔ چاہے دوسرے کو ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔"

اتنا کہہ کر اتالی کچھ دیر خاموش رہی۔ اور پھر سلسلہ کلام
کو جاری کیا۔

" سمجھ میں نہیں آتا التیکار کہ آخر تمہارا ہاتھ اتنا سست اور
کاہل کیوں ہے؟ مہینہ ختم ہونے کو آیا۔ لیکن ابھی صرف چہرہ بنا ہے
نہ جانے پوری تصویر بننے کی کب نوبت آئے گی۔"

اتالی نے اسے کچھ اس انداز میں کہا کہ التیکار بہت زیادہ
متاثر اور اداس ہو گیا۔ اس نے تیزی سے زمین پر پڑے ہوئے
چاقو کو اٹھایا اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار دیا۔ تیز پھل اس پار نکل
آیا۔ اتالی جلدی سے مڑی اور گھبرائی ہوئی بولی۔

" یہ تم نے کیا کیا التیکار؟"

" اسے یہی سزا ملنی چاہیے تھی اتالی" التیکار نے زخم کو
منہ کو انگلی سے دباتے ہوئے کہا۔ "کمبخت اب تک تمہاری تصویر
بھی مکمل نہ کر سکا۔"

" تم بھی کتنے بھولے ہو التیکار؟" اتالی اس کا ہاتھ پکڑ کر ندی
کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ "تم نے مذاق میں ہاتھ زخمی کر لیا یہ بھی
نہ سوچا کہ میری تصویر کو مکمل کرنا ہے۔"

" مکمل ہو جائے گی اتالی" التیکار نے کہا۔ "اب دیکھنا کہ یہ
سست اور کاہل ہاتھ کتنا جلدی اپنا کام ختم کرتا ہے۔"

" اتالی نے ہتھیلی کو ندی کے پانی سے دھویا اور اس کے گرد
کپڑا لپیٹتی ہوئی بولی۔

آخر تم میرے لیے اتنی مصیبتیں کیوں اٹھا رہے ہو التیکار
اب بھی اس سے علیحدہ ہو جاؤ۔"

" اس سے علیحدگی؟ یہ ناممکن ہے اتالی" التیکار نے کہا
" میں خود بھی نہیں جانتا کہ میرے دل میں وہ کون سا جذبہ شدت
کے ساتھ کام کر رہا ہے جو ہر لمحہ ہر لحظہ تمہاری تصویر کی تکمیل میں
ہمہ تن مصروف رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ یقین جانو۔ میں جب بھی
تمہاری تصویر بنانے کے لیے بیٹھتا ہوں تو میرے دل میں ایک قسم
کی مسرت اور ایک بے پناہ لذت کروٹیں لینے لگتی ہے اور اس
وقت میں اپنے سارے تلخ احساسات کو یک قلم فراموش کر جاتا

اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میری تخلیق کا واحد ترین مقصد تمہاری اور صرف تمہاری تصویر کی تکمیل ہے۔"

التیکار اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا آتالی بھی گردن جھکائے خاموش رہی۔ مصور نے پھر اپنے سلسلہ کلام کو جاری کیا۔

"**آتالی** اگر تم مجھے اجازت دو تو میں یہ کہنے پر مجبور رہوں گا میرا یہ نیا جذبہ ایک بے لوث محبت کا پیغامبر ہے۔ دن کا بیشتر حصہ جب تمہاری معیت میں گزار کر میں علیحدہ ہوتا ہوں تو مجھے کائنات کی ہر لطیف شے بے کیف اور پھیکی معلوم ہونے لگتی ہے میں ذرے ذرے میں ایک نشتر ایک کراہت سی محسوس کرنے لگتا ہوں لیکن پھر جب تم سامنے آ جاتی ہو تو انہیں چیزوں انہیں ذروں پر ایک فردوسی وجدانیت طاری ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس وقت نہایت شدت کے ساتھ مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگ گیا ہوں آتالی محبت؟ کیا تم بھی مجھ سے . . . . . . ؟"

التیکار کی آواز گلوگیر ہو گئی نہ اس سے آگے کچھ اور نہ کہہ سکا۔ آتالی نے اپنا سر اٹھا کر پر اشتیاق نگاہوں سے مصور کو دیکھا اور پھر نہ رکتے بہتے دھاروں کو دیکھنے لگی۔ التیکار نے دیکھا آتالی کے پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے تھر تھرا رہے ہیں۔ اس نے آتالی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملتجیانہ انداز میں بولا

"**ایک بار** صرف ایک بار آتالی۔ میں تمہارے ہونٹوں سے یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو یا نہیں؟ تمہارے دل میں بھی یہ نیا جذبہ اسی شدت کے ساتھ کارفرما ہے یا نہیں؟ ایک بار آتالی میری خاطر اپنے ہونٹوں کو تکلیف دو صرف ایک بار۔"

آتالی نے اپنی بھیگی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں اور مصور سے آنکھیں ملا کر تھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"**التیکار**! زندگی میں پہلی بار آج آتالی اپنے دل پر تمہاری محبت کا لطیف دباؤ محسوس کر رہی ہے"

"**سچ** . . . . سچ آتالی؟" التیکار نے جذبہ مسرت میں آتالی کو اپنی آغوش میں کھینچتے ہوئے کہا۔ "کہیں میرے کان مجھے دھوکا تو نہیں دے رہے ہیں؟ اوہ آج میں نے سب کچھ پا لیا۔ سب کچھ حاصل کر لیا۔ اب مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے کچھ بھی نہیں آتالی۔ میں مصور ہونے کے باوجود بھی اب تک اپنی زندگی کی تصویر مکمل نہ کر سکا تھا۔ لیکن آج مکمل ہو گئی بالکل مکمل"

آتالی کسمساتی ہوئی اس کی آغوش سے نکل آئی اور شرم و حیا کے ملے جلے لہجے میں مسکراتی ہوئی بولی

"لیکن میری تصویر جو ابھی ادھوری ہے؟"

"مکمل ہو جائیگی آتالی۔ بہت جلد مکمل ہو جائیگی" التیکار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جب ہماری زندگی کی تصویر مکمل ہو گئی ہے تو اسے مکمل ہونے میں کتنی دیر لگیگی۔"

"اچھا اب بہت ہوا" آتالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو رات آ گئی۔ پتاجی انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"تو میں کب انکار کر رہا ہوں" التیکار ہنستے ہوئے بولا۔ "چلو اور دوڑ کر چلو"

دونوں فرط مسرت میں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چبوترے کے نزدیک پہونچے اور انکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب، انہوں نے اس ادھوری تصویر کو وہاں سے غائب دیکھا۔ کچھ دیر حیرت کے عالم میں کھڑے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر تمام کھوج مارا لیکن وہ تصویر نہ ملی۔

"آخر کیا ہوئی وہ تصویر؟" آتالی نے غمگین لہجے میں پوچھا

"میں خود بھی اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں آتالی" التیکار نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

اس روز رات کو مصور التیکار آتالی ہی کے گھر رہا۔ دونوں رات بھر بےچین و مغموم رہے۔ مصور اپنے زخم کی تکلیف سے اور آتالی ادھوری تصویر کے کھو جانے کی وجہ سے۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی نیند ان پر اپنا سایہ ڈال سکی۔

رات نے آہستہ آہستہ اپنا سیاہ لبادہ لپیٹنا شروع کیا فطرت انگڑائی لینے لگی۔ پرندے چہچہانے لگے۔ مندروں سے

ناقوس اور مسجدوں سے اذاں کی صدائیں بلند ہوئیں — التیکارا اور آتالی دونوں اٹھ بیٹھے۔ اور پوجا کرنے کے لیے مندر کی طرف روانہ ہوگئے۔ سوچا شاید اس سے ان کے دل کو کچھ سکون مل جائے۔ بےچینی دور ہو جائے اور شاید.... شاید وہ کھوئی ہوئی تصویر واپس مل جائے

دروازے پر تمبر شگفتہ پھولوں سے ڈالی بھرے دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ آتالی نے ڈالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور دونوں مندر کی طرف روانہ ہوگئے۔ فرحت بخش ہوائیں تخلیق فطرت سے اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف تھیں اور ننھے ننھے ہرے پودے ایک وجدانی کیفیت میں باہم گلے مل رہے تھے۔

مندر کا قدیم وضع دروازہ ایک طویل گھڑ گھڑاہٹ اور کرخت چیخ کے ساتھ کھول دیا گیا۔ اور دونوں اندر داخل ہوگئے کھڑکیاں بند تھیں اس سبب ہال کافی تاریک تھا۔ اور اس تاریکی میں دیوتا کی دو سرخ سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ فضا دھوپ اور گھی کی ملی جلی خوشبو سے بسی ہوئی تھی اور چمگادڑ نہایت تیزی سے ادھر ادھر چیخ اور پھڑپھڑا رہے تھے۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دئے آہستہ آہستہ دیوتا کے نزدیک آئے اور پھر یکایک چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے آتالی کے ہاتھ سے ڈالی گر پڑی اور پھول ادھر ادھر بکھر گئے۔ التیکارنے لپک کر تمام کھڑکیاں کھول دیں اور دھیمی دھیمی روشنیوں نے تیزی سے اندر گھس کر انھیں ایک عجیب منظر سے روشناس کرایا۔

دیوتا کے سامنے بادل کا اکڑا ہوا بے جان جسم پڑا تھا۔ اور اس کے سینے کے نیچے خون میں لت پت آتالی کی وہ ادھوری تصویر رکھی تھی۔ دونوں کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن دونوں کے انداز میں بہت بڑا فرق تھا۔ تصویر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ایک جان لیوا مسکراہٹ، مسرت تھی ایک بے پناہ مسرت۔ لیکن بخلاف اس کے بادل کے چہرے پر ایک مایوسی تھی انتہا کی مایوسی۔ ناکامی تھی دلریش ناکامی اور سب سے بڑھ کر فریب ہستی اور تلخی حیات کے ایک شدید احساس کا درد انگیز عکس۔

آتالی ایک دلدوز چیخ کے ساتھ التیکار کے سینے سے جا لگی۔ اور وہ اسے سہارا دئے ہوئے مندر سے باہر نکل آیا۔

بیتے ہوئے دنوں کی یاد

عارف سنبھاروی

یاد ش بخیر آہ وہ تابانیٔ حیات
وہ ذوق آرزو وہ بہار تصورات
وہ حسن نوجواں وہ بہار تکلفات
وہ جرات نظر وہ فروغ تجلیات
اک سحر جمال کی وہ برق پاشیاں وہ مستی شباب وہ ساغر نوازیاں
وہ ساعت حسیں وہ لمحات خوشگوار
وہ بیخودی شوق وہ احساس خوشگوار
ٹھنڈی ہوا خموش فضا شام زرنگار
کوئل کی کوک آم کا بن موسم بہار
ہر آرزو شباب کی عشرت نصیب تھی مجھ کامیاب شوق کی دنیا رقیب تھی
وہ سادگی شوق وہ رنگینی حجاب
وہ چشم نیم باز وہ کیفیت شراب
وہ کمسنی کی گود میں پلتا ہوا شباب
چمکا ہوا جہان محبت کا آفتاب
ہر ناز حسن جلوہ حسن نیاز تھا باب حریم خلد نگاہوں پہ باز تھا
جلوہ فروشیاں وہ رخ بے نقاب کی
ہنگامہ خیزیاں دل پر اضطراب کی
وہ کیف انبساط وہ مستی شراب کی
محشر بدوش آہ وہ راتیں شباب کی
رقصاں وہ برق حسن نگاہوں کے سامنے
بندہ بنا لیا تھا کسی لالہ فام نے

رشید احمد اعظمی

افسانہ عبرت

ایک دن گور غریباں میں ہوا میرا گذر
ڈھلنے کا وقت ہلکی ہلکی تاروں کی نظر
آسماں پر ہلکی ہلکی گرد تھی چھائی ہوئی
ایک تربت پر نظر کچھ پھول ایسے منتشر
ان میں کچھ سوکھے ہوئے کچھ نیم تر غنچے بھی تھے
جو زبان حال سے یہ کہہ رہے تھے سر بسر
گود میں گلشن نے پالا لوریاں دیتے ہوئے
جب کسی قابل ہوئے گلچیں نے کی ہم پر نظر
اپنے بچپن میں ہم آغوش عنادل میں رہے
یہ ملا ہم کو جوانی میں جوانی کا ثمر
مسکرائے بھی نہ تھے ہم آنکھ بھی کھولی نہ تھی
کھا گئی صیاد گلچیں کی ہمیں ظالم نظر
توڑ کر گلشن سے بیچا ہم کو یوسف کی طرح
ایک زلیخا دوست نے ہم کو خریدا سر بسر
لا چڑھایا ایک تربت پر بصد عجز و نیاز
اللہ اللہ اہل دنیا کی عقیدت کا اثر
پوچھنے والا نہیں کوئی ہمارے حال کا
رحم بھی کھاتا نہیں کوئی ہمارے حال پر
وہ حسیں راتیں وہ بلبل کی ترنم ریزیاں
یاد ہے گلشن نشیں آج بھی ہم کو مگر
کیا مٹائے مٹ بھی سکتا ہے مقدر کا لکھا
مانا ہو جاتا ہے شام ہجر سے رنگ سحر
دیدہ عبرت سے دیکھیں دیکھنے والے ہمیں
کہہ دو شبنم سے کہ اب روئے ہمارے حال پر
ہم کو ہونا تھا کسی نوشاہ کے سہرے کی جان
ہم کو بھی زیب گلو رکھتا کوئی رشک قمر
لیکن اس دنیا کو سب کہتے ہیں عبرت کا مقام
جو ہیں پژمردہ چمن کے وہ پڑے ہیں خاک پر
سن کے یہ افسانہ عبرت میں حیراں ہو گیا؛ چند لمحوں کے لیے میں آپ سے بھی کھو گیا

نظر نظامی (جبلپور)

حقائق و معارف

کہہ رہا ہے رنگ یہ ہر پیکر تصویر کا
خاک کے پتلے میں جلوہ ہے تری تنویر کا
نام رکھ لیتی ہے دنیا اس گھڑی تقدیر کا
پست ہو جاتا ہے جس دم حوصلہ تدبیر کا
میری قسمت جب لکھی جانے لگی روز ازل
کانپ کانپ اٹھا ہے خامہ کاتب تقدیر کا
اس سے پہلے دل نہ جب تک مبتلائے عشق تھا
کیا ہی انداز تھا ظالم تری تقریر کا
ایک مرکز پر سمٹ آئی ہے دنیا عشق کی
کیوں نہ قائل ہو زمانہ حسن کی تسخیر کا
اے قدر انداز تجھ کو اپنے ناوک کی قسم
کچھ جگر میں تو رہے کچھ دل میں پیکاں تیر کا
دیکھنے والا تھا یہ منظر بھی وحشی کا ترے
اپنے ہاتھوں سے پہننا پاؤں میں زنجیر کا
آشیاں کے بعد خاک آشیاں پر ہے نظر
ہر گھڑی طرفہ ستم ہے آسمان پیر کا
میری انکی قسمتیں جس دم لکھی جانے لگیں
دل تھا ان کے نام کا غم تھا مری تقدیر کا
غم نہ دے یارب غم جاناں کے ہوتے اب کوئی
مل گیا مجھ کو جو حصہ تھا مری تقدیر کا
پوچھتے ہو اپنے کیا تیر نظر کی آرزو
دل پر اکثر ہو گیا دھوکا تمھارے تیر کا
ہوں لحد میں بھی اسیر ظلمت شام فراق
سلسلہ چھوٹا نہ خواب زلف کی تعبیر کا
اہل دل کے واسطے ہے حاصل صد گفتگو
دیکھ کر خاموش ہو جانا تری تصویر کا
دل جگر میں ہو گیا تقسیم اس انداز سے
کچھ پتہ چلتا نہیں سینے میں ان کے تیر کا
ناز ہے افقر نسیم و مومن و تسلیم پر؛ میں مقلد ہوں نہ غالب کا نہ میر و میر کا

افقر موہانی

دنیا کا پہلا ادیب

ادب' ان لطیف خیالات کا نام ہے' جو زبان کے لطیف سانچوں میں ڈھالے جائیں۔ اور ہم ادیب' ایسے شخص کو کہتے ہیں' جو ان سانچوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ تیار کرے۔ شعوری زندگی کی ابتدائی منزلوں میں' جس طبقے نے سب سے پہلے ان سانچوں کو تیار کیا وہ پجاریوں یا راہبوں کا طبقہ تھا۔ ان لوگوں نے مختلف قبیلوں میں' مذہب کے ارتقا کے متعلق اپنی معلومات جمع کیں اور اس طرح ادب کی موجودہ عظیم الشان عمارت کا مال مسالہ فراہم کیا' لیکن اس سلسلے میں' ان سے پہلے وہ لوگ توجہ کے محتاج ہیں' جو اپنے قبیلے کے سرداروں کی مدح میں [illegible] طریقے پر ان کی بہادری کے گیت گاتے [illegible]۔ چونکہ آدمی کسی چیز کو سمجھنے یا اس کی عقلی توجیہہ کرنے سے پہلے اسے جذباتی طور پر محسوس کرتا ہے' اس لیے عام طور پر نثر سے پہلے نظم وجود میں آتی ہے۔ خیالات کے اس طریقہ اظہار میں ایک غیر منطقی اور سیدھے سادے آدمی کی ذہنی کاوشوں کے لیے اچھے سانچے مل جاتے ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ مقدس کتابیں اور رزمیہ نغمے جن کو ادب کی اولیں یادگاریں کہنا چاہیے نظم کی شکل میں ملتے ہیں جنھیں بعد میں کم و بیش مذہب کی اہمیت حاصل ہو گئی۔ مقدس تحریروں یا رزمیہ نظموں کو لوگ زبانی یاد کر لیتے اور اسی سے اپنی ادبی پیاس بجھاتے تھے۔ اگرچہ قصوں اور کہانیوں کو عام طور پر بہت قدیم سمجھا جاتا ہے' اور بہت ممکن ہے ابتدائی شکل میں بھی لوگوں کو زبانی یاد ہوں' لیکن تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جس چیز کو سب سے پہلے ادب کی حیثیت حاصل ہوئی وہ نظم ہی ہے۔ اب ہمیں تاریخی شہادتوں کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ ادب کی بنیادیں [illegible] ہوئی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ دنیا کا پہلا ادیب کون سمجھا جا سکتا ہے۔

انسانی جذبات اور خیالات کی تاریخ بہت قدیم ہے اور یہ بتانے کے لیے کہ دنیا کا پہلا ادیب کس کو سمجھنا چاہیے' بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے قدیم ادبی ذخیروں کو ٹٹولنا پڑتا ہے' اکثر و بیشتر بڑے ادبی ذخیرے تو مل جاتے ہیں' مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا لکھنے والا کون ہے۔ کہیں کسی لکھنے والے کا پتا چل جائے تو خود اس کے متعلق ٹھیک طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا اسے دنیا کے لکھنے والوں میں اولیت حاصل ہے' کیونکہ پہلے تو قدیم زمانے کی تاریخ سے اس مسئلے پر بہت کم روشنی پڑتی ہے' اور دوسرے یہ کہ دنیا کا ہر ادب کسی نہ کسی بیرونی ادب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کا ادب ہمیشہ اپنے پیش رو ادبی ذخیروں کا خوشہ چیں ہے' چنانچہ قدیم مصر کے رہنے والوں' یا بعد کے مصری انشا پردازوں کا اثر چین کے مشہور فلسفی کنفیوشس پر نظر آتا ہے۔ یہ بتانا کہ یہ اثرات کیونکر پڑے اس وقت ممکن نہیں لیکن یہاں یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انسان کس وقت سے سوچنا شروع کیا ہے۔ بابل کا عظیم الشان تمدن دو ہزار سے پانچ سو قبل مسیح' یعنے پندرہ سو سال کے طویل زمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس تمدن کے اخلاقی نظریوں' مذہبی قصوں اور اس کی طرز فکر کا اثر دنیا کے بہت سے تمدنوں پر پڑا' پھر بابل پر جو چینی کے اثرات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں پورے ایشیا میں آمد و رفت کا ایک سلسلہ جاری تھا' تاجر' فاتح' مبلغ اور آوارہ گرد قبیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ برابر جاتے آتے تھے۔ جب انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ سے ملتا ہے تو ان کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا ناگزیر ہے چنانچہ یہ لوگ ایک دوسرے کے مشہور اقوال' خیالات' عادات اور معلومات کی خوشہ چینی کرتے رہے۔ یہاں ہم نے بابل کے تمدن سے بحث کا آغاز کیا ہے کیونکہ دو ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ آسانی سے ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے۔ نیز بابل کے

تمدنی آثار بھی بہت سے مل جاتے ہیں، لیکن اگر ہم مصر کی قدیم سلطنت کا لحاظ کریں، تو ہم کو آج سے کوئی آٹھ ہزار سال پیچھے کے دھندلکے میں جانا پڑتا ہے جو بہت غیر دلچسپ مرحلہ ہو جاتا ہے۔ مصر میں مذہبی قصے کی ابتدا تین ہزار پانچ سو قبل مسیح سے ہوتی ہے۔ یہ قصہ "ممفس" کا ہے جو شہنشاہ مینا کا بسایا ہوا ایک شہر تھا۔ مینا کا تمدن دو ہزار سال قبل مسیح تک برابر آگے بڑھتا رہا۔ مصر کے بڑے تاریخی بادشاہوں کے حالات اسی زمانے میں ملتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک ادب کا بھی پتا چلتا ہے، جو انسانی خیالات اور ذہنی کاوشوں کا ایک مرقع ہے۔ مصر قدیم کا ایک قیمتی ادبی مرقع اسے نہٹ اول کی نصیحتیں ہیں جو اس نے اپنے بیٹے کو کی تھیں، لیکن اس سے پہلے بھی بعض ادبی کوششوں کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ کسانوں اور مچھیروں کے گیت یا بادشاہوں وغیرہ کے قصے اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں جو تقریباً بائیس سو قبل مسیح کی پیداوار ہیں۔ شاہ امنوٹیپ سوم کا عہد مصر کی تاریخ کا ایک یادگار باب ہے، کیونکہ اس زمانے میں ادب اور دوسرے فنون کو بڑی ترقی ہوئی۔ امنوٹیپ نے اپنے سفیروں اور سیاحوں کو دنیا کے طول و عرض میں بھجوایا اور جب یہ لوگ واپس ہوئے تو اپنے ساتھ دوسرے ملکوں کے اثرات لیتے آئے۔ اس زمانے کے ادب میں سلطنت مصر کے تزک و احتشام اور اس کی مہموں اور کارناموں کا تذکرہ ملتا ہے، چنانچہ آج بھی ہمارے تخیل پر ان کا اثر ہے، مثلاً سفرنامہ سنوہے آج بھی سندباد جہازی کے قصے کی شکل میں ہمارے بچے پڑھتے ہیں اور رہمات تھوٹی ایک مشہور قصہ ہے جس کا چربا علی بابا چالیس چور کے قصے میں اتار لیا گیا ہے۔

انسانی تخیل کی تاریخ میں جسے ہم 'ادب' کہتے ہیں، مصر کا وہ زمانہ بہت دلچسپ ہے جو چودہ سو ساٹھ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت یوسف، داود، سلیمان اور اس طرح کی دوسری مقدس شخصیتوں کی وجہ سے جو اس زمانے سے تعلق رکھتی ہیں، ادب کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ مصر میں پیدا ہوا۔

مگر یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مصر کا یہ ادب خود سمیریا، بابل، اور شام کے تمدنوں سے متاثر ہوا، اور رامسس دوم کے زمانے میں یہ ادب چینی شاعری کی طرح بظاہر تو بہت شان دار ہو گیا، لیکن اسے آج بڑے ادب میں شمار نہیں کیا جاتا۔ رامسس کے انتقال کے بعد جو مصر کا آخری بادشاہ تھا وادی نیل مختلف حملہ آوروں کی آماجگاہ بنی رہی اور گیارہ سو پچاس سے تین سو تیس قبل مسیح تک مصر سے ادب کا خاتمہ ہو گیا لیکن قدیم مصر کی اس ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ ایک بڑا ادبی ذخیرہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس کو بلند پایہ ادب میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اس ادب کے پیدا کرنے والوں کے متعلق ہم کو کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ چونکہ مذہبی ادبیات الہامی یا خدائی سمجھی جاتی ہیں اس لیے حضرت یوسف، داود وغیرہ کو جن کی آسمانی کتابیں ہیں ادیب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب رہا دوسری قسم کا ادب، تو اس کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ فلاں بادشاہ کے عہد میں کوئی خاص ادبی پیداوار ہوئی تھی لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس ادب کا پیدا کرنے والا کون تھا۔ مختصر یہ کہ مصر کی پوری ادبی تاریخ کے مطالعے کے بعد بھی ہم ٹھیک طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں شخص ایک ادیب تھا اور اس نے فلاں ادبی پارے کی تخلیق کی۔

مصری ادب کے بعد دنیا کی تاریخ میں دوسرا بڑا ادب جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یونان کا ادب ہے۔ یونانی ادب کو یورپ کی ادبیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے اول تو یہ کہ یہ ادب بڑی حد تک ایک ایسی چیز ہے جس کی عرصہ دراز تک خود بہ خود نشو و نما ہوئی اور اس پر بیرونی اثرات کا بہت کم پتا چلتا ہے، بلکہ مغربی نقادوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہ ادب بیرونی اثرات سے بالکل ہی پاک رہا اس نے برخلاف یورپ کے دوسرے ادبی ذخیروں پر باہر کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یونانی ادب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ایک مسلسل

تاریخ ہے جو الف ثانی قبل مسیح سے لے کر موجودہ زمانے تک پہنچتی ہے۔ اس ادب کا مطالعہ ہمارے لیے بڑی دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک بڑا ادبی ذخیرہ ہے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا دنیا کا پہلا ادیب یونان کی سرزمین سے اٹھا تھا، ہمیں یونان کی ادبی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنی پڑے گی۔

قدیم یونانی ادب کے دور کو ہومر کے زمانے سے شروع کیا جاتا ہے اور یہ دور جسٹی نین کے عہد یعنے تقریباً پانچ سو تائیس عیسوی تک پھیلا ہوا ہے، جو کم و بیش چودہ صدیوں پر حاوی ہے۔ اس دور کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے تو قدیم ابتدائی دور ہے جو ہومر کے عہد سے لے کر سکندر کی وفات یعنے سن تین سو تیئس قبل مسیح تک حاوی ہے۔ دوسرے سکندری دور ہے جو تین سو تیئس قبل مسیح سے شروع ہو کر ایک سو عیسوی پر ختم ہوتا ہے۔ اور تیسرے سکندری دور کے بعد کا زمانہ ہے جس میں ۵۲۹ء تک کا زمانہ شامل ہے۔ یہاں ہم کو صرف قدیم ابتدائی دور پر نظر ڈالنی ہے اور اس دور کے ادبی ذخیرے کو ٹٹول کر یہ دیکھنا ہے کہ دنیا کا پہلا ادیب کس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یونانی ادب کی ابتدا ہومر کی رزمیہ نظموں سے ہوئی اور وہ قدیم ادبی شہ پارے جو الیڈ اور اوڈیسی کے نام سے مشہور ہیں ہومر ہی کی پیداوار سمجھے جاتے ہیں۔ ان رزمیہ نظموں کو یونانی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ پہلے تو وہ ادب کے ارتقا کی پہلی کڑی ہیں اور دوسرے یہ کہ قدیم ابتدائی نظم کی سادگی اور حسن کاری ان میں پوری طرح موجود ہے، لیکن دقت یہ ہے کہ ادبی آثار سے پہلے کی جتنی کتابیں ملتی ہیں ان کے لکھنے والوں کے متعلق ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ حال صرف یونانی ادب ہی کا نہیں بلکہ اکثر صورتوں میں یہی دقت پیش آتی ہے۔ مثال کے طور پر کبھی اُس لینڈ سے وہ قدیم تاریخی ادب دستیاب ہوتا ہے جو ایڈا کے نام سے موسوم ہے مگر اس کے لکھنے والے کا پتا نہیں کبھی حضرت داود کی زبور اور حضرت موسیٰ کے دس احکام ملتے ہیں مگر ان بزرگوں کو کوئی ادیب نہیں کہہ سکتا، کیونکہ زبور وغیرہ

کو کلام ربانی تصور کیا جاتا ہے کبھی شاں ساں وور دلاں کی جیسی کوئی اہم کتاب نکل آتی ہے جو کسی غیر معلوم شخص کی فکر کا نتیجہ ہے کبھی رگ وید جیسی کوئی کتاب رشیوں کی لکھی ہوئی ہمیں نظر آتی ہے۔ بہر حال اس سارے ادبی ذخیرے کو گرید کر دیکھا جائے، خواہ وہ یونانی ادب ہو یا ہندستانی، یورپی ہو یا افریقی ایک الجھن ہی ہوتی ہے کیونکہ یہ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں شخص فلاں کتاب کا لکھنے والا ہے چنانچہ ہومر کو دیکھو تو وہ بھی ایک معمہ ہے کہ آیا اسے الیڈ اور اوڈیسی کا لکھنے والا سمجھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ ادبی پارے واقعی ہومر کی تخلیق ہیں تو اس کو یقیناً دنیا کا پہلا ادیب تصور کیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ ہم کو ٹھیک طور پر یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ہومر نام کے کسی آدمی کا وجود بھی تھا۔ ہومر کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ ہومری نظموں کا ایک مصنف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظمیں تو موجود ہیں اور وہ بلاشبہ یونانی ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں، لیکن ہومر کی حیثیت ایک افسانوی کردار سے زیادہ نہیں جیسا کہ مسٹر اذنیل کا خیال ہے "ان نظموں کو خواہ مخواہ ہومر سے منسوب کر دیا گیا ہے، حالانکہ وہ کسی دوسرے ہی ذہن کی پیداوار ہیں" جن لوگوں نے ان نظموں کا گہرا مطالعہ کیا ہے ان کا خیال ہے کہ یہ نظمیں ایک وقت نہیں لکھی گئیں بلکہ ایک نظم کے مرتب ہونے کے کم از کم ایک صدی بعد دوسری نظم لکھی گئی۔ نیز تحریر کا رواج ہونے سے پہلے ان نظموں کا وجود تھا اور کئی پشتوں سے یہ لوگوں کو زبانی یاد تھیں۔ اور جب یہ ایک پشت سے دوسری پشت میں آئیں تو کبھی تو سطروں کی ترتیب بدل گئی اور کبھی خود مضمون کچھ کا کچھ ہو گیا۔ ہومر کے نام کے ساتھ اور بھی بہت سی نظمیں منسوب کی جاتی ہیں، مثلاً ہومری مناجاتیں اور تھی بائیڈ وغیرہ لیکن یہ سب کسی نہ کسی دوسرے ادیب کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جب کہ خود ہومر کے وجود پر ہمیں شبہ ہے اور یونان کے ان قدیم ادبی پاروں کے لکھنے والے کا ہمیں پتا نہیں چلتا۔ ہومر کے متعلق معین طور پر یہ کہہ دینا کہ وہی

دنیا کا پہلا ادیب تھا ایک طرح کی جسارت ہے۔

ہومر کے بعد تاریخ یونان میں ایک دوسرا بڑا آدمی فیثا غورث ملتا ہے جو ۵۸۲ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا' یہ ایک بڑا ریاضی داں اور ماہر موسیقی تھا' لیکن وہ کسی صورت میں ادیب نہیں کہلا سکتا۔ اس کے بعد ہیرودوطس کا درجہ ہے جو ۴۸۴ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑا مورخ اور ادیب ہے اور اس کو بلاشبہ یونان کا پہلا ادیب سمجھا جا سکتا ہے۔ یونان کے اور مشاہیر جن میں تھوسی ڈائی ڈیز' افلاطون' ڈیموس تھنیز ارسطو' سیسرو وغیرہ شامل ہیں۔ سب ہیرودوطس کے بعد کے لوگ ہیں۔ ہیرودوطس یونان کی تاریخ میں پہلا آدمی ہے جس کے متعلق ہم ٹھیک طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ یونان کا پہلا ادیب ہے۔ لیکن یہ دنیا کا پہلا ادیب نہیں کیونکہ اس کی پیدائش سے پہلے ہم کو چین کی سرزمین پر ایک اور شخص نظر آتا ہے جو ایک بڑا ادیب اور فلسفی تھا' اب ہمیں چینی ادب کو دیکھنا چاہیے کیونکہ دنیا کے دوسرے ادب مثلاً لاطینی۔ زرتشتی' ایرانی' ہندستانی اور عربی ادب اس کے بعد آتے ہیں۔

چینی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو جس شخص پر سب سے پہلے آپ کی نظر پڑے گی وہ کنفیوشس ہے۔ کنفیوشس جسے چینی تلفظ کے لحاظ سے "کنگ فت سی" کہنا چاہیے ۵۵۱ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا اور یہ تاریخ عالم کا بہت اہم اور یادگار زمانہ ہے۔ اس ساری دنیا میں جس کو ہمارے اسلاف جانتے تھے اس تمام سرزمین کی تاریخ میں جو ایک طرف ٹوکیو سے جزائر سسلی تک اور دوسری طرف ڈینیوب سے لے کر راس امید تک پھیلی ہوئی تھی کنفیوشس کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس عہد میں بنی آدم کی جسمانی اور دماغی قابلیتیں خوب چمکیں' چنانچہ ایک طرف ان کے لیے فتوحات کے میدان کھلتے گئے اور ان کی طاقت بڑھتی گئی تو دوسری طرف ان کی دماغی کاوشیں بھی بہت بار آور ہوئیں اور ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا۔ جو ادب چین کی سرزمین سے پیدا ہوا اس کا بابا آدم کنفیوشس ہے۔ اس فلسفی کی وجہ سے دنیا کی متمدن قوموں کے خیالات اور ان کی ذہنیت میں ایک نیا انقلاب پیدا ہوا جس کا اثر آج تک باقی ہے چنانچہ بادہ مرت اور پھر مغرب کے اثرات کے باوجود کنفیوشس کی تعلیمات اور فلسفہ کو آج بھی چین میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ کنفیوشس چین کا پہلا ادیب ہے جس کے متعلق ہم ٹھیک طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس نے چند کتابیں لکھیں اور ایک ادب کی تخلیق کی۔ اس کی مشہور کتابوں میں شوچنگ' شی چنگ اور چوان چی ان قابل ذکر ہیں۔ جن سے صحیح معنی میں چینی ادب کی ابتدا ہوئی ہے اور جو چین کا بڑا ادبی اور ذہنی سرمایہ ہیں۔ وقت اجازت نہیں دیتا کہ یہاں کنفیوشس کے متعلق کچھ زیادہ کہا جا سکے لیکن اس موقع پر یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ کنفیوشس ایک ہی آدمی ہے جو ہومر کے بعد اور ہیرودوطس سے پہلے پایا جاتا ہے جسے ہم واقعی ادیب تصور کر سکتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی دنیا کا پہلا ادیب ہے۔

عبدالحفیظ صدیقی۔ بی ایس سی (عثمانیہ)

بیوہ

آنکھ میں آنسو' لبوں پر آہ' دل میں بے حسی
چہرہ گل رنگ پر افسردگی چھائی ہوئی
بے بسی بیچارگی اور بدنصیبی' اضطراب
سر سے پا تک درد میں ڈوبی ہوئی سینہ کباب
مضمحل اندام' اور دل سرد' دامن تار تار
جیسے رخصت ہو گئی ہو باغ سے فصل بہار
ہر طرف رنج والم بے دردیاں گھیرے ہوئے
ظلم نا انصافیاں' بے رحمیاں گھیرے ہوئے
باوجود اس کے وہ حال دل بتا سکتی نہیں
اور پل بھر کے لیے بھی چین پا سکتی نہیں
جی رہی ہے' زندگی کا جام پی سکتی نہیں
چاک دامان جگر ہے' آہ سی سکتی نہیں
غم نصیب و بے نوا بیوہ کی یہ تصویر ہے

تحسینہ سیہروی

ماحول

وہ فردوسی محلوں کے عقب میں رقص مستانہ
چھلک جائے نہ لغزش سے مرا لبریز پیمانہ
اسی ماحول میں اس مرکز جذبات سے ہٹ کر
نظر کے سامنے ہے دور اک دہقاں کا غمخانہ
یہی ماحول ہے جس نے عطا کی مجھ کو مجبوری
یہی ماحول ہے جس نے بنایا مجھ کو دیوانہ
اسی ماحول میں تاریک ہے مزدور کی کٹیا
اسی ماحول میں روشن ہے دولت کا سیہ خانہ
نظر افروز ہے اس دیس میں باطل کی پیشانی
بھٹکتی ہے اسی ماحول میں تقدیر رندانہ
اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
غمیں ہیں جس کی ہیبت سے دیار و دشت و ویرانہ
جنوں بیدار ہوتا ہے بڑی مشکل سے قوموں میں
لہو روتے ہیں برسوں مسجد و مکتب و میخانہ
غلامی کے بدن میں ہو اگر سوز نفس تازہ
کہیں صدیوں میں ہوتا ہے حریف خاک پروانہ
میں تکتا ہوں اسی ماحول میں اک خواب آزادی
یہی ماحول ہے مجھ کو جنوں انگیز کاشانہ
امارت پھونکتی ہے ہر طرف افسون خاموشی
زمین دہرا رہی ہے اک بغاوت خیز افسانہ
اذاں سے گونج اٹھیں گے کسی دن قت کی ایواں
پیامی ہے قیامت کا یہ شور انگیز ویرانہ

کیف اسرائیلی

اے دوست

نصیب شوق پہ ہیں سرفرازیاں تیری
متاع خاص ہیں شاغل نوازیاں تیری
نوازشوں کو ترے لطف زندگی سے کہیے
عنایتوں کو تری جان دوستی سے کہیے
بہار شوق میں اک کیف جاودانی ہے
ہر ایک بات میں طوفان زندگانی ہے
چمن فروز بہاروں میں دیکھتا ہوں تجھے
نظر نواز ستاروں میں دیکھتا ہوں تجھے
ترے خیال سے مسرور ہو کے جیتا ہوں
خلوص و چاہ پہ مغرور ہو کے جیتا ہوں
سرور و کیف کی دنیا جگا سکوں اے کاش
میں تیرے کام بھی دنیا میں آسکوں اے کاش
جہاں میں سیکڑوں طوفاں اٹھائے ہیں ہم نے
جنوں کے رنگ ہزاروں جمائے ہیں ہم نے
محبتوں کا فسانہ سنائیں گے اب بھی
اسی طرح سے زمانے پہ چھائیں گے اب بھی
ہمارے دل پہ کدورت نہ آئے گی ہرگز
ہماری گرد یہ دنیا نہ پا سکے گی ہرگز
جہاں میں رہ کے جہاں کو غلام کر لیں گے
خدا گواہ زمانے میں نام کر لیں گے
حوادثات سے ٹکرا کے مسکرائیں گے
جبیں پہ اپنے شکن بھی کبھی نہ لائیں گے
نئی امید کا عالم ہمیں بسانا ہے
تعینات کے پردے ابھی اٹھانا ہے
نقوش عہد محبت مٹا نہیں سکتا
ترے خلوص کو شاغل بھلا نہیں سکتا
دل حزیں پہ عنایت کا شکریہ اے دوست
خلوص و چاہ و محبت کا شکریہ اے دوست

شاغل

شاعر کا انجام

وہ شاعر تھا! اس کی ہر ادا ایک شعر، اور اس کی ہر صدا ایک نغمہ تھی! اس کے سنہری بربط سے جو نغمہ نکلتا تھا، سوز و گداز کے عمیق اثرات سے لبریز ہوتا تھا۔ جب کوہسار کے قریب چاندنی راتوں میں وہ اپنا طلائی بربط سنبھالے، نغمہ سرائی میں محو ہوتا، تو ستارے کانپتے، فضائیں تھرتھراتیں، اور خدائی یکسر بیگانہ ہوش نظر آتی! مدہوش نظر آتی ——— اور بے ہوش نظر آتی تھی!!!

وہ ایک شاعر تھا! اس کا نوجوان دل نازو نیاز محبت سے معمور تھا! اس کی حسین اور پاک روح سوز و گداز عشق سے چور تھی ——— ! جب وہ فضاؤں کے سیمیں دامنوں میں اپنے نوزائیدہ نغمہ ہائے شعر بکھیرتا ——— تو زمین و آسمان سے الوہیت و محبت کی اک حزین اور دل گداز صدا آنے لگتی، اور ستاروں کے قریب، افسردگی کے انداز میں کوئی مسکراتا ہوا دکھائی دیتا۔! وہ شاعر تھا ——— ! میں نے یقین کر لیا کہ وہ شاعر تھا! مگر ان شاعرانہ نوا سنجیوں میں، درد و غم کا حسین مگر غمگین پہلو کس لیے ——— ؟ اس راز سے کوئی باخبر نہ تھا ——— !

نوجوان شاعر کا معمول تھا کہ ہر شب، حسین ملکہ کی حضور میں، اک اچھوتا اور نیا نغمہ پیش کرتا، اور حسین ملکہ اس عطیے سے کمال مسرور رہتی، اور خوشی کی طلائی کرنوں سے اس کا دل معمور ——— شاعر کو فخر، اور بجا طور پر فخر ہوتا کہ چاند، تارے، گھٹائیں، پھول سبھی ملکہ کی حضور میں اپنی نذر عقیدت پیش کرتے، مگر ملکہ، مغرور و حسین ملکہ، ان سب کے تحائف کو حقارت سے ٹھکرا دیتی۔ مگر وہ ایک ——— اور صرف ایک شاعر کے نغمہ ہائے جمیل کو دلی شوق سے سنتی! سنتی اور سر دھنتی ——— !

باوجود اس کے کہ شاعر آج تک ملکہ کی جھلک سے بھی محروم تھا۔ وہ غائبانہ اپنے پہلو میں، اک خلش! آہ محبت کی ایک لذیذ و رنگین خلش محسوس کرنے لگا تھا ——— تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ملکہ کے حسن عالم آشوب کا ایک ہلکا سا نظارہ بھی، اس کے نازک اور رقیق جذبات کے حق میں کس درجہ ہلاکت کا سامان ہو سکتا ہے ——— اور اسی لیے وہ اپنی محبت کا بے پناہ شوق، نغموں کے پردوں میں چھپا کر، دور سے پیش کرنے کا عادی تھا! مگر افسوس کہ فطرت، اس کی نزاکت وجدان کا پاس نہ کر سکی۔

ایک رات ——— جبکہ شاعر اور ملکہ کو، اپنی اپنی تاریکیوں میں، ہزاروں نور در بر، اور نغمہ پرور راتیں بسر کرتے ہوئے مدت ہو چکی تھی ——— کوہسار کے قریب شاہی محلات کے نیچے شاعر! یہ بہار پیشہ شاعر! اپنا بربط اٹھائے فضائے نیم شبی میں، نہایت لطیف و رقیق نغمے برسا رہا تھا۔ اس حال میں کہ چاند کی حسین و زرکار شعاعیں، شاعر کے رخساروں کو چومتی ہوئی، اس کے مرمریں جسم پر آ کر تھرا رہی تھیں، ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہوائیں فشار نکہت سے لبریز اور فضائیں اک گداز پرستش سے مدہوش تھیں!

یک بیک اس عالم رنگ و بو میں ایک حسین ستارہ طلوع ہوا۔

شاعر مست تغافل شاعر اب بھی بے خبر تھا ——— ! ملکہ قریب آئی! اور بیک جنبش نظر شاعر سے ہم آغوش تھی ——— ستارے جھلملانے لگے! چاند کی سنہری کرنیں تھرتھرانے لگیں، اور فطرت و عالم فطرت، یکسر غبار رنگ و بو بن گئے۔ شاعر کو ہوش آیا! مگر یہ ہوش ایک ابدی مدہوشی کا آغاز تھا۔ دنیا کی فضاؤں نے، حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کہ شاعر کے طلائی بربط کے تار ٹوٹ چکے، نغمے خاموش ہو چکے ہیں اور وہ اپنی تمام حسین آرزوؤں کے ساتھ ایک طرف......!! عیش و نشاط کی محفل کو گرما رہا ہے۔

نورجہاں ناز

محبت کی راہیں

محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں
نغمے نغمے کو ہم آواز بنا لوں تو چلوں
ساز بیداری الفت پہ اٹھا لوں تو چلوں
ہاں ذرا دل کا کوئی راگ سنا لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

آبشاروں کے سحر خیز ترنم کی قسم
شب ماہتاب کی تابانی انجم کی قسم
لب معصوم کے وارفتہ تبسم کی قسم
دل کے ہر داغ کو پیمانہ بنا لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

میں نے دیکھی ہے محبت کی نظر اے ساقی
جانتا ہوں ہوس دیدۂ تر اے ساقی
میں ترے ساتھ تو چلتا ہوں مگر اے ساقی
ٹھہر جا عمر گذشتہ کو بلا لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

پختہ کاری کی ضرورت ہے محبت میں ابھی
رنگ بھرنے کا ہے تصویر صداقت میں ابھی
کام آنا ہے غریبوں کی مصیبت میں ابھی
اپنی روٹھی ہوئی غیرت کو منا لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

بے پیے مست بہاروں میں نظر جھومتی ہے
سن رہا ہوں کہ وہاں حور بھی ہے خلد بھی ہے
ہمسفر سانس تو لے ایسی بھی کیا جلدی ہے
وہ بضد ہیں انہیں اک نظم سنا لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

بھول جائے نگہ شوق جوانی کا سہاگ
ہر نفس میں خلش و غم کے تڑپنے لگیں راگ
آگ لگ جائے محبت کے بھرے گھر میں بھی آگ
ایک ایسی بھی نظر ان سے ملا لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

آنکھ کو جرأت اعجاز نہ دے کر جاؤ
ہوش کو دعوت پرواز نہ دیکر جاؤ
یوں ہی رسماً مجھے آواز نہ دے کر جاؤ
ٹھیرو ٹھیرو میں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

دیکھنا بھی ہے گناہ بات بھی کرنا ہے گناہ
جب یہ عالم ہے تو کیوں کر ہو یہاں اپنا نباہ
آہ کرنا ہے مجھے اور فقط ایک ہی آہ
دل کو بھی دل کی نگاہوں سے چھپا لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

کم ہوا جاتا ہے آنکھوں کا اجالا ساقی
وہ مرا ساغر مہتاب اٹھالا ساقی
تاکہ ششدر ہو مجھے دیکھنے والا ساقی
ہوش کھو لوں تو چلوں ہوش میں آ لوں تو چلوں
محفل ناز کے تاروں کو جگا لوں تو چلوں

ساغر چشتی

بھگوان نہیں ہے!

کہتا تھا سر شام یہ اک بندہ مزدور
میرا تو خداوند پہ ایمان نہیں ہے
یہ ظلم یہ انیائے یہ دنیا یہ زمانہ
محسوس یہ ہوتا ہے کہ بھگوان نہیں ہے

معبود کہاں ہے؟

سجدے تو تڑپتے ہیں یہ مسجود کہاں ہے
جو حمد کے لائق ہو وہ محمود کہاں ہے
باطل کے خداؤں کی ہے دنیا میں خدائی
معبود کہاں ہے ارے معبود کہاں ہے

سرار الہام (عثمانیہ)



(ایک مختصر ڈراما۔ تین مناظر میں)

پیش رس

بہزاد نامی ایک مصور اپنے ایک نوجوان دوست شاہد کی تصویر تیار کرنے میں مصروف ہے۔ کام کا بیشتر حصہ ختم ہو چکا ہے۔ بس ایک نشست کی کسر رہ گئی ہے۔ بہزاد بیتابی کے ساتھ شاہد نے آنیکی راہ دیکھ رہا ہے۔

اتنے میں ایک بے تکلف دوست نواب ہمایون ٹپک پڑتے ہیں۔ ہمایون بھی ایک انوکھا فنکار ہے جس کی زبان اور نگاہوں میں بلا کا جادو ہے۔ بہزاد کو دھڑکا لگا ہے کہ وہ شاہد کو رام کر کے کہیں اپنے ڈھب کا نہ کرلے۔ یہ ہو کر رہتا ہے۔

پہلا منظر

(بہزاد کا تصویر گھر)

اشارات ۔ ایک خوش وضع تصویر گھر۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک چوکھٹا جس پر تصویر کھینچنے کا کرچ (کینوس) لگا ہوا ہے۔ بائیں جانب ایک ایستانہ۔ کچھ فاصلے پر الٹے ہاتھ کی طرف ایک بڑا سا پیانو۔

پردہ اٹھتا ہے۔ بہزاد رنگ آمیزیوں میں مصروف ہے۔

(دستک کی آواز باقر (بہزاد کا نوکر) داخل ہوتا ہے)

بہزاد ۔ کون باقر کون ہے دروازے پر؟

باقر ۔ حضور۔ نواب ہمایون تشریف لائے ہیں۔

بہزاد ۔ میں اس وقت نہیں مل سکتا۔ مجھے شاہد بہال کا انتظار ہے۔ ہمایون کو کسی طرح ٹال دو۔

(باقر جاتا ہے)

ہمایون ۔ (اندر آتے ہوئے) بہزاد۔ یہ شاہد بہال کون ہے؟

بہزاد ۔ میرے آرٹ کا ایک انوکھا موضوع۔

ہمایون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر بہزاد۔ اس وقت تو مزہ آگیا تمھارا چھپا اور چاہا ایک نہ ہوا۔ اور ہم بن بلائے مہمان ہو گئے۔ (ٹوپی پیانو پر رکھتے ہوئے) واللہ! بن بلائے آنے میں ایک مزہ ہے۔ یہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ بس وہی دہن؟ (تصویر کے قریب آکر) بھئی واہ! کیا تصویر ہے! بخدا!! اسکے دیکھنے سے میرے دل میں کھوج کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔

بہزاد ۔ دیکھو وہی ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نا؟ جس سے میں ڈرتا تھا۔

ہمایون ۔ نہیں بہزاد۔ تمھیں ناحق کا دھڑکا ہے۔

بہزاد ۔ ہمایون۔ مجھے تمہاری کھوجیلی طبیعت سے دھڑکا ہی رہتا ہے۔ تم بڑے گنی پاپی ہو!!

ہمایون ۔ (ہنس کر) تمھیں خبر نہیں گن پاپ ہی سے نکلا ہے پھر گنی پاپی ہونے میں قباحت کیا ہے۔ مگر بہزاد۔ سچ کہتا ہوں تمھارے ہاتھوں نے ایسی سندر تصویر ابتک نہیں کھینچی۔

بہزاد ۔ سچ کہتے ہو؟

ہمایون ۔ سچ بہزاد۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ایک بات مانوگے؟

بہزاد ۔ کیا؟

ہمایون ۔ اسے بانکی پور کے نمائش گھر بھیجدو۔

بہزاد ۔ کبھی نہیں۔

ہمایون ۔ کیوں؟

بہزاد ۔ میں تماشہ بننا نہیں چاھتا۔

ہمایون ۔ تماشہ کیا؟

بہزاد ۔ اس تصویر کے اندر میں نے خود کو آئینہ کردیا ہے۔

ہمایون ۔ ہر اچھی تصویر اپنے کھینچنے والے کا پتہ دیتی ہے کھینچنے والا تو بس کھنچ جاتا ہے۔

بہزاد ۔ ہمایون تم میرے ارادے کو اور مضبوط کر رہے ہو بس کہدیا۔ میں تماشہ بننا نہیں چاھتا۔

ہمایون ۔ جو کہتا ہوں کر کے تو دیکھو۔ اس دیس کے چاروں

کھونٹ ایک دھوم مچ جائیگی ۔

بہزاد ۔ میں اس ادھم سے باز آیا ۔

ھمایون ۔ کیسی باتیں کرتے ہو ۔ جانتے ہو ایک آرٹسٹ کی ٹریجڈی کیا ہے ؟ یہی کہ اپنے پرائے میں اسکی کوئی مان نہ ہو ۔ بھلے مانس ۔ کیا تم نام کمانا نہیں چاہتے ۔

بہزاد ۔ ایسے نام کو میرا پرنام ۔

ھمایون ۔ کیسی کھوسٹ پن کی باتیں کرتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سارا یہی دیکھا کہ ایک اچھا آرٹسٹ اس معاملے میں کچھ الول جلول سا ھوتا ہے ۔ وہ آرٹ کے پیچھے مرٹتا ہے اور اپنی زندگی کو بے رس بنا دیتا ہے ۔ اس کے بجائے ایک گھٹیا درجے کا آرٹسٹ جو آکاش کے تارے توڑکر لانے کی دھن میں نہیں رہتا ۔ سا دلچسپ ثابت ہوا ہے ۔ وہ اپنے اوھورے کام ہی سے ہمارا دل موہ لیتا ہے ۔ مگر خیر (سگریٹ سلگاتے ہوے) اس لڑکے کا کچھ حال سنا جاو ۔

بہزاد ۔ تمھیں اس سے دلچسپی نہ ہوگی ۔

ھمایون ۔ شاھد نہال !!! (دیا سلائی بجھاتے ہوے) ٹھیک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی تمھارے منہ سے یہ سندر نام سنا تھا ۔ سنو بہزاد ۔ اس لڑکے کا وجود میرے آرٹ کے لیے بھی اتنا ہی بانکا موضوع بن سکتا ہے جتنا کہ تمھارے موقلم کے لیے ۔

بہزاد ۔ تمھارے آرٹ کے لیے ؟ کیا خوب ۔ ھمایون میں سچ کہتا ہوں کہ یہ لڑکا معصومانہ عفت کی مورت ہے ۔ میں ایک منٹ کے لیے یہ گوارا نہ کرسکوں گا کہ وہ تمھاری فن کارانہ بیدردیوں کا شکار بنے ۔ نہیں ۔
اس کا وجود میرے آرٹ کے لیے بہت ہی نیک ہے ۔ اس کا حسن مجھے نیکوکاری ۔ صداقت اور سچائی کا درس دیتا ہے ۔

(باقر داخل ہوتا ہے)

باقر ۔ حضور ۔ شاھد میاں آگئے ۔

(شاھد داخل ہوتا ہے)

بہزاد ۔ شاھد میں کب سے تمھاری راہ دیکھ رہا ہوں آج کی نشست بہت ضروری ہے ۔ تمھارے سامنے سجیدہ سنجیدہ کام ہے ۔

شاھد ۔ (ھمایون کی طرف غلط انداز نظر دوڑاتے ہوے) بہزاد تمھاری سنجیدگی سے میں تنگ آگیا ہوں ۔

بہزاد ۔ (تعارف کراتے ہوے) ھمایون شاھد سے ملو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاھد یہ ہیں ۔ ھمایون اختر ۔ ایک ۔ ایک خطرناک دوست اور ایک دلچسپ دشمن ! (دونوں مصافحہ کرتے ہیں) اچھا ھمایون ! اب چلتے بنو ۔

(ھمایون اپنی ٹوپی لینے کے لیے پیانو کی طرف بڑھتا ہے)

شاھد ۔ ٹھہر جایے ۔ آپ سچ مچ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ کچھ دیر گپ شپ ہی رہے گی ۔ میاں بہزاد تو بس آرٹسٹ ہیں ۔ ان کی رفاقت سے تنہائی بھلی ۔

ھمایون ۔ شاھد صاحب ! انسان کا تنہا رہنا اور مجرد رھنا ہی بھلا ۔ میرے نزدیک یہ بھی ایک آرٹ ہے ۔ لیکن خیر میری رفاقت منظور ہے تو ٹھہر جاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ مگر بہزاد کی اجازت شرط ہے ۔

شاھد ۔ کیوں بہزاد ؟

بہزاد ۔ ھمایون ! یہی ان کی مرضی ہے تو ٹھہر جاو ۔ سچ ہے یہاں بیٹھے بیٹھے طبیعت الجھتی ہوگی ۔ تم دونوں باتیں کرتے رہو ۔ مجھے تو سننے اور شریک ہونے کی فرصت نہیں لیکن شاہد کہیں ھمایون کی کشش میں نہ آجانا ۔ یہ حضرت جو کچھ فرماتے ہیں اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا اثر مخرب ہے ۔

شاھد ۔ سچ مچ ۔

ھمایون ۔ شاھد صاحب ! اثر سبھی مخرب ہوتا ہے ۔

شاھد ۔ یہ کیسے ۔

ھمایون ۔ کسی کو اپنا تابع اثر کرنا یہ ہے کہ انسان اپنا سب کچھ دے بیٹھے ۔ خود دیوالیہ بنے اور اس کی بھی باڑہ مارے ۔ کہنے کو سبھی کہتے ہیں کہ ہر شخص کے لیے اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ضروری ہے ۔ مگر کتنے ہیں جو ثابت قدمی اور بے باکی کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں ۔ . . . . ضمیر ہمیں بزدل بنا دیتا ہے ۔ اور مقلدی ہماری سرشت کو بے جان کر دیتی ہے ۔

شاھد ۔ ھمایون صاحب ۔ آپ نے مجھے سوچ میں ڈال دیا ۔

ھمایون ۔ مجھے یقین نہیں . . . . سوچ سے آپ کے ماتھے پر بل پڑ جایں گے ۔ میں نے تو ابھی کچھ لمحوں کے لیے مشاہدہ نفسی کی جانب آپ کو مایل کیا ہے ۔ ع

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے ۔ شاھد صاحب ! آپ کی زندگی رنگینیوں سے معمور ہو سکتی ہے ۔ بشرطیکہ آپ کچھ جرات سے کام لیں ۔ آپ کا یہ حسن جنس نایاب ہے ۔ لڑکیاں پروانہ وار اس پر گریں گی اور مائیں جل کر کوسنے دیں گی ۔ لیکن حسن شباب سے اور شباب ہی سب کچھ ہے (شاھد ہنس پڑتا ہے) ہنسو نہیں ۔ یہ ہنسی کہاں ہو گی جب ان لبوں پر جذبات اور فکر کی مہر لگ جائیگی چند لاجواب مال اس وقت تمھارے قابو میں ہیں ۔ انکی برکتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لو ۔ اور زندگی اور اخلاق کی ھچر مچر میں نہ پڑو ۔

(بہزاد ابتک دونوں سے بے خبر ۔ اپنی دھن میں ڈوبا ہوا اور تصویر کی تکمیل میں مصروف تھا ۔ تصویر کا کام ختم ہوتے ہی مارے خوشی کے اچھل پڑتا ہے)

بہزاد ۔ شاھد ! ھمایون !! مجھے مبارکباد دو ۔ تصویر ختم ہو چکی !!!

ھمایون ۔ اے صل علیٰ !!

(شاھد اداس اور خاموش کھڑا رہتا ہے)

بہزاد ۔ کیون شاھد کس سوچ میں ہو ؟ تمھیں یہ تصویر پسند نہیں ؟

شاھد ۔ سوچتا ہوں کیسی کرکری ہو گی . . . . . . میرا یہ روپ رنگ ایک دن رخصت ہو جائے گا ۔ میں بڑھا ہو جاؤں گا اور یہ تصویر میری ہنسی اڑائیگی ۔ زندگی کا انجام اور شباب کی حقیقت آج معلوم ہو گئی ۔

بہزاد ۔ یہ کیا !!! تم نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ۔ کاش اس تصویر کا مضحکہ اڑا سکتا . . . . . . میں تمام دنیا بلکہ اپنی روح سے بھی منہ موڑنے کے لیے آمادہ ہوں بشرطیکہ مجھے اس تصویر کی حیات مل جائے . . . کہ میں سالہا سال جوان رہ سکوں اور اس کے حسن کو ڈھلتا دیکھوں ۔

بہزاد ۔ میں تو کبھی اس کی پرواہ نہ کروں ۔

شاھد ۔ تمھیں کیون پرواہ کرنے چلی — آپ بھلے آپ کا فن بھلا ۔

(بہزاد ۔ شاھد کی طرف بڑھتا ہے ھمایون تصویر کی طرف)

بہزاد ۔ شاھد کیا سچ مچ تمھارا یہی خیال ہے ۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمھیں اس تصویر سے نفرت ہے ۔ (ھمایون سے) ھمایون ۔ یہ سب آپ کی کارستانی ہے ۔ تم نے اس بچے کو میرے پیچھے کیا پٹی پڑھائی ؟

ھمایون ۔ میں نے ان کے آگے ان کی روح کا نقشہ کھینچا ۔

بہزاد ۔ ھمایون ۔ افسوس ! . . . . . تم نے ہمیں تنہا چھوڑا ہوتا ۔

ھمایون ۔ جو ہونا تھا ہو چکا — بہزاد ! یہ کہو آج کھیل دیکھنے چلو گے ؟

بہزاد ۔ مجھ میں سکت نہیں ۔ میں نڈھال ہو رہا ہوں ۔

ھمایون ۔ بھلے مانس جاؤ پہلے منہ ہاتھ دھو لو ۔ جی تصفیہ ہو گا ۔

(بہزاد گھر کے اندر جاتا ہے)

ھمایون ۔ (شاھد سے) کیوں شاھد صاحب ۔ آپ چلیں گے ؟ یا بہزاد کی طرح آپ بھی نڈھال ہو رہے ہیں ؟

شاھد ۔ (جھجکتا ہوا) مجھے . . . . . . مجھے ایک جگہ جانا ہے ۔

ھمایون ۔ آپ کو "کسی" کا اتنا پاس ہے ۔
شاھد ۔ یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا ۔ ھمایون صاحب ۔ آپ تو کچھ شیطان سے بھی سیانے معلوم ہوتے ہیں ۔
ھمایوں ۔ کیوں نہیں ۔ میں ان بزرگوار سے جگہوں بعد یہاں آیا ہوں ۔ خیر ۔ یہ تو بتایئے آپکی منظور نظر کون ہیں ؟
شاھد ۔ ایک حسین اور باکمال ایکٹرس ۔
ھمایون ۔ اور غالباً جوان ۔ یہ وہ ادرس بھی ؟
شاھد ۔ نہیں —— کمسن اور پاکباز ۔
ھمایون ۔ کیا خوب ۔ ع ۔ دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں ۔ اور آپ اس کے ساتھ خانہ آبادی کی نیت رکھتے ہیں ۔
شاھد ۔ ھمایون صاحب مذاق نہیں ۔ . . . . نرگس بڑی پاکباز
ھمایون ۔ چشم بد دور ! !
شاھد ۔ یہ کیا ۔
ھمایون ۔ کچھ نہیں —— فرمایئے کچھ اور ۔
شاھد ۔ سمجھ میں نہیں آتا ۔ آخر کیوں آپ کے سامنے اس کا ذکر کروں ۔
ھمایوں ۔ آیندہ سے آپ سب کچھ بتادیا کریں گے ۔
شاھد ۔ کیا بات ۔ ھمایون صاحب ۔ آپ نے مجھے احمق سمجھ رکھا ہے ؟ ۔
ھمایون ۔ نہیں صرف —— تندرست ! کوئی تندرست حیوان سوچنے کا عادی نہیں ہوتا ۔ غور و فکر اس کے نزدیک کہٹر اگ ہے مگر خیر ۔ نرگس کا نہیں تو کچھ اپنا ہی حال سنا جائے ۔
شاھد ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری زندگی میں آپ کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ۔
ھمایون ۔ نہیں ۔ میں آپ میں بہت سی دلچسپیوں کے امکان پاتا ہوں ۔
ع ۔ سالے کہ نکوست از بہارش پیداست ۔
شاہد صاحب آپ کو اپنے نوخیز شباب سے ناامید نہ ہونا چاہیے
یہ زندگی کا وہ انوکھا تجربہ ہے جو ہر ایک کو نہیں ملتا ۔
شاھد ۔ ھاں ۔ زندگی کے ابھی بہت نشیب و فراز دیکھنے ہیں ۔ میں نے تو ابھی یہ بھی طے نہیں کیا کہ مجھے کیا کرنا ہے ۔
ھمایون ۔ میں بتادوں کیا کرنا ہے . . . . . . پہلے اپنے خیالات ارادوں اور   کو مجھ پر ظاہر کر دیجیے ۔
شاھد ۔ مجھے دھڑکا ہے آپ میری ہنسی اڑائیں گے ۔
ھمایون ۔ میں اور آپ کی ہنسی اڑاوں ۔
شاھد ۔ عام لوگ جن سے ملنے جلنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے میں خود کو ان سے جدا پاتا ہوں ۔ مجھے ان کے روکھے پھیکے دھندوں سے جن میں وہ دن رات ڈوبے رہتے ہیں ذرہ دلبستگی نہیں ہوتی ۔ شکار ۔ شطرنج ۔ اور سیاسیات میرے نزدیک کھیل ہیں ۔
ھمایون ۔ زندگی خود کھیل ہے ۔
شاھد ۔ شاید لیکن بہی سنجیدہ کھیل . . . . . میں جانتا ہوں دنیا میں کچھ کام کروں اور اپنی دولت سے دوسروں کی مدد کروں ۔
ھمایون ۔ ہا ! خیر خیرات ؟
شاھد ۔ ہاں . . . . —— . . . . منفعت رسانی ۔
ھمایون ۔ یہ بھی ایک طرح کی نفس پروری ہے ۔
شاھد ۔ پھر تو اندیشہ ہے کہ میں کسی طرح مفید نہیں بن سکتا ۔
ھمایون ۔ حسین ہونا مفید ہونے سے بدرجہا بہتر ہے ۔ لوگ حسن کو نظرانداز کر دیتے ہیں ۔
شاھد ۔ اس کے باوجود بھی اگر میں مفید نہ ہوسکا —— تو ؟ میں خود میں کوئی ہنر نہیں پاتا ۔ . . . . . . مجھ میں اگر کوئی کمال ہوتا ۔
ھمایون ۔ زندگی سب سے بڑا کمال ہے ۔ زندگی کو ڈھالنا سنوارنا ۔ بنانا ایسا ہی مقدس فرض ہے جیسا کہ ایک مندر کی سہانی فضا میں بیٹھ کر رام نام کی سمرن کرنا ۔

شاھد ۔ کیا پاکیزہ خیال ہے!! میں بھی اکثر یہی محسوس کرتا رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب میں اس پر عمل پیرا ہوکر اسی کے نام سمرن کرونگا ۔

ھمایون ۔ تم بہت جلد دیکھ لوگے کہ میں اس کا پجاری بن کر سب کچھ بیچ دوں گا ۔

ھمایون ۔ ٹھیک ۔ بہت ٹھیک ۔ لیکن یہ کہو نرگس دیوی کے درشن کب کراؤ گے ؟

شاھد ۔ جب کہیے ۔ اب تک میں آپ کو بے درد سمجھتا تھا ۔ آپ کے الفاظ نشتر کی طرح دل میں چبھتے تھے لیکن بخدا ان میں زہر نہیں ۔

ھمایون ۔ تو آپ مجھے بے ضرر سمجھتے ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو اس صلح کی خوشی میں آج کی رات میرے ساتھ کھانا کھاؤ ۔

شاھد ۔ منظور ہے !

ھمایون ۔ ! ٹھیک آٹھ بجے میں ملٹری کلب پر رہوں گا ۔ اور ساڑھے آٹھ تک تمہارا انتظار کروں گا ۔

شاھد ۔ بس خاموش ــــ دیکھو وہ بہزاد آ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ نرگس کا نام تک نہ آے ۔

(بہزاد داخل ہوتا ہے)

ھمایون ۔ بہزاد ۔ ہم چلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا حافظ (شاھد سے) دیکھو شاھد ماحضر ــــ ٹھیک آٹھ بجے ۔

(چلا جاتا ہے)

(چند سکنڈ کی خاموشی)

بہزاد ۔ شاھد ایک بات کہوں ؟ ھمایون کی دعوت قبول نہ کرو ۔

شاھد ۔ بھلے مانس آخر کیوں نہیں ؟

بہزاد ۔ تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ۔

شاھد ۔ اس وعظ کو رہنے دیجیے ۔

بہزاد ۔ شاھد تمہارا رنگ آج بدلا ہوا ہے ۔

شاھد ۔ ع ۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن اتنا گزشگزار رہے کہے دیتا ہوں آیندہ سے میں اپنی مصلحت اور مرضی کا مختار ہوں ۔

بہزاد ۔ لیکن اتنا وعدہ کرو کہ ھمایون کے پاس نہ جاؤ گے ۔

شاھد ۔ ھمایون سے مجھے کوئی اندیشہ نہیں ۔

بہزاد ۔ لیکن مجھے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری خاطر ۔

شاھد ۔ کیسے نادان ہو ۔ کہا یا پھر وہی ۔ (گھڑی دیکھ کر) میرے پاس کم وقت ہے ۔ اور ٹھیک آٹھ بجے مجھے ملٹری کلب پر رہنا ہے

بہزاد ۔ (گھبرا کر) یہ تو ھمایون کا کلب ہے ۔

شاھد ۔ اور میرا بھی ۔ فی امان ۔

بہزاد ۔ شاھد ! شاھد !!

شاھد ۔ (جاتے ہوے دور سے) نگہبان ! ۔ ۔ خدا نگہبان !

(باقی) ابوظفر عبدالواحد ام ۔ اے (علیگ)

غزل

یہ جتنے ہیں رخ و گیسوے جاناں دیکھنے والے
انہیں میں کچھ ہیں ہندو کچھ مسلماں دیکھنے والے

محبت چھوڑ کر وحشت کا ساماں دیکھنے والے
مجھے دیکھیں مرا چاک گریباں دیکھنے والے

تجھے بھی کچھ خبر ہے کیا اسیروں پر گذرتی ہے
بہار رونق دیوار زنداں دیکھنے والے

بہار آئی جنوں نے پاؤں پھر اپنے نکالے ہیں
بیاباں جا رہے ہیں اب گلستاں دیکھنے والے

مری تربت کو بھی دیکھیں عدو کی دیکھ کر تربت
نہ جائیں اس طرح گور غریباں دیکھنے والے

یہی عالم رہا گر زلف پیچاں کی اسیری کا
کہاں سے آئیں گے پھر زلف پیچاں دیکھنے والے

ذرا اپنے کو دیکھیں ہیں پھر مجھ کو اے جوہر
خبر دامن کی لیں میرا گریباں دیکھنے والے

سرفراز حسین جوہر لکھنوی

غزل

انجام شوق تا بہ سحر دیکھتے رہے
آہوں سے دور باب اثر دیکھتے رہے

اے چارہ ساز کیا ہوئی حالت ترا [illegible]
وہ آج کیوں بہ زیادہ تر دیکھتے رہے

گھبرا گئے جو صدمۂ درد فراق سے
ہم شام ہی سے خواب سحر دیکھتے رہے

کوتاہیٔ نصیب کا شکوہ ہی کیا کہ ہم
حسرت سے تیری راہگزر دیکھتے رہے

وارفتگان دید سے اے ہمنفس نہ پوچھ
کیا دیکھتے رہے وہ کدھر دیکھتے رہے

جس سمت سے وہ جان تمنا گزر گیا
ہم اسکے نقش راہ گزر دیکھتے رہے

جوش جنوں میں ہوش کہاں اسکی دید کا
دیکھا کیے ادھر ہی جدھر دیکھتے رہے

اب تک تو درد عشق کی حالت وہی رہی
لیکن وہ میرا حال دگر دیکھتے رہے

وابستہ حجاب رہیں بے حجابیاں
نیرنگیٔ فریب نظر دیکھتے رہے

اس بیکسیٔ عشق کا کیا پوچھنا مجیب
مرہم رسیدہ زخم جگر دیکھتے رہے

مجیب جیاآبادی

رباعیات

دنیا [illegible] ایک [illegible] آتا ہی [illegible] کیوں وقت پڑے کی فرقت پچھتاتا
کس [illegible] آج [illegible] چلے مرنے سے جو [illegible] جاتا ہے

انجام [illegible] قریب [illegible] دل کسی طرح سے سنبھلتا ہی نہیں
[illegible] آیا [illegible] تیرا خیال ٹلتا ہی نہیں

کرشن [illegible] ستھر [illegible]

غزل

بچپن کی شوخیوں پہ مٹا جا رہا ہوں میں
ہر ایک ادائے یار سے شرما رہا ہوں میں

اب کیا بتاؤں ہجر میں کیسا رہا ہوں میں
تم پوچھتے اگر ہو تو اچھا رہا ہوں میں

میں خود تڑپ گئے درد محبت سے شام ہجر
جتنے ہیں اہل دل انہیں تڑپا رہا ہوں میں

اہل نظر نے مجھ کو تماشا سمجھ لیا
کچھ اس طرح سے محو تماشا رہا ہوں میں

دنیا میں یوں گزاری ہے دو دن کی زندگی
پھولوں میں پھول کانٹوں میں کانٹا رہا ہوں میں

انجام یہ ہے زندگیٔ عشق کا مری
دل اپنا دے کے یار کو پچھتا رہا ہوں میں

وہ دن بھی مجھ کو یاد ہیں اے رشک جب کبھی
اہل نظر کی آنکھ کا تارا رہا ہوں میں

رشک صدیقی لکھنوی

رباعیات

ہر ایک ادا عین عبادت کی ہوس ؛ اور کفر ہے ہر اہل محبت کی ہوس
سر خاک پہ ہے عرش کی تفریح میں ؛ اس کو نہ پڑا ہو گو ہی جنت کی ہوس

مشہور کبھی تھے جو رضا کے بندے ؛ نالاں ہیں یہی جن سے ریا کے بندے
مسلم ہیں وہی آج بھی مسلم لیکن ؛ اب نفس کے بنتے ہیں خدا کے بندے

جب دیکھیے ہے مال غنیمت پہ نگاہ ؛ اور آلۂ تفریح ہے مظلوم کی آہ
وہ سجدوں پہ جنت کی تمنا ہے ؛ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

گلشن میں گلوں کا کوئی دیوانہ ہے ؛ محفل میں کوئی شمع کا پروانہ ہے
دل اپنے تیرا احسان [illegible] ؛ وہ تیرا ہی جو آپ سے بیگانہ ہے

صبا [illegible]

ٹیگور کے سیاسی عقائد

ہماری سیاست کی نہ کوئی قواعد ہے اور نہ قاعدہ!
یہہ بے رحمانہ مہربانی سے پر ہے۔ ایک مطیع قوم ہونے کی وجہ سے
ہم اپنے آپ کو بیرونی حکمراں کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ لوگ
سب سے زیادہ تعریف کے مستحق سمجھے جاتے ہیں جو چیخ چیخ کر اس
کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اگر پورا پورا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ
ہماری سیاست بالکلیہ بیرونی رحم و کرم پر موقوف ہے۔ رابندر ناتھ
کو اس سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں۔ اس کا عقیدہ انسانی بھائی
چارے میں ہے۔ اس لیے وہ قوت اور طاقت کی کج ادائی کو حقارت
کی نظر سے دیکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ تہذیب کا مقصد انسانوں
کا اتفاق و اتحاد اور امن و خوشی کا قیام ہے اس لیے وہ حرص و
آز نفرت و حقارت کو ٹھکراتا ہے جو صحیح انسانیت کا جذبہ ہے
ٹیگور مخالف بادشاہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک انفرادیت کا حامی
ہے جو اس بات کا معتقد ہے کہ حکومت یا مملکت کا مقصد ایسے
ذرایع اور وسایل کا پیدا کرنا اور ان کو برقرار رکھنا ہے جس سے
بہتر زندگی بسر ہو سکے۔ سماج یا سوسائٹی کا مقصد یہہ ہے کہ وہ بہتر
ترقی دے اور انسانوں کی اخلاقی و روحانی آرزوؤں کو ظاہر کرے
جن کا تعلق اعلیٰ فطرت سے ہے ایک انفرادیت کے حامی کی حیثیت
سے وہ سچائی، انصاف اور حق کو قدرتی طور پر قوت و طاقت سے
منسوب کرنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ یقین رکھتا تھا کہ اخلاقی
انصاف پسندی سے دست بردار ہونا غلامی کا طوق پہننا ہے اس کو
گہری عقیدت تھی کہ سماجی اتحاد عملی انفرادی پیش قدمی کے محدود
کرنے سے مختلف نہیں ہے۔ جس سے انسانوں کا باہمی تصادم فرو
کیا جا سکتا ہے۔ اس کا سیاسی تخیل اس نظریے کا پیدا کردہ ہے کہ
مملکت اور سماجی اتحاد محض قوت اور طاقت کی اجاعت کا نام نہیں
ہے بلکہ صرف انسان کی اخلاقی تحریک کے تابع ہے۔ یہہ ثابت کیا
جا سکتا ہے کہ انسانیت کی تاریخ اس اصول کے خلاف حقیقی ہے کہ
انصاف طاقتور کی مرضی ہے اور اخلاقی آواز و محرکات کوئی قابل
لحاظ چیز نہیں ہیں۔

ہیگل نے اس بات پر زور دیا تھا کہ حقیقی اتحاد عمل کو
مملکت کے تحت حاصل کیا جانا چاہیے اور انسان میں مملکت کے
رکن ہونے کا احساس پیدا کیا جائے ایک شہری کا انفرادی و
اجتماعی مفاد مملکت کے مفاد کے بعد اہمیت رکھتا ہے کیونکہ
مملکت مجسمہ ہوتی ہے عالم گیر خیال کا۔ رابندر ناتھ نے اس
بات پر زور دیا کہ سماجی اتحاد میں مختلف لوگوں کو یکجا کیا جائے
اور ان کو پوری آزادی رہنی چاہیے کہ وہ اپنے اختلافات
کو برقرار رکھیں۔ مملکت کی عظمت غایب ہو جاتی ہے۔ جب یہہ خیال
نہ ہو چونکہ انسان ایک سماجی حیوان ہے اس لیے مقصد یہہ ہونا
چاہیے کہ انسان آپس کے اتحاد کی بدولت ان خیالات کو نشوونما
پانے دے۔ سماجی جماعتوں یا طبقوں کے متعلق ٹیگور کا خیال تھا کہ
وہاں پر طبقہ واری کشمکش کا موقع نہ رہے اور ہر طبقہ یا جماعت
سماج کے لیے اجتماعی خدمت کی شکل میں اپنا حصہ باقی رہے یہی
خیال ہیگل کا بھی تھا لیکن وہ مملکت کے اثرات کا خواہاں تھا اور
ٹیگور اخلاقی محرکات کی ہم آہنگی کا قایل تھا ٹیگور کا خیال تھا کہ ہندستان
کے سماجی اداروں میں جو چیز آجکل جگہ حاصل کر رہی ہے۔ وہ دو
مقاصد کی حامل ہے۔ ایک تو یہہ کہ ہمارے جذبات اور دل کی
آوازوں کو انسانی ترقی سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اور دوسرے
یہہ کہ اس کو اپنے ساتھی انسانوں سے بے غرضانہ محبت کرنا سکھایا جائے
یہہ عقاید فولاد اور شراب کی طرح بے قاعدگی اختیار نہیں کر سکتے۔
بلکہ یہہ انسانوں کو باہمی فطری بھائی چارے کو ترقی دینے میں
مدد دے سکتے ہیں۔ یہہ سماجی محرکات حرص و آز اور نفرت و حقارت
کا سد باب کرتے ہیں اور ایک سماجی ضمیر کو پیدا کرتے ہیں جو موجودہ
دور میں مملکت کی سماجی خدمات کے لیے از حد ضروری ہے ٹیگور
کے سماجی عقاید میں خدمت اور قربانی ہے۔ خدمت اپنے انسانی
بھائی کی اور قربانی اپنی انفرادیت کی یہی وہ نظریہ ہے جو موجودہ
مملکت کی سماجی خدمات کی روح ہے۔

ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹیگور نے مغرب کی اعلیٰ روح کو تو قبول کیا لیکن مغربی قوموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اسٹیٹ یا مملکت انسانوں کے سیاسی و معاشی اتحاد کا نام ہے جو ایک خاص مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ قوم پرستی ٹیگور کے پاس ایک بدترین چیز تھی اور وہ کہتا تھا کہ مغربی اقوام ایک بند کی طرح سے مغربی تہذیب کو پھیلنے سے روک رہے ہیں مغربی تہذیب طاقت والوں کی تہذیب ہے اور اس میں دوسروں کا حصہ نہیں ہے۔ فطرتی طور پر اس کے دروازے ان لوگوں کے لیے بند ہیں جن کو مغربی اقوام نے تباہ کرنے کے لیے چن لیا ہے۔ انگلستان کے ہاتھوں ہندستان کی تباہی دو وجہ سے بہت خطرناک ہے :-

۱۔ حکومت انگلستان کی تنظیم بہت اچھی ہے۔ انسانی تاریخ میں قومیت کی زنجیر سے بڑھ کر کوئی مضبوط زنجیر تیار نہیں ہوئی جس کو کوئی شخص نہیں توڑ سکتا۔

۲۔ برطانیہ کی حکومت سے قبل ہندستان پر بیرونی حملے ہوئے اور بیرونی حکومت رہی۔ اس کو بادشاہوں اور انسانی نسلوں سے سابقہ پڑا۔ ہندستان نے ان سے محبت بھی کی اور حقارت بھی۔ جیسا بھی موقع رہا۔ لیکن برطانوی فتح کے بعد ہندستان کو پرائی حکومت سے سابقہ پڑا جو اجنبی بادشاہ کی حکومت نہیں بلکہ اجنبی قوم کی حکومت ہے۔ ہندستان ..... پہلی دفعہ ..... لوٹا جانے لگا۔ ایک اجنبی قوم کے ہاتھوں ایک اجنبی قوم کے مفاد کے لیے۔ وہ اپنے حکمراں کی ضروریات اور حرص کو پورا کر سکتا ہے لیکن یہہ ناممکن تھا کہ وہ تباہی سے محفوظ رہے جب کہ ایک مسلسل اور منظم لوٹ جاری تھی جو ایک منظم قوم کی طرف سے دور بیٹھی ہوئی قوم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کی جا رہی تھی۔ ان حالات میں ہندستان برباد ہوا۔ اس نے ہندستان کے سماجی تخیلات کو چکنا چور کر دیا۔ اور ایسے طبقے پیدا کیے کہ جو ہندستان کی تباہی میں برطانیہ کے ممد و معاون ہو سکتے تھے اور ایک بھیک کی سیاست کو رواج دیا۔

(پولی ٹکس آف دی بگنگ) اس پس منظر میں ٹیگور کے سیاسی عقاید نے اپنی جگہ حاصل کی اس کا سیاسی فلسفہ چند بنیادی اسباب پر مبنی تھا۔

۱۔ ٹیگور کی یہہ خوش عقیدگی تھی کہ ہندستان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک تعمیری کام ہے جس کو خود اس نے مرتب کیا ہو اس کام کے لیے لوگ ہر قسم کے خطرے میں پڑیں اور اپنا کام جاری رکھیں۔ سچائی کے لیے ہر قسم کی مصیبت برداشت کرنے کی قوت کا مظاہرہ کریں۔ اس کے نزدیک ہاتھ جوڑ کر مہربانی اور آزادی کی التجا کرنے اور اپنے غصے کا اظہار کر کے مہربانی اور آزادی طلب کرنے میں بہت تھوڑا فرق تھا۔ ٹیگور جانتا تھا کہ جہاں ہم اپنی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے وہاں پر مانگنا ضروری ہے دوسروں کے رحم و کرم پر چھیتڑے لگا کر رہنا ایک قوم کے لیے انتہائی شرمناک ہے۔

ٹیگور کہتا ہے :-

اے قیدی کہہ کہ اس مضبوط زنجیر کو کس نے بنایا۔

"وہ میں ہی ہوں" قیدی نے کہا جو بہت ہشیاری سے یہہ مضبوط زنجیر لی۔

۲۔ ٹیگور کا "سودیشی سماج" اس کے اپنے عقیدے کا مظہر ہے کہ ہندستان کا مسئلہ محض سماجی ہے اور اس کا حل بھی سماجی اتحاد عمل کے ذریعے ہو سکتا ہے اس کی اسکیم میں ہندستانی ذرایع اور ہندستانی وسایل کی تنظیم تھی جس میں بیرونی سررشتہ داری یا اہلکاروں کی حکومت کو دخل نہ تھا۔ اس کی اسکیم میں برطانوی نظم و نسق اور برطانوی اشیا سے بائیکاٹ ضروری تھا۔ مملکت کے توسط سے زندگی کو حرص و رقابت کے لیے وقف کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ قوت پر حملے کی بھی نصیحت نہیں کرتا تھا۔ وہ سوسائٹی کو بلند کرنا چاہتا تھا اور سماجی اتحاد عمل کی ترقی اس کی اسکیم کی بنیاد ہی تھی۔

۳۔ ٹیگور نے متعدد مرتبہ اس بات پر زور دیا کہ انسان ترقی کرے اور اپنے ساتھ اخلاقی قوتوں کو بھی ترقی دے۔ وہ بتاتا ہے کہ بیرونی تہذیب و تمدن کو مشتبہ نظروں سے نہ دیکھا جائے۔

لیکن ہندستانی اپنے تمدن اور تہذیب کو پوری طرح سے سب پر ظاہر کریں وہ اپنے ہم وطنوں کو یورپی تہذیب کی طرف مایل ہونے پر ملامت کرتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے شاندار ماضی کو پس پشت ڈالدیا ٹیگور اچھی طرح سے جانتا تھا کہ انگریز ہماری صرف اسی وقت عزت کریں گے جب ہم طاقتور ہو جائیں گے۔ اور وہ یہہ بھی جانتا تھا کہ کمزور ہمیشہ قوت والے کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا رہیگا۔ اس لیے وہ ہدایت کرتا ہے کہ "جس کسی کمزوری کو ہم اپنے سماج میں جگہ دیں گے وہ ہماری سیاست میں خطرہ بن جاے گی۔ وہی جمود اور سکون جو ہمارے موجودہ مردہ سماج کی طرف لیجاتا ہے ہماری سیاست میں ایسے قید خانے بناے گا جس کی دیواریں ناقابل شکستنی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیگور خطرے کی گھنٹی بجا کر آگاہ کرتا ہے کہ موجودہ سیاسی آزادی کی عمارت سماجی غلامی کی ریت پر کھڑی کی گئی ہے وہ ناقدین کو جواب دیتا ہے کہ "موجودہ سماجی کمزوریوں کے ڈھیر میں سیاسی آزادی کو ڈھونڈنا خود ہماری اپنی حقیقی تاریخی روایات کی نہر پر بند باندھنے کے مترادف ہے۔" وہ جن کو سیاسی آزادی حاصل ہے حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہیں بلکہ وہ صرف طاقتور ہیں۔ سیاسی آزادی کے نفاذ میں غلامی کی تنظیم اور مضبوط زنجیریں بندھی ہیں۔ ایسی سیاسی قوت پر فریفتہ ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

جب ٹیگور مغرب کی فتنہ پرداز تحریک قومیت کے خطرات بتاتا اور سماجی اتحاد عمل کی ہدایت کرتا جس میں نفرت و حقارت اور حرص و لالچ کے ادنیٰ جذبات نہیں ہیں تو ناقدین اس کو بے رنگ بین الاقوامی سیاست داں، کھوکھلا تصور پسند، وہ جو صرف تعریف و توصیف حاصل کر سکتا ہے لیکن کوئی بھی اس کا پیرو نہیں وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں۔ اس کے ہموطن مغربی سیاسی فلسفے میں مخمور مگر اس کی سیاسی تعلیمات کو قبول نہ کیا اور مغربی باشندوں نے اپنی قوت اور طاقت کے گھمنڈ میں ٹیگور کی تعلیمات کی اچھائیوں کو معلوم نہ کیا۔ مختلف سیاسی مکتب خیال کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہہ بات بہت دلچسپ ہے کہ آجکل قومیت کا مغربی تخیل جو با اقتدار مملکت کی بنیاد پر تھا۔ خود مغربی سیاسی مفکرین کی سخت تنقید کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اب یہہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مملکت میں تابعداری اور فرمانبرداری (مالی، عدلی، انتظامی) کسی طرح بھی مملکت کے لیے کسر شان نہیں ہو سکتی۔ آجکل کے مفکرین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ قومیت کا تخیل شہنشاہیت کی پرورش کرتا ہے اور وہ اس امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مستقبل میں کسی قومی مملکت کو (موجودہ مفہوم میں) اقتدار اعلیٰ حاصل نہ رہیگا یہہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے کہ قومی مملکت کی حدود میں عام بہبودی کے مد نظر کسی مداخلت کو روا نہیں رکھا جا سکتا اس عام بے چینی جنگ کو روکنے کی خاطر (جو ساری دنیا میں اسوقت موجود ہے) جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ ایک طرح سے ٹیگور کی بتلائی ہوئی راہ پر ہی ہیں جو اس نے قومیت کے سلسلے میں بتائی ہیں۔ اور جہاں وہ مذمت کرتا ہے کہ قوم اپنی قوت کے ساز و سامان اور خوشحالی کے "اپنے قلم اور مقدس ترانوں کے" اپنی کفرانہ عبادتوں کے جو عبادت گاہوں میں ہوتی ہے اور ساری وطن کی محبت کی چیخوں کے" اس بات پر پردہ نہیں ڈال سکتی کہ قوم قوم کے لیے بھی سب سے بڑی برائی ہے۔ اور یہہ کہ ساری حفاظتی تدابیر خود اس کے خلاف ہیں اور ایک ساتھی انسان کا دنیا میں آنا اس کے دل میں نئے خطرات کو پیدا کرتا ہے مغرب نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ "انسان اپنی انتہا پر قوت والا نہیں بلکہ مکمل انسان ہوگا۔" موجودہ عالمی کساد بازاری دراصل با اقتدار قومی مملکتوں کی تقسیم اور ان کی جماعت بندی اور ایک دوسرے پر عدم اعتماد کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ٹیگور اس امید کی پرورش کرتا ہے کہ جب صبح ہوگی اور قوم کی سیڑھیوں کو جو خون میں بھرے ہوے ہیں دھویا جاے گا جو عین انسانیت کی شاہراہ اختیار کرنے کا نتیجہ ہوگا تو ہندستان کو ــــ جہاں کبھی بھی حقیقی طور پر موجودہ قومیت اثر نہیں کی تھی۔ اپنے برتن میں مقدس پانی لیکر انسانی تاریخ کو شیریں اور خالص کرنے اور صدیوں سے روندی ہوئی دھول کو بار آور بنانے کے لیے بلایا جاے گا ٹیگور صبر کی ہدایت کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"ہم کو ہماری موجودہ ہتک کو برداشت کرنا چاہیے۔ اور جاننا چاہیے کہ یہ آگ روشنی تو رکھتی ہے مگر اس میں استقلال نہیں کیونکہ ان کی قوتوں کی وجہ سے ان میں بھک سے اڑ جانے کا مادہ پیدا ہو گیا ہے جو ان کی کمزوری ہے۔"

ٹیگور کی سیاسی تعلیمات پر ہندستان کی تاریخ کا گہرا اثر تھا جس میں انسان صرف غذا ہضم کرنے والا حیوان نہیں سمجھا گیا تھا۔ بلکہ اس کے سامنے ایک تصور تھا جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا اس کو حاصل کرنے کی ایک راہ تھی اور وہ سچائی تھی۔ اس نے یورپ اس مقام پر انسانیت کی مذمت کی ہے جہاں وہ اس مقصد عظیم کو حاصل کرنے سے رکا یا پس وپیش کیا۔ ٹیگور کا عقیدہ تھا کہ ہندستان اتحاد عمل کی بنیادوں پر مضبوطی سے قائم رہے۔ جہاں کہیں انسان اس اتحاد کو حاصل کرنے میں ناکام ہوا وہاں انسانیت کو شکست ہوئی۔ انسان کی زندگی میں جو چیزیں سب سے زیادہ قیمتی ہیں وہ آزادی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہی اس کے سیاسی فلسفے کی کنجی تھی۔

ٹیگور کی سیاسی تعلیمات کو سمجھنے اور پوری طرح سے استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بنگال کے ماحول کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے۔ انیسویں صدی میں بنگال میں دو متضاد ذہنی تصورات تھے۔ راجہ رام موہن رائے جدت پسند تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ اجتماعی زندگی لا متناہی سلسلہ ہے جو آمیزش اور میل سے پر ہے۔ دوسرا حلقہ قدامت پسندوں کا تھا جو راسخ الاعتقاد ہندو تھے۔ اس سلسلے میں بنیادی عمل کے اعتبار سے ٹیگور راجہ رام موہن رائے کے خاندانی وارث تھے۔ اس زمانے میں بنگال مغربی تہذیب و تمدن کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اٹھارویں صدی میں بنگال پر ایک تجارتی تنظیم "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی حکومت درحقیقت برٹش پارلیمنٹ کی حکومت تھی جو بنگالیوں اور ان کے مال و دولت کا دیوالیہ نکال دیا۔ خود کشی کی طرف رہبری کرنے والی خارجی حکومت، خارجی تہذیب اور خارجی مہم بالکل نظرانداز کرتے ہوئے ٹیگور اپنی ایک علیحدہ راہ تلاش کرتا اور نکالتا ہے۔ اس وقت جو نظریہ اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا وہ یہ تھا کہ "سچائی حقیقت اور واقعات میں نہیں ہوتی بلکہ واقعات اور حقیقت کو ملانے سے پیدا ہوتی ہے۔ نفع کمانے والی کا مشغلہ (وزن کا پیمانہ) خارجی تباہ کاری انگریزی نظم و نسق کا بے روح ڈھانچہ انسانی فلاح و بہبودی کے متعلق موجودہ قومیت کا طنز آمیز اور بے روح ... وطنی جو تہذیب پر منڈلا رہی ہے ان سب پر جو سچائی کی پردہ پوشی کرتی ہیں۔ ٹیگور نے سخت تنقید کی ہے۔ اس کے سیاسی عقائد پر انسانیت کا گہرا اثر تھا۔ وہ کوئی پیشہ ور سیاست داں نہ تھا۔ وہ بیرونی خوف و ہراس سے آزادی چاہتا تھا۔ وہ صرف ... کے بارے آزادی چاہتا تھا جیسے مستقبل کی طرف سے ہم کو اندھا اور بے خبر بنا دیا ہے ... ذلیلوں کی دنیا میں رہنے کی ہتک سے آزادی چاہتا تھا ... دماغ ... سے پیدا ہوتی تھی وہ ہنگامہ ... سے آزادی چاہتا تھا جس کے بازیابی پوری طرح سے خیالی ... کے تابع ہیں۔

ہندستان میں برطانوی سیاست نے جو رویہ اختیار کی ہے وہ اس کی بری طرح مذمت کرتا ہے اور ہر موقع پر بیباک دل کہتا ہے "ہماری قوم کے دل میں جس جذبہ نفرت کا ہمہ گیر احساس پیدا ہوا اس سے ہمارے حکمرانوں نے تغافل کیا ممکن ہے کہ وہ اس اپنے آپ کو لائق تحسین سمجھتے ہوں" ۱۹۱۹ء کے پنجاب و بنگال کے سیاسی ہنگاموں کو فرد کرنے میں حکومت نے جو تدابیر اختیار کیں ان کی سختی و شدت نے ایک سخت صدمے کے ساتھ اس کے دماغ میں عالت بے چارگی کا احساس پیدا کیا۔ اس دور میں حکومت نے صحافت کی ایک مایوس کن پالیسی اختیار کی۔ اکثر اینگلو انڈین اخبارات نے حکومت کے ہر اقدام کو سراہا یا اور ہندستانیوں کے مصائب کا مضحکہ اڑایا اور اس قوت نے ان کی ذرا بھی مزاحمت نہ کی بلکہ وہ شدت درد کی ہر چیخ اور جذبات کے ہر اظہار کو جو مصیبت زدگان کے ... اخبارات کے ذریعے ہوتا تھا سنگدلانہ ہوشیاری سے دبانے میں مصروف رہی۔ ان تمام حالات سے متاثر ہو کر جس کا اظہار اس نے ایک خط میں کیا تھا جو لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے کے نام تھا۔ اس نے اپنے اعزاز کی واپسی کا فیصلہ کیا اور لکھا کہ "اب وقت آ گیا کہ اعزاز کی علامات کو ہم اپنی بے شمار ذلتوں میں

ایک ذلت کا اضافہ کریں اس سیلے میں اپنی طرف سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں کہ تمام امتیازی خصوصیات سے معرا ہو کر اپنے ہموطن باشندوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں جو اپنی اس حیثیت میں جس کو معمولی حیثیت کہا جاتا ہے ان ذلتوں کو برداشت کرنے کے مستحق سمجھے جاتے ہیں جو انسان کے لیے مناسب نہیں ہیں۔

مس راتھبورن نے سنہ ۱۹۴۱ء کے نصف اول میں ہندستانیوں سے ایک اپیل کی جو چیلنج کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کا جواب ہم ٹیگور کو ٹیگور شانتی نکیتن سے دیتا ہے۔ اس میں وہ حکومت ہند کی تعلیمی پالیسی پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے "جس حد تک انگریزی تخیل مغربی روشنی اور روشن خیالی کی بہترین روایات کا حامل ہے اس حد تک اس نے بلا شک ہم کو بہت کچھ سکھلا دیا۔ لیکن برطانیہ نے ہم کو غلط طریقے پر تعلیم دینے کی بہت سی کوششیں کی ہیں۔ یہہ ممکن تھا کہ ہم پر مغربی علم و فضل کے دروازے علاوہ انگریزی کے کسی دوسری زبان کی کنجی سے کھل جاتے"۔ اس کے بعد وہ موجودہ طریقہ تعلیم پر اور قدیم طرز تعلیم کا مقابلہ کر کے مس راتھبورن پر واضح کرتا ہے "سرکاری برطانوی تعلیمی دھارے بہہ بہہ کر مدرسوں میں ہندستانی بچوں تک آئے مگر وہ بہترین انگریزی خیالات نہ تھے۔ بلکہ وہ گندگی اور کوڑا کرکٹ تھے۔ جس نے ان کو اس نعمت سے بھی محروم کر دیا جو خود وہ اپنے تمدن کے دسترخوان پر پا سکتے تھے"۔ یہاں پر راتھبورن سے سوال کرتا ہے کہ کیا برطانیہ کی ہمدردانہ پالیسی یہ ہے کہ صدیوں کے نظم و نسق کے بعد بھی ہندستان میں صرف ایک فیصد انگریزی داں ہوں حالانکہ روس نے پندرہ سال ہی میں (۹۸) فیصد بچوں کو تعلیم یافتہ بنا لیا تھا"۔

اس کے بعد حکومت کی اس پالیسی کا ذکر کرتا ہے جو اس نے اسلحہ کے بارے میں اختیار کی۔ اور صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ "انگلستان میں آج یہہ حال ہے کہ ہر برطانوی شہری اپنے دل اور اپنے گھر کو دشمن سے بچانے کے لیے پوری طرح مسلح ہے۔ مگر ہندستان میں نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ لاٹھی چلانے کی تربیت تک کو قانوناً روک دیا گیا ہے۔ یہہ قصداً و ارادتاً کیا گیا ہے کہ ہمارے ہموطنوں کو غیر مسلح اور نامرد بنایا جائے تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنے مسلح آقاؤں کے رحم و کرم پر بھیگی بلی بنے پڑے رہیں"۔ یہاں پہنچ کر وہ اور صاف بیانی اختیار کرتا ہے اور پیتا ہے کہ "برطانیہ تو نازیوں سے اتنی سی بات پر نفرت کرنے لگا کہ اس نے برطانیہ کی آقائیت کو دعوت مبارزت دی تھی اور مس راتھبورن یہہ امید کرتی ہیں کہ ہم ان کے ہم قوموں کے غلام بن کر ہاتھ جوڑ میں اس لیے کہ انہوں نے ہمیں ہتھکڑیاں پہنائی ہیں"۔

یہہ ہیں ٹیگور کے خیالات، ہندستان کی موجودہ سیاست سے متعلق اس نے اپنے ان ہی خیالات کو نیز انگریزوں کے انفرادی ذاتی اعلیٰ کردار کو اور قومی بدکرداری و حرص و آز کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنی اس تقریر میں ظاہر کیے ہیں جو اس نے اپنی اسیویں سالگرہ کے موقع پر کی تھی۔ اس تقریر کو غور سے پڑھنے کے بعد اس کے سیاسی تفکرات اور ہندستان و برطانیہ کے سیاسی، معاشی، اخلاقی، تجارتی وغیرہ، غرض ہر قسم کے تعلقات پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ یہی ڈاکٹر ٹیگور کی آخری تقریر ہے اور اتفاقاً اس کے سارے اعلیٰ سیاسی تخیلات کا نچوڑ اس میں موجود ہے۔ یہہ تقریر ہندستان کے اکثر انگریزی رسایل میں پوری کی پوری شایع ہوئی جس کا ترجمہ مجلہ "ہندستانی ادب" کے ٹیگور نمبر میں "میری آخری تقریر" کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔

انوار احمد صدیقی (علیگ)

متاعِ حیات

پیکرِ حسنِ دلربا ہو تم
میری کشتی کے ناخدا ہو تم
تم متاعِ حیاتِ عاشق ہو
میرے دل میں سما گئے ہو تم
تم سے نبضِ حیات چلتی ہے
ہر حسیں گل میں تم کو پاتا ہوں
قلب میں سوز و ساز پنہاں ہے
اک مجسم شبابِ رنگیں ہو
بے نیازِ جفا و جور ہو تم
آئینہ دارِ حسنِ لاثانی
حسن جب جلوہ بار ہوتا ہے
میرے دل میں سرور پیدا ہے
دلِ غمناک کا قرار ہو تم
تم کو حد درجہ پیار کرتا ہوں
تم سے قائم جہانِ عشرت ہے
بیخودی کی پناہ لے کے

پوچھتے کیا ہو مجھ سے کیا ہو تم
زندگانی کا مدعا ہو تم
حاصلِ کائنات عاشق ہو
میری ہستی پہ چھا گئے ہو تم
کشتِ ہستی تمہیں سے پھلتی ہے
ساغروں میں تم کو پاتا ہوں
زندگانی کا راز پنہاں ہے
آپ اپنا جواب رنگیں ہو
تو نہ تم ہیں کچھ اور ہو تم
مہر میں ماہ کی درخشانی
ہر ستارہ نثار ہوتا ہے
میری آنکھوں میں نور پیدا ہے
میرے اس باغ کی بہار ہو تم
تم پہ ہستی نثار کرتا ہوں
اک مسرت پس مسرت ہے
کھیلتا ہوں شبابِ رنگیں سے

میری ہر سانس زندگانی ہے
رونقِ بزمِ شادمانی ہے

عظیم (عثمانیہ)

آئینِ محکم

مرنے والا مر گیا اے دوست اب اتنا نہ رو
تیرا دل دکھنا بجا، اس طرح لیکن جاں نہ کھو
میں نے مانا تیرا اک مدت کا ساتھی کھو گیا
قبر کے آغوش میں تجھ سے بچھڑ کر سو گیا
سچ ہے تو اس حادثے کی تاب لا سکتا نہیں
یہ بھی سوچ جانے والا بھی تو آ سکتا نہیں
موت پر ناداں! کسی کا زور چل سکتا نہیں
یہ وہ آئینِ محکم ہے جو بدل سکتا نہیں
وقت آئیگا کہ جب میں اور نہ تو ہوگا یہاں
تا ابد چلتا رہے گا زندگی کا کارواں

سلیمان اریب

طمانیتِ مجبور!

دستۂ گل نہ سہی خارِ مغیلاں ہی سہی
غم کا درماں نہ سہی درد کا ساماں ہی سہی
میں بہرحال نوازیدۂ الفت ہوں تیرا
گل بداماں نہ سہی خاک بداماں ہی سہی

زعمِ خودی!

گر قیدِ مشیت ہی نہیں رہتی ہے
پھر کوئی مصیبت ہی نہیں رہتی ہے
انسان کے ہاتھوں میں ہو جو نظمِ جہاں
مذہب کی ضرورت ہی نہیں رہتی ہے

شرقی خالدی

کی
تلاش کرتا ... تھا
رہا تھا وہ ... تھا ...

[illegible]

حجام - کیا کہوں کہ حجام کیا ہے اور کیا ہوتا ہے جب لوگوں کے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی اور عقل سے باہر نظر آتی ہے تو کہتے ہیں کہ خدا کی شان ہے۔ اس لیے میں بھی کہتا ہوں کہ خدا کی شان ہے واقعی عجب نعمت ہے۔ انسان کو آدمی بناتا ہے۔ آج کل دور تہذیب و تمدن میں ایک آدمی کا بغیر ٹھیک سی حجامت کے کہیں گھر سے نکلنا ایسا ہی ہے جیسے حکیم ارشمیدس کا حمام سے نکلنا۔ چہرے کی رونق اسی کے دم سے ہے۔ میں نے تو دم لکھا اگر آپ نے پیش سے پڑھ دیں تو واقعی لطف آجائے گا اور شاید غلط فہمی بھی ہو کہ حجام کے دم بھی ہوتی ہے جس سے وہ آپ کے چہرے پر رونق پیدا کرتا ہے۔ کسی زمانے میں ہوتی ہوگی۔ مجھے معلوم نہیں لیکن ڈارون کے نظریہ ارتقا کی رو سے اب جھڑ گئی ہے۔

خیر آمدم برسر مطلب! حجام یہ آپ کے سر اور چہرے کا کاشتکار ہے۔ گو زمیندار آپ ہیں لیکن یہ بنگال یا اودھ کی زمینداری نہیں کہ ہر فصل پر سپاہی بٹھا دے اور نہ معلوم کیا کیا بیچ کر لگان وصول کریں۔ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ زمیندار آپ ہیں مالک آپ ہیں ملکیت آپ کی ہے فصل آپ اگاتے ہیں اپنے خون سے اسے سینچتے ہیں لیکن ہر فصل کی کٹائی پر لگان آپ ہی کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ بلا چون و چرا اور بغیر حیل و حجت۔ کیا کیجیے روس میں حکومت کسانوں کی اور ہندستان میں تاجر بچوں کی ہے گو دونوں اس وقت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ میری تمام ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں! بشرطیکہ آپ پاس گھر میں سیفٹی ریزر نہیں۔ ورنہ یہ ہمدردیاں مجھے حجام کی دکان میں منتقل کرنی پڑیں گی)۔

جس طرح مشہور ہے کہ ہر وہ شخص جو پیدا ہوا ہے مرے گا اسی طرح میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جو پیدا ہوا ہے حجامت بنوائے گا ہر پیدا ہونے والے کو موت سے واسطہ پڑتا ہے اور ملک الموت سے مفر نہیں بالکل اسی طرح ہر انسان کو حجامت سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور حجام سے نجات نہیں۔ ملک الموت سے تو صرف ایک بار واسطہ پڑتا ہے لیکن حجام سے "دو غسلوں" کے درمیان گود سے گور تک سابقہ ہی رہتا ہے۔ حجام سے سابقے کے سلسلے کا افتتاح ان کی والدہ محترمہ (جن کا تذکرہ میں آگے کروں گا) آپ کی اس دنیا میں پہلے غسل سے فرماتی ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوتا ہے جب کہ آپ آخری غسل فرما چکتے ہیں۔ شاید اسی لیے آپ ہم پر ان کی ہر ملاقات کے بعد ایک غسل فرض نہیں تو واجب ضرور ہو جاتا ہے۔ اور بزرگان مادر مکرم کے صاحبزادے کی کرامت دیکھیے جب یہ ایک بار آپ کے سر پر دست شفقت پھیر دیتے ہیں تو شراب کی لت یا زبان دراز بیوی کی طرح ساری عمر حجامت آپ کے سر پر سوار یا گلے کا ہار رہتی ہے۔

پیدا ہوئے تو عقیقہ ہوا اور مر گئے تو چھٹکارا ہوا۔ یہ بات صرف آپ ہم پر ہی صادق نہیں (بلکہ غلط فہمی نہ ہو تو) خود حجام بھی اپنی رفع حاجت پر قادر نہیں۔ اس کے سر پر دوسرا ہاتھ پھیرتا اور دھولیں جماتا ہے اب آپ کا ہمارا کیا پوچھنا ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب ہی اس کے اسیر ہیں۔ داڑھی کٹوائیے منڈوائیے یا خاص وضع کی بنوائیے۔ مونچھوں سے بے نیاز ہو جائیے۔ انہیں نوکدار مثلث نما یا اہرام مصر کی طرح کتروائیے سر پر جس قسم کے چاہے بال رکھیے۔ فرنچ، انگریزی، مغلائی، ایرانی یا ہندستانی ہر حال میں آپ اسی کے رہین منت اور اسیر ہیں۔ البتہ سکھ ایسے ہیں جو اس زنجیر میں جکڑے ہوئے نہیں معلوم ہوتے لیکن بالوں سے ڈھکے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔ کیا عجب کہ ان بالوں میں بھی حجام نے کوئی جال پھیلا رکھا ہو اور ان کے نیچے "پانچواں کالم" موجود ہو تاہم خالصہ[٭] کالج دور اور ہمارا حجام مطمئن ہے

حجام کی شخصیت بہت بڑی ہے اس کے سامنے سب اپنے

٭ خالصہ کالج بمبئی میں سکھوں کا سب سے بڑا کالج ہے۔

بیٹھتے ہیں ایک ہی پہلو پر اور ایک ہی مقررہ طریقے پر۔ بڑی شخصیت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ یہہ بڑا شفیق بھی ہوتا ہے سب کے سروں پر بلا امتیاز دست شفقت پھیرتا ہے۔ کبھی ہلکی ہلکی دھولیں لگاتا ہے۔ لیکن خفا کوئی نہیں ہوتا۔ بلکہ سب اس عنایت کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اس کا حکم بھی سر پر اور دھولیں بھی سر پر، آنکھوں پر کچھ نہیں۔ سوا اسے کٹے ہوئے بالوں کے۔

حجام یا حجامت کی دکان پر مجھے آپریشن تھیٹر کا شبہہ ہوتا ہے اور سچ پوچھیے تو یہہ آپریشن تھیٹر سے کسی طرح کم نہیں۔ آگے پیچھے آئینے، صاف ستھری میزیں جن پر عمل جراحی کا سامان، کنگھی، استرے، قینچی، چاقو، چھرے کانٹے نہ جانے کیا کیا لیکن سبھی کچھ ہوتا ہے اور اس کے درمیان حجام کچھ اس شان سے جلوہ گر ہوتا ہے جیسے مطب میں ڈاکٹر یا کوٹھے پر...... اور آپ داخل ہوتے ہیں ڈرتے ڈرتے کوئی دیکھ نہ لے یا جیسے آپ پر عمل جراحی ہونے والا ہے اور حقیقت یہہ ہے کہ ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔

حجام کہیں ہو اپنی امتیازی شان کبھی نہیں کھوتا وہ ڈاکٹر ہے اور بہر حال ڈاکٹر ہے چاہے دوا خانے میں ہو چاہے بنگلہ پر۔ بندہ لے اپنے مریض کے معائنے کے لیے جا رہا ہو جو سستی، پستی کمزوری یا پیٹ بڑا ہو جانے کے سبب سے اس تک پہنچنے سے قاصر ہے پیٹ بڑا ہونے کی وجہ نا معلوم ہے اگر اس معاملے میں آپ کو زیادہ تجسس ہو تو کسی بوڑھی تجربہ کار دایہ سے رائے لیجیے یا اگر آپ اس دور جدید کی پیداوار ہیں تو کسی کمسن نرس یا نوجوان لیڈی سے مشورہ کیجیے۔

پرانا مقولہ ہے کہ حجام پرانا ہو اور دھوبی نیا۔ دھوبی سے اس وقت مجھے بحث نہیں۔ لیکن حجام کے معاملے میں، میں اس مقولے کی صداقت کا پوری طرح قایل ہوں۔ اگر آپ غلطی سے کسی نئے حجام کے پاس پہنچ جائیں تو یقین مانیے آپ کے سر اور چہرے مبارک کی ایسی گت بنے گی کہ نہ آپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہیں گے نہ سر، اور شاید آپ پہچانے بھی مشکل سے جائیں اگر آپ نے اس حرکت کے خلاف ذرا سا بھی احتجاج کیا یا اتنی ہمت نہ ہو تو آئینے میں اپنا ہی منہ چڑھایا تو حجام پوری لسانی چرب زبانی اور قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان سے یہہ ثابت کر دیں گے کہ آپ کی حجامت "جدید ترین اور فیشن ایبل طریقے پر بنائی گئی ہے" ایک ایک سانس میں اتنے ثبوت اور اتنے حوالے پیش کیے جائیں گے کہ اس کے آگے منطق اور اقلیدس کا علم ہندسہ بھی ہیچ معلوم ہونے لگے گا۔ آپ کچھ جھنجلائیں گے۔ لیکن آپ کا چہرہ اور خاص طور پر ناک سرخ ہو کر رہ جائے گی۔ آپ کچھ کہنا چاہیں گے مگر زبان میں لکنت آجائے گی۔ غرض آپ غصہ، خفت، بے چارگی اور بے بسی کا ایک مخلوط اور مکمل نمونہ بن کر تشریف لیجائیں گے ایسی شاندار پسپائی ہوگی واہ جی واہ یقین مانیے میری پوری ہمدردیاں پھر ایک بار آپ کے ساتھ ہیں۔

اب اس کے بعد مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس بزرگ ہستی کے آبا و اجداد اور اس کے شجرہ نسب کا کچھ ذرا سا جائزہ لوں۔ اس کی ماں وہ ہے جس نے قدیم زمانے میں بڑے بڑے آدمیوں کی بوقت پیدایش (پیدا ہونے میں) مدد کی ہے۔ اور پیدا ہوتے ہی آپ کی...... اپنی کہنے میں اگر آپ کو کچھ تکلف سا ہو تو یہی کہیے یعنی میری پچکی دبی ہوئی ناک کو پکڑ کر، دبا کر، اور کھینچ کر سیدھا کیا اور اس کے بعد آگے آپ نے کچھ ایسا ناروا سلوک کیا کہ آپ آتے کے آتے ہی اس نا معقول دنیا سے نالاں ہو گئے اور کمال یہہ کہ آپ کے عزیز و اقارب نے اس نالہ و فریاد و بیکسی پر تبسم فرمایا اور اگر آپ کسی بڑے گھر (گو اس سے میری مراد جیل خانہ نہیں) میں پیدا ہوئے ہوں تو آپ کی اس آمد پا آورد دست بدست دیگرے و پا بدست دیگرے پر نقارے بجوائے گئے بندوقیں اور توپیں داغی گئیں وغیرہ وغیرہ۔ چھوڑیے اس قصے کو طویل سے طویل ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن نا قدر شناس زمانے نے ان بزرگ ہستی کی مادر مکرم کی قدر اب کچھ کم کر دی ہے۔

آج جب کہ ہماری بہت سی چیزیں مغرب زدگی میں مٹ گئی ہیں ان میں ایک ہمارا قدیم حجام بھی ہے۔ دوسری چیزوں کے نوحہ خواں آپ کو بھی بہت سے مل گئے لیکن قدیم حجام کے مٹ جانے کا

عمر تو میری ہی قسمت میں لکھا تھا قدیم حجام سب کچھ نہیں تو بہت کچھ تھا لیکن آج کل کا کچھ بھی نہیں ۔ فقط مغرب زدہ ہے ۔ پرانے زمانے میں عمل جراحی میں کمال خاص حجاموں کا وصف تھا ۔ فصد یہ کھولتے تھے ۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ' کٹے ہوئے اعضا یہ جوڑتے تھے ' زخموں کی مرہم پٹی یہ کرتے تھے اور پرانے زمانے کے بڈھے اور بوڑھیوں کا متفقہ اور مشترکہ بیان ہے کہ یہ ختنہ کرنے میں بھی ید طولی رکھتے تھے اور یہ سب کام اس قدر آسانی ' بلا زحمت اور کم خرچی میں ہو جاتا تھا کہ بس دیکھا چاہیے اور ان کے علاوہ گذرے ہوئے زمانے میں (جبکہ "کورٹ شپ" نہ ہوتی تھی) شادی بیاہ کے معاملے میں معتبر نائی کی اہمیت تو کبھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی لیکن اب ' اب کچھ بھی نہیں باقی ہے فقط عہد ماضی کا فسانہ ستم ظریف زمانے نے حجام سے بہت کچھ چھین لیا لیکن کنگھیوں اور استروں سے اسے جدا نہ کر سکا وہ پہلے بھی تھے اب بھی ہیں اور شاید زمانہ مستقبل میں بھی اس کے ساتھ رہیں ۔ حجام ان سے علیحدہ ہو سکتا ہے اور علیحدہ ہونا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ

جہاد زندگی میں یہ ہیں "حجاموں" کی شمشیریں

حجام کا وجود تو شاید زمانہ ماقبل تاریخ سے ہو اور اس کا تعلق دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں سے رہا ہو لیکن افسوس ہے کہ حجام اور حجامت کے سلسلے میں بڑے آدمیوں کا تذکرہ اور تعلق بڑی مشکل سے دستیاب ہو سکا ۔ ان میں فی الحال میں صرف دو کا تذکرہ کروں گا اور اگر آئندہ موقعہ ہو تو کسی وقت اس سلسلے میں آپ کچھ اور سنیں گے ۔ ان لوگوں میں جن کا میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں ایک چچا سعدی ہیں اور دوسرے مہاتما گاندھی ۔ اتفاق دیکھیے دونوں کے نام بھی ایک ہی قافیہ میں آ رہے ہیں ۔ چچا سعدی کے متعلق حجام اور حجامت کے سلسلے میں جو قصہ مشہور ہے وہ یہ کہ ایک دفعہ چچا کو ایک اناڑی حجام سے سابقہ پڑا جس نے ان کے سر کو اپنی کھیتی سمجھ کر اس طرح جنا کر بکھر چلایا کہ بس جا بجا سرخ گھاٹیاں اور چشمے نمودار ہو گئے لیکن چچا بھی حجام کے چچا نکلے انہوں نے اس کی حجامت کی بڑی تعریف کی اور ایک اشرفی بطور نذرانہ گذرانا ۔ آگے راوی یوں بیان کرتا ہے کہ کچھ دن بعد ایک ولایتی خان صاحب انہیں حجام صاحب کے پاس بغرض عقیقہ تشریف لائے ۔ حجام صاحب سمجھے کہ یہ بھی چچا کی قسم کی کوئی مخلوق ہے اس لیے انہوں نے دانستہ طور پر وہی طرز عمل اختیار کیا لیکن خان صاحب کی خوش خلقی دیکھیے وجد ہی میں تو آ گئے اور کچھ ہی عرصے میں خان صاحب کے سخت اور کھردرے پاپوش اور حجام کے سر سے کچھ تصادم ہو گیا اور طبلے کی تال کی سی آوازیں سنائی دیں تا ___ تا ___ دھنا ___ تا تا ___ تا . . . .

گاندھی جی نے حجام اور حجامت کا تذکرہ "تلاش حق" میں کیا ہے ۔ جس زمانے میں گاندھی جی افریقہ میں تھے اور وکالت کرتے تھے تو یورپین حجاموں نے ان کے ہندستانی سر کی حجامت بنانے سے انکار کر دیا ۔ مجبوراً مہاتما جی نے مشین اور استرا سنبھالا لیکن توبہ کیجیے کہاں حجام اور کہاں بنیا ۔ دوسرے دن جب وہ عدالت گئے تو ساتھیوں نے پوچھا "کیا مسٹر گاندھی آپ کے بال چوہے کتر لے گئے" ۔

آخر میں ایک بات سن لیجیے اگر نہ کہوں تو پیٹ کے درد سے شاید رات بھر مجھے نیند نہ آئے لیکن دیکھیے کسی سے نہ کہیے اگر آپ کے بھی پیٹ کی عافیت کا سوال درپیش ہو جائے تو ضرور کسی سے کہہ دیجیے مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیجیے کہ "کسی سے نہ کہنا" وہ بات جس کے لیے میں نے اس قدر طویل تمہید اٹھائی ہے یہ ہے کہ مجھے بھی حجامت بنانی آتی ہے چنانچہ ایک دفعہ ہمت کر کے میں نے اپنے چھوٹے بچے کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مجھ سے حجامت بنوائے لیکن کچھ ایسی بات ہوئی کہ کہنا پڑا ۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخرش حجام ہی سے رجوع کرنا پڑا اور اس مبارک سعی اور نیک کوشش کے صلے میں (جو اس بزرگ ہستی کی شخصیت حاصل کرنے کی گئی تھی) کیا ملا ؟ ؟ ان کا ایک ہمت شکن قہقہہ اور

دوسروں کے تبسم زیرلب۔ ہم نے کچھ بات بنانے کی کوشش کی لیکن ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آخر میں اور یہ سب سے آخری بات جو سارے مضمون کا خلاصہ بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ مجھے کہنے دیجیے کہ حجامت ایک علم ہے۔ علم دریا۔ ایک فن ہے۔ ایک مستقل فن۔ جو مشکل ہے بہت مشکل۔ چاہے وہ سیدھے استرے سے بنائی جائے چاہے الٹے استرے سے۔ سیدھے استرے سے حجامت تو صرف حجام ہی بناتے ہیں۔ لیکن الٹے استرے سے حجامت بنانی آپ ہم بہت سے لوگوں کو آتی ہے اس لیے اس دنیا میں فی الاصل آپ ہم سب حجام ہیں جو رات دن ایک دوسرے کو الٹے استرے سے مونڈتے رہتے ہیں۔

مسرت کی تلاش

س۔ م۔ ح

معبود! دنیا مسرت کو کہاں سے تلاش کر لیتی ہے...؟

میری مایوسیوں اور ناکامیوں سے ہمکنار روح تو باوجود انتہائی تلاش اور تجسس کے بھی مسرت کے زریں جزایر کو نہ پا سکی۔

بارہا میں نے مسرت کے بے پایاں سمندروں میں بلند بادبانوں والے جہاز تیرتے دیکھے ہیں اور سنا ہے — کہ طویل — اور دشوار گزار چٹانوں کو عبور کر کے آخر کار — وہ مسرت کے جزایر تک جا پہنچے — کون جانے؟ یہ سچ ہے یا نہیں — اور جانے بھی کیونکر —؟ جبکہ میری افسردہ اور پریشان روح باوجود ان تھک کوششوں کے ان تک نہ پہنچ سکی۔

آہ —! میری حرمان نصیب روح جتنی زیادہ کوشش کرتی ہے مسرت کے حسین و دلفریب جزایر اس سے دور تر ہوتے جاتے ہیں اور — مایوسیوں اور ناکامیوں کے روح فرسا اور بھیانک جزایر نزدیک تر

معبود!! آخر اس کا مطلب —؟؟؟

کنیز ام۔ آ



مصحفِ رخ کی زیارت بھی گناہ
آہ یہ حق کی تلاوت بھی گناہ

بربط "زہرہ" کے نغموں کی قسم
تھام کر دل آہ کرنا بھی گناہ

آہ اس دنیا کے اربابِ خرد
سوزِ الفت کی نگارش بھی گناہ

ساغرِ عشرت کا اک جرعہ ستم
اک ذرا دل کی تسلی بھی گناہ

زخمِ ہستی کے لیے مرہم ہے قہر
الفتِ معصوم کرنا بھی گناہ

چاندنی راتوں میں پھرنا بھی غضب
ماہ و انجم کا نظارہ بھی گناہ

آتشِ خاموش میں جلنا بدی
شمع و پروانے کی وصلت بھی گناہ

آنکھ کی حیرانیاں پابند ہیں
دیدہ و دل کا فسانہ بھی گناہ

وقتِ رخصت یاس و اندوہ سے
اشکِ حسرت کا بہانا بھی گناہ

صبر کر اے مخفی تفتہ جگر
کہ یہاں ہے زندہ رہنا بھی گناہ

مخفی

اردو و ہندی کی ترقی یافتہ صورت ہے

زمانہ حال کی تاریخی و لسانی تحقیقات سے یہہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ بھاشا اردو کا پیش منظر ہے۔ بھاشا ملک کے چند در چند سیاسی و ملکی حالات کی وجہ سے تغیر پذیر ہونے لگی اور اس کو اپنے تدریجی ارتقا کی بنا پر تین دور سے گذرنا پڑا۔

ہند آریائی زبانوں (یا بھاشا) کا پہلا دور ویدک یا ویدی کہلاتا ہے۔ یہہ دور قدیم ترین ہے جس میں آریاؤں کے مقدس وید لکھے گئے۔ اسی دور کے اختتام پر ویدک کی ترقی یافتہ صورت سنسکرت پیدا ہوئی۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں جب سنسکرت کے بڑے قواعد داں پانینی نے سنسکرت کی قواعد مرتب کی تو اس ادبی زبان کا نام سنسکرت (یعنی شایستہ زبان) قرار پایا۔

سنسکرت کے اسی دور یا اس سے قبل جو زبان بول چال کے لیے استعمال ہوتی وہ پراکرت (یعنی فطری یا غیر شایستہ) کہلاتی تھی۔ سنسکرت کے لفظ کی تحقیق سے بھی یہہ پتہ چلتا ہے کہ یہہ لفظ ہندستان کی قدیم زبان کے لیے بہت بعد استعمال ہوا۔ "رامائن" جو ویدک دور کے ایک عرصہ بعد وجود میں آئی اس زبان کے لیے سب سے پہلے "سمسکرتہ" کا لفظ پایا جاتا ہے۔ قدیم سنسکرت قواعد داں یاسکا نے (جو پانچویں صدی قبل مسیح میں زندہ تھا) اور اس کے بعد ایک عرصے تک اوروں نے بھی کلاسکل سنسکرت کو بھاشا کہا ہے۔ لہ

ہندی کے لیے بھاشا کا لفظ مستعمل ہونے کی ایک وجہ یہہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندی سورسینیا یا مدھیہ دیسا (علاقہ متھرا) سے نکلی اور وہیں اس کا مرکز رہا ہے۔ قدیم زمانے میں کلاسکل سنسکرت کا مرکز بھی یہی تھا۔ سنسکرت دور کے اختتام کے بعد ہندی کا دور دورہ رہا۔ شاید اپنی اسی قدیم مناسبت کے باعث ہندی کو بھی بھاشا کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔

کلاسکل سنسکرت یا بھاشا کا دوسرا دور سورسینی ہے۔ جو سورسینیا (یعنی جدید متھرا) سے نسبت رکھتا ہے۔ اس دور کی زبان کی خصوصیات قواعد صوتیات لسانیات اور نحوی اعتبار سے بالکل اسی قسم کی ہیں جو ویدک زمانے کی تھیں ان کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

اس کا تیسرا دور خود برج بھاشا کا ہے۔ آریائی خاندانی السنہ کے دو گروہ ہیں۔ ایک اندرونی دوسرا بیرونی۔ اندرونی گروہ میں صرف سورسینی ہے اور بیرونی میں مگدھی اردھا مگدھی مہاراشٹری اور شمال مغرب کی ایک نامعلوم پراکرت شامل ہے اندرونی گروہ کا مرکزی مقام وہی ہے جو کلاسکل سنسکرت کا تھا اس لیے اس گروہ السنہ میں صوتیاتی تبدیلیاں اور زیادہ تر کلاسکل سنسکرت ہی پر مبنی ہے۔ بیرونی گروہ میں مقامی اثر بہ نسبت سنسکرت عنصر کے زیادہ غالب ہے۔ غرض اندرونی گروہ میں برج بھاشا اپنے اسی نام سے ایک ہزار سال سے مروج ہے۔

برج بھاشا کی سب سے پہلی مشہور کتاب چند بردائی کی "پرتھی راج راسو" غالباً ۱۱۹۲ء میں لکھی گئی۔ اس میں ۶۹ بند ہیں جس میں شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج کے معرکے بیان کیے گئے ہیں۔ اسی کتاب میں عربی فارسی کے الفاظ کی بہتات ہے۔ ایک ہندو شاعر کے کلام میں عربی فارسی الفاظ کی کثرت کا پایا جانا یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ اس زمانے میں عوام بلا امتیاز ذات بات ان کو استعمال کرتے تھے۔

بھاشا کے مبادیات میں کبیر داس کے دوہے تلسی داس کی راماین اور سکھوں کے گرنتھ صاحب وغیرہ بھی قابل لحاظ ہیں۔ یہہ سب کسی نہ کسی مذہبی جذبے اور اس کی اشاعت کی غرض سے لکھے گئے۔ لازماً ان کی زبان وہی ہوگی جو عوام کی تھی۔ شاید یہی وجہہ ہے کہ ان میں بھی فارسی عنصر کافی طور پر پایا جاتا ہے۔

لہ۔ ملاحظہ ہو۔ ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر۔ میکڈانل صفحہ (۲۲)

اسی سلسلے کی سب سے آخری کتاب سورداس کی "سورساگر" ہے۔ یہہ کتاب تیرھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی جو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف میں شاید ہی کوئی شعر ہوگا جو فارسی یا عربی الفاظ سے خالی ہو۔

"پرتھی راج راسو" اور سورساگر کا درمیانی زمانہ کوئی چار پانچ سو سال کا ہے۔ اس عرصے میں بھاشا کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور ان تمام میں آہستہ آہستہ اردو کے لیے ایک زمین پیدا ہو رہی تھی اور اس میں فارسی کا عنصر کچھ اس طرح جذب ہو رہا تھا کہ بعد میں مسلمانوں نے اس کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔

سولھویں صدی عیسوی میں شمالی ہند میں جب یہہ مخلوط زبان ترقی کر رہی تھی دکن میں نہ صرف پورے طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ ادبی زبان بن گئی تھی اور دکھنی کے نام سے پکاری جاتی تھی بیجاپور اور گولکنڈہ اس کے مرکز بن گئے۔ بیجاپور کے عادل شاہی اور گولکنڈے کے قطب شاہی بادشاہوں نے اس زبان کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ خود ان میں سے اکثر اس کے بڑے بڑے شاعر گذرے ہیں۔

دکن میں اردو شمالی ہند کے مسلمانوں ہی کے ذریعے آئی۔ جس وقت محمد تغلق نے اپنا دارالسلطنت دلی کو چھوڑ کر دولت آباد قرار دیا اور دلی کو کامل طور پر خالی کرنے کا حکم جاری کیا تو وہاں کے لوگ ناچار سفر کی ہزارہا تکلیفیں اٹھا کر دکن میں آئے گو راستے میں بہت سے فوت ہوے لیکن چند صحیح و سالم پہنچ گئے شہنشاہ کے حکم کے واپس لینے کے بعد بھی اکثر یہیں بس گئے اور انہوں نے اپنی زبان کو دکن میں پھیلایا اور اس طرح دکن میں اردو زبان رایج ہو گئی۔

اس ایک ہزار سال کے دوران میں جب کہ فارسی کا عنصر اس زبان میں داخل ہو رہا تھا اردو کے مختلف نام وجود میں آئے سب سے پہلے شمالی ہند میں جن لوگوں نے برج بھاشا کو نظم کے لیے استعمال کیا اور اس میں فارسی عنصر ملانا شروع کیا۔ انہوں نے اس کا نام ریختہ رکھا نثر میں اسی کا نام ہندی رکھا گیا دکن میں اسی کو دکھنی کہنے لگے۔ بالآخر شاہ جہاں کے بعد میں چونکہ یہہ زبان لشکر میں بولی جاتی تھی اس لیے اسی مناسبت سے اس کا نام اردو (یعنی لشکر یا بازار) پڑ گیا۔ مغربی مصنفوں نے اس کو ہندستانی کے نام سے مشہور کرنا چاہا لیکن اردو ہی زیادہ مقبول رہی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قایم کیا گیا جس کے صدر ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے۔ اس کالج کا مقصد یہہ تھا کہ اس میں انگریز عہدہ داروں کو اردو سکھائی جاے اور ان کے لیے اردو کی کتابیں تصنیف و تالیف کی جائیں اس مقصد کی تکمیل کے لیے مسلمانوں اور ہندو تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت بنائی گئی لیکن بدقسمتی سے اس مقام پر زبان کے لیے دو راہیں پیدا کی گئیں اور اردو ہندی کو الگ الگ تصور کیا جانے لگا۔ چنانچے اسی دور میں رسم خط کے اختلاف کے ساتھ دو قسم کی کتابیں تیار ہونے لگیں۔ للوجی لال جو اسی کالج کے ایک منشی تھے انہوں نے پریم ساگر لکھی جس میں قصداً فارسی عنصر کو خارج کر دیا گیا۔ اب تک ہندی کا کوئی علحدہ ادب موجود نہ تھا لیکن انہوں نے اعلیٰ ہندی کے نام سے ایک قسم کا ادب پیدا کرنا شروع کر دیا اور عربی فارسی کے الفاظ چن چن کر نکالے اور اسکی بجاے سنسکرت کے نامانوس الفاظ کی بھرمار کر دی۔ اس مخالف تحریک نے زور پکڑا اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔

اردو زبان کی تاریخ پر اس سرسری نظر نے یہہ ثابت کر دیا کہ کس طرح اردو اپنے ابتدائی ارتقائی مدارج میں وہی ہندی تھی جو آجکل رایج کرنیکی سعی جاری ہے۔ اور کیونکر اس زبان نے ترقی کر کے اپنا تاریخی لقب "اردو" پایا۔ جو لوگ ہندی کے نام سے قدیم متروک زبان استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ یقیناً الٹی گنگا بہا رہے ہیں۔ پہلے تو یہہ چیز ناممکن بلکہ محال ہے کہ قدیم اور دقیانوسی زبان سارے ملک میں پھیل جاے لیکن بفرض محال اس کو تسلیم کر لیا جاے کہ یہہ پھیلا بھی دی جائیگی تو ہمیں یقین کامل ہے کہ یہی زبان ترقی کر کے اسی نوبت پر پہنچیگی جس نوبت پر کہ موجودہ اردو ہے۔ غرض ہمیں یہہ کہنے میں کبھی تامل نہ ہوگا کہ اردو ہندی کی ترقی یافتہ صورت ہے اور جو لوگ اردو کو ہندی بنا رہے ہیں وہ ترقی معکوس کی طرف مایل ہیں۔

رشید الحسن ام۔ اے
(عثمانیہ)

سائنس

گیاس پلانٹ یہ گیاس کاربن مانو آکسائیڈ ہے جو چلنے پر قوت محرکہ بہم پہنچاتی ہے اس گیاس کے پیدا کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ گرم چارکول پر سے ہوا گذاری جاتی ہے۔ اس گیاس پلانٹ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک فولادی سلنڈر ہوتا ہے جس میں چارکول ہوتا ہے اور باہر سے اس کو گرم کیا جاتا ہے۔ ایک پنکھے کے ذریعے سے ہوا داخل کی جاتی ہے اور جب گیاس تیار ہو جاتی ہے تو اسکو ایک نلی کے ذریعے منتقل کرتے ہیں تپش کم سے کم ایک ہزار درجے فارن ہیٹ ہونی چاہیے۔ اس سے جو گیاس حاصل ہوتی ہے اس میں ۶ فیصد نائٹروجن (۲۳) فی صد کاربن مانو آکسائیڈ اور باقی ۲۷ فیصد جن نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، آکسیجن وغیرہ ہوتی ہے۔

جب یہ گیاس نکلتی ہے تو پہلے اسکو خالص کرنا ضروری ہے تاکہ مشین کی زندگی کم نہ ہو نتایج اچھے حاصل ہوں سرد کرنے کا عمل نلیوں کے ایک انتظام سے ہو جاتا ہے جس سے تپش معمولی ہو جاتی ہے۔ صاف کرنے کے لیے اس گیاس کو مسلسل تین آہنی ڈبوں میں سے گذارا جاتا ہے اب گیس تیار ہو جاتی ہے۔ اس میں ضروری مقدار ہوا شامل کرکے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہوا کو شامل کرنے والا آلہ انجن کے کاربن والے ٹرک کے قریب ہوتا ہے گیاس کے استعمال کی وجہ سے مشین کی قوت میں ۲۰ فیصد کمی ہو جاتی ہے۔

موجودہ حالات کے تحت اس کے مقبول ہونے کی توقع ہے مدراس میں چھ سو موٹریں اس کی مدد سے چل رہی ہیں۔

قوت محرکہ اس بات کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے کہ سورج کی گرمی سے قوت محرکہ حاصل کیجائے چنانچہ ایک مقام ڈمی میں آئینوں کی مدد سے سورج کی گرمی کو حاصل کرکے اس سے پانی گرم کرنے کا کام لیا جا رہا ہے اس سے فی گھنٹہ (۵۰۱) پونڈ قوت والی بھاپ تیار کیجا سکتی ہے۔

پانی بلندی پر کیلیفورنیا میں پانی کو بلندی پر پہنچانے کے لیے اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ فی منٹ (۱۴۰۰) گیلن پانی پمپ کیا جا سکا۔

سورج سے برقی سائینسداں کوشش کر رہے کہ تیس ہزار کیلوواٹ کی برقی قوت سورج کی شعاعوں سے حاصل کیجائے اگر ان کو اس میں کامیابی حاصل ہو گئی تو پھر دنیا میں برقی قوت کی محتاجی نہیں رہے گی۔



معلومات

موسیقی کے اثرات موسیقی کا استعمال بہت قدیم سے ہوتا آیا ہے۔ قدیم باشندوں کے وہ مذہبی مراسم جو کسی کی بیماری کے وقت ادا کیے جاتے تھے اسی کی ایک شاخ ہیں مذہبی رہنما طبیب اور معالج کا عقیدہ تھا کہ بیماری چند خبیث ارواح کا اثر ہے جو کسی جادو منتر یا موسیقی سے زایل ہو سکتا ہے اس کے علاوہ موسیقی کو طبیب اور معالج استعمال کرتے آ رہے ہیں اور اس کی مدد سے کئی بیماریوں کو دور کیا گیا ہے۔

۱۸۹۹ء میں میٹر کو کوہم (مصر) میں ایک تحریر ملی جو ۲۵ سنہ ق م کی معلوم ہوتی تھی اس میں ایک منتر تھا جس میں موسیقی کا جز ہے جو عورتوں کے بانجھ پن کو دور کرنے کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔

انگریزی شعراء نے داود کے بربط کی بہت مدح سرائی کی ہے۔ اس آلہ موسیقی کی مدد سے خاندان بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ کی بیماری میں عارضی افاقہ ہوا تھا شیکسپیر نے اپنے ڈرامے "کنگ لیر" میں بادشاہ کا علاج موسیقی سے کیا ہے۔ اسپنسر نے اپنی شہرہ آفاق نظم "فیری کوئین" میں موسیقی کو "میلان کولیا" کے علاج میں استعمال کیا ہے۔ اس مرض میں انسان اداس اور غمگین رہتا ہے یونانی شاعر ہومر بھی موسیقی کے سحر سے آشنا ہے اور اپنے

کارنامہ میں اکثر مقامات پر لوتھیس کو جوش میں لانے کے لیے موسیقی کا استعمال کرتا ہے۔

اسپین کے شاہ فلپ پنجم پر "میلان کو لیا" کا حملہ ہوا ہے شاہی معالج تھک گئے لیکن فرنیلی نامی شخص نے خوش آیند مضمون سے علاج کیا۔

انگلستان کے بادشاہ جارج سوم پر بھی اس بیماری کا حملہ ہوا اور موسیقی ہی سے اس کو دفع کیا گیا۔

نیپا غور شندے موسیقی کو سانپ کا زہر اتارنے میں استعمال کیا۔ یہی پہلا شخص ہے جس نے اسپاسپ میں موسیقی کو استعمال کیا یورپ کے اکثر لوگوں نے دل کی بیماریوں و زہریلے کیڑوں کے کاٹنے کے علاج میں مرگی میں بلبوں کی موسیقی کو استعمال کیا۔

جنوبی اٹلی میں ایک قسم کا بچھو پایا جاتا ہے جس کا زہر مہلک سمجھا جاتا ہے۔ انگلستان میں ڈاکٹر ہمین اور فرانس میں ڈاکٹر قبرونی نے موسیقی کے ذریعے اس زہر کو اتارا ہے۔ اس زہر کا اثر بہت تیز ہوتا تھا۔ کاٹنے کے کچھ ہی گھنٹے بعد بیہوشی اور تھرتھری کا حملہ ہوتا اور جب درد کا حال پوچھا جاتا تو مریض دل کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ موسیقی کے ساتھ ہی یہہ مریض ہاتھ پیر ہلا کر زندگی کا ثبوت دینا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر تیزی سے رقص شروع کر دیتا۔ تین چار گھنٹے کے بعد اس کو آرام کی نیند آجاتی۔ یہہ نغمہ دن میں کئی بار سنایا جاتا اور پھر یاری حال ہوتا تھا۔ تین چار روز تک روزانہ تقریباً بارہ گھنٹے موسیقی ہوتی۔ تب کہیں بیماری کے آثار پوری طرح ختم ہو جاتے۔ بیماری کے دوران میں اس کے حواس قایم نہ رہتے اور عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ اگر سامنے کوئی شخص سیاہ لباس میں آجاتا تو بیماری عود کر آتی۔

بڑے بمبار طیارے } امریکہ میں جو جدید ہوائی جہاز بنائے جارہے ہیں ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہوا میں اڑنے والے قلعے ہیں۔ اور اس وقت تک اس قدر بڑے بمبار طیارے نہیں بنے تھے۔ ان کی پہنائی (۱۰۴) فٹ اور طول (۶۸) فٹ ہے ان میں چار انجن ہیں جن میں سے ہر ایک ساڑھے بارہ سو گھوڑوں کی قوت کے برابر ہے ان کی رفتار (۳۰۵) میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ یہہ ۵ ہزار سے ۳۶ ہزار فٹ بلندی تک پرواز کر سکتے ہیں۔ یہہ طیارے ۵ ہزار پونڈ وزن ۲ ہزار میل تک لیجا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بڑے بڑے بموں کو کافی بلندی سے گرایا جاسکتا ہے۔

جسم انسانی } انسان کے جسم کا تقریباً پاو حصہ معدنی یا یا غیر نامیاتی نمکوں پر مشتمل ہے۔ ہڈی اور دانت اس قسم کے بنے ہوئے ہیں۔ بعض نمک گوشت میں پائے جاتے ہیں جسمانی رطوبت میں بھی نمک موجود ہیں جو بہت ضروری ہیں۔ یہ ترشے خون میں ترشی پیدا ہونے نہیں دیتے جس سے ہم بیمار ہوسکتے ہیں۔ بعض نمکوں کی وجہ سے گردے کام کرتے ہیں اور خون کو فضلے سے پاک رکھتے ہیں۔ معدے میں ہاضم رطوبتیں ان ہی نمکوں سے پیدا ہوتے ہیں انسان کے جسم میں بیس مختلف قسم کے معدنی عنصر ہوتے ہیں ان ہی سے مختلف نمک بنتے ہیں۔

چونا ہمارے جسم کا ناخن اور اہم عنصر ہے۔ ہڈیوں و دانتوں کے بنانے، قلب کی حرکت درست رکھنے اور کسی حصے کے کٹنے پر زیادہ خون نہ بہنے کے لیے خون کو منجمد کرنے میں مدد دیتا ہے

فاسفورس سب بھی ہڈیوں اور دانتوں کا اہم جز ہے اس کی قلت سے دانت و ہڈی ناقص ہو جاتی ہے۔ یہہ بھی اہم حصہ ہے اس کی وجہ سے خون کا رنگ سرخ ہے۔

آنکھوں کا علاج } امریکہ کے محکمہ حفظان صحت کے ڈاکٹر آنکھوں کے امراض کی تحقیق اور علاج کی جستجو میں تھے۔ ایک رپورٹ میں ان کی تحقیقات کے نتایج شایع ہوئے ہیں۔ امریکہ کے بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو رات میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹروں نے تجربے سے معلوم کیا کہ غذا کے ایک عنصر کی کمی سے جو انڈے دودھ اور ترکاریوں میں ہوتا ہے خرابی لاحق ہوتی ہے اس لیے ان مریضوں کے لیے ایسی غذائیں تجویز کی گئیں جن میں وہ خاص عنصر بہت زیادہ تھا۔ اس سے بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

کیا آپ کو معلوم ہے؟ روئے زمین کا رقبہ (۱۹۶,۹۵۰,۰۰۰) مربع میل ہے جس میں خشکی صرف (۵۶,۵۰۰,۰۰۰) مربع میل ہے۔ ذیل میں ہر براعظم کا رقبہ اور اس میں برطانوی مقبوضات کی وسعت اور آبادی درج کی جاتی ہے۔

براعظم ایشیا کی وسعت (۱۶,۵۰۰,۰۰۰) مربع میل ہے جس میں سے (۲,۱۲۶,۲۶۳) مربع میل پر برطانیہ قابض ہے اور اس کی رعایا کی تعداد اس براعظم میں (۳۵۰,۶۸۸) ہزار ہے۔

افریقہ کا رقبہ (۱۱,۵۰۰,۰۰۰) مربع میل ہے جس میں سے (۳,۸۲۰,۲۷۴) مربع میل اور (۵۴,۲۸۲) ہزار نفوس پر برطانیہ حکمران ہے۔

براعظم یورپ کا رقبہ (۳,۹۰۰,۰۰۰) مربع میل ہے جس میں سے (۱۲,۵۷۸) مربع میل برطانیہ کے زیر نگیں ہے جس کے باشندوں کی تعداد (۴۸,۹۶۳) ہزار ہے۔

شمالی امریکہ کی وسعت (۸,۷۰۰,۰۰۰) مربع میل ہے جس میں سے (۳,۹۱۳,۱۱۶) مربع میل برطانیہ کی ملکیت ہے۔ اس کے باشندوں کی تعداد (۱۱,۸۱۸) ہزار ہے۔

جنوبی امریکہ (۷,۳۰۰,۰۰۰) مربع میل وسعت رکھتا ہے جس میں سے (۹۵,۰۹۸) مربع میل کا برطانیہ مالک ہے اور اس کی آبادی (۳۱۳) ہزار ہے۔

براعظم آسٹریلیا (۳,۶۰۰,۰۰۰) مربع میل وسیع ہے جس میں سے (۳,۲۷۲,۸۱۹) مربع میل برطانیہ کی ملک ہیں جس کے باشندوں کی تعداد (۸,۹۴۸) ہزار ہے۔

بحر اوقیانوس کی وسعت (۳۴,۵۰۰,۰۰۰) مربع میل ہے۔ اس کی اوسط گہرائی (۱۰,۳۷۰) فیٹ اور زیادہ سے زیادہ گہرائی (۲۷,۴۰۰) فیٹ ہے۔

بحر الکاہل جو دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے۔ (۶۸,۰۰۰,۰۰۰) مربع میل وسیع ہے اس کی اوسط گہرائی (۱۲,۵۶۴) فیٹ اور زیادہ گہرائی تقریباً (۳۱,۶۱۴) فیٹ ہے۔

بحر ہند کا بے پناہ پھیلاو (۲۸,۰۰۰,۰۰۰) مربع میل ہے اس کی اوسط اور زیادہ سے زیادہ گہرائیاں علی الترتیب (۱۱,۷۹۰) اور (۲۲,۷۶۰) فیٹ ہیں۔

بحر منجمد شمالی کا رقبہ (۲۸,۰۰۰,۰۰۰) مربع میل ہے اور اوسط اور زیادہ سے گہرائیاں علی الترتیب (۲,۷۰۰) اور (۱۵,۹۱۰) فیٹ ہیں۔

بحر منجمد جنوبی (۴,۰۰۰,۰۰۰) مربع میل پھیلا ہوا ہے اس کی گہرائیاں علی الترتیب (۴,۹۲۰) اور (۱۹,۷۵۰) فیٹ ہیں۔

دنیا کی سب سے بلند چوٹی **مونٹ ایورسٹ** (ہمالیہ کی ایک چوٹی کا نام) (۲۹,۰۰۲) فیٹ بلند ہے اس چوٹی تک تاحال کسی کی رسائی نہ ہو سکی۔

یورپ کی سب سے بلند چوٹی مونٹ بلانس (کوہ آلپس کی ایک چوٹی) (۱۵,۷۸۰) فیٹ بلند ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا دریا، دریائے مس سس سپی ہے۔ جو (۴,۰۶۰) میل طویل ہے۔

ایشیا کا سب سے بڑا دریا ینی سی ہے جو (۳,۹۵۰) میل طویل ہے۔

افریقہ کا دریائے نیل (۳,۶۸۰) میل طویل ہے۔

دلچسپیاں

ڈی ویلرا کا مذاق کچھ عرصہ ہوا آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر منزیس آئرستان گئے تھے۔ جہاں ڈی ویلرا سے ان کی ملاقات ہوئی پہلی ہی ملاقات کے موقع پر آئرستان کے بڑے وزیر ڈی ویلرا نے اپنے معزز مہمان منزیس سے کہا "بات چیت سے پہلے آپ کو کچھ کھانا چاہیے۔ منزیس نے کہا "ضرور۔ مگر مجھے اولڈ آئرش سے بڑی محبت ہے۔ اگر یہ مل جائے تو میری تشفی ہو جائے گی" اس پر ڈی ویلرا نے ہنستے ہوئے جواب دیا "خیر گذری کہ آپ نے صرف یہی طلب کیا مجھے تو اندیشہ تھا کہ کہیں آپ ہمارے اولڈ پورٹس طلب نہ کر بیٹھیں"

قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ "اولڈ آئرش" اور "اولڈ پورٹ" کی شراب کی دو مشہور قسمیں ہیں۔ اولڈ آئرش سے مراد آئرستان کا قدیم علاقہ یعنے آزاد آئرستان ہے۔ جس کے وزیراعظم مسٹر ڈی ویلرا ہیں پورٹ بندرگاہ کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اولڈ پورٹس کا مطلب یہہ ہو سکتا ہے کہ مسز پیس دوسرے معنی میں پرانے آئرستان کی کنجی یعنی اس کی بندرگاہیں طلب کر رہے تھے۔

ہائے موٹاپا! نیو روشل واقع نیو یارک کے فرسٹ نیشنل بنک کی ایک نئی شاخ کے افتتاح کی تیاریاں بڑے ہی اعلیٰ پیمانے پر عمل میں آچکی تھیں۔ ہر چیز تیار تھی۔ مقررہ وقت پر بڑی تعداد میں مہمان آئے۔ جلسہ منعقد کیا گیا۔ تقریریں ہوئیں۔ لارڈ میئر نے فیتہ کاٹنے کی رسم بھی انجام دیدی۔ قومی ترانہ بھی گایا گیا۔ ان تمام مرحلوں کے بعد اب وہ بھی باری آئی کہ بنک کے صدر مسٹر ارنسٹ وانسن اس نئی عمارت میں سب سے پہلے قدم رکھیں۔ صدر صاحب بڑے خوش خوش نظر آتے تھے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے کوٹ اور نکٹائی بھی ٹھیک کرلی اور داخل ہونے کی غرض سے آگے بڑھے مگر "ہائے موٹاپا" دروازے نے انہیں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ انہیں اندر ڈھکیلنے کی انتہائی کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ صدر تو صدر ڈھکیلنے والے بھی پسینہ پسینہ ہو گئے لیکن وہ داخل نہ ہو سکے۔ آخرکار ہانپتے کانپتے اور پسینہ پونچھتے ہوئے صدر صاحب اسی شان اور آن بان کے ساتھ واپس لوٹے جس اہتمام کے ساتھ وہ آئے تھے انکی واپسی کے وقت چند خوش مزاجوں نے آوازے کسے "فوج پر بھاری ——— آیندہ سے جب کبھی دروازہ بنانا ہو تو پہلے اپنا ناپ لے لیں" مسٹر وانسن کا وزن ۳۰۹ پونڈ ہے۔

فلمی خبریں

نسیم بانو کا خط آپکے نام آپ کو یہہ سن کر تعجب ہوگا کہ مجھے جو خط آتے ہیں ان میں کسقدر رومان درد اور اضطراب ہوتا ہے۔ ان خطوں کی تعداد دیکھ کر انسان کو تعجب ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ان کے نفس مضمون کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے زیادہ تعجب انگیز ہے۔

یہہ خطوط محبت کے ان مدارج کے مظہر ہوتے ہیں جو فطری طور پر ایک سینما اسٹار کے لیے ہونے چاہئیں۔ ان میں بعض نظم بھی ہوتے ہیں بعض حقیقی ہوتے ہیں اور بعض تخیل کی بلند پروازیوں کو بام ثریا تک پہنچا دیتے ہیں۔ میں یہہ خطوط پڑھ کر ہنسنا چاہتی ہوں وہ ہنسی جو قہقہوں میں تبدیل ہو کر گرد و پیش کے ماحول کو کشت زعفران یا دیوار قہقہہ بنا دے۔ لیکن میں اس طرح ہنس نہیں سکتی۔ صرف اس لیے کہ بعض واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں اور جب میں یہہ محسوس کرتی ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے یہہ ایک ایسا احساس ہے جسکو زبان کسی طرح ادا نہیں کر سکتی۔ اس احساس کے ساتھ فوراً میری آنکھوں سے آنسو مچل کر بہنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں ضبط کرتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ انسانی زندگی کے تھیٹر میں اسکی ہر سانس ایک مکمل ڈرامہ ہے۔ یہہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تصور بھی کوئی نہیں کرتا دنیا کے ہر قدم پر ایک افسانہ ہے اور وہ افسانہ کتنا دردناک اور کتنا رومان آفریں ہے اس کا احساس اگر کیا جائے تو دل کی گہرائیوں میں اضطراب کروٹیں لینے پر مجبور ہو جائے انسانی زندگی کے یہہ حقیقی ڈرامے اسکرین کے مصنوعی ڈراموں سے بدرجہا جامع اور بہتر ہوتے ہیں۔ بلکہ اسکرین میں ایسے ڈرامے پیش کرنے کی جسارت ہی نہیں ہے۔ میں اس حقیقت کو اس لیے زیادہ اہم سمجھتی ہوں چونکہ میرے سامنے ہر صبح مختلف لوگوں کی زندگی ایک نیا عنوان حیات سے پیش کرتی ہے۔ مجھے کراچی کے ایک نوخیز کالج اسٹوڈنٹ کے ۲۰ خطوط وصول ہوئے ہیں جس نے کراچی میں پکار کا ہر شو دیکھا۔ اور جسکا دعویٰ ہے کہ اسکی نیند بھی میرے دیکھنے کے لیے اسقدر بیتاب ہے کہ ہر شب اسکی آنکھوں کو تج کر میری تلاش میں نکلتی ہے۔ آپ اس محبت کی معراج کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ میں کر سکتی ہوں لیکن میں بیان نہیں کر سکتی۔ ان نازک جذبات کو سمجھنے کے بعد میرے رباب دل کا ہر تار تڑپ اٹھتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ حسن دل کی نزاکت اور اسکے آئینہ خیال کو حفاظت سے رکھنے کے قابل ہے یا توڑنے کے لیے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میری تشہیر کرنے والوں نے **پری چہرہ نسیم** لکھ کر عوام کے لیے تباہی کے دروازے کھولدیے ہیں۔ میرے دل میں آنسو درد کی کشمکش سے اس قدر بے چین ہوتے ہیں کہ وہ تڑپ کر میری نگاہوں کے عنوان بے خودی بن جاتے ہیں اور میں سوچتی ہوں کہ حسن اتنا نازک اور بے رحم بھی ہے۔ جس سے زندگی کے ارمان سنوارتے بھی ہیں اور برباد ہوتے بھی ہیں۔ (ظفر)





رسالے

چمنستان { ۱۹۴۲ء کا سالنامہ ۱۴۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ لکھائی چھپائی حسب معمول سرورق سادہ اور سالنامے میں کوئی تصویر نہیں قیمت ۱۸ر دفتر چمنستان دلی سے طلب فرمایئے۔

آغا سرخوش اور گوردھن داس مدیران قابل مبارکباد ہیں کہ کاغذ کی بڑھتی مہنگائی کے باوجود انہوں نے سالنامہ نکالنے کی جرات کی۔ اور اپنے خریداروں کے لیے نظم و نثر کے مجموعے کا ایک عمدہ گلدستہ پیش کیا۔

اس نمبر میں جوش، جلیل، مرلیدھر شاد، احسان دانش اور آرزو کا کلام خاص وزن رکھتا ہے۔ نثری حصے میں یوں تو مضامین عموماً اچھے ہیں۔ لیکن یادِ رفتگان، ایسا بھی ہوتا ہے، خمخانۂ ریاض، سوگوار سہاگ، ہمارے موٹے نواب، بیوی داڑھی کی سرگذشت اور لوگ اسے محبت کہتے ہیں خاص مطالعے کے محتاج ہیں۔

بہرحال یہ سالنامہ ادبی کوششوں کا اچھا ثمر ہے۔ ادب نواز اس سے پورا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

آئینہ { بمبئی کے ہفتہ وار نے نئے سال کے موقع پر اپنا خاص نمبر نکالا ہے جو ۸۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ لکھائی چھپائی نفیس اور قیمت ۲ر ہے۔

اداریے کے بعد نوح ناروی کے کلام سے پرچے کی ابتدا کی گئی ہے۔

تقریباً ہر مضمون اور ہر نظم کے ساتھ یہ لکھا ہوا ہے "خاص آئینے کے لیے" یا "خاص برائے آئینہ" وغیرہ۔ کاش کہ یہ ادبی تحفے جس خصوصیت کے ساتھ بھیجے گئے ویسے ہی خاص ہوتے تاہم بعض مضامین اور نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ مثلاً نظم تبرکات نوح، شاعر، جذبات لطیف اور محو تماشا، اور نثر میں بیوہ، سہیلی اور آخری محبت ایک حد تک معیار پر اتر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم اپنے بمبئی والے معاصرین کو یہ نیک مشورہ دیں گے کہ سالناموں کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ زیادہ حجم کے ساتھ چند تصویریں پیش کر دی جائیں بلکہ حقیقی معنی ادبی افادیت پیش نظر ہونی چاہیے۔

اپنے اعتبار سے آئینے کا سالنامہ بہت اچھا ہے جس کے پڑھنے کی ہم ضرور سفارش کریں گے

ظفر { بمبئی کے ہفتہ وار ظفر نے "عید قربان نمبر" پیش کیا ہے۔ حجم ۲۶ صفحے قیمت ۲ر۔ لکھائی چھپائی اوسط۔

• احسان دانش اور اختر شیرانی کی نظموں اور ڈاکٹر اعظم کریوی کے افسانے "مردانگی" سے اس خاص نمبر کو زینت دی گئی ہے۔

شان ہند { اس ہفتہ وار نے بھی اپنا خاص نمبر جاری کیا ہے جس کی ضخامت ۸۵ صفحے ہے قیمت ۴ر۔ مگر یہ عید یا نئے سال کی خاطر نہیں بلکہ "آل انڈیا موشن پکچرز کانفرنس" کی یادگار ہیں۔ چنانچہ اس سے متعلق کئی ایک تصویریں اس نمبر میں موجود ہیں نیز بعض مضامین اور کانفرنس کی پوری پوری روداد بھی درج ہے۔

شاید جلدی کے سبب لکھائی کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں اور چھپائی غیر تشفی بخش ہے۔

ہمیں عام بمبئی کے اکثر و بیشتر رسالوں سے ہمیشہ یہ شکایت

رہی ہے کہ وہ انگریزی کے عنصر کو خواہ مخواہ اور غلط سلط طریقے پر جگہ دینے کی بے جا کوششیں کرتے ہیں اس سے پہلے بھی ہم نے اس امر کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی تھی لیکن سخت افسوس کا مقام ہے کہ کسی ایک بھی مدیر کے کان پر جوں رینگتی نظر نہ آئی۔

ہم شان ہند کے مدیر سے یہہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا بمبئی جیسے بڑے شہر کے انگریزی چھاپے خانوں میں ہندستانی زبان کا ٹائپ نہیں جو آپ کے سرورق اور تصویروں کے ناموں وغیرہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہہ محض آپ کی غفلت کا سبب ہے ورنہ آپ چاہیں تو وہی تحریر ہندستانی زبان میں چھپ سکتی ہے۔ ایک طرف تو آپ ہندستانی زبان کے پرچار اور اس کی اہمیت کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے ہاتھوں اس کی تباہی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ کیا آپ کے لیے یہہ ناممکن ہے کہ اپنے رسالے کی جلد اور نمبر، تاریخ اور سنہ، قیمت اور ریٹ، خاص نمبر یا اور کچھ، تصویروں کے نام اور ان سے متعلق ضروری عبارت وغیرہ ہندستانی زبان میں چھپوائیں۔ کیا آپ یہہ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے رسالے کے پڑھنے والوں میں سے سو میں سے ایک بھی انگریزی سے آشنا ہوتا ہے اس صورت میں آپ کی لاحاصل کوششوں کا مقصد ـــ ؟

بہر حال ہم پھر سے ایک دفعہ بمبئی یا جہاں کہیں کے بھی ہوں ان تمام ایسے رسالوں کے مدیروں وغیرہ کو ان کے غلط طریقۂ کار کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ فوراً اس غلط روش کا سد باب کریں

کتابیں

محشر خیال (سجاد علی انصاری مرحوم بی۔ اے، ال ال بی (علیگ) کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس کو پروفیسر خواجہ منظور حسین ام۔ اے (علیگ) بی۔ اے (آکسن) نے مرتب کیا ہے اور ۱۹۴۱ء میں دوبارہ چھپا ہے۔ صفحات ۲۸۰ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

کتاب کے آغاز سے قبل آل احمد صاحب سرور صدیقی ام۔ اے (علیگ) نے "شعلہ مستعجل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو اس کتاب کا بہترین تعارف ہے۔ زیر نقد کتاب کیا بہ حیثیت خیالات اور کیا بہ حیثیت زبان نہایت وقیع ہے۔ کتاب کا پڑھنے والا کبھی زبان کے گنجلک میں الجھ جاتا ہے اور کبھی خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہے۔ سجاد صاحب کے مذہبی رجحانات بھی عجیب وغریب ہیں۔ وہ اپنے نظریات کو اپنے خاص منطقی استدلال میں کچھ اس طریقے پر بیان کرتے ہیں کہ وہ لوگ جن کے مذہبی عقاید کمزور ہیں یا جن کا مذہبی مطالعہ قوی نہیں ہے مذہب سے برگشتہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے اپنے مضامین "حقیقت عریاں" "پیام زلیخا" "مذہب و اخلاق" وغیرہ میں گناہ اور نیکی، سزا اور نافرمانی اور آدم کے گناہ اولین کو مصلحت خداوندی قرار دے کر یہہ ثابت کیا ہے کہ انسان گناہ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ "ایک لطیف گناہ ہزار خشک نیکیوں سے بالاتر ہے۔" لیکن "لطیف گناہ" کیا کیا ہیں اور کس طرح کیے جا سکتے ہیں کہیں نہیں بتایا۔

عورت اور حسن وشباب کی رنگینیاں بھی سجاد صاحب کے ہاں اکثر و بیشتر معرض بحث میں آگئی ہیں۔ بلکہ ہم تو ان کے تمام فلسفے کو عورت ہی پر مرکوز سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "حوا محض اس لیے پیدا کی گئیں کہ آدم سے ارتکاب جرم کروائیں۔ صحیح معنوں میں عورت وہ ہے جو اپنے ہر انداز سے محبت کرنے والے کے دلوں میں لطیف امیدیں پیدا کردے۔ قدرت نے زلیخا کے ذریعے یہہ پیغام بھیجا تھا کہ حسن کو کبھی مرعوب نہ ہونا چاہیے۔ اس کو اختیار دیا گیا ہے کہ اپنی قوت تسخیر کو جب چاہے اور جس طرح چاہے صرف کرے۔ صحیح معنی میں عورت وہ ہے جو محبت کرے اور کرنے دے۔" حسن وشباب کی رنگینیوں میں محو ہو جانا عورت کا حقیقی فرض ہے۔ شباب کے ساتھ عورت کی نسوانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک لایعنی ہستی ہو کر رہ جاتی ہے۔" لیکن سجاد صاحب کی دنیا چند حسینوں کی ایک چھوٹی سی بستی سے باقی ل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "ایک کرۂ بیت المنظر انسان

۔۔۔خوبصورت انسان سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔ عصمت فروشی یہ ہے کہ ایک حسین عورت ایک بدصورت سے محبت کرے"۔ "حسن کی حقیقی دلفریبیاں لطیف گناہوں میں ہیں"۔

سجاد صاحب کی علمی اور ادبی تنقیدیں بھی ندرت سے خالی نہیں۔ حالی، بوکشں، سرسید جیسے شاعر اور ادیبوں پر بعض ناجائز چوٹیں کی ہیں۔ حالی کے مقابلے میں شبلی کو ترجیح دی ہے۔ سجاد مرحوم اگر زندہ ہوتے تو دیکھ لیتے کہ خود زمانہ شبلی کو مٹاتا جا رہا ہے اور حالی لافانی ہوتے جا رہے ہیں۔ البتہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے متعلق غلو کر گئے ہیں کہتے ہیں۔ "اگر قرآن نازل نہ ہوچکا ہوتا تو" یا مولانا آزاد کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔ شاید مرحوم کو یہ خبر نہیں تھی کہ اقبال اور آزاد کی تحریریں اسی قرآن کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

کتاب کے آخر میں مرحوم کا ایک ناتمام ڈرامہ روز جزا بھی شریک کیا گیا ہے۔ جو ان کے ہر قسم کے خیالات کا لب لباب ہے۔ روز جزا اپنی تمام ڈرامائی خصوصیتوں سے معرا ہے۔ ڈرامے کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف محض اپنے خیالات کی ترویج کرنا چاہتا تھا۔ ان کے کردار مٹی کے پتلے ہیں جن کے پیچھے خود ڈرامہ نگار بول رہا ہے۔

غرض مختصر خیال اپنی افادیت کے لحاظ سے زیادہ اہم نہیں۔

جو لوگ مذہب اور ائے فلسفے سے واقف ہیں وہ ضرور اس کتاب کو پڑھیں۔ (ر۔ح)

پریم مندر } کتابی سائز کے ۵۴ صفحات پر سید شبیر حسن صاحب قیس نے ایک ڈرامہ لکھا ہے جو انجمن ترقی ہندستانی" کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ ڈرامے کا نام ہی خود پلاٹ کی دلکشی کا ضامن ہے۔ عاشق و معشوق ندی کنارے ملتے ہیں۔ واقفیت کے مزے لوٹنے کے بعد طالب و مطلوب کے دل ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ مذہب انہیں رشتہ ازدواج میں جوڑنا چاہتا ہے تو ماں باپ کی مخالفت خط فاصل بنتی ہے۔ محبت کی دلخراش جدائیاں مایوسیوں کی حدود تک پہنچ جاتی ہیں تو صرف "محبت" ہی ملا سکتی ہے۔ قیس صاحب نے پریم مندر میں روحوں کی بھینٹ چڑھائی ہے۔ محبت کے پجاری اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں قیمت ۶ر۔ (ع۔م)

گردھاری } سید شبیر حسن صاحب قیس نے فلمی طرز کا قصہ لکھا ہے جس کو انجمن ترقی ہندستانی حیدرآباد نے چھاپا ہے کتاب لکھتے وقت مصنف کے پیش نظر مسئلہ تناسخ تھا جس کے حل کرنے کی انہوں نے کوشش بھی کی ہے۔ عہد عتیق کی روحوں کا آپس میں باتیں کرنا، چٹان کا پھٹ جانا، موقع بر موقع تلوار چل جانا، اختتام پر سب افراد کا مر جانا، پھر ان کی روحوں کا محو تکلم ہونا اس قسم کے مافوق الفطرت واقعات سے کتاب بھری ہوئی ہے فرصت کے وقت اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (ع۔م)

داغ } نور اللہ محمد نوری صاحب نے داغ کی سوانح حیات اور کلام پر مبسوط تبصرہ فرمایا ہے۔ یہ غالباً پہلی کتاب ہے جو داغ سے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد پیش کرتی ہے مصنف نے داغ کے شاگردوں کی فہرست بھی دی ہے مگر نامکمل ہے۔ بہتر ہوتا اگر نوری صاحب قادر حیدرآبادی جیسے شاعر کا بھی ذکر فرما دیتے داغ کے ہمعصر امیر مینائی اور ان کے حریف مقابل پاس حیدرآبادی کی استادانہ چشمک کا بھی ذکر ہو جاتا تو کتاب کو چار چاند لگ جاتے ساتھ ہی ساتھ داغ کی مشہور تعلی "کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے" کا جواب بھی ضروری تھا جو مائل، واصفی، محمود اور معین وغیرہ نے دیا تھا۔ داغ کی اصلاحات کا باب بھی تشنہ ہے۔ یہ عنوان اپنی وسعت کے اعتبار سے زیادہ توجہ کا مستحق تھا۔ تاہم مصنف کی کوشش قابل قدر ہے۔ داغ کے پرستار اس کتاب سے بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں نہ صرف داغ بلکہ ان کے مشہور تلامذہ عزیز یار جنگ بہادر عزیز کیفی، واصفی، آلم، سائل وغیرہ کے اشعار سے بھی روشناس ہوسکتے ہیں۔

داغ کی روح خوش ہوتی ہوگی کہ ان کے مرنے کے بعد ایک حیدرآبادی ادیب ہی نے ان کی زندگی اور کلام پر مبسوط تبصرہ کیا۔ (ع۔م)

ارمغان باز } میر تراب علی خاں باز کے کلام کا مجموعہ ہے جو ۸۴ صفحات پر رنگین ٹائٹل اور شاعر کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا ہے شروع میں سردار علی صاحب کا لکھا ہوا تعارف ہے اس کے بعد باز

کی شاعری کے متعلق اساتذہ فن اور مستند رسائل کی آرا کا اقتباس ہے جس میں حضرت امجد حضرت جلیل حضرت جوش ملیح آبادی حضرت فانی مرحوم قابل ذکر ہیں۔

ارمغان باز شاعر کے جذبات کا آئینہ ہے۔ کلام میں سلاست روانی اور بے ساختہ پن کے علاوہ خاص درد بھی پوشیدہ ہے۔ جس کی وجہ سے اشعار غیر شعوری طور پر دل نشین ہو جاتے ہیں اشعار میں کہیں کہیں ظرافت کی چاشنی کلام کو دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ مزید برآں دکھنی محاورات کا استعمال سونے پر سہاگہ ہے۔ ذیل میں ان کے چند شعر دیے جاتے ہیں۔

[illegible] غم پہ موت کا احسان ہو گیا
اب جاؤ تم سے کوئی شکایت نہیں رہی

[illegible] بزم طرب آج مجھ عدو بھی تھے
لہو کے گھونٹ بھی پینے پڑے شراب کیسا

[illegible] ڈھا رہا ہے ترا بانکپن
میں قربان جاؤں ذرا اور تن

(ع - م)

ایرپورٹ ڈائرکٹری } حیدرآباد دکن کا ریلوے ٹائم ٹیبل جس میں [illegible] مسافروں کو مدنی اور محصول کروڑگیری بھی درج ہے۔ انجمن آسایش مسافران حیدرآباد دکن کی جانب سے اردو میں شایع کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں حمل و نقل سے متعلق مکمل تفصیلات شایع [illegible] گی۔ اس قسم کی پہلی کوشش دنیائے اردو ادب میں ایک مستحسن اقدام ہے۔ اس کو کامیاب بنانے میں جس قدر امداد دی جائے کم ہے۔ چھپنے کا عذر [illegible] صفحے کی اردو ڈائرکٹری ارزانی میں گویا مفت ہے۔ (ع م)

السیاستہ الدینیہ فی الاسلام } مصنفہ ابو المحمود الاستاد العلامہ چودھری محمد حامد خاں [illegible]۔ حجم ۱۴۴ صفحے قیمت عہ ملنے کا پتہ محمد محمود دفتر اعظمیہ۔

زیر نظر کتاب کے ہاتھ میں آتے ہی یہ گمان ہوا کہ یہ کوئی "العربی" ہوگی اور کسی ادیب نے تصنیف کیا ہوگا۔ لیکن کتاب کے کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ [illegible] اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ شکر ہے کہ ہم اپنی عربی [illegible] نمایش میں نہ نکلے۔

علامہ موصوف نے انہیں کے قول کے مطابق اس کتاب میں ہر چہ گیرید مختصر گیرید کا اصول اختیار کیا ہے لیکن تمہید اس زرین اصول سے محروم رہ کر تقریباً پچاس صفحے تک چلی گئی ہے اور اصل متن جو انگریزی جامعہ کے طالبعلموں اور "اسلامی سیاست" و عدالت سے نابلد تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے برسبیل استعمال سپرد قلم کیا گیا ہے، اتنا مختصر ہو گیا ہے کہ اسے معترضین اسلام تو کیا موافقین اسلام بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔

قابل مصنف نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے بعض مثلاً نکاح، طلاق، خلع، زکوۃ وغیرہ ہیں جو ان کی تصنیف سے زیادہ واضح طور پر دینیات کی بعض معمولی اور ابتدائی کتابوں میں دستیاب ہو سکتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کی ساری کتابیں چھاننے سے بھی نہیں ملتے۔ علامہ موصوف ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ "مذہب بغیر طاقت کے مستحکم نہیں رہ سکتا"۔ اسکی دلیل میں بجائے کبیر داس کا نام لیا ہے کہ "قوت نہ ہونے سے وہ اپنی آواز بلند نہ کر سکا"۔ ہم اس وقت علامہ موصوف کی توجہ انگریزوں کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں جن کی سلطنت اتنی بڑی تھی کہ اس پر سورج غروب نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ کم از کم اتنا ہی کر لیتے کہ اپنے مقبوضہ ممالک میں عیسائی مذہب کو تبلیغ کے ذریعے نہ سہی تلوار کے زور ہی سے پھیلا دیتے اس طرح اسلام اپنی عسکری قوت کی کمی اور اپنی دنیاوی طاقت اور حکومت کے فقدان کے باوجود دنیا سے ناپید کیوں نہ ہوا؟ کیا قابل مصنف اس سے ناواقف ہیں کہ مٹھی بھر نا تربیت یافتہ اور نہتے مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ جیسی زبردست اور جبار قوتوں کو زیر دست کر لیا تھا۔ کیا انکے پاس اس وقت فوجیں تھیں؟ کیا ان کے پاس کسی قسم کے نئے نئے آلات حرب تھے۔؟ آگے چل کر صاحب موصوف نے "اسلام ایک حکومتی مذہب ہے" کہہ کر اسلام پر ایک قسم کا الزام لگایا ہے۔ خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ اسلام اس لیے بھیجا جا رہا ہے کہ تم دنیا پر حکومت کرو بلکہ بار بار پکار کر یہی ارشاد کیا ہے کہ حکومت صرف اللہ کے لیے ہے تم پر آسمت اسی کے محکوم ہو تم اسی کی اطاعت کرو اور اسی کی حکومت قایم کرو۔ اسلام نے حاکمیت و محکومیت جیسی ذلیل چیزوں کو مٹا کر مساوات کی وہ تعلیم دی کہ محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں لا کر کھڑا کیا۔ اسی طرح علامہ موصوف نے اکثر مقامات پر اسلامی قوانین کی غلط تعبیر کی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولانا اس قدر تعجیل میں اس اہم ترین موضوع پر قلم ہی نہ اٹھاتے۔ ہم علامہ موصوف سے اس جسارت کی باادب معافی چاہتے ہیں۔

(ر - ح)

ہندستانی ادب

ایڈیٹر :- غلام محمد خاں ام ۔ اے (عثمانیہ)

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۸۴)
رجسٹرڈ برطانیہ ام (۴۴۴۳)
چندہ سالانہ (للعہ)

تار کا پتہ ... ادب
قیمت ایک پرچہ (۶/)

جلد ۲ | خورداد ۱۳۵۱ فصلی | اپریل ۱۹۴۲ عیسوی | نمبر ۷

فہرست مضامین

ہمارے خیالات



سالگرہ نمبر آنے والے مہینے کے ختم پر ہم اپنی عمر کا ایک سال پورا کریں گے اور اس کے بعد دوسرے سال کی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس مختصر سی زندگی میں ہم نے اپنے معمولی اور خاص نمبروں سے ادب اور زبان کی جو بھی خدمت کی ہے وہ ہمارے پڑھنے والوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہم پھر سے صاف طور پر کہے دیتے ہیں کہ ہمارا بڑا مقصد صرف ادب اور زبان کی خدمت ہے اگر ہم اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کے قابل ہو جائیں تو اس حالت میں بھی اس سے دریغ نہ کریں گے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں سالگرہ نمبر کی صورت میں اپنی زبان کی ایک خصوصی خدمت پر مجبور کر رہا ہے۔ گو یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب تک کہ ہندستان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ چاہے کچھ ہو ہماری کوششیں تو برابر جاری رہیں گی۔ اسی خیال کے تحت ہم اپنے قلمی معاونین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ جلد سے جلد اپنے افکار عالیہ بے مانگے ہمارے ہاں روانہ کر دیں۔

جیسا کہ ہم مسلسل اعلان کر رہے ہیں سالگرہ نمبر کے کامیاب مضمون لکھنے والوں کی خدمت میں انعامات بھی پیش کریں گے۔ یہ معمولی تحفہ ان کی نگارشوں کا معاوضہ نہیں ہوگا بلکہ ان کے ادبی کارناموں کی یادگار۔ اس لحاظ سے کسی کو اس معاوضہ کا خیال کیے بغیر مضامین اور نظمیں وغیرہ جلد سے جلد روانہ فرمانی چاہئیں۔ حالانکہ ماہنامہ میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوگی تو ادارہ ۱۳۴۲ء سے حق ہو [illegible] اپنے سالگرہ نمبر کی شکل میں آپ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا جائے گا۔

اپنے منہ میاں مٹھو ہم فخر کی دنیا میں تنگ نظری خود اپنی تعریف ہم [illegible] اکثر دیکھتے ہیں۔ [illegible] خیال کے حامی ہیں [illegible] کی [illegible] ترقی ممکن نہیں۔ دنیا کے ہر پیشے میں [illegible] اس کام کا کوئی حق توجہ اجرا اور [illegible] [illegible] چونکہ ہمارا سب سے بڑا مقصد ہندستانی زبان کی خدمت ہے اس لئے ہم نے اس خصوصیت پر توجہ دلانا ضروری سمجھا۔

معاوضہ نہیں لیا جاتا اور نہ کبھی ایک دوسرے کے کام سے گریز کیا جاتا ہے۔ ہماری درخواست کو اکثر معاصر نظر انداز کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ وہ ہمارا اشتہار چھاپ دیں اور اپنا اشتہار روانہ نہ کریں بلکہ ہم نے ہر وقت یہ خواہش کی ہے کہ آپ بھی ہمیں خدمت کا موقع دیں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر معاصروں نے مطلق توجہ نہیں کی جس کو ہم مجبوراً ان کے معاصرانہ رشک پر محمول کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہم اپنے ان کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہتے جنہوں نے ہمارے ساتھ تعاون عمل کیا اور ان کی خواہش کے مطابق ہم نے بھی ان کی خدمت اسی طرح کی۔ یہی ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ ورنہ معاصرانہ تعلقات رشک و حسد کے شعلوں میں بدل جائیں گے جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

ہندستانی لغت ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آل انڈیا ریڈیو نے ہندستانی زبان کے لغت کا کام شروع کر دیا ہے۔

ہندستانی زبان کے پرچار میں آل انڈیا ریڈیو کا بڑا حصہ ہے مگر بعض اوقات یہ لفظوں کے استعمال میں بھٹک بھی جاتا ہے اس لحاظ سے شاید ہمارا یہ شبہ بے جا نہ ہو کہ لغت کے جیسے اہم کام میں بھی اس سے ایسی لغزشیں سرزد ہوں۔ نشریات عارضی چیزیں ہوتی ہیں لیکن لغت ایک ایسا کارنامہ ہے جو دائمیت کا سکہ جما دیتا ہے۔ لغت خود زبان بھی ہے اور بھٹکا دینے والا شیطان بھی۔ اس لیے ایسے اہم کام میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مثلاً غیر زبان کے غیر مانوس اور ناقابل قبول لفظوں کو ہندستانی لفظوں کا نام دیکر لغت میں داخل کر دینا زبان کی خدمت نہیں بلکہ لسانی نقطۂ نظر سے اس کا خون کرنا ہے۔ کسی زبان میں دوسری زبانوں کے صرف ایسے ہی لفظ بجنسہ داخل کیے جا سکتے ہیں جن کا بدل اس زبان میں موجود نہ ہو یا ایسے سلیس اور آسان ہوں کہ عوام تک ان کو سمجھ سکیں۔

ہندستانی زبان کی تعمیر یقیناً ضروری ہے لیکن ہم کسی ایسے تعمیری کام کے قائل نہیں جو جھگڑا اور ناقابل قبول ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نے اس اہم کام کے لیے ہندستانی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کی خدمات حاصل کی ہوں۔ تاہم ہمارا یہ مشورہ ہے کہ اگر وہ عملی اور ادبی پہلوؤں سے اس پر بھی وقتاً فوقتاً مشورے کیے جائیں

حالی کی شاعری پر ایک اچٹتی نظر

اگرچہ شاعری میں حالی کا پایہ بہت بلند ہے اور ان کی ہر نظم کی جتنی بھی تعریف کی جائے تھوڑی ہے۔ مگر ان کی جن نظموں کا سکہ ہمارے دل پر بیٹھا ہے ان میں سے دو یہ ہیں۔ ایک "مسدس" دوسری "مناجات بیوہ" اگر حالی صرف یہی دو نظمیں لکھ دیتے تو بھی وہ ایسے ہی مشہور ہوتے جیسے کہ اب ہیں۔ مسدس نے حالی کو ان کے اصلی رنگ میں ظاہر کیا اس مسدس نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے لکھنے والے کا درجہ دوسروں سے کہیں زیادہ ہے اور وہ اصل حالات اور واقعات سے بے حد متاثر ہے۔ یہ نظم یعنی مسدس حالی نے سرسید کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں لکھی تھی۔ اس کے مقدمے میں خود حالی لکھتے ہیں۔

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں شریف خاک میں مل گئے ہیں علم کا خاتمہ ہو چکا ہے دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت کچھ دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی ہماری سلامتی ہے..... ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر دو طرح کے خیالات گذرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے پہلے خیال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے"

اس زمانے کی حالت کا ہم اس وقت ٹھیک طور پر اندازہ نہیں کر سکتے۔ حالی کے الفاظ میں گو بظاہر دیا نہ غلو معلوم ہو مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اصل میں حالی اپنے زمانے کے حالات سے بے حد متاثر تھے اور انہوں نے ایک ایک بات نہایت پتے کی کہی ہے۔ حالی مسدس کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں۔ "اس میں نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی ہے نہ مبالغے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی ہے مگر ہے کیا؟ خلوص ہے۔ صداقت ہے۔ سلاست ہے، روانی ہے۔ صاف گوئی ہے۔ سادہ بیانی ہے۔ ایک آئینہ خانہ ہے جس میں قوم اپنے صحیح خط و خال کو دیکھ سکتی ہے اور سمجھ سکتی ہے کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے"

اس مسدس کے متعلق منشی عبدالرحمان صاحب اپنے مضمون "حالی کی شاعری کے تین دور" میں تحریر فرماتے ہیں "مسدس نئی شاعری کا بنیادی پتھر ہے اور اس میں سخن ور نے ایک ایسا نمونہ شاعری پیش کیا ہے۔ جس کی مثال اب تک دیکھنے میں نہیں آئی مدوجزر اسلامی میں تواریخی واقعات کو اس صحت و خوبی کے ساتھ نظم کرنا مولانا حالی ہی کا حصہ ہے اس کے مختلف حصے ایسے باربط اور مرتب ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے نظم لکھنے میں خیال کو ایک ہی واقعے پر جمائے رکھنا اور اس واقعے کا ایک ایسی تواریخ سے اخذ کرنا جو نصف دنیا اور ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے سے متعلق ہے۔ کوئی آسان کام نہیں" زمانہ دسمبر ۱۹۳۵ء۔

اس مسدس سے سرسید کو بیحد مدد ملی۔ سنا جاتا ہے کہ لوگوں کو غیرت دلانے کی خاطر سرسید بھرے جلسوں میں اکثر اس مسدس کے بعض حصے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ایک تو سرسید کی

شخصیت اور دوسرے حالی کا یہ دردبھرا کلام پھر تو لوگوں پر خوب
اثر ہوا۔ مسدس کے پہنچنے پر سرسید نے حالی کو جو خط تحریر فرمایا اس
کی نقل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

" جناب مخدوم و مکرم من۔ عنایت نامجات معہ ۵ جلد
مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی۔ جب تک ختم نہ
ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ
کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ
جدید قرار دی جاوے تو بلکل بجا ہے۔ کس صفائی و خوبی اور
روانی سے یہ نظم تیار ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب
ہوتا ہے کہ ایسا مضمون جو مبالغہ جھوٹ اور تشبیہات دور
از کار سے جو مایہ ناز شعر و شاعری ہے بلکل مبرا ہے۔ کیونکہ ایسی
خوبی خوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس
میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ واقعہ یہ ہے
جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور
نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے
اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے
اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر
پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو ان ہی الفاظ میں
جن میں میری طرف اشارہ ہے بیشک میں اس کا محرک ہوا
اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا
پوچھے گا کہ تو کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا
ہوں۔ اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس
سے فائدہ۔ بخشئے مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں
اور خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں ..... آپ کے اس خیال
کا کہ حق تصنیف مدرستہ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرا دی
جاوے دل سے شکر کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس
کو جو قوم کے حال کا آئینہ دار یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی
قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو
اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی
پر گاویں قوال درگاہوں میں گاویں۔ حال لانے والے اس
سچے حال پر حال لاویں اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا دل
تو چاہتا ہے کہ دلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف
ہوں اور رنڈیاں نچاؤں گروہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں
میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھپاؤنگا۔ والسلام

خاکسار آپ کا احسان مند تابعدار

سید احمد۔ شملہ پارک ہوٹل۔ ۱۰ رجون ۱۸۷۹ء

مسدس کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب
فرماتے ہیں "مسدس لکھتے وقت جو قومی درد حالی کے دل میں
پیدا ہوا تھا وہ آخری وقت تک قایم رہا وہی ان کے خیالات
کا اصل سرچشمہ ہے جس سے نئی نئی سوتیں پھوٹی ہیں۔ باقی تمام کلام
اس ایک خیال کی تفسیر ہے"۔ اور پھر ایک دوسرے مقام پر
فرماتے ہیں "اس کی روانی حیرت انگیز ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
دریا امڈا چلا آرہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل
ہے جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحے کے
لیے بھی رکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا
ایک چشمہ ابل رہا ہے باوجود ان خوبیوں کے سادگی کا یہ عالم
ہے کہ اس پر ہزار صنایع بدایع قربان ہیں اور ہزاروں خوبیوں
کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد صداقت پر ہے۔ ادب
میں حسن و خوبی کا معیار صداقت یا حقیقت ہے۔ ہماری شاعری
میں مسدس نظم کی ایک ایسی قسم ہے جس کا نبھانا آسان نہیں ہے
اچھے اچھے مشاق شاعر بھی رہ جاتے ہیں اور بھرتی کے مصرعوں سے
جھول بھانے کی کوشش کرتے ہیں"۔

"**مناجات بیوہ**" بھی حالی کا کچھ کم اہم کارنامہ نہیں ہے
اسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بیوہ ہی کا کلام ہے یا یہ
حالی پر ایک بیوہ کی سی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ زبان اتنی صاف
اور خیالات اس قدر اچھے ہیں کہ جابجا حالی کی استادی کی داد
دینی پڑتی ہے روزمرہ محاورات اور عام بول چال کی زبان اور
طرز ایسا کہ اول سے آخر تک بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے

وہ لوگ جو اردو اور ہندی کے سوال میں الجھے ہوئے ہیں اس کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ہندستانی زبان میں ایسی صلاحیت موجود ہے جس سے وہ عام بول چال کی زبان بن سکتی ہے حالی نے باوجود فارسی اور عربی جاننے کے ہندی الفاظ اور روزمرہ کے استعمال سے کہیں احتراز نہیں کیا کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ جب تک زبان عام فہم اور سلیس نہ بنائی جائے کبھی عام ہو نہیں سکتی۔ مولوی عبدالحق صاحب کا یہ خیال بلکل درست ہے کہ کہیں ہندستان کی کوئی عام زبان ہو سکتی ہے تو وہ مناجات بیوہ کی زبان ہے۔

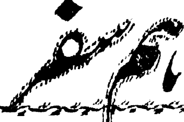
وہ لوگ جو حالی کے مقدمہ "شعر و شاعری" کو لاجواب کتاب مانتے ہیں یہ بھی تسلیم کریں گے کہ خود اس کا مصنف ایک اعلیٰ پایہ نثر نگار ہی نہیں بلکہ پکا شاعر بھی تھا۔ شاعری کے جن جن اصول کا "مقدمہ" میں ذکر کیا گیا ہے وہ تمام حالی کے مد نظر تھے انہوں نے ان تمام کا اپنی نظم اور شاعری میں لحاظ رکھا اور کہیں ان سے لغزش نہ ہونے پائی۔ تقریباً چار سو یا پانسو سال کے عرصے میں ہندستانی کے بہت سے شاعر پیدا ہوئے ان میں اکثر بناوٹی شاعر تھے جو اس لیے شعر کہا کرتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ہندستانی شاعری کے سرمایے میں اضافہ ہو جائے اور ایسے شاعر گنتی کے ہیں جن میں شاعری کا ملکہ قدرتی طور پر ودیعت کیا گیا ہو ہندستانی شاعری پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ دکھائی دیگا کہ اکثر وہ لوگ بھی جو شاعری کے نا قابل تھے۔ صلہ اور انعام کے لالچ میں شاعر بن جاتے تھے یا اس خیال سے شعر کہا کرتے تھے کہ لوگ ان کے کلام کی داد دیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان کا کلام معیاری تھا یا نہیں شعر کے سرمایے میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ بادشاہوں اور امیروں کی فیاضیوں سے ان کی تعداد میں روز بروز ترقی ہوتی گئی مگر حالی کا وہ زمانہ تھا جب کہ ہندستان سے مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور کہیں جو ایک آدھ قدرداں تھا تو وہ خود ہی پریشان اس کے علاوہ خود حالی کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی تھی کہ وہ خواہ مخواہ کسی کی مدح یا تعریف کرنی ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔

نیچرل اور جدید شاعری کے بانی حالی ہیں۔ ان سے قبل کے شعرا کے کلام کے مطالعے سے اس کی حقیقت ظاہر ہوسکتی ہے۔ سب سے پہلے حالی نے شاعری کے قصد اور مفہوم کو سمجھا۔ ان کا کلام خود اس کی زندہ مثال ہے وہ جس خیال اور رشتے سے متاثر ہوتے ہیں اس کو دوسروں پر ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں شیفتہ اور غالب کی فیض صحبت سے حالی نے اپنے کلام میں عامیانہ خیالات اور چھچھورے اور بازاری الفاظ کو داخل کرنے سے احتراز کیا اپنے بعد کے شاعروں کے لیے حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں وہ تمام اصول کو قلمبند کر دیے ہیں جن پر وہ خود چلتے تھے نئے قسم کے شاعروں کا آغاز گو محمد حسین آزاد کی کوشش سے ہوا تھا مگر ان شاعروں کو حالی جیسے شاعر کی شرکت سے نہایت مقبولیت حاصل ہوئی۔ **محمود احمد**۔ ام۔ اے (عثمانیہ)

جشن آزادی

دل تمدن کا دھڑکتا ہے ابھی کھنڈرات میں — زندگی گھبرا رہی ہے اس اندھیری رات میں
آگ برساتا ہے گردوں خون اگلتی ہے زمیں — عرش سے ٹکرا گیا ہے نالۂ قلب حزیں
رقص کرتے ہیں جہنم کوندتی ہیں بجلیاں — زلزلے طوفاں بداماں آندھیاں آتش بجاں
آ رہی ہے دور سے جلتی ہوئی نعشوں کی بو — تا کمر سیل اجل سیل گناہ سیل لہو
لے رہی ہے مفلسی شاہی سے صدیوں کا خراج — پھر بھی کچھ برہم نظر آتا ہے تجربہ کا مزاج
داغدار ایسا نہ تھا قانون کا دامن کبھی — شاذ ہی کھیلی گئی ہو ایسی ہولی خون کی
وہ خزانے سیم و زر کے جو ہیں دفنائے ہوئے — جن پہ قابض تھے مہاجن فیل پیکر اژدہے
ہے انہیں ارباب زر کی نعش کفنائی ہوئی — بیکسی ہے نوحہ خوانی کے لیے آئی ہوئی
منہ بسورے رو رہی ہے زندگی انسان کی — آگ سے بھڑکی ہوئی انجیل کی قرآن کی
اہرمن زائیدہ اس تہذیب سے فریاد ہے — جس کے ہاتھوں زندگی زحمت کش بیداد ہے
تجھ میں اے تہذیب حاضر ایسا اوچھا پن نہ تھا — قطرۂ شبنم کبھی غارت گر خرمن نہ تھا
یہ کسی معشوق کی زلف پریشاں تو نہ تھی — چشم آہو تو نہ تھی چاہ زنخداں تو نہ تھی
یہ جبیں وہ ہے کہ جو آسودہ سجدہ نہیں — یہ وہ مومن ہے کہ جس کو حسرت کعبہ نہیں
رہ نہیں سکتی کبھی یہ کارگاہ خیر و شر — ایک ہی قانون عالم گیر کے زیر اثر
صدہا تہذیبوں کا مدفن ہے یہی اپنی زمیں — جس کی قلبی کشمکش کا رازداں کوئی نہیں
آہ وہ آنسو کہ پالا چشم انساں نے جسے — مدتوں دیکھا کیا ہے چشم دوراں نے جسے
یعنی وہ تہذیب گوتم مذہب خیر الانام — عمر بھر تھا پائیداری کا جنہیں سودائے خام
غم ہی کیا اس کا [illegible] ہے یہ زندگی ناگفتنی — خوش گوار انجام کی حامل تو ہے تردامنی
نزع کے عالم میں ہے یہ رنگ آلودہ نظام — یعنی مرگ ناگہانی کا یہ رقص ناتمام
یہ معاشی کشمکش یہ جنگ یہ غارتگری — یہ فریب دین و ایماں یہ فریب زرگری
یہ خداؤں کا جہاں یہ دیوتاؤں کا جہاں — یہ مذاہب کا جہنم دار و گیر کن فکاں
یہ تصادم ہے نتیجہ خونچکاں تہذیب کا — آفریں اے عصر حاضر مرحبا اے ارتقا
اک نئی دنیا بسانے رہ گئے ہیں کچھ ہی دن — جشن آزادی منانے رہ گئے ہیں کچھ ہی دن
صبر کے فریاد کے ہیں بس یہی دو چار دن — عالم بیداد کے ہیں بس یہی دو چار دن
اس قدامت کے چلیں گے اب یہ کچھ اور دن — آئیں گے اس سرزمیں میں زلزلے کچھ اور دن
خون کا پرچم ہواؤں میں نچانے کے لیے — آگ سی بوڑھی فضاؤں میں لگانے کے لیے
گنبد تہذیب کہنہ سال ڈھانے کے لیے — کامیابی کی خوشی میں جھوم جانے کے لیے
آنسوؤں کو قہقہوں میں ڈھال دینے کے لیے — ہم صفیرو زندگی کا جام پینے کے لیے
بن رہا ہے خود بخود خوشحال دنیا کا نظام — ٹوٹ جائے گی تباہی خود ہی بے نیل و مرام
کتنا خود آئند ہے دہقاں کا یہ ذوق جہاد — جنگ آزادی کا عزم بالیقیں پائندہ باد
مردہ باد اے لعنت سرمایہ داری مردہ باد — جنگجو مزدور کا عزم ترقی زندہ باد
دنیا دار و سر جھکاؤ خوں بہانے دو انہیں — اک عظیم الشان فتنے کو مٹانے دو انہیں

کاہش آفاقی



وہ سکنڈ کلاس میں سفر کر رہی تھی اور ایک حسین نوجوان اس کے سامنے والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

ریل کے سفر میں امیدوں، اور تمناؤں کے خلاف کسی دلچسپ ساتھی کا مل جانا، اس جیسی جذباتی عورت کے لیے انتہائی طور پر باعث مسرت ہو سکتا تھا۔ لیکن حسین نوجوان کی موجودگی نے راحت کی بجائے اسے دکھ میں مبتلا کر دیا وہ سوچنے لگی اور باہر فضا میں گذرتے ہوئے اسٹیشنوں، درختوں اور میدانوں کی طرح اس کے دماغ میں بھی مختلف خیالات گذرنے لگے...... گذشتہ زندگی کے چھ سال اس نے شدید اذیت برداشت کرتے ہوئے اور اپنے وجود کو متنفر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گذارے تھے، وہ اپنی زندگی سے کچھ خوش نہ تھی، خوش ہونا درکنار اسے جوانی اور سرمستی کے اس موسم میں اطمینان کے چند سانس بھی نصیب نہ ہوئے تھے مرنے والے ماں باپ جو بزعم خود اس کے لیے نہایت شفیق اور ہمدرد تھے۔ اسے کندن لال کے سپرد کر گئے تھے۔ سماج ان دونوں کو میاں بیوی سمجھتا تھا، اور تھے بھی یہ دونوں میاں بیوی، اندھی مذہب پرستی نے ان کی زندگی کے رشتے میں گرہ باندھی تھی، اور احمق سماج اس گرہ کو روز بروز مضبوط دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ پچاس برس کے سیٹھ کندن لال اور بیس سال کی سوکھنا، سماج کی اس خواہش کو کس طرح پورا کر سکتے تھے، خصوصاً اس صورت میں جبکہ سوکھنا بھی حسین ہونے کے علاوہ خاصی تعلیم یافتہ اور خوش ذوق تھی۔ بوڑھے کندن لال علاوہ اس کے بہت موٹے اور کریہ النظر تھے۔ اپنی جہالت پر ناز کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔

چھ سال سے وہ ایک پربستہ چڑیا کی طرح شادی کے قفس میں قید تھی۔ اس دوران میں کئی مرتبہ دل کے اندر بیٹھے ہوئے کسی دیوتا نے بغاوت پر آمادہ کیا اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ میری مرضی کے خلاف جو زندگی مجھ پر سوار کر دی گئی ہے اس سے رہائی حاصل کر لوں۔ لیکن ہر مرتبہ اس نے اپنے آپ کو بلکل مجبور اور بے دست و پا محسوس کیا، مذہب، سماج، اخلاق اور خاندانی شرافت کو ذلیل کرنے کی ہمت وہ اپنے میں نہ پاتی تھی...... جب کبھی وہ ارادہ کرتی کہ کہیں بھاگ جائے اور اس تلخ و بدمزہ زندگی کو ترک کر دے تو اس کے تصورات کی دھندلی فضاؤں میں سورگ باشی ماں کا بوڑھا چہرہ غصے سے کانپتا ہوا نظر آتا، اور باپ کا سر اظہار ناراضی کے طور پر ہلتا ہوا دکھائی دیتا، ایسے موقعوں پر دھرم اور دھرم کے دیوتاؤں کی تنبیہیں اس کے کانوں میں گونجنے لگتیں اور پھر وہ اپنی موجودہ زندگی پر صابر و شاکر نظر آتی۔

ریل جنگلوں، وادیوں کھیتوں اور پہاڑیوں میں سے گذرتی چلی جا رہی تھی۔ باہر کا منظر اسے کچھ اداس سا نظر آ رہا تھا جیسے فطرت سو گئی ہو یا کائنات کسی کا ماتم کر رہی ہو، اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان پر ڈالی، وہ کس قدر حسین تھا، اس کے چہرے پر کتنا وقار تھا، کتنا دبدبہ کتنی متانت اور مردانگی،... یک بہ یک اسکی نگاہ نوجوان کے چہرے سے پھسل کر اپنے بوڑھے شوہر کے چہرے پر پڑی جو اس کے تصور میں اس وقت بھی ناگہانی طور پر داخل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کے چہرے پر پڑی ہوئی جھریوں کو متحرک دیکھا وہ کانپ گئی اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کندن لال اپنے موٹے اور غلیظ دانت لگائے ہوئے اس کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، اسے ایک پھریری سی آئی، تصور کا طلسم ٹوٹ گیا، اس نے پھر نوجوان کو غور سے دیکھا، وہ اپنا رخسار داہنے ہاتھ پر رکھے ہوئے کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا اس کے دل میں ایک عجیب و غریب جذبہ ابھرتا ہوا

محسوس ہوا، وہ تھوڑی دیر کے لیے اس خواہش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی کہ نوجوان کے نزدیک جاکر بیٹھ جائے اس کے مردانہ سینے پر اپنا سر رکھدے اور اپنے دھڑکتے دل کو نوجوان کے دل سے قریب کرکے سارے دکھ بیان کرڈالے۔ ابھی اس خواہش سے وہ پوری طرح لطف اٹھانے بھی نہ پائی تھی کہ پھر تصور کے ایک گوشے سے اس کا شوہر کندن لال حسب معمول ایک موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لیے ہوئے نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اس نے ڈنڈے کو فضا میں زور سے ہلایا اور پھر ایک بہیمانہ انداز میں اس سے بغل گیر ہوگیا وزنی، بھدے، بے جان اور زندگی کی حرارت سے خالی کھردرے ہاتھ اس کی گردن میں حمایل ہوگئے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا کسی بڑی چٹان کے نیچے دبی جارہی ہے اور وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی...... آپ کہاں جارہے ہیں؟ اس نے جذبات سے بے قابو ہوکر نوجوان کو مخاطب کیا۔

اپنے سوال کے جواب میں اسے معلوم ہوا کہ نوجوان بھی بمبئی ہی جارہا ہے۔ گفتگو کے دوران میں وہ نوجوان سے بے تکلف ہوگئی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ گراجویٹ ہے اور ادیب بھی، جب نوجوان نے اپنا تعارف کرایا تو اس کا نام سن کر سوبھنا اپنی نشست پر سنبھل نہ سکی بچپن کے اس زمانے میں جس کے نقوش اب اس کے دل سے تقریباً مٹ گئے تھے وہ اس کا معصوم رفیق تھا... مگر اب وہ اس کا نام تک بھول چکی تھی...... سوبھنا کے ذہن میں عہد معصومیت کے شوخ کھیلوں کی یاد تازہ ہوگئی جوانی نے دونوں کو کس قدر بدل دیا تھا۔ نوجوان اب ملک کا بہترین افسانہ نگار تھا اور اس کے دلنشین افسانے خود سوبھنا کے لیے سرمایہ تسکین تھے۔ تصور کی نگاہوں کے سامنے وہ زمانہ کسی دلکش کتاب کے اوراق کی طرح منتشر ہوگیا۔ جب سوبھنا خود بھی لکھنے پڑھنے کو اپنا مشغلہ حیات بنائے ہوئی تھی اور اس کا ذوق ادب کنوارپن کی معصومیت کے ساتھ ساتھ شگفتہ ہورہا تھا..... مگر اب...... اب وہ سیٹھ کندن لال کی بیوی ہے جن کا منیم روزانہ صبح حساب کے کاغذات لیے دروازے پر موجود رہتا ہے۔ پھر وہ دونوں ...... منیم اور کندن لال...... امرتسر کے چاولوں پر تبادلہ خیالات کرتے رہتے ہیں اسے رونا سا آنے لگا۔ جذبات جو پوری شدت کے ساتھ دل میں پیدا ہوئے تھے، حلق میں آکر پھنس گئے۔ اسے پیاس محسوس ہونے لگی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور صراحی میں سے مسلسل تین گلاس پانی پی گئی وہ اپنی رگوں میں ایک سوزش محسوس کررہی تھی اور اسے ایسا معلوم ہورہا تھا گویا وہ کئی دن سے بخار میں مبتلا ہے۔

ٹھنڈا پانی پینے سے اس کے حواس کسی قدر بجا ہوئے اور اس نے پھر سوچنا شروع کردیا...... کیا اچھا ہوتا اگر یہی سامنے والی سیٹ پر بیٹھنے والا نوجوان اس کا شوہر بنتا وہ دونوں زندگی کے تلخ و شیریں حقیقتوں کو اپنے افسانوں میں بیان کرتے رہتے۔ دنیا ان افسانوں سے کتنا فائدہ اٹھاتی؟ وہ ملک کی کتنی خدمت کرتے؟ انکے وجود سے سماج کو کس قدر فائدہ پہنچتا۔ ...... اے کاش...... اس کے غیر شعوری جذبات کے پردوں میں جنبش سی ہونے لگی اور پھر اس کے نازک دل سے آواز آئی ...... اے کاش! اس نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال دیا اور دوڑتے کھیتوں کو اس طرح دیکھنے لگی، گویا وہ بھی اس کی زندگی کے تلخ لمحات ہیں۔

شام ہو چلی تھی، آفتاب ایک زرد گنبد کی طرح مغرب کی جانب سطح زمین پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس مشاہدے کے ساتھ اسے طالب علمی کا وہ زمانہ یاد آیا جب وہ کھیلوں میں حصہ لیتی، اور اپنی ہم عمر لڑکیوں میں ٹینس کی بہترین کھلاڑی مانی جاتی تھی۔ ساکن دریا میں کنکری پھینکنے سے جو ہلکا سا موج پیدا ہوتا ہے ویسی ہی اس کے خیالات کی موجوں میں پیدا ہوا، جب اس نے سوچا کہ جیون کی

ایک کھیل ہے، بچوں کا کھیل، جس کا کوئی اہم مقصد نہیں اور جو محض وقت گذارنے کے لیے کھیلا جاتا ہے۔ چھ سال تک شریفانہ مگر تلخ زندگی بسر کرنے والی جوان عورت کے طوفانی جذبات کی ایک لہر اٹھی۔ ...... آخر جوانی کی سرشاریوں سے وہ کیوں محروم ہے؟ کس گناہ کی پاداش میں بوڑھا کندن لال اس کے باغِ حیات کا گلچیں بنا دیا گیا ہے؟ مسرت اور عیش کے حصول سے وہ کیوں باز رکھی گئی ہے؟ کیا یہ سب ظلم نہیں ہے؟ کیا اسے ستایا نہیں جا رہا ہے؟ کیا اس کی زندگی بے مزہ نہیں بنا دی گئی؟ ریل کے پہیوں کی سی تیزی کے ساتھ یہ سوالات اس کے دماغ میں گھومنے لگے اس کے اندر بیٹھے ہوئے دیوتا نے ایک نعرہ بغاوت بلند کیا اس ڈبے کی فضا پر ایک گہری نظر ڈالی۔ پھر نوجوان کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی مجرم قیدی روزنِ دیوار کو دیکھتا ہے، وہ اس کے بالکل قریب بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ دونوں کے پاؤں ایک دوسرے سے مس ہو رہے تھے۔ ڈبے کی چھت پر لگا ہوا برقی پنکھا تیزی سے چکر لگا رہا تھا گویا زندگی کے انقلابات کی نقل کر رہا ہو، باہر کی فضا کس قدر مسرت بخش اور پرسکون معلوم ہو رہی تھی بھاگتے ہوئے درختوں کھیتوں اور میدانوں کے ساتھ اسے جوانی کی شیریں ساعتیں بھی بھاگتی ہوئی معلوم ہوئیں......

ایسے سمے اس نے نوجوان کا ہاتھ اپنے شانے پر محسوس کیا، بوجھل مگر لطیف اور زندگی کی حرارت سے بھرپور رہا تھا نہ معلوم کس طاقت نے اسے اپنی جگہ سے اٹھا دیا۔ ایک قسم کی غنودگی کے بعد جب اسے ماحول کا اچھی طرح احساس ہوا تو اس نے اپنے آپ کو نوجوان کی آغوش میں پایا، جہاں اس کی روح، اس کا دماغ، اس کا جسم، غرض کہ اس کی پوری ہستی ایک بے پایاں اور ناقابلِ بیان لطف محسوس کر رہی تھی۔

.... ؛؛؛ ....

بہت زیادہ قریب ہو جانے کے بعد اس نے نوجوان کو اپنی پوری داستان سنا دی دل کے پورے زخم اس کے سامنے کھول کر رکھ دیے، روح کی تمام اذیتیں تفصیل سے بیان کر دیں اور زندگی کے ہر ناسور کو اس کی نگاہوں کے سامنے بے حجاب کر دیا۔ چھ سال تک سماج کے قید خانے میں رہ کر اس نے جتنے دکھ اٹھائے تھے وہ سب اسے تازہ محسوس ہونے لگے اور آئندہ ان سے بچنے کے لیے اس نے نوجوان سے وعدہ کر لیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے گی۔ اس مرتبہ خلافِ توقع نہ تو تصورات کی دھندلی فضاؤں میں سورگ باشی ماں کا بوڑھا چہرہ غصے سے کانپتا ہوا نظر آیا، باپ کا سر البتہ ناراضی کے طور پر ہلتا ہوا دکھائی دیا، دھرم اور دھرم کے دیوتاؤں کی تنبیہیں اس کے کانوں میں ضرور گونجیں، لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بھی ریل کے شور میں جذب ہو کر ختم ہو گئیں!۔

اب وہ نوجوان جو بچپن کے ساتھی ہونے کے باوجود تھوڑی دیر پہلے اس کے لیے بالکل اجنبی تھا، دوبارہ اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بن گیا۔ دونوں نے طے کر لیا کہ وہ ایک اسٹیشن قبل ہی اتر جائیں تاکہ کندن لال کا خطرہ نہ رہے جو وکٹوریہ ٹرمنس پر اپنی نوجوان بیوی کو لینے کے لیے آنے والا تھا، اس کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر کسی دور دراز مقام پر چلے جائیں اور دونوں سماج کی ایذا رسانیوں سے محفوظ ہو کر ایسی زندگی شروع کر دیں جس میں پریم ہو شانتی ہو، اور امن کا سکھ ہو۔

اسٹیشن گذرتے چلے جا رہے تھے۔ میل چھوٹے چھوٹے مقامات کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے بڑھا چلا جا رہا تھا جیسے دولت مند انسان فقیروں کی قطار کو گھورتا ہوا گذر جاتا ہے یہاں تک کہ دادر جنکشن آ گیا۔ نوجوان جوڑے کو جو سماج کے آئین و قوانین سے بغاوت کرنا چاہتا تھا یہیں اترنا تھا۔ دونوں سامان درست کر کے تیار ہو گئے۔ لیکن جب ٹرین رکی تو سوبھنا نے دیکھا کہ اس کا بوڑھا شوہر کندن لال چشمہ لگائے ہوئے اور حسبِ معمول موٹا سا ڈنڈہ ہاتھ میں لیے ڈبے کے سامنے کھڑا ہوا ہے اس کے دل کی اندرونی سطح سے ایک چیخ بلند ہوئی

جو حلق میں گھٹ کر رہ گئی، بوڑھا شوہر ڈبے میں چڑھ آیا اس نے کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا یہ بھی نہ دیکھا کہ وہاں ایک نوجوان شخص موجود ہے جو اس سے زیادہ اس کی حسین بیوی کا مستحق ہے، اور جس کی آغوش میں تھوڑی دیر پہلے وہ زندگی کا حقیقی لطف محسوس کر رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض کہ اس نے نہ کچھ دیکھا نہ کچھ سوچا، نوجوان کی موجودگی ہی میں اس کے وزنی کھردرے، بھدے اور زندگی کی حرارت سے خالی ہاتھ سوبھنا کی گردن میں حمایل ہو گئے اس نے قلی کے ذریعے سے اپنی بی بی کا سامان باہر نکلوایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سوبھنا جو سماج سے بغاوت کرنے پر آمادہ تھی جو ایک تعلیم یافتہ حسین نوجوان کو اپنی زندگی کی ساری دولت دے چکی تھی، جس نے کندن لال کو چھوڑ دینے کا عہد کر لیا تھا جو پریم، شانتی من کا سکھ تلاش کر رہی تھی بادل ناخواستہ مسکراتی ہوئی ڈبے سے باہر آ گئی اس نے صرف ایک مرتبہ اس نوجوان کو دیکھا جس کی آغوش میں تھوڑی دیر پہلے وہ زندگی کا حقیقی لطف محسوس کر رہی تھی اور اپنے بوڑھے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھر کی طرف روانہ ہو گئی جہاں اس کے شوہر کا منیم روزانہ حساب کے کاغذات لے کر آیا کرتا تھا اور وہ دونوں امرتسر کے چاولوں پر تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے

شاہد صدیقی

تخیل

تجھے یاد ماضی کو لانے سے حاصل
دکھی زندگی کو دکھانے سے حاصل

جنہیں ہو تنفر تری التجا سے
انہیں حال دل پھر سنانے سے حاصل

جو خوگر ہو ظلم و ستم کا الٰہی
اسے پھر نگاہوں میں لانے سے حاصل

نہ کر یاد ہمدم وہ اگلی محبت
بھلائی ہوئی یاد لانے سے حاصل

نہ آئے گا تیرے بلانے سے ہرگز
امیدوں پہ جیون بتانے سے حاصل

مٹا ہے تمہاری محبت میں ہمدم
مٹے دل کو پھر یوں مٹانے سے حاصل

نہ چھیڑ اب وہ اگلے ترانوں کو ہمدم
بھلائے ہوئے گیت گانے سے حاصل

ملاؤ نہ ماضی کو اس زندگی سے
خوشی اور غم کو ملانے سے حاصل

نہ آئے گا ہرگز وہ اگلا زمانہ
تو پھر زندگی یوں گنوانے سے حاصل

جسے ہو تری زندگی سے عداوت
اسے مرکز دل بنانے سے حاصل

تری حسرتوں کی تباہی کا نقشہ
بنا کر دلوں کو جلانے سے حاصل

نہیں جب بھروسہ ہے دل کی وفا پر
تو پھر ناز کو آزمانے سے حاصل

ناز (حمید آبادی)

طب مشرقی

انسان اور علم الابدان | ابتدائے آفرینش سے انسان دفع امراض کی تدبیروں سے برابر آگاہ رہا ہے اغلب ہے کہ انسان جب امراض کا شکار ہوا تو اس نے مرض کی نوعیت کے لحاظ سے تپتے لوہے آگ، پانی اور سورج کی کرنوں سے کام نکالا ہوگا اور فوری علاج کی سادہ شکلوں اور جڑی بوٹیوں سے دفع امراض کی تدبیریں کرتا رہا ہوگا اس خود گرفتاری نے تجربے کی شاہراہ پر انسان کو ایسا ڈالا کہ وہ جڑی بوٹیوں اور ان کے خواص سے متعلق مستند معلومات کا ذخیرہ علم سینہ کی شکل میں چھوڑا۔ جوں جوں انسان کی معلومات اور تجربوں میں تمدنی ارتقا کے تحت اضافہ ہونے لگا تو اس نے ایک علم کی باضابطہ شکل اختیار کی اور اس فن کی خوش قسمتی ہے کہ اس زمانے کے پیغمبروں اور اوتاروں نے بالخصوص علم الابدان پر کافی زور دیا اور الہامی ادویات سے فیض رسانی کا سامان بہم پہنچایا۔

طب کی ابتدا۔ | طب کا مقام پیدایش مصر بتایا جاتا ہے جہاں اس نے آنکھیں کھولیں اور کچھ ہوش سنبھالا، دی اوریجن آف ماڈرن مڈیسن کے مصنف کا بیان ہے کہ "زوسر سب سے پہلا مصری طبیب تھا جو اپنے انتقال سے ڈھائی ہزار سال بعد تک خدائے طب مانا جاتا رہا۔ اہل یونان نے اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اس سے استفادہ بھی کیا۔ غرض کہ سرزمین مصر سے ایسی باکمال ہستی کا پیدا ہونا اس امر کی بین دلیل ہے کہ اس زمانے میں مصر تعلیم و تہذیب اور طبی معلومات کا خاص مرکز رہا"

حضرت عیسیٰ سے سو سال قبل اسکندریہ میں مدرسۂ طب قایم تھا جس میں دو استاد تھے۔ اسٹریٹس اور برافلس ان دونوں نے انسان کے جسم کی تشریح کی، اور برافلس نے نبض کے بیان کو ترقی دی۔ مصری حکیم مقی ادویہ، مسہلات، حقنے عرق آور دوائیں، اور فصد وغیرہ استعمال کرتا تھا اور قواعد طب جس کو اس نے مقرر کیا تھا اسی پر عمل کرتا تھا جس کی وجہ نئی تحقیقات کا موقع نہیں ملتا تھا۔ الغرض مصر کی طبی معلومات کا عام شہرہ دنیا میں ہو چکا تھا۔

مصر کا فیضان چین و جاپان پہنچا اور وہاں کے باشندوں نے اس سے استفادہ کیا۔

چین و جاپان کا دور دورہ شروع ہوا۔ چینی اور جاپانی خیالات اور نظریے بھی مصریوں کے خیالات و نظریوں سے بہت ملتے جلتے تھے اور ان کی نباضی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ ہر مرض سے اطلاع کا ذریعہ صرف نبض شناسی ہی سمجھا جاتا تھا اور معالجے میں مصریوں کی طرح حیوانی اعضا بھی مستعمل ہوتے تھے

طب کی حالت یونان میں | اب طب کا رخ یونان کی طرف ہوتا ہے جہاں انقلیدس (جو ہرمس کا شاگرد تھا) نے اس کا شاندار استقبال کیا جب وہ مر گیا تو یونانیوں نے اس کو اپنا خدا ٹھہرایا۔ اس کے دو بیٹے تھے جو اپنے باپ کے نقش قدم پر گامزن تھے۔ اعلیٰ طبابت اور جراحی میں مشہور ہوئے جن کی تعریف میں ہومر جیسے مشہور شاعر نے قصیدے لکھے۔ یونان میں فنسوس، برمانیدس اور ہنسلز جیسے مشہور اطبا پیدا ہوئے فیثاغورث نے نمایاں شہرت حاصل کی بیاسیکوس نے اعضا کی تشریح ادویات کی تاثیر پر کتابیں لکھیں۔ یونان کے ایک طبیب بقراط کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے "آبائے طب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بقراط سے قبل کا زمانہ محض اوہام پرستی کا زمانہ تھا اور طب بے بسی و کس مپرسی کی حالت میں سسکیاں لے رہی تھی۔ بقراط ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے طب کی حالت پر خاص توجہ کی اور اس علم کو عام طور پر پھیلا دیا اور اطلاع امراض کے لیے مسئلہ اخلاط کی تعلیم دی جس نے طب مشرقی میں خاص بنیاد کی اہمیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد افلاطون و ارسطو جیسے قابل اطبا نے جنم لیا جنہوں نے فلسفہ بقراط کی نشر و اشاعت میں کافی حصہ لیا۔

رومیوں کا استفادہ | یونانیوں سے رومیوں نے طب کو حاصل کیا سب سے پہلا طبیب اسقلی بیوس تھا یہاں اس کو چند اسباب کی بنا پر خاطر خواہ طور پر ترقی نصیب نہ ہو سکی لیکن جالینوس نے جو چودھویں عیسوی میں آسمان طب کا مہر درخشاں تھا اس کو روم میں زندگی تازہ بخشی، فزیالوجی اور اناٹمی میں شہرہ آفاق ہوا اور اسلام سے پہلے جالینوس پر اس فن کے کمال کا خاتمہ ہو گیا۔ الحاصل اسقلی بیوس، غورس، میںس، برمانیدس، افلاطون، اسقلی بیوس دوم، بقراط، جالینوس یہ آٹھ باکمال حکما ہیں جنہیں دنیا "کاخ طبابت یونانی" کے ارکان سے موسوم کرتی ہے۔

طب کو یونانی کیوں کہتے ہیں۔ | طب کو یونانی کہا جاتا ہے حالانکہ طب کی ابتدا مصر میں ہوئی چین، جاپان اور ہندستان نے اس پیشے کو کافی ترقی دی اور پروان چڑھایا۔ لیکن طب کو یونانی کہنے کے وجوہ یہ ہیں:-

(۱) طب مصر، چین، جاپان و ہند وغیرہ میں علم سینہ کی حیثیت سے روشناس رہی۔ عام طور پر تعلیم کے لیے کوئی مدرسہ نہ تھا جس سے عوام فنی تحصیل کرتے۔ مگر اس کے برعکس یونان میں اس فن نے باضابطہ شکل اختیار کر لی اور حکماے یونان نے درس و تدریس کا باقاعدہ انتظام کیا۔

(۲) اہل یونان کو تالیف و تصنیف کی طرف شغف تھا کتب بینی کا ہر ایک کو شوق تھا۔ لیکن اس کے برخلاف ہند اور مصر کے علما کو تالیف و تصنیف کا شوق نہ تھا۔ مگر جب خلفاے عباسیہ کے عہد میں یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں اور دار العلوم قائم ہوے ان تراجم کی دنیا کے مختلف حصوں میں شہرت ہوئی۔ اسی تعلق کے مدنظر طب کو طب یونانی کہا جانے لگا۔

طب مشرقی آغوش عرب میں | طب یونانی کو سب سے زیادہ عروج عرب میں نصیب ہوا یہاں ایسے قابل افراد ملے جنہوں نے اس کی پرداخت میں زبردست حصہ لیا۔ زمانہ جاہلیت میں حارث بن کلادہ ثقفی پہلا عرب تھا جس نے ایران جا کر باقاعدہ اس فن کی تحصیل کی۔ طبی مسایل سے متعلق نوشیروان اعظم کے دربار میں اس نے جو تقریر کی تھی، وہ آج تک اس فن کی اصل الاصول سمجھی جاتی ہے حارث بعد میں "طبیب العرب" کے نام سے مشہور ہوا اور شہرت دوام حاصل کی۔

اسلامی حکومتیں اور طب مشرقی | جب اسلام کا زمانہ آیا تو اگرچہ اس فن کی ترقی کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور دنیا میں کوئی قوم حقیقی معنوں میں حکمت و فلسفے کی سرپرست باقی نہ تھی لیکن کم و بیش متمدن ممالک میں ماہرین طب موجود تھے اور ہر جگہ اس کا رواج تھا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں طب کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔ آقاے کائنات کی ہدایات نے فن طب کو سب سے زیادہ ترقی دی بہت ساری حدیثیں ایسی موجود ہیں جن کی روایات کا مفہوم اطبا کے ضوابط کے مطابق ہے جسے "طب نبوی" کہا جاتا ہے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے تعلیمات طبیہ کا نکلنا تھا کہ مسلمانوں میں طب کی جانب انتہائی میلان پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد اس فن نے دنیاے اسلام میں قبول عام کی سند حاصل کی "حالات کا استقصا سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کے جلیل الشان خلیفہ فاروق اعظم نے ایران پر فوج کشی کی تو سپاہ اسلام کے ہمراہ کئی نامور اطبا اور جراح موجود تھے"۔

خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ نے سرپرستی کی جن کے عہد حکومت میں فن طب کے جاننے والوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو چکی تھی ۸۸ھ میں ولید بن عبد الملک نے شفاخانہ قائم کیا اسی شفاخانے میں مجذوموں، مبروصوں، مسلولوں اور مدقوقوں کا خصوصیت کے ساتھ علاج کیا جاتا تھا سگ گزیدہ کا علاج بڑی کامیابی سے کرتے تھے۔ پہلی صدی کے اختتام تک بڑے بڑے طبیب پیدا ہو چکے تھے جن میں یحیی نحوی حکیم اولیطر اس اور حکیم ابن اثال نے خاص شہرت حاصل کی۔

خلفاے عباسیہ جب سریر آراے تخت خلافت ہوے انہوں نے طب کو اپنی قیادت میں لیا جو آج تک ضرب المثل ہے خلفاے

عباسیہ کا زمانہ علوم وفنون کی سرپرستی اور ان کی اشاعت کے لیے عہد زرین مانا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فاتحین اسلام دنیا کو مسخر کر چکنے کے بعد فارغ البالی سے علم وحکمت کی طرف جھکے ہوئے تھے، ہی ان کا سب سے زبردست اور دلچسپ مشغلہ بنا ہوا تھا۔ خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں قابل اطبا پیدا ہوئے جنہوں نے اس فن میں نمایاں حصہ لیا۔ کئی شفاخانے تعمیر کیے جن میں دار المرضیٰ بہت مشہور تھا جہاں بڑے بڑے قابل اطبا بلا اجرت کام کرتے تھے اصول صحت اور صفائی کا خاصہ انتظام تھا احمد بن طولون کا مصری ہسپتال، جامع مسجد مصر کا شفاخانہ اور آمان مقتدری، آل بویہ کا بیت الشفا مشہور ترین بیمارستان کہلائے جاتے تھے۔ آل سامان نے بھی طب کی سرپرستی میں کافی حصہ لیا۔ غزنوی عہد میں بھی طب نے کافی شہرت حاصل کی اس زمانے میں شیخ الرئیس بوعلی سینا ابن سہل، ابوسہل مسیحی، ابو الخیر خمار، ابوریحان بیرونی اور ابو نصر عراقی جیسے فاضل علما اپنی فضیلت وعلمیت کا سکہ دنیا پر بٹھا چکے تھے۔ سلجوقیہ دور بھی اعجاز طب کے معجزوں سے محروم نہ رہ سکا۔ ۲۹ھ میں سلجوقیہ حکومت کی سرپرستی مشہور ہے یہاں سے اندلس میں طب کی فیض رسانی پہنچتی ہے جو ایک زبردست علمی طبی مرکز کی حیثیت سے دنیائے علوم وفنون پر خاص شہرت کا مالک بنتا ہے اور اسی زمانے میں مصر بھی اسلامی حکومت کی وجہ سے طب کے لیے مشہور ہوتا ہے بغداد، موصل، حلب اور دمشق کے شفاخانوں کو دیکھ کر علامہ ابن جبیر حیران رہ جاتے ہیں دمشق میں نوریہ دار العلاج کی بنیاد پڑتی ہے جو اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ قاہرہ کا بیت المرضیٰ اسی زمانے میں شہرت دوام کا حامل قرار پاتا ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں غوری خاندان سرپرستی کرتے نظر آتا ہے جہاں نظامی عروضی سمرقندی جیسے جامع الکمال پیدا ہوئے۔

اسلامی حکومتوں کے زمانے میں حکمت کی کتب قدیمہ کی فراہمی کے لیے تمام وسایل سلطنت کو کام میں لایا جاتا تھا دار الترجمہ اور بیت الحکمت قایم تھے۔ یونانی تصنیفات کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا۔ بغداد کے امرا دولت نے ویدک کے باکمال ہندستانی اطبا کو ہاتھوں ہاتھ لیا جو دعوت پر یا قدردانی کی شہرت پر وہاں پہنچ گئے تھے وہاں ان کی ایسی قدر ومنزلت کی گئی کہ یہ ہندستان کو بھول کر وہیں کے ہو رہے اور انہوں نے بھی اپنے علمی کمالات وہنر کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ مشرقی طب کی جدید تدوین وترقی میں حتی الامکان ہاتھ بٹایا۔ ان میں کنکہ، شاناق، صالح بن بھلہ، منکا، جنجہل اور جو دو مشہور اطبا تھے جنہوں نے یونانی طب کی ترتیب وتبویب میں خاص حصہ لے کر ان کی امداد کی اور اپنے دیسی فن ویدک میں کمال رکھتے تھے۔

طب یونانی کا اسلامی ہونا | لکلرک کہتا ہے کہ "وہ عرب ہی تھے جنہوں نے رومن امپائر کے بچے ہوئے علمی سرمایے سے بہتر مسالہ تیار کیا تھا اور یونان نے جہاں ایک ہزار سال کی محنت شاقہ سے علم طب حاصل کیا اور اس کا سلسلہ قایم رکھا۔ عربوں نے صرف ایک صدی کے عرصے میں اسی علم طب میں عظیم الشان ترقی کر کے سب کچھ حاصل کر لیا۔ ابھی نویں صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ عربوں کے پاس علوم وفنون کا ذخیرہ یونانیوں سے زیادہ مہیا ہو گیا۔

طب اسلامی جو طب عرب سے پہلے طب یونانی کہلاتی تھی اس کو طب عرب اس لیے کہا جانے لگا کہ وہ عربی زبان میں پیش کی گئی تھی اس کا بیشتر حصہ طب یونانی سے اخذ کیا گیا تھا چونکہ یونانی زبان کی کتابوں کو مسلم عربوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس لیے طب عرب بعد میں اسلام کے آغوش میں آ کر طب اسلامی کہلانے لگی مگر یونانی لفظ نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ آج تک اس کو طب یونانی پکارا جاتا ہے گویا خود "طب اسلامی" سے مراد طب یونانی ہے اور طب میں عربوں کا ممتاز کارنامہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں اس یونانی فن کی حفاظت کی۔ اور اب طب مشرقی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اب مشرقی دنیا میں اس کا فیض عام ہے۔

حکما اسلام کا اجتہاد | اسلامی حکما نے طب کو وہ ترقی دی کہ آج تک ان کے نام زندہ جاوید ہیں جن کے اجتہاد نے طب

مردہ کے ڈھانچے میں ایک نئی روح پھونکی اور فنی حیثیت سے درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ طب کی ترقی میں مفید اجتہاد سے اضافہ کیا اور نئے نئے تجربات کو منظر عام پر پیش کیا۔" ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ "علم طب جس سے امراض بدن کا علاج کیا جاتا ہے وہ موجودہ شکل میں مسلمانوں کی ایجاد ہے۔" معجونات بنانے کی ترکیب سب سے پہلے عرب نے ایجاد کی اور ساتھ ہی ساتھ علم کیمیا بھی یہیں ایجاد ہوا۔ گبن لکھتا ہے کہ "علم کیمیا اپنے ارتقا اور اصلیت کے اعتبار سے اہل عرب کی ایجاد ہے انہوں نے سب سے پہلے قرع انبیق (آلہ عرق کشید) ایجاد کیا۔ تیزاب ایجاد کیے۔ ایمونیا، نائٹرک ایسڈ، ہیڈروکلورک ایسڈ، نائٹریٹ آف سلور، کلورائیڈ آف مرکیوری وغیرہ کیمیاوی مادے نکالے، سلفیورک ایسڈ اور الکحل جیسی چیزیں اختراع کیں زہروں کو دواؤں میں تبدیل کیا۔ غاز (گیس) کی خاصیتیں دریافت کیں۔

علی بن عباس علم طب کا امام مانا جاتا تھا جبریل نامی طبیب نے بہت نازک اور خطرناک امراض کا علاج ایجاد کیا ابو مروان نے بہت سی ان بیماریوں کے علاج بتائے جنہیں ان سے پہلے اور کوئی طبیب نہ جانتا تھا۔

حکمائے اسلام نے زمانہ عروج میں اکثر علوم کے ترجمے ہی نہیں کیے تھے بلکہ بہت سے علوم کی ایجاد کا فخر انہیں حاصل ہے۔ جہاں دوسرے علوم و فنون میں مہارت حاصل کی ان میں جراحی اور تشریح خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ابوالقاسم زہراوی (المتوفی ۱۱۱۲ء) جو اپنے زمانے میں طبیب ہی نہیں تھا بلکہ ایک مشہور اور نامور جراح بھی تھا۔ آلات جراحی خود بناتا تھا جس کے بڑے بڑے آپریشن آج خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ پتھری نکالنا جو آج بمثل جدید عمل مانا جاتا ہے دراصل اسی نامور جراح کی ایجاد ہے۔

اسی طرح اسلامی حکما نے دواسازی میں وہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ سر ڈاکٹر توفیق کو اپنے خطبے میں اس کی دل کھول کر اس طرح داد دینی پڑی کہ "انہیں نے علم صیدلہ (دواسازی) کی بنیاد ڈالی تھی اور انہیں کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ہی دوائیوں کی ترکیب کے قواعد وضع کیے۔ ساتویں صدی میں سالور بن سہل نے دواسازی کی تعلیم کے لیے سب سے پہلا مدرسہ "دارالصیدلہ" قائم کیا۔ اس زمانے میں اسی مدرسے میں دواسازی کی تعلیم دی جاتی تھی اس کے بعد امین الدولہ، ابن سینا، ابن تلمیذ اور ابن رشد کا مدرسہ فن دواسازی کی تعلیم دیتا رہا۔ غرض عربوں نے فن دواسازی میں بہت سے اصول و قواعد منضبط کیے تھے جن سے شربت، مرہم اور ڈسٹلڈ واٹر وغیرہ پر ہم آج تک عمل پیرا ہیں عہد عباسیہ میں کوئی شخص طبابت کا پیشہ اس وقت تک اختیار نہیں کر سکتا تھا جب تک اس نے طب کا باقاعدہ امتحان دیکر سارٹیفکٹ نہ حاصل کر لیا ہو اور یہی قانون دواسازی کے پیشے کے لیے بھی ضروری تھا۔

گو علم الادویہ عرب کا رہین منت ہے اسی طرح محققین عرب نے علم نباتات میں اس قدر تحقیق کی کہ ان کو نئی اور زود اثر ادویہ سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلمانوں میں ضیاء الدین بیطار ادویہ شناسی کا ایک ماہر اور امام فن مانا جاتا ہے جو اسی فن میں اجتہاد کا منصب بھی رکھتا تھا۔

اسلامی طب سے علمائے مغرب کا استفادہ

مسٹر ہاڈ نے لکھا ہے کہ "تمام علوم یونانی کا بڑا حصہ جو اصلی ذریعے سے یورپین اقوام تک پہنچا ہے وہ پہلے پہل ہم کو عربوں نے عنایت کیا تھا" جس کو اہل یورپ نے اس قدر ترقی دی کہ طب جدید (طبابت مغربی) کا ایک مکمل ڈھانچہ ان ہی بنیادوں اور اصولوں پر تعمیر کر لیا گیا جس کی تائید میں لارڈ کیمپبل سابق گورنر مدراس کا بیان شاہد ہے کہ "سترھویں صدی تک بلاشبہ یورپ کے ڈاکٹروں نے عرب کے حکما کی کتب سے جملہ علوم طبیہ کو پڑھا ہے فن نسخہ نویسی کو بیشک اسلامی اطبا ہی نے ایجاد کیا جو اب تک یورپ کے اطبا کا معمول ہے اور ان کے دیگر تحقیقات و تجارب اس وقت تک بلا اختلاف مسلّم ہیں اور یہ کل تحقیقات اسلامی اطبا ہی کا حصہ

ہے"۔ "جب اندلس سے علم کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تو علماے
مغرب نے اطبا اندلس کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا۔ ہسپانیہ کے
اسلامی کالجوں سے مستفید ہونے لگے۔ ذکریا رازی اور بو علی سینا کی
کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ ذاتی تجربات بھی کرنے لگے۔ دار التجربات
قایم کیے گئے۔ دواوں کے خلاصے نکالے گئے۔ سریع الاثر مرکبات
تیار ہوے بجاے چار کے بہت سے عناصر قرار پاے فارماکوپیا
مرتب ہوے جراحی کو ترقی دی گئی نئے نئے آلات ایجاد کیے ان
ہی کے نام لیوا دو گروہوں پر مشتمل ہو گئے۔ ایک مشرقی دوسرا مغربی
کہلانے لگا۔ مغربی طب سے زیادہ تر اسی گروہ کے آرا و افکار سے
استفادہ کیا اس کی وجہ یہہ تھی کہ یورپ کی آب و ہوا اس جماعت
کے طریق علاج اور ادویہ سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔

چنانچہ مغربی طب کے اسی گروہ کی مزید ترقی یافتہ شکل کو
جدید کہا جاتا ہے یہاں سے مشرقی طب قدیم اور مغربی طب جدید
کے نام سے پکاری جانے لگی جو آپس میں دست و گریباں ہو کر
ایک دوسرے کو سائنٹفک اور ان سائنٹفک کہتی رہتی ہیں حالانکہ
یہہ غلط فہمی بالکل بے بنیاد ہے جیسا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
نے گورنمنٹ طبیہ کالج پٹنہ کے اپنے خطبہ تقسیم اسناد میں فرمایا
ہے کہ:-

"تعلیم کے ناکافی ہونے کی وجہ سے یونانی اور ایلوپیتھک
سسٹموں کے درمیان اختلافات پر بے وجہ زور دیا جا رہا ہے۔
تاریخی طور پر یونانی سسٹم جدید طبی سائنس کی ماں ہے اگر اس کی
لڑکی نے ایک امیر خاندان میں شادی بھی کر لی ہے اور اپنی دولت
پر بیجا فخر کرتی ہے تو ماں کو اپنی خود داری قایم رکھنی چاہیے کیونکہ
یونانی سسٹم ایسی ایسی قیمتی دواوں کی نعمت ہے اور اس کا طریقہ
علاج و تشخیص ایسا اچھا ہے کہ مغربی میڈیکل سائنس ابھی اسے
معلوم نہیں کر سکی"۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کہ طب جدید
صدیوں تک طب قدیم کی خوشہ چین رہ چکی ہے اور اس کی جدید
تحقیقات کا جزو غالب بھی حقیقتاً کسی نہ کسی قدیم یونانی تحقیقات کا
ترمیم شدہ مرقع یا تبدیل شدہ قالب ہے کیونکہ:-

طب جدید اصل میں طب قدیم ہے
وہ اسکی ہے [illegible] پیدا کی ہوئی ہے

کوئی یہہ دعوی نہیں کر سکتا کہ اعلیٰ سائنٹفک ترقیات
کی بنا پر اخذ و ترک کا سوال باقی نہیں رہا۔ حالانکہ طب ایک ایسا
بحر ناپیدا کنار ہے کہ جس کی تہ میں ابھی ایسے نامور موتی چھپے
ہوے ہیں کہ مزید تلاش کو تاہ دامنی کی ہمیشہ شکایت رہے گی
یہہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ طب مغرب نے فن جراحی اور بعض
شعبوں میں کمال حاصل کر لیا ہے مگر مشرقی طب سے استفادہ جس
طرح پہلے کیا گیا اسی طرح علم الادویہ وغیرہ کے سلسلے میں آیندہ
بھی کرنا پڑے گا چنانچہ حکومت پنجاب کی یادداشت جو الحکیم میں
شایع ہوئی تھی اس کا لب لباب یہہ ہے کہ "علاج و اغذیہ کے
متعلق ابھی ڈاکٹروں کو طب یونانی سے بہت کچھ حاصل کرنا
چاہیے"

طب یونانی ہندستان میں | سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین
غوری کے حملوں نے طب مشرقی کے کارناموں سے اہل ہند کو روشناس
کیا البتہ خلجیہ خاندان کے دور میں طبی تصنیفات سے باضابطہ استفادے
کا موقع ملا۔ چنانچہ سلطان جلال الدین فیروز شاہ کے زمانے میں
سب سے پہلی تصنیف دستیاب ہوئی جس کا نام زردقہ تھا
محمد شاہ تغلق کے زمانے سے شفاخانوں کے رواج کا علم ہوتا
ہے۔ جب کہ مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ:- "اگر ہم مقریزی
کی روایات کا اعتبار کریں تو صرف شہر دہلی میں محمد تغلق کے زمانے
میں ۷۰ شفاخانے تھے"۔ فیروز شاہ نے ایک دار الشفا کی بنیاد
رکھی ۸۴۹ھ میں محمود شاہ نے ایک عمدہ شفاخانہ تیار کرایا اس
وقت ہندستان میں دیسی طب بھی عروج پر تھی مسلمانوں نے
اسلامی طب کے ساتھ ساتھ دیسی طب سے بھی استفادہ کیا ۹۲۳ھ
میں جب لودھیوں کے خاندان نے دہلی کو سنبھالا تو اس نے دہلی
میں مشہور اطبا کی نگرانی میں فن طب پر تحقیقی کام کیا۔ سلطنت مغلیہ
بھی خاص طور سے طب کی سرپرستی کے لیے مشہور رہی ہے شہنشاہ ہمایوں
کے زمانے میں ایک کتاب ریاض الادویہ مولفہ مولانا یوسفی کا پتہ

چلتا ہے شہنشاہ اکبر کے زمانے میں طبی ترقی میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ شاہ جہاں کا عہد حکومت شفا خانوں کے لیے مشہور ہے فن طبابت کمال پر پہنچ چکا تھا جامع مسجد کے عقب میں ایک دار الشفا ۱۰۶۰ھ میں بنوایا۔ شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں طب کو عالمگیری حیثیت حاصل ہوئی۔ محمد شاہ نے دار الصحت قایم کیا شاہ عالم ثانی کے زمانے میں فن طبابت کو نمایاں ترقی نصیب ہوئی بہادر شاہ ظفر کے عہد حکومت میں بھی خاص دہلی میں مکتبہ طبیہ اور دوا خانے جات وسیع پیمانے پر قایم تھے۔"

غرض مغلیہ سلطنت کی سیادت میں حکیم ابو الفتح گیلانی حکیم عین الملک، حکیم ہمام، حکیم علی گیلانی، حکیم روح اللہ کابلی، حکیم فتح اللہ گیلانی، حکیم اتقی گجراتی، حکیم خوشحال، حکیم ابو القاسم گیلانی، حکیم محمد اکبر ارزانی، حکیم صادق خاں حکیم علوی خاں جیسے مشہور اطبا طبی ترقی میں منہمک تھے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد طب یونانی شاہانہ سرپرستی سے محروم ہو گئی یہ دور اس کے انحطاط اور زوال کا ہے لیکن اطبا نے انفرادی طور پر اس معمول کو جاری رکھنے کی کوشش کی اور اسے تباہی سے بچایا خصوصیت کے ساتھ شریف خانی خاندان اور حکیم احسن اللہ خاں معتمد الملک حاذق الدولہ کے اخلاف نے اپنی محیر العقول طبی مہمات سے عوام اور خواص کی توجہ کو بٹنے نہ دیا مشترکہ مساعی کو بروئے کار لانے کے لیے مسیح الملک حکیم اجمل خاں، حکیم فیروز الدین نے نومبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس قایم کی ۱۹۳۰ء تک سالانہ اجلاس کرتی رہی جس کی تجویزوں اور کوششوں کی بنا پر حکومت برطانیہ نے دیسی علاج ... اور ایک چودہ قابل ڈاکٹروں کا وفد ... جس نے بمبئی، دہلی، بنارس، کلکتہ اور لکھنؤ وغیرہ کا دورہ کر کے دیسی طریقہ علاج کی کامیابی اور اس کے سائنٹیفک ہونے کا اعتراف کیا جس کی سفارشات کی بنا پر حکومت برطانیہ منتہیٰ نے علی گڑھ میں طبیہ کالج اور لکھنؤ میں اسکول قایم کیا اور صوبہ مدراس، بہار، یوپی وغیرہ میں بھی طبی ادارے قایم کیے۔ مڈلین بورڈ یوپی اور مدراس نے بھی اطبا کے مشورے سے دیسی طریقہ علاج کی اصلاح کی جانب اپنی توجہ کو منعطف کیا۔ تقریباً بارہ سال سے ہندستان کے اکثر صوبہ جات میں غریب مریضوں کو مفت دوا تقسیم کرنے کے لیے معتد بہ رقم منظور کی صرف صوبہ متحدہ میں چالیس ہزار روپے سالانہ مڈلین بورڈ کو دیے جاتے ہیں جو اپنی صوابدید پر اس رقم کو تقسیم کرتی ہے۔

علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ اور لاہور طب یونانی کے زبردست مرکز ہیں جہاں سے طبی رسایل اجمل میگزین، رہنمائے صحت، مشیر الاطبا، الحکیم، مسیح الملک، علی گڑھ میگزین وغیرہ نکلتے اور کامیابی کے ساتھ جاری ہیں۔ دہلی میں طبیہ کالج، لکھنؤ میں تکمیل الطب کالج اور منبع الطب کالج لاہور، پٹنہ اور امرتسر کے طبیہ کالج بھی طب کی برابر خدمت کر رہے ہیں۔ ہندستانی دواخانہ دہلی، شاہی دواخانہ، ہمدرد دواخانہ، چشمہ حیات وغیرہ کی دوائیں تمام ہندستان میں مقبول اور مفید ثابت ہوئی ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اطبا متحدہ مساعی کو کام میں لا کر طبی جدوجہد اور طب مشرقی کو طب مغربی کے قدم بہ قدم لے آئیں۔

طب مشرقی دکن میں دکن میں طب کی ترقی کا زمانہ سلطنت بہمنی سے شروع ہوتا ہے اس زمانے میں حکیم نصیر الدین شیرازی اور حکیم علاء الدین تبریزی مشہور طبیب تھے۔ محمود شاہ بہمنی کا زمانہ دکن میں طب کی ترقی کا زبردست زینہ مانا جاتا ہے "طب شاہ محمودی" کے نام سے اس عہد میں ایک کتاب ملتی ہے جس کو یونانی اور ہندی کی ادویہ کا نچوڑ سمجھا جاتا ہے۔ طبی دنیا میں خواجہ دکن سیدنا حضرت بندہ نواز کا نام نامی بھی خصوصیت سے لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسلامی طب کے مولف فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ:

"حضرت خواجہ گیسو دراز کو فن طب سے گہری دلچسپی تھی آپ

اس میں بھی بڑی زبردست دستگاہ رکھتے تھے۔ ایک طرف جلیل القدر طبیب روحانی تھے تو دوسری طرف اہل دنیا کے نزدیک ایک بہترین طبیب حاذق، آپ کی کئی طبی تصانیف ہیں۔

احمد شاہ فیروز شاہ بہمنی کے زمانے میں بھی طب مشرقی نے بہت ترقی کی، علاء الدین ثانی نے بیدر میں عالیشان شفاخانہ تعمیر کیا جہاں ویدا اور اطبا دونوں علاج کرتے تھے۔ بہمنی خاندان کے زوال پر قطب شاہیہ، عادل شاہیہ، نظام شاہیہ، برید شاہیہ اور عماد شاہیہ سلطنتیں قایم ہوئیں جنہوں نے بھی ارتقاے فن میں حصہ لیا۔ خصوصاً قطب شاہیہ دور طب کی ترقی کے لیے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے جو بھاگ نگر (جس کو آج حیدرآباد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کا بانی تھا ایک شاندار شفاگھر کی بنیاد رکھی جو آج تک محلہ دارالشفا میں اپنی قدامت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں حکیم الملک نظام الدین احمد گیلانی فاضل طبیب موجود تھا جس نے فن طب کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ جب قطب شاہیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تو دکن میں مغلیہ سلطنت کی جانب سے صوبہ دار فایز ہوتے رہے۔ جنوبی ہند میں میسور ارکاٹ میں بھی قابل اطبا موجود تھے جو طب کی خاموش خدمات انجام دے رہے تھے۔ ٹیپو سلطان نے سب سے زیادہ توجہ کی اس کے بعد سلطنت آصفیہ نے طب کو اپنی سیادت میں لے کر اس کو پروان چڑھانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔

سلاطین آصفیہ کی سیادت

سلاطین آصفیہ کا نام نامی طب کی ترقی اور تجدید میں نمایاں نظر آتا ہے جنہوں نے اپنی خداداد سرپرستیوں کا عملی ثبوت دیا۔ جب قطب شاہیہ سلطنت کا نام و نشان نہ رہا تو مغلیہ سلطنت کی جانب سے حضرت آصف جاہ اول نظام الملک بہادر صوبے دار کی حیثیت سے تشریف فرما ہوے جنہوں نے حیدرآباد میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی اور اپنی تمام زندگی رفاہی کاموں اور رعایا کی فلاح و صلاح میں بسر کی حضرت آصفجاہ اول کے زمانے میں حکیم عبدالحسین خاں، حکیم محمد امین الدین اصفہانی حکیم محمد جعفر شیرازی اور حکیم محمد تقی خاں جیسے قابل اطبا نے طب کی ترقی میں کوشش کی۔ حضرت آصف جاہ ثانی اور حضرت آصف جاہ ثالث نے بھی خاص دلچسپی لی۔ آصف جاہ ثانی نواب نظام علی خاں بہادر کے عہد حکومت میں یادگار رضائی تالیف ہوئی جس کے مولف حکیم محمود علی تھے مگر ان کے فرزند حکیم رضا علی خاں نے آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ بہادر کے زمانے میں اس کی تکمیل کی۔ اسی وقت حکیم شفائی خاں، حکیم مسیح الزماں، حکیم تاج الدین خاں شہرت نامہ رکھتے تھے۔ آصف جاہ رابع نواب ناصر الدولہ بہادر کی توجہات نے بھی طب کی نصرت میں مفید کام کیا۔ آصف جاہ خامس نواب افضل الدولہ بہادر کے زمانے میں طبابت کا ایک سررشتہ قایم ہوا۔ اضلاع میں دواخانے کھولے گئے۔ قابل اطبا میں حکیم محمد مرزا حکیم محمد وزیر، اور حکیم نادر علی موجود تھے۔ طب یونانی کو سب سے زیادہ ترقی آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکاں کے زمانے میں نصیب ہوئی۔ سررشتہ طبابت کا استحکام، صدر شفاخانہ حسینی علم اور بیرون بلدہ کے دواخانوں کا قیام، مدرسہ طبیہ کی سنہ ۱۳۰۱ف میں بنیاد آپ کے محبوب دور مبارک دور کے ان مٹ کارنامے ہیں۔ افسر الاطبا سررشتے کے اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ اسی سررشتے کے تحت مخزن الادویہ (گودام) قایم کیا گیا۔ ناظر الاطبا کا بھی تقرر عمل آیا۔ افسر الاطبا کی خدمت پر حکیم احمد سعید، حکیم محب حسین نواب فیلسوف جنگ، حکیم الطاف حسین نواب حاذق جنگ مامور رہے۔ مدرسے کی صدارت پر حکیم منصور علی خاں اور حکیم مولانا محمد ابراہیم صاحب فایز رہے۔ ان کے علاوہ حکیم افتخار علی خاں، حکیم رکن الدین، حکیم رفیع الدین، حکیم عاشق حسین، حکیم عبدالعزیز خاں، حکیم وحید الدین عالی، حکیم ابو القاسم نور محمد، حکیم امانت علی، حکیم شفاء الملک شفائی خاں، حکیم شافی نواز جنگ، خورشید الحکما، حکیم رضا کے سوا حکیم مولوی عبدالوہاب صاحب انصاری (جن کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوا) کافی شہرت کے مالک تھے۔ اسی زمانے میں افق طب پر دو روشن ستارے چمکے

ابوالحسنات محمود صمدانی اور ابوالفدا محمود احمد نے تام کیا یا۔ کسے خبر تھی کہ یہ بعد میں آفتاب و ماہتاب بن کر دنیا ے طب کو خیرہ کردیں گے اور زندگی کی سترستر کروٹیں لے کر غروب ہو جائیں گے۔

طب یونانی کا زرین عہد	برکات عہد خسرو حکمت کو دیکھیے اس دور میمنت کی لطافت کو دیکھیے

اعلیٰحضرت بندگان عالی آصف جاہ سابع ادام اللہ اجلالہ کی تخت نشینی کے مسرت آگیں موقع پر آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۱ء لکھنو میں حسب ذیل تحریک تہنیت منظور ہوئی تھی کہ:-

"یہ کانفرنس دلی مسرت کے ساتھ حضور پر نور نواب میر عثمان علی خان صاحب بہادر آصف جاہ سابع کی خدمت میں تخت نشینی کی مبارکباد نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ ان کا عہد طب یونانی کی سرپرستی و قدردانی کے لحاظ سے ویسا ہی ممتاز ہوگا جیسا کہ ان کے بزرگوں کا رہا ہے"

یہ تحریک حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور خود اعلیٰحضرت سلطان الحکمت نے بھی نطق شاہانہ سے اس کی تصدیق فرمائی کہ:-

"مشرقی طب سے مجھ کو ہمیشہ شغف رہا ہے کیونکہ یہ طریقہ علاج عوام الناس کو مرغوب اور مفید ہے"

اسی طرح ایک اور مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ:-

"میں نے کامل تیس سال کے تجربے کے بعد اس پر اعتماد کیا ہے"

سچ تو یہ ہے کہ ملک نے خوب سیاسی کروٹیں بدلیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر معمولی اور نہایت اہم ہیں ان میں حضرت آصف جاہ سابع کی قوت تدبر اور سیاست نافضہ جلوہ فرما رہی ہے۔ ہم بلا پس و پیش اس کے معترف ہیں کہ علمی اور فنی ضرورتوں کے پورا کرنے میں حضرت سلطان الحکمت کی ذات ستودہ صفات آج واحد ہے جن کے مبارک ہاتھوں سے کیا کچھ فوائد شعبہ جات ملک کو حاصل ہوتے رہے ہیں۔ جس کا ایک علمی نمونہ منجملہ اور محکمہ جات کے اس وقت سررشتہ طبابت یونانی خصوصاً طبیہ کالج اور صدر شفاخانے کا وجود ذی جود ہے حضرت جہاں پناہ کی شاہانہ سرپرستی میں طبی رفتار میں نمایاں ترقی ہوئی۔ مختلف یونانی دواخانوں کا قیام ناگراں قدر مشاہرے پر فاضل اطبا کا تقرر یہ نفس نفیس ذات شاہانہ کی دلچسپی اور شغف ترقی کے لیے حکومت سے فیاضانہ امداد، اسی قسم کی اور کئی سہولتیں پیدا ہیں ایسے امور ہیں جو طب یونانی کا حیدرآباد میں آخری سہارا بنے ہوئے ہیں۔

حکیم لئیق احمد

قطعات

(۱) امیدیں زندگی کے گیت گائیں
ستارے مسکرانا بھول جائیں
کوئی میری نظر کے سامنے ہو
بہاروں سے کہو دامن بچائیں

(۲) کسی کے پاس ہوتا جارہا ہوں
خوشی کے غم سے روتا جارہا ہوں
خدایا بے خودی کی لاج رکھنا
میں اب خود کو بھی کھوتا جارہا ہوں

(۳) یہ سمٹے سمٹے سے پیڑوں کے سائے
کوئی جیسے محبت کو چھپائے
نظاروں کی ان ہی بیچارگی سے
بھلا شاعر کا دل کیوں بھر نہ آئے

(۴) فضاؤں کو مچلتا پارہا ہوں
ہواؤں کو سسکتا پارہا ہوں
کسی کو سرکے ذرّیں اپنا بت کر
ہر اک شے کو دھڑکتا پارہا ہوں

راز ہاشمی

حقایق و معارف

مانا نظر حکیم کی اب طور پر نہیں
جلوہ ترا نہیں کہ ہماری نظر نہیں
شرط دوام سجدہ ہیں جس کے اگر نہیں
میری جبیں نہیں وہ ترا سنگ در نہیں
اک حضرت کلیم پہ کچھ منحصر نہیں
اس کی نظر میں کوئی بھی اہل نظر نہیں

جلوے کو تیرے چاہیے وسعت ابھی کچھ اور
حاصل ہے دید پھر بھی بہ قدر نظر نہیں
دنیا سمجھ رہی ہے ملیں گے وہ حشر میں
دنیا کا یہ خیال بھی کچھ معتبر نہیں
ہر ذرہ کوے یار کا ہے خلد در کنار
زاہد مری نظر ہے یہ تیری نظر نہیں
ہے انتظار یار کے بعد انتظار موت
اس سے زیادہ زندگی مختصر نہیں
ذوق نظر تھا جب تو چھپے تھے نظر سے وہ
اب وہ جو سامنے ہیں تو ذوق نظر نہیں
درد غم فراق ۔ ذرا اور اضطراب
اب تو ہی چارہ گر ہے کوئی چارہ گر نہیں
آسودہ جمال ہے میری نگاہ شوق
محروم آرزو مرا ذوق نظر نہیں
اندھیر دیکھنا مری شام فراق کا
سارے جہاں میں اب تو کہیں بھی سحر نہیں
کیا جانئے بیخودی میں انہیں لکھ دیا تھا کیا
دل کہہ رہا ہے خیریت نامہ بر نہیں
میں کہہ رہا ہوں ان سے کہ میرا جگر ہے یہ
وہ کہہ رہے ہیں تیر ہے میرا جگر نہیں
وہ کیوں سکون قلب و جگر پر نہ جان دے
جس کو نصیب لذت درد جگر نہیں
محشر بھی ایک وقفہ شام فراق ہے
افقرؔ یہی وہ رات ہے جس کی سحر نہیں

افقرؔ موہانی

ترانہ خیر مقدم

وہ تزئین لیل و نہار آ رہی ہے
سنا ہے وہ جان بہار آ رہی ہے

ستارے تبسم کناں ہو رہے ہیں
معطر زمان و مکاں ہو رہے ہیں
حسیں ولولے پھر جواں ہو رہے ہیں
کہ اک فتنہ روزگار آ رہی ہے
سنا ہے وہ جان بہار آ رہی ہے

محبت کی پھر بزم آرائی ہوگی
ستم رانی حسن و رعنائی ہوگی
نگاہوں سے پھر بادہ پیمائی ہوگی
کہ تعبیر کیف و خمار آ رہی ہے
سنا ہے وہ جان بہار آ رہی ہے

کہیں صبح زریں چرا لے نہ اس کو
کہیں شام رنگیں چھپا لے نہ اس کو
زمیں سے سہ نو اٹھا لے نہ اس کو
کہ وہ مرکز انتظار آ رہی ہے
سنا ہے وہ جان بہار آ رہی ہے

یہ ارمان و مستی کا دل کش ترانہ
یہ پندار ہستی کا رنگیں فسانہ
سنانا یوں ہی جذبہ دل سنانا
کہ نا واقف حال زار آ رہی ہے
سنا ہے وہ جان بہار آ رہی ہے

فضاؤں کو ہو حکم گلگونہ باری
ذرا گنگنا دے تو باد بہاری
بہ ہنجار مستی بہ حال خماری!
وہ دوشیزہ سحر کار آ رہی ہے
سنا ہے وہ جان بہار آ رہی ہے

ذرا خواب گوں چشم بے خواب کر لوں
ذرا دل کو آگاہ آداب کر لوں!
ذرا ساتھ شام تب و تاب کر لوں!
کہ شمع دل بیقرار آ رہی ہے
سنا ہے وہ جان بہار آ رہی ہے

رازؔ ہاشمی (امروہوی)

پریم ریہرسل

(اس سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو ہندستانی ادب بابت فروردی ۱۳۵۱ف)

دوسرا منظر

(نوشیروان جی کا تھیٹر)

(اسٹیج کا پچھلا حصہ جہاں اداکار اپنی تیاری سے پہلے بنتے سنورتے بلکہ ادھم مچاتے ہیں ایک دقیانوسی تھیٹر ہونے کی وجہ سے یہاں نراج کا عالم کچھ زیادہ ہے)

شمشاد۔ اماں نرگس کہاں ہے؟

مشتری۔ اسٹیج کی پرلی طرف۔

شمشاد۔ کیا "پریم ریہرسل" ہو رہا ہے؟

مشتری۔ بیٹا! بہن سے یہہ بدگمانی۔

شمشاد۔ نہیں ماں! نرگس کے یہہ نکھٹو سو یہہ جو آے دن گھیرے رہتے ہیں۔ مجھے ایک آن نہیں بھاتے۔ دیکھنا اس ہوشیار لڑکی سے غافل نہ رہنا۔

مشتری۔ شمشاد! یہہ بھی کہنے کی بات ہے! تجھے ہو گیا کیا ہے۔

شمشاد۔ اور خاصکر وہ قبول صورت لونڈا جو آے دن نرگس کے درشن

مشتری۔ بیٹا! اس کی فکر نہ کر۔ میرے لال! تو تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ ...... تیری یہہ صورت نہ جانے کب دیکھوں۔

شمشاد۔ چولھے میں گئی صورت اور تم بھی۔

مشتری۔ حیرت ہے! یہہ بے ڈھنگا پن تو نے کہاں سے [illegible]

[illegible]

شمشاد۔ [illegible] سمجھا ہوں وہ تو بس [illegible] تھے۔

مشتری۔ (کسی قدر برہم ہو کر) اچھا یہہ بکواس بند کر اور چل جا۔ [illegible] کا سامان کر۔ میں سب بندوبست کر چکی ہوں۔ نوشیروان جی کو کاغذ بھی لکھ دیا ہے۔

شمشاد۔ کاغذ؟ کاغذ......؟

مشتری۔ قرض کا اور کیسا؟ کیا میرے پاس خزانہ گڑا تھا؟ قرض نہ لیتی تو تیرے سفر کا بندوبست کیسے کرتی۔

(نرگس داخل ہوتی ہے)

نرگس۔ کیوں ماں خیر تو؟ کچھ اداس نظر آتی ہو۔

مشتری۔ بیٹا کچھ نہیں۔ بس یوں ہی...... گاڑی کا وقت قریب ہے۔ میرا شمشاد آج مجھ سے جدا ہوگا...... نا

نرگس۔ میرا اچھا بھائی!! مالک اسے اچھا ہی رکھے گا...... لیکن امی یہہ وقت اداس رہنے کا نہیں۔ دیکھو تو میں کتنی خوش ہوں۔ اس خوشی میں میرا ساتھ دو۔ (پھولوں کو دیکھ کر) آہا! یہہ پیارے پھول...... پھر آگئے؟ کتنے سندر اور دلنواز پھول ہیں!! اور کیسے میٹھے اور مدبھرے شبد۔ یہہ پھول مجھے سناتے ہیں۔...... تو وہ بھی کوئی دم میں آتے ہیں!!

مشتری۔ شمشاد! بیٹا تم دونوں بھائی بہن مل بیٹھ کر باتیں کرو میں جاتی ہوں نوشیروان جی کے پاس سے قرض کی رقم......

شمشاد۔ ٹھیک۔ لیکن اماں ذرا ہوشیار وہ بڑا کائیاں ہے۔

مشتری۔ بیٹا فکر نہ کر میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ (جاتی ہے)

شمشاد۔ نرگس پاس تو آنا...... یہہ سب کیا خرافات ہے۔

(نرگس قریب کی ایک میز کے پاس کھڑی میک اپ میں مصروف تھی)

نرگس (چونکی ہو کر پاس آتے ہوے) کیا ہے؟ بڑی حکومت جتائی جا رہی ہے۔

شمشاد۔ سچ سچ بتانا...... میں تجھ سے چھوٹا سہی گر کچھ دودھ پیتا بچہ نہیں...... تو کس کی چاہت......

نرگس۔ (چھیڑتے ہوے) سبھی کچھ ایسا ہی۔

شمشاد۔ یہہ سب ٹھیک گر چہرے پر یہہ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟

نرگس۔ ابھی ایک بھیانک خواب دیکھا ہے...... میں ان کی پریم کی قابل نہیں۔

شمشاد۔ قابل نہیں۔ کیا بات؟ (میز سے بے ساختہ اچک کر اب جو کچھ بڑا ہو۔ میں تجھے چھوڑ کر کلکتہ نہیں جاؤں گا۔ نوکری جلے

جو سلے ہیں۔
نرگس۔ نہیں بھیا!! تمہیں آج ہی جانا ہوگا۔
شمشاد۔ اچھا تو ایک کام کی چیز تجھے دیے جاتا ہوں۔
(جیب سے ایک تفنچہ نکالتا ہے)
نرگس۔ شمشاد!! یہ پستول؟ اسے کروں کیا؟
شمشاد۔ دیکھو یوں کھولا..... یہ بھرا..... یوں فائر کیا۔
نرگس۔ خدا کے لیے اسے پرے ہٹاؤ۔
شمشاد۔ (قہقہہ لگا کر) یہ کوئی بھوت نہیں!!...... ارے یہ تو "جیون داس"! ہے۔ کسی غنڈے کی نگاہ بدلی پانا تو اس سے خبر لینا۔
نرگس۔ شمشاد! تو بڑا ہی نٹ کھٹ ہے۔
شمشاد۔ نہیں بہنا!! اسے ہمیشہ پاس رکھو۔ پھر مجھے تیری طرف سے کوئی دھڑکا نہ رہے گا۔
نرگس۔ (پستول کو لے کر میز کے خانے میں ڈال دیتی ہے) ہش! وہ امی آگئیں۔ (مشتری داخل ہوتی ہے)
مشتری۔ بیٹا نرگس! بھائی کو اب رخصت کرو۔ گاڑی کا وقت قریب ہے۔
شمشاد۔ نرگس۔ آؤ مل لو..... خدا نگہبان!
نرگس۔ بھیا یہ لڑکیاں کیسی! تم رو رہے ہو۔
شمشاد۔ نہیں تو۔
نرگس۔ اچھا مالک کی چھان پناہ! جاؤ ڈھیر سی روزی کمانا اور.......!
شمشاد۔ (آبدیدگی کے باوجود ہنستے ہوئے) اور پھر تو یہ ناٹک کا دھندا تج دیگی۔ میں تجھے گھر دار سے لگا دوں گا اور تیرے اور ماں کے لیے وہ سب جتن کروں گا جس کی آس تم دونوں کو باپ سے رکھنی تھی مگر خیر..... امی!! نرگس!! بولا چالا معاف یہ لو چلا۔ (چلا جاتا ہے)
نرگس۔ شمشاد!! بھیا!!..... چلا ہی گیا۔
مشتری۔ یوں جی ہلکان نہ کر۔ مالک تجھے بھاگوان کریں۔
تیرے سامنے میدان ہے جا تیاری کر۔ تجھے آج "روپ" کا پارٹ کرنا ہے۔
(نرگس پھولوں کو لے کر ڈریسنگ روم کے داخلی حصے میں چلی جاتی ہے مشتری اسٹیج کی پچھلی طرف)

تیسرا منظر

(وہی ساز و سامان۔ البتہ باہر سے کچھ چہل پہل کی آوازیں آرہی ہیں۔ کھیل کی نمایش کا وقت قریب ہے۔ موٹر کے ہارن اور دوسرے طریقوں سے اس کا اظہار کیا جائے گا کہ لوگ تھیٹر میں آنے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً دستی اشتہارات اور ڈرامے کے بیچنے والوں کی صدائیں "روپ متی اور باز بہادر" کا قصہ آر پار بڑے سو ڈالیمنڈ وغیرہ)
(ہمایوں اور شاہد داخل ہوتے ہیں نوشیروان پیشوائی کو لپکتا ہے)
نوشیروان۔ حضور اس طرف تشریف لایے۔ یہ تو آپ لوگوں کا گھر ہے۔ پکارتا ہے۔ نرگس! ہیں!!!۔ یہ لڑکی کہاں گئی؟
(دروازے پر کھٹکا دیکر) یہ دیکھنا سرکار لوگ آئے ہیں۔
(پھر ہمایوں اور شاہد کی طرف مڑ کر) سرکار لوگوں کے لیے میں نے اچھی سے اچھی "سیٹ" (جگہ) الگ کر رکھی ہے
شاہد۔ شکریہ۔
ہمایوں۔ نوشیروان جی۔ تم نے تو ہمارے سرکار کے ناطقہ بند کر دیا۔
نوشیروان۔ نہیں سرکار! آپ ہی لوگوں کے قدموں سے ہمارے پیشے کا نباہ ہے۔ نہیں تو آج کل سینما گھروں کے آگے ہماری بے لاگ سیوا کی کون داد دیتا ہے۔
شاہد۔ بڑی بات تمھیں اس کی دینی چاہیے کہ تم نے نرگس جیسی نایاب شے مہیا کی ہے۔
نوشیروان۔ ارے سرکار وہ تو بقول شاعر انمول رتن ہے لیکن ایسے رتن کی دیکھ بھال کچھ ٹھٹھا مذاق نہیں۔

ھمایون ۔ بے شک ۔ بے شک (شاھد کی طرف کنکھیوں سے) اس کا تو ہیرا ایک شاھد ہے ۔

نوشیروان ۔ ارے سرکار یہہ حال آج کے دن "ھالی وڈ" میں ہوتا تو آپ دیکھتے ۔

ھمایون ۔ ہاں آپ کی ساری کمپنی نہال ہو جاتی ۔

شاھد ۔ ھمایون! تم اپنے حربوں سے باز نہیں آتے (بگڑ کر نوشیروان سے) نوشیروان جی! ہمیں اب تنہا چھوڑ دو ۔ وہ دیکھو ....

نوشیروان ۔ ہاں سرکار ۔ میرا وہاں رہنا ضروری ہے (چلا چلا جاتا ہے)

(چند سکنڈ خاموشی)

ھمایون ۔ کیا دنیا ہے! کیا دنیا ہے!!

شاھد ۔ سچ ہے ۔ نرگس اور یہہ جنجال .... لیکن اسے دیکھنے کے بعد انسان یہہ گندا ماحول اور یہہ ساری کلفت بھول جاتا ہے ۔

ھمایون ۔ تو شاھد کیا سچ مچ اس کے ساتھ شادی کی ٹھانی ہے ؟ ایک ایکٹرس کو گھر والی بنانا ۔ میرے نزدیک نرا پن ہے نہ پاپ ۔

شاھد ۔ بس آج اپنی حاضر جوابیوں کی نمایش نہ کیجیے ۔

ھمایون ۔ میاں لڑکے! تم مجھے اس لیے لائے ہو کہ میں تمہیں پتے پتے کی بتاؤں ۔ اپنی کم نگاہی کا تمہیں خود احساس ہے میری تیز نگاہوں سے تمہیں اپنی مورنی کی حقیقت معلوم ہو جائیگی

شاھد ۔ میں آپ کو صرف منوانا چاہتا تھا ۔ افسوس کہ آپ نے سمجھا کچھ اور ۔

ھمایون ۔ مجھ سے یا میری رائے سے یوں خایف رہ کر آپ اس پر کبھی قابو نہیں پا سکتے ۔

شاھد ۔ قابو! ممکن ہے کہ وہ میری ہونا پسند نہ کرے یہہ ہوا تو بس خدا ہی میری مدد کرے ۔

ھمایون ۔ خدا کبھی نہ کرے گا ۔ ممکن ہے میں کر سکوں ۔

شاھد ۔ (نرگس کے کمرے کے پاس پہنچکر) نرگس!

نرگس ۔ (کواڑ کھولتے ہوے) شاھد! شاھد! ....ہیں!!

شاھد ۔ نرگس ۔ ڈرو نہیں ۔ یہہ میرے گہرے دوست ہیں ھمایون .....

نرگس ۔ (سنبھل کر) معاف کیجیے بھول ہوئی ۔

ھمایون ۔ کم از کم آج ایسا نہ کیجیے ۔ آپ کو اپنا پارٹ کرنا ہے مجھے اپنا ۔

نرگس ۔ آپ کا مطلب میں نہیں سمجھی ۔

ھمایون ۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ۔ مگر خیر کھیل ابھی شروع نہیں ہوا ..... (شاھد سے) شاھد میں چل کر باکس میں انتظار کرتا ہوں ۔ تمہیں تنہائی کی ضرورت ہے اور مجھے بہزاد کی تنہائی کا خیال ہے ۔ وہ اکیلا گھبراتا ہوگا ۔

شاھد ۔ بہتر ہے میں نرگس سے دو باتیں کر کے ابھی آیا ۔

(ھمایون چلا جاتا ہے)

نرگس ۔ یہہ کون تھا ؟ اس نے تو مجھے سرد کر دیا ۔ کب سے تمہارے آنے کی گھڑیاں گن رہی تھی اور نہ جانے کیا کیا منصوبے باندھے تھے (دا ھنے اور بائیں ادھر ادھر دیکھ کر) کمبخت اوپر تلے مجھے گھور رہا تھا ۔ خدا کی پناہ! نگاہیں تھیں یا بس بھری چھریاں ۔

شاھد ۔ کمبخت نہیں ھمایون! سچ مچ ھمایون بڑا ذہین آدمی ہے ۔ تمہیں خبر نہیں میں یہاں اسے کیوں لایا ہوں ؟ ۔ وہ تمہاری ہنسی اڑانے آیا تھا ۔ تم نے اسے گرویدہ کر لیا ۔

نرگس ۔ کیا تم کو اس کا اتنا پاس ہے ؟

شاھد ۔ کیوں نہیں جب کہ سمجھ اور ذہانت میں وہ مجھ سے بڑھ کر ہے ۔ مجھے اس پر اتنا ہی ناز ہے جتنا کہ خود اپنی ذہانت پر ۔ دیکھو نرگس آج وہ جوہر دکھانا جو ان آنکھوں نے اب تک نہیں دیکھے ۔

نرگس ۔ اور یہہ سب اس کے لیے ۔ ؟

شاھد ۔ نہیں پیاری میری خاطر! اور مجھے اپنے پر ناز کرنے

کرنے کی خاطر۔ کیوں نرگس۔ سمجھتی ہونا؟ دیکھو مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔

نرگس۔ (اداس ہو کر) ہاں۔ یہہ ایک راج کہانی ہے۔ سننے کے لیے۔ برتنے کے لیے نہیں۔ امی کہا کرتی تھی۔ مگر مجھے یقین نہ آتا تھا۔

شاھد۔ نہیں پیاری میں تمہیں اپنے گھر کی ملکہ بنانا چاہتا ہوں ..... اور کھیل کے بعد تم میری ہو۔

نرگس۔ مجھے تو یہہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم اور شانتی کے گھونٹ پینے کی آس میں نہ جانے کتنے جگ بیت گئے..... کیا چاہت میں سدا یہی ہوتا ہے۔

شاھد۔ ہونا تو یہی چاہیے۔ میں تمہارے بیچدار الفاظ کی گتھی کو سلجھانے کے لیے اس وقت تیار نہیں ہوں۔ نرگس تم میرے جیون کا پھول اور میرے دل کا کنول ہو۔ میری نگاہوں میں تم پریم کی وہ انوپ اور نازک پنکھڑی ہو کہ بعض اوقات تم کو چھوتے مجھے ڈر لگتا ہے۔ کیسے بتاوں کہ اس دکھ بھری دنیا سے میں ایک ایسی جگہ تمہیں پہنچانا چاہتا ہوں جہاں یہہ جیون روگ نہ ہو۔

نرگس۔ تمہیں میرا جیون امرت ہو۔ تم ملے تو جیون روگ کیسا۔؟

شاھد۔ میں تمہاری جوانی کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں..... کہ تمہارے حسن کی باس سے تمام سنسار مہک اٹھے پیاری تم میرے نگاہوں میں شاعر کا خواب ہو۔ کبیرا اور تلسی داس نے تمہارے سندر ہونٹوں سے پریم کا راگ الاپنا سیکھا ہے۔

نرگس۔ اور یہہ ابھاگے ہونٹ پی کہاں..... پی کہاں۔ گنگناتے رہتے ہیں۔

شاھد۔ ہائیں..... نرگس تم کانپ رہی ہو۔

نرگس۔ یہہ خوشی کی کپکپی ہے۔ کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے تمہاری یہہ چاہت نہ رہے اور تم مجھ سے اکتا جاو۔

شاھد۔ اکتا جاوں تم سے؟ تم تو میری پران ہو۔ تم مجھ سے چھین جاو تو اس زندگی کے تانے بانے دھڑ دھڑ کر الگ کردیں۔

نرگس۔ عورت کی چاہت جان کے ساتھ ہوتی ہے۔ مگر مرد...

شاھد۔ کیا عورت کیا مرد۔ ہم سب معصوم بچوں کی طرح جادو کی زمین پر کھیل رہے ہیں۔ پریم کا چتر ہمارے سر پر ہے۔ تمام زندگی پھلواری ہی پھلواری نظر آتی ہے اور پھول چننا ہمارا کام ہے۔

نرگس۔ تم میری نگاہوں کے سامنے رہتے ہو اور تمہارے منہ سے یوں پھول جھڑتے ہیں تو کوئی حیران ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن نظر سے دور ہوے اور.....

(باہر سے پکارنے کی آواز)

پکارنے والا۔ (باہر سے) نرگس بانی چلو تمہاری باری ہے۔

شاھد۔ نرگس۔ فی امان؟..... دیکھو خوب پارٹ کرنا۔

(دونوں جاتے ہیں)

(چند منٹ کی خاموشی)

اور

اس کے بعد

(ایک شور برپا ہے۔ لوگ سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ کچھ لوگ آوازے کس رہے ہیں۔ بعضے ٹکٹ کے پیسے واپس کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں)

نوشیرواں (اسٹیج کے پیچھے سے) غضب ہوا۔ کیسا اودھم مچا ہے! یہہ سیٹیاں کیوں بج رہی ہیں..... ہے۔ ہے۔ میں لٹ گیا..... برباد ہو گیا..... (منظر بانو سے) ارے کمبختو! گرادو اگاڑی پردے کو!!

(ھمایون اور شاھد باتیں کرتے ہوے سنائی دیتے ہیں)

ھمایون۔ بڑی بھلی لگتی تھی۔ لیکن ایکٹ نہیں کر سکتی۔

شاھد۔ ذرہ چلوں..... دیکھو کیسی خبر لیتا ہوں.......

ھمایون افسوس کہ تمہارا وقت ضایع گیا۔ افسوس کیا سمجھا تھا کیا نکلی۔

ہانی بال اعظم

شمالی افریقہ کی ریاست کارتھیج کے بڑے جنرل اور نیک نفس ڈکٹیٹر ہامل کار بارکا نے جنگ کا ارادہ کیا لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانے اور سلطنت روما کی طرف اپنی فوجیں بڑھانے نیز بحیرہ روم پر اپنے اقتدار کی کوشش کرنے سے پہلے یا بالفاظ دیگر پوری دنیا کو اپنے قبضے میں لانے کی سعی سے قبل اس نے یہہ مناسب سمجھا کہ دیوتاؤں کی حضوری میں حاضر ہو کر اپنی تمناؤں اور دلی آرزوؤں کی کامیابی کے لیے التجا کی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے وہ کارتھیج کے مشہور مندر میں داخل ہوا تاکہ یہہ دعا نہایت ہی خلوص دل کے ساتھ کی جائے۔ اس لیے اس نے مندر کے پجاریوں کو حکم دیا کہ وہ باہر چلے جائیں اس کے ساتھ صرف اس کا نوسالہ لڑکا "ہانی بال" موجود تھا۔

"کیا تم میرے ساتھ جنگ پر چلنا چاہتے ہو" اس نے اپنے لڑکے سے دریافت کیا۔

"جی ہاں" مشتاقانہ انداز میں لڑکے نے جواب دیا۔

"تب تم اس قربانی پر اپنا ہاتھ رکھو اور رومن نام سے دائمی اظہار نفرت کی قسم کھاؤ"

اس طرح کارتھیج کے اس نوجوان کی زندگی ایک دائمی قسم کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد سے وہ شخص سلطنت روما کا کٹر دشمن ہو گیا اور نفرت کا جذبہ اسکے دل و دماغ میں ہر گھڑی پرورش پانے لگا اور یہہ ایسی بری بلا تھی کہ دماغ سے نکالے پر بھی نہیں نکل سکتی تھی۔

ہانی بال یعنی ہامل کار بارکا کا لڑکا ۲۴۷ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا پیدائشی مقام وہی نفرت آمیز سلطنت وہ تھی جو ہمیشہ سے ریاست کارتھیج کی تباہی کا باعث بنی ہوئی تھی۔

کارتھیج کے لوگ حقیقت میں جنگجو اور بہادر سپاہی نہیں تھے بلکہ وہ سوداگر اور تاجر پیشہ قوم سے تعلق رکھتے تھے اور یہی انہوں نے اپنے فنیشائی آباو اجداد سے ملاحی اور جہازسازی کا فن ورثے میں پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ روما کے ساتھ جب اس قوم نے جنگ کی تو اس کو بڑے بھاری نقصانات اٹھانے پڑے۔ واقعہ یہہ ہے کہ لڑائی کے موقع پر ان کی فوجوں میں بہت زیادہ کرایے کے سپاہی ہوا کرتے تھے۔ مگر عجیب بات یہہ ہے کہ اسی قوم سے ہامل کار بارکا اور اس کا لڑکا ہانی بال جیسے فریس، ہوشیار، عقلمند، مستعد، بہادر اور زبردست جنرل پیدا ہوئے۔

ہانی بال نے بال مولاک دیوتا کے روبرو جب سے رومنوں کے خلاف میں نفرت کا جذبہ پیدا کرنے کی قسم کھائی تھی اس وقت سے وہ ایک ایسی فضا میں پرورش پا رہا تھا جہاں ہر وقت جنگ و جدل، لڑائی، جھگڑا اور نفرت آمیز جذبات پیدا کرنے کی تعلیم دیجاتی تھی۔ اس کو اپنے باپ کے ورثے میں ایک خیمہ ملا تھا اور دوسرے یہہ کہ اس نے اپنے باپ کی جنگجو صفات سے ایک سپاہی کی سی خصوصیت اور ویسی ہی زندگی اپنے ورثے میں پائی تھی۔ جب ہامل کار بارکا نے ہسپانیہ پر چڑھائی کی تو اس نے قصداً اپنے کم عمر لڑکے کو ساتھ رکھا اس لیے کہ وہ محسوس کرتا تھا کہ ہانی بال کو جنگ و جدل سے فطری لگاؤ ہے اور اگر اس کا کوئی حقیقی وارث ہو سکتا ہے تو وہ یہی لڑکا ہے۔

اگرچہ وہ دبلا پتلا تھا۔ لیکن اس کا جسم گٹھیلا اور مضبوط تھا اس نے کھیل کود اور کرتبوں میں اپنے آپ کو بہت ہی نمایاں اور کامیاب کر دکھایا تھا۔ گھڑ بازی اور دوڑنے کی شرطوں میں ہر وقت اول رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک زبردست شہسوار بھی تھا۔ اسی طرح اس نے اپنی زندگی کو ہر مصیبت اور خطرے میں ڈال کر جنگ کے لیے اپنے آپ کو

ایک کامیاب شخص ثابت کیا۔ اس کو ہر بات میں کمال حاصل تھا۔ مثلاً جب کبھی وہ اچھے کھانوں کی خواہش کرتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے دسترخوان چنے جاتے اور جب وہ سختی پر اتر آتا تو سوکھے ٹکڑے تک کھانے سے دریغ نہ کرتا بلکہ بعض اوقات کئی کئی روز کے فاقے تک کھینچتا۔ اور اگر ضرورت پڑے تو کئی کئی رات بغیر سوے کام انجام دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک ایک بہتر پیرائے میں کر سکتا تھا۔ یعنی اپنے ملازمین سے وقت پر کام لینے اور موقع سے آرام دینے میں اس کو خاص ملکہ حاصل تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ ہانی بال ایک زندہ دل شخص تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ رومن تاریخ نویسوں نے محض بغض و حسد کی بنا پر اس کی شان کے خلاف اس کے اخلاق و کردار کی ایک بدترین تصویر کھینچی ہے جس میں اس کو ایک ظالم اور بربر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے حالانکہ وہ ایک خوش اخلاق اور شایستہ انسان تھا۔ اس کی تعلیم اور تربیت ایسے ہی اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی جیسے اس زمانے کے فنی شیائی امیر کی اولاد کی ہو سکتی تھی۔ وہ یونانی زبان کے ادب کا زبردست ماہر شخص تھا۔ اس کے یونانی ادب کی لیاقت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس نے اس زبان میں نہ صرف اخبارات ترتیب دیے بلکہ متعدد کتابیں بھی لکھیں۔

اٹھارہ سال کی عمر سے اس نے جنگ میں باقاعدہ طور پر عملی حصہ لینا شروع کیا۔ جس لڑائی میں ہامل کاربارکا کا انتقال ہوا ہے اس وقت ہانی بال اپنے باپ کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہامل کاربارکا کی موت سے قوم کارتھیج کے وہ ارادے پورے نہ ہو سکے جو کاربارکا کے سر پر بھوت کی طرح سوار تھے لیکن یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اسپین کا ایک زبردست علاقہ سلطنت کارتھیج میں شامل ہو گیا تھا۔

بہ حیثیت کمانڈر کارتھیج کی سوارہ فوج میں ہانی بال نے اپنے بہنوئی دروبال کے تحت آٹھ سال تک یہ خدمت انجام دی۔ یہ شخص ۲۲۱ ق م میں میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا اس کے بعد پوری فوج نے متفقہ طور پر ہانی بال کو پچیس سال کی عمر میں اپنا سپہ سالار مقرر کر لیا۔ بعد میں چل کر ہانی بال نے اپنے آپ کو اس خدمت کے قابل ثابت کیا کرایے کی ایک زبردست فوج کی سرکردگی کرتے ہوے اس نے ایک بڑے حملے کی ٹھانی ان کرایے کے ٹٹوؤں میں مختلف اقوام کے لوگ شامل تھے۔ جن میں اگرچہ بہت سے شوقین سیاح بھی تھے۔ لیکن ان میں کوئی جنگجو نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود کسی شخص نے بھی ہانی بال کے احکام کے خلاف سرتابی نہیں کی حالانکہ ان کو ضرورت سے زیادہ سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں۔

ان تمام دقتوں کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایک کامیاب جنرل ثابت ہوا لہذا اب ہم معلوم کریں گے کہ آخر اس کی ترقی کے اسباب کیا تھے۔

اول یہ کہ ہانی بال میں عوام کے احساسات اور جذبات کو جاننے کی ایک خاص قابلیت موجود تھی اس نے جنگ کے فن کو جس خوبی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی شاید ہی دوسرے جنرلوں کو یہ خصوصیت نصیب ہوئی ہو۔

فوجوں کو حرکت دینے اور ان کو ایک خاص خوبی کے ساتھ لڑانے کی چال بازانہ قابلیتوں نے اس کے سر کامیابی کا سہرا باندھا۔ ایسی چالوں سے سبق حاصل کر کے رومن جنرلوں اور خصوصیت کے ساتھ سی پیو آفریقانس نے ہانی بال کو بعد میں چل کر شکست دی۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی بیان کیا کہ ہانی بال میں ہر قسم کی قابلیت کا مادہ موجود تھا اور خصوصیت کے ساتھ دشمن کی نقل و حرکت کا بڑی حد تک صحیح اندازہ لگاتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ پیشین گوئی میں فطرت کی طرف سے اس کو ایک

خاص عطیہ حاصل تھا جس کی رو سے وہ آیندہ میدان جنگ کے نتایج پر پہنچ جاتا تھا۔ صرف یہی ایک واحد قابلیت نہ تھی جس کی وجہ سے ہانی بال کی شہرت میں چار چاند لگ گئے بلکہ وہ مزید خصوصیات کا بھی حامل تھا۔ مثلاً فن جاسوسی میں اس کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کے جاسوسی نظام کا یہ عالم تھا کہ رومنوں کے ساتھ جب بڑی لڑائی ہوئی ہے تو ان کے پایۂ تخت کے علاوہ ان کی فوجوں اور ان کے کیمپوں تک ہانی بال کے جاسوس جال کی طرح پھیلے ہوئے تھے صرف یہی نہیں بلکہ وہ خود بھی ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے نہایت ہوشیاری کے ساتھ تبدیل لباس کرتا اور دشمن کی فوجوں میں گھس گھسا کر کسی نہ کسی طرح اپنا مقصد پورا کر لیتا تھا۔

اس کی ابتدائی زندگی کا دور فوجی فضا میں بسر ہوا تھا اس لیے وہ بہتر طریقے پر جانتا تھا کہ ایک جنرل کو سپاہیوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنا چاہیے۔ اور ہر شخص کی قابلیت کو کس طرح سے موزوں کام پر صرف کیا جائے اور یہ کہ ان کی اخلاقی حالت کو برقرار رکھنے کے لیے کون سے ذرایع اختیار کیے جائیں۔ نیز یہ کہ معاشی پستی کے دور میں ایک جنرل کے اپنے سپاہیوں کے ساتھ کیا فرایض ہونے چاہئیں یہاں تک تو ہم نے اس کی سپاہیانہ قابلیتوں کا ذکر کیا۔ اس سے کہیں یہ مغالطہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ صرف میدان جنگ ہی کا مرد تھا بلکہ اس کی انتظامی اور سیاسی قابلیتیں بھی ہر لحاظ سے لایق ستایش ہیں جن کا انکشاف اس عظیم جنگ کے ختم پر اس وقت ہوا جب اس نے اپنی ریاست کا ریچھ کے نظم و نسق کو ٹھیک کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

ہانی بال اگرچہ ایک بیدار مغز لیڈر تھا لیکن روم کے خلاف مہم میں دو اہم غلطیاں کیں۔ پہلے یہ کہ اس نے سلطنت روما کی بحری طاقت کا ٹھیک اندازہ نہ کرتے ہوئے رومنوں کو اپنی بحری قوت کے بڑھانے کا موقع دیا اور اس طرح دشمن کے خلاف ایک نئی سرزمین پر لڑتے ہوئے اس کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اپنی فوج میں ہسپانوی سپاہیوں کا بھی اضافہ کر لیا اور یہ فوج اپنے نوجوان بھائی ہاسدروبال کی کمان میں دی۔ اگرچہ یہ نوجوان جنگجو اور بہادر تھا لیکن جنگی تجربوں سے اس کو زیادہ واقفیت نہ تھی۔

مولاک کے روبرو ہانی بال نے جو قسم کھائی تھی اس کا اثر اس کے دل و دماغ میں سرایت کر گیا تھا اس لیے ہر وقت وہ خیال اس کے پیش نظر تھا۔ روما پر حملے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سنہ ۲۲۱ ق م میں اس نے اسپین میں ایک زبردست قوت فراہم کر لی تھی۔ اور اس کی سرکردگی کرتے ہوئے سلطنت روما کو اس بات کا چیلنج دیا کہ دنیا کی لیڈری کے لیے تلوار کے زور سے تصفیہ کر لیا جائے۔ اس نے شہر سگنٹم کا محاصرہ کر لیا اور اسپین میں یہی ایک واحد شہر تھا جو اب تک مسخر نہیں ہوا تھا۔ اس محاصرے کے باوجود رومنوں نے ہانی بال کو یہ دھمکی دی کہ اگر سگنٹم پر جنگ کی ابتدا ہو گی تو پھر ایک عام حملہ کر دیا جائے گا۔ ہانی بال نے رومنوں کی ان بندر بھبکیوں کی مطلق پرواہ نہیں کی بلکہ اپنے محاصرے کو برابر جاری رکھا جو آٹھ ماہ کے طویل عرصے تک قایم رہا۔ ہانی بال کی پالیسی سے سلطنت روما بھی مشتعل ہو گئی جس کے نتیجے کے طور پر دوسری جنگ پیونک کی ابتدا ہوئی

ہانی بال نے بھی مزید حملے کی زبردست تیاریاں کیں اس نے اس موقع پر اپنی فوج کو تین حصوں میں منقسم کر دیا جس کا ایک حصہ افریقہ کو بھیجا گیا۔ دوسرا اسپین میں چھوڑ دیا گیا اور تیسرے حصے کے ساتھ اٹلی کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی یہ حرکت مجنونانہ اور غیر صحیح معلوم ہوتی تھی۔ اٹلی کا ملک پہاڑوں کے زنجیر سے گھرا ہوا ہونے کے باعث ناقابل تسخیر معلوم ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے کسی حملہ آور کے لیے خشکی یا سمندر سے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا اس کے باوجود ہانی بال نے وہی مجنونانہ اور غیر صحیح حرکت

کی۔ چلتے چلتے اس کی فوجیں کوہ پرینیز تک پہنچ گئیں ان میں سے سپاہیوں کی ایک کافی تعداد کو اس نے وطن لوٹا دیا۔ اور پچاس ہزار پیدل اور نو ہزار سوارہ بہادروں کی فوج کے ساتھ وہ اٹلی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے علاوہ ہاتھیوں کی بھی ایک بھاری تعداد اس کے ساتھ تھی۔

ہانی بال کی کوششیں آخر میں بارآور ثابت ہوئیں یعنی وہ کوہ پرینیز کو پار کرکے اہون تک پہنچ گیا اس کے راستے میں قوم گال (فرانسیسی) نے مزاحمت کی اور بجا طور پر موکھی بھی کھائی۔ یہاں سے وہ کوہ آلپس کی طرف بڑھتا چلا گیا اور آخرکار دنیا کی اس زبردست سد سکندری کو بھی پار کرگیا۔

کوہ آلپس کی اس مہم کو تاریخ عالم کا ایک نرالا کارنامہ سمجھا جاتا ہے جس کا سہرا ہانی بال جیسے بہادر جنرل کے سر ہے اس کے سپاہی میدانوں کے بسنے والے تھے جن کی زیادہ تعداد شمالی افریقہ کے ساحل کی تپتی ہوئی گرمی کو سہنے کی عادی تھی مگر یہ لوگ ہتیاروں اور ضروری ساز و سامان سے مسلح تھے۔ تسخیر کرنے والے آلات کے علاوہ باربرداری کے لیے ہاتھیوں کی ایک کافی تعداد اس کی فوج کے ساتھ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہاتھی زیادہ بوجھ اٹھانے کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن کوہ آلپس کی دشوار گذار پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں بجائے سہولت کے وبال جان بن گئے تھے اور ان کے بچاؤ کی ذمہ داریاں سپاہیوں کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث ہوئیں۔

ہانی بال کے اس انوکھے سفر کے متعلق بہت سے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ موقع بہ موقع اس نے سڑکیں اور پلیں اس سرعت اور تیزی کے ساتھ تیار کیں اور جب کافی وقت نہ ہوتا تو پلیں تیار کرنے سے قاصر رہ کر کوہ اپنائین کی تیز بہنے والی ندیوں میں ہاتھیوں کو اس ڈھعب کے ساتھ کھڑا کر دیتا کہ ندی کا دھارا اپنا رخ بدلنے سے بہاؤ کی قوت کم ہو جاتی اور اس طرح فوج معہ ساز و سامان آسانی سے پار کر جاتی۔ چونکہ کوہ آلپس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں اس لیے وہاں سے آنے والے دریاؤں کا پانی حد درجہ سرد رہتا ہے اور کارتھیج کے سپاہی ایسے سرد پانی یا سردی کو برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہانی بال نے اپنے سپاہیوں کو سردی کی مشکلات کا سامنا کرنے پر بھی آمادہ کر لیا۔ محض اس ایک واقعے سے ہانی بال کی مستعدی اور استقلال نیز اس کی سیاست و تدبر کا صاف پتہ چلتا ہے۔

اجنبی اقوام سے مقابلہ کرتے ہوئے موسم کی مشکلات کو سہتے ہوئے پہاڑی دروں اور ٹوٹے پھوٹے راستوں سے گذرنا ایک تکلیف دہ اور دشوار کام تھا۔ یہی سبب تھا کہ ہانی بال کی فوج کے سپاہی ان پہاڑوں کی چٹانوں پر سے پھسل جاتے اور ناہموار راستوں پر ٹھوکریں کھاتے اور سرد پانی کے دریاؤں میں سے گذرتے ہوئے اپنی منزل مقصود کی طرف بے تکان بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہواؤں کے زبردست طوفان بلائے ناگہانی کی طرح بار بار ان پر ٹوٹ پڑتے تھے ان تمام تکالیف اور دشواریوں کے باعث اس کی فوج کے اکثر و بیشتر سپاہی اجنبی پہاڑوں اور ناواقف راستوں میں مجنونوں کی طرح مارے مارے پھر رہے تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں اور قدرت کی دو بدو جنگ میں ہانی بال کو زبردست جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ لیکن اس کے باوجود بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بیس ہزار پیدل اور چھ ہزار سوارہ فوج کے ساتھ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ جانی نقصانات کی یہ عظیم ترین فہرست مورخین کی مبالغہ آمیز تحریروں کا ایک یادگار کارنامہ معلوم ہوتی ہے ہانی بال نہ صرف مرد میدان تھا بلکہ وہ ایک قابل سیاستداں بھی تھا۔ نیز یہ کہ اس کو اپنی فوج کی سدھار اور سپاہیوں کے حالات کو موقع کے لحاظ سے بدلنے اور سنبھالنے میں ایک

خاص ملکہ حاصل تھا۔ یہ تعداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی وہ اپنی غیر معمولی قابلیت کے اعتبار سے اس سے دگنی فوج پر بھی آسانی سے قابو رکھ سکتا تھا۔ اس کی یہی ایک خوبی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کا سبب بن گئی۔

جب ہانی بال کی فوجیں ان تمام مشکل کو مراحل طے کرنے کے بعد غیر یقینی طور پر اٹلی میں آدھمکیں تو رومنوں کے ہوش جاتے رہے اور وہ گم صم ہو گئے۔ بالآخر کار رتھیج کا یہ بہادر اپنے ازلی دشمن کی سرزمین پر پہنچ ہی گیا۔ رومنوں کو کچھ نہ سوجھی سوائے اس کے کہ اس سیلاب کو روکنے کے لیے اپنی فوجیں شمال کی جانب روانہ کریں۔

اس طویل مسافت کے بعد ہانی بال نے مناسب سمجھا کہ اپنی تھکی فوج کو چندے آرام دیا جائے لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ عرصہ دراز تک بیکار رکھ کر فوجیوں کو نکما کر دیا جائے۔ مقام ٹیسی ٹو پر سوارہ فوج کو جو فتح حاصل ہوئی اس کی اہمیت بھی اس طویل سفر کی داستان سے کچھ کم نہیں۔ ۲۱۸ ق م میں ہانی بال نے پلاسنشیا کے قریب جنگ ٹریبیا میں بہادری کے ساتھ رومن فوج سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پورے طور پر اس کو شکست دی اس کے بعد اس کی فوجیں پہاڑوں کے ایک دوسرے زنجیرے یعنی کوہ اپنائنس کی طرف بڑھیں اور اس کو پار کر کے شہر اٹرو ریا پر دھاوا بول دیا اور آخر میں اس کو تباہ و برباد کر دیا۔

اس مہم میں دو جنگیں ہوئیں پہلے ۲۱۷ ق م میں جھیل ٹراسی مینس کے مقام پر فلامینیس قونصل کی فوج کو ہانی بال نے گھیر لیا۔ دوسرے یہ کہ دریا کے کنارے رومنوں کی ایک دوسری فوج کو اس نے بری طرح گھیر لیا تھا کہ وہ فوج موت کا نوالہ بن گئی تھی۔ جتنے بھی آدمی اس محاصرہ میں گھر گئے انہیں سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور جو باقی بچ کر بھاگ نکلے ہانی بال کی سوارہ فوج نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ہانی بال نے روم کی طرف اس کے فوراً بعد پیش قدمی نہیں کی یہ دنیا کی تاریخ میں ایک معمہ سا ہے جس کو اب تک کسی نے بھی حل نہیں کیا۔

دوسرے سال بہ مقام کینا نے اس فتح مند سپہ سالار نے رومنوں کی ایک زبردست فوج کو بری طرح شکست دی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چھہتر ہزار سپاہیوں میں سے جو کار تھےجی نینس کے مقابلے میں نبرد آزمائی کے لیے گئے تھے ان میں سے ستر ہزار کے قریب لقمۂ اجل بن گئے۔

اس لڑائی میں ہانی بال نے اپنی فطری قابلیت کے کچھ ایسے جوہر دکھلائے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اگرچہ رومنوں نے دریائے روفی ڈس کے کناروں پر ایک نہایت ہی موزوں و مناسب مقام پر اپنی فوجیں اتاری تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہانی بال کی ترکیبوں کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ اگر یہاں ہانی بال کو شکست ہو جاتی تو گویا اس کی پوری قوت کا دائمی طور پر خاتمہ ہی ہو جاتا۔ کارزار کا یہ میدان دنیائے جنگ کی تاریخ میں ایک یادگار اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ ہانی بال نے رومنوں کی زبردست فوج کو شکست دینے کے لیے جو نقشے تیار کیے تھے۔ دنیا آج تک ان کی تقلید کرتی چلی آ رہی ہے۔

اس نے اپنی فوجوں کو مناسب وقت کے ساتھ بڑھانے کی کوشش کی اور سوارہ فوج کو بازوؤں میں رکھ کر پیدل فوج کو درمیانی حصے سے بڑھنے کا حکم دیا۔ لیکن قلب کا حصہ اس قدر قوی نہ تھا جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اس نے میمنہ و میسرہ کو زیادہ تقویت دی جنہیں زیادہ تر لیبیا کے سپاہی شامل تھے۔ پہلے ہی حملے میں گال اور ہسپانوی جو قلب میں تھے رومن پیدل فوج کے سامنے ٹک نہ سکے اس سے فائدہ اٹھا کر رومن فوج کارتھیج کی فوج پر ایک دم ٹوٹ پڑی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رومنوں کی فتح یقینی ہے۔ ایسے نازک موقع پر ہانی بال نے لیبیا کی پید

فوج پر دو بازوؤں سے سخت حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس ترکیب سے رومنوں کی فوج کا قلب کا حصہ تتر بتر ہو گیا۔ اس کے بعد ہانی بال کی سوارہ فوج نے اس کا پیچھا کیا بالآخر شکست فتح میں تبدیل ہو گئی۔

مشہور ہے کہ اس لڑائی میں اتنی انگوٹھیاں ہاتھ آئیں کہ ہانی بال نے تین تھیلے بھر کر کارتھیج کو بھیجے اور یہ انگوٹھیاں ان مقتول رومن سپاہیوں کی انگلیوں سے اتاری گئیں تھیں جو اس عظیم الشان معرکہ میں موت کا نشانہ بنے تھے۔ گو اس واقعے سے ہانی بال کی بربریت کا پتہ چلتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ فطرتاً وہ اس طبیعت کا آدمی نہ تھا بلکہ اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ مثلاً ایسی لڑائی میں اس کی انسانیت اور شرافت کا اندازہ صرف اس ایک واقعے سے ہو سکتا ہے کہ اس لڑائی میں جو رومن قونصل مارا گیا تھا، اس کی تدفین کی رسم ایک رومن فوجی عہدہ دار کی شایان شان انجام دی گئی۔ وہ دراصل ایک بہادر سخی اور شریف دشمن تھا۔

اس فتح کے بعد ہانی بال اٹلی کے ایک بہت بڑے علاقے کا مالک بن بیٹھا اگر وہ اسی لڑائی کے سلسلے میں شہر روما پر عقاب کی طرح جھپٹ پڑتا تو لازماً روما کی پوری قوت اس کے قدموں تلے ہوتی۔ لیکن اس حملے سے باز رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے مقاصد اس سے بھی کہیں زیادہ بالا و برتر تھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ظاہری فتح سے بڑھ کر ٹھوس کام کرنا چاہتا تھا۔ غالباً اس کا یہ مقصد تھا کہ لاطینی ممالک کی متحدہ فوجوں کا پہلے خاتمہ کر کے اس طرح رومن سلطنت کو کمزور کر دیا جائے اور پھر اس کے بعد شہر روما پر آسانی سے حملہ کر کے کامل فتح حاصل کی جائے۔ شاید اسی نظریے کے تحت وہ روما کی طرف بڑھنے کی بجائے جنوب کی طرف پلٹا اور لاطینی متحدین کو کچلنے کی ٹھان لی ۲۱۳ ق م میں تارنتم پر قبضہ کر کے اس نے پورے جنوبی علاقے پر اپنا اقتدار جما لیا۔

اس عرصے میں رومنوں نے اپنے جنرل کوئنٹس فابیس میگزیمس عرف کنکٹیٹر الملقب ڈی لیر دیر کرنے والا کے تحت ایک نئی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا انہوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ ہانی بال کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا جائے فوجوں کو بڑی تعداد میں جمع کرنا شروع کیا اور یہ فوجیں ایک ناقابل تسخیر مقام پر دشمن کے انتظار میں ٹھہری ہوئی تھیں ان فوجوں کا مقصد فوراً ہی مقابلہ کرنا نہیں تھا بلکہ دشمن کی نقل و حرکت کو دیکھنا اور اس کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرنا تھا۔ اس طرح سے دشمنوں نے ہانی بال کو اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ میدان کارزار میں اپنی روایتی برتری کو ظاہر کر سکے۔ ہانی بال کے لیے یہ ضروری تھا کہ لڑائی جاری رکھتے ہوئے دشمن کے ان علاقوں پر بھی قابو رکھے جو اس کے قبضے میں آ چکے تھے۔

دشمن کی ان ترکیبوں کے باوجود ہانی بال کی برتری مسلم تھی اس لیے کہ ہر سال وہ اٹلی کے کسی نہ کسی علاقے کو فتح کرتا ہوا روما کے ناقابل تسخیر قلعہ تک پہنچ گیا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے۔ ہانی بال نے پایۂ تخت سلطنت پر حملہ کر دیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طویل محاصرے کے باعث اس کی فوجیں تھک کر کمزور ہو گئیں۔ گویا یہ رومن افواج کی نئی پالیسی کے ایک جزو کا اثر تھا۔ اس وقت اس نے نیومیڈین سوارہ فوج کے سپہ سالار مہاربال کی اس تنقید پر غور کیا جو اس نے ایک خاص موقع پر کی تھی کہ "تم جانتے ہو کہ فتح کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہانی بال یہ مشورہ تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا کہ فتح ہمیشہ حاصل کی جا سکتی ہے نہ کہ حاصل کرائی جا سکتی ہے"

اس نے اپنے ملک کارتھیج سے فوجی امداد طلب کی لیکن اس وقت کارتھیج کے حکمرانوں میں بغض و حسد کے باعث پھوٹ پڑ گئی تھی اس لیے ہانی بال کو مناسب فوجی امداد نہ مل سکی جب ہاسدروبال نے اسپین سے فوجی امداد طلب کی تو وہاں سے بھی بہت کم تعداد میں سپاہی مل سکے۔ لیکن اس مختصر

گروہ کے ساتھ وہ دشمن کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ مگر آخر میں دریائے مٹارس کے قریب دشمن کی افواج نے اس کو شکست فاش دیدی۔ اور یہ سپہ سالار ہانی بال سے ملنے کے ارادے سے قاصر رہا۔ اس کی اس لڑائی کا حال ہانی بال کو اس وقت تک نہ پہنچ سکا جب تک کہ رومنوں نے ہاسدروبال کے سر کو ہانی بال کے کیمپ میں نہ پھینکا۔

ہانی بال نے انتہائی جنوب کے ایک مقام بروٹیم پر قبضہ کر کے اٹلی کے اہم علاقے پر اپنا اقتدار برقرار رکھا اس واقعے کے بعد سے سولہ سال تک اس کی فوجیں اٹلی کی سرزمین پر رہیں اور اس دوران میں اس نے رومنوں کو کبھی چین و آرام لینے نہیں دیا۔ اس کے بعد اپنے ملک کارتھیج میں اس کی یاد ہوئی تاکہ یہ بلیس سیپیو کے حملے سے اپنے ملک کو بچائے۔ یہ شخص اسپین کو فتح کرنے کے بعد لڑتے لڑاتے افریقہ تک پہنچ گیا تھا۔ ہانی بال کے آنے کے بعد سنہ ۲۰۲ ق م بہ مقام زاما ان دونوں فوجوں کی مدبھیڑ ہوئی کارتھیج کے سپاہیوں نے اس میدان میں اپنی پوری قابلیتوں کا مظاہرہ کیا اور ان کے قابل جنرل نے سیاست اور تدبر و جنگی ترکیبوں کو کام میں لانے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن رومن سپاہیوں نے بھی چال بازیوں کا سبق انہیں سے سیکھا تھا۔ ہانی بال نے اپنی فوج کے بچاؤ کی انتہائی کوشش کی لیکن دشمن کی زیادہ تعداد اور نت نئی ترکیبوں کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ آخر کار رومن فوج کو ہانی بال جیسے عظیم الشان جنرل کے مقابلے میں فتح حاصل ہوئی۔

لڑائی کا نقشہ کچھ ایسا بے ترکیب بیٹھا تھا کہ ابتدائے جنگ ہی سے ہانی بال کی فوج کو نیچا دیکھنا پڑ رہا تھا جب دشمن نے غلبہ پا لیا تو ہانی بال اپنے فردہ سپاہیوں کے ڈھیر کو روندتا ہوا میدان سے بھاگ نکلا اور شہر کارتھیج میں آکر دم لیا چھتیس سال کے طویل عرصے کے بعد ہانی بال کے لیے مادر وطن کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

رومن فوج پورے طور پر چھا گئی تھی اور میدان کارزار پر غلبہ پانے ہی کو تھی کہ کارتھیج کے دوسرے سرداروں نے صلح کا پیش کش کیا لیکن اس صلح نامے میں ہانی بال کا کوئی دخل نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہانی بال سے خود رومن صلح کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے ہانی بال کی شخصیت معمولی نہ تھی اس لیے کہ امن کے زمانے میں وہ جیسا طاقتور اور خطرناک تھا وہی حال دوران جنگ میں بھی ہوتا تھا اس لیے سے خود ہانی بال صلح کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی غیر معمولی شخصیت جس طرح اپنی ایک معین پالیسی کا سکہ جما کر ریاست کے کاروبار کو جس قدرت کے ساتھ انجام دے سکتی تھی اسی طرح وہ بہ حیثیت ایک کامیاب اور تجربہ کار جنرل کسی معمولی فوج کو ایک طاقتور اور لڑنے بھڑنے والی فوج میں آسانی سے بدل سکتا تھا۔ لہذا ایک ایسی غیر معمولی قوت و قابلیت والے شخص کے لیے قطعی ناممکن تھا کہ اس دشمن کی فوج کے سامنے آسانی سے سر تسلیم خم کر دے جس کو اس نے اپنی قوت بازو سے رام کیا تھا۔

ہانی بال نہ صرف ایک طاقتور اور بہادر سپہ سالار تھا بلکہ مجسم اخلاق بھی۔ حکومت کارتھیج کی سینٹ میں ایک وقت کا واقعہ ہے کہ جب دوسرے ارکان اپنے ملک کی بدقسمتی پر آنسو بہا رہے تھے تو ہانی بال بجائے رونے کے قہقہے مار کر ہنس رہا تھا۔ اس کی اس حرکت پر بعض حاسد دوست نما دشمنوں نے سخت حملہ کرتے ہوئے مذمت کی۔ لیکن ہانی بال نے ترش روئی سے جواب دینے کی بجائے نہایت ہی متانت سے کہا کہ آپ ایک ایسے شخص سے جس کی پوری عمر جنگ کے میدانوں میں بسر ہوئی ہو کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ آداب دربار کا لحاظ رکھے

چاہے امن ہو یا جنگ ہر وقت ملک کی قسمت کی باگ ہانی بال ہی کے ہاتھ میں رہتی تھی روما کے حملے اور تباہی کے بعد اس نے ملک کی از سر نو تنظیم کی اور حالات کو کچھ اس سرعت

کے ساتھ بدل دیا۔ روما نے جو بھی تاوان طلب کیا تھا کارتھیج کے خزانے اس رقم کے ادا کرنے کے قابل ہو گئے یہ سب کچھ ہوا لیکن مغربی دنیا کے جتنے بھی ممالک فتح کیے گئے تھے بہت سے ہاتھ سے جاتے رہے اور اکثروں پر باقاعدہ طور پر اقتدار قایم نہ رکھ سکا۔ اگرچہ کارتھیج کی سلطنت کمزور پڑ گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود رومن اب بھی ہانی بال کی قوت سے ڈرتے تھے اس لیے انہوں نے کارتھیج کے بعض سرداروں سے سازش کر کے ہانی بال کے خلاف نقض امن کا الزام لگایا ملک کی یہہ حالت دیکھ کر ہانی بال شام کے بادشاہ انتیاکس سوم کے پاس اس غرض سے چلا گیا کہ اس کی مدد سے ایک متحدہ قوت کے ساتھ شہر روما پر پھر سے حملہ کر دے۔ ہانی بال کے مقاصد بہت ہی اعلیٰ تھے لیکن شام کے بادشاہ نے مطلق توجہ نہ کی اور ایک ایسے شخص پر بھروسہ نہیں کیا جس نے عمر تمام میں کبھی دغا نہیں کی اور ہانی بال کے بہتر مشورے کو نظرانداز کر دیا۔ یہہ معلوم کرتے ہی رومنوں نے شاہ انتیاکس پر دباو ڈالنا شروع کیا اور اس سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ اگر تم ہم سے امن خریدنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت میں ہانی بال کو ہمارے حوالے کر دو۔ جب مفرور ہانی بال کو اس مطالبے کی خبر ہوئی تو وہ چپکے سے بھاگ گیا اور پروشیاس شاہ بِتھینیا کے پاس جا کر پناہ لی۔ رومنوں کو اس کا علم ہوتے ہی اس کا پیچھا شروع کر دیا اور پروشیا سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ وہ ہانی بال کو ان کے حوالے کر دے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ صبح سویرے ہانی بال اپنے مکان کے دریچے سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک طور پر اس کی نظریں فوج پر پڑیں تب اس نے معلوم کیا کہ اس کی رہایش گاہ کا محاصرہ کر لیا گیا ہے اور یہہ وہی فوج تھی جس کے ساتھ روما کے چند نمایندے ہانی بال کو مردہ یا زندہ گرفتار کرنے کے لیے آئے تھے جب اس نے بچاو کی کوئی صورت نہیں دیکھی تو اس نے اپنی انگوٹھی سے زہر کی ڈبیا نکالی اور زہر کو نگل گیا۔

"اس طرح ہمارے خاتمے سے رومنوں کو روزمرہ کی تکالیف سے نجات مل جائے گی" کہتے ہوے اس نے مسکرا دیا۔

اس کی موت کے واقعے کی صحیح تاریخ کا کسی کو بھی علم نہیں۔ لیکن یہہ باور کیا جاتا ہے کہ ۱۸۳ ق۔م میں اس نے خودکشی کی۔ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہونے پر موت کو اس نے اس لیے ترجیح دی کہ بچپن میں اپنے باپ کی موجودگی میں دیوتا کے مقابل میں اس نے رومنوں سے نفرت و حقارت برتنے اور ان سے انتقام لینے کا وعدہ کیا تھا جس کی تکمیل اس پر لازمی تھی۔

سی پیو جو ہانی بال کا فاتح تھا اور جس کو زاما کی فتح کے بعد آفریقانس کے نام سے یاد کیا جاتا تھا خود اس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ جس شخص کو شکست دی گئی ہے وہ درحقیقت ایک ایسا بہادر جنرل ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے اور جن لوگوں نے اس کے مقابل جنگ کی ہے انہوں نے کم از کم اخلاقاً اس کی سادگیٔ طبع اور دریا دلی کا اعتراف کیا ہے۔

چند سال بعد شہر کارتھیج کو بھی رومنوں نے تباہ کر دیا اور اس مقام پر ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی اور اسی شہر کو افریقہ کے لیے اپنا صدر مقام بنایا۔ لیکن رومنوں کی یہہ یادگار کچھ زیادہ عرصے تک قایم نہ رہ سکی اس لیے کہ ۶۹۸ء میں عربوں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور پورے ملک کو تباہ و تاراج کر دیا۔ وہ کارتھیج جس کی تہذیب و تمدن کے تمام دنیا میں چرچے تھے آج اس کی یادگار میں کوئی چیز باقی نہیں ہے۔

آوارا (عثمانیہ)

گیت

اے حسین چھٹکی ہوئی چاندنی!
ایک برس بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ ہوا۔
جبکہ تمہاری روپہلی چاندنی،
میری حسین منگیتر پر نثار ہو رہی تھی۔

اے شبنم کے آبدار موتیوں سے ڈھکے ہوئے پتو!
مجھے یاد ہے جبکہ نسیم صبح خرام ناز سے چلتی ہوئی
تم پر سے گذر رہی تھی۔ اور...... تم کانپ رہے تھے.....
اور دبی زبان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ تم میری خوابوں میں بھی
طرح کانپتے ہوئے مجھے نظر آتے ہو۔

اے شان سے بہتی ہوئی ندیوں کے پانی!
کاش! تم ہمیشہ اسی شان کے ساتھ اپنے طویل سفر کو جاری رکھو
تم جانو! میرے وجود کا ایک جز... تمہاری گہرائیوں میں پنہاں ہے۔

اے چمکتے ہوئے شہاب ثاقبو!
تم ہماری ملاقات کے شاہد ہو۔
ہم... جو کہ ایک جان دو قالب تھے
ہمارے دل.... ایک دوسرے میں تحلیل ہو جانے کے لیے
بیتابی سے دھڑک رہے تھے۔

اے حسین رات!
تمہاری یاد ہی میرے لیے کس قدر روح پرور ہے۔
کاش! تم مجھے اس کے خوابوں کے وسیع و زرین جزایر
میں پہنچا سکو.....!

کنیز ام۔ اے

درس ایثار

مناکی شادی فریدپور کے زمیندار کے بڑے لڑکے مسٹر افتخار کے ساتھ ٹھہری، فریدپور شادنگر اسٹیشن سے کوئی ۲۴ میل کی مسافت پر واقع ہے، مسافروں کو وہاں پہنچنے کے لیے بیل گاڑیوں میں سفر کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس چھوٹے سے مقام پر پہنچنے کے لیے کوئی موٹر یا ٹانگہ مہیا نہیں ہوسکتا۔ ہمارے قدیم ملازم مبارک نے جلد گاڑیاں فراہم کرلیں، دو کھلی گاڑیوں میں سامان بھر دیا گیا، بڑی بوڑھی عورتیں ایک گاڑی میں سوار ہوئیں مردوں کے لیے دو علیحدہ گاڑیاں موجود تھیں۔ سارے بچے ایک کھلی گاڑی میں بیٹھ گئے، اور ان سب میں بہتر کشادہ بیل گاڑی ہم نے اپنے لیے انتخاب کی۔

ہمارے بڈھے بنڈی بان نے کہا کہ اس کے خوبصورت سفید بیل بہت تیز چلنے والے ہیں ان کی لمبی لمبی پتلی ٹانگیں سیاہ زمین پر خوب دوڑتی ہیں۔

موسم گرما کی نکھری ہوئی رات تھی، سر پر کچھ تو وہ ہلکے ابر رواں تھے، اور چند ستارے ان کی آغوش میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

منا، میں اور فیروزہ ایک ساتھ زانو لگائے بیٹھے تھے، منا کے بڑے بھیا ہاشمی صاحب ایک ہلکا سفری لباس زیب تن کیے گاڑی بان کے بازو بیٹھے ہوئے بیلوں کو ہنٹر زور سے لگا کر دوڑا رہے تھے۔ اور رشید بھائی اپنی رائفل بغل میں دبائے پیدل ہمارا ساتھ دے رہے تھے شکار کے شوق نے تو بھائی صاحب کو بلکل وارفتہ بنادیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ ایسے سنہری موقعوں کے منتظر تھے ہماری اس مختصر سی گاڑی کی دنیا میں جہاں عیش و مسرت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر فرد بادہ مسرت سے جھوم رہا تھا۔

منا ایک معصومانہ انداز کے ساتھ سمٹی ہوئی بیٹھی تھی وہ دلہن بننے والی تھی۔ نت نئے جذبات اس کے دل میں مچل رہے تھے۔

فیروزہ بلا کی شریر لڑکی واقع ہوئی تھی، ایک منٹ بھی اس سے چپ نہیں رہا جاتا۔ اس کے شوخ و شنگ الفاظ پر دلہن کی صندلی پیشانی عرق آلود ہو جاتی۔ یہ کتنی تعجب کی بات ہے۔ منا وہی کالج کی شریر لڑکی جس سے کالج اور کلب کا ہر فرد اس کے مضحکہ خیز جملوں اور شرارتوں سے نہ بچا ہو، آج وہ ایک شرم و حیا کی تیلی بنی ہوئی ہر ایک کے مزاحیہ جملے سننے کے لیے تیار تھی۔

گرم ممالک کے چاند نے نہایت آب و تاب کے ساتھ اپنی نقاب کشائی کی۔ اس کی ہلکی ہلکی سنہری کرنیں ہمارے چہروں پر غازہ مل رہی تھیں، رشید بھائی جو چند منٹ پہلے ہم سے ایک فرلانگ آگے نکل گئے تھے دوڑتے ہوئے آئے، اور یہ مژدہ سنایا کہ آگے ایک میل کے فاصلے پر ایک خوبصورت ریتیلی ندی اپنے اندر کئی خوبیاں لیے ہوئے ہمارے سفر کی دلچسپیوں میں مزید اضافہ کرنے کے لیے مجسمہ انتظار بنی کھڑی ہے یہ مژدہ جانفزا سن کر ہم سب اچھل پڑے۔ شریر فیروزہ نے منا کی رخسار کی ایک چٹکی لی۔ جس کے جواب میں اس نے اس کے نئی گال پر ایک ٹھوکا لگایا۔ ہاشمی صاحب ندی تک جلد پہنچنے کے لیے بیلوں کو ہنٹر لگا لگا کر دوڑا رہے تھے۔ ان کا سارا جسم پسینے سے تر ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "مسٹر ہاشمی! ہم ندی تک پیدل چلیں گے آپ زحمت نہ کیجیے" فیروزہ نے بھی میری تائید کی، اور ہم بے تحاشا گاڑی سے کود پڑے۔

چاند بادلوں میں بھاگ رہا تھا، اس کی روشنی قدرے ماند پڑ رہی تھی۔ دلہن ہم سے کئی قدم پیچھے رہ گئی تھی۔ اس کے لیے ہیروں کا زیور، لباس و بال جان بنا ہوا تھا، فیروزہ

سے چپ رہا نہ گیا، اس نے آوازہ کسنا شروع کیا۔

"مہر ذرا اس کی چال تو دیکھ، کس انداز سے اٹکھیلیاں ری ہے کہ قدم قدم پر فتنے جاگ رہے ہیں، حضور والا! ں نے منا کو مخاطب کیا۔ خادمہ حاضر ہے، سواری کا شرف یئے گا۔ کمبخت اخبار بے حرمتی کر نہ بیٹھے۔"

میں اس مسخری کے جملوں پر خوب ہنستی رہی، ہاشمی صاحب ہونٹوں میں پائپ دبائے مسکرائے جا رہے تھے پاری دلہن شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی، اس نے پھرتی ے ساتھ فیروزہ کو دھکا دیکر گرا دیا، میں جو اسے تھامنے وڑی ایک نوکیلے کانٹے سے مجروح ہو کر بیٹھ گئی منا ے بھیا ہاشمی صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں انہوں ، ٹارچ کی روشنی میں فوراً میرے پیر کا کانٹا نکالا۔

یہہ شریر میرے بازو ہی ٹھہری ہوئی تھی اس نے ستہ سے میرے کان میں کہا، "تو اب پیر کا کانٹا نکل گیا ... مگر دل کا کانٹا ...... میں جھینپ سی گئی ..... چپ د ار ..... تجھے مذاق سوجھتا ہے۔"

"تو کیا یہاں بیٹھی ہوئی روتی رہوں" یہہ کہہ کر وہ خری سے سچ مچ ہچکیاں لے کر رونے لگی، اور تھوڑی ے کے لیے ہم سب کو بیوقوف بنا دیا، میں نے اسے چمکار ا، دیکھ فیروزہ! اب کے تو نے کچھ کیا ... کرا ... تو ....

"ہاشمی صاحب سے کہہ کر خوب پٹواؤنگی ..... اس ری بات کاٹ کر اپنا جملہ پورا کیا ....."

"نہیں .... بلکہ رشید بھائی .... سمجھی" میں نے جملے کمیل کی ....

کیا کہا، فیروزہ نے شرارت آمیز لہجے میں کہا "پٹواؤگی ں چل چڑیل، بڑی آئی .... رشید بھائی کی زبن بگڑ سنے والی ..... ذرا اس ندی میں صورت تو دیکھو لے ... آپ جیسی چڑیل تم نے جب سے بندگی میں اور ن مجھے سمجھ لینا ......"

ادھر یہہ مذاق ہو رہا تھا ... ادھر ایک رائیفل کی گولی آواز نے ہمارے ہوش گم کر دیے، منا کی زبان سے خوف میں ڈوبی ہوئی ایک ہلکی سی چیخ نکلی ...... فیروزہ دوڑ کر مجھ سے چمٹ گئی ..... اور میری حالت کچھ نہ پوچھیے بدن کا ہر عضو کانپ رہا تھا ......

"ہاشمی! ..... ہاشمی .... یہاں آو" یہہ لرزتی ہوئی آواز رشید بھائی کی تھی۔

"ہاشمی گھبرائے ہوئے دوڑے .... ہم سب بھی ان کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ گھبراہٹ کی وجہ سے چلنا بھی بار معلوم ہو رہا تھا ...... قدم من من کے وزنی ہو گئے تھے ......"

ندی کے کنارے رشید بھائی ریت پر عجیب حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے سے پریشانی و گھبراہٹ کے آثار پائے جا رہے تھے رائیفل ان کے سامنے ریت پر پڑی ہوئی تھی، ہاشمی تم سب کہاں تھے، رشید بھائی نے دیوانگی کی حالت میں کہا۔ میں نے ہاشمی صاحب کا کندھا ہلا کر کہا ..... دیکھو .... وہ سامنے درختوں کے جھنڈ میں .... تمہیں کیا نظر آ رہا ہے یہہ ایک بے گناہ انسان کی نعش ہے .... جو میری بے رحم گولی کا نشانہ بنی ..... اس کی گردن کے دائیں بازو گہرا زخم .... آہ ہاشمی .... میں نے .... ان ہاتھوں نے .... ایک گناہ ..... زبردست گناہ کیا ..... لیکن ...... دوست، لاعلمی کے پردے میں .... میری آنکھوں نے دھوکا کھایا .... میں نے ایک جھکے ہوئے آدمی کو جو کھیت میں پانی دے رہا تھا ..... جانور سمجھ کر گولی چلائی .... آہ ...... وہ تڑپ کر مر گیا، میں نے اکثر سنا تھا کہ یہاں راتوں کے وقت پانی پینے کے لیے ہرن، سانبھر، چیتل آیا کرتے ہیں۔ بتاؤ دوست اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ او خدا مجھے معاف کر، میں نے ایسا گناہ کیا جس کی تلافی شاید کسی دنیا میں نہیں .... آہ میں کیا کروں، میرا سر چکرا رہا ہے ..... اور

ضمیر مجھے بری طرح ملامت کر رہا ہے، رشید بھائی بھی اس طرح شدت غم سے بہت دیر تک روتے اور بڑبڑاتے رہے۔

چاندنے بادلوں کی دھندلی چادر سے اپنا سرخ چہرہ نکالا ..... اس کا خشمگیں چہرہ غیر معمولی آب و تاب لیے ہوئے تھا اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

میری عقل حیران تھی ..... اور ہاشمی منا کے چہرے سے بھی تشویش کے آثار نمایاں تھے، فیروزہ کا پتہ نہ تھا معلوم نہیں کہاں غایب رہی۔ دور سے کہیں بکری کے بچے کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

رشید بھائی دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھے ..... اور تیزی کے ساتھ نعش کی طرف دوڑے ..... ہم نے بھی ان کا پیچھا کیا ..... دیکھو ..... "یہ نعش ..... ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے چلا کر کہا ..... میری ہی گولی کا نشانہ بنی ....."

ہاشمی نے ٹارچ کی روشنی پھیلائی ..... "ارے یہ کیا ؟" بے ساختہ ان کی زبان سے نکل پڑا ..... "یہاں بکری مری پڑی ہے۔ رشید بھائی چونک پڑے ..... بکری ..... نہیں ..... نہیں ..... انسانی مردہ ہے ..... خوب اچھی طرح دیکھو ....." ہاشمی نے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا۔ ..... بیوقوف انسان ..... یہ کیا دل لگی ہے"

اب رشید بھائی نے نعش کو غور سے دیکھا ..... ابھی یہاں چند منٹ پہلے انسانی نعش تھی ..... ان کا لہجہ سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ مگر یہ کیا ؟ میں نے خود اپنے کانوں سے انسانی چیخ پکار سنی ..... اب یہ بکری پڑی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ الٰہی یہ کیا معمہ ہے ؟ ہاشمی مکرر کہہ رہے تھے ..... رہنے دو رشید، اب زیادہ بیوقوف نہ بنو ..... یہ کوئی تمہارا نیا کرشمہ نہیں ..... مگر یار ..... مذاق کر سکتے ہو ..... لیکن مذاق کو نبھانا نہیں آتا ....."

مگر میں اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکی، بدستور میری حیرانی بڑھتی ہی۔ رشید بھائی کی تقریر میں سچائی کی بو ضرور پائی جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ ایسے وقت اس قسم کا مذاق کرنا کبھی برداشت نہیں کرتے ..... ضرور کوئی راز اس واقعے میں پوشیدہ ہے انہوں نے ایسی زبردست غلطی کبھی نہیں کی ..... لیکن ایک اور خیال نے میرے دل میں شبہ کی گنجایش پیدا کی اس وقت بی فیروزہ کا پتہ نہ تھا۔ اس وقت ان کی غیر حاضری کوئی نہ کوئی بھید ضرور لیے ہوئے ہے۔

مجھے یاد ہے ..... اس نے رشید بھائی کی زبان سے چند بے ربط جملے سنے تھے ..... وہ سہمی ہوئی تھی ..... مگر ہم معاملے کی الجھن میں پھنس کر اتنے منہمک رہے تھے۔ اس کے کھڑے رہنے اور جانے کا ہمیں کوئی علم نہ ہو سکا۔

رشید بھائی کی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہو گئی تھی ..... وہ واقعات کے سمجھنے میں بے فائدہ دماغ کو لڑا رہے تھے تقریباً آدھ گھنٹہ ہم نے اسی ادھیڑبن میں صرف کیا، مگر کسی کا دماغ بھی اس گتھی کو سلجھا نہ سکا"

رشید! ہاشمی نے چلایا ..... "چلو گے بھی نہیں۔ ساری رات ..... یوں ہی اپنی بیوقوفانہ حرکات پر روتے ہوئے کاٹو گے"

رشید بھائی ..... چونکے ..... اور اپنی تھکی ہوئی ..... [illegible] کو اٹھا لیا .....

منا نے آہستہ سے سہمے ہوئے لہجے میں کہا ..... "فیروزہ کہاں ہے؟"

میرا دل دھڑکنے لگا ..... ایک زبردست خیال نے میری سکون کی دنیا کا شیرازہ بکھیر دیا .....

ہاشمی صاحب! کچھ معلوم ہے؟ فیروزہ کہاں ہے؟

ابھی یہاں تھی ..... رشید بھائی نے چاروں طرف ایک غایر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

یہیں کہیں ہو گی ..... ہاشمی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی .....

خدا جانے اتنی رات گئے ..... اس جنگل میں .....

وہ کہاں گئی ہو گی ..... ڈر بھی نہیں لگتا اسے .....

"لو وہ آرہی ہے ....." ہاشمی نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھ کر

کہا......"

"یہہ ندی پار کہیں گئی تھی؟" یکایک میرے دل میں یہہ خیال پیدا ہوا کہ کون سی ایسی ضرورت تھی جس نے اسے ندی پار جانے پر مجبور کیا......"

اب میری حیرانی کا اندازہ لگایے جوں جوں واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں ویسے ہی پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں۔

"کہاں گئی تھی...... فیروزہ"... میں نے بڑھتے ہوے جوش کے ساتھ محبت بھرے لہجے میں کہا۔

فیروزہ خاموش ہو رہی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

فیروزہ، میں نے پھر ایک بار اس کو مخاطب کیا، رشید بھائی نے پہچان میں بڑی غلطی کھائی وہ بکری کی لاش کو انسانی نعش سمجھ کر بڑے مغموم ہوے تھے۔

"ہاں فیروزہ" رشید بھائی نے بھی میری تائید کی۔

اب ہاشمی صاحب، درمیان میں ٹپک پڑے "نہیں فیروزہ، یہہ ان کی خطا نہیں بلکہ دماغی فتور ہے، جو کبھی کبھی ایسا کرنے پر مجبور کرواتا ہے" جملے کے اختتام پر ہم سب ہنس پڑے، فیروزہ نے بھی مسکرانے کی کوشش کی..... ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں تک آکر رکی، اس کے بال پریشان اور گرد آلود تھے۔

"ارے..... تو اداس کیوں ہے؟ اور تیرے ہاتھوں پر خون کیسا؟"

اس دفعہ جو گری تھی... چوٹ آگئی....

"خون.... رشید بھائی گھبرا کر بولے"

یہہ خون انسانی نہیں... میرے پیر کے زخم کا ہے فیروزہ نے اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوے کہا۔

"جھوٹی کہیں کی؟...." آگے فیروزہ نے مجھے بولنے نہیں دیا.... اس نے میرا منہ بند کر دیا.....

اب چھوڑو بھی اس قصے کو.... ہاشمی نے واقعات کی تہہ کو پہنچ کر فیروزہ کو علحدہ کرتے ہوے کہا اب ہمیں چلنا چاہیے بیلوں کے گھنگروں کی آواز قریب آرہی ہے۔

ہاں چلیں۔ رشید بھائی نے بھی اپنا ارادہ ظاہر کیا، گاڑی آنے تک ہمیں راستے پر پہنچ جانا چاہیے، میں اور ہاشمی آگے نکل گئے.... ہمارے قدم ساتھ اٹھ رہے تھے۔

"فیروزہ کچھ اداس ہے" ہاشمی بولے.....

اس اداسی کا بھی ایک راز ہے، میں نے مدھم لہجے میں کہا...... آپ نہیں سمجھتے۔

"یہی کہ رشید سے محبت کرتی ہے وہ...... ہاشمی نے جواب دیا...."

اور رشید بھائی بھی فیروزہ کو چاہتے ہیں.....

"بڑے خوش نصیب ہیں یہہ لوگ..." ہاشمی ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔

خدا کے لیے ایسی ٹھنڈی سانس نہ بھریے... پہلے ہی سے فضا میں خنکی پھیلی ہوئی ہے۔

"لیکن یہہ... یہہ خنکی ہمارے دلوں کو گرمائے گی؟"

رات زیادہ بھیگ چکی تھی..... اور منور چاند دوسری دنیا کو روشن کرنے کے لیے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا لیکن شریر ستارے ہنوز آسمانی گود میں اٹکھیلیاں کر رہے تھے.....

دور سے آنے والی گھنگروں کی آواز خاموش فضاوں میں نغمہ ریز تھی۔

"یہہ کوکو کی آواز کتنی دل کش ہے" میں ریت پر بیٹھ گئی۔

"یہہ غمگین نغمے اپنے پیتم کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں"

"مگر اس کا پیتم....."

"وہ بچھڑ گیا......."

"اور یہہ پی کہاں کی صدائیں..... بھی دل کو تڑپا رہی ہیں"

"نہیں پیاری......"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہماری پی تو بس ہے..."

"ہاشمی کے اس برجستہ جملے پر میں شرما گئی..... اب اٹھو پریم کے تاروں کو نہ چھیڑو" وہ ہمارا مختصر سا گروہ بھی آن پہنچا۔

بیل گاڑی میں ایک ایک کر کے ہم سب سوار ہوئے ہاشمی صاحب اور رشید بھائی دونوں گاڑی کے پیچھے پیدل چل رہے تھے۔ وہ کسی دلچسپ موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔

رات کا آخری حصہ بڑا دلچسپ اور سہانا تھا۔

لیکن ہم اس سنہرے موقع سے کوئی کیف و حظ نہ اٹھا سکے ہم میں سے ہر ایک کا دل اداس اور مغموم تھا، بیل گاڑی کی اس مختصر سی دنیا پر جس پر کبھی عیش و مسرت کے بادل چھائے ہوئے تھے، اب بلکل اداسی و خاموشی چھائی ہوئی تھی دلہن اونگھ رہی تھی، فیروزہ الگ نیچے پیر لٹکائے جنگل کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی......اور میں شاید.....

اس وقت ہمارا بڈھا بنڈی بان چند بے ترتیب نغمے گا رہا تھا، اس کی تھرائی ہوئی آواز سے سارا جنگل گونج اٹھا۔

سورج نکلنے سے پہلے ہماری گاڑیاں فریدپور کے زمیندار صاحب کی عالیشان ڈیوڑھی پر پہنچیں۔

ہم سب تھکان سے چور تھے سستانے کے لیے الگ الگ کمروں میں داخل ہوئے۔ رات کے واقعات نے مجھے سونے نہ دیا۔ بستر پر لیٹے لیٹے نیند کو بلانے لگی....

دفعتاً میرے کمرے کا دروازہ کھلا، اور ہاشمی صاحب اندر گھس آئے اور کچھ کھوئے ہوئے سے تھے "پھر تم نے کچھ سنا۔

"میں سنبھل کر بیٹھی......اور کہا.....نہیں"

"صبح ندی کے کنارے لوگوں کو ایک بہتی ہوئی نعش ملی۔ اس کی گردن کے دائیں بازو پر گولی کا گہرا زخم تھا، پھر اسی ندی کے دوسرے کنارے.....مری ہوئی بکری... سنا یہ فیروزہ کا ایثار تھا......جو اس نے اپنے محبوب کے لیے کیا......"

یکایک میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے

"آہ رشید کتنا خوش نصیب ہے۔" ہاشمی نے کچھ متاثر ہو کر کہا "میں اسے مبارکباد دوں گا۔ ابھی اسی حالت میں.....

ابھی نہیں پیارے ہاشمی، اس خبر کو سن کر وہ مغموم ہوں گے، ابھی اس راز کو ہمارے سینے میں محفوظ رہنے دو.....ہم اس سے زیادہ ایثار کریں گے!".....میری آواز میں رقت طاری ہو گئی.....

ہاں کیوں نہیں، جب کہ ہمارے دل ایک دوسرے کی شراب محبت سے مخمور ہیں، ہاشمی چلا گئے......اور میں تکیے سے لپٹ کر اتنا روئی کہ اس کا ایک کونہ آنسوؤں میں تر ہو گیا، اسی حالت میں میری آنکھ لگ گئی۔ فیروزہ نے دفعتہً بیدار کیا.....اری، تو سو رہی ہے، کچھ خبر بھی ہے، باہر کی حالت کی، میں گھبرا گئی......واللہ کچھ نہیں معلوم... بتاؤ نا... خود جا کر دیکھ لو...." ہاشمی صاحب کا پیر بچھو کے کاٹے سے کتنا سوجھ گیا ہے"

بدحواس ہو کر میں اٹھی.....اور جوتا پہنے بغیر بے تحاشا دوڑی.....راستے میں دروازے کی چوکھٹ سے مدبھیڑ ہوئی ......فیروزہ میرے پیچھے پیچھے تھی۔

یہاں برآمدے میں آ کر کیا دیکھتی کہ رشید بھائی، اور ہاشمی صاحب تاش کھیلنے میں محو ہیں۔

میں جھجک کر لوٹنا چاہی.... لیکن شریر فیروزہ نے دوڑ کر میری کلائی تھام لی، اور ہاشمی صاحب سے اس طرح کہنے لگی۔ ....لیجیے جناب! یہ آپ کے پیر کے سوجھ آنے سے گھبرا کر اس طرح ننگے پاؤں دوڑ آئی ہیں۔ اور اس گھبراہٹ میں انہوں نے ایک زخم مول لیا ہے، اللہ رے محبت! کیوں نہ ہو اتنا ایثار تو ضرور ہونا چاہیے۔

لیکن یہ ایثار تو میں نے ان سے سیکھا ہے، میں ان کی ممنون ہوں۔

فیروزہ نے میری کلائی کی گرفت ڈھیلی کر دی.....

اور میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔

صابر کوسگومی

فسردگی

اے ہم نشیں تو پوچھتا ہے کس لیے ملول ہوں
میری فسردہ زندگی کا حال آہ کیا کہوں
یہ الجھنوں کی زندگی یہ زندگی کی الجھنیں
توہمات کی سیاہ بدلیوں کی ظلمتیں
یہ عارضِ حیات پر اداس اداس زردیاں
اداس اداس زردیوں میں حسرتوں کا آشیاں
یہ بندگی کی بندشوں میں مفلسی کا پیچ و تاب
کہ جیسے بادلوں کی تیرگی میں زرد آفتاب
ہجوم ہو گواری شباب کی سیاہیاں
جبینِ آرزو کی تابناکیوں ہیں پرفشاں
کوئی جہاں نہیں جہاں نظر سے ہوں گی نہاں
یہ مضمحل، ضعیف، ناتوان نوجوانیاں
تبسموں کی لاش آنسوؤں کے دوش پر رواں
جھلو رہی ہیں جس کو حسرتوں کی بجلیاں
سکون زندگی پتہ نہیں کہ حسرت جلوہ دید
جمود بے حسی کا سانس لے رہا ہے تیز تیز
بہار زندگی ہے بے زری کی شام میں حزیں
مگر خدا کی رحمتوں کا دل پسیجتا نہیں
اے کاش یہ غلامیوں کی سخت سخت بندیاں
مری جوان شورشوں کی آگ سے پگھل سکیں

ساجدہ عثمانیہ

غزل

نگاہوں سے تسکیں دیے جا رہے ہیں
وہ ایفائے وعدہ کیے جا رہے ہیں
وہ پابند الفت کیے جا رہے ہیں
قسم اپنے سر کی دیے جا رہے ہیں
اس امید پر ہے یہ پرسش سے بالا
گناہِ محبت کیے جا رہے ہیں
ابھی اور ادھر مست نظروں کا صدقہ
ابھی پینے والے پیے جا رہے ہیں
جسے اپنی محفل میں تو نے نہ پوچھا
وہ بارِ تمنا لیے جا رہے ہیں
گلستاں کی سوجھی ہے شاید جنوں کو
جو کانٹوں سے دامن لیے جا رہے ہیں
تو ہے صاحبِ میکدہ پھر بھی ساقی
ترے مست اور بے پیے جا رہے ہیں
میرے زخمِ دل کو سکوں مل رہا ہے
نگاہوں سے نشتر دیے جا رہے ہیں
نہ معلوم رازِ فنا کب کھلے گا
اسی آرزو میں جیے جا رہے ہیں
نظر آیا نقشِ قدم کس کا صابر
جو سجدوں پہ سجدے کیے جا رہے ہیں

صابر القادری

مضمون نگار، مشتہرین اور دوسرے تمام حضرات
جواب طلب کرنے کی صورت میں ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ
ضرور روانہ کریں ورنہ جواب دینے میں دفتر کو تامل ہوگا۔
منیجر

ہندستانی ادب کے خریداروں سے
پتہ تبدیل ہونے کی صورت میں مہربانی فرما کر
اپنے نئے پتے سے ہمیں ضرور مطلع کر دیجئے۔
منیجر

"ماری زیادۃ مّی"

ماری زیادۃ ۲ر اپریل ۱۸۹۵ء کو نظارت میں پیدا ہوئی۔ اس کی ماں فلسطین کی رہنے والی تھی اور باپ کا وطن لبنان تھا۔ ماری زیادۃ نے نظارت عنطورہ اور بیروت کے مختلف کیتھولک مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی جب جوان ہوئی تو اپنے خاندان کے ساتھ مصر چلی گئی اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی مصر میں اس کو بہت سی تعلیمی سہولتیں حاصل ہوئیں۔ وہ قدرتی طور پر بہت ذہین اور تیز طبع تھی۔ تھوڑی مدت میں اس نے جرمن، فرانسیسی لاطینی، اسپینی اور جدید یونانی زبانیں سیکھیں اور ان زبانوں میں لکھنے پڑھنے کی قابل تعریف مہارت اور استعداد پیدا کی۔ ماری زیادۃ کا باپ الیاس زیادۃ (جس نے ۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وفات پائی) اخبار المحروسہ کا ایڈیٹر تھا۔ اس تقریب سے ماری کو مختلف مکاتیب خیال کے اہل علم سے ملاقات کرنے کا خوب موقع ملا۔ اخبار کے صفحات سے اس کی علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ ایک عرصے تک وہ اپنے مضامین اور نظمیں اسی اخبار میں شایع کراتی رہی۔ چونکہ ماری کی مادری زبان ہونے کے لحاظ سے عربی تحریر پر بڑی قدرت حاصل تھی اس لیے بہت جلد چمک گئی اور قدیم و جدید دونوں دبستان کے لوگ اس کی تحریر کو پسند کرنے لگے اور یہ خصوصیت شاید بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے کہ پرانے اور نئے خیال کے لوگ کسی تحریر کو یکساں پسند کرتے ہوں۔

ماری زیادۃ کا شمار بڑے بڑے لوگوں میں ہوتا ہے زمانہ حال کا ایک بڑا انشاپرداز میکائیل نعیمہ لکھتا ہے۔

"جب ماری زیادۃ ہمارے سامنے کوئی نظم پیش کرتی ہے تو اس کو پڑھ کر ہم مسرت محسوس کرتے ہیں اور جب وہ اپنے تنقیدی مباحث سے ہم کو حیرت میں ڈالتی ہے تو ہم بے اختیار اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جب وہ کوئی ناول ہمارے لیے ترجمہ کرتی ہے تو ہم اس کو پڑھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے اور جب زندگی کے نصب العین پر اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کرتی ہے تو ہم اس کے ساتھ بڑے بڑے پرشکوہ اور پر رعب الفاظ کی گھاٹیوں میں گھومنے لگتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ خاموش رہیں یا چیخ ماریں (الغربال صفحہ ۱۷۶) مطبوعہ العصریہ مصر پریس مصر۔

جدید عربی ادب میں ماری زیادۃ کا شمار چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے وہ نظم و نثر میں یکساں قدرت رکھتی ہے۔ متعدد یوروپین زبانوں کے استعداد و مطالعے نے اس کی تحریر و خیالات میں بہت بلندی اور خاص شان پیدا کر دی ہے۔ اس کی تحریر میں انگریزی تناسب اور مزاح، جرمن تحقیق و صحت، فرانسیسی لطافت و خوش طبعی اور لاطینی جذبہ و جوش انتہائی حد تک پایا جاتا ہے۔ عربی زبان کی لچک اور گہرائی نے ان عناصر میں مل کر ایک ناقابل بیان اپج اور جدت پیدا کر دی ہے۔

شاعری میں وہ ایک خاص دبستان کی موجد ہے اور اس کی طرز و اسلوب کو اس قدر پسند کیا گیا ہے کہ مصر، عراق اور شام میں شعرا اس کی پیروی کرنے لگے ہیں عہد حاضر کے بڑے بڑے ادیب و شاعر اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اس کی عربی نظموں کا سب سے زیادہ مقبول مجموعہ ظلمات اشعۃ ہے۔

مصر کے دو فصیح البیان مقرر مشہور ہیں۔ ایک ماری زیادۃ اور دوسرے محمد توفیق دیاب کہا جاتا ہے کہ محمد توفیق نے تقریر کی قوت مشق سے بہم پہنچائی ہے۔ لیکن ماری زیادۃ کی لسانی قوت فطری ہے۔ جن بڑے بڑے یورپین مستشرقین کو ماری زیادۃ کی تقاریر سننے کا موقع ملا ہے انہوں نے علانیہ اس کا اقرار کیا کہ انہوں نے اس قدر فصیح و بلیغ تقریر نہیں سنی۔

ماری زیادۃ کی تصانیف کی مقدار کثیر ہے۔ یہ لکھتا تبعت

ادب، تنقید، سوانح، شاعری، مختلف مضامین اور ناول پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں اس کی مشہور تصانیف درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ غایت الحیات۔ یہہ کتاب ۱۹۱۲ء میں المقتطف و المقطم پریس میں چھپ گئی ہے۔

۲۔ کلمات و الاشارات مطبوعہ الہلال پریس ۱۹۲۲ء۔

۳۔ المساوات مطبوعہ الہلال پریس۔ امیر شکیب ارسلان نے اس کتاب پر مجلۃ المجمع العلم العربی میں تفصیلی ریویو لکھا ہے

۴۔ الصحایف مطبوعہ سلفیہ پریس۔

۵۔ بین الجزر و المد مطبوعہ الہلال پریس مصر۔

۶۔ وردہ الیازجی (دختر ناصف یازجی کی سوانح حیات) یہہ کتاب پہلے رسالے المقتطف میں بالاقساط شایع ہوئی۔

۷۔ سوانح فنات مطبوعہ الہلال پریس (موضوع نام سے ظاہر ہے)۔

۸۔ ظلمات و اشعہ۔ نظموں کا ترجمہ۔ مطبوعہ الہلال پریس

۹۔ الرسایل۔

۱۰۔ رجع الموج۔ مشہور فرانسیسی ناول نگار براوا کے ایک ناول کا ترجمہ۔

۱۱۔ رطب فی العذاب دو حصے۔ کانن ڈائیل کے انگریزی ناول ای فیوجی کا ترجمہ۔

۱۲۔ ابتسامات والدمع میکس مولر کی جرمن تصنیف کا ترجمہ۔

یہہ سب کتابیں عربی زبان میں ہیں، فرانسیسی اور انگریزی زبان میں بھی اس کی تصانیف پائی جاتی ہیں۔ مثلاً شیڈو آف مری راک انگریزی میں اور فلیور دی ریو، فرانسیسی میں یہہ کتاب اس کی فرانسیسی نظموں کا مجموعہ ہے جو "ای سس کوپیا" کے فرضی نام سے شایع ہوا ہے۔

مستقل تصانیف و تالیفات و ترجمات کے علاوہ ماری زیادہ کے بہ کثرت مضامین جرمن فرانسیسی اور عربی معیاری رسایل میں بھی شایع ہوئے ہیں۔ رسالہ الہلال نے حال میں ماری زیادہ کی سوانح حیات میں یہہ ایک مقالہ شایع کیا ہے اور اس نے ماری کی تصویر بھی دی ہے۔ **محمد سردار علی**

غزل

ہر نقش جو ابھرا ہے مٹانے کے لیے ہے
ہر شمع جو روشن ہے بجھانے کے لیے ہے

خمخانۂ عالم ہے طلسمات کی اک جا
ہر دور یہاں ہوش میں لانے کے لیے ہے

ہم وضع کے پابند ہیں کیا ہم کو سروکار
نیرنگ زمانے کا زمانے کے لیے ہے

ان کی نگہ غیض کی تشہیر سے حاصل
کیا زخم جگر سب کو دکھانے کے لیے ہے

اس منزل ہستی میں ہے کیا دم کا بھروسہ
ہر سانس جو آتی ہے وہ جانے کے لیے ہے

کیوں دل میں جگہ دیتے ہو کینے کو حسد کو
یہہ شیشہ تو آئینہ بنانے کے لیے ہے

شہزادہ والا کی غزل دیکھی ہے رہبر
ہر شعر سراسیمہ بنانے کے لیے ہے

حکیم ست گرو پرشاد رہبر

فریبِ خیال

آدھی رات کا وقت ہے۔ دنیا ایک تھکے ہارے مزدور کی طرح گہری نیند کے آغوش میں ہے میں اپنے کمرے کی تنہائیوں میں میز پر سر جھکائے اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا ہوں۔ مختلف خیالات میرے دماغ میں آرہے ہیں۔ اور میں ان سے اسی طرح جی بہلا رہا ہوں جس طرح بچہ اپنے اردگرد کے مختلف کھلونوں سے۔ راہگیر کی کنکھار۔ پولیس والے کی سیٹی اور شرابی کی بہکی ہوئی آواز میرے خیالات کے سمندر میں کوئی ہلچل پیدا نہیں کرتی۔ میں دنیائے تخیل کی سیر کرتے ہوئے اس جگہ پہنچ جاتا ہوں جہاں ایک مزدور خود اپنے آپ کو روپیوں کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا پاتا ہے اور جہاں ایک بھوکا فقیر لذیذ کھانوں سے لطف اندوز ہوتا ہے ......یعنی میں سو جاتا ہوں۔

صبح کا وقت ہے۔ دنیا کے زرین لباس کی چمک لمحہ لمحہ تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ میں اپنے چچا کے مکان میں بستر پر لیٹا ہوا ایک کتاب پڑھنے میں مشغول ہوں۔ چچی باورچی خانے میں میرے لیے ناشتہ تیار کروا رہی ہیں۔ مجھے بالاگھاٹ سے آئے ہوئے صرف ایک دن ہوا ہے۔ کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں۔ ہر طرف خاموشی ہے .... قدموں کی آواز...... کوئی کمرے میں داخل ہوتا ہے میں بدستور کتاب پڑھنے میں مشغول ہوں...... ایک لمحہ خاموشی ......"بھیا"...... دنیا کے بہترین ساز کو کسی نے چھیڑ دیا اور فضا نغموں سے بھر گئی...... میں چونک پڑتا ہوں...... "یہ کون ہے"؟ میرا دل سوال کرتا ہے۔ شاید میرے چچا کی لڑکی ہے۔ بھیا...... یہ سوال کردو گے؟ میں اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی نظریں کاپی پر اور میں اس کے چہرے کی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

وہ میری طرف دیکھتی ہے...... معصوم سوالیہ نظر سے ......میں بستر سے اٹھتا ہوں اور کاپی لے کر میز پر رکھ دیتا ہوں وہ مجھ سے کچھ دور ہٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور انگلی کے اشارے سے سوال بتاتی ہے۔ میری نظریں کاپی پر ہیں لیکن دماغ کسی اور ہی جگہ ہوتا ہے۔ میں کاپی پر سے نظریں اٹھاتا ہوں۔ اس کی اور میری نظریں چار ہوتی ہیں اور ......ایک مبہم افسانے کی تمہید کے بعد...... وہ فوراً نیچی نظریں کر لیتی ہے۔ "سوال مجھ سے نہیں بنتا۔ اور وہ "استانی جی سے حل کروالوں گی" کہہ کر چلی جاتی ہے۔ کتاب ایک طرف پڑی ہے۔ میرا دماغ اس ستار کے مانند ہو جاتا ہے جس پر ابھی ابھی کوئی گیت بجایا گیا ہو جس کے تار جھنجھنا رہے ہوں۔

دوسرے دن میں چچی کے پاس بیٹھا ہوں چچی مجھ سے امتحان وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ زاہدہ آتی ہے اور ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑی ہو جاتی ہے اس کی نظریں نیچی ہیں لیکن کبھی کبھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتی ہے اور ایک حیا آمیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقص کرنے لگتی ہے۔ چچی اسے دیکھ لیتی ہیں اور کہتی ہیں۔ "ارے تو تو بڑی شرمیلی بن رہی ہے۔ بڑے بھائی سے پردہ کرتی ہے کیا؟ تیری اور اس کی کوئی شادی تھوڑے ہی ہونے والی ہے جو تجھے یہاں بیٹھنے میں اس قدر شرم آرہی ہے۔ چل یہاں بیٹھ۔" میرے دماغ میں ناگہاں ایک تیر سا آلگتا ہے۔ ابھی دنیا کی تخلیق نہ ہوئی تھی کہ قیامت آگئی۔ خوابوں کا محل برباد ہو گیا۔ چچی مجھ سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ "کل مجھ سے سوال پوچھ رہی تھی۔ میں کیا جانوں یہ سوال دوال۔ میں نے کہہ دیا کہ جا کمرے میں بھائی بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لے، تمہارے پاس آئی تھی کیا؟" میں کوئی جواب نہیں دیتا۔ زاہدہ چلی جاتی ہے۔

ایک ہفتہ بعد۔ وہ اب مجھ سے ملنے میں جھجک محسوس

نہیں کرتی۔ جب میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو مسکرا دیتی ہے اس کو شاید اپنی مسکراہٹ کے اثر کا کوئی احساس نہیں ہے میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ دیکھے جاوں ..... دیکھے جاوں یہاں تک کہ اسے دیکھنے کا احساس مٹ جائے۔ مجھ سے گھنٹوں میٹھی باتیں کرتی رہتی ہے۔ اپنی پڑھائی کا حال بتاتی ہے میں بھی کالج کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہوں جب وہ میرے پاس نہیں ہوتی تو میرے دل کی عجیب حالت ہوتی ہے۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اسے حاصل نہیں کر سکتا.... ایک معصوم اور پاک محبت ..... کسی رشتے کی خواہش کیے بغیر۔

چچی کا مکان چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند گھنٹے گذرے ہیں..... بھائی جان کا تار آتا ہے "ابا سخت بیمار ہیں۔ جلد چلے آؤ"۔ یہ تار میرے لیے موت کا پیغام ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے مجھے گرم کمرے سے باہر نکال کر سرد ہواوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پھینک دیا۔ ساری دنیا پر اداسی چھا جاتی ہے۔ زاہدہ بھی اداس ہو جاتی ہے۔

میرا سامان بندھ چکا ہے اور میں روانہ ہونے والا ہوں۔ وہ آتی ہے مجھ سے رخصت ہونے کے لیے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور صرف یہ منہ سے نکلتا ہے، "بھول نہ جانا" وہ چلی جاتی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور میں تانگے میں سوار ہو کر اسٹیشن کا رخ کرتا ہوں راستے بھر میرے کانوں میں یہ آواز گونجتی رہی بھول نہ جانا، بھول نہ جانا! میرے دل و دماغ میں ایک آگ سلگی ہوئی ہے۔ جو بجھانے کی کوشش کے باوجود نہیں بجھتی اف! میری زندگی کا بہترین دور کس قدر جلد گذر گیا .. یکایک تانگہ کو زور سے دھکا لگتا ہے.....اور میں جاگ جاتا ہوں۔ پھر وہی خاموشی وہی تاریکی اور میرے میز جس پر چند کتابیں ادھر ادھر پڑی ہیں کی گھڑی دو بجا رہی ہے۔ کوئی گا رہا ہے.... سپنوں میں پی درس دکھائے....

میں نے آج صبح ہی ناگپور جانے کے لیے پروگرام مرتب کیا ہے۔ اف! میرے تخیل نے مجھے کس جگہ پہنچا دیا۔ آہ! کتنی حسین اور عجیب شے ہے۔ وہ دنیا جس کو سنسار سپنوں کی بستی، کہتا ہے۔ **جلیل رومی**

دیدار دوست

کیا یہ ہی اس کی آمد تھی — مگر میں تو مشتاق نگاہوں سے ایک شاندار منظر دیکھنے کی منتظر تھی — اس عظیم المرتبت دیوتا کا شان نزول نہ پوچھیے — سنہری نور کی بارشوں میں — تمام ملکوتی قید و بند توڑ کر — ہاں تار قفس ہٹا کر اپنے آستانہ نیاز کی جبیں سائی کا شرف بخشنے کو آیا ہے —

دلنواز مجبوبہ دیدار دوست کی بے پناہ آرزوں کی تشنہ کامیوں سے بیقرار — خوفناک خوابوں کے بھنور میں غوطے کھا رہی ہے — بے پایان آرزوئیں تشنہ تعبیر تھیں — آہ وہ اپنے مالک کے ہاں اپنے دیوتا کے دیدار مطلع انوار کا جلوہ — اور اس کا غضبناک جلال دیکھنے کی تمنا رکھتی تھی — نادان لڑکی!—

دیوتا جلال میں آ کر اپنی آتش غضب سے اس پیکر نسائیت حسین کنول کو پامال کر دیتا

آہ اس حسین نوجوان کی دنیا — اس پر اسرار جزیرے میں...

اس مقدس سرزمین کو میں نے پا لیا۔ ہاں اب سراپا حیرت بنی اپنی فتحمندی پر شگفتہ کلی کی مانند میں کھل گئی ہوں — اسکے آستانہ نیاز کی جبیں سائی کے لیے میری مہک غراجی — باد نسیم کو شرما رہی ہے۔

محبت کی پر اسرار کشش والہانہ انداز سے میری رہنمائی کر رہی ہے — جہاں اور بھی کئی دوشیزائیں شان عبودیت کی پرستاری میں اپنی معصومانہ دل کشی اور اق سے مصروف ہیں۔ پاک فرشتے عقیدت کے حسین پھولوں کی بارش ہو نم کر رہے ہیں — اور — اور طائران فردوس نئے نئے بازوں کو کھولے — سفید براق جیسے پروں سے — سایہ کیے ہوئے ہیں۔ **جمیلہ بیگم (کلکتہ)**

سائنس

نر اور مادہ کی پہچان | سائنس کی ترقی لامحدود ہے۔ آئے دن ایک نت نیا انکشاف ہوتا ہی جاتا ہے۔ پہلے یہہ خیال تھا کہ جاندار کو پیدا کرنا آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہہ دنیائے سائنس نے انکیوبیٹر نامی آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعے ۲۱ دن کی محنت ۱۲ گھنٹوں میں تبدیل ہو گئی اور لاکھوں مرغی کے بچے پیدا کیے جا رہے ہیں۔

کیمبرج کے سائنس دانوں نے اسی سلسلے کی ایک اور کڑی معلوم کر لی ہے یعنی مرغی کے بچے جب تک جوان نہ ہو جائیں ان میں نر مادے کا فرق پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اب سائنس کے طفیل بچہ پیدا ہوتے ہی اس فرق کو معلوم کر لیا جا سکتا ہے۔ نر اور مادے کے جسم پر خاص خاص علامتیں ہوتی ہیں اور یہہ علامتیں انڈے سینے کے دوران میں برقی کے ایک خاص طریق عمل سے پیدا کی جاتی ہیں۔ تجربہ نہایت کامیاب رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہہ ہے کہ مرغی کے چھوٹے بچے بھی نر اور مادے کی گیارنٹی کے ساتھ بیچے جا سکتے ہیں۔

فلمی خبریں

مشہور سینما اسٹار نازی بن گیا | مورس شوالیے فرانسیسی مشہور آفاق فلم اسٹار کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کا رجحان نازیت کی طرف بہت زیادہ ہے چنانچہ اس خصوص میں اس نے فرانسیسی اخباروں اور ریڈیو پر بہت کچھ پروپگنڈا کیا ہے۔ اس کے اس بڑھتے میلان کو دیکھ کر ویشی کا اخبار کاندیدے ظاہر کرتا ہے کہ بہت ممکن ہے قریب میں وہ جرمنی چلا جائے تاکہ وہاں کے ہر شہر میں گا کر لوگوں کے دل کو لبھائے۔ ان مقامات میں سے ایک مقام وہ بھی ہوگا جہاں ۱۹۱۶ء میں وہ خود قیدی کی حیثیت سے تھا۔

ایجادات

پتھر چننے والی مشین | امریکہ میں ایک مشین ایجاد ہوئی ہے جو ناگر کے ساتھ لگا دینے سے بڑے بڑے تک پتھر چن لیتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بارہ ٹن کا پتھر تک آسانی سے اٹھا لیتی ہے۔ اس ایجاد سے وہ ممالک زیادہ مستفید ہو سکیں گے جہاں کی زمینات زیادہ تر پتھریلی ہیں۔

دلچسپیاں



استرا حرام کلب | سان فرانسسکو میں ایک نیا کلب قایم کیا گیا ہے جس کے ارکان نے قسم کھائی ہے کہ جب تک جاپان کو شکست نہ دیدی جائے گی اس وقت تک داڑھی کو استرا لگانا حرام ہے۔

خوش گپی | نیویارک کی خبر ہے کہ جاپانی زبردست مقداروں میں جو ہتھیار استعمال کر رہے ہیں وہ جرمنی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے یہہ خبر نیویارک کی خود ساختہ ہو۔

ستاون سالہ طالب علم | آج سے تینتالیس سال قبل اے لیوس نامی ایک یتیم لڑکا جس کی ماں کو چودہ بچے تھے بحیثیت پیام رساں کے ایک وکیل کے دفتر میں داخل ہوا۔ آج ستاون سال کی عمر میں بحیثیت و ڈوروڈاسکس ایک کامیاب سالیسٹر کے اس نے اپنی عمر کی واحد آرزو کی تکمیل بھی کر لی۔ یعنی یہہ کہ اس نے لندن یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کر لیا ہے۔

مسٹر لیوس کے تین بچے ہیں جن میں سے ایک سالیسٹر دوسرا اندرس اور ایک لڑکا کالج میں زیر تعلیم ہے۔ مسٹر لیوس

اب لاطینی فرانسیسی انگریزی اور تاریخ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ربر کے حلقوں والی مچھلیاں حال ہی میں بہ مقام سڈنی واقع آسٹریلیا گار فش نامی مچھلیاں پکڑی گئیں۔ جن کے جسم کے اطراف ربر کے حلقے تھے۔ ڈاکٹر ناسن صدر سمکیات نے بیان کیا کہ آسٹریلیا اور دنیا کے دیگر حصوں میں چکدار حلقوں والی مچھلیاں پکڑی گئی ہیں۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ یہہ حلقے مچھلی کو کس نے پہنا دیے۔ یہہ خیال کہ چھوٹی مچھلیاں جو قابل استعمال نہ سمجھی گئیں انہیں ماہی گیر بچوں نے یہہ حلقے پہنا کر چھوڑ دیا ہوگا جو بعد میں پکڑی گئی ہیں۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا غرض یہہ ایک معمہ ہو گیا ہے۔

مہلک لبھاو۔ سرکاری محکمہ سمکیات کے مہتمم نے مہلک لبھاو کا نظریہ پیش کیا ہے کہ مچھلیاں ان حلقوں کو پہننے کا ایک میلان رکھتی ہیں جس کا تجزیہ ناممکن ہے۔

گار فش مچھلی معلوم کیا گیا ہے کہ حلقے کو پہن لینے کی عجیب عادت رکھتی ہے۔ اور حلقے جو ان مچھلیوں پر پائے گئے وہ پارسل والے حلقوں کے مماثل تھے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ حلقے شاید سمندر میں پھینک دیے گئے اور مچھلیوں نے معلوم نہیں کیوں ان کو پہن لیا ہے۔ ایسی ہی مچھلیاں سابق میں بھی پکڑی گئی ہیں۔ اگر آپ پانی میں ربر کے حلقے پھینک دیں اور وہاں نزدیک گار فش مچھلیاں ہوں تو یہہ بالکل یقینی ہے کہ ان حلقوں میں گھس کر ان کو پہن لیں گی۔

معلومات

لوہے کی اہمیت ہائیڈ پارک، گرین پارک، سینٹ جیمس پارک کے حصار کے آہنی جنگلوں (کٹہڑوں) سے وہاں اور توپیں بنانے کے لیے لوہا حاصل کر لیا گیا ہے۔ ہائیڈ پارک کے حصار کا دور ۳ میل تھا جس کو پگھلانے کے لیے نکال لیا گیا ہے۔ اب گرین پارک کا حصار اکھڑ رہا ہے۔ اس کے بعد سینٹ جیمس کی باری ہے۔

موسیقار درخت گوالیار میں ہندستان کے زبردست مغنی تانسین کی قبر پر ایک درخت ہے جو کافی بلند ہے اور پھیلا ہوا بھی جس کے متعلق یہہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہہ درخت اسی بیج کا ہے جو ایک مرتبہ تانسین کے ہاتھ میں آیا تھا۔ بیج محفوظ تھا۔ چنانچہ تانسین کے مرنے کے بعد اس بیج کو قبر کے سرہانے بو دیا گیا۔ تانسین کی برسی کے موقع پر ہر سال ہزاروں گویے یہاں آتے اور عقیدت کے طور پر اس درخت کے پتے کھاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ان پتوں کے کھانے سے گویوں کی آواز صاف اور گانا بہتر ہو جاتا ہے۔

دنیا میں کم سے کم ٹیکس یورپ کے مشہور سلسلہ کوہ پیرینیز میں انڈورا نامی جمہوریت ہے۔ یہہ علاقہ اسپین اور فرانس کی سرحدوں کے درمیان ہے۔ اس خود مختار سلطنت کا رقبہ ۱۹۱ مربع میل اور آبادی ۵۲۳۰ ہے۔ پیداوار زیادہ تر جوار اور انگور ہے۔ جانور وغیرہ بھی کثرت سے پالے جاتے ہیں۔ بعض معدنیات بھی پائی جاتی ہیں۔ اس جمہوریت کو فرانس کی سرپرستی حاصل ہے۔

ٹیکس فی مکان ایک روپیہ سالانہ کے مساوی ہے اور یہہ دنیا میں سب سے کم ٹیکس ہے۔

آدمی کی پہچان جس کی آنکھیں زیادہ سرخ ہوں تو سمجھو کہ وہ سنگدل اور چڑچڑا ہوگا۔

پلکیں گری ہوئی ہوں تو سمجھ لینا کہ شاعر اور گویا ہے۔

جس کسی کے کان اور آنکھیں چھوٹی ہوں تو ایسا آدمی ناقابل اعتبار ہوتا ہے جس کی آنکھیں نیلگوں ہوں تو وہ زنانہ حسن کا زیادہ دلدادہ ہوگا۔

جس عورت کے ناخن مثلث نما ہوں تو ایسی عورت اپنا راز چھپا نہیں رکھ سکتی اور اس پر بھروسہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۸۴)
رجسٹرڈ برطانیہ (۳۳۴)
چندہ سالانہ (للعہ)

ہندستانی ادب

ایڈیٹر۔ غلام محمد خاں ایم اے (عثمانیہ)

قیمت ایک پرچہ ۶

جلد (۲) | تیر ۱۳۵۱ ف | مئی ۱۹۴۲ء | نمبر (۸)

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

ہر شخص بخیال خویش خبطے دارد

خورداد کے پرچے کی گنجایش ختم ہو چکی تھی جس وقت مارچ کا "معارف" ہمیں ملا ہے۔ اگر کسی طرح گنجایش نکل آتی تو یہ جواب اسی وقت دیدیا جاتا۔

معارف کے نقاد نے ہمارے "نیا سال نمبر" پر تنقید کرتے ہوے لکھا ہے:

"اردو زبان کی خدمت کے دعوی کے ساتھ انجمن ترقی اردو کی مخالفت سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی مسلہ میں سنجیدگی کیساتھ اختلاف کی بنا پر ایک مفید کام کرنے والے ادارہ کو بدنام کرنا کونسی ادبی خدمت ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب اور انجمن ترقی اردو کے خدمات اتنے ظاہر اور مسلم ہیں کہ ان مخالفتوں سے خود اپنے وقار کو گھٹانے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں"

نقاد کا یہ کہنا کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ ہمیں اردو زبان کی خدمت کا دعوی ہے۔ ہم نے آجتک اس قسم کا کوئی [illegible] ہمارا یہ کوشش رہی ہے کہ ہندستانی زبان کا [illegible] دلائیں اور اسی زبان کی ترقی [illegible] اور بات ہے کہ ہم جس کو ہندستانی [illegible] ہوں اگر یہ واقعہ ہے تو ہم اس [illegible] ان کی اردو اور ہماری ہندستانی میں [illegible] فرق ہے [illegible] چاہو تو معارف اور ہندستانی ادب کے مضمونوں [illegible] مضامین کے [illegible] دلانا چاہتے ہیں۔ معارف یا اس قسم [illegible] زبان کو پیش کرنے کی کوشش [illegible] سال پہلے [illegible] بھی اب زمانہ ترقی کر رہا ہے [illegible] بدل چکے ہیں۔ ماحول کچھ نیا سا ہو گیا ہے [illegible] کے خواب دیکھنا یا مولویوں [illegible] سے کم نہیں۔ بائیس کروڑ ہندوؤں میں سے [illegible] اس قسم کے دو چار آزاد خیال ہندوؤں کا یہ کہنا [illegible] قبول نہیں کہ "اردو ہندو مسلمانوں کی [illegible] ہے" اس کے برعکس آپ ہندستانی پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گاندھی جی جیسا ہندو [illegible] بات کو تسلیم [illegible] ہندستانی ہی ملک کی ملی جلی زبان ہو سکتی ہے اور انھوں نے ہندستانی کی [illegible] کہہ ہے کہ "وہ ایک ایسی زبان ہو جس کو ہندو و مسلمان آسانی سے سمجھ اور بول سکیں"

[illegible] گاندھی جی [illegible] خیالات [illegible] اس قسم کے پیش کر سکتے ہیں جو ملک کی سہل سادہ اور ملی جلی زبان کو پروان چڑھتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اس سے ایک قدم آگے بڑھیں تو [illegible] یقین دلاتے ہیں کہ ہندوؤں کا [illegible] گاندھی جی اور ان کے ساتھیو

کا ہم خیال ہے اس لحاظ سے ایسی صورت میں اردو کا پرانا راگ الاپنا انجمن ترقی اردو یا اس کے جیسے اداروں یا اردو پرستوں کے لیے مناسب نہیں۔ ہمارے ان خیالات کی روشنی میں کیا معارف کے نقاد کا اب بھی وہی خیال ہے کہ ہم اردو زبان کی خدمت کے دعویدار ہیں۔ ع۔ این خیالست و محال است و جنون است۔

ہم یہ سمجھنے سے حیران ہیں کہ نقاد نے ہماری پچھلی راے کو غیر سنجیدہ کیسے سمجھ لیا۔ اور اس اختلاف کو ذاتیات پر کیوں محمول کیا.....؟

آدمی کی یہ فطری کمزوری کا خاصہ ہے کہ جب کبھی اس کی کمزوریوں اور غیر غلط طریقوں کی طرف توجہ دلائی جاے تو وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ سب کچھ ذاتی بغض و عناد اور حسد کی بنا پر کیا جا رہا ہے، چاہے ذاتی مخاصمت اور اختلاف کی گنجایش ہو یا نہ ہو۔ ہم نقاد کو نیک مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ایسے معاملات میں اپنی قطعی راے قایم کرنے سے باز رہے جن کے متعلق اس کی معلومات ادھوری ہوں۔ یا نقاد کا یہ کہنا کہ "مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کے خدمات ظاہر اور مسلم ہیں۔ کیوں نہیں اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اگر ان کی خدمات کا جایزہ لینا ہو تو ہمارے رسالے کے پچھلے نمبروں کو پڑھ لیا جاے جس سے ظاہر ہو جائیگا کہ مولوی عبدالحق کو کیا کرنا چاہیے تھا انھوں نے کیا کیا ہے اور اب کس غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ سوائے اسکے کہ حیدرآباد کی لاکھوں روپیوں کی امداد کو خزانے میں ملا دیا اور اپنے شخصی اثرات کے تحت انجمن کے ڈکٹیٹر بن بیٹھے سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے جو جی میں آیا کر گذرے۔ خالی الذہن عوام اور انجمن کے براے نام ارکان کو سبز باغ دکھاتے رہے اور ان سے من مانے روپیہ کھسوٹا

افسوس کہ ان سب تماشوں کو دیکھنے کے لیے معارف کا نقاد حیدرآباد میں نہ تھا اگر وہ یہاں موجود ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ ہم پر کبھی ایسے ناجایز حملے کی جراٴت نہ کرتا۔ ہمارا حساب وہی ہے جیسے "گھر کا بھیدی لنکا ڈھاے" انجمن کا کچا چٹھا کھول سکتے ہیں تو ہم، انجمن کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کر سکتے ہیں تو ہم، انجمن کی سازشی کارروائیوں کو منظر عام پر لا سکتے ہیں تو ہم۔ یہاں ہم سے مراد صرف ہماری ذات نہیں بلکہ وہ تمام حیدرآبادی جو انجمن کے کرتا دھرتا کی چالبازیوں اور زیادتیوں سے واقف رہے ہوں۔ اگر معتمد انجمن کے غیر غلط کارناموں کو لکھا جاے تو کتاب کا حجم کسی عنوان "امیر حمزہ کی داستان" سے کم نہ ہوگا۔ شاید اس وقت ہمارے نقاد کی آنکھوں سے لاعلمی کا پردہ اٹھ جاے اور وہ بھی ہمارے ہم نوا ہو۔ لہٰذا ہم معتمد انجمن کے خلاف جو بھی لکھ رہے ہیں وہ ذاتی اختلاف پر مبنی نہیں بلکہ بعض عملی حقیقتوں کا انکشاف ہے جن کو منظر عام پر لانے کی پوری پوری کوشش کسی نے نہیں کی تھی۔ ابھی ہماری کوششیں جاری ہیں اور آگے چل کر ہم عوام پر معتمد انجمن کی اور بھی غلط کاریوں کو ظاہر کرینگے معارف کے نقاد نے یہ بیان کرکے کہ ان ہی مخالفتوں سے خود اپنے وقار کو گھٹانے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں اپنے وقار کو خود اپنے ہاتھوں گھٹا لیا ہے۔ عجیب مہمل اور بچکانی بات کہی ہے۔ بھلا حق بات کے کہنے سے کسی کا وقار گھٹ سکتا ہے۔ اگر نقاد کا یہ خیال ہے کہ ہمارے لگاے ہوے الزامات سب بے بنیاد ہیں اور ہم محض شخصی مخالفت پر تلے ہوے ہیں تو وہ ان الزامات کی تردید کیوں نہیں کرتا۔ مگر ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے بیان کیے ہوے واقعات میں سے ایک لفظ بھی غلط نہیں۔ پس ایسی صورت میں وقار ہمارا گھٹا یا مجذوب کی سی بڑ ہانکنے والے نقاد کا۔

اس حقیقت سے ہمیں بھی انکار نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ جھوٹ دغا اور مکر کا بول بالا ہے

ہندستانی زبان و ادب کی ابتدا اور دکن سے اس کا تعلق

ہندستانی زبان اور ادب کی ترقی کا سہرا ہمیشہ دکن کے سر رہا ہے۔ یہہ آج کی بات نہیں بلکہ اولین تاجداران آصفیہ اور سلاطین قطبیہ کے زمانے میں دکن ہندستانی کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ اگر صوفیا کرام کے انمول تصانیف پر نظر کی جاے تو معلوم ہوگا کہ دکن میں اس کی ابتدا بہمنیہ سلطنت کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔ یا یوں سمجھیے کہ ہندستانی ادب کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

ہندستانی کی ابتدا کس طرح ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے یہہ ایک معرکتہ الآرا مسلہ ہے جس کی تفصیل ہمارے مضمون سے باہر ہے مگر ہم اس پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں جس سے معلوم ہو جائیگا کہ اس کی ابتدا کے ساتھ اس کا تعلق دکن سے کس طرح پیدا ہوا۔

ہندستان میں مسلمانوں کے حملے دسویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکے تھے یوں تو مسلمان فاتح کی حیثیت سے پہلے پہل سندھ میں آے اور رہے۔ مگر صوفی اور درویش جن کو دنیاوی مال و دولت اور اعزاز و حکومت سے کوئی لگاو اور میل نہ تھا شمالی ہند اور گجرات اور سطح مرتفع دکن میں پہنچے۔ بندھیاچل اور ست پڑا کا زنجیرہ اور گوداوری جیسی ندیاں اور نالے ان کی رکاوٹ کا باعث نہ ہو سکے وہ ساری صعوبتوں کو سہتے اور تبلیغ کرتے ہوے بیدر پہنچے۔ حضرت گیسو دراز علیہ رحمتہ اللہ کی تصانیف معراج نامہ، شقین تلاوت الوجود، دار الاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ، ہشت مسائل وغیرہ ہیں) شاہ برہان الدین غریب، شمس العشاق شاہ میراں جی (شہادت الحقیقت) شاہ برہان الدین جانم (مصنف وصیت الہادی، سکھ سہیلا و دیگر مثنویات ہندی) شاہ امین الدین (اعلی محبت نامہ) یہی وہ حضرات تھے کہ جن کا فیض دکن میں پھیلا۔ اور ہر چھوٹا بڑا مرد و عورت امیر و غریب ان کے زیر سایہ رہ کر ان سے مستفید ہوتا رہا اور اس طرح دکن میں ہندستانی زبان اور مقبول ہوتی گئی۔

جب مسلمانوں کے قدم ہندستان میں جمنے لگے اور وہ پنجاب سے آگے بڑھے تو دلی کے اطراف کا میدان ان کی فوج اور سپاہیوں کی فرودگاہ بن گیا اور یہہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے پرانے آقاوں سے منہ پھیر کر نئے جانبازوں کے رہائش کا سامان مہیا کرنے لگے اور جب ان کا زور بڑھنے لگا تو ہندوراجدھانی کو نکال باہر کر کے نئے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کر دی یہہ ایک فطری چیز ہے کہ تابع سے تابع حکمران کو بھی ملک گیری اور کشور کشائی کی حرص دامن گیر رہتی ہے۔ نو وارد فاتح کس طرح ہاتھ پر ہاتھ ڈالے خاموش بیٹھتے۔ دوآبہ گنگ جمن اور بڑھتے بڑھتے وسطی ہندان کے قبضہ اقتدار میں آتا گیا اور بنگال و بہار پران کے صوبے دار پھریرا اڑانے لگے۔ دکن کی دولت کی کشش نے ان کو آرام سے بیٹھنے نہ دیا اور ملک کافور اور علاء الدین نے دکن کو روند ڈالا یہاں سے مسلمانوں کے حملے دکن پر ہونے لگے وہ اس قدر چھاتے گئے کہ آخر کار یہاں کی ہندو ریاستیں ملیامیٹ ہو گئیں۔ یہی نہیں بلکہ جب محمد تغلق کا دل دلی سے اکتا گیا تو اس نے کسی اور شہر کو اپنا مسکن بنانا چاہا۔ دکن کی سرزمین جی کو بھائی اور وہ دولت آباد کو مال و دولت اور دلی کی رونق سمیٹ لے آیا۔ ہزاروں خاندان آکر یہیں اور یہیں کے ہو رہے۔ ایک عرصہ بعد دکن میں بہمنیہ سلطنت کی بنیاد پڑی بعد کو ہونے والی پانچ ریاستوں کی داغ بیل

ڈالی گئی۔ اب تک ہندستانی زبان عوام اور بازاریوں کی بولی سمجھی جاتی تھی۔ کسی شریف کے لیے اس زبان میں لکھنا پڑھنا کسرِ شان تصور کیا جاتا تھا۔ مگر اب زبان نے کینچلی بدلی اور گولکنڈہ و احمد آباد اور بیجاپور کے شاہی تخت و تاج کے سایے میں اس کی پرورش ہونے لگی۔ بادشاہ جس کا مربی ہو اس کے کیا کہنے۔ یہاں تو ایک چھوڑ تین تین مربی تھے۔ اب کیا تھا گھوڑے کی قسمت جاگی ہندستانی نے وہ روپ بدلا کہ پہچانی نہ گئی۔ ہزاروں اہل دل اور صاحب دماغ اس کی طرف رجوع ہوے اور اب اس میں تصانیف لکھی جانے لگیں۔ ایسے ایسے مشاق اور استاد فن پیدا ہوے کہ ہندستانی ان پر ناز کرے تو بیجا نہ ہوگا۔ ہندستانی کا سب سے پہلا شاعر (جس کا کلام ہم کو دستیاب ہوا ہے) وہ گولکنڈہ کا نامور تاجدار محمد قلی قطب شاہ ہے جو ۹۸۸ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے دیوان کی تاریخ کتابت ۱۰۲۵ھ ہے جو اس کے بھتیجے محمد قطب شاہ کے دوران حکومت ۱۶۱۶ء تا ۱۶۲۵ء میں لکھا گیا تھا۔ یہ دونوں چچا بھتیجے صاحب دیوان گذرے ہیں۔ عبداللہ و ابوالحسن بھی نہ صرف شاعر بلکہ صاحب علم بھی تھے۔ سچ پوچھو تو انہی بادشاہوں کی قدردانی و حوصلہ افزائی نے ہندستانی کو درجہ کمال پر پہنچایا۔ وجہی (مصنف سب رس) شیخ احمد شریف (یوسف زلیخا) غواصی (بدیع الجمال ۱۰۳۵ھ اور طوطی نامہ ۱۰۴۹ھ) ابن نشاطی (پھول بن ۱۰۶۶ھ) قطب رازی (زیندان کا تحفہ) فائز (رضوان شاہ و روح افزا ۱۰۹۴ھ) طبعی (بہرام و گل اندام ۱۰۸۱ھ) سید میراں حسینی ملا قلی چندی (ماہ پیکر ۱۰۶۴ھ) قطبی مرزا (مرثیہ گو) نصرتی (علی نامہ ۱۰۷۵ھ) گلشن عشق وغیرہ۔ ابن عاجز ہاشمی بجری دولت شاہ ملک وغیرہ گولکنڈہ اور احمد آباد میں پیدا ہوے۔

اورنگ زیب کی آنکھوں اور کانوں نے اکبر و جہانگیر کے دکن کے معرکوں اور تسخیر کے شوق کو دیکھا اور سنا تھا۔ یہ آخر کس باپ کا بیٹا تھا۔ تیموری خون رگوں میں دوڑنے لگا۔ اکبر کے بعد ایک عرصے تک سکون و انجماد کی کیفیت سارے جزیرہ نمائے ہند پر طاری رہی مگر اورنگ زیب کا عالی ہمت اور اولوالعزم ارادہ اسے کسی طرح مایوس اور خاموش بیٹھنے دیتا۔ جنگی منصوبوں نے تو اس کی زندگی کو خانہ بدوش بنا دیا تھا اس کی سپاہیانہ بود و باش ہی اس کے ارادوں کو پورا کر سکتی تھی یہی وجہ ہے کہ خود لشکر کی کمان ہاتھ میں لیے ہوے بندھیاچل عبور کر گیا تاکہ مرہٹوں کی سرکوبی اور بیجاپور و گولکنڈے کا قلع قمع کیا جاے۔ دکن کی مہم اور یہاں کی سیاسیات نے عجیب پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ عالمگیر کو اگرچہ جلد ہی فتح اور کامل تصرف حاصل نہ ہوا پھر بھی وہ برسوں یہیں ٹھہرا رہا۔ سچ یہ ہے کہ سرزمین دکن میں کچھ ایسی فطری کشش ہے کہ جو آیا یہیں کا ہو رہا۔ اور تو اور عالمگیر نے بھی اپنی حکومت کی بساط یہیں بچھائی۔ اورنگ آباد کو اپنا دارالخلافہ ٹھہرایا۔ جو کچھ بھی ملکی مصلحت ہو اس عارضی روش نے تو یہاں کی فضا بدل ڈالی۔ اورنگ آباد جیسا کچھ بارونق ہوگا ظاہر ہے۔ ہزاروں امرا شاہ کے گرد حلقہ بگوش تھے لاکھوں کی فوج اس کے زیر کمان موجود تھی۔ لاتعداد علما و فضلا اور ان گنت شاعر اور صاحب تصنیف کھنچ کھنچ کر دکن آے اور یہیں انہوں نے بود و باش اختیار کی۔ اب تک جو فرق شمال اور دکن کی زبان میں پیدا ہو گیا تھا صدیوں کے بعد پھر یکسانی ہونے لگی اور شمالی اور جنوبی زبان و ادب میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ اورنگ زیب کے بعد بدقسمتی اور ادبار سلاطین مغلیہ کے سر پر منڈلا رہا تھا اور نکبت اور بدبختی ان کے آبائی جوہروں کو فنا کر رہی تھی۔ سپاہیانہ عادات و اطوار ان سے رفتہ رفتہ جاتے رہے اور عیاشی و آرام طلبی ان کے دل و دماغ پر غلبہ کر رہی تھی جس طرح چھوٹے پودے بڑے درخت کے [illegible] پیدا ہو کر اس کی ساری قوت اپنی طرف کھینچ کر خود توانائی حاصل کر لیتے ہیں اس طرح ماتحت صوبہ داروں نے سلطنت [illegible] بیخ و بن اکھاڑنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ اور ساری پھیلی ہوئی [illegible] حکومت کے حصے بخرے کر لیے۔ یہی نہیں بلکہ وہ امیران [illegible] شاہی

وابستہ تھے جن پر بادشاہ تکیہ کیے ہوے تھا اور جس سے یہ توقع رکھتا تھا کہ اڑے وقت کام آئیں گے۔ جن کو یہ سمجھتا تھا کہ یہ نمک خوار قدیم ہیں اور جو اپنے باپ دادا کی طرح پر قدم بہ قدم چل کر پسینے کی جگہ خون بہائیں گے وہ آہستہ آہستہ جونک کی طرح حکومت کا خون چوس رہے تھے جو کچھ بھی نچوڑ باقی رہ گیا تھا وہ ان کے ہاتھوں میں تھا اب جتنی بھی سکت تھی نادر کی چڑھائی اور احمد شاہ درانی کے دھاوے سے جاتی رہی فرنگیوں کی سیاسی چالبازیوں نے تو اس کو کہیں کا نہ رکھا۔ ایک طرف بہار و بنگال کی دیوانی و فوجداری و مالگذاری ان کے قبضے سے نکل گئی تو دوسری طرف وسط ہند و گجرات میں مرہٹوں کا بول بالا ہوا۔ اودھ نے اپنی جداگانہ روش اختیار کی۔ آصفجاہ اول کی دوربین نظر نے پہلے ہی تاڑ لیا کہ اب حکومت میں زوال آچکا ہے اور بادشاہ کٹھ پتلی بنا ہوا ہے اپنی بہتری اس میں سمجھی کہ دور بیٹھ کر اس سارے منظر کو دیکھا کریں۔ آصفجاہ اگر ایسے موقع سے فائدہ نہ اٹھاتے تو ظاہر ہے کہ حیدرآباد کا بھی وہی حشر ہوتا جو باقی ہندستان کا ہوا۔ سلاطین آصفیہ کی علمی سرپرستی محتاج بیان نہیں جو شغف اور ادبی شوق ان کو حاصل تھا وہ آفتاب کی طرح درخشاں ہے سینکڑوں بلکہ ہزاروں صاحب تصنیف ان کے زیر عاطفت پرورش پاتے رہے اور ان کی حقیقی طور پر قدر افزائی ہوتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ شمال ہند سے شعرا و علمانے ان کی فیاضیوں کا شہرہ سن سن کر دکن کی طرف رخ کیا اور جلد سے جلد یہاں آکر اپنے کمال و جوہر کی پوری پوری طرح عزت و توقیر دیکھی۔

میر عابد علی خاں
ایم اے (عثمانیہ)

انوار

مشکلیں بڑھ کر ہوئیں عنوانِ آسانی مجھے
اب پیامِ امن دیتی ہے پریشانی مجھے

کر رہی تھی بطنِ فطرت میں خبردارِ حیات
میری آبادی سے پہلے میری ویرانی مجھے

مسکراتا دیکھتا ہوں صبح کی تنویر کو
کس قدر عشرت فزا ہے گریہ سامانی مجھے

کب تک اے حسنِ نہاں ناکامِ نظارہ رہوں
کب تک اب کرنی پڑے گی اپنی قربانی مجھے

زحمتِ دولت سے بہتر عشرتِ بے مائگی
حسرتِ پوشش سے اچھی میری عریانی مجھے

صبحدم جب دیکھتا ہوں سوئے دورِ کائنات
کثرتِ انوار سے ہوتی ہے حیرانی مجھے

چھیڑتی ہے پھر سنا کر نغمۂ بزمِ الست
جلوۂ صبحِ ازل کی خندہ سامانی مجھے

ذرہ ذرہ مضطرب ہے جلوہ گاہِ حسن میں
کم کئے دیتی ہے لیکن میری [illegible] مجھے

صحنِ گلشن دور تھا اور وہ کا فرِ بے حجاب
شام کی تاریکیاں ہیں صبحِ نورانی مجھے

جس کے جلووں سے فضائے آسماں لبریز ہے
اس سراپا نازکی کرنی ہے مہمانی مجھے

کیا بتاؤں کس لئے اختر دمِ اظہارِ شوق
وعدہ وہ کرتے نہیں ہوتی ہے پشیمانی مجھے

علی اختر (حیدرآبادی)

غزل

نعرۂ تکبیر بھی زاہد شمارِ نغمہ ہے
کس قدر اللہ اکبر اعتبارِ نغمہ ہے

کیا سریلی تھی صدائے حرفِ کن روزِ ازل
آج تک رگ رگ ہماری بیقرارِ نغمہ ہے

سازِ ہستی پر تو ہے اپنا مدارِ زندگی !
ہوش میں لانا نہ لانا اختیارِ نغمہ ہے

کیا خبر کیا کہتی پھرتی ہے گلستاں میں صبا
پھول کی ہر پنکھڑی مستِ بہارِ نغمہ ہے

عندلیبِ خوش نوا پر آنکھ ہے صیاد کی
نرگسِ شہلا سراپا انتظارِ نغمہ ہے

نالۂ دل ہم نوائے لحنِ مرغِ نخلِ طور
سیلِ اشکِ دیدۂ تر آبشارِ نغمہ ہے

[illegible] اس طرح تو کیا جمے عشرت کا رنگ
دل ضعیف و ناتواں لب زیرِ بارِ نغمہ ہے

آنکھ ہو تو [illegible] گوشِ عبرت سے سنے
نے میں ہر ہر درز ان نے اک دیارِ نغمہ ہے

شعر وہ ہیں حضرتِ غالب کے دیواں میں عزیز
یہ غزل دیدی اسی مے کا خمارِ نغمہ ہے

عزیز یار جنگ عزیز

نرملا

میں اور نرملا بلند شہر میں رہتے تھے۔ میرے والد چونکہ وہاں کے بڑے عہدے دار تھے اس لیے مجھ کو رنگ ریلیاں منانے کا بڑا موقع ہاتھ آیا تھا۔ ہمارے سب گھر والے تعلیم یافتہ نئی روشنی کے دلدادہ تھے اس لیے ہماری آزادی میں پر لگ گئے۔ نہ باہر کوئی کہنے والا اور نہ گھر میں کوئی ٹوکنے والا۔ نرملا کے والد بلند شہر کے مشہور وکیل تھے۔ والد سے ان کا بہت گہرا دوستانہ تھا وہ بھی تعلیم یافتہ تھے۔ اس لیے ان کا زنانہ ہمارے گھر میں بلا تکلف آیا کرتا تھا۔ نرملا مجھ سے پردہ نہ کرتی تھی۔ میں بلند شہر میں ابتدائی تعلیم ختم کر کے علیگڑھ گیا۔ وہاں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو اعلیٰ تعلیم کا شوق دامن گیر ہوا۔ روپیے پیسے کی کمی نہ تھی۔ معاش کا کافی سے اچھا انتظام تھا اور میرے لیے یہہ بات نہایت آسان تھی کہ میں نہایت اطمینان اور آرام کے ساتھ ام۔ اے، پی ایچ۔ ڈی تک پڑھ سکوں اس لیے میں نے اعلیٰ تعلیم شروع کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کو زیادہ ترجیح اس لیے بھی دی کہ یہاں پر تمام علوم ہندستانی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں بہتر ہے کہ اس یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کروں اس کا بھی اچھی طرح علم تھا کہ اس یونیورسٹی کا کورس ہندستان کی دوسری بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے کچھ کم مشکل نہیں ہے اور نتیجے بھی سختی سے نکلتے ہیں جسکی وجہ سے ہر طالب علم کو ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کرنا پڑتا ہے اوسط درجہ طالب علم آسانی سے ڈگری حاصل نہیں کر سکتا بہر حال یہی چند خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے میری دلچسپی عثمانیہ یونیورسٹی کیساتھ اور گہری ہونے لگی مختصر یہہ کہ میں نے اپنا نام عثمانیہ میں شریک کرا دیا۔

جب میں ہائی سکول میں تھا تو میرا زیادہ تر وقت ادب لطیف کے مطالعے میں گذرتا تھا رفتہ رفتہ میں اشعار کہنے اور اچھے اچھے گیت بھی بنانے لگا جو نرملا کو بہت پسند آتے۔ نرملا بلا روک ٹوک ہمارے گھر آتی اور نہایت آزادی سے میری کتابوں کا اکثر اوقات جایزہ بھی لیتی تھی۔ لیکن مجھ میں اتنی مجال کہاں تھی کہ میں اسے ان حرکتوں سے باز رکھتا۔ کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے چپ کیوں ہو جاتا ہوں رفتہ رفتہ میں یہہ محسوس کرنے لگا کہ میں خود بخود اسکی طرف کھنچا جا رہا ہوں اور اسی طرح نرملا میری طرف۔ یہی وجہ تھی کہ میرے خیالات ہونٹوں تک آکر خود بخود رک جاتے تھے۔ اور میں "محبت" کا ایک جملہ بھی نرملا کے سامنے کہنے کے لیے اپنے آپ کو گونگا پاتا۔

دن، مہینے اور سال اسی طرح گذرنے لگے، اسی طرح ہم دونوں کی عمروں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اب ہم دونوں جذبات سے کھیلنے لگے۔ ہم دیکھتے تھے کہ ہماری عمروں کے ساتھ ساتھ کائنات کے ذرے ذرے کی عمروں میں بھی اسی طرح اضافہ ہو رہا ہے۔ غرض جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی میں پڑھائی میں بھی ترقی کرنے لگا۔

ایک دن میں اور نرملا بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ میں نے باتوں باتوں میں یہہ کہا "نرملا عورت جو زبان سے کہتی ہے وہ کرتی نہیں کیونکہ دل میں ایک بات ہوتی ہے اور ظاہر دوسری بات"، میرے اس انوکھے سوال پر وہ کچھ چونکی سی ہوئی۔ کہنے لگی "یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا"، میں نے اپنی آواز کو مدھم کرتے ہوئے کہا "کتابوں، رسالوں اور مختلف ذریعوں سینما، تھیٹر" فاتحانہ انداز میں کہنے لگی "تو کیا مرد اپنے وعدوں پر ہمیشہ برقرار رہتے ہیں"۔ میں نے اپنے وار کو ڈھال پر دیتے ہوئے کہا "ہاں ضرور قایم رہتے ہیں"۔ "اب مجھی کو دیکھ لیجے کہ ایک وقت میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ برابر آپ کی ادبی مشکلات میں مدد دیا کرونگا تو کیا آج تک میں اپنے وعدوں پر قایم نہیں رہا"، طنز سے مسکراتے ہوئے کہنے لگی "بیچارے بھولے جیسے کچھ جانتے ہی نہیں دیکھو تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں" میں اپنی بیوقوفی پر کچھ نادم سا ہوا اور آگے کھینچ کر کہنے لگا "اچھا پھر سے زمانہ بتاد ےگا کہ کس کا اعتراض صحیح ہے"۔ فوراً نرملا کی زبان سے یہہ الفاظ نکلے "مسٹر شمیم مجھے یقین ہے کہ عورت جو کہتی ہے وہ کرتی بھی ہے۔ مجھے کامل ایقان ہے کہ ضرور میں اپنے امتحان میں پوری اتروں گی"، آخر میں ہنستے ہوئے کہنے لگی "مسٹر شمیم مجھے ڈر ہے کہ اس امتحان میں آپ کو منہ کی نہ کھانی پڑے"۔ میں نے

بھی اسی طرح اپنے استدلال پر زور دیتے ہوئے اس بحث کو ختم کیا۔

کچھ دن بعد کالج کھل گیا۔ حیدرآباد جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ آنکھوں کو نیا ماحول، نئی فضا، نئی سوسائٹی، نیا طرز، نئی معاشرت نئی تہذیب، نئے ساتھی، نئے استاد، غرض نئی زمین نیا آسمان نظر آنے لگا اور پہروں مستقبل کی شاندار روشنی میں میرے تخیلات محو رہتے تھے۔ ۲ مئی کو عزیز و اقارب، دوست احباب اور عزیز ترین زملا کو وطن میں چھوڑ حیدرآباد روانہ ہو گیا۔ حیدرآباد آنے کے کچھ روز تک وطن کی یاد رہ رہ کر ستاتی تھی لیکن ضرورت سے زیادہ زملا کی دلچسپ صحبتیں میرے دل پر ایک زبردست چوٹ لگاتی تھیں بعض اوقات یہ حال ہو جاتا تھا کہ طبیعت چاہتی تھی کہ فوراً اڑ کر وطن اور اپنی زملا کے ہاں پہنچ جاؤں۔ اسی طرح کچھ دن خوشی اور ناخوشی میں کٹنے لگے۔ یہاں تک کہ میری طبیعت جامعہ کی فضا سے مانوس ہو گئی اور میں اپنے آپ کو اس طرح خوش قسمت تصور کرنے لگا جس طرح سے کہ دنیا کے اور بالخصوص یورپ کے لڑکے آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک ہونا باعث فخر سمجھتے ہیں جو ہیں یہاں جامعہ کی سرحد میں داخل ہوا کالج کی کشادہ سڑک پر [illegible] میری موٹر دوڑ [illegible] کی مسافت طے کر کے کالج کے [illegible] ہوتی ہوئی ہاسٹل [illegible] سامنے رک گئی۔ دور سے نیلی وادیوں میں کالج کے خوش مزاج لڑکے کھیل کے میدانوں، سڑک کے فٹ پاتھ، چمن، تفریح گاہوں میں ٹولیوں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ جب ان کے قریب سے میری موٹر گذرتی تھی تو کسی نے بھی توجہ نہ کی بلکہ اپنے مشغلوں میں ہمہ تن مصروف تھے موٹر جیسے ہی گیٹ کے سامنے رکی ہاسٹل کا چپراسی جو خدمتگار [illegible] کے میرا سامان اتارنے کے لیے موجود تھا۔ آنا فانا [illegible] گیا معلوم نہیں کہ اس وقت میں اپنے حواس کیسے درست کر سکا۔ جب ایک دو لڑکوں سے تعارف ہو گیا تو ان کی وساطت سے تمام لڑکوں سے بھی جان پہچان ہو گئی پھر کیا تھا بھول گیا گھر اور گھر والے کیوں یاد آتے۔ [illegible] ماہ بعد زملا کی چٹھی ملی۔ لکھا تھا:

"پیارے نسیم [illegible] آج میں اپنے دل کی حالت تمہیں لکھ رہی ہوں [illegible] اب میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر دیر کرو گے تو زندہ نہ پاؤ گے [illegible] میرا رشتہ ایک اجنبی سے باندھا جا رہا ہے جو مجھے کسی صورت بھی پسند نہیں ہے میں ایسی ازدواجی زندگی کو موت پر بدرجہا ترجیح دونگی۔ سنو دیر نہ کرو۔ اپنے لیے نہیں تو ایک انسانی جان بچانے کے لیے مردانہ ہمت کرو میں تمہارے ساتھ جہاں کہیں بھی ہو چلنے کو تیار ہوں"...... لیکن...... لیکن خط دیکھتے ہی سانس پھول گیا، پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ تھراتے ہوئے ہاتھوں سے خط چھوٹ گیا۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ دماغ کو کچھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ فوراً اٹھا شام کی ٹھنڈی ہوا کھانے کے لیے ہاسٹل سے بہت دور چلا گیا ساتھ زملا کی چٹھی بھی تھی۔ کئی بار چٹھی پڑھی اب مجھ پر ان الفاظ کا زیادہ اثر نہ رہا۔ یہاں تک کہ منہ سے ایک چیخ نکلی "جھوٹ بالکل جھوٹ آجکل محبت بوالہوسی کا دوسرا نام ہے۔ غلط بالکل غلط"۔ پاگلوں کی طرح مہمل الفاظ زبان سے نکل رہے تھے اور چٹھی پرزے پرزے کر کے زمین پر پھینکی جا رہی تھی۔ پیچھے سے ایک دوست آ دھمکے بے تکلفانہ لہجے میں کہنے لگے "دماغ کو زیادہ ہوا نہ دو ورنہ اندیشہ ہے کہ پاگل خانے کی ہوا کھانا پڑے" ارے تم نے یہ کیا کیا کیوں اس طرح اس چٹھی کے پرزے پرزے کر رہے ہو اگر تم اس کو یوں ہی چھوڑ دیتے تو تمہارا کیا بگڑتا۔ آہ اس دوست کو یہ کیا معلوم تھا کہ آج میں بلا سوچے سمجھے اس چٹھی کے اس طرح پرزے کر رہا ہوں کل میری عزیز ترین چیز اسی طرح ریزہ ریزہ ہو جائیگی۔ اسی طرح ان کا دوسرا جملہ بھی تھا اگر میں اس چٹھی کو یوں ہی پڑا رہنے دیتا تو آج میرا کیا بگڑتا۔ بہتر ہوتا اس مخلص دوست کے جملوں کی اس وقت قدر کرتا اور سمجھ سے کام لیکر اپنے راز کو آج تک اپنی روح کے پنجرے میں نہ پالتا اور ایک انسانی موت کا مرتکب نہ بنتا تھا۔

کچھ دیر بعد تفریح سے واپس ہوا۔ اندھیرا ہو چکا تھا کمرے بقعہ نور بنے ہوئے تھے میں بھی اپنے کمرے میں آ دھمکا۔ ساتھیوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو میں اپنے راز سے آگاہ کر کے مشورہ طلب کرتا جوں ہی میں کمرے میں داخل ہوا چند دوستوں نے مجھے آگھیرا اور کہنے لگے:-

"نسیم آج ہم تم کو چھوڑیں گے نہیں بین الکلیاتی تقریری مقابلے میں اول آئے گئے [illegible] مگر ابھی تک نہ ملا مٹھائی آج ہی کھلا دو ورنہ ہم سب مل کر تم کو لاپتہ کر دیں گے یا راستے میں بکیٹ سے خوب پانی نہلا ڈالیں گے۔ پانی کا جو لفظ سنا ہم خود بخود سردی سے کانپ اٹھا۔ ڈر کر فوراً وعدہ کر لیا کہ بھائی [illegible]

ہمارے ابا جان جو نوکری کرتے ہیں وہ سب آپ ہی لوگوں کی تواضع کے لیے تاکہ آپ خوب مٹھائی کھا کر موٹے ہوں اور ان کے اک لوتے بیٹے کو جو ان کی آرزوں، تمناوں اور امیدوں کا ٹمٹماتا چراغ ہے صرف چند ٹکوں کی خاطر اسے گل کر کے آنکھوں کی بینائی، گھر کا اجالا، خاندان کا کنکر ختم نہ کر دو۔ میں نے یہہ باتیں دل ہی دل میں کہیں اور بس کا نو دیکھا اپنے آپ کو بھی دعوتیوں کے زمرے میں شریک کر لیا۔

غرض اسی طرح تین ماہ گذر گئے اس کے بعد دوسرا کوئی خط نہ آیا۔ نرملا کو یقین ہو چکا تھا۔ واقعہ بھی دراصل کچھ ایسا ہی تھا۔ یہاں کی اتنی دلچسپ زندگی کبھی اس بات کا موقع نہ دیتی تھی کہ اپنے وطن اور نرملا کو بھول کر بھی خیال کروں۔ میں نے کبھی بھول کر کسی کو یاد نہ کیا۔ بلکہ دن رات کھیلنے کودنے لکھنے پڑھنے میں گذرنے لگا۔ اتفاق سے ایک روز اخبار ہندو پڑھ رہا تھا میری نظر "ایک لڑکی کی افسوسناک موت" کے عنوان پر گڑھ کر رہ گئی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ ایک لمحے میں ایک کالم کی پندرہ سطریں پڑھ ڈالیں سکتے کا عالم مجھ پر طاری ہوگیا آہ مرنے والی وہی بدقسمت نرملا تھی اور میں دنیا کا بدترین انسان اس کی موت کی خبر سننے کے لیے ابھی تک زندہ رہا۔

سید محی الدین احمد (عثمانیہ)

> ## خریداروں سے
>
> اس نمبر کے ساتھ جن حضرات کا چندہ ختم ہوگیا ہے وہ براہ کرم اطلاع دیں کہ آنے والے سال کے لیے وی۔ پی خدمت میں روانہ کی جائے یا آپ منی آرڈر کے ذریعے چندے کی رقم بھیج دیں گے
>
> **شکریہ! مینیجر**

غزل

نوا خاموش ہوتی جا رہی ہے ساز عرفاں کی
تیرے قربان کب تک زینتیں زلف پریشاں کی

بہت آگے نکل آیا ہوں میں حد تعین سے
گئے وہ دن خبر تھی جب مجھے جیب و گریباں کی

خوشا ذوق خلش، جاگیں نہ پھر ڈوبی ہوئی نبضیں
عیادت کو وہ آسے بارہا بیمار ہجراں کی

ابھی دنیا میں غم کا ہر تصور نامکمل ہے
سناوں کس کو میں یا رب کہانی درد ہجراں کی

قیامت ہوگئی عرشی یہہ میری نامرادی بھی
کہ ان کے سامنے بھی رت نہ بدلی یاس و حرماں کی

عرشی

نغمۂ شاعر

جہان عشق کی وسعت بڑھا رہا ہوں میں
نشان منزل ہستی مٹا رہا ہوں میں

سرود عشق کچھ اس طرح گا رہا ہوں میں
کہ محو خواب ہے دنیا جگا رہا ہوں میں

غرور زیست کو نیچا دکھا رہا ہوں میں
تعینات کے پردے اٹھا رہا ہوں میں

خدا کے سامنے گایا گیا تھا جو نغمہ
وہی زمانے کو اب پھر سنا رہا ہوں میں

اٹھا سکے نہ جسے کوہ و دشت و ارض و سما
وہ بار دوش پہ اپنے اٹھا رہا ہوں میں

وہ اضطراب مسلسل ہے راز بزم حیات
جس اضطراب سے دامن بچا رہا ہوں میں

ملی ہے لذت درد نہاں ظفر جب سے
غم حیات کو دل سے بھلا رہا ہوں میں

ظفر (عثمانیہ)

نغمہ فراق

میری زندگانی پہ چھا جانے والے
خیالوں کی بستی بسا جانے والے
گھٹا کی طرح جھوم کر آنے والے
پلا کر نگاہوں سے بہکانے والے
محبت کے نغمے سنا جانے والے
مجھے مست و بیخود بنا جانے والے
سراپا نوازش، مجسم مسرت
تصور کو غم کے مٹا جانے والے
محبت نے بیخود بنایا تھا ایسا
خبر کیا تھی ہیں یہ بھی دن آنے والے
نگاہوں میں تاریک تر یہ جہاں ہے
مسلط ساہستی پہ خواب گراں ہے
دل خستہ گم کردہ کارواں ہے
نہ رہبر، نہ معلوم ہے منزل کہاں ہے
محبت کی ٹھوکر کا ادنی کرشمہ
مسلسل میری جستجو رائیگاں ہے
ہوں میں ناامیدی سے دست و گریباں
جواں ہے ابھی میری الفت جواں ہے
وہ دل چسپ لمحے بھلائے نہیں ہیں
محبت کا تیری ابھی تک گماں ہے
نگاہوں میں ماضی کی رنگینیاں ہیں
نہ بھولیں گی وہ ایسی دلچسپیاں ہیں
مگر اب پرلطف دن ہیں نہ راتیں
نہ سوج تبسم نہ وہ شوخیاں ہیں
شکستوں کی نظروں کی پیہم آرزو ہے
پریشاں نظر ہے وہ جلوے کہاں ہیں
میں محسوس کرتا ہوں مشتاق سے ہیں
ستارے جو آکاش پر ضو فشاں ہیں
میرے پاس ہیں آج سب سے مادہ منور
مگر اب دل پہ چھائے ہوئے بدگماں ہیں

جمال (حیدرآبادی)

نیرنگ جذبات

آشفتگی دل کی کہانی بنا دیا
تجھ کو ترے شباب نے رانی بنا دیا
تیرے کرم نے تیری عنایات نے مجھے
دنیا میں آج یوسف ثانی بنا دیا
دنیا کی دست برد نے تیرے فراق میں
رنگیں حقیقتوں کو کہانی بنا دیا
میرے جنون عشق و جبین نیاز نے
تجھ کو جہان شوق کی رانی بنا دیا
ناقدر دانی چمنستاں کو کیا کہوں
شبنم کے آنسوؤں کو بھی پانی بنا دیا
لازم تھا زیست میں بھی تو ازن جمود کا
خالق نے ایک شغل جوانی بنا دیا
اب لیت و لعلی لب لعلیں کے فیض نے
ہستی کو ایک رام کہانی بنا دیا
بے التفاتی نگہ یار نے مجھے
آئینہ جنون و جوانی بنا دیا
تو اور بنا جو زیب تھی تیری مجال
خود میں نے تجھ کو جور کا بانی بنا دیا
فرحت ادا دوست نے میرا ہر ایک شعر
گنجینہ بیان و معانی بنا دیا

فرحت (کانپوری)

اگر اس نمبر کے ساتھ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے تو دوسرے سال کا چندہ پیشگی روانہ فرما کر ممنونیت کا موقع دیجیے۔

منیجر

ترقی پسند

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افراد

(۱) کلیمی (۲) یاور (۳) قیصر
(۴) یاسمین (۵) حضرت مزدور ہندی (۶) اصغر انور
(۷) قلندر

(آرام گاہ کا ڈرائنگ روم۔ قاعدے قانون کے مطابق آراستہ ہے۔ ایک طرف ٹیلیفون رکھا ہوا ہے۔ شام کا وقت ہے پانچ بجا چاہتے ہیں۔

کلیمی اور یاور داخل ہوتے ہیں۔ کلیمی نوجوان دبلا پتلا بلند قامت۔ یاور عمر میں اس سے پانچ سال بڑا، کسی قدر موٹا خوش مزاج بطور "مصرعہ اٹھانے" والے ساتھی کے بہت کام کا۔ ملازم قلندر ان کے پیچھے پیچھے آتا ہے)

کلیمی۔ (اخبارات ہاتھ سے رکھتے ہوئے) کیا ہے قلندر؟

قلندر۔ جی حضور۔ وہ رکشا والا۔ دو آنے پیسے اور مانگتا ہے۔

کلیمی۔ اف یہ رکشا والے! لعنت ہے ان پر۔ بڑا ناک میں دم کرتے ہیں حرام خور کہیں کے!

یاور۔ ارے بابا! چار آنے تو دیدے اسے۔ یہی کرایہ چکایا تھا اب اور کیا چاہتا ہے۔؟

قلندر۔ جی وہ کہتا ہے۔ دھوپ میں بہت پھرنا پڑا۔ دو سواریاں تھیں......

کلیمی۔ بدمعاش۔ اچھا جا ایک آنہ اور دیدے۔ پھر بھی نہ مانے تو بے تکلف جوتے لگا دینا۔ جا (قلندر جاتا ہے)

یاور۔ چھوڑ یار اس قصے کو۔ لے یہ اخبارات دیکھ سب میں یہ اطلاع چھپی ہے کہ ملک کے مشہور ترقی پسند افسانہ نگار حضرت بشارت نواز یہاں آئے ہوئے ہیں اور آرام گاہ عافیت روڈ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

کلیمی۔ (ہنستے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر) بشارت نواز! واہ رے میں! مگر یاور۔ جانتے یہ خبر اخبارات میں کس نے دی۔

یاور۔ اسی فلم ایکٹر نے دی ہوگی۔ کیا نام اس کا؟.... قیصر، ہاں قیصر نے دی ہوگی۔ جس کی بدولت ہم "جنت نشان مووی ٹون لمیٹڈ" کا اسٹوڈیو دیکھ سکے (ہنستا ہے)

کلیمی۔ خدا اس کا بھلا کرے!

یاور۔ مگر یار کلیمی تمہیں خوب سوجھی۔ تم وہ ترکیب نہ چلتے تو ہم اس "جنت نشان" کے معائنے موقع سے محروم رہ جاتے۔

کلیمی۔ غالب نے کہا تھا ع دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا۔ مگر وہ معشوق کا دربان تھا۔ فلم کمپنی کا دربان اور چیز ہے۔ اس کی سیاست بہت زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ فقط دعاؤں سے کام نہیں چلتا۔ اس کے توڑنے کے لیے سادہ پرکار سیاست چاہیے تھی ورنہ ہمارا حشر بھی دوسرے بیسیوں منچلے نوجوانوں کا سا ہوتا۔ یعنی ہم فقط طواف کوئے ملامت یا کوئے مووی ٹون کرتے ہی رہ جاتے اور "جنت نشان" کا رضوان ہمیں گھسنے نہ دیتا۔

یاور۔ ہاں کلیمی۔ ہم فلم کمپنی کی پھاٹک کے پاس سرد آہیں بھرتے کھڑے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کس طرح یہ قلعہ سر کریں۔ اتنے میں قیصر آتے دکھائی دیا۔ تم نے یہ معلوم کرکے کہ وہ فلم ایکٹر ہے، وہ تیر چھوڑ ہی دیا، "میں بشارت نواز ہوں! افسانہ نگار، جس کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ میں آپ کی کمپنی دیکھنے آیا ہوں"! اس نے بشارت نواز کا نام سنا تھا۔ اس کے افسانے پڑھے تھے۔ اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ چنانچہ......

کلیمی۔ چنانچہ دیکھ لیا جو کچھ دیکھنا تھا۔ حسن فیروزہ، کملا دیوی اور سب سے بڑھ کر "جنت نشان" ستارہ چندارانی سے بات چیت کی۔ یاور ذرا سوچو تو کھو نٹ کر ہم جب یہ واقعہ بیان کریں گے کہ چندارانی سے ہم نے ہنس ہنس کر اسٹوڈیو میں باتیں کیں تو سعیدہ، رام چندر، احتشام اور خصوصاً نعیم

جس کے گھر میں جوتے کی جوڑیں اور چندا رانی کی تصویریں کثرت سے ہیں، ذرا سوچو تو یہہ سب ہم سے کتنا جلیں گے۔

یاور۔ جلتے ہیں تو جلنے دو۔ این سعادت بزور بازو نیست

کلیمی۔ شہرت بشارت نواز نے کمائی۔ فائدہ میں نے اٹھایا خبر اخبارات میں نکل گئی۔ یاور اب کیا ہوگا۔؟

یاور۔ کیا ہوگا؟ قیصر اپنی بہن کے ساتھ آئے گا۔ اس لڑکی نے تمہارے ... یعنی بشارت نواز کے سب افسانے پڑھے ہیں۔ تمہاری بڑی عزت کرتی ہے۔

کلیمی۔ مگر یاور۔ لطف تو یہہ ہے میں نے بشارت نواز کے افسانے دو ایک سے زیادہ نہیں پڑھے۔ اور ان کا پلاٹ بھی یاد نہیں رہا۔

یاور۔ بڑے ادیب کی شان یہی ہے کہ جو کچھ لکھے یاد نہ رکھے

کلیمی۔ بہرحال اس ڈرامے کو انجام تک پہنچانا ہی پڑے گا خدا میری مدد کرے۔

یاور۔ اچھا اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ تیار ہو جانا چاہئے

کلیمی۔ ہاں خوب یاد آیا .... (پکارتا ہے) قلندر ارے او قلندر!۔ (قلندر آتا ہے)

قلندر۔ جی حضور!

کلیمی۔ ارے کون آیا تھا؟۔

قلندر۔ جی نہیں حضور۔

کلیمی۔ اچھا یہہ دیکھ۔ اب کچھ لوگ آئیں گے۔ بشارت نواز سے ملنے انہیں یہاں بھیج دے۔

قلندر۔ بشارت نواز؟ حضور یہہ کون ہیں؟

کلیمی۔ ارے بیوقوف وہ تو میں ہی ہوں، سمجھا؟ بشارت نواز ہے میرا نام۔

قلندر۔ مگر آپ کا نام تو کلیمی میاں ہے۔

کلیمی۔ وہ تو میرا .... میری عرفیت ہے سمجھا؟ میں بہت بڑا افسانہ نگار ہوں۔ اگر ملک میں تعلیم عام ہوتی تو تو بھی بشارت نواز کے افسانے پڑھ پڑھ کر سر دھنتا ... یاور یہ کتنی بدنصیبی ہے! نچلے طبقوں کی حمایت میں میں نے قلم اٹھایا۔ مگر وہی طبقے میرے کارناموں سے واقف نہیں ہیں۔ بشارت نواز کا نام تک نہیں جانتے۔ آہ! ترقی پسند ادب کو ابھی بڑی بڑی دشواریوں پر قابو پانا ہے۔

یاور۔ ہائے ہندستان والے ہندستان!۔

کلیمی۔ قلندر اب تو جا، اب لوگ آتے ہی ہوں گے۔

(قلندر جاتا ہے باہر موٹر کی آواز آتی ہے)

یاور۔ لو وہ آ گئے (کلیمی جلدی سے دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا ہے۔ قلندر آتا ہے)

قلندر۔ ایک صاحب ایک لڑکی کے ساتھ آئے ہیں۔

یاور۔ بھیج دے۔ (قلندر جاتا ہے قیصر اور یاسمین داخل ہوتے ہیں) آداب عرض (بڑھ کر قیصر ہاتھ ملاتا ہے)

قیصر۔ آداب عرض۔ یاسمین۔ یہہ ہیں مسٹر یاور، مسٹر بشارت نواز کے دوست مسٹر یاور، میری بہن یاسمین۔

یاور۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تشریف رکھیے۔ (سب بیٹھ جاتے ہیں)

قیصر۔ مسٹر بشارت نواز شاید.....

یاور۔ (اٹھ کر) جی ہاں! میں اطلاع کرتا ہوں (اندر جاتا ہے)

قیصر۔ یاسمین۔ تم ان سے مل کر واقعی بہت خوش ہوگی۔ جیسے دل چسپ افسانے وہ لکھتا ہے ویسا ہی دلچسپ آدمی بھی ہے۔

یاسمین۔ افسانے پڑھنے کے بعد میں نے جو تصور ان کے متعلق قایم کیا ہے، اب دیکھنا ہے کہ وہ.....

قیصر۔ او وہ آ گئے (کلیمی اور یاور داخل ہوتے ہیں) آداب عرض۔ میری بہن یاسمین سے ملیے۔ یاسمین مسٹر بشارت نواز۔

کلیمی۔ آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی .... آپ نے ناحق زحمت کی۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔

یاسمین۔ واہ! میری خوش قسمتی ہے کہ ملک کے بلند پایہ افسانہ نویس سے ملاقات ہوئی۔

کلیمی۔ آپ مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔ میں کیا اور میری افسانہ نویسی کیا! من آنم کہ من دانم، تشریف رکھیے، تشریف رکھیے (سب بیٹھ جاتے ہیں)

یاسمین۔ یہہ آپ کا انکسار ہے۔ بڑے آدمی کی شان انکسار ہی تو ہے۔

کلیمی۔ بشرطیکہ انکار جھوٹا نہ ہو۔

یاسمین (مسکرا کر) اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کا انکسار جھوٹا نہیں ہے مسٹر بشارت نواز!

قیصر۔ میں بھی اس کی گواہی دیتا ہوں۔

یاور۔ ایک اور گواہ چاہیے تو بندہ بھی "گواہ شد" کے نیچے دستخط کرتا ہے۔ (سب ہنستے ہیں)

یاسمین۔ میرا تصور آپ کے متعلق یہہ تھا کہ آپ کسی قدر سن رسیدہ ہوں گے کنپٹی کے اوپر بال سفید ہوں گے ہوئے ہوں گے، مگر زیادہ نہیں، بڑی بڑی مونچھیں ہوں گی۔ مگر آپ تو نوجوان نکلے۔ اس عمر میں یہہ تجربہ، یہہ مشاہدہ، فکر کی یہہ پختگی۔ حیرت ہوتی ہے، واقعی یہہ خدا کی دین ہے مسٹر بشارت نواز!

کلیمی۔ تو پھر مجھے کچھ میک اپ کر کے حاضر ہونا چاہیے تاکہ آپ کے تصور کو مجروح ہونے سے بچا لوں! کیوں یاور ٹھیک ہے نا؟

یاور۔ ہاں بشارت روپ بھرنا ہو تو پورے طور پر بھرنا چاہیے۔ ورنہ کوئی خامی کہیں کھیل بگاڑ نہ دے۔

کلیمی (خطیبانہ انداز میں) زندگی ایک کھیل ہے جس میں سب روپ بھرتے ہیں۔ فرق یہہ ہے کہ کوئی کامیاب ہوتا ہے کوئی ناکام۔

یاسمین۔ کتنے پاکیزہ خیالات ہیں! آپ کے افسانوں کی قدر قیمت تو ایسے ہی اعلیٰ خیالات سے بڑھ جاتی ہے یقین مانیے مسٹر بشارت نواز آپ کے افسانے میں دو دو تین تین بار پڑھتی ہوں، پھر بھی جی سیر نہیں ہوتا۔ ہر بار نیا لطف آتا ہے۔

قیصر۔ اس لیے کہ زندگی اس میں رقص کرتی نظر آتی ہے! گھناونی زندگی، عریاں زندگی، یہی تو تمہارا کمال ہے۔

یاسمین۔ آپ کا وہ افسانہ "سرمایہ دار کی خودکشی"، میں نے اسے چار بار پڑھا ہے۔ کیا کہوں۔ اس نے مجھ پر کتنا اثر کیا!

کلیمی۔ (یاور کی طرف دیکھتے ہوئے) سرمایہ دار کی خودکشی؟

یاور۔ ہاں ہاں وہی افسانہ، جو آپ نے مجھے لکھایا تھا، جس میں ایک سرمایہ دار زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتا ہے۔

یاسمین۔ جی ہاں وہی، اس میں ایک سرمایہ دار کی نفسیات آپ نے بڑی خوبی سے پیش کی تھی، کارخانے کا مالک نیک فیاض، خدا ترس، مگر سرمایہ داروں کو دنیا بھر کی گالیاں سنتے سنتے تنگ آ کر اس نے غیرت کے مارے اپنی مشین کے اندر اپنے آپ کو ڈال دیا۔

کلیمی۔ اچھا، اچھا اچھا! وہ، وہ افسانہ، ہاں ہاں۔ اب یاد آ گیا۔ بات یہہ ہے مس یاسمین۔ میں نے اتنے افسانے لکھے ہیں.....

یاور۔ لکھے ہی نہیں بلکہ لکھوائے ہیں کہ فوراً یاد نہیں آتا کہ کس افسانے کا ذکر ہو رہا ہے۔

یاسمین۔ اور وہ افسانہ آپ کا "ماتا" اس مزدور کی بیوی کا قصہ جس کے چار بچے تھے۔ روٹیوں کو محتاج۔ زندگی عذاب جان تھی۔ آخر اس کے دماغ کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ نہ صرف اپنے شوہر کو بلکہ ماتا کی ماری اپنے بچوں کو بھی قتل کر دیتی ہے اور خودکشی کر لیتی ہے۔

کلیمی۔ (بے ساختہ) غضب ہے۔

یاسمین (تعجب سے) جی

کلیمی (سنبھل کر) جی میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا حافظہ غضب کا۔ میں تو اس افسانے کو بھول ہی گیا تھا۔

یاسمین۔ آپ کے شاہکار افسانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے میں اس کو پڑھتے وقت رو پڑی تھی (ایمان سے)۔

کلیمی۔ اور میں بھی اسے لکھواتے وقت آبدیدہ ہو گیا تھا۔

یاور۔ اور لکھتے وقت تو میری ہچکی بندھ گئی تھی۔

قیصر۔ ہاں میں نے بھی وہ افسانہ پڑھا ہے۔ واقعی بہت دلدوز ہے۔ اور آپ کا وہ افسانہ "آیا" وہ بھی خوب ہے

کلیمی۔ "آیا" وہی نا جو.... جو.....

یاور۔ بچے کی آیا کا قصہ؟

قیصر۔ ہاں ہاں وہی۔ آیا کا نقشہ کھینچ کر آپ نے کمال کر دکھایا۔ اپنے شوہر اور اپنے چاہنے والے کو جو ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے۔ آیا نے کس ترکیب سے جگری دوست بنا دیا۔ ماہرین نفسیات وہ افسانہ پڑھیں تو عش عش کر اٹھیں۔ کمال ہے صاحب کمال!

کلیمی۔ اوہو! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ وہ افسانہ.... مگر خیر یہ قصے چھوڑیے۔ اپنی تعریف سن کر مجھے الجھن ہوتی ہے۔ آپ کچھ ہنس گئے۔؟ (دونوں شکریے کے ساتھ انکار کرتے ہیں)

یاسمین۔ آپ آجکل کون سا افسانہ لکھ رہے ہیں۔

یاور۔ افسانہ نگاری اب ملتوی ہے۔ ان کی صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے سیر و تفریح کو نکل کھڑے ہوئے۔

کلیمی۔ خیال تھا کہ آپ کے شہر کی سیر چپکے سے ختم کر کے چل دیں گے۔ مگر قیصر صاحب نے گرفتار کر ہی لیا۔ اخبارات میں خبر چھپوا دی۔ نتیجہ یہ کہ لوگ کارڈ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون آ رہے ہیں۔ ایڈیٹروں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن والے کوئی افسانہ نشر کروانا چاہتے ہیں۔

قیصر۔ ہندوستانی کہ یہاں جو چاہت ہے اور ادب کا ایک درخشندہ ستارہ یہاں آئے اور ہم اس کی خاطر مدارات نہ کریں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

یاسمین۔ جی ہاں میں آپ کو زحمت دینے آئی ہوں کل رات آپ ہمارے یہاں ماحضر تناول فرمائیں۔

کلیمی۔ نہیں نہیں۔ ان تکلفات کو رہنے دیجیے۔

یاسمین۔ تکلف تو آپ کر رہے ہیں۔ آپ کو ضرور آنا پڑے گا میں نے افسانے لکھے ہیں۔ اشاعت سے پہلے آپ کو دکھانا چاہتی ہوں۔ والد صاحب بھی آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں ہاں تو کہیے، کل رات آپ.....

کلیمی۔ آپ کا اصرار ہے تو منظور ہے۔ یاور نوٹ کر لو۔

قیصر۔ اور میں ملک کے مشہور نقاد کو بھی بلاؤں گا۔ آپ انہیں جانتے ہوں گے۔ جناب احسن جمال ام۔ اے۔

کلیمی۔ ہاں میں نے ان کے مضامین دیکھے ہیں۔ اچھا لکھتے ہیں بے لاگ تنقید میں وہ دوسرے نقادوں سے زیادہ کامیاب ہیں۔

قیصر۔ وہ ملک کے ترقی پسند افسانہ نگاروں پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ آپ سے تبادلہ خیال بھی ہو جائے گا۔

کلیمی۔ ہاں ضرورت بھی ہے ایسی کتاب کی۔ اب حال یہ ہے کہ ہر کس و ناکس ترقی پسند ادیب بننے کی فکر میں ہے۔ ایک فیشن ہو گیا ہے۔ نام و نمود کی خاطر جس کو دیکھو قلم چلائے جا رہا ہے۔ اس مصنوعی ترقی پسندی کا پردہ چاک کرنے کی ضرورت ہے کھرے کھوٹے میں امتیاز کی ضرورت ہے ورنہ ہمارے مقصد عظیم کو نقصان پہنچ جائے گا۔ میں کہتا ہوں بہت سے نام نہاد ادیب یہ تک نہیں جانتے کہ ترقی پسندی کس چڑیا کا نام ہے۔ سچا ترقی پسند ادیب میرے خیال میں وہ ہے جس کی تحریر میں خلوص اور صداقت ہو۔ خلوص اور صداقت۔ جی

یاور، یاسمین، قیصر (ایک ساتھ) خلوص اور صداقت! خلوص اور صداقت!

یاسمین۔ (آٹوگراف البم پیش کر کے) مہربانی کر کے اس میں کچھ لکھ دیجیے گا۔

کلیمی۔ آٹو گراف! خوب! لو یاور۔ لکھو۔ مس یاسمین کی فرمائش
ہے۔ بلکہ فہمائش۔
یاور (البم لیکر فوٹین پن نکالتے ہوئے) کہیے۔
کلیمی (سوچ کر) ہوں! پندار، گفتار، کردار میں خلوص و صداقت
انسانیت کا معراج ہے۔
یاور۔ (لکھنے کے بعد آٹو گراف دیکر) لیجیے۔ آپ دستخط کر دیجیے۔
(کلیمی دستخط کر کے البم یاسمین کو دیتا ہے)
یاسمین۔ شکریہ!
قیصر۔ ہاں تو کہیے ہمارا شہر پسند آیا؟
کلیمی۔ ماشاءاللہ بہت اچھا شہر ہے۔ مگر رکشا اس کی پیشانی
پر ایک داغ ہے۔ مرنے کے بعد حمل و نقل کے لیے انسان
کو چار آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے مگر ان زندہ لاشوں
کو تو ایک ہی آدمی کافی ہے۔ رکشا چلتا ہے یا چلتی ہے تو
مجھے روح انسانیت چیختی معلوم ہوتی ہے۔
یاسمین۔ آج آپ نے میری آنکھیں کھولدیں۔ دو ایک بار
میں بھی رکشا میں بیٹھی تھی مگر آج سے عہد کرتی ہوں کہ کبھی اس نامراد
سواری میں نہ بیٹھوں گی
(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)
کلیمی۔ لیجے ایک اور! دیکھو یاور کون ہے؟ (یاور اٹھ کر ٹیلیفون
کے پاس جاتا ہے اور بات کرتا ہے۔)
یاور۔ ہلو!.... آرام گاہ سے۔ آپ کہاں سے؟..... جی؟
.... معتمد دام خیال؟ فرمایئے.... بشارت نواز صاحب ہاں
ہیں۔ (بشارت سے) معتمد صاحب حلقہ دام خیال آپ سے
بات کرنا چاہتے ہیں۔
کلیمی (آلہ لے کر) ہلو! آداب! فرمایئے..... جلسہ؟ کاہیکا
جلسہ۔ حلقہ دام خیال کا جلسہ؟ جی میرے اعزاز میں؟ میرے
پاس وقت نہیں صاحب۔ اس خیال سے باز آیئے.....
یہ صحیح ہے مگر میری مجبوریاں.... جی؟... نہیں نہیں آپ کی
دل شکنی مقصود نہیں مگر.... ہاں۔ ہاں.... تقریر بھی کرنی ہوگی
.... اچھا صاحب اچھا۔ اس ہم اندر عاشقی.... کل نہیں۔ کل میں
بہت مصروف ہوں.... اچھا تو پرسوں شام.... جی؟ ایڈریس؟
میرا پتہ تو معلوم ہے آپ کو۔ آرام گاہ عافیت روڈ.......
(ہنس کر) اچھا۔ اچھا! ایڈریس! سپاس نامہ! جی نہیں صاحب
اس کی اجازت میں نہیں دے سکتا..... جی؟ آپ یہیں کل صبح
ملیے.... خدا حافظ! (آلہ رکھ کر) یاور! عالم تمام حلقہ دام
خیال ہے۔ جلسہ ہو رہا ہے۔ تقریر کرنی ہوگی۔ قیصر صاحب!
آپ کا شکریہ! آرام گاہ میں بہت بے آرام ہوا۔
قیصر۔ آپ جیسے مسلم الثبوت ادیب کو نہیں چاہیے کہ اپنے
قدردانوں کے حوصلے پست کریں۔
یاسمین۔ اس مکان کا نام، محل وقوع اور طرز تعمیر سب عمدہ
ہیں۔ یہ غالباً....
کلیمی۔ والد کے ایک کرم فرما ہیں ان کا مکان ہے۔ قبلہ والد
صاحب نے ان کو لکھا کہ میرا لڑکا آ رہا ہے۔ انہوں نے
جواب دیا۔ میں کشمیر جا رہا ہوں مکان خالی ہے۔ صاحبزادے
شوق سے اس میں لوٹ پوٹ سکتے ہیں۔
یاسمین۔ آپ کو یہاں تکلیف ہے تو ہمارے مکان میں....
کلیمی۔ جی نہیں شکریہ! ہر قسم کا آرام ہے سوائے ادبی
بے آرامی کے۔
قیصر۔ بشارت صاحب! ہماری کمپنی کے لیے کوئی افسانہ دیجیے
کلیمی۔ سنتا ہوں، کمپنی والے افسانوں کا ستیاناس کر دیتے
ہیں اور مجھے ایک حرف بھی بدلنا منظور نہیں ہوتا۔
قیصر۔ خیر آپ افسانہ دیجیے تو سہی۔ ہماری کمپنی میں تعلیم یافتہ
آدمی زیادہ ہیں۔ ایسی فلم بنائیں گے کہ آپ بھی دیکھ کر خوش
ہو جائیں۔
یاسمین۔ ہاں ضرور دیجیے گا۔ آپ کے افسانے کی فلم سارے
ہندستان میں بہت مقبول ہوگی۔
کلیمی۔ میں یاور سے مشورہ کرنے کے بعد قطعی جواب دے سکوں گا
یاور کے مشورے ہمیشہ صائب ہوتے ہیں (یاور سلام کرتا ہے)

یاسمین۔ اچھا اب اجازت دیجئے گا۔ آپ کا وقت شاید ضائع ہوا۔ مگر ہمارا وقت بہت اچھا کٹا۔ میں ممنون ہوں، تو کہیے، کل رات پھر آپ سے ملاقات ہوگی نا؟ ۔ (اٹھتی ہے)

کلیمی۔ انشا اللہ۔ چلیے موٹر تک پہنچا آوں (سب جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کلیمی اور یاور آتے ہیں)

یاور۔ یار تو نے کمال کر دیا۔ امید سے بڑھ کر کامیاب پارٹ کیا۔ اگر وہ اصلی بشارت نواز بھی آکر کہے۔ بشارت نواز میں ہوں تو ان کو یقین نہ آئے۔

کلیمی۔ سلیقہ چاہیے میرے دوست سلیقہ!

یاور۔ کچھ بھی ہو چار دن ٹھاٹ سے گذر جائیں گے دو تین جلسے، پھولوں کے ہار، بشارت نواز! زندہ باد!

کلیمی۔ مگر یاور۔ مذاق بہت آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

یاور۔ پست حوصلہ نہ ہو (قلندر آتا ہے اور ایک ملاقاتی کارڈ کلیمی کو دیتا ہے)

کلیمی (پڑھتے ہوئے) صغیر انور۔ مدیر رسالہ "کائنات" بھیج دے (قلندر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد صغیر اور حضرت مزدور ہندی داخل ہوتے ہیں۔ صغیر اسم بامسمی ہیں۔ یعنی پست قد، دبلے پتلے، رسالے کا سائز بڑا ہے۔ مگر مدیر رسالہ پاکٹ ایڈیشن ہے۔ حضرت مزدور بہت موٹے تازے اور منہ میں سگار دبائے ہوئے ہیں۔)

صغیر۔ آداب عرض ہے۔

کلیمی۔ آداب عرض ہے۔ آیئے بندے سے ملیے۔ بندے کو بشارت نواز کہتے ہیں یہ میرے دوست ہیں یاور صاحب (ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں)

صغیر۔ آپ سے ملیے۔ یہ مقامی مشہور شاعر ہیں حضرت مزدور ہندی۔

کلیمی۔ حضرت مزدور ہندی! خوب! (زور سے ہنستا ہے) میرے ایک دوست ہیں، وہ بھی شاعر ہیں۔ ان کا نام نامی ہے گنوار جندی، خوب قافیہ ملا ہے۔

مزدور۔ اسی لیے تو ہم آزاد شاعری کرنے والے قافیے کے دشمن ہیں۔

کلیمی۔ اچھا تو آپ آزاد شاعری کرتے ہیں! ملک آزاد نہیں ہوا۔ البتہ ہماری شاعری آزاد ہو گئی۔ اس ہم غنیمت است

مزدور۔ جی ہاں یہ ایک فال نیک ہے۔ ملک کی آزادی کی پہلی منزل شاعری کی آزادی ہے۔ آج اخبار میں خبر دیکھی کہ آپ تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہا، چلو ایک ترقی پسند ادیب بہت دن کے بعد باہر سے آیا ہے۔ مل آئیں اور ہاں پرسوں مشاعرہ ہے۔ ہماری انجمن تلامیذ الرحمٰن کا۔ یہ مزدور اس کا معتمد ہے۔ آپ کو شرکت کی دعوت دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ ہے دعوت نامہ (دعوت نامہ دیتا ہے)

کلیمی۔ پرسوں رات کو ہم ضرور شریک ہوں گے۔

مزدور۔ آپ سے یہی توقع تھی دوسری غرض یہ تھی کہ ایک تازہ نظم ہوئی ہے۔ آپ کو سنا ڈالیں (کاغذ نکال کر) عنوان نظم کا ہوا ہے "چاند کا جنازہ"... عرض کیا ہے۔

کلیمی۔ چاند کا جنازہ! خوب خوب!

مزدور۔ آداب۔ تسلیمات! تو عرض کیا ہے۔

وہ دیکھو چاند کے چہرے پر مردنی چھائی
یہ منظر دم واپسین کا
آخر کار اپنے بستر پر
دم توڑ دیا اس نے، دم توڑ دیا اس نے!
ابر نے چادر اپنی تان بھی دی
بادل کا ماتم
ایک شور محشر
آسمان اشک فشاں ہو کے عزادار بنا
یعنی لے دل
چاند کا بے غسل میت ہو گیا!
کفن ابر کا

پہناکے لے چلے ہیں بہت تیز کام آہ!
جنازہ چاند کا
سوئے مغرب جہاں ہے قبرستان
ستارے وہ دیرینہ ہمدم کہ جن کی
رفاقت پہ تھا ناز مرحوم کو
آتے نہیں نظر
دیکھ انجام عہد و پیماں کا

زمین کے چاند بہت سے ہیں لے مزدور!
جنازے نکلتے ہیں روزانہ جن کے
نہیں!
بے گور و کفن جن کی
ہر سو پڑی ہوئی ہیں
نعشیں ہی نعشیں انسانیت کی
نظام عالم بدل کے رکھدو، نظام عالم بدل کے رکھدو
یاران وطن! یاران وطن۔

(کلیمی، یاور، اور صغیر سب خوب داد دیتے ہیں حضرت مزدور آداب وتسلیمات کرتے ہیں)

کلیمی۔ میں آپ کی نظم دیکھ سکتا ہوں (کاغذ لے کر غور سے دیکھتا ہے) حضرت مزدور! آپ نے اپنی شاعری میں ریاضی کو بھی سمو دیا ہے۔ مثلاً ایک سوال یہہ ہو سکتا ہے۔ ایک نظم کھینچو جس کے مصرعوں کی لمبائی علی الترتیب اتنے اتنے انچ ہو۔ مصرعوں کے سروں کو سلسلے وار ملاتے جاؤ۔ بتاؤ کہ نظم کی شکل کیا بنتی ہے اور اس کا رقبہ بھی معلوم کرو۔ (سب ہنستے ہیں)

مزدور۔ واللہ۔ آپ نے یہ خوب نکتہ پیدا کیا۔

کلیمی۔ ہاں کہیے صغیر صاحب! آپ خاموش ہیں آپ کا رسالہ کیسے چل رہا ہے۔

صغیر۔ کاغذ کی گرانی ہے۔ مگر پھر بھی چلا رہا ہوں۔ آپ کی نظر عنایت چاہیے۔ ایک عرصے سے آپ نے کائنات میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔

کلیمی۔ مجھے خیال ہے۔ مجھے خیال ہے۔ یاور۔ فرصت کے وقت مجھے یاد دلا دینا۔ میں لکھوا دوں گا۔

صغیر۔ میں خطوط لکھتا ہوں تو آپ جواب بھی نہیں دیتے ایک زمانہ یہہ ہے اور ایک وہ زمانہ تھا کہ آپ اکثر میرے رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ اب دوسرے رسالوں نے آپ کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ حالانکہ جو شہرت آپ کی آج ہے اس کی تعمیر میں میں نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

کلیمی۔ صغیر صاحب میں نہیں سمجھتا، ایسی باتیں کرنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ آپ مجھے میری اس شہرت کا طعنہ دیتے ہیں۔ یہہ سمجھ کر کے میں اس شہرت کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اپنی شہرت کو پرکاہ سے بھی کم سمجھتا ہوں۔ آپ ہیں کس خیال میں؟ شہرت کی تعمیر میں آپ نے حصہ لیا ہے! اور تھا اس کے جواب میں یہہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی آپ کے رسالے میں لکھ کر آپ کو بہت فائدہ پہنچایا اور پھر آپ نے کبھی مجھے معاوضہ دیا ہے جو آج احسان جتانے آئے ہیں۔ آپ کی اس گفتگو سے میرا دل جانتا ہے کہ مجھے بہت رنج پہنچا۔

صغیر۔ معاف کیجیے، میرا مقصد آپ کو رنج پہنچانے کا نہ تھا۔

یاور۔ صغیر صاحب۔ مناسب تو یہہ ہے کہ آپ اپنے الفاظ واپس لے لیں۔

صغیر۔ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ میں اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔ مگر میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ "کائنات" کو دل سے دور نہ کریں۔

یاور۔ بشارت صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ پہلی فرصت میں ضرور آپ کے لیے افسانہ لکھوا دیں گے۔ اب آپ کو مطمئن ہونا چاہیے۔

کلیمی۔ یاور! دعوت میں جانا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔
صغیر۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ میں پھر معافی چاہتا ہوں۔
مزدور۔ بندہ بھی رخصت ہوتا ہے۔ پرسوں رات یاد رکھیے انتظار رہے گا۔
کلیمی۔ ہاں یاد ہے۔ آپ کی آزاد شاعری سننے کا ایک اور موقع ملے گا۔ حضرت مزدور مجھے آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ خدا حافظ! خدا حافظ صغیر صاحب (صغیر اور مزدور جاتے ہیں)
یاور۔ تم نے خوب ڈانٹا ہے۔
کلیمی۔ کیا یوں ہی افسانہ نگار بن بیٹھا ہوں؟ مگر یار کہیں قلعی نہ کھل جائے۔ ضمیری آواز اب تیز ہوتی جا رہی ہے۔
یاور۔ ضمیری آواز کو دبانا مردانگی ہے۔ (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ یاور آلہ اٹھا کر کہتا ہے) ہلو! آرام گاہ سے.... آپ کہاں سے؟.... نشاط ہوٹل سے..... اچھا قیصر صاحب ہیں؟ ہاں بشارت صاحب ہیں۔ (بشارت قیصر بات کر رہے ہیں)۔
کلیمی۔ (آلہ لے کر) ہلو قیصر صاحب! کہیے.... کون؟ احسن جمال صاحب ایم۔ اے جی.... وہ بھی ساتھ ہیں آپ کے؟ خوب.... ہمارا اسلام کہیے..... (آواز میں گھبراہٹ کے آثار) ہاں.... ہاں.... ہاں.... اس وقت لا رہے ہیں آپ ان کو؟ مگر میں.... اب باہر جا رہا ہوں تفریح کے لیے.... جی.... ہاں.... ہاں.... جیسی آپ کی مرضی.... آدھ پون گھنٹے میں؟.... اچھا! (آلہ رکھ دیتا ہے) یار غضب ہو گیا۔
یاور۔ خیر تو ہے؟
کلیمی۔ وہ احسن جمال ہے نا۔ وہ نقاد کا بچہ۔ وہ ہوٹل میں قیصر سے ملا۔ قیصر نے بشارت کا ذکر چھیڑا۔ معلوم ہوا کہ احسن جمال بشارت کا دوست ہے۔ دونوں نے علیگڑھ سے ایک ساتھ بی۔ اے کیا۔ دونوں میں برابر خط و کتابت ہوتی رہتی ہے۔ قیصر کہہ رہا تھا کہ احسن کو شکایت ہے کہ بشارت نے اسے آنے کی اطلاع تک نہیں دی۔ اب وہ دونوں یہاں آ رہے ہیں۔ آدھ پون گھنٹے میں نازل ہو جائیں گے انا للہ۔
یاور۔ واقعی یہ تو خبر بد ہے۔
کلیمی۔ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ بڑا آیا نقاد کہیں کا! آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اب کوئی نیک صلاح دو میرے دوست۔
یاور۔ تم اس وقت کہیں غائب ہو جاؤ۔ میں نپٹ لوں گا۔
کلیمی۔ اس سے کیا فائدہ؟ وہ نقاد ہی کیا جو کسی شریف آدمی کو چین سے بیٹھنے نہ دے۔ آج نہیں تو کل مجھے بے نقاب ہونا پڑے گا۔ یاور راستہ مجھے آرام گاہ سے سیدھا جیل خانے جاتا نظر آ رہا ہے۔ نقاد سے اس دنیا میں فرضی ترقی پسند ادیب کو مفر نہیں، اور احسن جمال جیسا بے لاگ نقاد! یا اللہ!
یاور۔ تو پھر بھاگ چلیں۔
کلیمی۔ لاکھ بات کی ایک بات کہی تو نے اے دوست تین دن میں ہم نے پورا شہر دیکھ لیا۔ اب ٹھہرنا بے فائدہ ہے پھر پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں، بھاگ جانا بہترین تدبیر ہے۔ اس میں ذلت ہرگز نہیں۔ مجھ سے بڑے لوگ اپنی زندگی میں بھاگا کیے ہیں.... جاؤ یاور۔ ریلوے گائیڈ دیکھو۔ گاڑی کب جاتی ہے قلندر! ارے او قلندر! (قلندر آتا ہے)
قلندر۔ جی حضور۔
کلیمی۔ ہمارا اسباب باندھ جلدی سے ہم جا رہے ہیں تار آیا ہے۔ فوراً جانا ضروری ہے۔ جلدی سے اسباب باندھ دے۔ اور دیکھ ٹکسی بلالا۔ (قلندر جاتا ہے۔ یاور اندر سے گائیڈ دیکھتا ہوا آتا ہے)
یاور۔ گاڑی ۲ بجکر ۵ منٹ پر جاتی ہے۔ کل ۲۰ منٹ ہیں۔
کلیمی۔ چلو جلدی کرو۔ الوداع اے دعوت۔ الوداع اے جلسہ و تقریر! الوداع اے جنت نشان ہوڈی ٹون لمٹیڈ!
کلیمی۔ نہیں مجھ جیسے ترقی پسند کا ذکر کر رہے ہو تمہیں یہ کہنا چاہیے۔ این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد (قلندر آتا ہے)
قلندر۔ مگر حضور کھانا تیار ہے۔ کھانا کھا کر جائیے۔
کلیمی۔ لاکھوں کروڑوں انسان فاقے کر رہے ہیں، ہم کھانا کس منہ سے کھائیں! جا اپنا کام جلدی ختم کر۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے (سب اندر جاتے ہیں)

ناکارہ
(حیدرآبادی)

تیاری

گل سے اڑائی نکہت — بلبل سے نغمہ خوانی
نرگس سے نیم خوابی — سوسن سے بے زبانی
بل کھاتی ناگنوں سے انداز کج ادائی — سرو سہی قد میں کچھ شانِ دلربائی
ماہ تمام سے کچھ — دل کش خنک جوانی
صرصر سے تیز گامی — سنبل سے سرگرانی
سبزے سے کچھ تموج — موجوں سے کچھ روانی
بادل سے کیف و مستی — طوفان سے کامرانی
جب جمع ہو گئے یوں سارے نقوشِ زیبا — بالائے بام آئے پیکر بھری جوانی
مشتاقِ دید آکر کوئی سوال ڈالے
کب سے وہ منتظر ہیں کہنے کو "لن ترانی"

شاہد (عثمانیہ)

راز و نیاز

تیری نگاہِ ناز نے عشق کو آسرا دیا
میرے وفورِ شوق نے حسن کو جگمگا دیا
تو نے مری وفاؤں کا آخر کو یہ صلہ دیا
شوق کی کائنات کو حاصلِ غم بنا دیا
تیری نوازشوں کا ہو کس طرح شکریہ ادا
پرسشِ غم سے اور بھی سوزِ دروں بڑھا دیا
دل میں نہیں ہے اب کوئی جوش و خروشِ زندگی
میں نے چراغِ آرزو، دیر ہوئی بجھا دیا
جانِ الم نصیب پر تیرا یہ لطفِ خاص ہے
لذتِ درد دی مجھے، پیکرِ غم بنا دیا
آہ جو دی تو بے اثر، نالہ دیا تو نارسا
بندۂ غم کو اے خدا! اپنے کرم سے کیا دیا
حالِ منصوراں دنوں ہے یہ جنونِ عشق میں
آپ ہی آپ وہ کبھی رو دیا مسکرا دیا

منصور قریشی

پاپ

دور اڑتا ہی چلا جاتا ہی سگرٹ کا دھواں محوِ پرواز ہو جس طرح فضا میں بادل
جسم کو چھوتی ہیں مہتاب کی ٹھنڈی کرنیں — ہم پہ سایہ کیے آکاش کا رنگیں آنچل
تیرے فردوسی تنفس سے معطر ہے فضا
تیرے آگے ہے بہت ماند ستاروں کی ضیا
تیری ان نرگسی آنکھوں سے جھلکتی ہے وفا
تجھ پہ نازاں ہے مری جانِ محبت کا خدا
لبِ لعلیں سے برستے ہوئے شیریں نغمے
میرے محبوب محبت کے ترانے نہ سنا
چاندنی رات میں ہنستے ہوئے ربط نہ اٹھا — دور رہ دور ابھی بس یوں ہی نزدیک نہ آ
گرم سانسوں سی بڑھی جاتی ہے دل کی دھڑکن
معصیت سے نہ کہیں بھیگنے پائے دامن
ہم کو روپوش کیے دیتا ہے پاپوں کا غبار
تیرے قدموں میں لٹا دوں نہ جوانی کی بہار
ہم پہ آکاش کے تاروں کو ہنسی آتی ہے — پاپ کی گرد بھی دامن پہ جمی جاتی ہے
بھاگ بھی جا کہ بہت دیر ہوئی جاتی ہے

الہام (عثمانیہ)

نِدر لینڈ انڈیز

دنیا میں گنتی کے ایسے مقامات ہیں جن کی حقیقی تعریف و توصیف کو مبالغہ تصور کیا جائے گا۔ ایسے ہی مقامات میں ندرلینڈ کا بھی شمار ہے۔ یہاں کے باشندے اپنی عمدہ صفات کے لیے مشہور رہیں۔ ان جزایر پر جاپانی حملے سے پہلے بڑی تعداد میں سیاح سیر و تفریح کے لیے آتے رہتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ جزیرے سیاحوں کی جنت کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے سے لوگ یہاں سیر و تفریح اور تعطیل منانے کے واسطے آیا کرتے تھے۔

ندرلینڈ انڈیز سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جزایر کا مجموعہ ہے۔ جہاں دل چسپی کے بے شمار سامان ہیں اور جن میں بیسیوں قبایل آباد ہیں۔ جو ایک دوسرے سے ہر لحاظ سے مختلف ہیں اور ان میں ایسی رسمیں موجود ہیں جو غالباً کسی اور مقام کے باشندوں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہاں کے حالات پر ایک ضخیم لٹریچر (ادب) موجود ہے۔ اور ہر سال اس میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اگرچہ جاپانی حملہ سے پہلے اس مجمع الجزایر کو کبھی کسی بڑی جنگ سے دوچار ہونے کا موقع نہیں ملا تاہم وہ کلیتاً جنگ وجدل سے ناآشنا بھی نہیں ہا۔ کیونکہ قبایل کی باہمی نزاعات آپس کی لڑائیوں کا سبب بنتی رہیں ان جھگڑوں میں سے اکثر کی بنا فساد و سیاسی امور سے تعلق رکھتی تھی۔ اب تک ان جزایر کی جیسی کہ چاہیے چھان بین نہیں ہوسکی اور بہت سے مقامات ایسے ہیں جنگی مساحت نہیں کی جاسکی اور ہم وہاں کے امکانات حصول زر کی قابلیت سے بہت کم واقف ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی سیاست کے مستقبل میں ندرلینڈ انڈیز کا بہت نمایاں حصہ ہوگا۔ ان جزایر کی وسعت ان کی قدرتی زرخیزی و شادابی اضعفا دیات عالم میں اپنی ایک خاص قیمت معین کرتی ہے۔ انہیں وجوہ سے جاپان چاہتا تھا کہ اس مجمع الجزایر کو اپنے شاہی مقبوضات کا جزو بنائے تاکہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے کے واسطے گنجایش فراہم کرسکے اور وہاں کی خام اشیا سے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جاسکے۔

مشرق میں ہالینڈ کے مقبوضات مشرقی انڈیز میں تقسیم ہیں۔ جن کا مجموعی رقبہ آٹھ لاکھ مربع میل ہے ان میں سب سے بڑے جزایر کا مجموعہ ڈچ ایسٹ انڈیز کے نام سے مشہور رہے۔ جس کا رقبہ (۷۳۳٬۰۰۰) مربع میل ہے اور آبادی چھ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ ان جزایر میں ہر قسم کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ مختلف قسم کے مناظر سے یہ مجمع الجزایر بھرا پڑا ہے۔ ان جزیروں میں ہر طرح کی تجارت جاری ہے اور وہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں وحشت و بربریت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی تہذیب بھی موجود ہے۔ شاداب و آباد قطعات کے پہلو بہ پہلو ایسے خطے بھی ہیں جن کی آج تک دیکھ بھال بھی نہ ہوسکی اور وہ اپنی قدرتی حالت میں ہیں۔

جاوا کا رقبہ اگرچہ نسبتاً بہت چھوٹا ہے لیکن ڈچ مقبوضات میں اس کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ڈچ حکومت کی یہ تجویز تھی کہ یہاں کے قدرتی ذرایع کو بہتر طریقے پر کام میں لاکر زراعت کو انتہائی ترقی تک پہنچادیا جائے۔ جاوا تمام حکومتی اداروں کا صدر مقام ہے۔ بٹاویا سماڑنگ اور سوراجاوا کے بڑے شہر ہیں۔ اور ان جزایر کی دولت و تجارت کا مرکز بھی انہیں کو کہا جاسکتا ہے۔ بٹاویا دارالحکومت ہے۔ جہاں ڈچ ایسٹ انڈیز کا گورنر جنرل رہتا ہے۔ جس کا رتبہ ہندستان کے وایسرائے کے برابر ہے۔ تقریباً حکومتی کاروبار ڈچ عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے جو اپنا کاروبار برطانوی عہدہ داران مشرق سے مختلف سپرٹ کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ یہ

عہدے دار ایسٹ انڈیز کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ وظیفہ لینے کے بعد یہ لوگ ہالینڈ کو واپس نہیں جاتے بلکہ ان کی بڑی تعداد جاوا میں اراضی خرید لیتی اور گھر بنا کر یہیں بس جاتی ہے۔ اور اپنی باقی زندگی یہیں بسر کر دیتی ہے تجار کا بھی یہی طریق عمل ہے۔ جو لوگ (باشندگان ہالینڈ) جاوی عورتوں سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ معاشرہ (سوسائٹی) میں ان سے حقارت یا مغایرت کا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔

جاوا کو دنیا کی شکر، چانول اور ربر کی پیداوار میں شمار کیا جاتا ہے یہاں سب سے بڑی فصل چانول کی ہوتی ہے۔ سات اور آٹھ ملین ایکڑ (ملین دس لاکھ کا ہوتا ہے) کے درمیان اراضی پر چانول کی کاشت ہوتی ہے۔ یہاں پام کی تین سو اقسام پائی جاتی ہیں جن میں ساگو، تاڑی اور شوگر پام کو قابل لحاظ تجارتی اہمیت حاصل ہے۔ کچھ عرصہ قبل جاوا کی کافی کو یورپی ممالک میں خاص قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جس کو ہالینڈ کی مقبوضاتی پیداواروں میں سب پر ترجیح حاصل تھی بلکہ تجارتی نقطہ نظر سے اس کے مقابلے میں مصالحے کی پیداوار بھی کم نفع بخش خیال کی جاتی تھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ اس پر سے سرکاری نگرانی اٹھالی گئی اور اب مزارعین آزادی کے ساتھ اس کاروبار میں ترقی کر رہے ہیں۔ وہاں کی عورتیں اس کام کو خوبی سے انجام دینے میں مشہور ہیں عورتوں سے عام طور پر کافی، نیشکر اور ربر کے کھیتوں میں کام لیا جاتا ہے تمباکو کے کارخانوں میں اور زراعتی زمین پر بھی عورتیں کام پر لگائی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہاں کی عورتوں کے قد کچھ زیادہ بڑے نہیں ہوتے۔ لیکن اپنے اعضا کی موزونیت، جسموں کی لچک اور نرمی کے اعتبار سے اچھا پر شوکت نزاکت کی مالک ہوتی ہیں کہ ان پر مغرب کی سفید فام عورتوں کو بھی رشک آتا ہے۔ رنگین جاکٹیں سارونگ (ملایا کی عورتوں کا لباس جو جسم کے نچلے حصے پر پہنا جاتا ہے) اور مختلف وضع کے زنگار رنگ رومال عورتوں میں بہت مقبول ہیں۔ یہاں کے مرد بھی ہوشیار کاریگر ہیں جو سونا و چاندی اور تانبے سے قسم قسم کی خوبصورت مصنوعات تیار کرتے ہیں۔ نیز مختلف وضع کے ہتیار، کٹورے، تمباکو رکھنے کی ڈبیاں، اور پان سپاری کی تھالیاں بھی خوش نما بناتے ہیں۔

یہاں ریلوے لائین کا بھی ایک کارآمد سلسلہ جاری ہے۔ اچھی شاہراہیں اور ٹراموے بھی موجود ہے۔ اس سرزمین پر شاندار اور خوبصورت مناظر کی بھی کمی نہیں ایسی دلکشیاں صرف مشرق ہی سے مخصوص ہوا کرتی ہیں یہاں کی اراضی کا ساٹھ فیصدی حصہ زیر کاشت ہے۔ جزیرے میں بہت سی جھیلیں بھی ہیں اور کئی دریا بھی بہتے ہیں لیکن یہ دریا بہت تیز رو ہیں اور ان کی وسعت بھی بہت کم ہے جس کی وجہ سے کشتی رانی ان میں ممکن نہیں۔ ملک کا بڑا حصہ پہاڑی ہے۔ یہاں (۱۲۵) سے کم کوہ آتش فشاں نہ ہوں گے۔

جاوا کی قدیم تہذیب ہندی اور بدھ تہذیب کا مجموعہ ہے۔ جزیرے کے وسطی حصے میں بارو بدر مقام پر نویں صدی عیسوی کے کھنڈر پائے گئے جو زبان حال سے اپنی یاد رفتہ تاریخ کی کہانی سناتے ہیں۔ جاوا کے دوسرے مقامات پر بھی ہندی اور بدھ تہذیب کے آثار پائے جاتے ہیں سنہ ۱۴۷۵ء میں مسلمان عربوں کا حملہ ہوا جس کے بعد یہاں کا قدیم مذہب مٹ گیا جزیرے بھر میں منطقہ حارہ کی وباؤں اور بخاروں سے انسانی زندگی دوبھر ہو گئی تھی لیکن تہذیب جدید نے ان مصائب کا چارہ کار ڈھونڈ نکالا جو تمام تکلیفوں کے دور ہو جانے کا ضامن ہے۔ ان جزائر میں وحشی جانور شیر، جنگلی بلیاں، گینڈے، جنگلی سور مگرمچھ، ہرن وغیرہ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

ڈچ ایسٹ انڈیز میں قوموں ان کی شاخوں اور

دو غلی نسلوں کا ایک پیچیدہ نظام ہے۔ جزیرے میں بسنے والے ان سب باشندوں میں جاوی (اہل جاوا) ہی تعداد میں دوسروں سے زیادہ اور ذی اثر ہیں۔ دراصل یہ لوگ قوم ملایا کی ایک شاخ ہیں جو چینیوں سے مخلوط ہوگئے جزایر سماٹرا، بالی اور جاوا کے بعض حصوں میں ہندو بھی ہیں اور اچینیز ملائے آف سماٹرا میں عرب بھی آباد ہیں۔ اہل جاوا طبعاً ملنسار ہوتے ہیں اگرچہ اعلیٰ طبقے کے افراد سست اور کمینہ خصلت ہوتے ہیں لیکن ادنیٰ طبقے والے محنتی اور زراعتی کاروبار سے خوب واقفیت رکھتے ہیں امرا کی زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوتی ہے۔ ان کا لباس قیمتی مخمل، ریشم اور شاندار زردوزی کا ہوتا ہے اور وہ زیورات بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مکانات نفیس اور آرام دہ بنائے جاتے ہیں۔ وہاں کے خوشحال باشندوں کے مکانات میں تین حصے ہوتے ہیں جو باہم ایک دوسرے سے ایک مختصر راستے کے ذریعے پیوست رہتے ہیں۔ پہلے حصے کو پانڈوپو کہتے ہیں۔ یہاں مہمانوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ دوسرے کو پرنگی ٹن کہا جاتا ہے اس میں مہمانوں کو سلایا جاتا ہے۔ تیسرے کا نام اوماہ ہوتا ہے اسی حصے میں صاحب خانہ کی رہایش ہوا کرتی ہے۔ اور مکان کا یہی اصلی حصہ ہوتا ہے۔ ادنا طبقے والے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جو بانس اور لکڑی کے موٹے موٹے کندوں سے بنائی جاتی ہیں اور ان کو پام کے پتوں سے چھایا جاتا ہے۔

آبادی کا بڑا حصہ دیہات میں رہتا ہے خانگی زندگی ان کی بڑی حد تک منظم ہوتی ہے۔ اعلیٰ طبقے میں تعدد ازدواج کا عام رواج ہے۔ لیکن ادنا طبقے میں ایک ہی بیوی کی جاتی ہے۔ باشندگان جاوا کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ قوم قناعت پسند ہے۔ جاوا کو مختلف ریجنسیوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی صدارت جاوی امرا کو سونپی گئی ہے۔ جنہیں حکومت سے مالی امداد بھی ملتی ہے۔ وسطی جزیرے میں دو چھوٹے اسٹیٹ بھی ہیں جن کا طرز حکمرانی تقریباً جمہوری ہے۔

جاوا کے مغرب میں ایک بڑا جزیرہ ہے جس کو سماٹرا کہتے ہیں۔ وسعت میں یہ جاوا سے چار گنا اور ہالینڈ سے چودہ گنا بڑا ہے۔ لیکن اس کے بڑے حصے پر گھنے اور بڑے جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں کا بڑا شہر پالمبانگ ہے جس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں اس کا طول ایک ہزار اور عرض (۲۰۱۳) میل ہے۔ لیکن اس کا پورا حصہ تقریباً ایسا ہے جس کی اب تک چھان بین نہیں ہوسکی یا دوسرے لفظوں میں نامعلوم ہے۔ آب و ہوا زیادہ تر جاوا سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں بڑی تعداد آچی نیز کی آباد ہے جو قوم ملایا کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ جاویوں سے زیادہ قوی ہیں اور اب تک ہالینڈ والے (ڈچ) ان کو صحیح معنوں میں مطیع نہیں بنا سکے۔ یہ قوم وحشی ہونے کے ساتھ اپنی ہتک اور تذلیل اور بدلہ لینے پر ہر وقت آمادہ رہتی ہے۔

جاوا کے مشرق میں دور تک جزایر کا ایک سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ جن کو تنگ دریاؤں نے ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہے۔ ان میں دو جزیرے بڑے خاص اہمیت والے ہیں جن کو بالی اور لمبوک کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ بات تعجب انگیز ہے کہ ان دونوں جزیروں میں عوام کا بڑا حصہ مذہباً ہندو ہے اگرچہ جزیرہ بالی کے ساحل پر مسلمانوں کی آبادیاں ہیں ان جزایر کے باشندے بھی تقریباً اسی نسل اور قوم کے ہیں جو دوسرے حصوں میں آباد ہیں اور آب و ہوا بھی کسی قدر معمولی فرق کے ساتھ ویسی ہی ہے۔ ان لوگوں کے اور دوسرے جزایر کے رہنے والوں کے طرز زندگی۔ عادات و رسوم میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

بحر الکاہل کے جزیروں میں سب سے بڑا بورنیو ہے اور عام طور پر وہاں کے حالات بھی تقریباً جاوا سے ملتے جلتے ہیں۔ بورنیو کا جزیرہ سماٹرا سے بڑا ہے لیکن دوسرے جزایر کی طرح یہ سب کا سب ہالینڈ کے زیر حکومت نہیں۔ ساراواک اور برٹش نارتھ بورنیو کا ہالینڈ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بورنیو میں مختلف قبایل آباد ہیں ہالینڈ کے مشرقی مقبوضات میں دوسرے درجے کی اہمیت جزیرہ سلیس کو حاصل ہے جو بہ لحاظ رقبہ نیوگنی کا نصف ہے۔

نیوگنی ملاے آرچی پلاگو کا کوئی حصہ نہیں ہے اس کا یہاں ذکر بھی نہ کیا جاتا اگر ڈچ ایسٹ انڈیز سے اس کے سیاسی تعلقات نہ ہوتے۔ اس کی آبادی پالی نیشین اور نیگریٹو قوموں پر مشتمل ہے۔ اس جزیرے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کو پرندوں کے شوقین لوگوں کی جنت کہہ سکتے ہیں۔ یہاں پرند کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پانسو سے کم ان کی اقسام ہوں گی اور برڈ آف پیاراڈیز کی قسمیں ۷۰ اور ۸۰ کے درمیان ہیں۔ اس جزیرے کا بڑا حصہ ایسا ہے جس کو اب تک اچھی طرح دیکھا نہیں گیا۔ نیوگنی کی ساخت اور اس کی آب و ہوا مزاج انسانی کے موافق نہیں ہے۔ پورے جزیرے کی آبادی آٹھ لاکھ سے زیادہ نہیں۔ بہ لحاظ تعداد قبیلہ پاپوآن کو فوقیت حاصل ہے۔ اگرچہ ان کی کئی شاخیں ہیں۔ باوجود اس کے ان سب کے قد یکساں طور پر طویل سر چھوٹے چھوٹے، ناک لمبی اور پر گوشت ہوتی ہے۔ بہ نسبت اہل ملایا کے ان کی تہذیب ابتدائی اور ادنا قسم کی ہے مرد عموماً پورے برہنہ رہتے ہیں۔ البتہ عورتیں کسی درخت کی چھال سے بنا ہوا ایک چھوٹا پیٹی کوٹ پہنتی ہیں وہ لوگ شخصی زیب و زینت کے بڑے دلدادہ ہوتے ہیں اس قدر کہ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اگر ضرورت ہو تو کسی بھی قسم کی جسمانی تکلیف کو برداشت کر لینے میں ان کو تامل نہیں ہوتا مردم خواری کو وہاں سختی سے روک دیا گیا ہے اس میں تھوڑا بہت ان باشندوں کی مرضی کو بھی دخل ہے۔ لیکن ملک کے بعید حصوں میں جہاں رسائی مشکل ہے اس مذموم رسم کے بند ہو جانے کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کے باشندے وہی زندگی کے عادی ہیں ان کے مکانات ٹیلوں پر بنے ہوتے ہیں۔ پہاڑی حصوں میں عجیب الخلقت بونے بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق نیگریٹو قوم سے ہے۔ یہ لوگ (بونے) انتہائی شرمیلی طبیعت کے ہوتے ہیں۔

مرزا احمد اللہ بیگ

مسز وانگ

بوڑھی مسز وانگ جانتی تھی کہ جنگ چھڑ چکی ہے۔ وہاں کے لوگوں نے سنا تھا کہ جاپانی درندے چینیوں کو بھیڑ بکری کی طرح پھاڑ رہے ہیں۔ لیکن وانگ قبیلہ اب تک محفوظ تھا۔ زرد دریا کے اس پار یہ قبیلہ صدیوں سے بسا ہوا تھا۔

گرما کا آغاز تھا۔ ایک شام کو مسز وانگ عادت کے موافق بند کی سیڑھیوں پر چڑھ کر دریا کا بہاؤ دیکھنے لگی وہ جاپانیوں سے زیادہ اس کے پانی سے ڈرتی تھی اسے معلوم تھا کہ اس کی ظالم موجیں آن کی آن میں کیا کچھ کر ڈالتی ہیں۔۔۔۔ اس کے جسم پر پھریری پھیل گئی۔

دیکھتے دیکھتے گاؤں کے لوگ اس کے اطراف اکٹھے ہو گئے اور وہ بھی اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگے۔ بڑی موجیں ننھی لہروں کو کھا جانے کے لیے ایک دوسرے پر پل پڑ رہی تھیں۔ جیسے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں یا جھینگوں پر۔ وہ تھراتی کانپتی ماں ساحل کی آغوش میں پناہ لینے دوڑی آئیں۔ لیکن بڑی موجیں تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی تھیں۔ غصے سے اچھلتی، منہ سے کف گراتیں وہ لپکتیں آئیں اور بالآخر انہیں ہڑپ کر لیا۔ بوڑھی مسز وانگ اس خوفناک کھیل کو بغور دیکھتی رہی۔

"میں نے آج تک اتنا زور شور نہیں دیکھا" مسز وانگ نے قریب ہی دھرے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے نفرت سے پانی پر تھوکا۔ "شیطان صفت دریا جاپانیوں سے بھی بدتر ہے" ینگ نے کہا! "ذرا آہستہ" مسز وانگ نے کہا۔ اگر سمندری دیوتا سنے گا تو غضب نازل کریگا۔ کوئی اور دلچسپ باتیں کر۔

وہ ادھر ادھر کی گفتگو کرنے لگا۔

"میں نے ایک بار ایک جاپانی کو دیکھا تھا وہ اونچا پورا نوجوان تھا۔ اس کے بال لانبے تھے اور اس کی آنکھیں مچھلی جیسی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اس جیسا نہیں۔"

سب کان دھرے اس کی باتیں سن رہے تھے اس کا کہا سب ہی مانتے تھے۔ اس کی بات ٹالنے کی کس کو مجال تھی؟ وہ تو اب بادلوں کے پرے اڑے اڑے پھرتے ہیں۔۔۔۔ جیسے تیز عقاب۔

میں کہتا ہوں عقاب بھی ایک بار ترس کھا کر اپنے شکار سے منہ موڑ لیگا۔ مگر وہ ہماری قوم پر۔۔۔۔ اپنے جیسے انسانوں پر۔۔۔۔ بلائے آسمانی کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔

مسز وانگ چند ثانیوں تک سوچتی رہی وہ آنکھوں دیکھی باتوں پر یقین کرتی تھی۔ میں جب تک ہوائی جہاز دیکھ نہ لوں میں نہیں مانتی۔ اس نے ایک بار کہا تھا۔۔۔ بیسیوں باتیں واقعی ہوتی ہیں۔ بغیر دیکھے ہمیں ماننا ہی پڑتا ہے۔ وہاں کی ملکہ مر چکی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ابھی زندہ ہے "میں جاپانیوں کی بہادری کی قایل نہیں" اس نے کہا۔ سب مسکرانے لگے۔ ینگ کی بیوی نے اس کا پائپ سلگایا ہاں اب گا ڈینگ، وہ گانے لگا۔ اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی، لوگ گیت میں کھو کر تھوڑی دیر کے لیے جاپانیوں کو بھول گئے۔ شام بھیگی ہوئی تھی۔ ننھے بادل گالے کی طرح ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ جیسے ہمالیہ کی بھیگی لٹیں اکے دکے سیاہ بادل مست ہاتھی کی طرح چکر کاٹ رہے تھے۔

درخت جھکے ہوئے اپنا عکس دیکھ رہے تھے اور پتلی ٹہنیاں ننھی لہروں کے بوسے لے رہی تھیں۔

بوڑھی مسز وانگ نے ایسی بے شمار شامیں اسی ساحل پر کاٹی تھیں وہ زمانہ بھی خوب تھا جب اس کا دل جوان تھا، اور اپنے شوہر کے ساتھ چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ اپنے مور جیسے سینے اور چکور جیسی چال پر ناز کرتی تھی۔ مگر اب تو وہ اس پتے کی مانند تھی جو شاخ سے ٹوٹ کر عدم

کے نامعلوم بہاؤ میں غرق ہو جاتا ہے۔

اسی ساحل پر ایک حسرت ناک شام کو اس نے اپنے محبت نواز شوہر کو موجوں کے جال میں بہتا دیکھا تھا۔ ان ہی موجوں میں کسی بزرگ نے اس کو تہہ آب کر ڈالا تھا۔ ظالم لہریں۔ وہ جب کبھی اس حادثے کو یاد کرتی تو یکبارگی خود کو لہروں کے سپرد کرنے کا ارادہ کرتی مگر اس کا بیٹا یک ہمیشہ روک دیتا۔ وہ جیسے جا رہی تھی ایک بوڑھے درخت کی طرح۔

اس نے مہاتما بدھ سے بڑی منتیں کیں کہ اس کے شوہر کو زندہ نکال دے۔ لالچی پجاری کو اس نے دس چاندی کے سکے بھی دیے تھے۔ لیکن بے سود۔

"ماں گھر چلو" مسز یگ نے کہا "خنکی بڑھ گئی ہے۔"

"ہاں مجھے چلنا ہی چاہیے۔" اس نے دریا پر نظر ڈالی "اس دریا کا پانی روک کر کھیت سیراب کیے جاتے ہیں جو ہمارے لیے باعث رحمت ہوتا ہے۔ لیکن ایک ایک زائد پانی تباہی لاتا ہے۔ وہ دیو کی مانند کھیتیاں روند ڈالتا ہے۔"

وانگ قبیلہ پشت ہا پشت سے ایسے پرخطر مقام پر بسا ہوا تھا۔ کسی نے بھی اسے دوسری جگہ منتقل کرنے کا خیال نہیں کیا۔

مسز وانگ ہو کے تیار کردہ نیلے مچھردان کے اندر لیٹ گئی۔ چند لمحوں تک وہ جاپانیوں کے متعلق سوچتی رہی۔ اسے تعجب تھا کہ کیوں وہ لڑنے مرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بد قماش لوگ ہی دنگا فساد کرتے ہیں نہ کہ "شریف صلح کل لوگ" اگر وہ یہاں بھی چڑھائی کریں تو میں ان سے کہوں گی کہ ہم غریب کسانوں کو کیوں ستاتے ہو۔ بد معاش خونخوار دریا نے کیا کچھ کم ستم ڈھائے ہیں۔ میں ہرگز ان سے نہ ڈروں گی۔

وہ آ گئے! سنو ہوائی جہاز کی آواز" مسز یگ چلائی..."

پہلے تو مسز وانگ کو یقین نہیں آیا۔ پھر وہ جاگتی ہوئی برآمدے میں آئی "کہاں ہیں وہ کہاں ہیں وہ؟"

"بادلوں میں چھپ گئے ہیں"

شاید تو نے ہیبتناک خواب دیکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ٹڈی دل کی آواز ہو۔ فصل خراب کرنے آ رہے ہوں جیسے ان کے باپ کی ملکیت ہے!۔

نہیں اماں۔ باور کرو! میں نے ابھی ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر "لو وہ دیکھو!"

سفید بطوں کی طرح ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں اور انڈوں جیسی کوئی چیز گرا رہے ہیں۔ دھماکوں کی آوازیں آئیں شعلے بلند ہوئے لوگ ادھر ادھر جان بچانے کے لیے دوڑنے لگے ایک شور و واویلا مچا ہوا تھا۔

وہ مسز وانگ کو اندر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ نہیں ہٹی۔ "ستر سال بیت گئے، میں نہیں بھاگی اب کیسے ہٹ سکتی ہوں۔ لیکن یگ کہاں ہے۔ کہیں وہ بھاگ نہ گیا ہو۔ بزدلا!"

یکایک چیخ پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔

"اگر یگ مر چکا ہے تو اس کے بچے کو بچانا ضروری ہے چلی جاؤ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

وہ اکیلی کھڑے جہازوں کی کارروائیوں کو دیکھتی رہی تھوڑے عرصے کے بعد مشرق سے چند اور نمودار ہوئے۔ ہوا دھار لڑائی ٹھن گئی۔ ساری فضا دھوئیں سے پٹ گئی۔ دشمن کے جہاز ٹوٹ کر گر پڑے۔ باقی تیزی سے واپس ہو گئے۔

جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو مسز وانگ دھیرے دھیرے لکڑی ٹیکتے مکان کی طرف چلی جو تباہ ہو چکا تھا اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ عرصہ قبل قزاقوں نے اس طرح اس کے مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی

اور گاؤں تباہ کر ڈالا تھا۔ لیکن یہ ہستی لڑائی اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

وہ بھوکی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی آکر اس کا دل بہلائے۔ اس نے پگ کو آواز دی۔ اس کے جواب میں جیسے کسی نے پکارا۔ لڈل پگ کے بوئے ہوئے کھیت کے قریب کسی کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔

"ہائے پگ" اس کے منہ سے نکلا۔ وہ تیز تیز کھیت کی طرف چلی۔ دو چار آوارہ کتے دم دبائے اس کے ساتھ ہو لیے۔ جب وہ شکستہ ہوائی جہاز کے قریب پہنچی تو کتے غرائے۔

"چپ رہو" اس نے انہیں ڈنڈا بتاتے ہوئے کہا "میرے کان ویسے ہی پھٹے جارہے ہیں۔ اس پر تمہاری گڑبڑ!" پھر اس نے ڈنڈے سے جہاز کے پنکھے کو مارا۔ چاندی کے ہیں، چاندی کے! اس نے کتوں سے مخاطب ہو کر کہا" شاید ہم امیر بن جائیں"۔

ملبے میں اسے انسانی صورت نظر آئی۔ کتے بھونکنے لگے۔ "دور ہو مردودا!" اس نے نیم مردہ نوجوان کو ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مرچکے ہو" اس نے قدرے حرکت کی۔ اس کے جسم سے خون ابل رہا تھا۔ "زخمی ہو گیا بچارہ" اس نے کلائی ہاتھ میں لی، جو گرم تھی۔ "تم باہر نکل آؤ میں تمہارا علاج کروں گی۔ تم اچھے ہو جاؤ گے"۔ نوجوان نے کچھ منہ ہی منہ میں کہا۔ وہ بلکل سمجھ نہ سکی۔ وہ اسے بدقت تمام ملبے سے گھسیٹ لائی۔

اس نے شریر کتوں کو پھر دھتکارا۔ جو زخمی نوجوان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے وہ اسے سہارا دیئے گھر تک لے کر آئی۔ اس نے اسے چبوترے پر لٹا دیا۔ نوجوان کوٹ کی اندرونی جیب سے چھوٹی بوتل نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ شراب باقی تھی۔ اس نے اسے پلا دی۔ اور زخموں کو مرہم پٹی کرنے لگی۔ نوجوان نے کراہتے ہوئے پھر کچھ کہا۔ وہ سمجھنے سے قاصر رہی۔ لیکن اشارے سے سمجھ گئی کہ پیاس سے بیتاب ہے وہ قریب ہی پڑے ہوئے ٹھیکرے میں پانی لے آئی۔ پھر وہ نان بائی کی دکان کی طرف گئی۔ مکان کی دیواریں گر پڑی تھیں اور اندرونی حصے سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے ہمت نہ ہاری منہ پر کپڑا اوڑھ کر وہ اندر گھس گئی اور تھوڑی دیر بعد تین چار گرم گرم روٹیاں نکال لائی۔

"میں بڑی سخت جان ہوں۔ مجھے مار ڈالنا آسان نہیں" اس نے نصف روٹی توڑتے ہوئے کہا۔ کاش کچھ سالن یا چائے کی ایک پیالی مل جاتی۔ لیکن ایسے میں لوازمات ملنا دشوار ہے"۔

اس نے کوچے سے باہر آکر دیکھا کہ نوجوان کے گرد چند سپاہی کھڑے تمسخر اڑا رہے تھے۔

"تم نے اس جاپانی کو کہاں پایا" بوڑھی ماں" ایک نے کہا۔

"کیا یہ جاپانی ہے"۔ وہ چلا اٹھی۔ لیکن یہ تو ہم جیسا ہے۔

"یہ جاپانی بندر ہے"۔

دوسرے نے کہا۔ یہ عمدہ عمدہ غذا کھاتا ہے اور ہمیں ترساتا ہے۔

"مجھے روٹی دو" ایک لڑکے نے کہا۔ اس نے توڑ کر دی۔ اس نے ایک ایک کر کے سب کو بانٹ دی "اب تم لوگ چلے جاؤ۔ ایک سپاہی نے چاقو کھولتے ہوئے کہا۔ کیا یہ حقیقت میں مر چکا ہے یا بنا پڑا ہے۔ میں اسے ختم ہی کیوں نہ کر ڈالوں۔ نہیں۔ مسز وانگ نے اسے ہٹا دیا۔ مرتے کو مارنے سے کیا فائدہ..... جاؤ!....."

وہ چلا گیا۔

تو کیا یہ سچ جاپانی ہے۔ کتنا خوبصورت ہے لیکن کتنا خطرناک۔ اس نے اس کی نبض دیکھی۔ دل پر ہاتھ

رکھ دیکھا۔ آواز بند تھی۔ لیکن اسے یقین نہ آیا۔ وہ ٹکڑے کو اس کے منہ تک لے گئی۔ "کھاؤ۔ عمدہ اور تازہ ہے۔" مگر اس نے جواب نہ دیا۔ اس نے مجبوراً بقیہ روٹی کھالی۔

دفعتاً آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ بند پر چڑھ آئی۔ اس نے دریا پر نظر دوڑائی۔ جو چڑھاو پر تھا۔ اس نے نفرت سے پانی پر تھوک دیا۔

گڑبڑ بڑھتی گئی۔ دشمن کی فوج چڑھی آرہی تھی اور اس پر جہاز منڈلا رہے تھے۔

مسز وانگ غصے سے کانپ اٹھی۔ تم نے گاوں کا صفایا کر ڈالا۔ اب میری جان کے پیچھے پڑے ہو۔ درندو! اچھا میں بھی تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گی۔

یکایک اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس کو پانی کے دروازوں کا خیال آیا۔ "شاید میں اکیلی ہوں۔ کاش مسز یک کے ہونے والے بچے کو دیکھ کر مرتی!" جاپانی کھیتوں کو روندتے چلے آرہے تھے۔ "اگر دروازوں کو کھول دوں تو وہ تنکوں کی طرح بہہ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نہ بچوں گی۔ کیا مضایقہ۔ دشمن کا ٹڈی دل تو ختم ہو جائے گا۔ لوگ بندوقوں، تلواروں اور ہوائی جہازوں سے لڑتے ہیں۔ لیکن میں حقیر پانی سے دشمن پر فتح حاصل کروں گی۔" اس نے زور لگا کر دروازے کھول دیے۔

پانی زور شور کرتا آن کی آن میں کھیتوں میں پھیل کر فوج کو جا لیا۔ معاً دھماکے کی آواز آئی۔ اور مسز وانگ بہتی ہوئی مردوں سے جا ملی۔

سید شبیر حسین قیس

ٹیپو سلطان کا پالکی نشین سفیر

سرنگاپٹم کی قدیم یادگاروں میں غلام علی لنگڑے کا ایک مقبرہ ہے۔ جو گنجان جھاڑوں میں چھپا ہوا ہے ایک بھولے بسرے ہوئے ویران باغ میں واقع ہے جہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مارتا۔ سیاحوں بلکہ وہاں کے باشندوں کا اس مقام پر ہی سے گزر ہوتا ہے۔ یہ محض ایک کڑی ہے جو غلام علی کا سرنگاپٹم سے تعلق ظاہر کرتی ہے۔ جو سلطان ٹیپو کے مشہور مقربین میں تھا۔ غلام علی کو ملک کی متعدد ذمہ دارانہ خدمات سپرد تھیں وہ تمام قلعہ جات و افواج سلطنت خداداد میسور کا ناظم اعلیٰ نیز امیر البحر تھا اور سلطان روم خلیفہ وقت کے دربار میں ٹیپو کی طرف سے خاص طور پر سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ باوجود ان گوناگوں ذاتی اور قطع نظر اس کے کہ وجع المفاصل کی وجہ سے اس کے پیر بیکار رہتے وہ اپنی خدمات کو نہایت قابلیت اور خوبی کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ اس کے ہمراہ ہر وقت ایک نفری پالکی رہا کرتی تھی جس کو بارہ آدمی اٹھاتے تھے۔ اور اسی میں ہر جگہ نقل و حرکت کیا کرتا تھا۔ ٹیپو سلطان نیز سرنگاپٹم کے رہنے والے اس کو غلام علی لنگڑا پکارا کرتے تھے۔ اور انگریز بھی اس سے خوب واقف تھے اور اس کو "غلام علی آف دی سلور چیر" پکارتے تھے۔

سفر ترکی: اس لنگڑے ایلچی کی نہایت مشہور مہم ترکی کی سفارت تھی ۱۷۸۵ء میں وہ بنگلور سے ترکی روانہ ہوا اس کے ہمراہ میسور کے بہترین پانسو سپاہی اور چھ سو ملازمین تھے۔ چار جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا گیا جس کے ملاح اور کپتان سب ٹیپو سلطان ہی کے ملازم تھے بیش قیمت جواہرات اور خلعتیں خلیفۂ وقت اور ان کے محلات کے لیے بطور تحایف ان پر بار کی گئیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ان تحایف میں میسور کے جنگلوں کے چار بڑے ہاتھی بھی تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ رستے ہی میں مر گئے۔

پچاس دن کی مسافت کے بعد یہ لوگ کہیں بصرہ پہنچے اور یہیں سے غلام علی کی قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کیا۔ اس کے ایک جہاز میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر خاک ہو گیا۔ جس میں نہایت بیش قیمت ساز و سامان موجود تھا۔

ناخوشگوار تاخیر: بصرے میں میسوری سفیر کا سلیمان پاشاہ گورنر وقت نے نہایت پرجوش خیر مقدم کیا اور یہاں تک ... یہاں سے آگے جانے نہ دیا۔ قسطنطنیہ کہ دریا کے رستے سے بغداد اور وہاں سے جانے کی بھی اجازت نہ دی۔ اور جب کبھی غلام علی جانے کی اجازت چاہتا تھا تو اس کو نہایت ٹھنڈے دل سے جواب ملتا کہ خلیفۃ المسلمین نے بصرے کے صوبیدار کو عظیم الشان سلطنت میسور کے معزز سفیر کی خاطر مدارات سے ہاتھ اٹھانے کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔

آخر کار تقریباً ایک مہینے کے بعد سلیمان پاشاہ نے جانے کی اجازت دی، اور یہ قافلہ بغداد تک دریا سے اور وہاں سے براہ خشکی قسطنطنیہ پہنچا غلام علی اپنے نفری میانے میں جو بارہ میانہ برداروں کے کاندھوں پر دار السلطنت گیا۔

۵ - یہ وہی غلام علی لنگڑا ہے جو انگریزوں کے ساتھ زبردست سازش میں شریک تھا اور بالآخر سلطنت میسور کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ... ٹیپو جب ... ہوا تو غلام علی ... کی ... "اشی راشٹن ... آسمس راحیدرا..."

ناکام سفارت | بظاہر خلیفۃ المسلمین کو میسور کے سفر کے متعلق بہت کم علم تھا۔ چنانچہ خلیفہ نے چھ مہینے تک سفیر کو باریاب نہیں کیا۔ اور بالآخر جب اس کو باریابی کی اجازت ملی تو بس بقول مسٹر ولکس اس کی باریابی اس طرح ہوئی کہ خلیفۃ المسلمین جھروکے میں برآمد ہوئے اور سفیر نیچے ہی سے تسلیمات بجا لایا۔ خلیفہ نے اپنے ایک مصاحب سے دبی آواز میں مخاطب ہو کر اس سے دریافت کیا کہ کیا آپ کا مزاج اچھا ہے۔ انہیں الفاظ کو تین اشخاص نے یکے بعد دیگرے دہرایا اور یہہ پیام سفیر کے کانوں تک پہنچا دیا گیا۔ جس کا جواب یہہ ادا کیا گیا کہ خلیفۃ المسلمین کی دولت و اقبال کے لیے دعا کرتے ہیں۔

سوال:۔ آپ بہت تھک گئے ہوں گے۔

جواب:۔ تکلیف اب راحت و مسرت سے بدل گئی ہے۔

اس کے بعد ہی فوراً اجازت چاہی اور سفیر معہ جماعت ہندستانی تین فرشی سلام بجا لا کر رخصت ہو گئے۔ یہہ لوگ نو ماہ کے قیام کے بعد آخری ملاقات کے لیے پھر باریاب ہوئے اور اس میں کوئی شرف تکلم حاصل نہیں ہوا۔ صرف تسلیمات بجا لا کر رخصت ہو گئے۔

سفیر کیمپ میں وبا طاعون | اگرچہ کہ سیاسی نقطۂ نظر سے سفارت ناکام رہی، مگر آو بھگت اور خاطر و مدارات کے لحاظ سے بہت کامیاب رہی۔ قسطنطنیہ میں قیام کے زمانے میں سفیر کے لیے مختلف دعوتیں اور جلسے کیے گئے اور اس سے نہایت اخلاقانہ برتاو کیا گیا۔ اس قسم کے ایک مظاہرے میں سلطنت میسور کے پانسو سپاہیوں نے اپنے ماہرانہ ہندستانی فوجی کرتبوں سے ترکوں کو محظوظ کیا۔

اس مہمان نوازی کے زمانے میں سوئے اتفاق سے ان کے کیمپ میں طاعون پھوٹ پڑا اور تین دن میں کوئی سو آدمی طاعون کا شکار ہو گئے تو غلام علی نے اپنے ساتھیوں کی اس طرح موت سے متاثر ہو کر قسطنطنیہ کو خیرباد کرنے کا حکم دیدیا۔ جس کی تعمیل تو ہوئی مگر اس وقت جب کہ ساتھیوں میں سے پانسو بیٹھ موت کا شکار ہو چکے تھے۔

غلام علی کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اسکندریہ سے پیرس جائے مگر اس کو اس بڑی آفت سے نجات ملی۔ کیونکہ اس کو ان قلیل ساتھیوں اور رقم کے ساتھ فرانس جانا پسند نہ تھا۔ ایک فرانسیسی مسافر نے جو ہندستان سے آرہا تھا غلام علی سے کہا کہ ٹیپو سلطان نے فرانس کو دوسرے اشخاص بھیجے ہیں۔

غلام علی نے اپنے تہیہ کر لیا کہ وطن واپس ہو جائے اور مصری کشتیوں کو کرایے سے حاصل کر کے دریائے نیل میں قاہرہ تک سفر کیا۔ اور وہاں سے اونٹوں پر سویز پہنچا۔ اس سفر میں گویا اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اپنی نقرئی پالکی سے محروم رہا۔ کیونکہ بارہ پالکی برداروں کے منجملہ طاعون سے صرف ایک ہی بچ رہا تھا۔

پھر سویز کی بندرگاہ سے غلام علی جہاز پر سوار ہو کر جدہ پہنچا اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی زیارت کی۔ مکہ میں غلام علی کی ہوشیاری اور چالاکی کی آزمایش ہوئی۔ شریف مکہ کو اس کے ساتھ بیشمار نقد اور جواہر کے صندوق دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا اور یہہ تجویز سوجھی کہ ان لوگوں کو اپنے ہی پاس مہمان رکھا جائے جب تک کہ ان سے رقم وصول نہ کر لی جائے اگرچہ کہ وہ بطور قرض ہی کیوں نہ ہو۔

شریف مکہ کی ناکامی | سفیر میسور اس پر آمادہ تھا کہ وہ شریف مکہ کا مہمان رہے۔ مگر یہہ اپنے قیام گاہ پر آیا اور ٹیپو سلطان کے خط کا ایک کاغذ لیا اور اس پر ٹیپو کی طرف سے یہہ لکھا کہ سلطان ٹیپو کی فوج ہندستان کی ہر فوج کو شکست دینے کے بعد پانسو جہازوں کے بیڑے کے ساتھ عربستان آئے گی۔ اور اس خط پر سلطان ٹیپو کی مہر ثبت

کر کے یہ انتظام کیا کہ یہ خط کسی نہ کسی طرح شریف مکہ کے ہاتھ لگ جائے چنانچہ اس حکمت عملی کا نتیجہ حسب خواہش فوراً ہی نکل آیا اور شریف مکہ نے ٹیپو سلطان کے سفیر کو جہاں کہیں بھی جانا ہو جانے کی اجازت دیدی۔

ہندوستان سے گویا پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد ملک عرب سے یہ قافلہ منگلور روانہ ہوگیا۔ واپسی کے وقت چونکہ بہت سے ساتھیوں یعنی گیارہ سو اشخاص میں سے صرف اڑسٹھ باقی رہ گئے تھے جو جہاز کے صرف ایک کونے میں آ گئے۔

انگریز مورخ مسٹر ولکس لکھتا ہے کہ "جب اس سفارت کے معتمد نے اخراجات سفر کا حساب لگایا تو ہمراہیوں کی تنخواہیں اور آتش زدہ جہاز کی قیمت شامل کر کے کوئی بیس لاکھ روپیہ اس سفر میں صرف ہوئے اور اس کثیر اخراجات کا صلہ کیا ملا۔ وہی ایک سلطان روم کا ایک فرمان جو واپسی کے وقت دیا گیا تھا اور پینتیس نصف سائز کی تختی پر لکھے ہوئے اخبارات دیے گئے تھے جن میں صرف دو لکھے ہوئے تھے۔ ان کاغذات کی قیمت جو بہت بھدے تھے پانچ روپیہ بھی بمشکل ہوگی۔

غلام علی جب وطن واپس ہوا تو اس کا ٹیپو نے خوش آمدید استقبال نہیں کیا۔ سلطان کو بہت غصہ آیا۔ اور غلام علی کو خدمت سے علیحدہ کر کے اسی کے گھر میں نظر بند کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ٹیپو کا غصہ اتفاقی طور پر اتر گیا۔ لیکن وہ غلام علی اور اس کے تین نائبین کو طعنہ "آدم خوار" کہا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ قسطنطنیہ سے اپنے ساتھیوں کو کھا کر واپس ہوئے تھے۔ **سخاوت مرزا** بی۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ)

صنم کدہ

نوعِ آدم کے بچپن کی تاریکی چھٹنے لگی، انسانی شباب کا سورج طلوع ہوا اور میرے بے چین قلب میں گھنٹے بجنے لگے ـــــ شاید پوجے کا وقت ہو چکا۔

صنم کدے کے دروازے خود بخود کھلنا شروع ہو رہے ہیں میں اندر بڑھتا جا رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں پوجا کی تھالی ہے ـــــ پوجا کی تھالی جس میں ایک دل رکھا ہوا ہے جو مسرت کی تلاش میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے اور ایک دماغ بھی ـــــ آج جو دنیا کی گتھیوں کو سلجھانے کی تدبیریں سوچتے سوچتے پژمردہ ہو گیا ہے۔

لیکن یہاں تو ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے شاید میں صنم کدے کے درمیانی حصے میں پہنچ گیا ہوں ـــــ اور وہ چھوٹی چھوٹی شمعیں جو قریب قریب نظر آ رہی ہیں اوہو! وہ تو ایک ایک دیوتا کے سامنے رکھی ہوئی ہیں دیکھو تو ان کی روشنی کتنی مدھم ہے کہ سوائے دیوتا کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ میں پوجا کروں گا اس دیوتا کی جو سب میں زبردست ہے ـــــ اور جو میری پریشانیوں اور مشکلات کو رفع کر سکتا ہے۔ جو دنیا میں محبت اور عشق کے بیج بو سکتا ہے۔ جو غلاموں کو غلامی اور مفلسی سے نجات دلا سکتا ہے۔ میں پوجا کروں گا اس کی جو در حقیقت پوجنے کے لائق ہے اور جس کی تلاش میں میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ـــــ کیا تم میری پوجا کی تھالی کو نہیں دیکھتے؟۔ کیا یہ میری تلاش کی شاہد نہیں؟

لیکن اے دیوتاؤ تم تو یہاں ہزاروں کی تعداد میں ہو ـــــ یہ بتاؤ کہ میں کس کی پوجا کروں؟ آہ! تمہاری پیشانیوں پر یہ کتنے خوبصورت الفاظ چمک رہے ہیں "آزادی، مساوات اور امن اور وہ کیا ہے ـــــ انسان دنیا میں آزاد پیدا ہوا ہے لیکن پابہ زنجیر ہے"۔ ان الفاظ سے تمہارا ملک شاید اس کی چارہ جوئی کرتا ہے۔ میں ضرور تمہاری پوجا کروں گا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے کہنے سے قبل ہی تم نے میری مشکلات کو سمجھ لیا ہے۔ اے دیوتاؤ میں ضرور تمہاری پوجا کروں گا۔

دیکھو تو میں سب سے پہلے اس دیوتا کے سامنے جھکتا ہوں جو میرے قریب ہے۔ لیکن یہ کیا! ـــــ اس کے سینے پر کندہ کیے ہوئے ان جلی حروف میں کیا لکھا ہے جو' ہاں! یہ تو گالیاں ہیں جو دوسرے دیوتاؤں کو دی گئی ہیں اس شفاف سینے پر تو ان کی کمزوریوں کے راز فاش کیے گئے ہیں ـــــ نہیں میں اس دیوتا کی پوجا نہیں کروں گا شاید کسی اور دیوتا کے سینے پر اس کے بھی راز افشا کر دیے گئے ہوں۔

دیکھو میں دوسرے دیوتا کے قریب پہنچ گیا میری نظر اس کے سینے پر جمی ہوئی ہے۔ آہ! یہاں پر تو اس پہلے دیوتا کی کمزوریوں کو اور زیادہ جلی حروف میں لکھا گیا ہے اور پھر اسے برا بھلا بھی کہا گیا ہے۔ اب میں تیسرے دیوتا کے قریب ہو رہا ہوں۔

شاید اب میں نے صنم کدے کی پہلی صف کے دیوتاؤں کا جائزہ لے لیا ہے۔ آہ ان کی پیشانیوں پر چمکتے ہوئے خوبصورت الفاظ ـــــ آخر ان سب کا مقصد ایک ہے تو پھر آپس میں یہ جنگ کیسی؟

پوجا کی تھالی بدستور میرے ہاتھ میں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ان سب میں میں کس کی پوجا کروں ـــــ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہ آخری پوجا بھی رائیگاں ہو جائے ـــــ نہیں آج میں اپنی مشکلات کا حل دریافت

کرکے ہی رہوں گا۔ لیکن اب مجھے ان دیوتاؤں سے نفرت سی ہو چلی ہے۔ ان کی تمام کمزوریاں مجھ پر فاش ہو چکی ہیں اب میں ان میں سے کسی کے دھوکے میں بھی نہیں آسکتا۔ وقت زیادہ ہو چلا ہے اور میری پوجا ابھی تک ختم نہیں ہوئی......

اس پہلی صف کے پیچھے بتوں کی ایک اور صف بھی تو ہے لیکن اس کے نظارے ہی سے میری امیدیں ختم ہو رہی ہیں اس صف کے بت تو اور بھی کمزور ہیں ان میں سے بہت سارے ٹوٹ چکے اور بہت سے ٹوٹنے کے قریب ہیں۔ بعض کے سامنے کی تو شمعیں تک گل ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی میری پوجا کے قابل نہیں اور مجھے کافی دیر ہو چکی ہے ــــــ اب میں ان میں سے ہر ایک کے پاس کہاں جاؤں۔

لیکن کیا میری پوجا کی تھالی بدستور میرے ہاتھ میں رہے گی؟ ــــــ کیا میں ہمیشہ ان ہی مصایب اور مشکلات میں گرفتار رہوں؟ ــــــ نہیں، آج میں یہ معلوم کر ہی لوں گا کہ زندگی کیسے گذاری جاتی ہے، میری مشکلات کا حل کیا ہے۔ اے دیوتاؤ تم میں سے کوئی بھی میری پرستش کے قابل نہیں۔ اس دنیا کے تمام جھگڑے شاید تمہارے ہی پیدا کیے ہوے ہیں۔ دنیا میں حسن و عشق کے ترانے گانے کے لیے تم سب کو فنا کر دینا ضروری ہے۔

یہ دیکھو میرا خونی خنجر فضا میں بلند ہو رہا ہے۔ آہاہاہا اس کے بلند ہوتے ہی تم سب بے تحاشہ منہ کے بل گرو گے ــــــ سنو کان دھر کر سن لو کہ یہ آخری انقلاب ہے ــــــ اس کے بعد یہاں اور کوئی انقلاب نہیں ہوگا شاید تم میں کا ہر ایک ایک زبردست انقلاب کی پیداوار ہے۔ آہاہاہا تم انقلاب کی پیداوار ہو اور انقلاب ہی تمہیں موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔

تم سب نیچے آ چکے! ــــــ تم سب فنا ہو چکے! آہ اب میرا خونی قہقہہ محبت کے ترانوں میں بدل جائے گا لیکن آہ! یہ بت کون ہے؟ یہ دیوتا جو دوسری صف میں کھڑا تھا ــــــ جس کے سامنے شمع بدستور جل رہی تھی لیکن جس کی طرف سے میں نے حقارت کے ساتھ نظریں پھیرلیں تھیں۔ وہ اب بھی ــــــ ہاں اس وقت بھی جب کہ تمام بت گر چکے ہیں بدستور اپنی جگہ کھڑا ہے اور اس کی شمع کی لو آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔ کیا یہ آخری انقلاب اسی کے لیے تھا؟ نہیں اب میں کسی بت کی پوجا نہیں کرونگا۔ اب میں ان بتوں کی حقیقت سے خوب آگاہ ہو چکا ہوں۔

یہ دیکھو میرا خونی خنجر فضا میں پھر ایک بار بلند ہو رہا ہے ــــــ اس بت کو فنا کرنے کے لیے۔ میں بڑھتا جا رہا ہوں ــــــ اس کے شفاف سینے پر وار کرنے کے لیے۔ اس کے سامنے رکھی ہوئی شمع کی لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی روشنی میں۔ لیکن آہ میرا خنجر تو وار کرنے سے پہلے ہی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا ــــــ اب مجھ پر غنودگی سی طاری ہو رہی ہے میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ اور مجھے ایک فرحت سی محسوس ہو رہی ہے ــــــ ایک ایسی فرحت جو میں نے پچھلے تمام دیوتاؤں کے قریب پہنچ کر بھی محسوس نہیں کی ــــــ شاید یہی دیوتا میری پوجا کے لائق ہے۔ میں پوجا کی تھالی کو اس کے چرنوں میں رکھ رہا ہوں اور مجھے ایک میٹھی نیند آ رہی ہے۔

کاش میں اس میٹھی نیند سے نہ چونکتا۔ اے دیوتا تو نے مجھے اتنا جلد کیوں جگا دیا ــــــ اب تو پورا صنم کدہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ اور میری پوجا کی تھالی؟

یہ کیا! اس میں تو صرف ایک دل رکھا ہوا ہے ہاں میرے پژمردہ دل اور دماغ کی بجائے صرف ایک تروتازہ دل۔ اور یہ اس کے بازو میرا خنجر۔ لیکن اس سے کتنی سریلی آواز بلند ہو رہی ہے۔ تو تم بھی سنو کہ کتنی رسیلی آواز میں میرا دل کہہ رہا ہے۔

نعیم الدین احمد (عثمانیہ)

آں کس کہ مرا نام خراباتی کرد

کسے معلوم تھا کہ یعقوب بن لیث صفار کے کم سن اور ناسمجھ بچے کے معصوم ہونٹوں سے نکلے ہوے الفاظ فارسی اور ہندستانی ادب کا مایہ ناز مقولہ قرار پائیں گے؟ کس کو علم تھا کہ "خیام" ایک غریب خیمہ دوز کا لڑکا اپنے نام کو منصہ شہود پر جلوہ گر کرے گا اور اپنی لازوال شہرت سے خراسان و ایران ہی نہیں بلکہ ایک جہان کو اپنا حلقہ بگوش بنالے گا۔ قادر مطلق نکتہ نواز ہے جسے چاہے چن لے۔ پتھر میں سے ہیرا، مٹی سے پھول دھوپ سے پانی یہ سب اس کی قدرت کا ادنا کرشمہ ہے۔ آیے! ذرا دیکھیں کہ "خیام" کون ہے۔ اور کیا ہے؟

جاے پیدایش | آسمان رباعی کا یہ پیکر رخشندہ ملک خراسان کے ایک شہر نیشاپور میں عالم وجود میں آیا اس کی پیدایش ایک غریب خیمہ دوز کے گھر میں ہوئی۔

نام و تخلص | اصل نام غیاث الدین ابو الفتح عمر بن ابراہیم تھا۔ تخلص عجز و انکسار کے باعث اپنے والد کے پیشے کی رعایت سے خیام اختیار کیا اور اسی نام سے مشہور ہوا۔

تعلیم و تربیت | نیشاپور کے اعلیٰ دار العلوم میں تعلیم حاصل کی۔ ذاتی ذہانت و فطانت کے باعث بہت جلد ترقی کی۔ اعلیٰ منازل طے کرلیں تحصیل علم و فضل میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ علم شعری کے علاوہ اسکو علم ہندسہ، نجوم، فلسفہ، فقہ، تاریخ میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ حکمت کا یہ عالم تھا کہ جو بات منہ سے نکلتی اثر رکھتی۔

شعر و سخن | ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ معترضین کے نزدیک "قدح خوار" خیام صرف شراب کی تعریف کرنا جانتا ہے۔ کاش کہ چشم بصیرت ہو اور دیکھیں...! بھولے لوگ!! یہ نہیں سمجھتے کہ عیب کرنے کو بھی لازم ہے شعور۔ خیام کا طرز سب سے انوکھا، اچھوتا اور قطعی نرالا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے۔ ایک ایک مضمون کو کئی کئی سو طرح باندھنا، خیام کے سوا کسی کے بس کا روگ نہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ ایک ہی صنف میں مناظر قدرت مدح و قدح، تصوف و فلسفہ، علم و حکمت، عشق و عاشقی، غیرت و حسن معاشرت، شہود و وجود، خفا و ظہور، حقیقت و فنا، سزا و جزا، زندگی و موت، قضا و قدر، اور غیرت اور انکسار کو ایسے عجیب اور دلآویز انداز میں ادا کرنا خیام ایسے قادر الکلام شاعر ہی کا حصہ ہے یہ بات دنیا کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں۔ ہر شاعر کی شاعری کروٹیں لیتی ہے۔ کبھی ہزج ہے تو کبھی رمل۔ کہیں مجتث ہے تو کہیں مقتضب۔ ابھی متدارک تھی تو ابھی متقارب۔ غرض کہ یہی سلسلہ اساتذہ کرام سے چلا آرہا ہے۔ یہ صرف خیام کی رنگین، جبلی جدت پسند اور متنوع طبیعت کا اقتضا تھا کہ ایک ہی صنف کو نکتہ ارتحال قرار دیکر رباعی کے ماہ کدہ میں انقلاب برپا کردے اور آسمان شاعری پر ماہتاب بن کر جلوہ گر ہو۔ اور آفتاب بن کر چمکے۔

حکمت و کمال - یوں تو شاعر "تلمیذ الرحمٰن" ہوتا ہے

"خیام کا فضل و کمال سونے پر سہاگہ ہے۔ یا یوں کہیے!
عروس جمیل و لباس حریر" جو کہتا وہ ہو کر رہتا۔

ارباب وفا | عمر خیام کے ہم سبق حسن بن صباح اور خواجہ نظام الملک طوسی تھے۔ ایک دن خیام نے کہا "آؤ ہم مواخات کا عہد کریں۔ دنیا کہتی ہے امام موفق کے شاگرد بہت خوش نصیب ہوتے ہیں...... اگر ہم میں سے کسی کا بخت یاوری کرے تو اسے لازم ہوگا کہ اس وقت کو یاد رکھے اور اپنے دوستوں کی ہر ممکنہ مدد کرے" نظام الملک اور حسن بن صباح نے قہقہہ لگایا۔ مگر خیام نے کہا "نہیں یہ ایک سچی اور شدنی بات ہے"

زمانہ شاہد ہے خیام نے جو کہا وہ سو فیصدی پورا ہوا۔ نظام الملک طوسی نے اپنا عہد پورا کیا اور خیام کو دو سو روپیے ماہوار کی جاگیر صرف اس لیے عنایت کی کہ وہ فکر معاش سے آزاد رہ کر علم و ادب کی پوری پوری خدمت کر سکے۔

چہار مقالے میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ شاہ وقت کو شکار کا شوق ہوا۔ خیام سے مشورہ کیا گیا کہ اپنے علم نجوم سے ایسا وقت مقرر کرے جب کہ بارش نہ ہو اور بادشاہ اطمینان سے شکار کھیل سکیں۔ خیام نے غور و فکر کے بعد ساعت مقرر کی۔ اتفاق دیکھیے کہ خیام کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور پانچ روز مطلع تک ابر آلود نہ رہا۔

نظامی سمرقندی نے لکھا ہے کہ خیام نے مجھ سے کہا تھا کہ "میری قبر پر سال میں دو مرتبہ پھول برسا جائیں گے۔ خیام کی وفات کے بعد مجھے ان کے مرقد کو دیکھنے کا شوق ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں دیوار کے زیر سایہ تربت ہے۔ سرہانے امرود اور زرد آلو کے درخت ہیں۔ شگوفے جھڑ جھڑ کر ڈھیر لگ گئے ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔"

تصانیف | خیام نے ضخیم کتب نہیں لکھیں۔ صرف چند چند رسایل پر اکتفا کیا ہے۔ جن کی تعداد بارہ یا تیرہ ہے مگر سچ پوچھیے تو کوزے میں دریا بند ہے۔ مختصر رسایل میں وہ اجمال ہے جس پر ہزاروں تفاصیل قربان۔ حقیقت وجود پر ایک رسالہ طبع کیا ہے۔ کون و مکان پر بھی قلم اٹھایا ہے ایک زیچ تیار کی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ناسازگار ماحول نے خیام کے راستے میں کانٹے بچھا دیے۔ ورنہ آپ خیام ہی سنتے کہ وہ کیا ہیں؟ حالات نے نامساعدت کی حاسدوں نے بدنام کر دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ خیام فلسفہ یونان کا درس دیتے۔ اسی فلسفے کا جس نے ارسطو کی جان لی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر گام پر ٹھوکریں مقدر رہیں۔

شہرت | خیام نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کو مقبول ہوتے دیکھا۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی غیور طبیعت کا استغنا اس امر کا متمنی نہ تھا کہ ان کی تعریف و توصیف ہو۔ بلکہ جو کہا وہ صرف اس لیے ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کیوں نہ ہو؟ عربی فارسی ادب میں شیخ سعدی کے بعد یہ پہلے شاعر ہیں۔ جنہوں نے تملق و چاپلوسی کو باعث ننگ و عار سمجھا۔ زبان خامہ کبھی فضول یاوہ گوئی اور بیجا ہرزہ سرائی سے آلودہ نہیں ہوئی باوجود اس کے بادشاہ مسند پر برابر جگہ دیتے۔ ہر طرح عزت و تکریم ہوتی۔ بد قسمتی سے ہم نے ایک بلند پایہ اور اعلیٰ مرتبہ حکیم کو نہیں پہچانا۔ مگر اہل یورپ نے ٹیگور کی طرح خیام کو بھی اپنے سر کا تاج سمجھا۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اپنی طرز تحریر سے دامن خیام پر مے گلگوں کے ارغوانی دھبے بہت ہی نمایاں دکھائے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔
مگر میں بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ ان کی رباعیات میں ایک لطیف نشہ، ایک رنگین و سرمدی کیف پنہاں ہے۔ ہے خیام

کی خمریات میں حقیقی شراب کا نشہ اور اصلی شہد کی مٹھاس ہے ان میں قند کی شیرینی اور پھول کی بو ہے۔

نمونہ کلام | کہتے ہیں محفل عیش و نشاط گرم تھی۔ شمع محفل روشن تھی۔ جملہ سامان عیش و طرب جمع تھے۔ خیام دنیا و مافیہا سے مستغنی داد عشرت دے رہے تھے کہ آندھی کے ایک تیز و تند جھونکے نے شیشہ و پیمانہ ٹکرا دیا۔ ساغر و مینا چکنا چور ہو گئے۔ تاریکی چھا گئی اور تمام مجلس درہم برہم ہو گئی۔ خیام کے دل پر چوٹ لگی بے ساختہ کہہ اٹھے۔ ؎

ابریق مئے مرا شکستی ربی　　بر من در عیش را بہ بستی ربی

بر خاک فگندی مئے گلگون مرا　　"خاکم بدہن" مگر تو مستی ربی

رباعی کا کہنا تھا کہ چہرے پر تاریکی چھا گئی۔ آئینے میں صورت دیکھی اور بول اٹھے۔ ؎

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو؟

آں کس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو؟

من بد کنم و تو بد مکافات دہی؟

پس فرق میاں من و تو چیست بگو؟

معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو بھی یہہ دلفریب شوخی پسند آگئی۔ چشم زدن میں خیام کا چہرہ بدر منیر بن گیا۔ ملاحظہ ہو! رباعی کیا ہے؟ گویا پیکر خیام مجسم التجا بن کر بارگاہ حقیقی میں سر بسجود ہے "بگو" میں کیسا درد و کرب پنہاں ہے؟ اور "من بد کنم" کہہ کر کس انداز سے گناہوں کا اقرار کیا ہے کتنی بے کسی ہے؟ کس درجہ عجز و انکسار کا مظاہرہ ہے اور چوتھے مصرع میں تو کمال ہی کر دیا۔ شان رحیمی کو عجز و عبودیت کا واسطہ دیکر کس درد سے پکارا ہے؟ کہ الاماں ؎

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور

یا با صنمے سادہ رخے خنداں خور

بسیار مخور و رد مکن فاش مساز

اندک "خور" گہہ گاہے خور و پنہاں خور

اس رباعی کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ خیام کا مطمح نظر صرف شراب تھا ؎ کتنی حکیمانہ بادہ نوشی ہے یہہ؟ بار بار پڑھیے اور غور کیجے؟ کیا کوئی سیہ مست اس نظریے کا حامل ہو سکتا ہے؟ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے ان شرایط کا لحاظ کون رکھ سکتا ہے؟ اور کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں ماننا ہوگا کہ قیود و حدود کو مد نظر رکھتے ہوے "مے نوشی" کرنا کسی عاقل و فرزانہ شخص کا ہی کام ہے ؎

اے کوزہ گر آب نوش اگر ہشیاری

تا چند کنی بر گل آدم خواری

انگشت فریدوں و کف کیخسرو

بر چرخ نہادہ چہ سے پنداری

تخیل کی رفعت ملاحظہ ہو! ناممکن ہے کہ خیام کا مشرب صرف پینا پلانا ہے وہ اپنے انجام سے خبردار ہیں۔ گیتی کا ہر ذرہ اپنی دعوت فنا دیتا ہے۔ جبھی تو پکار اٹھتے ہیں کہ اے کوزہ گر! یہہ کیا ہے؟ تو کب تک آدم کی مٹی خراب کرتا رہیگا۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ یہہ مٹی کیا ہے؟ اے نادان! یہہ تو جلیل القدر فریدوں کی انگلی اور شاہنشاہ کیخسرو کا ہاتھ ہے۔

اس مضمون کو دوسری جگہ دوسرے انداز۔ اور جدید معانی کے ساتھ ایک علٰحدہ طرز میں پھر باندھا ہے۔ ؎

در کارگہہ کوزہ گرے بودم دوش

دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش

ہر یک بزبان حال با من گفتند

تو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

سچ کہیے! بے ثباتی عالم کا نقشہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟۔ اس سادگی میں کتنی رعنائی ہے۔ اور یہہ سفلی مٹی کے کوزہ کی تمثیل۔ آیات علوی کی مثالوں سے کتنی بلند و بالا ہے۔ ؎

قطرہ بہ گریست کہ از بحر جدائیم ہمہ

بحر بر قطرہ بخندید کہ مائیم ہمہ

در حقیقت دیگرے نیست جدائیم ہمہ
لیک از گردش یک نقطہ جدائیم ہمہ

وحدت وجود کا کتنا سچا نقشہ ہے۔ مثال کیسی عام فہم اور دلنشین ہے۔ کہاں ہیں وہ؟ جو خیام کو منکر خدا اور ملحد و دجال ٹھہراتے ہیں.......شاید اس بلند پایہ حکیم کو علم تھا کہ کسی زمانے میں آنے والی نسلیں انہیں مورد الزام ٹھہرائیں گی اور اسی لیے اپنی برات کے مدنظر بول اٹھے

از آتش ما دود کجا بود ایں جا؟
وز مایہ ما سود کجا بود ایں جا
آں کس کہ مرا نام خراباتی کرد؟
در اصل خرابات کجا بود ایں جا

میری آگ میں دھواں کہاں تھا؟ میرے سرمایے میں نفع کس دن تھا؟ کس نے مجھے خراباتی کہا؟ اے کور چشم! یہاں خرابات ہی کہاں؟...... جی چاہتا ہے پڑھیں اور سر دھنیں۔ اب سے

اے آمدہ وز عالم روحانی تفست
حیران شدہ در چہار و پنج و شش و ہفت
مے خور کہ ندانی از کجا آمدہ
خوش باش ندانی بہ کجا خواہی رفت

"مے خور" سے قطع نظر کتنی بہترین رباعی ہے۔ ترانہ کیا ہے۔ انسانی "ہست و بود" کا بہترین خاکہ ہے۔ تمام کائنات کو چہار و پنج و شش و ہفت میں ادا کر نا خیام ہی کا نادرہ ہے۔ کس مزے سے کہتے ہیں۔ اے نو وارد اے عالم بالا سے نکالے ہوئے انسان! تو کیوں اس درجہ حیران و پریشان ہے؟ یہ عناصر اربعہ۔ حواس خمسہ۔ شش جہات۔ اور ہفت آسمان تجھے کیوں دیوانہ بنائے ہوئے ہیں۔ جب تجھے اپنی ابتدا و انتہا کا ہی علم نہیں تو بہتر ہے کہ سب کچھ بھول جا اور خوش و خرم رہ۔ کیونکہ زندگی یہی ہے۔

مسز اے۔ کریم خاں

درس زندگی

اے عقل کے مالک سوچ کبھی
انسان تو ہے مجبور سہی
گر غم میں بسر ہے لطف یہی
ہنس ہنس کے لہو کے گھونٹ کو پی
سن دل کی صدا یہ درد بھری
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

اپنوں کی محبت اپنی سمجھ
غیروں کی ضرورت اپنی سمجھ
دشمن کی مصیبت اپنی سمجھ
مخلوق کی حاجت اپنی سمجھ
دنیا کی خوشی ہے تیری خوشی
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

ہے پریم کا بندھن تیرے لیے
اور حسن کے درشن تیرے لیے
ہر دل کا ہے درپن تیرے لیے
سب دھن اور تن من تیرے لیے
اک ڈور میں سب کو باندھ کے سی
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

جذبات میں ہو احساس وفا
احساس کو رکھ پابند حیا
دیوی کو بدی کے سر نہ چڑھا
اک پریم بھجن دنیا کو سنا
دکھ جھیل کے رہ ہر دکھ کے سکھی
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

یوں کہنے کو ہیں انسان بہت
ہیں دل میں بھرے ارمان بہت
دنیا ہے جنہیں آسان بہت
ہیں خود سے مگر انجان بہت
بڑھ اور کر ان کی راہ بری
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

تکلیف اٹھا ہر دل میں سما
حق پر ہے تو حق پیغام سنا
اٹھ سعی عمل کی شمع جلا
سنسار کو حق کی راہ دکھا
ہر دے میں جگہ دیں تجھ کو سبھی
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

دنیا نے لیے آنکھوں پہ قدم
اور پالا تجھے با ناز و نعم
گو لاکھ کیے دنیا پہ ستم
ہے آج بھی باقی تیرا بھرم
بگڑے نہ تیری یہ بات بنی
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

ہر لحظ مروت غیر سے کر
بیکار نہ حجت غیر سے کر
بے لاگ عنایت غیر سے کر
دکھ سہہ کے محبت غیر سے کر
دے دل میں جگہ دشمن ہی سہی
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

انسانیت سیکھ اور سکھا
الفت کا سبق پڑھ اور پڑھا
ہر ایک کی جیون میں ہو دیا
وہ دھیان اور گیان کا راگ سنا
صابر کی نصیحت مان ابھی
جینا ہے تو بس اس طرح سے جی

صابر القادری

کیفِ بہار

ننھے ننھے سفید بادلوں کے ٹکڑے نیلے آسمان پر تیر رہے ہیں۔ اور.... وسیع میدانوں میں سنہرے پھول.... ماہ مارچ کے سنہرے پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ سوسن ایک طرف مسکرا رہی ہے اور سنہرے پروں والی نازک موہنی چڑیاں گاتی پھرتی ہیں۔ نسیم صبح عطر بیز ہواؤں کے جھونکے بن کر.... مشام جان کو سرور بخش رہی ہے۔

ہری گھانس اور گیلی زمین کی سوندھی ملی جلی خوشبو بہار کی آمد کا پیغام دے رہی ہے۔ سنہرے پروں والی ننھی ننھی چڑیاں.... پھولوں کی شگفتگی اور غنچوں کا تبسم دیکھ دیکھ کر.... ترانۂ مسرت گا رہی ہیں.... بہار کا سحر آگیں زمانہ آگیا.... ننھی چڑیاں.... !

لالہ و نسترن.... اور نارنگی کے پھولوں کی مست خوشبو سے مسحور ہو کر ڈالیوں پر ناچ رہی ہیں۔ کیف و رنگینی تمام سبزہ زاروں میں فردوسی سماں پیش کر رہی ہے..... ہر طرف بہار آفریں نسیم و شمیم اٹکھیلیاں کر رہی ہیں.... لو بہار آئی ہے۔

گلاب کے سرخ غنچوں کی تبسم ریزیاں.... دل میں حسین گدگدی پیدا کر رہی ہیں۔ ذرہ ذرہ حسن کی بہار بکھیر رہا ہے۔

سفید چنبیلی کے سیماب وش پھول چاند کی روپہلی فضا دکھلا رہے ہیں۔ پھولوں کے زمردیں پتے ان کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ وسیع بیابان سے سرِ بلند و بالا شمشاد کے درخت تک.... ترانۂ الفت الاپ رہے ہیں۔ ہواؤں کے جھونکے.... بل کھاتی لہروں کا ملنا.... سانپ سانپ کرتے جو انہیں سرشار کر رہے ہیں.... گویا نغمۂ شاعری کی سریلی تانوں میں شاعر کی روح محو اکتسابِ حسن ہو رہی ہے۔ بے کیف وادیوں میں کائنات روح پھونک رہی ہے [illegible] سیماب وش سینوں سے قوس قزح کی رنگینیاں جھلک رہی ہیں۔ جیسے خوابوں کے حسین آغوش میں پریوں کا رقص ہے! کوئل کی کوک بہار کی شباب آفریں فضاؤں میں گونجنے لگیں۔ شبنم کے موتیوں جیسے قطرے سبز پتوں پر رقص باری کر رہے ہیں۔ دریا میں طلوعِ آفتاب کی ارغوانی شعاعیں حسن اور شادمانیوں کے نور برسا رہی ہیں.... وہی پھولوں کی رعنائی .... وہی نکہت بیز ہوائیں، وہی چڑیوں کے نغمے ریز گانے.... بہار کا دلکش جلوہ ہر گوشے میں سرایت کر رہا ہے۔ شاخ گلاب پر اسی طرح بلبل نغمہ سنج ہے ماہ مارچ کی حسین و زرنگار رنگ کے سفید اور ارغوانی پھولوں نے کسی زاہد کی جنت کا سماں پیش کر دیا ہے..... جمیلہ بیگم (کلکتہ)

تخلیق نغمہ

جب شگفتہ بہاروں کے رنگین دامن میں نوخیز کلیوں کی پوشیدہ مسکراہٹیں نمودار ہونے لگتی ہیں اور آسمانوں پر ایک کیف انگیز تبسم چھانے لگتا ہے۔

بہار کی نشیلی فضاؤں میں پھولوں کی مست کن خوشگوار بو پھیل جاتی ہے۔ شاداب کنول کی ریشمیں پتیوں میں سنہری مکھیاں شیریلی آواز سے گنگنانے لگتی ہیں۔

سرسبز تاکستانوں میں سوئی ہوئی بلبلوں کے دلنواز خواب دوش نسیم پر پرواز کرنے لگتے ہیں۔ بہار کی سنہری پری عجب طرح کے دل کش لباس میں فردوسی آسمانوں سے شاعر کی سنہری سرزمینوں پر اترا آتی ہے۔ اور بہار انگیز شاخوں کی تمام تر رعنائیاں رنگین شگوفوں میں سمٹ آتی ہیں۔ جب نیلگوں افق کے کناروں پر نارنجی رنگ کا خوبصورت آفتاب اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتا ہے، تب شاعروں کے خواب آسا تخیل میں سحر انگیز جذبات کا طوفان امڈ آتا ہے بلبل کے زمزمے پھول کی خوشبو آفتاب کے رنگین آبشار کا ترنم، کلیوں کا تبسم مل کر نغمہ بن جاتے ہیں اور بے ساختہ شاعر کے نیم خوابیدہ لبوں کی نامعلوم جنبش سے ایسے ابدی نغمے کی تخلیق ہوتی ہے جو دلوں کو برماتا ہماری روح کی گہرائیوں میں آپ ہی آپ جذب ہو جاتا ہے۔ **نزہت سلطانہ**

ایجادات

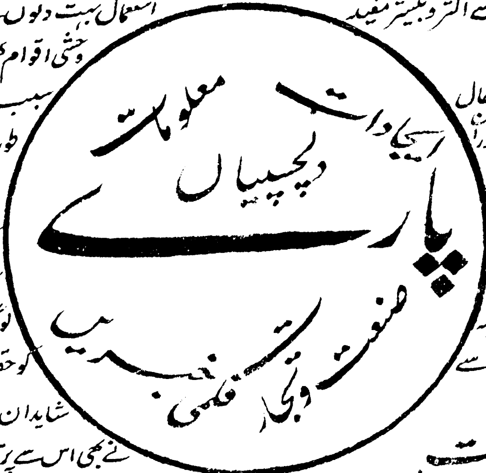
تارپیڈو روک | کوئینس لینڈ واقع آسٹریلیا کے باشندے فرانکلن بارنس نے یہہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کو ایک ایسا آلہ بنانے میں کامیابی ہو گئی ہے جو تارپیڈو کو اپنے نشانے تک پہنچنے سے روک دے گا۔ یہہ بارنس وہی مشہور آفاق موجد ہے جس نے کچھ عرصہ پہلے مقناطیسی سرنگوں کو خود بخود کھینچنے والی مشین ایجاد کی تھی۔ اس نے انگلستان میں پورے چار سال صرف کیے جہاں اس کے متعدد ڈیزائنس قبول کیے گئے اور ان میں سے اکثر و بیشتر مفید ثابت ہوے۔

بارنس انگلستان سے حال میں اپنے وطن کو لوٹا ہے۔ دوران سفر میں وہ اپنی اس تازہ ترین ایجاد پر مسلسل کام کرتا رہا اور اس کو یقین ہے کہ اس ایجاد میں سو فیصد کامیابی ہو گی۔ نیز یہ کہ جہاز تارپیڈو کا نشانہ بننے سے بچ جائیں گے۔

معلومات

لہسن کے خواص | اسی سنہ ۱۹۲۶ء میں میونچ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے مشہور سائینس داں پروفیسر ڈاکٹر مسٹر لیفورد نے ایک مقالہ طبع کرایا تھا۔ اس مقالے میں پروفیسر موصوف نے لکھا تھا کہ لہسن ایک عطیہ الٰہی ہے۔ اس کے استعمال کرنے سے دل و دماغ اور جسم تینوں کو ترقی ہوتی ہے۔ متواتر استعمال کرتے رہنے سے جسمانی طاقت بہت بڑھ جاتی ہے خون کی مقدار بھی کافی بڑھتی ہے۔ جسم کے بہت سے امراض اس کے کھانے سے اچھے ہو جاتے ہیں۔

نیو یارک کے مشہور ڈاکٹر لوڈسکی نے چند سال گذرے گاجر، مولی اور لہسن کے چند تجربات کیے تھے۔ وہ بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔



مانچسٹر میڈیکل ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ ڈاکٹر ای۔ سی۔ بریڈلے نے بھی لہسن کی تعریف کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ تپ دق سل اور دماغ کے عوارض میں لہسن سے بہت فائیدہ ہوتا ہے وہ تو لہسن کو دوائے کبیر کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور لہسن میں ایسے اوصاف ہیں جن کی وجہ سے حکمت کی کتب نے اور آیوروید گرنتھوں نے بھی اس کے استعمال کے لیے کافی زور دیا ہے۔ یونانی اور رومن اس کا استعمال بہت دنوں سے کرتے آرہے ہیں۔ افریقہ کے وحشی اقوام بھی اس کا استعمال کرتی ہیں یہی سبب ہے کہ یہہ قومیں آج بھی مکمل طور پر تندرست ہیں۔

ہندستان میں شاید اس کا استعمال پہلے کثیر مقدار میں ہوتا تھا۔ لیکن آجکل یہاں کے پنڈت لوگ اور وشنو اقوام کے آدمی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور شاید ان ہی لوگوں کی دیکھا دیکھی اوروں نے بھی اس سے پرہیز کیا۔

اس کا معاشرتی یا مذہبی سبب کچھ بھی ہو لیکن صحت کے خیال سے اس کو ترک کرنا ایک بڑی غلطی ہے۔ اس عظیم غلطی کے سبب ہی ہماری صحت کا تنزل ہو۔ اس لیے صحت کے خیال سے اس کا استعمال کرنا ضروری ہے۔

لہسن خون بڑھاتا ہے خون میں جراثیم کو دفع کرنے کی طاقت پیدا کرتا ہے اعصاب میں پھرتی اور طاقت پیدا کرتا ہے اور آنکھوں میں روشنی اور بصارت بڑھاتا ہے جسم میں دافع مرض کی قوت پیدا کرتا ہے۔ جلد اور ہڈی کے امراض میں فوراً فائیدہ کرتا ہے۔ اس لیے مشہور سائینس دانوں نے اس کی تعریف

کی ہے اس کا استعمال اگر مریض کرے تو اس کو مرض کے دفع کرنے میں امداد حاصل ہوگی اور اگر تندرست آدمی استعمال کرے تو اس کی صحت ہمیشہ اچھی رہے گی۔ لہسن میں جو بڑے معرکے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ اس کا حسن افزا اثر جسم کے ہر ہر عضو پر ملاحت اور چہرے پر تازگی و چمک لاتا ہے یہی اس کا پہلا خاصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ملک یونان میں آجکل عورتیں علی الصباح اٹھ کر حاجت ضروریہ سے فارغ ہو کر شہد کے ساتھ لہسن کا استعمال کرتی ہیں۔ سویڈن اور ناروے کی عورتوں کے سنگار دان میں آج بھی لہسن کی پوتھیاں قدر کا درجہ رکھتی ہیں۔ نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے ٹوکری بھر لہسن لڑکے والوں کی نذر کیا جاتا ہے۔ ان کی خوبصورتی کا یہی سبب ہے۔

لہسن تیز اور تلخ ہوتا ہے اس میں ایک خاص قسم کی بو ہوتی ہے۔ جو بہت تیز اور ناگوار ہوتی ہے۔ اس کے اس وصف کے سبب سے بعض بھولے بھالے مذہبی لوگ اسے قابل نفرت سمجھتے ہیں ان کا یہ سمجھنا ہی ناسمجھی کا باعث ہے۔

لہسن تاثیر میں گرم ہوتا ہے اس لیے ہندستان کے ان صوبوں کے لیے جہاں گرمی زیادہ پڑتی ہے اس کا استعمال صرف سردی کے دنوں میں کرنا مفید ثابت ہوگا۔ ہر ایک انسان جو اپنی صحت بنانا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ روز صبح حاجات ضروریہ سے فارغ ہو کر لہسن کی چند کلیاں لے کر انہیں چاقو سے کاٹ کر ٹکڑے کرے پھر ان کو شہد یا گلقند میں ملا کر کھائے۔ اگر شہد یا گلقند آسانی سے نہ مل سکے تو کشمش یا منقے کا استعمال کرنا لازم ہے۔ اس حالت میں لہسن کے ٹکڑے اور دس دانے منقہ ۲۵ دانے کشمش کو ایک ساتھ ملا کر کھانا چاہیے۔

انگور کے دنوں میں لہسن کے ساتھ انگور کا استعمال کرنا بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس وقت شہد یا گلقند کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ صحت کے خیال سے جتنا مفید انگور ہوتا ہے اتنا منقہ یا کشمش نہیں۔

گرم دنوں میں لہسن استعمال کرنا ہو تو صرف گلقند کے ساتھ ہی کرنا چاہیے۔ جاڑے سے آنے والے بخاروں میں جب کونین جواب دیدے تو روز صبح و شام کو شہد کے ساتھ تین چار کلیاں لہسن کی دینے سے بخار اتر جاتا ہے۔ نوبتی بخاروں میں بھی اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ نظام عصبانی سے تعلق رکھنے والے امراض میں سے اکثر اسکے استعمال سے اچھے ہو جاتے ہیں۔ ہسٹریا، مرگی، مالیخولیا، بیخوابی اور لقوے میں کافی فائدہ ہوتا ہے۔ ان امراض میں اس کا رس چاے یا قہوے ملا کر دینا چاہیے۔ اس کی مقدار اتنی ہونی چاہیے جتنی تین چار کلیوں سے نکلتی ہے۔ شام کو شہد کے ساتھ ہی کھانا بہتر ہے۔ لقوے کے مقام پر لہسن کا رس اور سرسوں کا تیل ملا کر مالش کرنی چاہیے تیل عرق سے بیس گنا ہو۔

مریض کو چاے یا قہوے میں لہسن کا رس ملا کر پلانا چاہیے بدہضمی اور قبض میں لہسن کی پوتھیوں کو کاٹ کر لیموں کے رس میں ملا کر کھانے سے ایک ہی دن میں فائدہ دکھائی دیتا ہے کان سے پیپ نکلنے پر کان میں لہسن کا تیل ڈالنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کمزور بصارت رکھنے والوں کو لہسن کا استعمال روزانہ علی الصباح کرنا چاہیے۔ پایوریا میں لہسن کا استعمال کرنے سے پیپ آنا بند ہو جاتا ہے۔ لہسن کے رس ایک حصے میں بیس حصے پانی ملا کر اس سے کلی کرنے سے آنا فانا بند ہوتا ہے۔

خارش، چھاجن، داد اور دیگر امراض جلد میں لہسن بہت فائدہ دیتا ہے۔ اس میں لہسن کا استعمال کھانے اور لگانے میں کرنا چاہیے۔ خرابی خون کو دور کرنے میں بھی یہ بڑے کام کی چیز ہے اس سے خون صاف ہو جاتا ہے۔ آتشک سوزاک میں بھی اس سے فائدہ ہوا ہے۔ ان امراض میں اس کا استعمال کھانے اور لگانے دونوں کاموں کے لیے بہتر ہوتا ہے

ہیضہ، پلیگ، ٹائیفائڈ، سیتلا اور دوسری بیماریوں میں روزانہ اس کا استعمال کرنے سے جراثیم جسم میں داخل نہیں

ہونے پاتے۔ اس لیے یہ ایک قابل اعتماد حفظ ما تقدم ہے تپ دق کے کئی مریض اس کے استعمال سے بالکل آرام پاچکے ہیں۔ ڈاکٹر لینڈ نے کئی مریضان دق کو صرف لہسن کا استعمال کرواکر کی صحت بخشی ہے۔ (ازالی دنیا)

چارسو روزنامے | سوئزرلینڈ میں روزانہ ۴۰۰ روزنامے اخبار فرانسیسی، اطالوی جرمنی رومانش زبانوں میں شایع ہوتے ہیں۔

لوہے کی اہمیت | ہائیڈ پارک، گرین پارک، سینٹ جیمس پارک کے حصار کے آہنی جنگلوں (کٹہروں) سے دبا ہے اور توپیں بنانے کے لیے فولاد حاصل کریں گیا ہے۔ ہائیڈ پارک کے حصار کا دور ۴ ½ میل تھا جس کو پگھلانے کے لیے نکال لیا گیا ہے۔ اب گرین پارک کا حصار اکھڑا جا رہا ہے اس کے بعد سینٹ جیمس پارک کی باری ہے۔

دلچسپیاں

بھولی دنیا | لاوارثی خطوں کے شعبے کی روداد ۱۹۴۱-۴۰ء میں ظاہر کیا گیا ہے کہ پورے ہندستان میں روزانہ ایسی چیزیں ڈاک کی جاتی ہیں جن پر پتے نہ ہوتے ہوں اس طرح پورے سال میں جملہ ۵۳۶۳۰۰۰ چیزیں بغیر پتے کے ڈاک کی گئیں جو شعبہ لاوارثی کی نذر ہوئیں۔

خط اور پارسل وغیرہ کھولنے کے بعد بعض میں چیک کرنسی نوٹ، بس آف اکسچنج، سکے اور دوسری قیمتیں چیزیں بھی ملیں۔

چھان بین کے بعد شعبہ خانے نے بہت سی چیزیں مرسل الیہ کو اور جب مرسل الیہ کا پتہ نہ چلا تو مرسل ہی کو واپس کردیں۔ لیکن اس کوشش کے باوجود ۹ فیصد چیزیں مرسل کا بھی پتہ نہ چلنے سے لاوارثی شعبے میں محفوظ کردی گئیں۔

اٹھارہ سو مین ایک کوٹ | پیٹرزبرگ میں ایک ہندستانی عورت نے کوٹ خریدا جس کا معاوضہ اس نے (۱۸۰۰) پنی ادا کیا۔

چرچلیس مرمر | انگلستان کی ایک عورت کو دل کا عارضہ ہو گیا۔ بیماری کچھ نہیں تھی۔ مگر دل زور سے مارتا تھا۔ ڈاکٹر نے بار بار لاشعاعی فوٹو لیا۔ تب بھی کوئی پتہ نہ چلا۔ آخر کار ڈاکٹر نے عورت سے اس کی پریشانیوں کے متعلق دریافت کیا جس پر عورت نے کہا "اپنے وطن کے لیے بار بار میرا دل پکارتا ہے" اس پر ڈاکٹر نے اس نئی بیماری کا نام "چرچلیس مرمر" دیا۔

فلمی خبریں

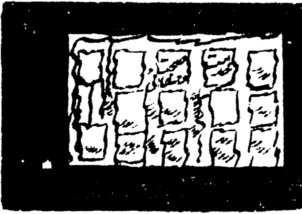
ایکٹر کی راکھ | مسٹر جیمس نامی ہالی ووڈ کے ایکٹر نے ایک وصیت کے ساتھ دس ہزار ڈالر کی رقم اپنے بھائی ارل کیرول کے نام چھوڑی۔ اس وصیت نامے کی دو اہم شرطیں یہ تھیں۔ اول یہ کہ جیمس کی لاش کو جلانے کے بعد اس کی راکھ کو کیرول ہمیشہ اپنے سونے کے کمرے میں رکھے اور دوسرے یہ کہ اس رقم کی آمدنی کا دو تہائی حصہ جوزی بوزی نامی شوگرل کو پابندی کے ساتھ دیتا رہے جیمس کو اس لڑکی سے محبت تھی۔ لیکن باقاعدہ عاشقی نہیں کی تھی۔ کیرول ان دونوں شرطوں کی پابندی کر رہا ہے۔

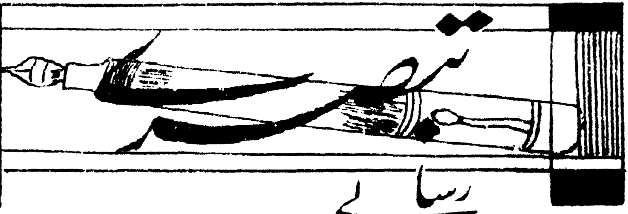
صنعت و تجارت

گھونگروالے بال | اگر آپ کو اپنے بال گھونگروالے بنانے کا شوق ہے تو نیچے کا نسخہ روزانہ استعمال کیجیے۔

سوڈیم کاربونیٹ — ۸۰ گرین
سلوشین آف اموتیا — ۴ منم
میوسی لیج آف اکاکشیا — ۴ ڈرام
آئیل آف کلوف — ۱ ڈراپ
عرق گلاب — ۱۰ اونس

ان تمام چیزوں کو خوب حل کرکے بند بوتل میں رکھ چھوڑو ضرورت کے موافق سر کے بالوں میں ملتے رہو۔ چند ہی روز میں بال گھونگروالے بن جائیں گے۔





رسالے

خدمت | جنت نشان کشمیر بھی ہندستانی زبان کا قدیم گہوارا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہاں کی فضا فرقہ وارانہ جذبے سے مسموم نہ ہونے پائی تھی۔ ہندستانی فرقے یا جماعت کی زبان نہ تھی، بلکہ ملکی سرکاری اور ہر خاص و عام کی مادری زبان تھی۔ لیکن جب سے مذہبی منافقت اور منافرت کے کانٹے اس سرزمین میں بوے گئے اس وقت سے ہندی اردو کا باقاعدہ جھگڑا شروع ہو گیا۔ ہمیں سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت کشمیر نے اس خصوص میں حاکمانہ انصاف کا ثبوت نہ دیا بلکہ مذہب پرستی سے متاثر ہو کر اس نے مدرسوں اور دفتروں میں ایک ایسی زبان کو جگہ دی جو جھگڑے اور فساد کا شاخسانہ بنی ہوئی ہے۔ ہم اردو کے ہرگز حامی نہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ حکومت کا یہ فرض تھا کہ وہ اردو کی بجاے ہندستانی کو جگہ دیتی۔ اس سہل اور عام فہم زبان کے بنانے اور اس کو رواج دینے کے لیے زبان کے جاننے والوں کی ایک کمیٹی قائم کی جاتی اور اس کی سفارش کے مطابق عمل کیا جاتا۔ کسی ایک فرقے یا جماعت کی دھمکیوں یا سازشوں سے متاثر ہو کر ملکی روایتوں اور عوام کے جذبات کا خیال نہ رکھنا مصلحت کے خلاف ہے۔

ہمیں اس کا بھی افسوس ہے کہ کشمیر سالہا سال سے ہندستانی زبان کا مرکز بنا ہوا ہے۔ لیکن ادبی خدمت میں ان حصوں سے بھی پیچھے ہے جہاں کی زبان اور سرکاری و غیر سرکاری کاروبار تک غیر ہندستانی زبانوں میں انجام پاتا ہے۔ غنیمت ہے کہ کشمیر سے ایک آدھ ماہوار اور شاید ایک دو روزانہ اخبار بھی نکلتے ہیں۔

"خدمت" کشمیر کا ایک ہفتہ وار ہے جس کے مالک و مدیر ع۔ ر عارف صاحب ہیں۔ تقطیع چھوٹی، حجم ۸ صفحے سالانہ چندہ (للعہ) روپیے قیمت ایک پرچہ ار ہے جلد نمبر سے ظاہر ہے کہ تین سال سے یہ اخبار ملک اور قوم کی خدمت برابر بجا لا رہا ہے۔ حالات حاضرہ کے علاوہ بعض وقت مختصر سے مضامین بھی درج رہتے ہیں۔ لکھائی چھپائی تسلی بخش اور اخبار ہر حیثیت سے اچھا ہے

کتابیں

صحت و صفائی | محمد حسین حسان صاحب نے چھوٹی تقطیع کے ۶۰ صفحوں پر صحت و صفائی کے متعلق مکالموں کی صورت میں تیرہ مضامین لکھے ہیں۔ مضامین کے عنوان یہ ہیں :-

تازہ ہوا، کھانا پینا، پانی، عام صفائی، دن کا کام رات میں، لوہ، بخار آگیا، بیماری کا موسم، کپڑوں میں آگ لگ گئی، انکسیر پھوٹ گئی، آنکھ میں کچھ پڑ گیا، ناک میں کچھ پھنس گیا۔ مکالمے دلچسپ اور عام فہم ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ یہ مدرسے کی ابتدائی جماعتوں کے نصاب میں داخل کی جاے۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دلی اس بارے میں مبارکباد کا مستحق ہے کہ صرف ۲ر میں چکنے کاغذ اور نفیس ٹائٹل کی ایسی مفید کتاب بہم پہنچا رہا ہے۔

(ع۔م)

ہندستانی ادب

سالگرہ نمبر

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۸۴) رجسٹرڈ برطانیہ (۴۴۴۴)

تار کا پتہ "ادب" حیدرآباد دکن

چندہ سالانہ (للعہ) قیمت ایک پرچہ (۱۲)

ایڈیٹر۔ غلام محمد خاں، ایم۔ اے (عثمانیہ)

ہمارے خیالات

ایک سال بعد

آج سے ایک سال پہلے بھی دنیا کے حالات کافی پیچ کھا چکے تھے جنگ کے گھنے بادل یورپ پر تو منڈلا ہی رہے تھے لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی امکان تھا کہ اس منحوس بلا کے بڑھتے ہوئے شعلے مشرق کو بھی آلپیٹیں گے۔ دنیا سمجھ رہی تھی کہ چنگاریاں آہستہ آہستہ بڑھ کر شعلوں کی شکل میں تبدیل ہونگی۔ مگر سیاسیات عالم کی توقع اور پیش قیاسیوں کے خلاف جنگ کا آتش فشاں پہاڑ اپنے مرکز و منبع یعنے جاپان سے اس بری طرح پھوٹ پڑا کہ اس کے لاوے کے سیلاب کو کوئی قوت نہ روک سکی۔ ان واقعات کے رونما ہوتے ہی بدبخت ہندوستان کو ہر قسم کی مصیبت کا سامنا لاحق ہوگیا۔ کاش کہ ہمارا وسیع ترین ملک بھی پہلے سے ایک صنعتی مرکز ہوتا اور ہم اپنی ضرورتوں کے لیے غیروں کے دست نگر نہ ہوتے تو آج ہمیں اپنی ہر ضرورت کے لیے محتاجی کی مایوس کرنیوالی صورت دیکھنی نہ پڑتی۔

باہر کی منڈیوں کے دروازے بند ہوتے ہی جہاں مختلف چیزیں مہنگی ہوگئیں کاغذ کو بھی اسی دشواری سے دوچار ہونا پڑا۔ کاغذ کی قیمت تو افسانوی حد تک بڑھ گئی ہے۔ اس سے وہی طبقہ بہتر طریقے پر واقف ہے جو بلا واسطہ یا بالواسطہ اس سے تعلق رکھتا ہے۔

پچھلے سال اسی مہینے میں جب ہم نے پرچہ جاری کیا ہے اس وقت بھی کاغذ کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ دوست احباب اور ہمدردوں نے ہمیں بھی مشورہ دیا تھا کہ ہم جنگ کے ختم ہونے تک صبر سے کام لیں۔ مگر شامت اعمال کو کوئی کیا کرے۔ ہم نے ایک دھن اور دھم سے مصیبت کے اس گڑھے میں کود پڑے۔ اب اس کی ہولناکیوں کا وہ لطف اٹھا رہے ہیں کہ ہر وقت پناہ! پناہ!! کی ہچکیاں اور بھیانک آواز اپنی پوری بے ساختگی کے ساتھ نکل پڑتی ہے۔ بہرحال ہم اپنے کیے کو بھگت رہے ہیں۔ اور بڑے مزے کے ساتھ۔

اس پر طرفہ یہ کہ ایک سال کی مدت میں ہم نے ہزار ہا دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے تین خاص نمبر بھی پیش کر دیے گویا ہرے بھرے زخموں پر نمک چھڑک گیا۔ اب آپ خود اندازہ فرمائیے کہ کیا مزہ نہ مل رہا ہوگا۔

دنیا توقع پر چل رہی ہے، اسی طرح ہندوستانی ادب بھی۔ یہ سب کچھ محض توقع پر کیا گیا۔ کچھ ہم نے تنہا ایسا نہیں کیا بلکہ ہر کوئی ایسا ہی کرتا ہے مگر سہ جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی ہمیں گلے شکوے کی عادت نہیں۔ اب ہم توقع کو ہاتھ سے دے چکے ہیں اور رسالے کو اس کی حالت پر چھوڑ دیتے ہیں چلتا ہے تو خود چلے گا ورنہ پورا ایک سال ہم صبر کے گھونٹ پیتے رہے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ جب علم و ادب اور زبان کی ترقی کا بیڑا اٹھایا ہے تو ضرور حساس دل اس کی اعانت کی طرف رجوع ہوں گے مگر کیا معلوم تھا کہ دل جیسی نازک چیز بھی پتھر کی ہوا کرتی ہے اور وہ بھی سب کے دل ایسے دل جوش سے مس نہ ہوں۔

اس دوران میں ہمیں مختلف مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مختلف قسم کی ہستیوں سے رابطہ رہا جن میں ایسے بھی ہیں کہ کھیل تماشے پر صرف ایک ہی وقت میں چار روپے آسانی سے بلکہ نہایت خوشی سے خرچ کر دیتے ہیں مگر سال میں ایک مرتبہ کسی ادبی رسالے کی قیمت میں چار روپے دینا کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔ رسالے کے مضامین کی تعریف و توصیف کے پل باندھ دیں گے لیکن جہاں چندے کا سوال پیدا ہوا رسالہ بند کر دو کی رکیک آواز بلا تامل نکالیں گے۔

ایک اور طبقہ ایسا ہے جو نمونہ مفت طلب کرتے ہوئے اپنی پوری پوری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ ہر نمبر میں مسلسل لکھنے کے بعد بھی یہ لوگ اثر نہیں لیتے حالانکہ وہ کاغذ کی مہنگائی اور رسالہ نکالنے والوں کی مالی دشواریوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ انہیں سمجھاتے سمجھاتے ہم تو تھک گئے مگر ان کا حال چکنے گھڑے کا سا ہے۔

بعضوں کو شرارت یا بدمذاقی سوجھتی ہے کہ وی۔ پی کے لیے لکھا اور جب وی۔ پی پہنچے تو لینے سے انکار، لکھو تو جواب نہیں دیتے ہم نہیں سمجھتے کہ ایسی کور مذاقی سے انھیں کیا حاصل ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اپنے گرے ہوئے اخلاق کا ثبوت دیں۔

ہماری مشکلوں میں اضافہ کرنے والا ایک اور طبقہ بھی ہے جس کو

ہم بڑے بانوں کا گروہ کہہ سکتے ہیں اس جماعت سے ہماری مراد ایسے مشتہرین ہیں جو وعدہ وعید کرنے کے باوجود اشتہاروں کی اجرت ادا نہیں کرتے۔ اپنے معاصروں سے ہم پرزور طریقے پر درخواست کرتے ہیں کہ ایسے وہوکا بازوں کا بائیکاٹ کیا جانا چاہیے یعنے اگر کسی معاصر کی شکایت پہنچے تو سب رسایل اس مشتہر کا اشتہار چھاپنے سے انکار کردیں جب تک کہ معاصر موصوف کی رقم ادا نہ ہوجاے۔ اگر کوئی اس طرح سید صانہ ہو تو ہر رسالے کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ایسے مشتہر کے خلاف جماکھول کر زہر اگلے تاکہ صحافتی دنیا میں اس کی ساکھ باقی نہ رہے۔ اور وہ اپنا پیشہ چھوڑنے پر مجبور ہوجاے۔ یہہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب خود ہم آپس میں متحد ہوجائیں اور معاصرانہ چشمکوں کو نظرانداز کردیں۔

پورے ایک سال کے بعد حرف شکایت زبان پر لاے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ شکایتیں بارہ صبر آزما مہینوں کے بعد بے جا نہیں ہیں۔ ہمیں کہنا تو بہت کچھ تھا لیکن اس سے حاصل —؟ ہم جانتے ہیں کہ ابھی ہماری آواز بانگ دہل یا صدا بصحرا سے زیادہ اہمیت حاصل نہ کرے گی۔

آخر میں ہم صاف صاف لفظوں میں یہہ ظاہر کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندستانی ادب جن مقصدوں اور ارادوں کو اپنے ساتھ لے کر اٹھا ہے ان کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہندستانی ادب کی زندگی اور بقا کا کٹھن مسلہ حل نہ کرلیا جاے کشمکش حیات کا سوال بہت ٹیڑھا ہوا کرتا ہے۔ اگر ذی روح کو اپنی زندگی کی فکر ہوتی ہے تو غیر ذی روح کو اپنے بقا کی فکر دامنگیر ہوا کرتی ہے لیکن ہر دو صورتوں میں اعانت و امداد ضروری ہے ورنہ ناممکن ہے کہ مصایب کے مسلسل سیلاب سے کوئی تیر نکلے۔

ہندستانی ادب فرد کی نہیں افراد کی میراث ہے اس کی ڈوبتی ناؤ کو بچانا افراد ہی کا فرض ہے اس کے بعد بھی اس کی سنبھالا نہ ہو تو یہہ ہندستانی ادب کی نہیں بلکہ ہندستانی زبان اور ادب بلکہ ملک کی بدقسمتی ہوگی اس لیے کہ ایسے مخصوص خیالات اور عزایم کے ساتھ شاید ہی کوئی اور آواز بلند ہو۔

اپنے مقصد میں کامیابی

ہندستانی ادب کے اجرا کا سب سے بڑا مقصد جیسا کہ بارہا کہا جاچکا ہے۔ ہندستانی ادب کی ترویج اور ترقی ہے۔ ہندستانی سے مراد ایک ایسی سیدھی سادی اور سلیس زبان ہے جو ادبی ہونے کے باوجود تقریبًا ہر شخص کی سمجھ میں آسکے۔ فارسی عربی اور سنسکرت کے موٹے موٹے لفظوں سے بری ہو۔ جملوں کی ترکیب بھی مشکل نہ ہو تاکہ ہر ایک پڑھنے والا مطلب کو آسانی سے سمجھ سکے

زبان کو سہل اور آسان بنانے کا ہم جو مشورہ دے رہے ہیں ممکن ہے بعض حضرات اس کو پسند نہ کریں لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ آسان زبان کو ادب کا ذریعہ بنانا اتنا آسان نہیں جتنا کہ مشکل یا خیالی زبان میں اپنے مطلب کو ادا کرنا ہے۔ یورپ کی اکثر بلکہ دنیا کی بیشتر زبانوں کا کامیاب اور مشہور سرمایہ ادب آسان زبانوں میں موجود ہے۔ انجیل توریت اور قرآن جیسی مذہبی کتابیں نہایت سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں اور یہہ سب ادبی نقطہ نظر سے کامیاب سے کامیاب ادبی کارنامے مانے جاتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز زبان کی سادگی، آسان ترکیبوں اور سلیس جملوں اور عام فہم ترکیبوں میں مضمر ہے اس لحاظ سے کسی کا یہہ سمجھ لینا کہ سلیس زبان ادب کی تعریف سے خارج ہے کس حد تک صحیح ہوسکتا ہے ؟

ہندستانی ادب اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ پورے ہندستان کے لیے ایک ایسی عام فہم اور سلیس زبان کے لیے مسالہ تیار کرے جس کی تعمیر قریب زمانے میں ہو کر رہے گی۔

ہمیں اس بات کا اقرار ضرور ہے کہ اس رسالے میں بھی بعض اوقات ایک آدھ مضمون نیم خیالی زبان میں ضرور آجاتا ہے اور وہ محض مضمون لکھنے والے کی خاطر دیدیا جاتا ہے ورنہ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ مضمون کی زبان ہمارے مقصد کی آئینہ دار ہو۔ پچھلے بارہ نمبروں میں آپ نے نظم و نثر دونوں میں اس چیز کو نمایاں پایا ہوگا۔ آگے بھی ہماری کوشش یہی رہے گی کہ ہر مضمون سادہ اور سلیس زبان میں ہوا کرے اس کیلیے بھی شعرا مضمون لکھنے والوں کا تعاون ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہندستانی ادب کے لکھنے والے

ہماری اس اہم درخواست کو قبولیت کا شرف بخشیں گے۔

رسالے کی ترتیب

ایک علمی ادبی رسالے کی ترتیب کا کام ہمارے لیے زیادہ دشوار اس لیے نہیں تھا کہ پہلی مرتبہ ہم نے اس اہم کام کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا بلکہ چند سال پہلے جب کہ مجلہ عثمانیہ کی ادارتی اور تنظیمی باگ ہمارے ہاتھ میں تھی ہمیں اس کا کافی تجربہ ہوچکا تھا لیکن اس کے باوجود ہندستانی ادب کی ترتیب میں ہمیں دشواریاں اس لیے پیش آئیں کہ ادبیت کے علاوہ تجارتی نقطہ نظر بھی ملحوظ تھا۔

ہم ہر نمبر میں ترتیب کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ تبدیلی کرتے رہے اور اس دوران میں جو بھی مفید مشورے ملے ان پر عمل کرنے سے ہم نے کبھی دریغ نہ کیا۔ ہماری ناقص رائے میں ایک علمی ادبی رسالے کے ایڈیٹر کو انسانی نفسیات کے مطالعے کا جتنا بہتر موقع ملتا ہے شاید ہی کسی اور کو ملتا ہو۔

بہر حال ایک سال کے صبر آزما اور طویل تجربے کے بعد ہم موجودہ ترتیب کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ اس سے ہر مکتب خیال کے افراد کی تشفی ہوسکتی ہے۔ ہمارا یہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے بلکہ آگے چل کر ہمیں اگر اس سے بہتر مشورے ملیں تو ہم ضرور ان پر عمل کریں گے۔

مضامین کے بارے میں

یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا سمجھانا آسان نہیں۔ ہمارے ہاں اکثر شکایتیں وصول ہوتی ہیں کہ رسالے میں افسانے کم ہوتے ہیں۔ شکایت بڑی حد تک بجا ہے اور ایک حد تک بیجا بھی۔ بجا تو ظاہر اور بے جا اس لیے کہ کسی علمی ادبی رسالے کا واحد مقصد دماغی تفریح نہیں بلکہ علم و ادب کی ترویج اور عوام میں اس کا شوق پیدا کرانا ہے خصوصاً جبکہ ہندستانی ادب نے ہندستان کی ملی جلی زبان کی ترویج اور ترقی کا بیڑا اٹھایا ہے تو اس پر لازم آتا ہے کہ ہر نمبر میں متعلقہ مضامین کے لیے گنجایش پیدا کی جاسے۔

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ٹھیٹ ادبی چیز خشک ہوا کرتی ہے یا ٹھوس مضامین جیسے تحقیقی مقالے وغیرہ عام پڑھنے والوں کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوا کرتے اس لیے ایک دو ایسے افسانے دیے جاتے ہیں جو ٹھوس مطالعے سے تھکے ہوے دماغ کی تفریح کا سبب بن سکیں۔

افسانے ڈرامے یا نظمیں اس طریقے پر ترتیب دیجاتی ہیں کہ اگر ٹھوس مضمون پڑھتے پڑھتے دماغ اکتا جاے تو نظم سے اس کے بار کو ہلکا کردیا جاے یا اسی طرح افسانے یا ڈرامے کی چاشنی سے دماغ کو ادبی لذت حاصل ہو۔

ہمیں اس موقع پر ہندستانی ادب میں چھپنے والے مضامین کے بارے میں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ جس طرح تنوع کا خیال رکھا جاتا ہے اسی طرح ان کے افادی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ ہندستانی ادب میں چھپنے والے سب کے سب مضمون اپنے میں زیادہ سے زیادہ افادیت کا پہلو لیے ہوے ہوتے ہیں۔

عام طور پر نظموں کے افادی پہلو کے تو ہم قایل نہیں۔ ان کے پڑھنے سے اچھی خاصی دماغی تفریح ضرور ہوجاتی ہے۔ زبان کا لوچ اور ادب لطیف کی حقیقی لذت حاصل کرنی ہو تو نظم کے مطالعے سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

ہندستانی ادب اپنی ایک خاص پالیسی کے تحت غزل پر نظم کو ترجیح دیتا ہے۔ نظم ہی اصل میں شاعری کی جان ہے۔ نظم ہی مکمل شاعری کا دوسرا نام ہے۔ نظم کے لکھنے اور پڑھنے والے کو حلاوت حاصل ہوتی ہے نظم مطلب کے ادا کرنے کا آسان اور بہتر ذریعہ ہے۔ نظم کی قوت غیر محدود ہے۔ اگر شاعر میں اہلیت ہو تو مثنوی مولانا روم اور فردوسی کے شاہنامے کی طرح تمام دنیا کی تاریخ نظم کر ڈالے۔ ہماری رائے میں اگر دنیا کی تاریخیں نظم میں مدون کی جائیں تو پڑھنے والوں کو اس سے بہت زیادہ فایدہ پہنچیگا۔

غزل ایک محدود حلقہ دام خیال ہے۔ جسکی معنی آفرینی کے

متعلق محض مبالغے سے کام لیا جاتا ہے اگر غزلوں کے کہتے وقت غالب کے ذہن میں ہر شعر سے پہلے بیس پچیس مطالب ہوتے تو پورے دیوان کے کہنے کے لیے شاعر کو دس گنی عمر صرف مطالب کے سوچنے کے لیے درکار تھی۔ وہ شاعری کیا جو ایک شعر کے لیے آدھ گھنٹہ سوچتا رہے حقیقی شاعر تو وہی ہے جس کے دماغ میں شاعری کا تموج ہر وقت موجزن رہتا ہو۔ جوں ہی کسی خاص چیز کی طرف اسکی توجہ مبذول ہوئی طبیعت موزوں ہوئی اور مناسب خیال نظم کہہ ڈالی۔ یا جیسے ہی کوئی خاص خیال اس کے دماغ میں آیا فوراً چند شعر موزوں کر دیے۔ اگر وہ خیال اس کو زیادہ بھا جائے صرف چند شعر پر ہی کیا منحصر بلکہ طویل نظم بھی کہہ ڈالتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ غزل قدامت کی ایک یادگار ہے جس کو تبرکاً استعمال کیا جائے تو نامناسب نہیں اور نظم ہر زمانے اور دور کی اہم ترین ضرورت کا نام ہے جو قوموں کی بگڑی حالت کو سدھارنے کا ذریعہ بن سکتی ہے تفریحی اور اصلاحی پہلوؤں کے علاوہ نظم میں اور بہت سی خوبیاں موجود ہیں جن کی تفصیل کے لیے اچھا خاصا مضمون درکار ہے۔

ہندستانی ادب معاصروں کی نظر میں

صحافت کی دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کبھی کوئی رسالہ معیاری قرار پاتا ہے یا اس کی تعریف و توصیف کے پل باندھے جاتے ہیں تو فوراً اپنی آنے والی اشاعت میں ایسی کسی رائے کو نمایاں سرخی کے ساتھ چھاپ دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس رسالے کے پڑھنے والوں پر اپنے رسالے کی اہمیت جتانے کے لیے ایک نفسیاتی اثر ڈالا جائے۔

ہمارا سب سے پہلا نمبر نکلا۔ ہم نے بھی قاعدے کے مطابق تنقید اور تبصرے کی خواہش کی۔ اکثر معاصروں نے مناسب لفظوں میں سراہا اور آیندہ کے لیے بہتر توقعات ظاہر کیں۔

رسالے کے جاری ہونے کے صرف چوتھے ہی مہینے میں ہم نے ہندستان کے ادیب اور شاعر اعظم ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کی یاد منانے کے لیے "ٹیگور نمبر" نکالا جو آج تک اپنی قسم کا واحد نمبر ہے ہمارا یہ پہلا ہی خاص نمبر بھی اوروں سے خراج تحسین حاصل کیے بغیر نہ رہا۔ اس پر بھی ہم پھولے نہیں سمائے بلکہ خاموش رہے

حسن اتفاق سے ٹیگور نمبر کے بعد یعنے پانچواں پرچہ بھی ایک اور خاص نمبر یعنی "نیا سال نمبر" کی شکل میں پیش کیا گیا جو کیا بلحاظ ظاہری حالت کیا بلحاظ حجم، کیا بلحاظ تصویریں اور کیا بلحاظ مجموعہ نظم و نثر نہایت ہی کامیاب رہا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ منعقدہ بہمن ۱۳۵۱ف کی یادگار کے طور پر ہم نے ایک خاص "صنعتی نمبر" نکالی جس کے مضامین افادیت کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہیں۔

خاص نمبروں کے قطع نظر امرداد ۱۳۵۰ف سے تیر ۱۳۵۱ف تک جو معمولی نمبر نکلے ان کے بھی نظم و نثر کے مجموعے ہر حیثیت سے تعریف کے قابل رہے۔

ہمارے پہلے نمبر اور خاص نمبروں سے متعلق بجائے اس کے کہ خود ستائی سے کام لیں آپ کے ملاحظے میں چند معاصروں کی رائیں اس نمبر کے کسی حصے میں پیش کیے دیتے ہیں اور آنے والے نمبروں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تاکہ اس سے ہماری ناچیز خدمات کی اہمیت آپ پر واضح ہو جائے۔ چونکہ دوسرے معمولی نمبر تنقید کی ہوا سے بچے ہوئے ہیں اس لیے ان کے متعلق شاید ہمارا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر آنے والے نمبر کو پچھلے نمبروں پر سبقت حاصل رہی اور اس طرح ہندستانی ادب صحافتی دنیا کی پہلی صف میں آ دھمکا۔

ہندستانی ادب کے لکھنے والے

ہم اپنا اخلاقی اور اداراتی فرض سمجھتے ہیں کہ ہندستانی ادب کے لکھنے والوں کی خدمت میں نہ صرف شکریہ بلکہ مبارکباد بھی عرض کریں ـــ یقیناً مبارکباد کے مستحق قلمی معاون ہی ہو سکتے ہیں کسی ایڈیٹر کا کام اس سے زیادہ نہیں کہ مضمون اور نظموں وغیرہ کو اپنے نقطہ نظر سے جانچ لینے کے بعد ایک خاص سلیقے کے ساتھ ترتیب دے دے۔ بہرحال اس کی حیثیت محض

ترتیب دینے والے کی ہے میعاری مضمون یا اچھی نظم لکھنا مضمون لکھنے والے اور شاعر کا حصہ ہے اس لحاظ سے کسی رسالے کو معیاری بنانے والے اس کے قلمی معاون ہوا کرتے ہیں اس لیے ہم نے کئی بار کہا ہے کہ مضمون لکھنے والوں اور شاعروں کو کسی رسالے کے غیر معیاری ہونے کی ہرگز شکایت نہ کرنی چاہیے اس لیے کہ یہ الزام انہیں پر عاید ہوتا ہے اور اس کی پوری پوری ذمہ داری انہیں کے سر تھوپی جا سکتی ہے۔ بے چارہ ایڈیٹر کیا کر سکتا ہے۔ جب اچھے اور عمدہ مضمون اور نظمیں وصول نہ ہوں اس کے ہاں کوئی مشین تو ہے نہیں کہ ہر مہینہ معیاری پرچہ ڈھال کر نکال لیا جائے۔

مگر ہندستانی ادب کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کے قلمی معاون خود معیاری مشین بنے ہوئے ہیں جس کے باعث ہر مہینہ رسالہ معیاری شکل میں آپ کی خدمت میں پیش ہوتا ہے یہی وہ وجوہ ہیں جن کے سبب ہندستانی ادب کے قلمی معاون نہ کہ ہم، اس کی کامیابی پر مبارک باد کے مستحق قرار پاتے ہیں اور اس لیے مکرر یہ بیش قیمت تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے۔

یوں تو کئی ایک حضرات نے ہندستانی ادب کی قلمی معاونت فرمائی ہے جن کی فہرست بہت لمبی چوڑی ہے۔ ڈر ہے کہ اگر ہم پوری فہرست یہاں دیدیں تو پڑھنے والے اکتا جائیں اس لیے ہم ان تمام ناموں کو پردے ہی میں رکھ کر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے ان مستقل محسنوں کا نام یہاں گنوا دیں جو پرچہ جاری ہونے سے اب تک برابر ہماری قلمی امداد کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ان سب ناموں میں سرفہرست ہمارے استاد محترم جناب عبدالرحمان خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ کا نام نامی آتا ہے۔ ادارہ آپ کا بے حد ممنون ہے کہ آپ اپنے تحقیقی مقالوں کے اجزا ہندستانی ادب میں چھاپنے کے لیے مرحمت فرماتے ہیں آپ کے تحقیقی مقالے ہماری تعریف سے بالاتر ہیں اس لیے ہم صرف اسی بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہمارے دوسرے مستقل معاونوں میں جمیلہ بیگم صاحبہ (کلکتہ) آوارا صاحب (عثمانیہ) ابو رضا سخاوت مرزا صاحب بی۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ) معین الدین صاحب رہبر فاروقی (منشی فاضل) پنجاب کے مشہور مضمون لکھنے والے ام۔ اسلم صاحب۔ صابر سگوی صاحب۔ انوار احمد صدیقی صاحب (عثمانیہ) محمد سردار علی صاحب (حیدرآبادی) اور رابعہ بیگم صاحبہ عاصیہ (مسز انوار اللہ) قابل ذکر ہیں۔

جمیلہ بیگم صاحبہ کو لکھنے کی خاصی مشق ہے ان کے مضامین ہندستان کے اکثر رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں جن میں زیادہ تر ترجمے ہوا کرتے ہیں آوارا صاحب کا طرز بیان ان کے اپنے خاص رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ سخاوت مرزا صاحب کے مقالے ان کے تحقیقی انہماک کے آئینہ دار ہوا کرتے ہیں۔ معین الدین صاحب کی طرز ادا اچھی منشیانہ ہوتی ہے جس میں سلف کی قلمی کاوشوں کا رنگ چھلکتا رہتا ہے۔ پرانی شراب عموماً اچھی ہی ہوا کرتی ہے۔ ام۔ اسلم (لاہوری) کو زمانہ جانتا ہے ان کا اپنا ایک خاص رنگ ہے جس کے سبب انھوں نے صحافتی دنیا میں خاصی شہرت حاصل کر لی ہے۔

صابر کو سگوی۔ نئی پود کے نونہال ہیں۔ لکھنے کا ڈھنگ اچھا ہے جس چیز کو بیان کرنا چاہتے ہیں بڑے سلیقے کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں انوار احمد صاحب بھی خوب لکھنے والے ہیں۔ انہیں ترجموں کا زیادہ مشق ہے اور اس میدان میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ سردار علی صاحب، نہایت خاموشی کے ساتھ کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ یہ بزرگ صحافتی دنیا کی قدیم یادگار ہیں۔ ان کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کماتے تو سو پون سو ہیں مگر ہر مہینہ سو سوا سو کی کتابیں خرید لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ انہیں صرف کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے بلکہ ان پر عبور بھی حاصل ہے ان کا ہر مضمون تحقیقات کی ایک اہم کڑی ہوا کرتا ہے۔ وسیع مطالعے کے باعث آپ کی تنقیدی قوت بھی خوب ہے۔ مسز انوار اللہ کو نہ صرف نثر پر بلکہ نظم پر بھی قدرت حاصل ہے۔ آپ کے مضامین واقعی شاہکار ہوا کرتے ہیں۔ زبان میں لوچ اور قلم میں اچھی روانی ہے۔ نظم بھی خوب کہتی ہیں۔

پروفیسران عبدالمجید صدیقی، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر جعفر حسن، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، محمد سعید الدین، ڈاکٹر قاری کلیم اللہ، ڈاکٹر حمید اللہ، ناصر علی۔ ام۔ اے (عثمانیہ) سراج الدین۔ ام۔ اے (عثمانیہ) عبدالوحد ابوظفر۔ ام۔ اے۔ سید محمد ام۔ اے (عثمانیہ) عبدالقیوم خاں باقی ام۔ اے (عثمانیہ) صاحبان۔ نیز عمر یافعی، بادشاہ حسینی، اشفاق حسین ام۔ اے (عثمانیہ) اعظم خاں۔ ام۔ اے (عثمانیہ) جہاں بانو ام۔ اے (عثمانیہ) محمد غوث ام۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ) غلام رسول حیدرآبادی محشر عابدی۔ ام۔ اس سی (عثمانیہ) دیپک راج سکینہ ام۔ اس سی (عثمانیہ) محمد عمر مہاجر ام۔ اے (عثمانیہ) وزیر حسن (عثمانیہ) صاحبزادہ جاوید قیصری۔ نامہ نگار حیدرآبادی صاحبان بھی ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں ان میں سے ہر ایک کا مضمون اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے شاہکار رہا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے بار بار دست طلب بڑھانے پر بھی ان میں سے کسی نے توجہ نہیں کی۔ عمر یافعی صاحب چاہتے تو اپنی وسیع علمی معلومات اور دیرینہ صحافتی تجربوں کی دولت سے ہندستانی ادب کو مالا مال کر دیتے۔ آپ نہ صرف ایک زبردست ادبی بہا کتب خانہ کے مالک ہیں بلکہ آپ کا مطالعہ اسقدر وسیع ہے کہ اس کا لحاظ کرتے آپ کو کتابی دنیا کا انسائیکلوپیڈیا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ آپ چند سال پہلے تحفہ نامی رسالہ نکالتے تھے۔ وزیر حسن صاحب (عثمانیہ) اگرچہ قلم کے دھنی ہیں لیکن اس دھن کو دفینہ بنا کر رکھنا پسند کرتے ہیں آپ کے لکھنے کا ڈھنگ کچھ ایسا دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ مضمون شروع کرنے کے بعد جی نہیں چاہتا کہ چھوڑ دیں۔ سلاست بیان کے ساتھ ساتھ زبان کی شیرینی دو آتشہ کا کام کر جاتی ہے۔

شاعروں کے متعلق قلم اٹھانے سے پہلے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ بڑی کٹھن منزل ہے ان کے متعلق کچھ بیان کرنا دشوار گذار گھاٹیوں کو پار کرنے سے کم نہیں ہر وہ شخص جو دو مصرعے موزوں کر سکتا ہے اپنے آپ کو شاعر کہتا ہے تب ہی تو شعر بھی کہتا ہے۔ یہ رہا عام شاعروں کا خیال اور حقیقی معنی میں جو شاعر ہیں ان کا نقطۂ نظر کچھ اور ہی ہے اس کی وضاحت اور تفصیل تو یہاں ممکن نہیں۔ اگر آپ اس کا لب لباب یا نچوڑ معلوم کرنا چاہیں تو سنیئے یعنی حقیقی شاعری ہے جو فطرت کی ترجمانی آسانی سے کر سکے یہاں تک تو ہر ایک سے ممکن ہے لیکن شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ فطرت کی رنگا رنگیوں کو میٹھے بولوں میں ادا کرنا حقیقی معنی میں شاعری کا دوسرا نام ہے۔ فطرت کا لفظ ان تمام خوبیوں اور خاصیتوں پر حاوی ہے جو ایک پرگو شاعر کے حیطۂ خیال میں آ سکتی ہیں۔

ان خیالات کے مدنظر ہم جیسے ہیچمدان سے ناممکن ہے کہ حقیقی اور غیر حقیقی شاعر اور اسکے کلام میں فرق پیدا کر سکیں۔

اس فہرست میں کیا بحیثیت سرپرستی اور کیا بحیثیت شعرگوئی علی اختر صاحب (حیدرآبادی) کا نام بلا تامل سب سے پہلے لیا جا سکتا ہے۔ علی اختر کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آپ کا شمار ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں ہے۔

نواب ثریا یار جنگ بہادر، سعید نواب عزیز یار جنگ بہادر، عزیز، نخشب جارچوی، اخگر موہانی وارثی، ناطق گلاوٹھی، ثاقب کانپوری، شاد عارفی رامپوری، غزل کی بساط کے اہم مہرے ہیں۔

سلام حیدرآبادی، ممتاز ہاشمی، عبدالواحد ابوظفر، ساغر حشمتی، اوجینی، کیف، اسرار، امجد، صابر القادری، اختر انصاری الہ آبادی، اپنے اپنے خاص رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

علی منظور حیدرآبادی مشہور لکھنے والوں میں سے ہیں کچھ عرصے تک ہندستانی ادب پر انکی عنایت رہی۔ ماہر القادری کے نام سے کون واقف نہیں شاید ہی کوئی ایسا پرچہ ہو جس میں آپ کا کلام نہ چھپا ہو آپ نہ صرف شاعر بلکہ ایک اچھے مضمون لکھنے والے بھی ہیں کچھ عرصے سے آپ کی بھی نظر عنایت کم ہو گئی ہے۔

نظر حیدرآبادی، تحسین سروری، شاہد صدیقی، نور الحسن ناہی، لطیف شریف، ساجد وغیرہ ایسے جوان سال شاعر ہیں جن کی شاعری کا مستقبل اچھا معلوم ہوتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کی پیداوار میں عبدالقیوم خاں باقی ام۔ اے، سکندر علی وجد بی۔ اے، صاحبزادہ محمد علی علیخاں میکش، احمد رضوی ساز بی۔ اے۔ ال ال۔ بی۔ مخدوم محی الدین ام۔ اے، امیر احمد خسرو، محمد علی تیر بی۔ اے، رشید احمد اور عظیم الدین محبت ام۔ اے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم نے مضمون لکھنے والوں اور شاعروں کے نام اوپر جو گنوائے ہیں صرف وہی مضمون لکھنے والے اور شاعر کہلا سکتے ہیں اور باقی دوسرے جن کا مضمون یا کلام ہمارے رسالے میں چھپا ہے وہ اس قابل نہیں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم اختصار کو کام میں لانا چاہتے تھے اس لیے جن حضرات نے رسالے میں زیادہ حصہ لیا اور جہاں تک حافظہ کام کر سکا صرف وہی نام لکھ دیئے گئے۔ اس کے علاوہ ہم ان تمام مضمون لکھنے والوں اور شاعروں کا بھی دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ہندستانی ادب کی ایک ایک سے زیادہ مرتبہ قلمی مدد فرمائی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس حقیقت کے اظہار کے بعد کسی کو گلہ باقی نہ رہے گا۔ ہم ایسے اشخاص سے معافی چاہتے ہیں جن کا ذکر رہ گیا تھا اور سہواً ان کا نام چھوٹ گیا ہو۔

آخر میں ہم اس امر کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ گنجائش کی کمی کے سبب بعض خبریں اور بحث طلب کہانیاں جن پر ہم آئندہ نمبروں میں روشنی ڈالیں گے خصوصاً رسم خط کا مسئلہ جس کا اظہار اس نمبر میں ضروری تھا

نظام الملک نواب آصفجاہ اول آصف

بانی سلطنت آصفیہ



جن کا کلام اس نمبر میں درج ہے

حضرت آصفجاہ اول کے اردو اشعار

محققین ابتک حضرت مغفرت مآب آصفجاہ اول کے صرف ایک ہی اردو شعر سے روشناس ہیں جو بعض تذکروں (ریاض حسنی و گل عجائب) میں نقل ہوتا چلا آیا ہے[1]

گالی نہ کہو کوئی میرے دل پر کہ جس سے
مجھ دل کے گلے میں یہ دعا یمنی ہے

لیکن لالہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی نے جس کا تخلص صاحب بھی ہے، "تذکرہ چمنستان شعرا" میں اس کو ناصر جنگ شہید سے منسوب کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے یہ شعر اوروں کے نام سے بھی مشہور ہے۔[2]

راقم الحروف کو اپنی مسلسل تحقیقات کے ضمن میں مرزا افضل قاقشال اورنگ آبادی کے نسخہ "تحفۃ الشعرا" کا ایک ایسا قلمی نسخہ ملا ہے جس کے ساتھ ایک اور قلمی بیاض بھی منسلک ہے۔ اس میں مختلف شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے لیکن زیادہ تر شفیق کے ایسے اردو اشعار درج ہیں جو کسی کی تتبع میں کہے گئے ہیں۔ اول شاعر کا تخلص، پھر اس کا شعر لکھا ہے۔ چنانچہ ان شعرا میں عماد الملک غازی الدین خان نظام اور آصف (نظام الملک آصفجاہ اول) بھی شامل ہیں۔ نواب صاحب موخر الذکر کے اس بیاض میں کل (۸) شعر درج ہیں۔ جن پر صاحب (یعنی شفیق) نے غزلیں کہی ہیں۔

لیکن اس امر کی جانب غور و فکر مائل ہو جاتی ہے کہ "چمنستان شعرا" میں کس وجہ سے آصفجاہ اول کو ان اشعار کے ملنے کے باوجود اردو شعرا میں جگہ نہیں دی۔ حالانکہ خود اس نے ان کے ان اردو اشعار پر شعر کہے ہیں۔ شاید یہ کلام جو ہمارے پیش نظر بیاض میں درج ہے، اس کو اپنے تذکرہ کی ترتیب کے وقت نہ ملا ہو۔ اس دور میں یا اس کے بہت بعد تک بھی آصف تخلص کا کوئی اردو شاعر کسی تذکرے میں بھی نہیں ملتا، جس کی وجہ سے یہ گمان کیا جا سکتا کہ یہ اشعار کسی اور کے ہوں گے۔ کیوں کہ بیاض میں اکثر صرف تخلص کی صراحت پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ان دلایل کے تحت یقین ہوتا ہے کہ یہ اشعار حضرت مغفرت مآب کے سوا کسی اور کے نہیں ہو سکتے اسی لیے "ہندستانی ادب" کی نذر ہیں۔

حضرت مرحوم کے حالات چوں کہ کافی مشہور اور متعدد دفعہ ملک کے آگے پیش کیے جا چکے ہیں، اس لیے ان پر کسی قسم کی روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔[3]

شمیم کاکل مشکیں سے جب میں اونگ گیا — تو آپ کہنے لگے اس کو سانپ سونگ گیا

میں تنہا نہ تن، بلکہ جاں بیچتا ہوں — یہ ہستی کی ساری دکاں بیچتا ہوں

ہے بازار جنوں منتشر، دیوانوں کے — یہاں دوکانیں ہیں کئی چاک گریبانوں کے

دور سے سمجھا تھا میں سنجاف کی تحریر ہے — پاس جا دیکھا تو خون عاشق کا دامنگیر ہے

ادھر دیکھو تو کس ناز و ادا سے یار آتا ہے — مسیحا کی مری امت کو ٹھوکر سے جلاتا ہے

کس طرح سے ماہ نو، انجم کے عقدے وا کرے — ہو جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے

جی سے کہدو کہ آہ سرد کے ساتھ — ٹہلتے ٹہلتے، چلے، تو چل نکلے

اس گلبدن کے غم میں رونا ہے عین حکمت — کرتے ہیں ضعف دل پر آنکھیں گلاب پاشی

منشی نادر خاں بیدری نے اپنی "تاریخ آصف جاہی" میں لکھا ہے کہ جب ناصر جنگ نے اپنے والد سے باغی ہو کر بعد مقابلہ گرفتار ہوئے۔ تو آصف جاہ بہادر نے ان کو دیکھ کر بہ آواز بلند یہ شعر پڑھا۔ بیدری کا انداز بیان کچھ ایسا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ یہ شعر خود ان کا ہے یا کسی اور کا۔

[4] مارنا عاشق کا سہل ہے اے دل ربا
صید کو جیتا پکڑنا صنعت صیاد ہے

معین الدین رہبر فاروقی

---

[1] چمنستان شعرا مطبوعہ انجمن ترقی اردو صفحہ ۳۱۳ — [2] دیکھو بیاض منسلکہ تذکرہ تحفۃ الشعرا مرزا افضل خان قاقشال۔ فن تذکرہ فارسی قلمی نمبر (۱۲۲) کتب خانہ آصفیہ صفحات (۸، ۱۵، ۲۲ و ۴۴) [4] تاریخ آصفجاہی قلمی صفحہ ۱۱ مکتوبہ سنہ ۱۲۶۶ھ۔

ہندستانی افسانہ نویسی کے چند ستارے

نذیر احمد ہندستانی افسانہ نگاری میں قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کرنے والے ڈاکٹر نذیر احمد تھے۔ ان کی وہ پہلی ہستی ہے جس نے سحر طلسم، دیو پری، بھوت، پریت، جن اور عفاریت جیسے خرافات اور توہمات سے قطع نظر کر کے ہندستانی افسانے کی بنیاد ہماری روزمرہ زندگی کے حالات و واقعات پر رکھی۔ نذیر احمد مرحوم نے جو کچھ لکھا اس کے لیے نظر کے سامنے زندگی سے مواد فراہم کیا اور ان کو خاص مقصد کے تحت بالترتیب جوڑ کر افسانے کی صورت میں منتقل کیا۔ ان کا ہر افسانہ اصلاحی ہے۔ اخلاق و معاشرت کو سنوارنا اپنی سوتی قوم کو اس کی غلطیاں بتا کر آگاہ کرنا ان کا خاص مقصد تھا جس کا لہجہ پند و نصیحت کا ہے۔ اس قسم کے افسانے زیادہ زمانے تک عوام کی دلچسپیوں کا مرکز نہیں بن سکتے۔ لیکن نذیر احمد کے افسانے اب تک ایک خاص ذہنیت اور ایک خاص دور کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے وہ ہر زمانے میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ جو واقعات ان کے افسانوں میں پیش کیے گئے ہیں وہ اس قوم کے حالات ہیں جس کے وہ ایک فرد ہیں اور زندگی کے واقعات اس زمانے کا ماحول ہے۔ جو ماحول آج ہے وہ ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ فطری امر ہے کہ اس میں تبدیلی رونما ہو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اس کے باوجود نذیر احمد کے افسانوں کو دلچسپ مانا جاتا ہے۔ اور آج بھی قبول عام کا شرف بخشنے والی صرف ان کی زبان اور ان کا اسلوب بیان ہے۔ ان کی زبان نہایت سلیس صاف اور شستہ ہے۔ اور پوری ادبی کیفیت کی حامل۔ گو اس میں عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں لیکن ان کا اسلوب دلکش ہے جس کے نشانات صفحہ دل پر ہمیشہ مرتسم نظر آتے ہیں۔

نذیر احمد نے مکالمے کو افسانے کا لازمی جز بنا دیا۔ گھریلو زندگی اور روزمرہ کی معاشرت کی بنیادوں پر ان کے افسانوں کی لازوال عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں۔ ان کا مقصد اصلاحی افسانہ نگاری تھا۔

سرشار ہندستانی زبان کے افسانوں میں سیرت نگاری کے علمبردار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بیحد انفرادی کردار پیش کیے ہیں جن کی دلچسپ سیرتیں اس سے قبل کسی افسانہ نگار نے نہیں لکھی تھیں۔ سرشار بڑے ظریف انسان تھے اور میلان طبع مزاح اور استہزا کی طرف بہت مائل تھا۔ ان کے اکثر افسانے ہجویہ ہوتے تھے۔ ان کی مشہور تصنیف "فسانہ آزاد" ہے جس میں واجد علی شاہ کے زمانے کی اس تہذیب کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ جو اب تک نہیں مٹی۔ مصنف "اسالیب بیان" نے ان کو ہندستانی زبان کا "ڈکنس" کہا ہے جو بالکل ان کی حالت پر چسپاں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ربط اور تسلسل پر اتنی زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ جتنی کرداروں پر۔ ان کے افسانوں میں زبان روزمرہ محاورہ اور رعایت لفظی کے ساتھ شوخی کی چاشنی بھی ہے۔ وہ لکھنو کی بامحاورہ زبان کو بڑی سہولت کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں اور کہیں کہیں ان کا بیان عامیانہ ہو گیا ہے۔

شرر ہندستانی زبان میں تاریخی افسانوں کی ابتدا اور ترویج کے واحد ذمے دار شرر ہیں ان کے افسانے بہت جلد سارے ہندستان میں مقبول ہو گئے۔ شرر کی منظر نگاری بے حد مشہور ہے۔ کردار تو ان کے یہاں ایک بھی اعلیٰ پایہ کے

کانہیں۔ سروالٹر اسکاٹ کی طرح اسلامی قوم کی عظمت کے تحت انہوں نے افسانہ نویسی شروع کی۔ ہندستانی زبان ہی پر نہیں بلکہ مسلمانوں پر بھی ان کا بڑا احسان ہے کہ مٹنے والی تاریخی ہستیوں کے واقعات کو ایسے پیرائے میں قلمبند کردیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں گے۔ اپنے افسانوں میں شرر نے واقعات کو مقامی رنگ دینا شروع کیا۔ ان کے مناظر تازگی اور دلکشی سے بہت کم خالی ہوتے ہیں شرر سادہ اور عام فہم عبارت لکھتے ہیں۔ ان کی طرز تحریر بے رنگ اور بے کیف ہوتی ہے۔

راشد الخیری

راشد الخیری نے اول اول تو نذیر احمد کی طرز اختیار کی اور ان کی تتبع میں کئی افسانے لکھے لیکن بہت جلد اپنا انفرادی رنگ اختیار کرلیا۔ ان کے افسانے صنف نازک کے المناک جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو مصور غم کا خطاب دیا گیا۔ غم کے بیان میں غلو اور مبالغے سے اس قدر کام لیتے ہیں کہ ساری چیزیں غیر فطری معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ان کی زبان بڑی رسیلی ہوتی ہے اور لطیف قسم کی نسائیت بھی پائی جاتی ہے شرر کی طرح راشد الخیری کی تصانیف بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک ہی قسم کا رنگ ہے۔ ان کے دو چار افسانے پڑھنے کے بعد انسان ان سے بالکل اکتا جاتا ہے۔

ہندستانی ادب کے جدید اکتسابات و میلانات تمام تر مغرب کے اثر کا نتیجہ ہیں اور ہندستانی کے جدید افسانوں سے مراد مختصر افسانے ہیں، جو خصوصیت کے ساتھ مغرب کے خوشہ چین ہیں۔ ہندستانی میں جتنے افسانے لکھے جارہے ہیں یا تو کسی مغربی افسانے کا ترجمہ ہوتے ہیں یا پھر اس کو پڑھ کر اس کے زیر اثر لکھے جاتے ہیں۔

پریم چند

جدید قومی ہندستانی افسانوں کی ابتدا پریم چند سے ہوتی ہے شبلی جیسا انشا پرداز بھی پریم چند کے نام کی مالا جپتا تھا۔ افسانہ نگاری کا فن پریم چند کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ وہ ہندستانی کے ان محسنوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی کوششوں سے ہندستانی افسانوں کو دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو کھڑا کردیا۔ اس سے پہلے ہندستانی افسانے گوناگوں تکلفات سے معمور تھے۔ پریم چند پہلے افسانہ نویس ہیں جنہوں نے ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ سے گریز کرکے ایک ایسا ڈھنگ اختیار کیا جو اس زبان کے بولنے والوں کی زندگی اور معاشرت کا سچا آئینہ دار ہے۔ پریم چند سے پہلے کسی نے ہندستانی زندگی اور خاص طور پر دیہات کی معاشرت کا نقشہ اس خوبی اور بے تکلفی سے نہیں کھینچا تھا۔ زمانے کی ضروریات اور مسایل موجودہ سے وہ اچھی طرح واقف تھے ان کے افسانے جدید رجحانات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ غریبوں امیروں مزدوروں اور سرمایہ داروں عورتوں اور مردوں کے اصلی زندگی کے نمونوں اور ان کے مختلف کردار کے تمام پہلوؤں پر وہ خوب لکھتے ہیں۔ نفسیاتی گتھیوں اور فلسفیانہ مسایل کو اس سادگی سے حل کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے انہوں نے ہمیشہ عوام سے سروکار رکھا۔ ان کی زندگی یاس و اور ناکامیوں کا ایک مرقع رہی۔ آخر دم تک یہ کشمکش حیات میں مبتلا رہے۔ مگر محبت خلوص اور عمل اور سادگی کی جلوہ گری ان کی جملہ تحریروں کو موثر بنادیتی ہے۔ منشی جی کی ساری زندگی عسرت و فلاکت کی گھنگھور گھٹاؤں میں گھری رہی۔ انہوں کو برداشت کرنا پڑا۔ خطرات ہمیشہ بھیانک صورت سے پریشان کرتے رہے۔ لیکن خدا کا بندہ کبھی نہ ڈرا۔ وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے تمام آلام کا مقابلہ کرتے رہے۔

پریم چند نے اپنی زندگی میں بے شمار مختصر افسانے لکھے وہ ہندستان کے عظیم ترین افسانہ نویس تھے۔ ان سے پہلے جدید طرز کی افسانہ نویسی کے رازوں سے ہندستانی ناواقف تھے ان کے لیے نئے اسلوب نے حقیقی افسانہ نگاری کا ذوق پیدا کردیا انہوں نے اپنے افسانوں کو عبارت آرائی اور رنگینی سے

بے نیاز کر کے نفسیات کے لطائف اور نازک ترین احساسات کا مظہر بنا دیا۔ اور یہہ بتلا دیا کہ افسانہ نویسی جذبات کی سچی تصویر کھینچنے کا نام ہے۔ منشی صاحب لطیف احساسات و جذبات کا اظہار اس خوبی کے ساتھ کرتے ہیں کہ دل پر چوٹ لگے بغیر نہیں رہتی۔ جذبات اور احساسات انسانی کی ترجمانی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ مجلس اور معاشرت کی حقیقی تصویر ان کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا ہندستانی میں مغربی طرز کی غیر رسمی افسانہ نویسی کے یہہ موجد تھے۔ انہوں نے اور افسانہ نگاروں کی طرح اپنی دنیا الگ بسانے کی کبھی کوشش نہیں کی ان کے افسانوں کے کردار اس دنیا کے بسنے والے انسان ہی ہیں۔ جن میں ہم اپنی زندگی گذارتے ہیں۔ غریبوں، بیکسوں اور مزدوروں کی المناک زندگی کو پیش کر کے انہوں نے سرمایہ داروں کی بے اعتنائی اور ظلم و تشدد کا پردہ چاک کیا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں فصیح اور بلیغ عبارت کی بجائے سادہ سلیس زبان استعمال کرتے ہیں تاکہ عوام بھی ان کو سمجھ سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں۔ ان کے افسانوں میں جگہ جگہ درد و الم کی غمناک تصویریں پائی جاتی ہیں۔

پریم چند نے اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھکر افسانے کی ابتدا کی۔ اس اصلاحی مقصد میں صرف مغرب کے لیے دشمنی پنہاں نہ تھی بلکہ یہ صحیح جذبہ خود ان کی قومی محبت تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہندستانی اپنے اسلاف کی عظمت سے بلکل واقف نہیں ہیں اور جو واقف بھی ہیں وہ اس کو بھلا رہے ہیں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اپنے افسانوں کو اصلاحی مقصد کے مد نظر نیا رنگ لیا۔ اور ان میں دیہات کی زندگی لہلہلاتے ہوے سبزے کی بہاریں۔ بہتے ہوے دریاوں کی روانی، معصوم کسانوں کی زندگی ان کی زبان۔ ان کے معصوم جذبات ان کی سادگی ان کی مصیبتیں ساری چیزوں کو صاف اور واضح طور پر دکھایا ہے۔ وہ زندگی کا مرقع پیش کرتے ہیں روزمرہ ہم اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے بہت مختصر ہوتے ہیں اور ان کی ابتدا ہمیشہ زندگی کے ایسے درمیانی واقعے سے ہوتی ہے جو بے انتہا اہم اور نتیجہ خیز ہوتا ہے وہ کہیں زندگی کا مکمل نقشہ نہیں پیش کرتے ان کے افسانوں کے اجزا ہمیشہ پیش پا افتادہ اور دلکش اور بصیرت افروز واقعات ہوتے ہیں۔

ان کے افراد قصہ اپنے حرکات اور سکنات سے خود اپنے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ انفرادیت کے قایل نہ تھے۔ وہ کبھی کسی شخص یا کسی بات کا مضحکہ نہیں اڑاتے بلکہ مزاحیہ پہلو کو نمایاں کر کے ہم کو گدگدا دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ اور دلپذیر ہوتا ہے انہوں نے ہمیشہ عام فہم اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ یہہ نہیں دیکھا کہ الفاظ کس زبان کے ہیں البتہ تسلسل باقی رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔

بیان کی سادگی کی بدولت ان کے افسانے تصنع اور بناوٹ سے بلکل پاک ہیں۔ لطیف تشبیہات اور استعارات کا استعمال خاص طور پر قابل داد ہوتا ہے منشی جی کے لکھے ہوے افسانوں کی تعداد تقریباً (۳۰۰) ہے۔ ان کی تصانیف کی مقبولیت کا ثبوت یہہ ہے کہ ان میں سے اکثر دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں ان کے افسانوں کی طرح کسی دوسرے ہندستانی مصنف کے افسانوں کو قبول عام نصیب نہیں ہوا یہی وجہ ہے کہ پریم چند کو مصور فطرت کے نام سے یاد کیا گیا۔

سدرشن سدرشن نے بھی پریم چند کی تقلید کی۔ لیکن ان کے افسانے معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو کی اصلاح کو مد نظر رکھتے ہیں۔ ان میں خاص افسانے کا لطف اتنا زیادہ نہیں ہوتا جتنا پریم چند کے افسانوں میں پایا جاتا ہے اس کے علاوہ پریم چند کی سی زبان پر ان کو دسترس حاصل نہیں۔ ان کے قصوں میں وہ سادگی نہیں اور وہ بیان نہیں

چیز وہی ہے لیکن پریم چند جس طرح اس کا اصلی رنگ ظاہر کرتے ہیں اور اس میں کامیاب رہتے ہیں وہ سدرشن کو نصیب نہیں۔ سدرشن قارئین کو مسرور کرتے ہیں لیکن ان کا بیان کیف آور نہیں۔ ادبی نزاکتوں کا ان کے یہاں فقدان ہے سدرشن کے افسانے بہت زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔ ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور مضمر ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کا پلاٹ ڈرامے کے پلاٹ کا سا ہوتا ہے سدرشن کے قصوں کی بنیاد بھی دیہاتی یا سماجی زندگی ہے ان کا مقصد اصلاحی مختصر افسانے کو حقیقی ہندستانی زندگی سے روشناس کرانا ہے۔ اس میں مقامی رنگ بھرنے میں پریم چند بہت زیادہ کامیاب رہے۔ اس خصوص میں سدرشن نے بھی ان کے برابر رہنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے حقیقت نگاری کے قریب ہیں اور دلچسپی سے خالی نہیں۔

راشد الخیری کی طرح۔ سدرشن نے افسانے کو گھریلو زندگی کے بیان کا ذریعہ بنایا۔ وہ گھریلو زندگی کی تصویر عمدہ کھینچتے ہیں۔ گھر کی زندگی کا لطف گھر والوں کی لڑائیاں شادی بیاہ کے رسوم اور پرانے رسوم میں جن ناگوار واقعات کو روا رکھا گیا تھا غرض گھریلو زندگی کی ہر چیز پر ان کی نظر رہتی ہے۔ گھر کی غمگین زندگیوں کا بھی انہوں نے موثر خاکہ کھینچا ہے اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندستان میں گھروں کی کیا کیفیت ہے۔ زندگی ادبار بھری کیوں ہے۔ آپس میں خاندان والوں کے کیا تعلقات رہتے ہیں۔ آیا وہ خوشگوار ہوتے ہیں یا گھر ہمیشہ جنگ کا اکھاڑا بنا ہوتا ہے۔

اعظم کریوی اعظم کریوی نے پریم چند کے اثر کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ ان کے افسانے عام دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں کو کافی مقامی رنگ دیا۔ فطرتاً ان کا دل حساس واقع ہوا ہے وہ ہر چیز سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان کا قلم ان احساسات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے جنہوں نے ان کے دل کو گرمایا۔ ان کی نگاہ تیز اور دقیق ہے۔ وہ واقعات کی باریکیوں سے نازک نازک امکانات پیدا کرتے ہیں۔ جذبات کے لطیف لطیف میلانات کو محسوس کرتے ہیں۔ پھر ان کو ایسے پیرایے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا سمجھنے لگتا ہے کہ جو چیز وہ پڑھ رہا ہے وہ خود اس کی محسوس کی ہوئی ہے۔ اور ان احساسات کے دھارے میں بہنے لگتا ہے

پریم چند کی طرح مصنف نے اپنے افسانوں میں زندگی کے واقعات کو پیش کرنے کا زیادہ خیال رکھا ہے انہوں نے زندگی اہم واقعات پر روشنی ڈالنے کی بیحد کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہے۔ ان کی زبان بھی سادہ اور سلیس ہے۔ اوروں کی طرح غیر مانوس الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں اور اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کے مضمون کو آسانی سے سمجھ سکے۔ اور اس سے متاثر ہو سکے۔

علی عباس حسینی ہندستانی افسانہ نویسوں میں علی عباس حسینی کا بھی خاص درجہ ہے۔ ان کے افسانے مجنون گورکھپوری کے افسانوں کی طرح محبت کے نفسیاتی اصولوں سے پر ہیں۔ زبان بھی اچھی ہے۔ افسانے دلچسپ ہوتے ہیں لیکن نقطہ نظر مجنوں کی طرح وسیع نہیں۔ یہ محبت کے قائل ہیں لیکن ان کا نقطہ نظر محدود ہے۔ فطری رشتوں مثلاً ماں باپ کی محبت اولاد کے ساتھ۔ اولاد کی محبت ماں باپ کے ساتھ۔ بھائی کی محبت بہن کے ساتھ۔ بہن کی محبت بھائی کے ساتھ۔ دوست کی محبت دوست کے ساتھ۔ آقا کی محبت خادم کے ساتھ۔ بیوی کی محبت شوہر کے ساتھ۔ غرض انس و محبت کے بہت سے نقشے انہوں نے پیش کیے ہیں معاشرت کے مقرر کردہ حدود کے باہر قدم رکھنا گناہ خیال کرتے ہیں اور محبت کو دنیا کے ہر رشتے کے ساتھ وابستہ رکھنے میں پریم چند کے حامی ہیں اس کے علاوہ دوسری قسم کی

محبت ان کے نزدیک مجنون کی پریشان خیالی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

سجاد حیدر یلدرم | سجاد حیدر کے طبع زاد افسانوں کے علاوہ تراجم بھی بہت زیادہ ہیں۔ ان کے تراجم سے اس بات کا پتہ چلانا آسان ہو جاتا ہے کہ ہندستانی زبانوں پر غیر زبان کا کس قدر اثر ہوا۔ ان کے اکثر افسانے ترکی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ ترکی کی تمام خصوصیات کے بقا کے ساتھ ترجمہ کرنے کی کوشش میں ان کو بڑی جد وجہد کرنی پڑی۔ بعض اوقات یہ اجتہاد بے اعتدالی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ ان کی زبان لطیف اور دل کش ہوتی ہے اسلوب بیان۔ ناقابل تقلید۔ ترجمہ کرنے والوں کی فہرست میں ان کا نام سرفہرست دکھائی دیتا ہے ان کا مرتبہ ہندستانی ادب میں مسلم ہے انہوں نے اپنے طبع زاد افسانوں کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے کی بیحد کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے پڑھنے والوں کو ادبی نزاکتوں سے مخمور بنا لیتے ہیں۔ بسا اوقات نیاز کی طرح فطرت کی نقاشی کرتے ہیں انہوں نے جیساکہ اوپر ذکر ہو چکا ہے اکثر افسانے غیر زبانوں سے اخذ کیے ہیں۔ یا ترجمہ، ان میں سب سے پہلی چیز اسلوب کی دل کشی ہے جو پڑھنے والے کو گھنٹوں سرور وانبساط کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ جو اسلوب انہوں نے اپنے قصوں کے لیے انتخاب کیا وہ اس قسم کے قصوں کے لیے نہایت موزوں ہے۔ "اگر کبھی صداقت افسانے سے زیادہ تعجب خیز ہے تو افسانے صداقت سے زیادہ موثر" ان کی پیداکردہ رومانوی فضا میں ہم صداقت کی کمی محسوس کرنا بلکل بھول جاتے ہیں یہی چیز ادبی کارناموں میں ہوتی ہے۔ جب وہ سامنے ہو تو کوئی دوسری چیز سامنے نہیں رہتی۔ نیاز کی طرح سجاد حیدر بھی عموماً روزمرہ کی سادہ زندگی کو چھوڑ کر ایک نصب العینی عالم کی حیات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے تخیل میں بلندی اور شان رکھتے نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے جذبات نگاری میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ سجاد حیدر کے افسانے اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ مستقل مضامین جب کامل فن کے ہاتھ میں آتے ہیں تو کیونکر ادب کے لیے مایہ نازشاہکار ہو جاتے ہیں۔

ع مردہ بھی بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

حجاب امتیاز علی | صنف نازک میں جتنے ہندستانی مصنف ہیں ان میں حجاب کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ کہنہ مشق لکھنے والی ہیں ان کے مضامین رومان آفریں ہوتے ہیں۔ زبان سلیس پاکیزہ اور دل آویز ہوتی ہے۔ اسلوب بیان میں بھی دل کشی ہوتی ہے۔ ان کے افسانے کو شروع کرنے کے بعد ختم ہونے تک چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا بہت خوب لکھتی ہیں۔ بعض مقام کا نقشہ کھینچتی ہیں وہاں کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ چمن، بہار، بلبل، قمری، چاند ستارے، ٹھنڈی ہوائیں، درختوں کے پودے سبزہ و شبنم، ان کے کھلونے ہیں۔ جن سے دل بہلاتی ہیں اور دوسروں پر جادو ڈالنے میں مدد لیتی ہیں۔ انسانی زندگی کے لطیف جذبات کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ اور واردات قلب کی رنگین داستانوں کو بلبل ہزار داستان کی طرح بیان کرتی ہیں افسانے خاصے دلچسپ ہوتے ہیں۔ ہر چیز کی تہہ تک پہنچنے کی کاوش ان کی طبیعت میں موجود ہے "مردے کی چیخ" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا ہے۔ بات اتنی تھی کہ ایک درخت کی دو ٹہنیاں آپس میں رگڑاتی تھیں جن کی باہمی رگڑ سے انسانی چیخ کی سی خوفناک آواز رات کی تاریکی میں ہواوں میں پھیل جاتی تھیں۔ بس اتنی سی بات کو افسانہ کردیا۔ عورتوں کی فطرت کے مطابق ان کی طبیعت میں توہم کو خاص دخل ہے "مردے نے کیا کیا" اس افسانے میں ان کی طبیعت کے رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی انانیت قابل داد ہے۔

محمد فاروق حسین ام۔ اے (عثمانیہ)

مضمون ہر وقت خوشخط لکھا کیجیے۔ منیجر

تنقید



تجھے خیال کہ ہے رات کی جبیں تاریک
مجھے یقین کہ یہ بھی ہے موج گردش رنگ

تجھے یہ وہم کہ ہے موت زندگی کا فال
مجھے یہ علم کہ باطل نہیں زمانہ تنگ

تری نگاہ میں ہستی رہین صبر و سکون
مرے خیال میں گیتی محیط شورش جنگ

تجھے بایں ہمہ دانش، غم زمانہ، تلخ
مجھے بایں ہمہ کاوش سرور بادہ رنگ

تجھے خیال کہ قصر طرب ہے نقش بر آب
مجھے یقیں کہ صنم آفریں ہے ریزہ سنگ

تجھے فسانہ باطل حدیث سوز و گداز
مجھے پیام حقیقت صدائے بربط و چنگ

سکون قلب تری سعی ناتمام کی حد
نشاط روح مری ہمت بلند کو ننگ

چلا ہے تو کہ ہے دنیا مقام حزن و ملال
بڑھا ہوں میں کہ تجھے دوں پیام رامش و رنگ

ترا وہ قلب کہ آسودہ فریب جمال
مری وہ روح کہ بیگانہ حجاب و خدنگ

وہ موج تو ہے کہ جس پر گراں روانی اسیر
وہ صید میں کہ جسے خود ہے آرزوئے خدنگ

فسردگی سے ہے ظلمت فروش تیری نگاہ
شگفتگی سے ضیا آفریں ہے میری امنگ

پھر اس پہ دعوی نقد و نظر خدا کی پناہ!
کہاں جمال حقیقت، کہاں صغیر گناہ

علی اختر (حیدرآبادی)

"بی بی!" دھوبن نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ "سات گھروں نئے کپڑے دھوتی ہوں سات گھروں کے کس چیز کی کمی ہے میرے ہاں۔ خدا سلامت رکھے کمانے والے کو اپنی نیند سوتی ہوں اپنی نیند جاگتی ہوں"۔

بی بی ہنس کر بولی

"اری کم بخت! تو یہ کیوں نہیں کہتی کہ ہمارا غریب دھوبی کماتا ہے اور تو مزے سے کھاتی ہے۔ لطف تو تب آوے جب تجھے بھی کسی روز لادی لے کر گھاٹ پر جانا پڑے۔ اس غریب کی تو دن بھر چھو اچھوا کرتے زبان سوکھتی ہے اور تجھے گھر بیٹھے منجن مسی کے سوا اور کام نہیں۔

دھوبن ہنس کر بولی

"بی بی! منجن مسی بھی تو اسی کے لیے کرتی ہوں وہ دن بھر کا تھکا ماندہ آتا ہے میں بھی اٹھ کر لادی اتارنے میں جب ہاتھ بٹاتی ہوں تو جس انداز سے وہ مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے جس کا مزا ہی تو آجاتا ہے"۔

"بہت محبت ہے تم سے"؟ بی بی نے کہا

"بی بی! دھوبن آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "مرد کی محبت کا اعتبار ہی کیا۔ جونہی کبھی نظر آئی اس پر لٹو ہو گئے اور کچھ نہیں تو ذرا آنکھیں ہی سینک لیں۔ ہائے توبہ! ان مردوں کو بھی اللہ میاں نے کیسا پھسلنا دے رکھا ہے"۔

بی بی نے ہنس کر پوچھا۔

"کہیں تم سے بھی تو یوں ہی آنکھ نہیں لڑ گئی تھی۔ ہو تو تم بھی بڑی طرحدار۔ پھانس تو نہیں لیا تھا کہیں غریب کو"۔

دھوبن ہنس کر بولی۔

"بی بی! بات تو آپ نے خوب بوجھی پر میں نے نہیں پھانسا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اسی نے مجھ غریب کو پھانس لیا۔ میں انجان ان مردوں کی چالوں کو کیا سمجھ سکتی تھی!



"گویا! بی بی مسکرا کر بولی" کیا دل ملے کی شادی ہوئی تھی ہوئی کیسے؟ مجھ سے نہ کہو گی؟"

دھوبن ہنس کر بولی۔

"میرا باپ بوڑھا تھا۔ ایک ساتھی کام کے لیے رکھ لیا تھا۔ یہ ایک جوان چھوکرا تھا۔ جب لادی لے کر گھاٹ پر جاتا تو خوب میٹھے میٹھے سروں میں۔ ع

گوری دھیرے چلو گگری چھلک نہ جائے!

الاپا جاتا عمر کے لحاظ سے اسے زیادہ سنگار کا بھی شوق تھا۔ کام محنت سے کرتا تھا۔ کوئی بارہ ایک کے قریب کبھی میں اور کبھی میرا باپ اس کی روٹی لے کر جاتے۔ باپ کا تو وہ بہت ادب کرتا اور ان سے جھجکتا بھی تھا۔ لیکن جب میں جاتی تو اس کے طور اطوار کچھ اور ہی ہوتے۔ بات بات پر مسکرا دیتا۔ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے لانبا سانس لیتا کبھی آہ بھرتا۔ کبھی کچھ گنگنانے لگتا"۔

"میں خاموش بیٹھی اس کی یہ حرکات دیکھا کرتی لیکن......"

"لیکن"! بی بی نے بات کاٹ کر پوچھا "تم سے بات چیت نہ ہوتی تھی؟"

"بلکل نہیں بی بی" دھوبن نے جواب دیا "میں خود ہی جو کچھ پوچھتی تو جواب ... اور وہ بھی بہت مختصر سا۔ کبھی لادی بھاری ہوتی ... پر سے لادنے میں اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتی۔ اسی طرح دن گذر رہے تھے ایک روز جو وہ گھاٹ سے واپس آیا تو بارش ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ میں چولھا جلائے بیٹھی تھی وہ جب بیل پر سے لادی اتارنے لگا تو اس کا پاؤں پھسل گیا اور لادی اس کے اوپر گری۔ باپ گھر پر نہیں تھا میں نے جلدی سے اٹھ کر لادی گھسیٹ گھسیٹ کر اوپر سے ہٹائی اس کے چوٹ آئی تھی۔ میں نے کہا۔

"تم چولھے کے پاس چل کر آگ تا!

کپڑے اندر رکھتی ہوں۔"

"تم کیوں رکھو،" اس نے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے تمہاری بیزار کام کرے۔"

"اوہو!" میں نے ہنس کر کہا۔ "گویا میں آج پہلی بار کام کرنے لگی ہوں! چلو ہٹو! یہ گیلے کپڑے اتار کر دوسرا پہن لو۔ کہیں سردی نہ لگ جائے۔"

لیکن وہ نہ مانا اور خود ہی لادی کھول کر کپڑے ٹھکانے سے رکھنے لگا۔ کچھ میں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ جب کپڑے رکھ دیے گئے تو میں نے کوٹھڑی میں سے بھوسہ نکال کر اس میں دانہ بھی ملایا اور بیل کو چھپر کے نیچے باندھ کر بھوسہ کنڈ میں ڈال دیا۔ گو وہ مجھے بار بار روکتا ہی رہا۔ لیکن گھاٹ پر سے آ کر جو کام وہ کرتا تھا آج میں نے کر دیا۔ رات اسے بخار آ گیا۔ میں اور میرا باپ ایک کوٹھڑی میں سوتے تھے وہ دوسری کوٹھڑی میں سوتا تھا۔ یہی دو کوٹھڑیاں ہمارے پاس تھیں۔ ان کوٹھڑیوں کے آگے گھاس پھوس ڈال کر ہم نے ایک برآمدہ بنا رکھا تھا۔ برآمدے میں لکڑیوں کی ایک بار کسری کر کے اسے بھی دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا ایک حصے میں بیل بندھا رہتا۔ دوسرے میں اپلے اور ایندھن وغیرہ رکھا رہتا۔

"رات کا وقت [illegible] رہی تھی۔ ہوا تیز تھی۔ آج اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں نے باپ سے کہہ کر تھوڑا سا دودھ منگوایا اور اس کے لیے چائے بنائی۔ جب میں چائے لے کر اس کی کوٹھڑی میں گئی تو وہ تپ سے پڑا تھا۔ میں نے اسے دو ایک بار آواز دی۔ اس نے ایسے ہی ہوں ہاں کر دی۔ میں نے کہا۔

"اٹھو! تھوڑی چائے پی لو۔"

اس نے ایسے ہی سر ہلا دیا۔

"[illegible]" میں نے پوچھا۔

اس نے سر کے اشارے سے کہا "لگتا ہے" گھر میں کوئی فالتو لحاف تو تھا نہیں۔ مجھے اس کی اس بیکسی پر بڑا ترس آیا میں چپکے سے اپنا لحاف اٹھا لائی اور اس کے لحاف کے اوپر دوسرا لحاف بھی ڈال دیا۔ کچھ دیر میں خاموش کھڑی رہی پھر اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گئی۔ نہ جانے کیا بات تھی جو آج مجھے نیند نہ آئی۔ رہ رہ کر بیمار کا خیال آتا۔ باپ مزے سے پڑا خراٹے بھر رہا تھا۔ میں چپکے سے اٹھ کر پھر اس کی کوٹھڑی میں گئی۔ چراغ کی بتی جھلملا رہی تھی وہ مزے سے پڑا سوتا تھا میں نے ماتھے کو چھوا تو بخار نہیں تھا لیکن میرے چھونے سے اسے جاگ آ گئی۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پڑے رہو۔ میں ہوں" میں نے جواب دیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو" اس نے پوچھا۔

"ایسے ہی آ گئی تھی،" میں نے جواب دیا۔ "چائے پیو گے۔"

"ہاں!" وہ بولا "اگر مل جائے تو۔"

میں چپکے سے پھر اپنی کوٹھڑی میں آئی اور چائے والی دیگچی اٹھا کر برآمدے میں اپلوں کی آگ والی انگیٹھی پر رکھ دی آگ میں نے دبا رکھی تھی۔ جب چائے گرم ہو گئی تو میں دیگچی اٹھا کر اس کے پاس لے گئی۔ چراغ کسی مریض کی طرح سانس لیتا معلوم ہوتا تھا۔ ہوا کا جو ایک جھونکا آیا تو چراغ بجھ گیا اور کوٹھڑی میں اندھیرا ہو گیا۔ میں جہاں کھڑی تھی چائے کی دیگچی میں نے وہیں رکھ دی۔

"اوہو!" وہ بولا "چراغ گل ہو گیا کیا۔"

"شاید تیل نہیں تھا،" میں نے جواب دیا۔ "ٹھہرو تو میں تیل لاتی ہوں۔"

"کیا کرو گی تیل لا کر" اس نے کہا۔

"روشنی کروں گی۔" "تم چائے نہیں پیو گے۔" میں نے کہا۔

"تم ایسے ہی پلا دو" اس نے کہا
"تو پی پی!" دھوبن کہنے لگی "میں نے ٹٹول ٹٹال کر کٹوری میں چاے ڈالی اور اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ لو! کٹوری پکڑ لو۔ اس نے اندھیرے ہی میں کٹوری پکڑ لی میں پاس کھڑی تھی وہ چاے پی رہا تھا۔"
وہ بولا۔
"تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ نا۔"
"تم چاے پی لو تو میں جاؤں" میں نے جواب دیا
"کتنی رات گئی" اس نے پوچھا۔
"کوئی نصف کے قریب" میں نے جواب دیا
"نصف کے قریب!" وہ تعجب سے بولا "تم ابھی سوئی نہیں۔"
میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس نے پھر پوچھا۔
"گھر میں فالتو لحاف تو ہے نہیں۔ یہ لحاف تم کہاں سے لائیں۔"
"میں اپنا اٹھا لائی" میں نے جواب دیا۔
"کیوں!" اس نے پوچھا۔
"تمہیں جاڑا جو لگتا تھا" میں نے جواب دیا۔
"تم نے کیا اوڑھ لیا" اس نے پوچھا۔
"میرے گاڑھے کی اوڑھنی جو تھی" میں نے جواب دیا
"بہت برا کیا تم نے" اس نے کہا "تمہیں اس کی کچھ سزا ملنی چاہیے۔"
"سزا!" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیوں؟"
"بس میری مرضی!" اس نے جواب دیا۔
کہتے ہوے اندھیرے ہی میں اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
"ہاتھ چھوڑ دو میرا" میں نے کہا
لیکن اس نے مجھے کھینچ کر پاس بٹھا لیا اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر میرا منہ چوم لیا۔

"ہٹو بھی۔ میں نے جھلا کر کہا۔ کیا کرتے ہو۔"
"خدا کے لیے ایک بات بتلا دو" اس نے کہا۔
"کیا؟" میں نے پوچھا۔
"سچ کہو گی" اس نے پوچھا۔
"ہاں!" میں نے جواب دیا۔
"تمہیں مجھ سے محبت ہے" اس نے پوچھا۔
"چلو ہٹو!" میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوے کہا "جانے دو مجھے۔"
لیکن اس نے مجھے اٹھنے نہ دیا۔ ساتھ ہی آواز آئی
"لو دیکھ لو! اس حرامزادے کے کرتوت"
"ٹھہرو!" ایک اور آواز آئی۔ "میں لالٹین روشن کرتا ہوں۔"
میں اس کی چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں جب لالٹین جلی تو محلے کے دو آدمی کھڑے تھے۔ یہ بھی ہماری برادری کے لوگ تھے۔ لیکن میرے باپ سے ان کی ان بن سی تھی۔ ان میں سے ایک بولا:۔
"چھوکری! تو یہاں کیا کرتی ہے اس وقت۔"
میں نے ڈرتے ڈرتے کہا
"اسے بخار تھا۔ میں چاے لیکر آئی تھی۔"
"اس وقت؟" لالٹین والے نے غصے سے کہا "بے شرم لاج بھی نہ آئی تجھے۔"
اب بیمار بولا:۔
"تم کیوں آے اس وقت۔"
لالٹین والا بولا۔
"اے حرامزادے! ہم تو تیری کرتوت بہت دنوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس بوڑھے کو غیرت نہ آئی۔"
"لیکن تم اس وقت آے کیوں" بیمار نے پھر پوچھا
"تم ہو کون اس گھر میں آنے والے۔"

"ابھی بتا دیتے ہیں" لالٹین والے کا ساتھی بولا:-

"چھٹی کا دودھ یاد نہ آجائے تو جو دل چاہے کہو"

لیکن پیشتر اس کے کہ کوئی اور بات ہو میرے باپ کا ساتھی چھلانگ مار کر کوٹھڑی سے نکلا۔ اور چور چور پکارنے لگا۔ اس کی آواز سنتے ہی ادھر ادھر سے دو چار بریشے گھروں سے نکل آئے۔ میرا باپ بھی کھانستا ہوا اندر سے نکلا۔ اب ہر طرف سے "کون ہے؟ کہاں ہے" کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ دونوں بھی باہر نکل آئے۔ اس نوجوان نے آگے بڑھ کر لالٹین والے کے ایک گھونسہ جمایا اور بولا۔

"پکڑ لو حرامزادوں کو۔ یہی لوٹنے آئے تھے" ہمیں لوگوں نے دونوں کو پکڑ لیا۔ اور پہچان کر لگے لعنت ملامت کرنے۔ ہر چند وہ اپنی صفائی پیش کرتے۔ لیکن اس وقت ان کی سنتا کون تھا۔ شور و غل کی آواز سن کر گشت کا سپاہی بھی کہیں سے آنکلا اور دونوں کو پکڑ کر تھانے لے گیا اور میرے باپ کو اور دو ایک اور آدمیوں کو بھی صبح تھانے پر آنے کو کہہ گیا۔ اس اثنا میں میں چپکے سے اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ باہر کچھ دیر تک یہ لوگ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر میرا باپ اور وہ جوان چھوکرا بھی گھر آ گئے۔ لیکن وہ چھوکرا میرے باپ کو اپنی کوٹھڑی میں لے گیا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ ان میں کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن صبح ہوتے ہی محلے کے دو چار آدمیوں کی موجودگی میں میرے باپ نے اسی چھوکرے سے میرا عقد کر دیا۔

یہہ داستان کہہ کر دھوبن ہنس کر بولی۔

"بی بی! اب آپ ہی انصاف سے کہیں کہ کس نے پھانسا؟"

بی بی ہنس کر بولی

"یہہ پھانسنے کی بات تو تم رہنے دو۔ لیکن اس نے کمال ہی کر دیا۔ اب بھی کبھی اس روز کی بات کا آپس میں ذکر تو تم کرتے ہو گے؟"

"ہاں بی بی!" دھوبن نے ہنس کر کہا: "ذکر تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ خوب ہنستے ہیں ہم دونوں!"

"خوب مزے کی داستان ہے تمہاری" بی بی نے ہنس کر کہا۔

"قسم لے لو بی بی!" دھوبن بولی: "آج پہلی بار آپ سے کہا ہے۔"

ام اسلم

آبشار شولا

کوڈی تیری گودی میں مچلتا ہوا شولا　　جلوہ ہے سراپا
صناعی قدرت کا دل آویز نظارہ　　صد رنگ تماشا
ہے جیسے ابلتی ہوئی اک دودھ کی ندیا　　خوش رو پسندریا
بس دیکھتا رہجائے جسے دیکھنے والا　　مسحور ہوا ایسا
یعنی یہ پانی کا تڑپتا ہوا ریلا　　سیماب ہے گویا
یا یہ ہے کہ اک نقرہ سیال کا دریا　　ہے جوش میں آیا
چلتے ہوئے پانی کا وہ سورج میں چمکنا　　کرنوں میں لرزنا
بہتے ہوئے الماس کا دریا نکل آیا　　ہے یوں نظر آتا
وہ دھوپ میں بل کھاتے ہوئے پانی کا چلنا　　گل بوٹوں کا بننا
ہیں پھل جھڑیاں چھوٹتیں رنگین و مطلا　　اک آن میں صدہا

یا عاشق بیتاب کا ہے دل یہ مچلتا　　تھمتا نہ ٹھہرتا
چوکھٹ پہ در یار کی جو سر ہو پٹکتا　　با گریہ و نالہ
دیوانہ ہے شوریدہ کوئی شور مچاتا　　اور دوڑتا جاتا
اک کل نہیں کل اس کو ہے معلوم یہ ہوتا　　پارے کا ہے پتلا
وہ کوہ کے اوپر سے جو آتا ہے تڑپتا　　پانی کا دڑیڑا
ہے دیو گرتن کوئی با قامت بالا　　اور غیظ میں بھرا
دشمن کے تعاقب میں ہے جھنکارتا جاتا　　کف منہ سے اگلتا
یا زاہد شرمندہ عصیاں کہ بہ صحرا　　بیٹھا ہوا اکیلا
اور اشک مسلسل سے ہے ریش اپنی بھگویا　　مصروف بہ توبا

یا درس عمل اہل نظر کو ہے یہ دیتا　　باعزم و ارادہ
کچھ رنج ملامت کا نہ تحسین کی پروا　　کوشش ہے سراپا

وہ گنبد نیلی کے تلے کوہ کے بالا　　شولا کا تماشا
اور پانی کی بہتی ہوئی لہروں کا وہ تانتا　　تا دامن صحرا
اطراف میں سرسبز درخت اور وہ سبزا　　کرنوں میں دمکتا
اوراق سے اشجار کے شکل اپنی دکھاتا　　خورشید مطلا
دیکھا بھی کبھی تو نے ہے یہ سین انوکھا　　اے دیدہ بینا
اس کیفیت خاص کا رکھ کھینچ کے نقشہ　　اے حسن کے شیدا
ہے حبشی دلہن اوڑھے ہوئے نیلا دوپٹا　　با ناز و کرشمہ
اک گوہر غلطاں کا پچکتا ہوا سہرا　　ماتھے سے ہے باندھا
استادہ جوانان چمن بہر تماشا　　از جوش تمنا
جھک جھک کے بڑھا ہاتھوں کو اور کھول کے چہرا　　منہ دیکھ دلہن کا
خورشید کا ہاتھوں میں لیے جام سنہرا　　دیں شادی کا تحفہ
اے عاصیہ دریائے مضامیں کا بھی تیرا　　ہے خوب چڑھاوا

رابعہ بیگم عاصیہ

کوڈی کینال جنوبی ہند کا ایک گرمائی مقام ہے جو مناظر اور آب وہوا کے لحاظ سے مشہور ہے۔

تنقید نگاری اور نیاز فتحپوری

دنیا میں ہر چمکنے والی چیز سونا ہوتی تو پھر نہ عیار کی ضرورت تھی اور نہ پرکھنے کا ڈھنگ کسی کو معلوم ہوتا لیکن یہاں تو پھولوں کے ساتھ کانٹے اور جواہرات کے ساتھ سنگریزے کچھ اس طرح ملے جلے ہیں کہ ہر دو میں تمیز کرنے کے لیے بڑی ہوشیاری اور بیداری کی ضرورت ہے ادبیات کا شعبہ بھی زندگی کی اس عام حقیقت سے مستثنیٰ نہیں۔ اس لیے یہاں بھی کسی چیز کو سمجھ کر اس کے محاسن اور معایب میں امتیاز کرنا انسان کا فرض ہی نہیں بلکہ فطری حق ہے۔ پھر جہاں تک اپنی پسند کا تعلق ہے ہر شخص کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ کانٹوں کو پھول سے زیادہ نازک اور رنگین تصور کرے اور جواہرات کو سنگریزوں سے زیادہ بے حقیقت سمجھے اور اپنی فراست پر مطمئن رہے۔ لیکن اگر وہ کسی چیز پر ایسی جامع رائے پیش کرنے کا خواہشمند ہے جو دوسروں کے لیے بھی قابل تسلیم ہو تو پھر وہ اپنے ذاتی تاثر و تکلیف اور شخصی وجدان و ذوق کو حقیقت اور واقفیت سے دست و گریبان کرنے پر مجبور ہوگا۔ اور اسے اپنی پسند کے مقابلے میں معیار صداقت کو ترجیح دینی پڑے گی۔ حیات انسانی کا مفہوم اجتماع سے ہے۔ اسی لیے محض اپنی افتاد طبع کسی چیز کے لیے معیار رد و قبول نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے ضرورت اور سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی چیز کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے ایسے اصول مقرر کیے جائیں اور اس کے محاسن و معایب پرکھنے کے لیے ایک ایسا معیار متعین کیا جائے جو ذوق سلیم کے لیے قابل قبول ہو ان مقررہ اصولوں پر ادبیات کی تشریح و توضیح اور اسی مخصوص معیار پر ان کی خوبیوں اور خامیوں کا امتیاز تنقید کہلاتا ہے۔

تنقید کے لغوی معنی ہیں پرکھنا اور کھوٹے کھرے کا فرق معلوم کرنا، بطور ادبی اصطلاح کے بھی اس لفظ کے استعمال میں اس کے لغوی معنی کا اثر موجود ہے۔ ادب کے محاسن اور معایب کا صحیح اندازہ کرنا اور اس پر رائے قایم کرنا اصطلاح میں تنقید کہلاتا ہے۔ تخلیقی ادب حیات انسانی کا ترجمان ہے اور تنقید تخلیقی ادب کی ترجمان، اس لیے ادبیات میں شعبۂ تنقید ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ عوام کے ذوق سخن کی اصلاح کے علاوہ ایک نقاد ہمیں ادبیات کی غرض و غایت سے آگاہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ حیات انسانی کے ارتقا میں شعر و ادب نے کیا اور کس قدر اہم خدمت انجام دی ہے۔ ایک نقاد کا فرض ادبیات کی تشریح و تنقیح اور ان کی تہذیب و ترتیب ہے وہ ایک معین معیار اور مقررہ اصولوں کے مطابق ادب کے جملہ محاسن و معایب معلوم کرنے کی جد و جہد کرتا ہے اس کے بعد ان کا ایک صحیح نظریہ اور ایک بلند معیار قایم کرکے موجودہ ادب کی معاصرانہ تحریکوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ایک حیثیت سے ادبیات کے جملہ شعبے تنقید کے تابع فرمان ہیں۔

کسی زبان کی ادبیات کی نشو و نما بغیر تنقید کے نہیں ہوتی۔ جس طرح ایک باغ میں باغبان کی موجودگی روشوں کو درست رکھنے، بیکار اور فضول جھاڑیوں کی بیخ کنی کرنے کانٹ چھانٹ کرنے اور خشک و مردہ پتیوں سے درختوں کی تھالوں اور پھلواریوں کے تختوں کو صاف رکھنے کے لیے

ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ اسی پر باغ کی بہار، خوبصورتی اور صحیح نشو ونما کا انحصار ہے۔ بلکل اسی طرح ادبیات کی ترقی اور صحیح نشو ونما کا انحصار بھی فن تنقید کے وجود اور اس کے بے باک عمل پر ہے۔ اس لیے ہر ملک اور ہر زمانے میں نقادان ادب کا وجود ملتا ہے۔ لیکن موجودہ صدی کے آغاز تک بہت کم تنقیدیں ایسی لکھی گئی ہیں جن کا مقصد ادب کی بے غرض خدمت ہو۔ اس زمانے کی تنقیدوں میں تخریبی پہلو زیادہ نمایاں رہا ہے اور ان میں حریفانہ جذبات کی جھلک بھی صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً سودا کے اعتراضات میر پر یا رجب علی بیگ سرور کے حملے میر امن پر۔ یہاں یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ معترضین خود بھی بلند مرتبہ ہستیوں کے مالک تھے اور ادبیات میں غیر فانی اور لازوال کارنامے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے معاصرین کے ادبی کارناموں کا اندازہ کرتے وقت آنکھیں بند کر لیں۔

ہماری زبان میں تنقید کی ابتدا صحیح معنوں میں موجودہ صدی کے آغاز سے ہوئی ہے۔ اس سے قبل اگر کوئی چیز تنقید کے مماثل کہیں پائی جاتی ہے تو وہ عام طور سے تذکروں میں ملے گی جو عموماً فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ تنقیدیں نہیں ہیں اور نہ اس مقصد سے لکھی گئی ہیں۔ چند معروف اور غیر معروف شعرا کا مختصر حال جو کہیں صرف نام اور تخلص پر ختم ہو جاتا ہے اور ان کے چند منتخبہ اشعار جن کی تعداد کم ہوتے ہوتے ایک حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کچھ ایسی لفظی اور سطحی تعریفیں جن سے شاعری کی امتیازی صفات سے زیادہ تذکرہ نویس کے زور قلم اور مضمون آرائی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ کہیں کہیں کلام پر کوئی اعتراض اور دور اسے لفظی تغیر کے ساتھ کسی شعر پر اصلاح ان تذکروں کا کل سرمایہ ہے۔ اردو میں غالباً سب سے پہلا تنقیدی کارنامہ ہے میر کے مرثیہ پر سودا کی منظوم تنقید ہے۔ اگرچہ یہ سراسر تخریبی ہے

لیکن قدیم طرز تنقید کی اس سے زیادہ مکمل اور بہتر کارنامہ پیش کرنا مشکل ہے اس میں زبان اور بیان کے علاوہ مرثیہ گوئی کے بعض اصولوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔

محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف "آب حیات" کو قدیم و جدید طرز تنقید کی درمیانی کڑی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن "آب حیات" کا تنقیدی اور تاریخی پہلو بہت کمزور ہے۔ اور معیار صداقت سے بھی گرا ہوا ہے۔ بعد کے مبصرین نے "آب حیات" کی غلط بیانیوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ محمد حسین آزاد ایسا عالم اور فاضل انسان بھی بے لاگ اور غیر جانبدار نہ تنقید نہ کر سکا اور اپنے استاد ذوق کے مقابلے میں مرزا غالب کو پست و ہیچ دکھانے کی کوشش میں اپنے اس ادبی کارناموں کو دنیا کی نگاہوں میں ایک بے قیمت چیز بنا گیا۔ البتہ "آب حیات" اپنی عبارت کی رنگینی اور اسلوب بیان کی دلآویزی کے لیے ضرور قابل قدر ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا "مقدمہ شعرو شاعری" دور موجودہ کا سب سے بڑا اور کامیاب تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس میں پہلے نفس شعر اور اصول شعر گوئی سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور شعرو شاعری کا ایک صحیح اور بلند معیار متعین کر کے نہایت بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ جملہ اصناف سخن پر تنقید کی گئی ہے۔ اور ان کی اصلاح و ترقی کے لیے اصول و آئین وضع کیے ہیں۔ مگر افسوس اس کا اسلوب بیان کچھ اس قدر روکھا پھیکا اور زبان غیر مانوس، انگریزی الفاظ کی بھرمار کی وجہ سے اس قدر بے مزہ ہے کہ حالی کے اس شاندار ادبی کارنامے کی قیمت گر گئی ہے۔

شبلی نعمانی کی تصانیف "شعر العجم" اور "موازنہ انیس و دبیر"، امداد امام اثر کی کتاب "کاشف الحقائق"، رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" اور بالخصوص اس کا ہندستانی ترجمہ اور حافظ محمود شیرانی کی تصنیف "پنجاب میں اردو"، ہماری زبان

کی بہترین تنقیدیں ہیں مگر ان میں مشرقی اور مغربی خیالات کا کچھ ایسا امتزاج کیا گیا ہے کہ بعض جگہ نظر یہ میں تناقص پیدا ہوگیا ہے۔

دورِ موجودہ میں تنقید نگاری کی طرف کافی توجہ کی گئی ہے۔ مگر افسوس ہمارے بعض ناقدین اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ تنقید کا مقصد محض عیب بینی ہے۔ ان کی بے اصولی تنقید تخلیقی ادب کی نشو و نما مسدود کرنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں مطبوعات جدیدہ پر تنقید کرنے کا مطلب ان کی تعریف کرنا سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نقاد کا کام عیب بینی نہیں لیکن نقاد کو زیر تنقید کتاب کے پڑھنے والوں سے واسطہ ہونا چاہیے مصنف سے نہیں۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ مصنف نے کس قسم کے ماحول میں زندگی بسر کی اور اس کی استعداد اور قابلیت کیا ہے اور ان چیزوں کا کیا اثر اس کی تصنیف میں نمایاں ہے اس طرح کی معلومات بہم پہنچا کر نقاد گویا مصنف کا مقصد اور اس کا نقطۂ نظر سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ تاکہ ہم خود اس کی تصنیف پر صحیح رائے قایم کر سکیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ تنقید سے نقاد کا مطلب ترجمانی ہونا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے مصنفین اپنی کتابیں رسایل وجرائد کو محض اس خیال سے بغرض تنقید بھیجتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنی کتابوں کی ارزاں اشتہار بازی کرسکیں گے۔ مدیران رسایل و جرائد بھی کتاب کی تعریف چھاپنے پر مجبور رہیں کیونکہ یہی لوگ ان کے رسالوں اور اخباروں کے مضمون نگار بھی ہیں کیونکہ مضمون نگار کو اس کی محنت اور دماغی کاوش کا کوئی معاوضہ جبرہ شاہی کی صورت میں ادا نہیں کیا جاتا۔ اس لیے مدیران رسایل وجرائد اپنے مضمون نگاروں کو خوش رکھنے کی غرض کو زیر تنقید کتاب کی الٹی سیدھی تعریف کرنے پر مجبور رہیں۔ اکثر حالات میں ہوتا یہی ہے کہ کتاب کا مطالعہ کیے بغیر چند تعریفی کلمات چھاپ دیے جاتے ہیں۔

اگر آپ تنقید کے اس دفتر بے پایاں میں صحیح اصولوں اور نظریوں کی جستجو کریں تو آپ اپنے آپ کو ایک ایسے باغ میں پائیں گے جہاں ایک پھول ہے تو دس کانٹے ایک طرف صفائی اور چمن بندی کی گئی ہے تو تین طرف خس و خاشاک کے ڈھیر لگے ہوے ہیں۔ کہیں محض تنقیص پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کہیں تقریظ کو بہت سمجھا گیا ہے۔ کہیں سطح ہی پر جستجو ختم کر دی گئی ہے اور کہیں تہ میں ڈوب کر رہ گئے ہیں۔ پھر آپ ان تنقیدوں کی محرکات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کہیں مذھبی تعصب کی کار فرمائی ہے، کہیں فرقہ بندی کے جذبات اور ذاتی تعلقات کی ریشہ دوانیاں ہیں۔ اور ناقد کا مقصد بلعموم کسی کی ناروا ستایش یا بے جا مذمت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ناقد اصولوں کے تحت لڑنا نہیں جانتے ان کو صرف اپنے مزعومات سے عشق ہے جن پر وہ صداقت اور واقعیت کو قربان کردینے میں بہت بے باک ہیں ہندستانی میں تنقید کی بے قدری اور مبصرین کی بے راہ روی کی ایک خاص اور نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ ہمارے اخبار نویسوں میں زبردست اکثریت قطعاً جاہل یا نیم جاہل لوگوں کی ہے۔

ہندستانی میں غیر ذمہ دار حضرات کے شعبۂ تنقید کی جو مٹی پلید ہوئی ہے اس پر جس قدر افسوس کیا جاے کم ہے لیکن پھر بھی شکر کا مقام ہے کہ ناقدین کی اس افسوسناک ذہنیت کے باوجود آج بھی دو چار ہستیاں ایسی ضرور موجود ہیں جو صحیح معنوں میں حق تنقید ادا کر رہی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر محمود شیرانی، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری۔ پروفیسر حامد اللہ افسر، میر علی عبدالباری آسی، محی الدین قادری زور وغیرہ کے نام فخر کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے خود ساختہ اور نیم جاہل ناقدین یہ بھول جاتے ہیں کہ دیگر اصناف ادب کی خامکاری صرف رہرو کی گمراہی ہے۔ جس کا علاج رہبر سے ممکن ہے لیکن تنقید کی گمراہی تو رہبر کی لغزش ہے جس کی تلافی ناممکن۔ تنقید کا فقدان صرف عیب و ہنر کو یکساں کر دکھاتا ہے۔ لیکن تنقید کی غلطی تو ہر عیب کو ہنر اور ہر ہنر کو عیب بنا دیتی ہے۔ تنقید کی پستی کے ساتھ جدت و اختراع کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ اور تخلیقی ادب کا بڑھتا ہوا سیلاب ختم ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے تنقید کی ترقی کے ساتھ ادبیات کے تمام شعبوں میں اس طرح سے گرمی پیدا ہو جاتی ہے، جس طرح بجلی سے کسی مشین کے جملہ پرزے حرکت کرنے لگتے ہیں چنانچہ یورپی ملکوں میں تنقید کو فروغ ہوا وہاں ادب بھی بہت وسیع، متنوع اور ترقی یافتہ ہے دراصل تنقیدی اور تخلیقی ادب ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ جہاں تنقید اپنے اصولوں کی تدوین تخلیقی ادب سے کرتی ہے وہاں "متاعِ سخن" کی نوعیت اور ارزانی بھی بہت کچھ "عیارِ طبعِ خریدار" پر منحصر ہے۔

اگر ہم بے اصولے اور مصلحت اندیش یا کوتاہ بیں ناقدین کو نظر انداز کر دیں تو پھر ہمیں کہنا پڑے گا کہ ہندستانی میں ناقدین کی تعداد اس قدر کم ہے کہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور ان میں نیاز فتحپوری مدیر مجلہ نگار (لکھنو) کو کیا بہ لحاظ اصابت رائے اور اصول پرستی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے مجلہ نگار کے مومن، غالب، ظفر، مصحفی اور نظیر نمبر۔ اور اسی رسالے کی اردو شاعری اور ہندی شاعری نمبر "مذکرات نیاز" وغیرہ تنقیدی ادب کے قابل فخر کارنامے ہیں۔ اس لیے سطور ذیل میں ہم نیاز کے تنقیدی کارناموں پر ایک طایرانہ نظر ڈالیں گے۔

نیاز فتحپوری نے ۱۹۴۳ء میں ایک تقریر بعنوان "ادبیات" دلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی تھی۔ اس تقریر کے دوران میں انہوں نے اصول تنقید غرض و غایت تنقید پر اپنی رائے بایں الفاظ پیش کی تھی کہ "ادبیات میں تین مختلف قوتیں سرگرم کار پائی جاتی ہیں ایک قوت تصنیف دوسرے قوت لذت اندوزی، اور تیسری قوت انتقاد، ان تینوں قوتوں میں سے اول الذکر دو قوتوں کا وجود پہلے سے پایا جاتا ہے اور اس کے بعد قوت انتقاد اپنا کام کرتی ہے۔ جوں ہی ایک شخص کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ ایک سے زاید چیزوں میں سے کسی خاص چیز کو ترجیح دینی چاہیے۔ انتقاد شروع ہو جاتا ہے" فن تنقید کی غرض کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اس فن کی غرض صرف یہ ہے کہ تصانیف اور ان کے موضوع سے بحث کی جاے اور مصنف اور زمانہ تصنیف کی باہمی مناسبت ظاہر کرکے ان کتابوں سے مقابلہ کیا جاے جو کسی مخصوص موضوع پر مختلف زبانوں اور ملکوں میں لکھی گئی ہیں۔ علمی رایوں پر اعتراض کرنا نقاد کا کام نہیں ہے۔ کیونکہ نقاد کے لیے ہر موضوع میں مہارت رکھنا ضروری نہیں ہے۔ البتہ ہر عہد اور ہر ملک کی علمی تاریخ سے آگاہ ہونا یقیناً لازم ہے کیونکہ فن نقد اور تاریخ علم و ادب میں باہم ربط پایا جاتا ہے"

"فن نقد کے تین اغراض ہیں؛ تشریح، حکم اور تعین مراتب، جو شخص کسی کتاب پر نقد کرے اسے چاہیے کہ پہلے اسے غور سے پڑھ کر سمجھ لے اور اس کے ساتھ اس موضوع کی اور کتابوں کا بھی مطالعہ کرے کیونکہ بغیر اس کے وہ کتاب زیر نقد کا کوئی درجہ متعین نہیں کر سکتا ہے"

"متقدمین کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی کتاب پر نقد کرتے تھے تو صرف اس کے موضوع اور مضامین پر نگاہ ڈال لیتے تھے۔ اور معانی و لغت، صرف و نحو کی حیثیت سے اس پر نظر کرتے تھے۔ لیکن موجودہ فن نقد بہت بلند ہے آج جب کوئی شخص نقد کرتا ہے تو اسے یہ بھی بتانا پڑتا ہے

کہ علم وادب کی تاریخ میں یہ کتاب کس درجے میں رکھے جانے کی مستحق ہے۔ اس کے مضامین کو موضوع سے کہاں تک مناسبت ہے، عصر حاضر سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اور تصنیف کو مصنف اور اس کے ماحول سے کیا نسبت حاصل ہے۔

سب سے پہلے وہ مصنف کے سوانح حیات پر نگاہ ڈالتا ہے کہ اس کے وطن کا جغرافیائی موقعہ و ماحول کی کیا حالت ہے وہ کس خاندان یا قوم سے تعلق رکھتا ہے کن لوگوں میں اس نے تربیت پائی، اس کا خاندان غریب تھا یا دولتمند، اس کا لڑکپن اور شباب کن افکار اور مشاغل میں بسر ہوا۔ زمانہ اس کے موافق تھا یا مخالف۔ اس نے تحصیل علوم کہاں کی۔ کن لوگوں سے استفادہ کیا۔ اس کی زندگی کس طرح بسر ہوئی۔ کسی سے اس کو محبت ہوئی یا نہیں زندگی اسے عزیز تھی یا نہیں، وطن سے باہر اس نے سیاحت کی یا نہیں۔ زندگی میں اسے کیا کیا تجربات حاصل ہوئے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا رہا۔ اس کی دماغی حالت اور جسمانی صحت کیسی تھی۔ الغرض نقاد ان باتوں سے باخبر ہو کر کتاب کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتا ہے اور اسی کا نام تشریح ہے۔

"اس کے بعد حکم درجہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نقاد اپنے ذاتی میلان اور انفرادی ذوق سے علٰحدہ ہو کر کتاب کے موضوع کے لحاظ سے منصفانہ رائے قائم کرے۔ یعنی اس کی طبیعت ڈراما کو پسند کرتی ہے تو خواہ مخواہ ناول کی برائی نہ کرے، اگر اس کو ابونواس کے خمریات سے دلچسپی ہے تو عنترہ کی رزمیات پر اعتراض نہ کرے۔ اگر اسے میر انیس کے مراثی اچھے معلوم ہوتے ہیں تو وہ غالب کے تغزل پر معترض نہ ہو۔ بلکہ ہر تصنیف کو منصفانہ نگاہ سے دیکھے اور اس کے محاسن و معایب پر انصاف سے قلم اٹھائے اور سوائے اظہار حقیقت کے کوئی اور غرض اس کے پیش نظر نہ ہو، اس لیے بہترین نقاد وہی ہو سکتا ہے جو کسی خاص فن یا موضوع سے گہری دلچسپی رکھتا ہو۔ بلکہ عام علمی مذاق رکھتا ہو

حکم کے بعد تعین مراتب کی منزل آتی ہے۔ مثلاً اگر ہم آتش، مومن اور غالب کے حالات زندگی، شخصی خصوصیات اور مخصوص اسالیب بیان معلوم کرکے ذوق سلیم سے کام لیں تو ان میں سے ہر ایک کا درجہ متعین کرنا پڑے گا۔ یہی وہ چیز ہے جو فرایض نقاد میں سب سے زیادہ اہمیت اور نزاکت رکھتی ہے اور اسی لیے اصول نقد مرتب کرنے کی کوشش عرصے سے جاری ہے۔ مگر کسی مخصوص قسم کے ادب کو سامنے رکھ کر ان اصولوں کے مکمل ہونے کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ یہ اصول خوبیوں کا مقابلہ کرکے مرتب کیے جاتے ہیں۔ اگر نظریہ ادب پہلے عقلی اصول کے مطابق مقرر کیا جائے تو نقد میں بھی اصول رانی ہو سکتی ہے اور اس کا بھی کوئی اصول مستنبط ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ شاید اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ادبیات کا وجدانی پہلو محو ہو کر اس کی بنیاد یکسر افادیت پر قایم نہ ہو اور یہ نہ صرف دشوار ہے بلکہ ادبیات کی لطف اندوزی کو بھی محو کر دینے والا ہے۔"

نیاز فتحپوری کا مطالعہ وسیع ہے۔ انہوں نے دینی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ علوم جدید مثلاً سائنس، فلسفہ یونانی، علم الاصنام، سیاسیات، ادبیات وغیرہ کا عمیق مطالعہ کیا ہے، عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، ہندستانی سنسکرت اور بنگالی وغیرہ زبانوں پر انہیں پورا عبور حاصل ہے ان کی معلومات اس قدر وسیع ہیں کہ زندہ "انسائیکلو پیڈیا" کہنا چاہیے۔ ان کی مشہور و مقبول تالیف "مجموعہ استفسار وجواب" اس وقت تک اس کی تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں، علوم مشرق و مغرب، قدیم و جدید کے متعلق معلومات کا ایسا گراں بہا خزانہ ہے کہ اس کا جواب لکھا جانا بہت مشکل ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق صحافی، بہترین

افسانہ نویس اور بے مثل نقاد ہونے کے ساتھ ہی ایک شاعر بھی ہیں۔ گو ایک کافی طویل مدت سے انہوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے اور اب انہیں سخن گوئی کا دعویٰ بھی نہیں ہے لیکن ان کی سخن فہمی سے ان کے دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے سخن فہمی سے جو میرا مطلب ہے اسے نیاز ہی کی زبان سے بہتر طریقہ سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر ایک شخص اچھا شاعر ہے تو ہم اسے سخن گو کہتے ہیں۔ مگر دوسرا جو شاعر نہیں مگر ذوق شعری پاکیزہ رکھتا ہے اسے سخن فہم کہتے ہیں۔ پھر جس طرح ہر سخن فہم کا سخن گو ہونا ضروری نہیں۔ اسی طرح ہر سخن گو کا سخن فہم ہونا بھی لازم نہیں اور اس کی نمایاں ترین مثال میں میر کو پیش کر سکتے ہیں کہ یوں تو سخن گوئی کے لحاظ سے وہ شاہ تغزل ہے۔ لیکن جس وقت وہ خود اپنے اشعار کا انتخاب پیش کرتا ہے تو ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ دنیا جن اشعار کو میر کے نشتر سمجھتی ہے وہ خود میر کے نزدیک دل میں پھانس چبھونے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔"

اس میں شک نہیں کہ بہ حیثیت انسان ہونے کے نیاز کی تحریریں بھی معایب اور خامیوں سے پاک نہیں "مطبوعات موصولہ" کے عنوان کے تحت جو تنقیدیں مجلہ نگار میں وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہتی ہیں، ان میں دوست پروری کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اس قسم کی تنقیدیں کوئی ادبی قدر وقعت اپنے اندر نہیں رکھتی ہیں، یہ وقتی چیزیں ہیں انہیں نظر انداز کر دینا ہی مناسب ہے۔ ان کے علاوہ چند خاص وجوہ کی بنا پر جو تنقیدیں لکھی ہیں وہ بھی اعتراضات سے بالا نہیں مثلاً ۳۰-۳۱-۳۲ء ۱۹ میں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی شاعری پر تنقیدی مضمون کئی ماہ تک مجلہ نگار میں مسلسل شایع ہوا تھا۔ اگرچہ اس پر نیاز نے اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا ہے اور شخصی و ذاتی حملوں سے بھی اجتناب کیا ہے اور وہ علمی ادبی حیثیت سے بھی قابل قدر ہے لیکن با ایں ہمہ اس میں انتقامی اور حریفانہ جذبات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ لیکن یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ بہ حیثیت ایک انسان کے ان سے لغزشیں ہونا قانون فطرت ہے، اس لیے ان باتوں کو بھول جانا ہی اچھا ہے۔

نیاز نے ہندستانی اور فارسی کے تقریباً تمام مشہور شعرا پر تنقید کی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کی رائے سے اختلاف ہو کیونکہ شاعری پر رائے پیش کرنے کے سلسلے میں "سب سے زیادہ جھگڑے کی چیز ذوق کا سوال ہے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز آپ کے لیے پسندیدہ ہو۔ اور میرے لیے ناگوار، ایک ہی انداز بیان مجھے بھاتا ہو اور آپ کو ناپسند ہو۔ اس لیے کسی نقاد کی رائے کو آخری لفظ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ نقاد نے جانبداری، دوست پروری سے تو کام نہیں لیا ہے حریفانہ یا انتقامی جذبات کی جھلک تو نظر نہیں آتی ہے

نیاز نے غالب کی شاعری کے متعلق جو رائے اپنے ایک خط میں پیش کی ہے وہ بے لاگ ہونے کے ساتھ ہی بے حد دقیق اور بلند پایہ ہے، لکھتے ہیں۔

"غالب کی فارسی شاعری کے متعلق آپ میری رائے صرف ایک جملے میں چاہتے ہیں، اچھا تو سنیے لیکن غالب ہی کی زبان میں کہنا ہے۔

نظم غالب نگر کہ پنداری
کز کمیں گاہ جستہ خیل غزال

اس وقت تک غالب کے متعلق دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن خدارا بتائیے کیا اس سے بہتر رائے آپکی نظر سے کبھی گذری ہے اور وہ اتنے مختصر الفاظ میں آپ اس کا حقیقی رنگ سخن دیکھیے۔ الفاظ کے تیکھے پن پر نگاہ ڈالیے بیان کی شوخی اور بے باکی کو سامنے رکھیے۔ طرز ادا کی صفائی و شستگی پر غور کیجیے۔ اور پھر اس بیان پر کہ

ع۔ کز کمیں گاہ جستہ خیل غزال

کیا آپ اسے غالب کی شوخ نگاری کا معجزہ نہ کہیں گے؟

میرے نزدیک غالب نے اپنی عمر میں دو غلطیاں کیں، ایک بہت بڑی اور ایک بہت چھوٹی۔ بڑی یہہ کہ اس نے ریختہ میں شاعری کی اور چھوٹی یہہ کہ اس نے فارسی میں بھی غزلیں کہیں۔ اگر آج اس کا اردو دیوان جیسے وہ خود "مجموعہ بیرنگ" کہتا ہے موجود نہ ہوتا اور جو وقت تغزل فارسی میں صرف کیا ہے وہ مثنوی میں صرف کیا جاتا تو غالب کی حقیقی عظمت کا اندازہ کوئی کرتا یا نہ کرتا لیکن دنیا اس کا جواب نہ پیش کر سکتی، اس کے معنی یہہ نہیں کہ میں اس کے دیوان ریختہ یا تغزل فارسی کا مداح و معترف نہیں۔ بلکہ مقصود یہہ ظاہر کرنا تھا کہ فطرت نے جس کام کے لیئے بنایا اس کی طرف اس نے پوری طرح توجہ نہیں کی۔"

شعرائے حال و ماضی کے متعلق نیاز کی مزید تنقید بطور نمونہ پیش کرنے سے قبل یہہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کیسا شعر پسند ہے اور کیوں۔ خود ان کی زبان سے سنیئے۔ کہتے ہیں:۔

"جس وقت غزل کا کوئی شعر میری نگاہ سے گذرتا ہے تو سب سے پہلے میں یہہ دیکھتا ہوں کہ اس میں کس خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ اور اگر وہ خیال اچھا ہے تو پھر انتخاب الفاظ اور انداز بیان کو دیکھتا ہوں کہ وہ اصل جذبے کو کہاں تک ظاہر کرتا ہے یا نہیں۔ اگر دونوں میں کامل توافق پاتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ مکمل ہے اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو اسی نسبت سے اس کے حسن و قبیح پر حکم لگاتا ہوں۔

اب رہا یہہ امر کہ میں کس خیال اور جذبے کو پسند کرتا ہوں اور کس اصول پر اسلوب بیان کی ہمواری یا ناہمواری پر حکم لگاتا ہوں اس کے تمام جزئیات کی تفصیل تو دشوار ہے۔ لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میرے نزدیک وہی جذبہ زیادہ پسندیدہ ہے جو واقعیت سے زیادہ قریب ہے اور اس لیئے وہی اسلوب بیان مجھے پسند آنا چاہیے جو اس حقیقت سے زیادہ متاثر کرنے والا ہو۔ خیال کی وقعت اور بیان کی ژولیدگی غزل میں میرے نزدیک نہایت مکروہ چیز ہے۔ ایک غزل کے شعر کا لطف یہہ ہے کہ اس کے سنتے ہی مفہوم ذہن نشین ہو جائے اور انسان کو سوچنا پڑے کہ کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہے اور الفاظ سے اس کا مدعا کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے۔ الغرض خیال کی پاکیزگی اور انداز بیان کی حلاوت و سلاست جب پورے توازن کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو جائیں گی تو اسے بہترین نمونہ تغزل قرار دوں گا۔ اور اگر ان دونوں میں سے کسی میں اصلاح یا حذف و اضافہ کی گنجائش ہوئی تو یقینی میرا ذوق پوری طرح آسودہ نہ ہوگا۔"

اب انداز بیان کی اہمیت کے متعلق نیاز کی رائے سن لیجیے۔ فرماتے ہیں:۔

"انداز بیان ہی وہ چیز ہے جس سے شاعر کے صحیح جذبات کا پتہ چلتا ہے، بولنے میں لب و لہجہ اور آواز کے اتار و چڑھاؤ سے مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے لیکن تحریر میں تو یہہ کام انداز بیان سے لیا جا سکتا ہے۔

فارسی میں خدا جانے کتنے غزل گو شاعر گذر چکے ہیں لیکن جذبہ محبت کو پوری صداقت و سادگی کے ساتھ بیان کرنے میں سعدی کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے یہی حال اردو میں میر کا ہے تو پھر یہہ کرشمہ انداز بیان کا نہیں تو کس بات کا ہے؟

مومن کا رشک آمیز سوز، غالب کا شوق و ذہن تعشق، خواجہ میر درد کی والہانہ ربودگی، اب سب کی تفریق انداز بیان ہی سے تو ہوتی ہے ورنہ کون سا ذریعہ تعین و امتیاز کا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ ایک نقاد کا مختلف اسالیب بیان سے آگاہ ہونا اور ان کو دیکھ کر شاعر کے جذبات حکم لگانے کی اہمیت رکھنا از بس ضروری ہے۔

بہر حال میری تو رائے یہی ہے کہ شاعری میں اصلی چیز انداز بیان ہے۔ اگر آپ کے نزدیک بلندی مضمون

کوئی اور چیز ہے اور سب سے زیادہ اہمیت وہی رکھتی ہے
تو میں کہہ سکتا ہوں، کیا کر سکتا جب کہ اس زمانے میں غزل
کا معیار تصوف و فلسفہ طرازی کے بہانے سے مہمل گوئی قرار
پا گیا ہے۔"

ہمارے بعض "روشن خیال" اور مغرب زدہ مبصرین
نے غزل گوئی کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی ہے اور اس کی
مذمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن نیاز
کو ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

"میرے نزدیک شاعری کی اصناف میں "غزل گوئی"
جس قدر بلند چیز ہے کوئی نہیں، روح کی گہرائیوں اور قلب
کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر ہو سکتی ہے تو صرف
غزل ہے اور صرف اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ غزل کا ارتقا
تصوف ہے۔" (مذاکرات نیاز)

لکھنؤ کی شاعری پر نیاز نے بہت سخت تنقید کی ہے
کہتے ہیں:۔

"لکھنؤ کی شاعری میں الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی، چوٹی
انگیا، آنچل، آرسی، سرمہ بے معنی صنایع و بدایع اور اسی
قسم کی بہت سی سطحی و غیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے
کا سبب یہی تھا کہ اس وقت کی زندگی ہی ایک جھوٹی زندگی
تھی ایک غیر حقیقی ہستی تھی۔ اور رات دن ان کو انہیں چیزوں
سے واسطہ تھا اور انہیں پر ان کے نشاط کی بنیاد قائم
تھی۔ ان کی شاعری کا موضوع عہد وحشت کی وہ عورت
تھی جب اس سے صرف ہوس رانی کا کام لیا جاتا تھا اور
جس کو اسباب آرائش و زیبائش کی کم مایہ دوسری کم مایہ
جنسوں کی طرح قابل بیع و شری جنس قرار دیا گیا تھا
......اسی لیے لکھنؤ کا شاعر بھی ایک سادہ گو ناظم، ایک ہرزہ
سرا متشاعر، ایک بوالہوس حسن پرست، ایک بازاری فقرہ
باز، ایک عام پھبتی گو، ایک سوقی عیاش کی حیثیت سے
آگے نہیں بڑھا اور نہ بڑھ سکتا تھا کیونکہ ماحول اور فضا کا
اقتضا یہی تھا۔"

"الغرض لکھنؤ میں جتنی تغزل کی مٹی پلید ہوئی وہ ناقابل
عفو حد تک عفونیت و گندیدگی سے لبریز ہے۔ یہ ماننا
پڑے گا کہ شاعری کی اس صنف نے جسے مرثیہ کہتے ہیں
یہاں غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ کے اخلاقی مظالم
کی تلافی اگر فطرت کی طرف سے کوئی ہوئی ہو تو صرف یہ کہ
اس نے انیس و دبیر کو یہاں پیدا کر دیا۔ مرثیہ گوئی کم و بیش
ہر زبان اور ہر ملک میں پائی جاتی ہے۔ لیکن مذہبی و قومی
اہمیت کے لحاظ سے جو مرتبہ لکھنؤ کی مرثیہ گوئی کا ہے۔ اس
کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔" (مذاکرات نیاز)

اب میں شعرائے ماضی و حال کے متعلق نیاز کی رائے
پیش کرتا ہوں۔ اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ آپ خود
کر لیں۔ امیر و داغ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"امیر شاعر تھے اس میں کلام نہیں، لیکن آپ کو معلوم
نہیں کہ شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ذہنی اور اکتسابی نہیں
بلکہ میں نے ایک علیحدہ قسم اور کی ہے مطلق شاعر اور شاعر
بالقوۃ، یعنی ایک وہ جو سوائے شعر کہنے کے اور کسی کام کا
نہیں۔ شعر نہ کہے تو کرے گا کیا۔ اور دوسرا وہ جو تمام انسانی
اہلیتوں کے ساتھ شعر گوئی کی بھی اہلیت رکھتا ہے، سو ظاہر
ہے کہ جہاں تک محض شاعری کا تعلق ہے امیر کو داغ
سے کوئی نسبت نہیں۔ داغ صرف شاعر تھا اور کچھ نہیں۔ امیر
سب کچھ تھے اور شاعر بھی۔ داغ کا سرمایۂ ہستی صرف اس
کی شاعری تھی اور امیر کے لیے یہ امر باعث فخر و ناز تھا۔
داغ نے تمام عمر میں اسی ماحول میں بسر کر دی جو گوشت و
پوست سے متعلق ہونے والی شاعری کے لیے ضروری ہے
اور غریب امیر کو نماز پنجگانہ اور تہجد گزاری سے کہاں فرصت
تھی کہ وہ اس طرف توجہ کرتے۔" (مکتوبات نیاز)

منشی امیر احمد مینائی کی یہ غلطی دنیائے حقیقت میں
کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے اپنے آپ کو

ایک شاعر کی حیثیت سے رونما کیا۔ کیونکہ ان کے فضل وکمال کے لحاظ سے شاعری ان کے لیے ننگ تھی اور اس کے مقابلے میں داغ کی دانشمندی اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ انہوں نے فن شعر کو اختیار کر لیا۔ کیونکہ دنیا میں اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہ بن سکتے تھے۔" (مجموعہ استفسار و جواب" جلد اول)

منشی امیر احمد مینائی اپنے علم وفضل، اخلاق و عادات کے لحاظ سے بہت زیادہ انسان تھے ان کو شاعر کہنا میرے نزدیک ان کی توہین ہے۔ چونکہ اس وقت کی فضا میں سوائے شاعری کے کوئی دوسرا نغمہ مقبول ہی نہ تھا۔ اس لیے منشی امیر احمد مینائی کو بھی اس کا اثر ہوا اور شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے ورنہ قدرت نے ان کو اس سے بہت زیادہ اہم جذبات کے لیے پیدا کیا تھا۔ مگر چونکہ فطرت میں لوچ تھا جو ہر ہر کمال کے حصول کا ان میں موجود تھا اس لیے اساتذۂ شعر میں بھی ان کا شمار ہونے لگا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ امتیاز ان سے کبھی نہیں چھینا جا سکتا کہ انہوں نے باوجود لکھنو میں رہتے کے جہاں ناسخ کی شاعری کے جراثیم ایک مرض متعدی کی طرح پھیلے ہوئے تھے ایک الگ راہ شاعری کی قائم کی۔ اور اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر وہ وہ شعر کہہ گئے کہ جو ہمیں کسی ایک لکھنوی شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتے۔ لیکن دنیا شاید یہ سن کر تعجب کرے گی کہ اہل لکھنو امیر مینائی سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ اور ان کے مستند استاد ہونے سے بھی انکار کرتے ہیں۔" (مذاکرات نیاز)

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ہاتھوں ہندستانی شاعری میں جو انقلاب رونما ہوا اس پر بھی نیاز کی رائے سن لیجیے۔ لکھتے ہیں:-

"میں نے اب تک جان بوجھ کر اردو تغزل میں اس انقلاب کا ذکر نہیں کیا جو اقبال کے ہاتھوں رونما ہوا۔

اب تک اردو تغزل میں عشق و زندگی کے جو اصول پیش کیے گئے تھے ان میں انفرادی زندگی کے لیے جو کچھ بھی کہا گیا ہو لیکن اجتماعی زندگی کا موضوع اور اجتماعی زندگی کے اصول نہیں بیان کیے گئے تھے غزل کی زبان بڑی حد تک اس کام کے لیے ناموزوں تھی۔ اگرچہ اس دور کے تغزل میں بہت وسعت و تنوع ہے۔ پھر بھی اجتماعی زندگی اور اس کے اصول اجتہاد و ایجاد چاہتے تھے یہ کام اقبال نے کیا۔ انسانی تاریخ اور اجتماعی زندگی کا فلسفہ انہوں نے اپنے زاویہ نگاہ سے اپنی غزلوں کے سینکڑوں اشعار میں بیان کیا کچھ پرانی زبان سے مدد لی اور کچھ اپنی زبان خود بنائی۔ انسانیت کے عروج وزوال سماجی زندگی کے پیچیدہ مسایل، انسانی تاریخ کے رجحانات سائینس اور جدید فلسفہ کی روشنی میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ایسے غزل گو اب آئیں گے۔ اس کے لیے مغربی علوم سے محرکات ملیں گے۔ اشتراکیت، جمہوریت اور دہر حسن وعشق، حیات و کائنات کے نظریے، علاوہ نظم گو شعرا کے آنے والے غزل گو شعرا پیش کریں گے، اقبال نے موضوع میں اہم وسعت ضرور پیدا کر دی۔ لیکن اقبال کا نظریہ جو ایک شخصی آسمانی خدا اور دنیا تی ملت و نظام پر قائم ہے اب اس کے بھی دن بیت چکے ......"

(ماہنامہ نگار جنوری و فروری ۱۹۴۲ء)

آیندہ ہماری غزل گوئی کیا رنگ اختیار کرے گی اس کے متعلق بھی نیاز کی پیشین گوئی سن لیجیے۔ لکھتے ہیں:-

"آیندہ کے تغزل کے لیے خاص دل و دماغ کی ضرورت ہو گی غزل میں ہمارے کلچر کا عطر ہوگا۔ تغزل ہمارے شعور کو وہ لطیف و نازک نکھار عطا کرے گا جو غالباً کسی اور صنف سخن کے لیے ممکن نہ ہو۔ دیگر اصناف سخن ممکن ہے شاعری کے لیے مخصوص ہو جائیں۔ لیکن زندگی شاید غزل کی آواز ہی پر آواز دیگی۔" (نگار جنوری فروری ۱۹۴۱ء)

دورِ موجودہ کے مشہور نقاد اور شاعر حامد اللہ افسر میرٹھی کی شاعری کے متعلق نیاز کی رائے ہے۔

"ان کی شاعری بڑی حد تک "شب پرستانہ" قسم کی ہے۔ مگر "شب رو" نہیں۔ آسمان، ستارے، کہکشاں چاند ان کے ذرایع پیام رسانی ہیں۔ اور مقصود شاعری "درس حیات"۔ تیڑھی تیڑھی بحروں میں ٹوٹے ٹوٹے شعر کہنا ان کا خاص ذوق ہے۔ جس سے بعض جگہ انجیلی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تغزل میں ان کی جذبات نگاری کے بعض شعر میں کبھی نہیں بھول سکتا" (مذاکرات نیاز)

منشی پریم چند آنجہانی ہندستانی کے مشہور و مقبول افسانہ نویس ہیں۔ ان کے متعلق نیاز کی رائے بھی سن لیجے جو ۱۹۲۹ء میں لکھی تھی۔

"پریم چند کی فسانہ نگاری ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ لیکن جب سے انہوں نے ہندی زبان میں لکھنا شروع کیا ہے۔ ان کی ذہنیت میں کافی تغیر ہو گیا ہے۔ چنانچہ "چوگان ہستی" (ہندی ناول کا ترجمہ) دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس طویل بحث کو اردو برداشت نہ کر سکتی تھی وہ ہندی میں کس آسانی سے قبول ہو گئی اور وہ عصبیت جو ان کی اردو فسانہ نگاری میں کبھی ایک افسردہ چنگاری سے زیادہ نمودار نہیں ہوتی تھی وہ ہندی میں کس طرح "شعلہ ملتہب بن گئی"، ہرچند پریم چند فارسی عربی سے بقدر ضرورت بھی آگاہ نہیں ہیں اس لیے اردو زبان پر ان کو وہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جو سادہ فسانہ نگاری کو چھوڑ کر کسی عمیق غور و فکر یا علمی و تحقیقی تحریر کے لیے درکار ہوتی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا سادہ اسلوب ادا کافی دلکش ہے جس میں پلاٹ کا مقامی رنگ اور زیادہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔ تاہم حیرت مجھے اس امر کی ہے وہ شخص جو اردو اس قدر صاف لکھنے کا عادی ہو، ہندی میں پہنچکر اس قدر ثقیل ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ نصاب کی جو اردو کتابیں نول کشور پریس میں شایع ہوتی ہیں ان میں بھی سنسکرت کا اثر غالب کر دیتا ہے۔۔۔۔" (مذاکرات نیاز)

مثنوی مولانا روم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"مثنوی مولانا روم کے متعلق میری رائے آپ سے کیا ساری دنیا سے مختلف ہے۔ نظم و زبان کے لحاظ سے اس کا کوئی پایہ نہیں اور معنوی حیثیت سے بھی مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ کہانیوں کے ذریعے سے اخلاق کا درس دینا بڑی پرانی چیز ہے۔ ہر قوم کے لٹریچر میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ کتابیں جو کہانیوں کو حقیقت کے رنگ میں پیش کرتی ہیں میرے نزدیک سخت مضرت رساں ہیں اور ان میں سے ایک مثنوی مولانا روم بھی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جتنی حکایتیں اس کتاب میں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے عوام کیا بعض خواص کی نگاہوں میں تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہے اور اس طرح ہمیں واہمہ پرست بنانے میں اس کتاب نے بھی بڑی مدد کی ہے"۔

"آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس میں جن روایات و احادیث سے استناد کیا گیا ہے وہ بھی سب کی سب موضوع و ضعیف ہیں اور ایسا ہونا لازم تھا۔ کیونکہ جب تک صنمیاتی رنگ نہ پیدا کیا جاتا۔ جاہلوں کے لیے اس میں دلچسپی پیدا نہ ہوتی لیکن کیا دلچسپی "افادیت" سے زیادہ مہتم بالشان چیز ہے۔ بہر نوع میری رائے میں یہ یکسر تخریبی لٹریچر ہے اور اس کا مطالعہ کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا"۔

"رہ گیا تصوف، سو اس میں شک نہیں کہ وہ اس رنگ سے خالی نہیں۔ لیکن ایک (آئیڈیل) چیز ہونے میں مجھے بہت شک ہے۔ کیونکہ نہ اس میں خیال کی گہرائی ہے، نہ انداز بیان کی گہرائی۔ اگر اس میں تاریخی ہستیوں کے متعلق غلط بیانی سے کام نہ لیا جاتا بلکہ بلا تحقیق افراد و واقعات عمومی طور پر محض

مثالی انداز سے حکایتیں بیان کر دی جائیں تو اس زہر کا نقصان بہت کم ہو جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ وہ ادبی خصوصیات کے لحاظ سے مطالعہ کے قابل ہے اور نہ معنوی خوبیوں کی حیثیت سے۔ سعدی کو میں ان سے بہت بلند سمجھتا ہوں، اور عطار کو ان سے زیادہ دلچسپ سچ پوچھیے تو مجھے عراقی بھی ان سے بہتر نظر آتا ہے۔"

نیاز کی لکھی ہوئی تنقیدوں میں سے مذکورہ بالا چند اقتباسات میں نے بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ جگہ کی تنگی اور وقت کی قلت کے باعث مزید اقتباسات پیش نہ کرنے پر مجبور رہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نیاز کے تنقیدی مضامین وغیرہ کتابی صورت میں ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ مجلہ نگار، مکتوبات نیاز، مجموعہ استفسار و جواب (تینوں جلدیں) مذاکرات نیاز وغیرہ کے صفحات پر منتشر ہیں۔ ان کو جمع کرنے کے لیے بہت زیادہ وقت اور محنت کی ضرورت ہے۔ بہرحال ان اقتباسات سے یہ تو ظاہر ہی ہے کہ نیاز کے تنقیدی مضامین اپنی بے باکی صاف گوئی اور اصابت رائے کے لیے ادب میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔

نیاز کی مذہبی تنقیدوں کو میں نے عمداً نظر انداز کر دیا ہے۔ کیونکہ اول تو یہ ایک قطعاً جداگانہ موضوع بحث ہے دوسرے یہ ایک ایسا خاردار موضوع ہے کہ اسے چھیڑ کر خواہ مخواہ بحث و مناظرے کو دعوت دینا مجھے منظور نہیں آخر میں صرف اس قدر اور عرض کروں گا کہ نیاز کی لکھی ہوئی تنقیدوں میں جو چیزیں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں، وہ ان کا مخصوص طرز بیان، جوش، زور قلم وسیع معلومات اور عمیق مطالعہ ہے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اکثر معمولی بات کو بھی اتنا رنگین بنا کر سامنے لاتی ہیں کہ وہ خود بخود دلکش نظر آنے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جدت پسند طبیعت کے مالک ہیں اور ان کی جدت پسندی انہیں ہمیشہ عام راستوں سے الگ لے جاتی ہے اس لیے ان کے مضامین عام مذاق کے نہیں ہوتے ان میں علمیت کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔

سید محمود مورخ بی اے

سکھی سے

آ چل سکھی چلیں:-

(۱)

جہاں شفاف پانی کیاریوں میں مسکراتا ہو
جہاں سنبل ہواؤں میں جھومتا ہو لہلہاتا ہو
جہاں ہر گل محبت کا نیا نغمہ سناتا ہو
جہاں رہ رہ کے دریا شوق میں بربط بجاتا ہو

(۲)

جہاں پر بولیاں صبر و حیا کی مسکراتی ہوں
جہاں مل کر سب آپس میں سریلے گیت گاتی ہوں
جہاں وہ میل و ملت کا سبق۔ الفت سکھاتی ہوں
جہاں بام فلک پر بدلیاں سی آتی جاتی ہوں

(۳)

جہاں کا ذرہ ذرہ گیت آزادی کے گاتا ہو
جہاں بیدار کن شوق تمنا ہر ترانا ہو
جہاں سرسبز گلشن ہو جواں نخل تمنا ہو
جہاں ہر سو محبت ہو۔ نرالی اپنی دنیا ہو

ہم اس جگہ چلیں

عارفہ بیگم انجم

انسانیت سے خطاب

ایک ترا وجود ہے مظہر ذات حق پسند
ایک ترے صفات ہیں فہم سے دور اور بلند
ایک ترے فروغ کو قربت خاص ہے عطا
ایک ازل سے بے نیاز تو ہے ز فکر قید و بند
شان وقار جلوہ گر ذوق مشاہدات میں
عظمتیں بے پناہ ہیں تیرے مقدرات میں
صاحب ہست و بود کی تجھ پہ نگاہ التفات
تیری سرشت کے لیے لطف بہار کائنات
رحمت خاص نے تجھے بخشا جہان زندگی
ختم ہے تجھ پہ بخشش قوت ذوق حیات
سجدے کو جھک گئے ملک دیکھ وہ تیری شان ہے
خاص مقام ہے ترا تیری جو آن بان ہے
حد سے سوا عنایتیں اور ترا خاک کا جسد
قلب و دماغ کو ترے بخشی تمیز نیک و بد
ذرہ ہر ایک جہان کا تیرا رہین آگہی
شرف ہے کائنات پر تجھ کو ازل سے تا ابد
قدرت خاص نے تجھے دے کے خطاب راہبر
زیر نگیں بنا دیے سارے جہاں کے بحر و بر
درس ہر اک عمل ترا سارے جہاں کے واسطے
حوصلے تیرے، زینتیں کون و مکاں کے واسطے
قدرت حق کہاں تجھے لائی تھی کس امید پر
اور قدم ترے بڑھے دیکھ کہاں کے واسطے
فرض سے رہ کے دور دور اپنی خودی میں تو رہے
اس پہ یہ بدگمانیاں بندہ بے قصور ہے
چاہیے تھا تجھے کہ تو خلق کی رہبری کرے
ہر دل دردمند کی جلتی ہو دلدہی کرے
غیر کے کام آ کے دے شان ثبات کا ثبوت
رہ کے مٹے خودی سے دور خدمت آدمی کرے
یہ نہیں نیکی ہو اگر بو الہوسی کا ہو شکار
یہ نہیں اپنی بات سے اوروں کا دل کرو فگار
دہر کو درس لطف دے تیری نظر ہے اس لیے
فکر جہاں پہ صبر کر تیرا جگر ہے اس لیے
ناصح بے ریا تو بن لب تو ذرا ہلا کے دیکھ
بات کو تیری سب سنیں اس میں اثر ہے اس لیے
منزل زیست کے لیے بھٹکے ہوؤں کی راہ بن
دیدہ کور کے لیے روشنی نگاہ بن
عار ہے تیرے سامنے دیکھ لے پھر اٹھا قدم
خود ہی بھٹک کے راہ سے مفت میں یہ کہاں کا غم
پیش نظر یہ بات رکھ لغزشیں امتحان ہیں
لطف حیات و خوف مرگ اصل میں دونوں ہیں بہم
بن کے مزاج مستقل ساتھ جو ان کا دے کے دیکھ
ہمتیں تیرے ساتھ ہیں کام جو ان سے لے کے دیکھ
شرق سے غرب تک تری شہرت عام چار سو
تیرے فیوض خاص کا نام ہی نام چار سو
تیرے کرم کی بارشیں وجہ نشاط زندگی
پھرتا ہے تجھ کو ڈھونڈھتا ماہ تمام چار سو
اپنے وقار کا ذرا بہر خدا تو حال دیکھ
جس کو کبھی عروج تھا اس کو ہی کیا زوال دیکھ
خواب سے اب بھی جاگ جا ہوش میں آ نگاہ کر
منزل حق کے واسطے کوئی تلاش راہ کر
نقش قدم وہ چھوڑ جا جس پہ زمانہ چل سکے
عالم آب و گل میں ہے رہنا تجھے نباہ کر
صابر خستہ حال کی اتنی سی ہے عرض کر قبول
کام پہ اپنے رکھ نظر اور خیال سب فضول

صابر [illegible]

سماج کا شکار

دلھن نے اپنے مہندی لگے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور اپنے آپ سے کہنے لگی "آہ! اب میرے یہہ مہندی لگے ہوئے ہاتھ کون ہاتھ میں لے گا۔ اب مجھے پریم بھری نظروں سے کون دیکھے گا۔ مجھ سے میٹھی آوازیں کون کہے گا کہ مالتی آج سے ہم تم ایک نئی زندگی شروع کر رہے ہیں یہہ لفظ میرے کان میں کہاں سے آئیں گے کہ مالتی مجھے تم سے پریم ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ آہ یہہ مہندی لگے ہوئے ہاتھ تو مجھے خون سے رنگے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں یہہ بیاہ کے رنگین اور ریشمی کپڑے تو کانٹوں کی طرح میرے بدن میں چبھ رہے ہیں۔ چوٹی کی موباف ناگن کی طرح مجھے ڈس رہی ہے۔ آسمان کے تارے میرے پھوٹے نصیبوں پر ہنس رہے ہیں۔ اف میں کتنی بدنصیب ہوں، مگر میں نے دنیا والوں کا کیا بگاڑا تھا۔ جو انہوں نے سہاگن بننے سے پہلے ہی میرا سہاگ لوٹ لیا۔ میرے دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ سماج کا یہہ کیسا انصاف ہے۔ دنیا کی یہہ کیسی ریت ہے۔ آہ کوئی مجھے بتائے۔ کوئی مجھے سمجھائے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے..... میں کس سے کہوں؟ میری کون سنے گا؟ لیکن جس طرح دنیا والوں نے میری آرزوں کا خون کیا ہے اسی طرح میں بھی ان کے ارمانوں اور امیدوں کی کھیتیوں کو پنپنے نہ دوں گی۔ میں بھی ان کے ارمانوں کو پامال کرنے کی کوشش کروں گی۔ میں اس سماج سے ضرور بدلہ لوں گی جس نے میرے سہاگ کو اپنے بنائے ہوئے قانون کا نشانہ بنایا ہے۔ میں ان دنیا والوں کو ضرور بتاؤں گی کہ ایک بےگناہ کے دل کو دکھانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے..... ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی کے امنگوں بھرے دل کو اس ظلم اور بے رحمی سے کچل ڈالنے سے روح کو کتنی بےچینی ہوتی ہے۔ یہہ سب کچھ ان کو تب ہی معلوم ہوگا جب میں بھی ان سے اس کا زبردست بدلہ لوں۔

دلہن یہہ کہتے کہتے یک بہ یک سناٹے میں آگئی۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ کیا گئی بلکہ گر پڑی۔ بلکہ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کا پھول جیسا چہرہ کملایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہرے کی تازگی اور خوشی کا نور ہو چکی تھی اور ہرن کی سی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے، وہ پھر اپنے آپ سے کہنے لگی۔ "لیکن یہہ سب کچھ میں کیوں کہہ رہی ہوں؟ اف کیا میں ان دنیا والوں سے ایک بات بھی کہہ سکتی ہوں۔ کیا میں سماج سے سچ مچ بدلہ لینے کی طاقت رکھتی ہوں؟..... آہ نہیں..... میں ان خونی بھیڑیوں سے جن کو میری حالت پر ذرا بھی ترس نہیں آیا بدلہ نہیں لے سکتی۔ میں ایک بدنصیب ملک میں پیدا ہوئی ہوں یہی میری سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ جس ملک میں "دلہن" کو ہزاروں قید و بند میں جکڑ کر بےبس اور بزدل بنا کر رکھا جاتا ہے۔ جس "دلہن" کو سر اوپر اٹھا کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی وہ بھلا دنیا والوں سے کیا بات کر سکتی ہے اس کی بھلا اتنی مجال کہاں کہ سماج اور سوسائٹی کے منہ پر صاف صاف کہہ سکے کہ وہ ان سے بدلہ لینا چاہتی ہے..... آہ یہہ تو نہیں ہو سکتا..... کاش میں دلہن نہ بنتی، کاش دلہن بننے سے پہلے ہی ظالم سماج میری قسمت کا فیصلہ سنا دیتا کہ مجھے یہہ دکھ تو نہ جھیلنا پڑتا میرے

دل پر چوٹ تو نہ لگتی.... لیکن یہہ سب کچھ ہونے والا تھا ہونے والی بات کو کون ان ہونی بنا سکتا ہے۔ او خدا میں دکھیا ہوں، مجھ پر ترس کھا۔ مجھ پر رحم! دلہن نے یہہ کہتے کہتے پھر آنکھیں بند کر لیں اور دونوں آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسو ڈھلک کر اس کے پھول جیسے گالوں پر سے بہتے ہوئے نیچے گرے اور اسکی ساڑی کی آنچل میں غایب ہو گئے۔

۲

"بولو بابو! میں تم سے ہاتھ جوڑ کر پوچھتی ہوں کہ اس میں میرا کیا قصور ہے کہ میں اچھوت ہوں نیچ ذات ہوں، غریب ہوں۔ بابو کیا اچھوت آدمی نہیں ہوتے؟ مالتی نے نہایت عاجزی کے ساتھ رام سروپ سے پوچھا۔

رام سروپ کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بہت رنجیدہ اور اداس تھا اور بار بار سوچ رہا تھا کہ اس نے کیوں یہہ سب کچھ مالتی کو پہلے سے نہ بتا دیا۔ اس نے کیوں اس کی اصل پیدایش کو چھپا کر یہہ ساری مصیبت مول لی۔ اس کے دل کی آواز اس کو ملامت کر رہی تھی وہ اس راز کے کھل جانے سے کہ مالتی اس کی بیٹی نہیں ہے بلکہ ایک نیچ ذات کے غریب آدمی کی لڑکی تھی جس کو رام سروپ نے پال لیا تھا۔ بہت پریشان تھا اور دل ہی دل میں اپنی غلطی پر پچھتا رہا تھا اور سماج کی بے دردی اور نا انصافی پر اس کا خون غصے سے کھول رہا تھا۔ اس کا دل خود ہی رنج اور غم کی شدت سے بوجھل ہو رہا تھا اور بھلا مالتی جیسی دکھیا اور دل شکستہ لڑکی کو کیا دلاسا دے سکتا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا" تمہارا کوئی قصور نہیں مالتی.... تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم بلکل بے گناہ ہو۔ یہہ ساری مصیبت تم پر میری وجہ سے آئی ہے مالتی میں ہی ہوں اس ساری مصیبت کا سبب ہوں"

مالتی (تعجب سے) آپ؟ آپ اور مجھ پر مصیبت لائیں۔ بابو جی یہہ کیسے ہو سکتا ہے۔

رام سروپ بلکل سچ ہے مالتی۔ میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں۔ تم میری بیٹی نہیں ہو۔

مالتی (یک بہ یک چونک کر) بابو جی یہہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ آپ نے مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ سب مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھا۔ اب آپ اتنے دنوں کے بعد مجھ سے کہہ رہے ہو کہ آپ میرے باپ نہیں ہیں... بابو جی یہہ راز آپ نے کیوں اب تک مجھ سے چھپا رکھا تھا۔ بولیے بابو جی کیوں؟..... یہہ کہتے کہتے مالتی کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے.....

" یہہ ابھی بتانے کا وقت نہیں ہے مالتی یہہ راز میں نے تجھ سے کیوں چھپا کر رکھا تھا۔ یہہ مت پوچھ بیٹی میں پھر کبھی تجھے بتا دوں گا۔ لیکن یہہ بلکل سچ ہے کہ تو میری بیٹی نہیں ہے تو ایک غریب اچھوت کی لڑکی ہے، جس کو میں نے کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے لے کر پال لیا تھا۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔ جو کنواں میں نے دوسروں کے لیے کھودا تھا آخر اس میں ایک دن مجھ ہی کو گرنا پڑا۔ رام سروپ نے بہت ہی رنجیدہ آواز میں کہا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ رو پڑے گا"

" اچھا بابو، اب نہ پوچھوں گی۔ آپ سے کوئی بات لیکن بابو یہہ آج کل کے سماج کا سراسر ظلم ہے کہ آدمی کو جانور سے بھی بدتر سمجھتا ہے۔ یہہ دنیا کیسی ہے کہ آدمی کے گن اور طور طریقوں کو نہیں دیکھتی وہ اس بات پر بھی نظر نہیں ڈالتی کہ جس کی شادی ہو رہی ہے اس کے

گن کیسے ہیں اس میں کیا اچھائیاں اور کیا برائیاں ہیں وہ یہہ کیوں دیکھتی ہے کہ وہ نیچ ذات ہے یہہ اونچ ذات، وہ بڑا ہے یہہ چھوٹا۔ وہ امیر ہے یہہ غریب۔ مالتی نے بہت درد بھری آواز میں کہنا شروع کیا "اونچ ذات میں بھی نیچ سے نیچ چلن کے آدمی جنم لیتے ہیں اور نیچ ذات میں بھی اچھے سے اچھے کیرکٹر کے انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔

ہمارے سماج کی آنکھیں بند ہیں۔ اس کو اچھے اور برے میں کوئی پہچان نہیں رہی۔ سماج کے یہہ بھوت سچ پوچھو تو آدمی کے سب سے بڑے دشمن ہیں شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہے"۔ رام سروپ نے موجودہ سماج کی تاریک ذہنیت پر ناراضگی سے کہا۔

" بابو.... جو سماج غریبوں کو آدمی نہ سمجھے جو سوسائٹی اچھوت اور ادنا درجے کے آدمیوں کو لعنت کا نشانہ بنائے اس سماج سے آپ بدلہ کیوں نہیں لیتے.... سماج کے ان خونی درندوں سے بدلہ ضرور لیجیے" مالتی نے اسی مایوسی کے عالم میں کہا۔

۳

رام سروپ نے مالتی کو بچپن سے پالا تھا جب اس کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی۔ رام سروپ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے اس نے اپنے محلے کی ایک نیچ ذات کی لڑکی کو لے کر پال لیا تھا اور اس کو بیٹی کی طرح چاہتا تھا۔ میاں اور بیوی دونوں اس لڑکی پر پروانے کی طرح شیدا تھے۔ لیکن رام سروپ کی بیوی اتنے دنوں تک زندہ نہ رہی کہ مالتی کا بیاہ رچاتی ابھی مالتی کی عمر نو یا دس ہی سال کی تھی کہ رام سروپ کی بیوی دنیا سے کوچ کر گئی۔ مالتی کو اپنی منہ بولی ماں کے مرنے کا بہت رنج ہوا۔ لیکن رام سروپ کے پیار اور محبت بھرے برتاؤ کی وجہ سے وہ سب کچھ بھول گئی۔ رام سروپ نے دنیا والوں پر یہہ راز ظاہر نہ ہونے دیا کہ مالتی اس کی اپنی بیٹی نہیں ہے۔ یوں بھی جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا لوگوں کو اس کی کھوج بھی نہ رہی کہ مالتی رام سروپ کی بیٹی ہے یا کوئی پالی ہوئی لڑکی گویا دنیا اب اس بات کو بھول چکی تھی۔

مالتی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ رنگ سانولہ بڑی بڑی بھونرے کی سی آنکھیں، کماندار بھویں اور اونچی ناک۔ چھریرا جسم۔ اس کے سانولے رنگ میں دل کشی، اور بھولاپن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ لیکن وہ یہہ سب کچھ نہ جانتی تھی۔ وہ ان باتوں کو نہ سمجھتی تھی کہ نوکدار بھویں، ہرن کی سی سیاہ آنکھیں، لمبی لمبی گہری پلکیں اپنے اندر کیا جادو چھپائے ہوئے ہیں وہ حسن کی دیوی یا قاف کی پری نہیں تھی۔ بلکہ سولہ سترہ سال کی ایک معصوم اور الھڑ لڑکی جس کی ہر ہر بات میں شرم اور حیا جھلکتی تھی۔ اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا پھر بھی اس میں دوسری لڑکیوں کی طرح بناوٹ اور دکھاوا نہ تھا۔ اس کے اخلاق اور اطوار اس کی اکثر ہم جماعت سہیلوں کے مقابلے میں زیادہ تعریف کے قابل تھے۔

۴

چائے کی ایک دعوت تھی۔ مخمل کے جیسا ہرا ہرا گھانس کا فرش۔ ہر طرف رنگ برنگ کے پھولوں کے تختے جھومتے ہوئے درخت، چلتے ہوئے فواروں کی پھواریں۔ لوگوں کی آمد و رفت، ہر طرف چہل پہل ہر طرف رونق و خوشی۔

مالتی اپنے کالج کی ایک سہیلی سوشیلا کے ساتھ ایک الگ میز پر بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھی۔ اس کی سہیلی بولی۔ مالتی بہن وہ دیکھو سامنے سے ہماری ماں، بہن، بھیا سب آ رہے ہیں۔ جب سے تم کالج

میں آئی ہو اور ہماری تمہاری دوستی ہوئی ہے تم ان سے نہیں ملیں۔ آج تو میں ان سب لوگوں سے تمہاری ملاقات کراؤں گی۔ تمہیں برا تو نہ معلوم ہوگا۔؟

مالتی۔ سوشیلا بہن۔ وہ لوگ بڑے آدمی ہیں، مجھ جیسے معمولی اور غریب آدمی سے مل کر کیا کریں گے مجھے تو ان سے ملتے ہوئے شرم آتی ہے۔

سوشیلا۔ اونھ۔ بڑی آئیں کہیں کی شرمانے والی۔ غریب بن کے۔ ٹھہرو۔ میں ابھی جا کر انہیں یہاں لاتی ہوں۔ دیکھو بھاگ نہ جانا یہاں سے۔

سوشیلا تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی اپنی ماں کے پاس پہنچی اور سب کو مالتی کے پاس لے آئی اور ان سب کا مالتی سے تعارف کراتے ہوئے بولی "آپ میری ماں یہہ میری بہن رومیلا، آپ میرے بھائی سریش بابو، اسکول کے ہیڈ ماسٹر"

مالتی نے "مجھے آپ لوگوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" کہا اور پھر سب لوگ چاے پینے لگے۔

سریش مالتی کو بار بار کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا اور یہہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے آہستہ آہستہ وہ کوئی چیز کھو رہا ہے، کوئی چیز چپکے چپکے اس کے قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ مالتی میں کوئی زبردست کشش ہے جو اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ لیکن چونکہ یہہ پہلا ہی اتفاق تھا کہ اسے اس قسم کی بے چینی محسوس ہو رہی تھی اس لیے وہ پوری طرح اس کیفیت اور ان عجیب جذبات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کر سکا مالتی یوں تو بڑی خاموش، متین اور چپ رہنے والی لڑکی تھی۔ لیکن نہ جانے آج، اس وقت وہ سریش کو کیوں بار بار دوسروں کی نظر بچا بچا کر دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے نہ جانے اسے سریش میں کیا خاص بات نظر آ رہی تھی۔۔۔۔ یہہ مالتی اور سریش کی پہلی ملاقات تھی۔

مالتی اور سریش کو رفتہ رفتہ ملاقات کے موقعے ملتے رہے اور آہستہ آہستہ ان دونوں کی محبت کے پینگ سب کی نظروں سے اوجھل رہ کر بڑھتے رہے لیکن دیکھنے والوں نے کبھی ان دونوں کے بڑھتے ہوئے پریم کو محسوس نہ کیا اور ان دونوں نے بھی کبھی صاف صاف اس بات کو معلوم نہ ہونے دیا کہ دراصل وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

جس طرح مشک کی بو نہیں چھپ سکتی، اس طرح محبت کے راز بھی چھپانے سے چھپ نہیں سکتے۔ سوشیلا نے مالتی اور سریش کے بڑھتے ہوئے میل جول کو تاڑ لیا اور اپنی ماں اور باپ کو ان دونوں کے بیاہ پر بڑی مشکل سے آمادہ کر ہی لیا۔

۵

مالتی کا بیاہ سریش بابو سے ہونا طے پا گیا۔ مالتی خوش تھی نہ صرف اس لیے کہ شادی کے بعد وہ بہت آزادانہ زندگی بسر کر سکے گی وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے گی آے گی جہاں چاہے گی جاے گی۔ کنوار پن کے قید و بند سے اسے ایک طرح چھٹکارا ہو جاے گا۔ بلکہ اس بات سے اور بھی زیادہ خوش تھی کہ اس کے من مندر میں سریش بابو کا خیالی بت اپنا گھر بنا چکا تھا۔۔۔ یہہ اس کے من کی مراد تھی جو اسے مل رہی تھی

لیکن ستاروں کی گردش سے کون واقف ہوتا ہے جو مالتی واقف ہوتی۔۔۔۔ مالتی آنے والی زندگی کے رنگین اور پر بہار خواب دیکھنے لگی۔ وہ اپنی خیالی دنیاؤں کو طرح طرح کے تصوروں اور آرزوں سے آباد کرنے لگی، لیکن وہ بھولی لڑکی کیا جانتی تھی کہ اس کی

قسمت کا ستارہ گردش میں آنے والا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی آرزوں اور خوشیوں کی دنیائیں آناً فاناً میں برباد ہونے والی ہیں وہ کیسے جان سکتی تھی کہ اس کی خوشی اور اطمینان کی دنیا میں ایک زبردست انقلاب ہونے والا ہے۔۔۔ وہ یہہ کچھ نہ جانتی تھی اور اب تک کوئی اور بھی نہ جانتا تھا۔

(۶)

مالتی دلہن بنی ہوئی تھی۔ مالتی کی سہیلیاں اس سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں اور مالتی بناوٹی خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ ادھر سریش بابو دلہا بنے ہوئے دوستوں میں بیٹھے تھے۔ ہر طرف باجوں کی آوازیں اور خوشی اور مسرت کی لہریں اٹھتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

بارات مالتی کے گھر آگئی۔ مالتی کا دل اندر ہی اندر خوشی سے اچھلنے لگا۔ جیسے جیسے بیاہ کی رسمیں ادا کیے جانے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ اسی طرح مالتی کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا تھا وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح جلد سے جلد یہہ رسمیں ادا ہو جائیں تو اس کے دل کو پوری طرح سکون نصیب ہو جائے کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ اکثر مرتبہ عین شادی کے وقت طرح طرح کی مخالفتیں اور جھگڑے دلہا اور دلہن والوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس لیے اس کا دل بھی طرح طرح خیالات سے دھڑک رہا تھا۔

دلہا اور دلہن منڈپ میں لاکر پنڈت کے پاس بٹھائے گئے، ہر طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آنے لگیں۔ خوشی سے رام سروپ کی باچھیں کھلی جارہی تھیں اور وہ مسکرا مسکرا کر ہر ایک کا شکریہ ادا کرتے جا رہے تھے۔

ٹھیک اس وقت جب کہ پنڈت جی اپنے اشلوک ختم کر کے دلہا اور دلہن کو ایک بندھن میں باندھ کر بیاہ کی آخری اور سب سے ضروری رسم ادا کرنے جارہے تھے کہ یکایک دروازے سے ایک شور سنائی دیا۔

"یہہ شادی نہیں ہو سکتی۔ یہہ شادی نہ ہوگی"

شور کرنے والا اتنی دیر میں اندر آپہنچا۔ جلسے کے تمام مہمان اور خود پنڈت جی اس بات کو سن کر آنے والے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"شادی نہیں ہو سکتی" یہہ لفظ نہیں تھے بلکہ بجلی کی چنگاریاں تھیں۔ جنہوں نے مالتی کی خوشیوں اور اطمینان کے کھلیان کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ سریش بابو بھی پریشان ہو گیا اور بے چینی سے آنے والے کو دیکھنے لگا کہ آخر وہ کیوں ایسے برے لفظ زبان سے نکال رہا ہے۔ کہیں وہ دیوانہ تو نہیں ہے۔

آنے والا کہنے لگا۔ "یہہ شادی نہیں ہو سکتی۔ یہہ شادی نہ ہوگی۔ رمیش بابو یہہ بیاہ ہرگز نہ ہونا چاہیے"

سریش کے باپ رمیش نے بہت بے تابی سے پوچھا۔ "کیوں؟ تم کون ہو جو ایسا کہہ رہے ہو"

آنے والا۔ "ہاں رمیش بابو میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں رام سروپ کا پرانا دوست گوکل داس ہوں۔ آپ برہمن ہیں بابو جی۔ یہہ لڑکی نیچ ذات کی اچھوت ہے۔ رام سروپ نے اس کو اپنی لڑکی بنایا ہے۔ رام سروپ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ سچ جانو بابو جی۔ یہہ لڑکی اچھوت ہے"

یہہ باتیں سن کر رمیش بابو کو سخت غصہ آیا۔ ان کو دھوکہ دیا گیا تھا، رام سروپ نے اس کو فریب دے کر سارے شہر میں اس کی بدنامی کا سامان کیا تھا۔ رام سروپ اس کی آبرو کو خاک میں ملانا چاہتا تھا۔

اور ادھر رام سروپ کی یہہ حالت کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ اس نے کیوں اس راز کو چھپا کر دوسروں کو فریب دینے کی

کوشش کی۔ اس کے دل میں چور تھا وہ اپنی جرأت پر نادم
تھا۔ وہ اپنی زبان بند کیے بیٹھا رہا۔ اس کے منہ سے اپنی
صفائی میں ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

رمیش نے گوکل سے کہا "اس کا تمہارے پاس
کیا ثبوت ہے کہ یہ لڑکی رام سروپ کی نہیں ہے؟"
گوکل نے جواب دیا "میں آپ کو ابھی ثبوت دیتا ہوں
لیکن آپ اس شادی کو روک دیجیے۔ ابھی فوراً ورنہ
آپ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائیگا"

رمیش سخت غصے میں تھا۔ اس نے اس بات
کا انتظار بھی نہ کیا کہ ایک اجنبی سے پہلے ثبوت تو
مانگ لے صرف لفظ اس کے لیے کافی تھے۔ اس نے
بلا سوچے سمجھے چلا کر کہا "پنڈت جی یہ شادی نہ ہوگی
چلو۔ میرے دوستو۔ برات واپس لے چلو۔ میں ہرگز یہ
ذلت گوارا نہیں کر سکتا کہ ایک برہمن کے لڑکے کا
بیاہ ایک نیچ ذات کی لڑکی سے ہو۔ چلو بیٹا سریش اب
یہاں ایک منٹ بھی ٹھہرنا ہمارے لیے ذلت ہے یہاں سے
جلد چلو، فوراً نکل چلو"

رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ سریش باپ کے کہنے پر
کھڑا ہو گیا۔ جلسے میں گڑبڑ شروع ہو گئی۔ ہر عورت مرد
نہایت برا بھلا کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور رام سروپ کو
نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوا جانے لگا۔

رام سروپ نے بڑی منت وسماجت سے
رمیش بابو سے التجا کی "بابو جی مجھے معاف کر دو۔ مجھ
سے غلطی ہوئی"

رمیش نے بہت نفرت اور غصے سے کہا "رام
سروپ تم نے میری عزت برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا
نہ رکھی تھی۔ تم دنیا میں ایک برہمن کے منہ پر بدنامی کی
کالک لگانا چاہتے تھے۔ تم میرے بیٹے کا بیاہ ایک
اچھوت لڑکی سے کر کے ہمیشہ کے لیے مجھے ذلت کے
گڑھے میں ڈھکیل دینا چاہتے تھے۔ تمہاری غلطی اس
قابل نہیں ہے کہ معاف کر دی جائے۔ رام سروپ
تمہیں اپنی اس شرارت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا تمہیں
اس دھوکہ بازی کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ ٹھہر جاؤ بہت
جلد تمہیں اس چھل دینے کا مزہ چکھاؤں گا۔ یہ کہتا ہوا
رمیش اپنے بیٹے سریش کا ہاتھ پکڑ کر براتیوں کے ساتھ
وہاں سے نکل کر چل دیا۔

سارا گھر اور بڑا دالان بلکل خالی ہو گیا۔ ایک
طرف مالتی خاموش اور بے جان بیٹھی ہوئی تھی اور اس
کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ دوسری طرف
رام سروپ شرم اور ندامت سے زمین میں گڑھا جا رہا تھا
اور اس کا سر اوپر نہ اٹھتا تھا۔

(۷)

گوکل داس گاؤں کا رہنے والا ایک غریب
بنیا تھا۔ جب اس کے گاؤں میں قحط پڑا اور لوگ پریشان
ہونے لگے تو اس کے بیوپار پر بھی اثر پڑا۔ اس کا کاروبار
ایک تو تھا ہی کتنا بڑا اس پر قرض ادھار کی بھرمار، ان
سب باتوں سے پریشان ہو کر گوکل بچی کچھی پونجی لے کر
شہر میں آ گیا، تاکہ یہاں کوئی دکان کھول لے۔ شہر میں
آنے کے بعد اسی محلے میں جہاں رام سروپ وکیل رہا
کرتا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لیکر
کام شروع کر دیا۔ گوکل بنیا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے
پہننا اس کی قسمت میں نہ تھا۔ ہمیشہ پھٹے پرانے کپڑے
پہنتا اور سارے شہر میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔

جب شہر میں رہتے رہتے چند مہینے گذر گئے تو اس
کی تجارت میں بھی ترقی ہونے لگی اور کسی طرح رام سروپ
وکیل سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وکیل صاحب نے شروع
شروع میں اس کے ساتھ بڑی ہمدردی جتائی اور آہستہ
آہستہ اس بنیا کے گھر میں اپنا رسوخ پیدا کر لیا۔ گوکل

وکیل صاحب کو بہت مانتا تھا۔ وکیل صاحب کے یہاں کا سارا سودا سلف اب گوکل ہی کی دکان سے جاتا تھا اور ان کے ساتھ یہہ رعایت تھی کہ اگر عام خریداروں کو کوئی چیز سوا روپیے میں دی جاتی تو وکیل صاحب سے صرف ایک روپیہ لیا جاتا۔ اس کے سوا جو چھوٹے موٹے مقدمے یا ڈگریاں وغیرہ دایر کرنے کی ضرورت ہوتی تو گوکل رام سروپ ہی کو اپنا وکیل مقرر کرتا تھا۔

لیکن جیسا کہ کسی مشہور آدمی کا مقولہ ہے کہ "دوستی صرف برابر والوں ہی میں نبھ سکتی ہے۔ اور بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے اور ایک بڑے یا ایک امیر اور ایک غریب میں سچی دوستی موجود ہو"۔ اس طرح جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا۔ گوکل ایک غریب اور معمولی بنیے سے ترقی کر کے ایک ساہوکار، ایک بڑا آدمی اور ایک امیر آدمی بننے لگا۔ اب ہر طرف اس کی آؤ بھگت ہونے لگی۔ گاوں میں جو آدمی صرف گوکل پکارا جاتا تھا شہر میں آنے کے بعد گوکل داس پکارا جانے لگا اور وہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے سیٹھ گوکل داس بن گیا آدمی گو بنیا سہی، لیکن تھا ہوشیار۔ آدمیوں کو خوب پہچانتا تھا اور بیوپار میں اچھی خاصی مہارت رکھتا تھا ساتھ ہی ساتھ اس نے محنت اور دیانتداری سے بھی کام کیا اس لیے چند ہی سال میں سارے شہر میں مشہور ہو گیا۔

جہاں انسان میں اچھائیاں ہوتی ہیں وہاں وہ برائیوں سے بھی نہیں بچتا۔ رام سروپ وکیل بھی انہیں لوگوں میں سے تھا جو اپنے سے چھوٹے لوگوں کی ترقی اور شہرت کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے دل میں بھی حسد کی آگ جلنے لگتی ہے اور وہ ان کو بری نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

رام سروپ ایک معمولی درجے کا وکیل تھا اس کی وکالت بس اتنی ہی چلتی تھی کہ وہ ایک بڑے شہر میں بڑی مشکل سے اپنی گذر بسر کرے۔ جب اس نے یہہ دیکھا کہ چند روز کا آیا ہوا ایک بنیا اس قدر ترقی کیے جا رہا ہے اور سارے شہر میں اس کی شہرت ہو رہی ہے بڑے بڑے لوگ اس کو سیٹھ صاحب، مہاجن صاحب اور بعض وقت بابو صاحب اور لالہ صاحب بھی کہہ کر پکارتے ہیں تو یہہ بات رام سروپ کے دل میں کھٹکنے لگی۔ اس کے دل میں بلا وجہ گوکل کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ اب اس سے کھنچا کھنچا رہنے لگا لیکن گوکل گو ادنا درجے کا بنیا سہی، پھر بھی تھا بڑے دل کا۔ اس نے وکیل صاحب کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔

رام سروپ کو گوکل سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اگر تھی تو صرف یہی کہ وہ زیادہ مشہور ہوتا جا رہا ہے وہ زیادہ ہر دلعزیز اور دولتمند بنتا جا رہا ہے۔

رام سروپ اکثر اپنے آپ سے کہتا "میں تو وکیل ہوں جہاں تھا وہیں کا وہیں رہا اور یہہ چار دن کا آیا ہوا بنیا آج بڑا آدمی بنا جا رہا ہے۔ یہہ ادنا درجے کا آدمی، نیچ ذات۔ اچھوت"۔

رام سروپ کے دل میں گوکل کی طرف سے جو نفرت اور حقارت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا وہ روز بروز بڑھتا گیا۔ گو وہ بظاہر اس کو چھپاتا رہتا تھا۔ گوکل سادہ مزاج آدمی تھا۔ وکیل صاحب کے دل کی بات کیا جانتا تھا اس کا تو یہہ حال تھا کہ اکثر بار رام سروپ گوکل کے مقدمے ہار گیا۔ لیکن گوکل نے زبان سے اف تک نہ کی۔

گوکل بہت زمانے تک رام سروپ کی وکالت میں مقدمے ہارتا اور نقصان اٹھاتا رہا۔ وہ بھی آدمی تھا مسلسل نقصان اٹھاتے اٹھاتے گھبرانے اور پریشان

ہونے لگا اور اس فکر میں پڑ گیا کہ کس طرح اس نقصان کی تلافی کی جائے۔

اس اثنا میں گوکل کو ایک بڑے مقدمے کے لیے وکیل کی ضرورت پڑی۔ اس بار اس نے رام سروپ سے کچھ نہ کہا اور اپنے ایک دوست کے ذریعے شہر کے ایک مشہور بیرسٹر کو مقرر کیا۔ یہہ بات رام سروپ کے کانوں تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچے جب وکیل صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے اور بولے:۔ "آخر بنیا ہی تو ہے وہ کیا جانے دوستی نبھانا، کسے کہتے ہیں..... ٹھیرو تو سہی، دیکھو بچا جی کو کیسا مزہ چکھاتا ہوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے"

اس کے بعد سے رام سروپ نے گوکل کے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ گوکل نے کئی بار وکیل صاحب کے گھر پر جا کر معافی مانگنے کی کوشش کی۔ اور واقعات سمجھانا چاہے لیکن وکیل صاحب نے معاف کرنا تو رہا ایک طرف اس سے ملنا تک پسند نہ کیا اور کہلا دیا کہ ان کو گوکل سے ملنے کے فرصت نہیں ہے۔

گوکل مقدمہ جیت گیا۔ لیکن اسے اس بات کا بہت رنج رہنے لگا کہ وکیل صاحب نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا اور پچھلے میل جول کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا وہ یہہ بھی جانتا تھا کہ وکیل صاحب اس کے بہت سے روپیوں کے قرضدار ہیں اور وہ ان پر ڈگری دایر کرا سکتا ہے۔ لیکن اس کی طبعیت نے یہہ بات پسند نہ کی۔ دن یوں ہی گذرتے گئے گوکل اور رام سروپ کے بیچ میں ایک خلیج، پھر ایک دریا اور آخر میں ایک بڑا سمندر حایل ہوتا گیا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف سے اتنے انجان بن گئے تھے کہ جیسے کبھی ایک دوسرے کو پہچانتے نہ تھے۔

دنیا رنگ بدلتی رہی۔ آئیں آئیں، اور ہزاروں آرزوں اور تمناوں کا خون کرتی ہوئی چلی گئیں۔ دن نکلے اور اندھیرے گھروں کو روشن کرتے ہوئے پھر تاریکی میں چھپ گئے۔ زمانے نے بہت سی کروٹیں لیں لیکن رام سروپ کے دل میں انتقام کی آگ جو سلگ رہی تھی، اس کے شعلے روز بروز بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

آخر وہ وقت بھی آ پہنچا جب رام سروپ کو اپنے دل کا بخار نکالنے کا موقع مل گیا۔ سیٹھ گوکل داس کی دولت اور شہرت کا حال سن سن کر بہت سے رئیس اور دولتمند خاندانوں نے بھی اس کے لڑکے سے اپنی بیٹیوں کی شادی کا پیام بھیجا۔ ان میں سے بعض برہمن تھے۔ بعض چھتری، کیونکہ لوگ اس بات کو زمانہ ہوا بھول چکے تھے کہ سیٹھ گوکل داس کوئی نیچ ذات کا آدمی ہے۔ اس کے اخلاق اس کی شرافت اور اس کا رکھ رکھاو ہر آدمی کی نظر میں کھپ گیا تھا۔ اس لیے ہر چھوٹے اور بڑے نے اس سے رشتہ جوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

ایک بڑے چھتری گھرانے میں گوکل کے بیٹے کی شادی کا معاملہ طے پا گیا اور برات بھی دلھن کے گھر پر آ گئی ٹھیک اس وقت جب کہ دلھن کا گھر خوشی اور شادمانی کے شور سے گونج رہا تھا۔ عورتیں اور مرد، بوڑھے اور بچے زرق برق پوشاکیں پہنے ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ دروازے پر شادیانے بج رہے تھے۔ بیاہ کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں کہ رام سروپ اس جلسے میں داخل ہوا۔ رام سروپ کو دیکھتے ہی گوکل کا ماتھا ٹھنکا اور اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ رام سروپ کا اس وقت آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ رام سروپ نے دلھا کے باپ سے کہا "مہاراج ایسی غلطی مت کرو۔ اپنے بیٹے کی شادی ایک اچھوت ایک نیچ ذات میں کر کے چھتریوں کی آبرو میں بٹہ نہ

لگاؤ۔ گوکل ایک اچھوت ہے، میں اسے بہت زمانے سے جانتا ہوں"

رام سروپ کی ان باتوں سے ساری محفل میں کھلبلی پڑ گئی۔ ہر آدمی رام سروپ کو حیرت اور پریشانی سے دیکھنے لگا۔ وہ ایک وکیل تھا۔ ایک معزز اور اعلیٰ خاندان کا رکن۔ سارا شہر اس کو جانتا پہچانتا تھا ہر جگہ اس کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اس کی بات دلہن کے باپ پر بجلی کا کام کر گئی۔ کسی نے بھی یہ نہ پوچھا، گوکل کے اچھوت ہونے کا کیا ثبوت ہے کیونکہ کسی کو اس بات میں شبہ نہ ہو سکتا تھا کہ رام سروپ جیسا مشہور وکیل ایسی جھوٹ بول سکتا ہے۔

دلہن کے باپ نے کہا "گوکل بابو تم نے اپنی ذات چھپا کر ہم کو دھوکہ دیا۔ اچھا.... لیکن اب یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ ہم جان بوجھ کر زندہ مکھی نہیں نگل سکتے" اور پھر بیٹی سے مخاطب ہو کر بولا "اٹھو بیٹی تمہاری شادی نہیں ہو سکتی" دلہن کی ماں نے دوڑ کر دلہن کو چھاتی سے لگا لیا وہ بولی "بیٹی ایشور نے ہماری آبرو رکھ لی۔ بہت اچھا ہوا جو ہم کو وقت پر یہ بات معلوم ہوئی۔ ہم وکیل بابو کے بہت احسانمند ہیں کہ انہوں نے ہم کو کیچڑ میں گرنے سے بچا لیا"

دلہن گھر کے اندر پہنچا دی گئی۔ براتی اور مہمان بھاگنے لگے اور آن کی آن میں سارا گھر سنسان ہو گیا بے چارہ گوکل منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن رام سروپ کی اس ذلیل حرکت اور ایسے برتاوے سے اس کے دل پر کاری زخم لگا۔ اس راز کے اتنے بڑے جلسے میں کھل جانے سے سارے شہر میں اس کی ذلت اور رسوائی ہوئی اور گوکل کی رہی سہی عزت اور آبرو خاک میں مل گئی۔ شہر کے معزز اور اونچی ذات کے لوگ اسے حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس کا دل بیٹھ گیا اور رنج و غم سے اس کے حواس بجا نہ رہے۔

گوکل آخر آدمی ہی تھا اور اس کے سینے میں بھی آدمی ہی کا سا دل تھا۔ اس نے سوچا (دیکھو اس نے وکیل صاحب کے ساتھ کیسا سلوک کیا اور وکیل صاحب نے اس کا کیا بدلہ دیا۔ اپنی عزت اور آبرو پر پانی پھر جانے کے بعد بھی اس کے دل میں بدلہ لینے کی آگ سلگ اٹھی اور اس آگ کے شعلے اس وقت رام سروپ کے گھر تک پہنچے جب اس کی پروردہ بیٹی مالتی کا بیاہ ہو رہا تھا اور اس کے بیاہ کی آخری رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔ گوکل نے بھی رام سروپ کے ساتھ وہی کیا جو رام سروپ نے گوکل کے ساتھ کیا تھا.... اور پھر بدنامی و ذلت اور رسوائی کے ڈر سے وہ اس کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یہ تھے وہ ڈراونے اور روح کو بیتاب اور بے چین کر دینے والے منظر، جو سینما کے فلم کی طرح ایک کے بعد ایک رام سروپ کی نظروں کے سامنے سے گذر رہے تھے وہ ان منظروں کے بھیانک اور تڑپا دینے والے تصوروں میں ڈوبا جا رہا تھا وہ چاہ رہا تھا کہ انہیں تصوروں میں ڈوب جائے اور پھر کبھی ان سے باہر نہ نکلے۔

سریش بابو.... اس میں میرا کیا قصور ہے کہ میں اونچے گھرانے میں پیدا نہیں ہوئی.... نیچ گھرانے میں پیدا ہونے والے انسان نہیں ہوتے؟ بابو کیا ان میں شرافت اور غیرت نہیں ہوتی۔ کیا ان میں جذبات نہیں ہوتے۔ کیا ان کے سینوں میں پتھر کے دل ہوتے ہیں؟ بولو بابو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ مالتی نے سریش سے نہایت درد بھرے لہجے میں عاجزی سے کہا

"میں مجبور تھا مالتی! میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ اپنے باپ کے کہنے سے انکا

کر دیتا، شادی کے لیے ٹھہر جاتا اور میرا بیاہ بھی تمہارے ساتھ ہو جاتا... لیکن میں باپ کے کہنے کو نہیں ٹال سکتا مالتی۔ میرے باپ مجھے حد سے زیادہ چاہتے ہیں میں ان کا اکیلا لڑکا ہوں۔ میں اس بڑھاپے میں ان کی آنکھ کی روشنی ہوں۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھے اپنے باپ کی بات کو ٹال دینا چاہیے تھا۔ کیا مجھے ان کی آنکھوں کی روشنی چھین لینا چاہیے تھا.... اگر نہیں تو پھر تم ہی بولو مالتی کہ میں اور کیا کر سکتا تھا.... بولو میں اور کیا کر سکتا تھا؟ سریش نے بہت زیادہ غمگین اور متاثر ہو کر جواب دیا۔

مالتی۔ سریش بابو، میری خاطر محض میرے لیے آپ اپنے باپ کو ناراض نہ کیجیے۔ دنیا میں ماں باپ اولاد کے لیے بہت بڑی نعمت ہیں۔ آپ ان سے مت بگاڑیے، میرے لیے مجھ جیسی لڑکیاں آپ کو بہت مل سکتی ہیں۔ سریش بابو، ماں باپ کو کبھی مت کھو دیجیے۔ وہ کھو جانے کے بعد پھر کبھی نہیں ملتے۔ میں خوب جانتی ہوں اس بات کو۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو میرے لیے ان کو دکھ نہ پہنچایا۔ ماں باپ کو دکھ پہنچانے والا کبھی دنیا میں سکھ اور چین سے نہیں رہتا.... مگر سریش بابو آپ کے ماں باپ نے صرف ایک ہی بات پر شادی کرنے سے کیوں انکار کر دیا کہ میں نیچ ذات کی لڑکی ہوں۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میں آدمی نہیں ہوں؟ آپ کے باپ نے اس بات کو کیوں نہ دیکھا کہ جس لڑکی کو آپ نے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے پسند کیا ہے اس کا کیریکٹر کیسا ہے۔ وہ جاہل اور ان پڑھ ہے یا تعلیم یافتہ، اس میں شرم و غیرت، اخلاق و حیا ہے یا نہیں۔ اس کی شکل و صورت آدمیوں کی طرح ہے یا نہیں۔ اس میں اپنے شوہر کو خوش رکھنے کا سلیقہ ہے یا نہیں۔ بابو کیا آپ کے ماں باپ، لڑکی میں ان باتوں کو نہیں دیکھنا چاہتے؟ کیا آپ کے باپ ایک لڑکی کو صرف اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ اونچے کنبے کی ہے خواہ اس کو لکھنا پڑھنا آئے یا نہ آئے خواہ اس میں اخلاق و سلیقہ ہو نہ ہو..... بابو کیسے تعجب کی بات ہے یہ؟

سریش۔ تم ٹھیک کہتی ہو مالتی.... لیکن میرے ماں باپ نئی روشنی کے نہیں ہیں وہ ذات پات کے معاملے میں بڑے کٹر ہیں۔ وہ سماج اور سوسائٹی کے تباہ اور گمراہ کرنے والے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کی نظریں بہت محدود اور ان کی دنیا بہت تنگ ہے میں ان کو کس طرح سمجھاؤں کہ اونچ اور نیچ دنیا والوں کے گھڑے ہوئے اصول ہیں۔ آدمی دراصل وہی ہے جس میں آدمیت ہو۔ میں ان کو کس طرح سمجھاؤں .... مالتی میری.... نہیں میری نہیں۔ تم شاید اب اس جنم میں میری نہ ہو سکو۔ سماج کے ظالم ہاتھوں نے مجھے تم سے چھڑا دیا ہے مالتی... سوسائٹی نے تم کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ آہ اب میں کیا کروں؟

مالتی۔ سریش بابو رنجیدہ نہ ہو.... افسوس نہ کرو اس بات پر کہ میں تم سے چھوٹ گئی.... تم جس کو سماج کا ڈر اور سوسائٹی کا خوف اس قدر لگا ہوا ہے کہ وہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتا.... تم جس کے دل و دماغ میں تعلیم کی روشنی پہنچنے کے بعد بھی تاریکی اور اندھیرا چھایا ہوا ہے.... اس کو ایک مالتی کے چھوٹ جانے کا رنج نہ ہونا چاہیے۔ سریش بابو.... کاش تم سماج اور سوسائٹی کے ان بندھنوں کو توڑ سکتے۔ کاش تم نے جو علم حاصل کیا ہے اور اس پر عمل بھی کرتے تو آج تمہارے ماں باپ بھی تم سے ناراض اور الگ نہ ہوتے اور اس مالتی کو بھی تمہارے قدموں میں پڑے رہنے کی خوشی نصیب ہو سکتی۔

سریش۔ تم اپنی طعن آمیز باتوں سے میرے دل و جگر پر نشتر چلا رہی ہو مالتی.... بس کرو۔ بس کرو، اب میں ان باتوں کو زیادہ نہیں سن سکتا۔ میں اب ان باتوں کو سن کر برداشت نہیں کر سکتا۔

مالتی۔ میری باتوں میں کیا ہے بابو؟

سریش۔ بہت کچھ ہے مالتی، تمہاری باتوں میں سب کچھ ہے۔ میں اب تک سچ مچ اندھیرے اور گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا یہ ثبوت ہے کہ تم جیسی لڑکی ایک کم عمر اور ناتجربہ کار عورت مجھے یہ سبق دے رہی ہے کہ میں نے جو تعلیم حاصل کی ہے اس پر مجھے عمل بھی کرنا چاہیے.... میں نے یہ سبق پڑھا تھا کہ تمام مرد عورت ایک دوسرے کے بھائی بہن ہیں اور آج میں نیچ اور اونچ ذات کے تباہ کرنے والے اصول اور رواج کا پابند ہوں، مجھے اپنی ہمت پر شرم آتی ہے۔ مالتی تم نے آج میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں سماج کے ان بندھنوں کو ضرور توڑ کر رہونگا میں دنیا کو اس برے اور گمراہ کرنے والے راستے پر چلنے سے ضرور روکوں گا.... مالتی تم میری ہو.... آؤ اب میں تم کو جانے نہ دوں گا۔

مالتی۔ سریش بابو، جذبات کی رو میں نہ بہہ جایئے میں ابھی دنیا کی نظروں میں غیر ہوں۔ میں ابھی آپ کی نہیں بن سکتی۔ میں آپ کی بن کر آپ کو اور آپ کے ماں باپ سے چھڑانا نہیں چاہتی.... بابو بے سوچے سمجھے کام نہ کریے۔ جایئے اٹھیے۔ پہلے سماج کے اس اصول کو بدل ڈالیے۔ جایئے پہلے اپنے ماں باپ کو منایئے ان کو تیار کیجیے۔ مالتی اب بھی آپ ہی کی ہے اور ہمیشہ آپ ہی کی ہو کر رہے گی.... سریش بابو اب میں جاتی ہوں۔

سریش۔ مالتی کہاں جاتی ہو.... کیوں....؟ نہیں تم اب مت جاؤ یہاں سے۔

مالتی۔ مجھے جانا ہی پڑے گا بابو.... کہاں یہ کون جانتا ہے کہاں....؟

مالتی کے آخری لفظ بادل کی گرج کی طرح سریش کے دل سے ٹکرائے اس کی زبان پر یہ لفظ بار بار آنے لگے۔ "کون جانتا ہے کہاں" اور نہایت ڈراونے منظر اس کی نظروں میں پھرنے لگے۔

مالتی پلٹی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی۔

سریش آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ "مالتی تم جا رہی ہو.... مت جاؤ" مالتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سریش کی نظروں میں اس کے باپ کی صورت اور شادی کا منظر پھر رہا تھا اور دماغ میں مالتی کی طنزیہ باتیں، اسے چکر سا آنے لگا۔ وہ یکایک کرسی پر گر پڑا۔

(۹)

مالتی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے آنکھیں کھولنے پر دیکھا کہ سریش اس کے پاس کھڑا ہے "بابو آپ آ گئے؟" مالتی نے دردبھری آواز میں پوچھا "ہاں آ گیا مالتی.... سماج کے بندھنوں کو توڑ کر سوسائٹی کے اصولوں کو ٹھوکر مار کر.... مالتی یہ سب کچھ میں نے تمہارے لیے کیا.... اس لیے کہ میں تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں" سریش نے جواب دیا۔

مالتی۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر آپ مجھے اپنی کنیز بنالیں۔ مجھے اپنی کنیز بنالیں، مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیں۔ لیکن سریش بابو آپ کے ماں باپ تو آپ کے یہاں آنے سے ناراض نہیں ہوئے؟

سریش۔ ماں باپ! مالتی انہوں نے تو بہت روکا مجھے لیکن میں نے ان کے کہنے کی ذرا بھی پرواہ نہ کی

اس معاملے میں تو ماں باپ بھی مجھے اپنے دشمن معلوم ہوتے ہیں۔

مالتی۔ آہ بابو…… یہہ تم نے کیا غضب کیا …… یہہ تم نے بہت برا کیا…… میری خاطر، ایک غریب اچھوت لڑکی کے لیے اپنے ماں باپ کو ناراض کر لیا نہیں بابو ایسا نہ کرو، تم گھر لوٹ جاو۔ میری پرواہ نہ کرو، مجھے اسی میں خوشی ہوگی کہ تم لوٹ جاو۔ ماں باپ کا دل اس بڑھاپے میں نہیں توڑنا چاہیے۔ تم ابھی واپس جاکر ان کو منا لو۔ وہ مان جائیں گے اور میرا خیال اب اپنے دل سے نکال ڈالو بابو… میں اب صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہوں۔ نہیں صرف چند منٹ کی۔

سریش (چونک کر پریشانی سے) ایں، یہہ تم نے کیا کہا مالتی؟ ابھی میں تم کو مرنے نہ دوں گا میں تم کو اپنا بنانا چاہتا ہوں۔

مالتی۔ یہہ میرے نصیب میں نہیں تھا کہ آپ کی ہو کر زندہ رہوں، میں جانتی تھی سریش بابو کہ آپ کے ماں باپ جو اونچی ذات کے ہیں کبھی اس بات کو پسند نہ کریں گے کہ آپ میرے ساتھ بیاہ کریں …… پھر میں یہہ بھی جانتی تھی کہ دنیا میں ایک مرتبہ سب کی نظروں سے گر جانے کے بعد عزت واپس نہیں آتی…… سریش بابو۔ اور مجھے یہہ بھی معلوم تھا کہ میرے دل کی تمنا پوری نہ ہوسکے گی۔ میں جانتی ہوں کہ خدا اپنے بندوں پر ترس کھاتا ہے لیکن آدمی…… اور ظالم سماج کبھی کسی پر ترس نہیں کھاتا وہ دوسروں کی بربادی پر ہنستا ہے وہ دوسروں کی تکلیف اور درد دکھ پر مسکراتا ہے۔ پھر جب مجھے ہر طرف سے ناامیدی ہوگئی اور دنیا میری نظروں میں تاریک ہوگئی تو سوائے اس کے میرے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اپنی دنیا سے بہت دور، چلی جاوں بہت دور خدا معلوم کہاں؟ مگر ایسی جگہ جہاں جاکر واپس نہ آوں۔ بابو تم گھر واپس جاو۔ لیکن میری غلطیوں کو معاف کردو۔ میرے قصور…… بولو بابو… چپ کیوں ہو…… جلد… بہت جلد…… صرف چند منٹ میری زندگی کے اور باقی ہیں۔

سریش۔ مالتی، مالتی۔ میرا سینہ تمہاری ایسی باتوں سے پھٹا جا رہا ہے۔ تم اس قدر جلد مجھ سے دور ہونے کی کوشش نہ کرو، مالتی میں تم سے پریم کرتا ہوں …… میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

مالتی مجھے معلوم ہے بابو کہ آپ کو مجھ سے کیسا سچا پریم ہے۔ لیکن سماج نے ہمارے اس پریم کے پودے کو مسل کر رکھدیا۔ بابو ذرا اپنا ہاتھ لاو۔ میں آخری بار اس کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لوں…… مالتی کی آواز یہہ کہتے کہتے بھرا گئی۔ اس کی زبان رک گئی۔ سریش نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیے۔ مالتی نے نہایت حسرت بھری نظروں سے سریش کو دیکھا۔ اور یوں ہی دیکھتی رہ گئی…… اس کی آنکھ کی پتلیاں ہمیشہ کے لیے ساکت ہوچکی تھیں۔

محمد مشیر عابدی بی۔ اے۔ ام۔ ایس سی (علیگ)

رسید

تبصرے کے لیے ذیل کی کتابیں وصول ہوئی ہیں جن پر آنے والے نمبروں میں بشرط گنجائش تبصرہ کیا جائیگا

(۱) لاسلکی و ٹیلیویژن (۲) بہن۔ (۳) شان خدا (۴) محمد رسول اللہ (۵) نقد سخن (۶) مومن و غالب (۷) جواہر العلوم (۸) سیاسی تقاریر

تیری یاد

ساون کا پیام ابر نے جب آ کے دیا تھا
برسات نے جب گود میں عالم کو لیا تھا
جب دامن شب کالی گھٹاؤں میں سیا تھا
جب لب پپیہے سے رواں لفظ پیا تھا
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

اللہ رے وہ ساونی رت کالی گھٹائیں
بجلی کی چمک گھیرے ہوئے ساری فضائیں
پانی سے ملی آتی تھیں وہ ٹھنڈی ہوائیں
لیتی تھی نظر منظر دل کش کی بلائیں
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

وہ رات کے سناٹے میں بادل کا گرجنا
گھنگھور گھٹاؤں میں وہ بجلی کا چمکنا
پانی کا وہ رہ رہ کے وہ تھم تھم کے برسنا
اور وہ دل ناکام کا رہ رہ کے مچلنا
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

موتی لیے دامن میں زمیں تول رہی تھی
بڑھ بڑھ کے ہر اک موج اسے رول رہی تھی
غنچوں کے دہن باد صبا کھول رہی تھی
کویل بھی کہیں بیٹھی ہوئی بول رہی تھی
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

اللہ رے ساون کی گھڑی رات سہانی
جس رات پہ ہو جائے فدا لاکھ جوانی
دل سوز پپیہے کی وہ تھی درد بیانی
جیسے کوئی کہتا ہو محبت کی کہانی
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

بھرپور جوانی پہ تھا ساون کا مہینہ
برسات کی ووٹی[عہ] کا ٹپکتا تھا پسینہ
ہر بوند سے گیتی کے چھدا جاتا تھا سینہ
بنتا تھا جگرتا تھا حبابوں کا سفینہ
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

پانی کی شب تار میں پر زور جھڑی تھی
پانی کی جھڑی کیا تھی کہ موتی کی لڑی تھی
کالی سی ردا چاند کے چہرے پہ پڑی تھی
ساون کی گھڑی تھی ارے ساون کی گھڑی تھی
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

اتنے میں رکا پانی نہ تھی برق نہ بدلی
مہتاب سے گھونگھٹ جو ہٹا چاندنی پھیلی
جیسے کہ حسینہ کوئی محمل سے ہو نکلی
بجلی نہ تھی لیکن میرے دل پر گری تھی
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

جب چاندنی پھیلی تو زمانہ ہوا روشن
دیکھا تو گرفتار قفس کیا نشیمن
زنداں میں مقید تھا نہ صحرا تھا نہ گلشن
خون دل بیتاب سے رنگین تھا دامن
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

اس موسم گل میں بھی خزاں میرے لیے تھی
حسرت سے بھری فصل جواں میرے لیے تھی
سب خوش تھے مگر آہ و فغاں میرے لیے تھی
زنداں میں بھلا نیند کہاں میرے لیے تھی
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

جب رنگ قفس حسرت و ارمان سے بدلا
اور تیری ملاقات کو دل قید میں مچلا
بےچینی میں اٹھا کبھی بیٹھا کبھی ٹہلا
دل پھر ترے نکہت کا کسی طرح نہ بہلا
ایسے میں تیری یاد نے بےچین کیا تھا

نکہت (لکھنوی)

عہ بمعنی ملا استعمال ہوا ہے۔

فارسی نثر ساتویں صدی ہجری میں

۶۱۶ھ میں تاتاریوں کا فتنہ اٹھا۔ اسی سن کے ماہ ذی حجہ میں چنگیز خاں نے بخارا کو تاراج کیا۔ یہ ایران کا پہلا شہر تھا۔ جو خونخوار تاتاریوں کے قبضے میں آیا۔ تاتاریوں کا یہ فتنہ اس وقت سر اٹھایا جب کہ اسلامی علوم و فنون کا عالم شباب تھا۔ چنگیزی فوج نے جس کی تعداد کم از کم ۸ لاکھ تھی خراسان، عراق و شام تک ممالک روند ڈالے اور ان کو بے چراغ کر دیا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تاتاریوں کے ہاتھوں سے ۱۶ لاکھ سے زیادہ میدان ہائے جنگ میں اور تقریباً اسی قدر گھروں میں بے گناہ آدمی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ بخارا، سمرقند، ترمذ، بلخ، غزنین، ہرات، مرو، طوس، دامغان، رے، قم، خزوین، زنجان، ہمدان، مراغہ، نیشاپور اور اصفہان میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ تاتاری فوجوں نے کتابوں کے حق میں بھی بڑا ظلم کیا بہت سی کتابیں جلا دیں اور بہت سی غرق دریا کر دیں غرض ان ظالموں نے مسلمانوں کے چھ سو سالہ تمدن کا خاتمہ کر دیا۔

بالآخر قیام امن کے بعد جب تاتاریوں کو تنظیم حکومت کا خیال ہوا تو ان کو مسلمانوں سے پھر مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ ساتویں صدی کا نصف اول تو اسی دار و گیر میں گذرا۔ لیکن آخری نصف میں ایران میں سکون ہوا اور پھر لوگوں نے ادبیات کی طرف توجہ کی جو لوگ ہندستان اور دیگر ممالک کی طرف بھاگ گئے تھے وہ واپس آنے لگے اور پھر ایک دفعہ فارسی ادب میں زندگی پیدا ہو گئی۔

جب تگودار اپنے باپ ابقا خاں کی جگہ بادشاہ ہوا تو اس نے سلطان احمد کا لقب اختیار کر کے مذہب اسلام قبول کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایرانی تہذیب و تمدن کا اثر تاتاریوں میں نفوذ کرنے لگا۔ فارسی ادب کو ساتویں صدی کے نصف اول جو ضعف میں آگیا تھا آخر میں اس میں زور پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں بہ کثرت شاعر اور نثر نویس پیدا ہوئے۔ تاریخ نویسی شریف ترین مشغلہ قرار پایا۔ فارسی ادب کے اسلوب نگارش میں بھی انقلاب ہوا۔ فتنہ تاتار کے پہلے فارسی ادب پیچیدہ اور مغلق تھا اب سبک اور رواں ہو گیا۔

چونکہ ہمارے مضمون کا موضوع نثر ہے اس لیے اس عہد کے شاعروں کا تذکرہ آیندہ کسی مضمون میں کیا جائے گا۔

ذیل میں فارسی کے صرف ایسے نثر نویسوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ساتویں صدی ہجری میں ایران اور اس کے اطراف علاقوں میں گذرے ہیں اور جو فارسی نثر نگاروں میں درجہ امتیاز رکھتے ہیں۔ ایسے مصنف بھی اس میں شامل ہیں جنہوں نے اگرچہ آٹھویں صدی میں وفات پائی۔ لیکن ان کی نشو و نما ساتویں صدی میں ہوئی تھی۔

(۱) ابو عمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی ۵۸۹ھ میں پیدا ہوئے اور [illegible] میں وفات پائی

پہلے غور میں سکونت تھی۔ بعد سیستان چلے گئے اور ۶۲۲ھ و ۶۲۳ھ میں سفارتی خدمت پر مامور رہے اس کے بعد ہندستان گئے۔ ان کی ایک کتاب طبقات ناصری بہت مشہور ہے۔ یہ کتاب ۶۵۸ھ میں تمام ہوئی۔ اس کا شمار ہندستان کی معتبر تاریخوں میں کیا جاتا ہے۔ اس میں عہد قدیم سے سلطنت ناصر الدین محمود شاہ تک کے حالات ہیں۔ پوری کتاب ۲۳ طبقات پر مشتمل ہے۔ آٹھ طبقے ہندستان سے متعلق ہیں۔ یہ کتاب رایل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سلسلہ مطبوعات میں چھپ گئی ہے اس کا انگریزی ترجمہ میجر جی ریورٹی نے کیا ہے۔ ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی اسی تاریخ کا تکملہ ہے۔

(۲) ابو شرف ناصح بن ظفر بن سعد منشی جرفادقانی تاریخ یمین کے مولف ہیں جو ابو نصر محمد بن عبد الجبار عتبی کی تاریخ غزنوی کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب سلطان محمد غزنوی کے لیے لکھی گئی تھی۔ تاریخ یمین کا ہندستانی ترجمہ حکیم وکیل احمد سکندر پوری نے کیا ہے جو آئینہ یمینی کے نام سے چھپ گیا ہے۔

(۳) خواجہ عطا ملک علاء الدین بن بہاء الدین محمد بن شمس الدین محمد جوینی۔ یہ شمس الدین صاحب دیوان جوینی کے بھائی ہیں ان کا خاندان علم و فضل میں بہت مشہور رہے ان کے خاندان کے کئی افراد عہدہ وزارت پر بھی معمور رہے ہیں۔ مصنف ۶۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ جب ان کی عمر ۲۰ سال کی ہوئی تو جلال الدین خوارزم شاہ کے دربار سے متوسل ہوئے جہاں ان کے والد اور بھائی پہلے ہی سے اس دربار میں عہدوں پر مامور تھے۔ اس کے بعد ان کے خاندان کا تعلق ابقا خان و منگو و ہلاکو اور ارغون سے ہو گیا۔ یہاں بھی سب کے سب بڑے منصب پر فائز رہے۔ عطا ملک جوینی نے ۴ ذی حجہ ۶۸۱ھ میں وفات پائی۔ عطا ملک جوینی کا شمار ایران کے بلند پایہ مورخین میں کیا جاتا ہے۔ نثر فارسی میں ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کی مشہور کتاب تاریخ جہاں گشائی ہے جو جہاں گشائے جوینی کے نام سے مشہور ہے یہ کتاب ۶۵۰ھ سے ۶۵۸ھ تک آٹھ سال میں اختتام کو پہنچی۔ اس کی تین جلدیں ہیں۔ جلد اول تاریخ چنگیز خاں و فرزندان تا کیوک خاں۔ جلد دوم تاریخ خوارزم شاہیاں۔ جلد سوم تاریخ اسمٰعیلیان الموت تینوں جلدیں گب میموریل لندن کے سلسلے میں مرزا محمد قزوینی کی تصحیح سے چھپ گئی ہیں۔ مشہور تاریخ وصاف اسی کتاب کا ذیل ہے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے جو بغداد میں ہولاکو خاں کے ساتھ تھے فتح بغداد کے حالات لکھ کر جہاں گشاے کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔ یہ ضمیمہ جہاں گشاے کے بعض قلمی نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ تسلیۃ الاخوان اسی مصنف کا ایک رسالہ ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے آخری عمر کے حالات و مصائب قلمبند کیے ہیں۔

(۴) بہاء الدین محمد بن حسن بن اسفندیار کاتب طبرستان کے باشندے ہیں۔ ان کی کتاب تاریخ طبرستان مشہور ہے۔ تاریخی واقعات کے قطع نظر اس کتاب کی عبارت نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ عبارت میں کثرت سے عربی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ خلاصے کے طور پر اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر براون نے گب میموریل میں شایع کیا ہے۔

(۵) خواجہ نصیر الدین ابو جعفر محمد بن حسن طوسی۔ ان کے والد ساوہ کے باشندے ہیں۔ لیکن طوس میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور یہیں ۱۱ جمادی الاول ۶۰۶ھ کو وفات پائی۔ خواجہ نصیر بن طوسی جوان ہی تھے کہ

خراسان کے حوادث نے ان کو قہستان میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ جہاں وہ ملک ناصر الدین ابو الفتح عبد الرحیم ابن ابی منصور حکمران قہستان کے دربار سے متوسل ہو سے۔ یہیں مشہور و معروف کتاب اخلاق ناصری اور رسالہ سیر و سلوک لکھا اور فرمانروا کے نام پر معنون کیا۔ چند روز خواجہ کو قہستان کے زندان میں بھی رہنا پڑا۔ ابھی یہہ قلعہ موت میں قید تھے کہ ۶۵۵ھ میں ہلاکو خاں نے ان کو چھڑایا اور اپنا وزیر بنایا۔ اس کے بعد ہلاکو خاں نے مراغہ کو اپنا پایہ تخت قرار دیکر یہاں ایک رصد خانہ تعمیر کیا۔ مشہور ہے کہ ہلاکو خاں نے بغداد میں خواجہ ہی کے اشارے و مشورے سے حملہ کیا تھا۔ بغداد کی لوٹ میں جو کتابیں بچ رہی تھیں وہ جمع کر کے خواجہ کے سپرد کی گئیں۔ ان کتابوں کی تعداد ۴ لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ آخر عمر میں خواجہ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے۔ ۱۸ ذیحجہ ۶۷۲ھ کو بہ عمر ۷۵ سال بغداد میں انتقال کیا۔ کاظمین میں دفن ہو سے۔ خواجہ نصیر الدین کا ممتاز علما میں شمار ہے۔ اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے۔ گھر گھر آپ کی علمیت کی شہرت تھی۔ ریاضی، حکمت، نجوم، سلوک، تصوف و کلام میں ید طولی حاصل تھا۔ نظم و نثر میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی عربی فارسی تصانیف کی تعداد ۶۰ بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں بہت مشہور ہیں۔ جن میں قابل ذکر اخلاق ناصری۔ اوصاف الاشراف معیار الاشعار، منشور نامہ، ایل خانی، رسالہ سیر و سلوک رسالہ بیست باب یا باسید نا و مطلوب المومنین جبر و اختیار۔ جام جہاں نما، ادب الوجیز، رسالہ رمل تذکرہ نصیریہ۔ ہیئت و معرفت تقویم ہیں۔ ایک کتاب مکارم الاخلاق بھی خواجہ کے نام سے منسوب ہے۔

(۶) قاضی القضاۃ نصیر الدین یا ناصر الدین ابو الخیر یا ابو سعید عبد اللہ بن عمر بیضاوی۔ قاضی شیراز تھے۔ ۶۸۵ھ میں بہ مقام تبریز انتقال کیا۔ اپنے وقت کے مشہور عالم تھے۔ ان کے والد عماد الدین ابو القاسم عمر بھی سلطنت اتابک ابو بکر سعد زنگی میں فارس کے قاضی القضاۃ تھے۔ بعد میں یہی خدمت بیٹے کو ملی۔ ایک عرصے تک شیراز میں سکونت اختیار کر کے آخر عمر میں تبریز چلے گئے تھے ان کی تفسیر بیضاوی بہت مشہور رہے یہہ کتاب یورپ کے علاوہ ہندستان کے کئی مطابع میں متعدد بار چھپ چکی ہے۔ آپ نے نظام التواریخ کے نام سے ایک تاریخ لکھی تھی جس کا سنہ تالیف ۶۷۴ھ ہے یہہ ایران کی تاریخ ہے۔ جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے اس کتاب کا متن معلومات آفریں مقدمے کے ساتھ شایع کیا ہے۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب کی اور بھی تصانیف ہیں۔ قاضی صاحب نے کئی کتابوں پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

(۷) شمس الدین محمد بن قیس رازی۔ رے کے باشندے ہیں۔ ایک عرصے تک ماوراء النہر خوارزم اور خراسان میں رہے۔ جب ۶۱۴ھ میں خراسان میں تاتاریوں کے حملے کا غلغلہ بلند ہوا تو سلطان علاء الدین محمد ابن تکش خوارزم شاہ کے ساتھ عراق چلے آئے اور یہاں سے بھی جب سلطان نے تاتاری لشکر سے خوفزدہ ہو کر راہ فرار اختیار کی تو یہہ بھی سلطان کے ساتھ تھے ۶۲۳ھ میں عراق سے فارس گئے اور اتابک سعد زنگی (۵۹۹ھ تا ۶۲۳ھ) کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ سعد بن زنگی نے ان کو اپنا ندیم خاص مقرر کیا۔ ان کی ایک مشہور کتاب المعجم فی معائر اشعار العجم ہے۔ یہہ کتاب عروض و قوافی اور صنایع شعر میں درجہ استناد رکھتی ہے۔ یہہ کتاب انہوں نے ۶۱۴ھ میں شہر مرو میں لکھنا شروع کی تھی ۶۱۴ھ میں اس کا ناتمام مسودہ میں

کے قبضے سے نکل گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک مدت کے بعد مسودہ مذکور پھر ان کو مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے سنہ ۶۳۰ھ میں بمقام فارس اس کی تکمیل کی۔ یہہ کتاب گب میموریل کے سلسلے میں چھپ گئی ہے۔ ان کی اور تین کتابیں مشہور ہیں۔ المعرب فی معاییر اشعار العرب۔ الکافی فی العروضین والقوافی۔ کتاب حدایق العجم۔

(۸) سعدالدین وراوینی۔ آذربائیجان کے رہنے والے ہیں۔ خوارزم شاہیاں کے آخری دور حکومت میں تھے۔ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے ہمعصر ہیں۔ ان کی ایک کتاب مرزبان نامہ بہت مشہور ہے یہہ کتاب اصل میں طبرستان کی زبان میں مرزبان بن رستم بن شروین باوندی نے جو طبرستان کے حکمرانوں میں تھا لکھی تھی۔ سعدالدین نے اس کا فارسی ترجمہ خواجہ ابوالقاسم ربیب الدین ہارون بن علی بن ظفر دندان وزیر اتابک ازبک بن محمد بن ایلدگز کے نام پر کیا ہے۔ یہہ فارسی کی مشہور کتاب ہے۔

(۹) نجم الدین ابوبکر عبداللہ بن محمد بن شاہور اسدی رازی۔ یہہ نجم الدین دایہ کے نام سے مشہور ہیں۔ رے کے باشندے تھے۔ عالم جوانی میں خوارزم گئے اور مشہور بزرگ نجم الدین کبری کے مریدوں میں شریک ہو گئے جب سنہ ۶۱۸ھ میں تاتاریوں کا فتنہ اٹھا تو ان کے مرشد قتل ہوئے۔ یہہ اپنے وطن کو بھاگ آگئے لیکن تاتاریوں نے ان کا تعاقب کیا۔ مجبوراً ہمدان چلے گئے۔ وہاں سے اردبیل (ایشیائے کوچک) اور اردبیل سے قیصریہ اور پھر ملطیہ پہنچے۔ یہاں شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر ابوالفتح کیقباد کیخسرو بن قلیج ارسلان کی حمایت میں قونیہ گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ یہاں صدرالدین قونوی و جلال الدین [illegible] [illegible]

سال سکونت اختیار کرنے کے بغداد چلے گئے۔ اور وہیں سنہ ۶۵۶ھ میں انتقال کیا۔ بیرون شہر بغداد مزارات شیخ سری و جنید بغدادی کے مابین دفن ہوئے تصوف پر لکھنے والوں میں بہت مشہور رہیں۔ ان کی مشہور کتاب مرصاد العباد من المبدا الی المعاد ہے۔ یہہ کتاب رجب سنہ ۶۲۰ھ میں بمقام سیواس تمام ہوئی۔ فصاحت کے اعتبار سے بھی اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کی ایک کتاب بحر الحقایق والمعانی فن تفسیر میں عربی میں ہے فارسی میں عشق و عقل۔ منارات السائرین الی حضرت اللہ ومقامات الطاہرین باللہ بھی ان ہی کی تصانیف سے ہیں۔

(۱۰) شہاب الدین ابوحفص عمر بن محمد بن عبداللہ بکری سہروردی۔ یہہ سنہ ۵۳۹ھ میں سہرورد میں پیدا ہوئے ایران کے مشہور صوفیا و مشائخین میں ان کا شمار ہے اپنے چچا نجیب الدین سہروردی کے مریدوں اور شاگردوں میں امتیاز رکھتے ہیں۔ اپنے وطن سے بغداد گئے۔ عمر کا بڑا حصہ بغداد اور ایشیائے کوچک میں گذارا۔ بڑی ریاضت کی۔ حضرت غوث الاعظم کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ بعد میں بغداد کے شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔ مکہ معظمہ میں بھی آپ نے سکونت اختیار کی تھی۔ اس زمانے کے مشہور شعرائے ایران مثلاً کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی اور سعدی کو ان سے عقیدت تھی۔ سنہ ۶۳۲ھ میں بمقام بغداد وفات پائی۔ محلہ وردیہ بغداد میں اب بھی ان کا مزار زیارت گاہ انام ہے سلسلہ سہروردیہ آپ ہی کے نام سے قایم ہے۔ عربی فارسی نظم و نثر میں دستگاہ رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سب سے مشہور کتاب عوارف المعارف ہے۔ اس کتاب کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں یہہ کتاب سفر مکہ کے دوران میں لکھی تھی۔ اشف النصایح

اعلام التقی و اعلام الہدیٰ بھی آپ کی تصانیف ہیں حضرت شہاب الدین سہروردی پر ہندستانی میں بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں۔ ابھی حال میں حکیم شمس اللہ صاحب قادری ماہر آثار قدیم نے اپنے رسالہ تاریخ میں بہت بسیط اور جامع مضمون شایع کیا ہے۔

(۱۱) خواجہ رشید الدین فضل اللہ بن ابی الخیر عماد الدولہ بن موفق الدولہ علی ہمدانی۔ ان کے اجداد ہمدان کے یہود سے تھے۔ ہمدان میں ۶۴۵ھ میں پیدا ہوئے ابتداً پیشہ طبابت اختیار کیا۔ ابقا خاں کے طبیب خاص مقرر ہوئے اس کے بعد ارغوں خاں و غازان خاں و الجائتو محمد خربندہ کی حکومتوں کے دوران میں وزارتوں پر رہے۔ ابو سعید بہادر کی شاہی کے زمانے میں اس کے وزیر تاج الدین علی شاہ نے چغلی کھائی اور یہ بہتان باندھا کہ خواجہ رشید الدین نے محمد خربندہ کو زہر دیا تھا۔ اس جرم میں خواجہ کو گرفتار اور ان کے املاک ضبط کیے گئے اور ۷۱۸ھ میں بہ مقام تبریز ان کو قتل کیا گیا۔ رشید الدین فضل اللہ ایران کے ممتاز علما میں گنے جاتے ہیں۔ فارسی میں ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ رفاہ عام کے بھی بہت سے کام کیے۔ ایک مدرسہ ایک مسجد ایک شفا خانہ اور ایک کتب خانہ تعمیر کر کے وقف کیا تھا نثر فارسی کے بزرگ ترین ادیب ہیں۔ عربی میں بھی اچھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مکاتیب بہت مشہور ہیں۔ ان کی مشہور ترین کتاب جامع التواریخ ہے۔ جو ابتداے آفرینش سے ۷۰۳ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے ۷۰۰ھ میں یہ کتاب انہوں نے غازان خاں کے حکم سے لکھنی شروع کی تھی اور ۷۱۰ھ میں اس کو ختم کیا۔ اس کی تدوین میں ایران کے کئی مورخوں نے شرکت کی تھی۔ چین اور منغولستان کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ مشہور تاریخ بناکتی اسی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ یہ اپنے موضوع پر بڑی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ لطایف الحقایق سلطانیہ حکمت۔ مفتاح التفاسیر۔ رسالہ توضیحات الاحیا و الآثار۔ بیان الحقایق۔ مکاتبات رشیدی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

(۱۲) فخر الدین ابو سلیمان داود بن ابو الفضل محمد بناکتی بناکت کے رہنے والے ہیں۔ دربار غازان خاں کے مشہور شعرا اور ارباب علم میں ممتاز درجہ رکھتے تھے ۷۰۱ھ میں ملک الشعرا کے لقب سے سرفراز ہوئے ان کے بھائی نظام الدین علی عارف کامل تھے۔ ان کی مشہور کتاب روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب ہے۔ جو تاریخ بناکتی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ابتداے عالم سے مولف کے عہد تک کے واقعات اجمالاً درج ہیں یہ کتاب ۷۱۷ھ میں تمام ہوئی۔ جامع التواریخ رشید الدین فضل اللہ کا خلاصہ ہے جو منشیانہ تکلفات سے لکھی گئی ہے۔

(۱۳) شمس الدین احمد افلاکی۔ شیخ جلال الدین عارف نوادہ جلال الدین بلخی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ یہ ایک کتاب مناقب العارفین کے مولف ہیں۔ اس میں جلال الدین بلخی و فرزندان و جانشینان اور مشایقین طریقت کے حالات ہیں مطالب و روانی کے لحاظ سے یہ کتاب بہت دل کش ہے۔

(۱۴) شہاب الدین عبد اللہ بن فضل اللہ شیرازی ملقب بہ وصاف الحضرۃ۔ شاہان مغول کے وزراسے ہیں۔ رشید الدین فضل اللہ کے متوسلین میں خاص آدمی تھے۔ فضل اللہ کے قتل ہونے کے بعد ان کے بیٹے غیاث الدین محمد سے اپنا تعلق قایم رکھا۔ ان کی مشہور کتاب تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار ہے جو عام طور پر تاریخ وصاف کے نام سے مشہور ہے اس میں

۶۵۶ھ تا ۷۱۲ھ تک سلطنت مغول کے حالات ہیں اس کتاب کی منشیانہ عبارت آرائی مشہور ہے۔ اس کو نثر فارسی کی معیاری کتاب ہونے کا درجہ حاصل ہے یہہ کتاب چھپ گئی ہے۔

(۱۵) حمد اللہ بن ابی بکر بن احمد بن نصر مستوفی قزوینی مستوفیان قزوین کے خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا امین الدین احمد ایک عرصے تک وزیر رہے اور فتنۂ مغول میں مارے گئے۔ ان کے بھائی زین الدین محمد رشید الدین فضل اللہ کی وزارت میں نایب دیوان تھے۔ ان کی مشہور کتاب تاریخ گزیدہ ہے۔ یہہ تاریخ دیوان کا خلاصہ ہے۔ دوسری کتاب کا نام نزہۃ القلوب ہے۔ یہہ فن جغرافیہ میں اہم کتاب ہے اس کا متن اور خلاصہ انگریزی ترجمہ سلسلہ گب میموریل میں چھپ گیا ہے۔ ایک منظوم ظفر نامہ بھی ہے۔ اس میں ایران پر عربوں کے غلبہ سے لیکر مولف کے عہد تک کے واقعات ہیں۔ اس کو شاہنامہ فردوسی کا تکملہ کہا جاتا ہے۔ اس میں ۷۵ ہزار شعر ہیں۔ تاریخ قزوین کے نام سے ایک اور کتاب اس سے یادگار ہے جو فارسی ادب کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔

(۱۶) شرف الدین ابو الفضل فضل اللہ راجی حسینی قزوینی۔ اتابیک نصرۃ الدین احمد بن یوسف شاہ (۶۹۶ھ تا ۷۳۰ھ) کے دربار سے متوسل تھے۔ ان کی کتاب المعجم فی آثار ملوک العجم بہت مشہور ہے۔ یہہ ماقبل اسلام کے شاہان ایران کے احوال پر مشتمل ہے اس میں کثرت سے عربی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

(۱۷) سید مرتضی بن داعی حسنی رازی ملقب بہ علم الہدی آخر چھٹی صدی اور اوایل ساتویں صدی کے علما میں ان کا شمار ہے۔ یہہ بہت فصیح اور بلیغ فارسی کہتے تھے ان کی تالیف تبصرۃ العوام فی معرفت مقالات الانام بہت مشہور ہے۔ یہہ کتاب مختلف مذاہب کی رد اور شیعہ مذہب کے اثبات میں ہے۔ ایک اور کتاب انساب نامہ ہے جس میں آئمہ کے حالات ہیں۔ یہہ کسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۱۸) افضل الدین محمد بن حسن بن حسین بن محمد خوزہ مرقی کاشانی۔ ایران کے مشہور علما سے ہیں۔ ایران میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس میں گذار دیا۔ فارسی عربی تحریر میں قدرت رکھتے تھے۔ حکمت، منطق کلام اور تصوف میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ بعض تصانیف کے نام یہہ ہیں۔ المفید المستفید۔ ساز و پیرایہ شاہانہ پرمایہ۔ مبادی موجودات۔ رسالہ نفس ارسطو۔ رسالہ تفاحہ ارسطو۔ رسالہ اجر النفس۔ شرح فصوص الحکم۔ آیات الصنعہ (عربی) مجموعہ رباعیات۔ مکاتیب و تقریرات۔

(۱۹) نجم الدین ابی بکر محمد بن علی بن سلیمان بن محمد ابن احمد بن حسین بن ہمتہ راوندی۔ علماے عراق کے خاندان سے ہیں۔ یہہ راوند (کاشان) میں پیدا ہوئے ۵۷۰ھ میں جب راوند میں قحط پڑا تو وہ وہاں سے نکل گئے اور ہمدان و عراق کے شہروں میں پھرتے رہے۔ ۵۷۷ھ طغرل بن ارسلان سلجوقی کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ بطور خاص سلیمان شاہ بن قلیج ارسلان سلجوقی کے بچوں کی تعلیم دینے کے لیے مقرر ہوے۔ اس طرح سے کچھ دن انہوں نے ہمدان میں بسر کیے۔ انقراض سلجوقیاں کے بعد ایران سے روم چلے گئے۔ اور دربار سلطان غیاث الدین ابو الفتح کیخسرو بن قلیج ارسلان کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ ان کی تاریخ سلجوقیاں راحۃ الصدور و آیۃ السرور بہت مشہور ہے۔ اس کا سن تالیف ۵۹۹ھ ہے۔ نثر فارسی کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

(لاہور) نے اس کا متن شایع کیا ہے اور اس پر نہایت مفید دیباچہ اور نوٹس لکھے ہیں۔

(۲۰) خواجہ فقیہہ زاہد شیخ الاسلام ابونصر طاہر بن محمد خانقاہی سرخسی۔ یہہ ایران کے مشہور مشائخین میں سے تھے۔ ان کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ یہہ ایک مشہور و معروف تصوف کی کتاب "گزیدہ" نامی کے مولف ہیں۔ اس کتاب کا ترکی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

(۲۱) عمادالدین ذکریا بن محمود و کمونی قزوینی۔ قزوین کے باشندے ہیں۔ امام انس بن مالک سے نسبت رکھتے ہیں۔ جوانی میں دمشق گئے اور تحصیل علم کے بعد عراق آے۔ ۶۵۰ھ میں قاضی حلہ اور ۶۵۲ھ میں قاضی واسط مقرر ہوے اور آخر عمر تک اسی خدمت پر مامور رہے۔ عمر کا آخری حصہ بغداد میں بسر کیا اور وہیں ۶۸۲ھ میں انتقال کیا۔ یہہ عربی و فارسی ادب کے بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ جن میں تاریخ قاہرہ۔ کتاب آثار البلاد و اخبار العباد اور عجایب المخلوقات و غرایب الموجودات مشہور ہیں۔

(۲۲) جمال الدین ابوالفضل محمد بن عمر ابی الاقرشی ان کے والد حافظ بلاساغون ماوراے سیحون کے رہنے والے ہیں۔ یہہ کاشغر میں پیدا ہوے اور یہیں نشو و نما حاصل کی۔ انہوں نے جوہری کی صحاح اللغتہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا جس کا نام الصراح من الصحاح ہے۔ یہہ کتاب ۱۶ صفر ۶۸۱ھ میں تمام ہوئی اس کے بعد انہوں نے عربی میں اس کا ذیل لکھا جس کا نام ملحقات صراح ہے۔ اس میں بہ کثرت مطالب تاریخی آگئے ہیں۔

(۲۳) صفی الدین عبدالمومن ارموی۔ اورمیہ کے فضلا سے ہیں۔ خوشنویسی اور موسیقی میں درجہ کمال رکھتے تھے جوانی میں بغداد گئے اور مدرسہ مستنصریہ میں تحصیل علم کیا۔ ادبیات اور تاریخ میں درجہ کمال پیدا کیا۔ عود بہت اچھا بجاتے تھے۔ خلیفہ معتصم کے کاتب، ومغنی و ندیم بنائے گئے فتح بغداد کے بعد خاندان جوینی میں خصوصی درجہ حاصل تھا ان کی طرف سے بغداد کے کاتب انشا دیوان مقرر ہوے۔ اس خاندان کی تباہی کے بعد وہ اس قدر تنگ دست ہو گئے کہ ان کو صرف تین سو دینار قرض کے لیے قید ہونا پڑا۔ قید کی حالت میں ۱۸ صفر ۶۹۳ھ میں بہ عمر ۸۰ سال وفات پائی۔ فن موسیقی میں ان کی کئی کتابیں مشہور ہیں۔ ایک رسالہ شرفیہ ہے۔ جو شرف الدین ہارون فرزند دیوان صاحب دیوان جوینی کے نام پر لکھا گیا تھا یہہ ایران کی قدیم موسیقی میں بہترین و معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔

(۲۴) قطب الدین محمود بن مسعود بن مصلح کازرونی شیرازی یہہ شیراز میں علامہ کے نام سے مشہور تھے۔ ۶۳۴ھ میں شیراز میں پیدا ہوے۔ جہاں ان کے والد ایک مشہور طبیب تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے طب کی تعلیم حاصل کی اس کے علاوہ نجوم میں بھی مہارت پیدا کی۔ خواجہ نصیر الدین دستیاری کے ساتھ رصد خانہ مراغہ میں کام کرتے رہے۔ بعد میں روم چلے گئے۔ قاضی سیواس و ملطیہ مقرر ہوے اور یہاں سے شام گئے۔ پھر تبریز آے۔ وہاں سے قونیہ گئے۔ یہاں بادشاہ کے ندیم مقرر ہوے اور یہیں ۷۱۰ھ میں وفات پائی اور مقبرہ چرنداب میں دفن ہوے۔ آپ طب، ریاضی، نجوم، حکمت، کلام اور موسیقی میں ماہر کامل تھے۔ ان کی ظرافت طبع بھی مشہور رہی ہے۔ یہہ شیخ سعدی کے ماموں مشہور رہیں۔ نظم و نثر فارسی و عربی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کی فارسی کتابوں میں درۃ التاج لغرۃ الدباج مشہور رہے۔ علم ہیئت میں تحفہ شاہی اور نہایۃ الادراک دو کتابیں مشہور رہیں۔ کتاب زیج سلطانی کو بھی بعض لوگوں نے ان کی تصانیف میں شمار کیا ہے۔

(۲۵) رکن الدین علاء الدولہ احمد بن محمد بیابانکی سمنانی۔ ایران کے مشاہیر سے ہیں۔ ۶۵۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ۶۸۶ھ میں فریضہ حج سے فراغت حاصل کی اور ۷۲۰ھ میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ ۷۳۶ھ میں وفات پائی۔ تصوف میں کئی فصیح و بلیغ فارسی رسالے لکھے جن میں رسالۃ التصوف فی آداب الخلوہ، بیان الیال فی الموار سلوک اہل الحال، سلوۃ العاشقین و سکنۃ المشتاقین، ذکر خفی المستجاب لاجر الوفی مشہور ہیں۔

(۲۶) شمس الدین بن فخرالدین فخری اصفہانی مشہور ادیب و شاعر۔ جوانی میں اتابیک نصرۃ الدین احمد اتابیک لرستان کے دربار سے متوسل رہے۔ اس کے بعد خواجہ غیاث الدین محمد پسر رشید الدین فضل اللہ کی خدمت میں پہنچے۔ یہاں سے شیخ ابواسحاق انجو کے پاس گئے۔ ان کے والد فخرالدین بھی مشہور شاعر تھے شمس الدین فخری کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں معیار نصرتی (عروض و قوافی) مخزن البحور و مجمع الصنایع (خواجہ غیاث الدین کی مدح میں) معیار جمالی و مفتاح ابو اسحاقی (بدیع و نعت میں) مشہور ہیں آخرالذکر کتاب ابو اسحاق انجو کے نام پر لکھی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب محسنات کلام بھی ہے۔

(۲۷) ناصر الدین عمدۃ الملک منتجب الدین یزدی۔ منشی و رئیس دیوان رسایل و انشا صفوۃ الدین بادشاہ ترکان خاتون۔ ۶۹۴ھ کرمان کے باشندے اور سمط فراختائیہ ہیں۔ ان کے والد یزد سے ۶۵۰ھ میں کرمان گئے اور وہاں کے دربار سے متوسل ہوئے۔ ان کی مشہور کتاب تاریخ فراختائیان ہے جس کا نام سمط العلی للحضرت العلیا ہے۔ یہ عقد العلی کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ بلحاظ عبارت یہ کتاب بہت فصیح ہے۔

(۲۸) شہاب الدین ابوسعید کرمانی۔ کرمان کے مورخین سے ہیں۔ ان کے حالات معلوم نہیں ہوئے صرف ایک کتاب تاریخ شاہی ان کی یادگار رہے یہ فراختائیان کرمان کی تاریخ ہے۔

(۲۹) امیر ناصر الدین یحییٰ بن مجدالدین محمد۔ کورسرخ گرگان کے سادات سے ہیں۔ ان کی والدہ بی بی منجمہ کمال الدین سمنانی رئیس شافعیہ نیشاپور کی دختر تھیں یہ ابن بی بی کے نام سے مشہور رہیں۔ چونکہ ان کی والدہ کی ستارہ شناسی مشہور تھی۔ اس ذریعے سے وہ جلال الدین خوارزم شاہ کے پاس پہنچیں اور ان کے ساتھ کئی مرتبہ سفر پر روانہ ہوئیں۔ اس بادشاہ کے قتل کے بعد یہ خاندان دمشق چلا گیا۔ علاء الدین کیقباد بادشاہ سلجوقی روم نے بی بی منجمہ کو اپنے پاس (قونیہ) میں طلب کیا۔ ان کے شوہر کاتب و انشاے دیوان مقرر ہوئے اور ان کے فرزند کو دربار میں ایک اہم خدمت دی گئی۔ ابن بی بی کی مشہور کتاب سلجوق نامہ ہے۔ جسے انہوں نے ۶۸۰ھ میں شروع کرکے ۶۸۴ھ میں تمام کیا۔

(۳۰) صدرالدین محمد بن اسحاق قونیوی۔ ایران کے بزرگوں میں ان کا شمار ہے۔ ان کے شاگردوں اور مریدوں کی تعداد کثیر تھی ۶۷۳ھ میں انتقال کیا۔ عربی فارسی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں اعجاز البیان، فکوک النفوس، شرح خصوص الحکم ابن عربی کتاب الخصوص نفحات، تبصرالمبتدی و تذکرالمنتہی مشہور ہیں۔

(۳۱) اسمعیل بن محمد تبریزی۔ ایران کے حکما سے ہیں۔ اتابیک یوسف شاہ بن الپ ارسلان ارغون (از اتابکان لرستان) کے دربار سے متوسل تھے یہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں حیوۃ النفس اور

رسالہ نصریہ مشہور ہیں۔

(۳۲) قاضی سراج الدین ابو الثنا یا محمود بن ابی بکر ارموی۔ علماے آذربائیجان سے ہیں۔ سنہ ۵۹۴ھ میں پیدا ہوے۔ ان کے خاندان نے ترک وطن کرکے قونیہ میں سکونت اختیار کی۔ عزالدین کیکاوس بن کیخسرو بن کیقباد (از سلجوقیان روم) کے دربار سے متوسل تھے۔ سنہ ۶۸۲ھ میں وفات پائی۔ ان کی تصانیف و تالیفات کی تعداد بہت بیان کی جاتی ہے۔ جن میں مطالع الانوار و لطائف الحکمت مشہور ہیں۔

(۳۳) ابو القاسم عبد اللہ بن علی بن محمد کاشانی مشہور مورخ ہیں۔ خواجہ رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ کی تالیف میں یہہ بھی شریک تھے اس کے بعد خود انہوں نے ایک مستقل تاریخ لکھی جس کا نام زبدۃ التواریخ ہے۔ یہہ کتاب سنہ ۷۰۰ھ میں تمام ہوئی اس کی ایک جلد تاریخ الجائتو کے نام سے بھی مشہور ہے جو سلطان محمد خربندہ کے نام سے منسوب ہے۔

(۳۴) ابو نصر محمد قطان غزنوی۔ ساتویں صدی کے بڑے زبردست اہل قلم ہیں۔ ان کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔ ان کی تصانیف بھی ناپید ہوگئی ہیں۔ صرف ایک کتاب سراج القلوب پائی جاتی ہے جو فصاحت کے اعتبار سے نثر فارسی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں پیغمبروں کے حالات ہیں۔

(۳۵) محمد بن علی بن حمید بن ابی بکر کوفی۔ بڑے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ہندستان میں مقیم تھے منہاج المسالک تالیف محمد بن قاسم ثقفی کا جو عربی زبان میں تھی اس کا چچ نامہ یا فتح نامہ کے نام سے معز الدین محمد بن سام و ناصر الدین قباچہ کے زمانے میں عین الملک فخر الدین حسین بن ابی بکر اشعری وزیر کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہہ سندھ کی بہت مشہور و معتبر تاریخ ہے اس کا متن بزم مخطوطات فارسی حیدرآباد دکن نے ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتا کی تصحیح سے شائع کیا ہے۔

(۳۶) بدر الدین تخشی رومی۔ سلجوقیان روم کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ دبیر کی خدمت پر مامور تھے قونیہ میں سکونت تھی۔ ان کی کتاب الترسل الی التوسل صنعت انشا میں مشہور کتاب ہے۔ اس کا سن تالیف سنہ ۶۸۴ھ ہے۔

(۳۷) نصیر الدین محمد بن ابراہیم بن عبد اللہ سجستانی ساعتی تبکلی سیواسی۔ ایران کے علما سے تھے روم میں سکونت تھی۔ علوم ریاضی و ہندسہ میں بڑی مہارت تھی۔ دقایق الحقایق اور مونس العوارف (در بیان معراج و معجزات) ان کی تالیفات میں قابل ذکر ہیں۔

(۳۸) حسن نظامی نیشاپوری۔ خراسان میں سکونت تھی۔ فارسی کے زبردست منشی سمجھے جاتے تھے۔ اوایل عمر میں غزنین گئے اور وہاں سے ہندستان جاکر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ قطب الدین ایبک و شمس الدین التمش تک رسائی پیدا کی اور انہیں بادشاہوں کے حال میں ایک تاریخ لکھی جو تاج المآثر کے نام سے مشہور ہے۔ یہہ کتاب سنہ ۶۰۲ھ میں لکھنی شروع کی تھی۔ اس کتاب کی عبارت آرائی مشہور ہے۔ عربی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔

(۳۹) محمد بن امین الدین ابو المکارم ایوب بن ابراہیم دنیسری۔ روم میں سکونت تھی۔ ان کی مشہور کتاب نوادر التبادر ہے اس میں تمام علوم کا تذکرہ ہے یہہ کتاب سنہ ۶۶۹ھ میں تمام ہوئی۔

(۴۰) شرف الدین محمد بن مسعود بن محمد مسعودی۔ کتاب الکفایہ فی العلم الہیئہ ان سے یادگار ہے۔ یہہ کتاب عربی میں ہے سنہ ۶۰۰ھ میں لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد خود انہوں [illegible] فارسی ترجمہ جہان دانش کے

نام سے کیا۔

(۴۱) حسن بن محمد نیشاپوری قمی۔ نظام صاحب کے نام سے مشہور رہیں۔ خواجہ نصیرالدین کی زیج ایلخانی کی شرح لکھی ہے۔ جس کا نام کشف الحقایق ہے۔

(۴۲) محمد بن ابی عبداللہ سنجر کمالی۔ سیف منجم کے نام سے مشہور رہیں۔ شیراز میں سکونت تھی مشہور منجم تھے زیج اشرفی ان کی مشہور کتاب ہے۔

(۴۳) محمد بن منصور۔ غازان خاں (۶۹۴ھ۔ ۷۰۳ھ) کے زمانے میں تھے۔ جواہرات کی شناخت میں ان کی ایک کتاب مشہور ہے۔ جس کا نام جواہر خانہ ہے۔

(۴۴) سعدالدین سعید بن محمد بن احمد فرغانی بسعید فرغان کے نام سے مشہور ہے۔ ۶۹۱ھ میں وفات پائی اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے۔ قصیدہ تائیہ ابن الفارض کی فارسی میں شرح لکھی ہے۔

(۴۵) نجم الدین صاین الاسلام محمود بن صاین الدین الیاس بن سربار بک شیرازی۔ اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے۔ طب میں ان کی کتاب غیاثیہ بہت مشہور ہے۔

(۴۶) شمس الدین محمد بن علی واکبنوی۔ بخارا کے قریب وابکنہ کے رہنے والے ہیں مشہور منجم تھے بڑے بڑے سفر کیے اور ایک عرصے تک یزد میں مقیم رہے۔ ان کی تالیفات میں زیج سلطانی و زیج قطبی مشہور ہیں۔ زیج سلطانی کا سن تالیف ۶۹۴ھ ہے۔

اس دور میں دو اور کتابیں اہم اور قابل ذکر ہیں جو فارسی میں لکھی گئیں۔ ایک تاریخ سیستان ہے جو بظاہر مجہول الاصل معلوم ہوتی ہے۔ پانچویں صدی میں اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ کسی دوسرے مولف نے ساتویں صدی کے نصف دوم میں اپنے وقت تک کے سیستان کے حالات اس کتاب میں اضافے کیے۔ اور اس کو ملک نصیرالدین بادشاہ سیستان اور اس کے فرزند رکن محمود و نصرۃ الدین کے نام سے ۶۷۵ھ سے ۶۹۵ھ کے مابین تکمیل کی۔

دوسری کتاب فارسی ترجمہ کتاب الفتوح از احمد بن اعثم کوفی ہے۔ یہ ترجمہ خوارزم شاہیان کے ایک وزیر کی فرمایش پر آخری چھٹی صدی اور اوایل ساتویں صدی میں کیا گیا۔ لیکن یہ ترجمہ مترجم کی وفات کی وجہ سے ناتمام رہ گیا تھا۔ جس کو بعد میں اسی وزیر کے حکم سے محمد بن احمد بن ابی بکر مائز یا بادی نے تمام کیا یہ ترجمہ بلحاظ فصاحت مشہور رہا ہے۔

ساتویں صدی سے تعلق رکھنے والے اور بھی بہت سے فارسی نثر نویس گذرے ہیں جن کا ذکر کچھ تو بخوف طوالت اور کچھ زیادہ اہم نہ ہونے کی وجہ سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس مضمون کا ماخذ مشہور ایرانی اہل قلم سعید نفیسی کا کتابچہ تاریخ ادبیات ایران ہے۔ کتابوں کے متعلق معلومات نگارندہ سطور کی ذاتی ہیں۔

محمد سردار علی

سالگرہ نمبر کی انعامی اسکیم

اس خاص نمبر کی نظمیں اور مضامین ایک گلدستے کی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں سے ہماری خواہش ہے کہ وہ اپنی اپنی رائے لکھ بھیجیں کہ کونسا علمی مضمون، کونسی نظم کونسا افسانہ یا ڈراما اور کس خاتون کی نظم یا مضمون بہتر ہے۔

اگر رایوں کافی تعداد میں وصول نہ ہوں تو ہم اس کے تصفیے کے لیے بعد میں ادیبوں اور شاعروں کی ایک حکم کمیٹی بناکر یہ کام اس کے سپرد کردیں گے۔ اس کے بعد نتیجے کا اعلان ہوگا۔ اس وقت تک کسی قسم کا استفسار بیکار ہے۔

غزل — غزل

لب پہ کیوں شکر کی جا شکوہ دلبر آیا
ہم نشیں کیا کہوں بیساختہ جی بھر آیا

ایک نالے میں بلا سے شب غم سے چھوٹے
جس کو دشوار تھا آنا وہ مکرر آیا

طالع خفتہ عاشق کا جگانا معلوم
سحر ایسا، تجھے کب چشم فسوں گر آیا

لے لیا رنج ہو راحت ہو الم ہو جو کچھ
جو بھی سرکار محبت سے میسر آیا

اشک میں خاصیت اخگر سوزاں پائی
تا مژہ آگ کلیجے میں لگا کر آیا

شکوہ جور و جفا اور زباں سے میری
مجھ کو حیرت ہے یقیں آپ کو کیونکر آیا

یہ تڑپ اور یہ تشویش یہ زاری کیسی
یاد یہ کون تجھے اے دل مضطر آیا

روز محشر وہ ہوئی بارش ابر رحمت
میرے حصے میں بھی جام مئے کوثر آیا

گرد کلفت مرے آئینہ دل سے نہ گئی
اشک بھی آنکھ میں آیا تو مکدر آیا

ہر قدم پر ادب آموز خرد تھی وحشت
میرا سایہ بھی مرے قد کے برابر آیا

چشم ظاہر ہی رہے دید سے محروم عزیز
وہ پری وش تو نظر خواب میں اکثر آیا

عزیز یار جنگ عزیز

کیوں نہ ہوں آخر مزاج حسن سے بیگانہ ہم
آپ اک راز مکمل اور اک افسانہ ہم

چاہتے ہیں یہ بدولے جرات رندانہ ہم
ڈالدیں آنکھوں میں آنکھیں انکی بیباکانہ ہم

یک بیک آجاتا ہے مے ریز آنکھوں کا خیال
چھوڑ دیتے ہیں لبوں تک لا کے یوں پیمانہ ہم

مصلحت مانع ہے ورنہ چیز کیا ہے رعب حسن
کہہ تو سکتے ہیں مگر کہتے نہیں افسانہ ہم

کر رہے ہیں یوں کمی محسوس ان کے روبرو
جیسے کھو بیٹھے خیال جرات رندانہ ہم

چاہتے ہیں آپ کے جلووں کی گھر میں روشنی
کیا جلا سکتے نہیں ورنہ چراغ خانہ ہم

دور تر ہے اب بھی وہ جلوہ حد ادراک سے
چھوڑ آئے دور نقش کعبہ و بتخانہ ہم

معترض دیکھیں کہ ہوتی ہے حقیقت بے نقاب
اب اٹھاتے ہیں حجاب جلوہ جانانہ ہم

وہ نہیں ملتے تو نخشب کاش یہ امکاں میں ہو
ترک ہی کر دیں خیال جلوہ جانانہ ہم

نخشب جارچوی

برسات

الاماں وہ موسم گرما کی حشر انگیزیاں
ذرہ ذرہ دہر کا منت کش فریاد تھا
بسکہ تھا پوری تمازت سے درخشاں آفتاب
مضمحل اعضا پریشاں قوتیں چہرے اداس
جل رہے تھے دھوپ کی تیزی سے دشت و کہسار

دفعتاً بدلا سماں چلنے لگی ٹھنڈی ہوا

چھا گئی ساری فضا پر دیکھتے ہی دیکھتے
مقدم سیلاب یا سرمایہ راہ حیات
ہاں مگر ہر قطرہ میں پنہاں تھا طوفانوں کا شور
سعی پیہم اس کی سیرت عزم راسخ اس کی خو
جستجوئے گوہر مقصود میں سرگرم کار
جرأتوں پر اس کی آوازے ہواؤں نے کسے
صبح کے جلوؤں میں رنگ آمیزیاں کرتا ہوا
ارتقائے ہستی موہوم کا ارماں لیے
ارتعاش برق کی لہروں سے ٹکراتا ہوا
بادہ جوش عمل پی کر چلا مستانہ وار
دیکھ کر قطرات کے جوش عمل کا اثر اک
ہل چلا ڈالے کسانوں نے زمیں پر بے گماں
پٹ گئے سب مخملیں روئیدگی سے سبزہ زار
لد گئیں گلہائے رنگارنگ سے سب ڈالیاں
متحد جب تک رہے قطرے گھٹا چھائی رہی
پھر نہ قطرہ ہی رہا باقی نہ وہ کالی گھٹا
ساز ہستی کے ہر اک نغمے میں ہیں شادیاں

ہر زبان پیکر خاکی تھی مصروف فغاں
لٹ رہی تھیں راحتیں ذوق سکوں برباد تھا
آرہا تھا لے کے ہر لمحہ پیام اضطراب
منتشر شیرازہ ہمت معطل تھے حواس
اٹھ رہے تھے صورت ذرات پانی سے بخار

گوشۂ مغرب سے پھر اٹھنے لگی کالی گھٹا

آرزوئے منزل مقصود پہلو میں لیے
چند قطروں کی جماعت کل تھی اس کی کائنات
انقلاب انگیزیاں پرجوش ہیجانوں کا شور
بیقراری اس کی طینت، اس کی فطرت جستجو
تھے عمل پیش نظر احساس منزل در کنار
اور امواج سمندر نے اڑائے قہقہے
شام کی رعنائیوں کو ضو فشاں کرتا ہوا
آسماں سے شورش و پیکار کا ساماں لیے
آندھیوں کے مست طوفانوں کو ٹھکراتا ہوا
مل گیا قطرے سے قطرہ رقص میں دیوانہ وار
خیر مقدم کے لیے اٹھنے لگے ذرات خاک
فصل کی رنگینیوں سے ڈھک گئیں سب کھیتیاں
جگمگا اٹھے بہار نو سے دشت و کہسار
لہلہا اٹھیں بہار حسن سے سب بالیاں
منتشر ہوتے ہی اک کو ہوا پھر لے اڑی
ختم آخر ہو گیا برسات کا سب ماجرا
قلب انساں میں اگر محمود ہوں بیداریاں

سید محمود ید الٰہی حیدرآبادی

مصور کا جنون

(آرنلڈ بنٹ کے مشہور ڈرامے ''دی گریٹ اڈونچر'' کو اپنایا گیا ہے)

افراد ڈرامہ

(۱) عبدالقیوم۔ مشہور مصور (۹) عاشق علی } دونوں بھائی
(۲) احتشام الدین مصور کا ملازم (۱۰) امداد علی
(۳) ڈاکٹر مدلیار۔ ایک مدراسی ڈاکٹر (۱۱) مصور جنگ۔ ایک نواب
(۴) محمد حسین۔ ڈاکٹر کا مددگار (۱۲) مس میرین... نرس
(۵) رحیم بخش ہراجی۔ مصور کا پچیرا بھائی (۱۳) رضیہ۔ بابا ہشنگ کی لڑکی
(۱۴) شہلا۔ عاشق اور امداد کی ماں
(۶) بدبا ہشنگ۔ ایک نیا دار بزرگ (۱۵) رشید مصور جنگ کا ملازم
(۷) محمد اکبر... نامہ نگار (۱۶) سیٹھ جی........
(۸) پاپنا... تصویر فروش (۱۷) ڈاکٹر کا ملازم........
(۱۸) ہوٹل کا چھوکرا۔ (۱۹) راما ملازم

پردہ پہلا

منظر (۱)

(ڈاکٹر مدلیار کا دواخانہ۔ ڈاکٹر مدراسی لباس میں بیٹھا ہے نرس سامنے کھڑی ہے)

ڈاکٹر۔ اَدّے میں اپنے کو اس واسطے بلا کو ہوں....

نرس۔ ڈاکٹر آپ نے اس جملے کو بار بار دہرایا مگر اب تک اصل مطلب نہ بیان کر سکے۔

ڈاکٹر (کھسیانے پن کے ساتھ) کیا اَپّے غصے میں آ کو ہیں....

نرس۔ غصے کی کیا بات آخر فرمایئے بھی کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ کوں۔ کیا سچ کوں۔

نرس۔ ہاں ہاں فرمایئے۔ آخر آپ نے مجھے بلایا کس غرض سے ہے۔

ڈاکٹر۔ اَدّے نرس اَمّاں اَپّے نیں بھوت اچھ چھ چھ

نرس۔ فرمایئے فرمایئے۔

ڈاکٹر۔ اَپّے اَپّے (اٹھ کر نرس کے قریب آتا ہے) اچھ چھ چھ (اس کا مددگار محمد حسین داخل ہوتا ہے) اچھا اچھا بھوت اچھا کام کرتیں۔

نرس۔ بس۔ بس۔ یہی۔ شکریہ! کیا میں جا سکتی ہوں۔

مددگار (نرس سے) جاؤ تم اپنا کام کرو (نرس جاتی ہے)
ڈاکٹر سے) آپ بلا وجہ بھی وقت خراب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ نیں رے محمد حسین۔ انیں نیں کل جو کام کری تھی سو کتّا اچھا تھا نا رے۔

مددگار۔ جی ہاں میں سب کچھ جانتا ہوں۔ خیر چھوڑیئے ان جھگڑوں کو۔ یہ بتایئے کہ آج جو بیمار آیا ہے اس کا آپریشن آج ہی کرینگے یا کل۔

ڈاکٹر۔ تو سچ بولنا رے پاکیب کرنا سو۔

مددگار۔ حالت تو خطرناک ہے۔ کل بھی کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ اچھا لے (قیوم پریشانی کے ساتھ داخل ہوتا ہے) کون وہ جی اَپّے۔ کیا پیشنٹ ہو کو ہیں۔

قیوم۔ میں نہیں ڈاکٹر صاحب۔ بیمار آپ کے مقابل والے مکان میں ہے حالت خطرناک ہے براہ مہربانی جلد چلیے۔

ڈاکٹر۔ اَی سامنے والے مکان میں کیا۔ پر سونچ آکو ہے نا۔ وہ تو فیمس آرٹسٹ گہیوم ہے نا رے با۔

قیوم۔ جلدی کیجیے۔ جلدی کیجیے۔

مددگار۔ ڈاکٹر آپ ان کے ساتھ جایئے میں ابھی آتا ہوں۔ (مددگار اندر جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ اچھا با، تو دوڑ کو بھاگ جائیں تیرے پیچھے اَپنیچ آتوں لے۔ (قیوم جاتا ہے)۔

منظر ۲

(عبدالقیوم کے مکان کا کمرہ۔ مصوری کے بہترین نمونے دیواروں

پر لٹک رہے ہیں۔ بوسیدہ کرسیاں، صوفے اور میز بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر رکھے ہوے ہیں۔ میزا ور تپائیوں پر چند خوبصورت سالم اور نصف مجسمے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ فن مصوری کے آلات اور رنگ کاری کا سامان بھی دھرا ہے۔ معمولی فرش پر قیوم کا مریض ملازم احتشام لیٹا ہوا ہے۔

چند صندوق بھی دھرے ہیں اور کھونٹیوں پر کپڑے لٹک رہے ہیں۔ کمرے کے پچھلے حصے میں دو دروازے ہیں جو مکان کے اندرونی حصے کا راستہ ہے۔ پہلا دروازہ دالان اور صدر دروازے کی طرف جاتا ہے

عبدالقیوم تیزی سے داخل ہوتا ہے)

احتشام۔ (کمزور آواز میں) کیوں حضور خیریت

قیوم۔ غالباً وہ آرہا ہے۔

احتشام۔ آنے بھی دیجے۔

قیوم۔ ارے کیا آنے بھی دو۔ غضب ہو گیا غضب۔ اس نے تو مجھے پہچان ہی لیا۔

احتشام۔ ہاں کیا اس نے آپ کو پہچان لیا۔

قیوم۔ بس یہی تو غضب ہو گیا (پریشان ٹہل رہا ہے) سن احتشام مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔

احتشام۔ وہ کیا حضور۔

قیوم۔ سن تو میرے بستر پر لیٹ جا۔ گویا تو قیوم اور میں احتشام۔ دیکھ اس ترکیب سے میں بچا رہوں گا۔ اٹھ اٹھ جلدی کر۔

احتشام۔ حضور بھلا آپ کو کون نہیں جانتا۔ جو یہ ترکیب چلے گی۔

قیوم۔ (چڑچڑے پن کے ساتھ) شش۔ بالکل نہیں گا۔ چل جلد جا اور میرے بستر پر لیٹا رہ۔

احتشام۔ مگر سرکار میں اور آپ کا بستر....

قیوم۔ (لاپروائی سے کہ ساتھ) یہ توقف کہیں کا۔ اس وقت میں اور تو کی کیا بحث ہے۔ چل اٹھ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر فوراً عمل کر۔ چل جلدی کر۔ (باہر سے گھنٹی کی آواز آتی ہے۔)

احتشام۔ حضور گھنٹی بج رہی ہے۔

قیوم (ترش روئی سے) میں بہرا نہیں ہوں سمجھا۔ میں جو کہہ رہا ہوں پہلے وہ تو کر (احتشام اٹھ کر بستر کی طرف اور ادھر قیوم باہر جاتا ہے۔ احتشام کھانستا اور کراہتا بلانکٹ اوڑھے لیٹا ہوا ہے۔ قیوم ڈاکٹر کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کے گلے میں استیتھاسکوپ اور ہاتھ میں دواکا بیگ ہے)

ڈاکٹر (کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا کر اور بیمار کی طرف دیکھ کر) کیا رے یا پیشنٹ ہے کیا؟ (بیمار کے پلنگ کی طرف جاتے ہیں۔ ڈاکٹر پہلے بیمار کی نبض دیکھتا اس کے بعد جیب سے حرارت پیما نکال کر صاف کرتا اور جھک کر بیمار کی طرف بڑھاتا ہے) کی سورے با تو ایسا مونہہ کو ہے۔ یہ لے۔ یہ مونہہ میں گھسیڑ لے کو رکھ۔ (حرارت پیما منہ میں رکھتا ہے۔ آدھ منٹ منٹ کے وقفے سے گھڑی دیکھ کر حرارت پیما نکال کر دیکھتا ہے۔ اس کے بعد قیوم کی طرف پلٹ کر آہستہ سے دریافت کرتا ہے) ٹمپریچر کا یہہ سلسلیا کتنے دناں سے ہو کو ہے۔

قیوم۔ آج ہی سے۔ شام شام تک طبیعت ٹھیک تھی۔ تقریباً چھ بجے سے یہہ سلسلہ شروع ہوا اور یکدم مزاج خراب ہو گیا۔ میرے خیال میں یہہ زیادہ تھکن کی وجہ سے ہوگا۔ اس لیے کہ ہم پشاور سے مسلسل سفر کے بعد حال ہی میں یہاں آئے ہیں۔

ڈاکٹر۔ ٹمپریچر ایک سو چار پوائنٹ دو اور نبض کی حرکت ۱۴۰ ہونے کے علاوہ.... بہوت ویک ہے سینے کے تو یہہ آثار نئیں دسیں۔ اچھا رے با۔ اتو کھنت

کچھ گرم پانی ہونا نا۔

قیوم (پریشانی کے ساتھ) کیوں کس لیے۔

ڈاکٹر۔ کیا کہتا ہے سُور سے وہ علاج کرنے کو معلوم نیں کیا تجے۔

قیوم (مایوسی کے ساتھ) مگر اس وقت گرم پانی کہاں سے ملے گا۔ ہمارے پاس سوائے (ایک اسپرٹ لیمپ کو بتاتے ہوے) اس اسپرٹ لیمپ کے اور کوئی چیز موجود نہیں۔

ڈاکٹر۔ کیا رے وہ اپنے باوز میں کوئی بیکال نیں سا ہے کیا۔

قیوم۔ (ایک خاص انداز میں سوچتے ہوے) یہ بیکال کیا بلا ہے۔

ڈاکٹر۔ اجی تو بیچ فیملس نیں بولتے بیکال بیکال۔

قیوم۔ او ہو۔ یہاں کوئی عورت نہیں۔

ڈاکٹر۔ نیں ہے۔ اچھا نیں تو نیں لے کوئی مجا کھے کی بات نیں۔ میں اپنے باوز کو جاکو ہاٹ واٹر لا کے توں (احتشام سے) اپے جرتاں کچھ بھی پکر کر کو کرو۔ میں ابیچ واپس آتوں۔ بھوت جلدی اپنی طبیعت ہلکی ہو کو جائیں گی۔ (قیوم سے دروازے کے پاس جاکر) دیکھ رے بابا اپنے ماسٹر کو اچھی طرح اُوڑا کو رکھنا کیوں سمجھ کو ہے نا (قیوم ڈاکٹر کو تیوری چڑھا کر دیکھتا ہے ڈاکٹر چلا جاتا ہے)

قیوم۔ (احتشام کے قریب آکر ہنستے ہوے) کیوں ترکیب کیسے کارگر ہوئی وہ تو مجھے قیوم سمجھ رہا ہے۔

احتشام۔ لیکن حضور۔

قیوم۔ خیر اچھا ہی ہوا۔ اس گمنامی کے باعث کم از کم مجھے عوام سے ذرا نجات مل جائے گی۔

احتشام۔ یہ تو ٹھیک ہے..... لیکن..... لیکن...

قیوم۔ کہتا کیوں نہیں۔ آخر کیا بکنا چاہتا ہے۔

احتشام (رکتے ہوے) اجی حضور۔ پرسوں میں نے ایک نوجوان عورت سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ شاید وہ آج یہاں آئے گی۔

قیوم۔ تو بڑا بدمعاش ہے۔ اس واسطے مجھے ہر روز جلد سو جانے کے لیے کہتا تھا۔ اب تو ہی بتا کہ اگر وہ جوان عورت آ جائے تو میں اس سے کیا گفتگو کروں (احتشام کمزوری کا اظہار کرتا ہے۔ ڈاکٹر ایک جگ میں پانی لیکر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر (قیوم سے) کیوں میں جلدیچ واپس ہو کے ہوں نا اچھا رے ایک گلاس کولڈ واٹر لے کو آنا (قیوم بازو سے گلاس بھر پانی دیتا ہے۔ ڈاکٹر گلاس اپنے ہاتھ میں لے کر احتشام سے) آپ تے اِتّا واٹر پی لیو نا (قیوم اور ڈاکٹر احتشام کو سیدھا کر کے پانی پلاتے اور لٹا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر قیوم سے) ایک چھوٹی پلیٹ ہے تو دینا رے بابا۔ (ڈاکٹر جیب سے ڈبیہ نکال کر ایک قرص تشتری میں رکھ کر تھوڑا سا پانی ڈالتا ہے قرص کے گھلنے کے بعد تشتری قیوم کے ہاتھ میں دیکر جیب سے پچکاری نکال کر پچکاری گرم پانی سے صاف کرتا ہے اس کے بعد پچکاری میں تشتری کی دوا کھینچ لیتا ہے)

قیوم (پریشانی کے ساتھ) آخر مرض کیا ہے۔

ڈاکٹر۔ تو بیچ رے۔ نمونیا کتے سو (بیمار کا سیدھا ہاتھ پکڑ کو) آستیناں چڑھا رے بابا (قیوم احتشام کے آستین چڑھاتا ہے۔ ڈاکٹر روئی اسپرٹ میں بھگا کر ڈنڈ صاف کرتا اور بعد میں انجکشن دیتا ہے) اب اپنے ہاتھ رکھد یو جرت۔

(باہر کچھ گڑبڑ کی آواز آتی ہے)

قیوم (پریشانی کے ساتھ احتشام کی طرف دیکھ کر) باہر کسی کی آواز آرہی ہے۔

ڈاکٹر۔ آپ تے اطمینان سے رہو۔ کوئی بی نیں ہے ییں

اپنے اسسٹنٹ کو پولٹس گیرا کا سامان لانے کو بولیا تھا۔ اس کے سوا اور کون اُجڑتا ہو رہے (ڈاکٹر کا مددگار محمد حسین سامان لے کر داخل ہوتا ہے) کی رے بائی دیر لگا کو بہتے ہو۔

محمد حسین۔ کیا مضایقہ (ڈاکٹر کو دیکھ کر) یہ بیمار اور اس تکلیف کے عالم میں لیٹا رہے ہے۔

ڈاکٹر۔ ہورے جب سے میں بھی ہیچ سوچ کو ہوں (قیوم سے) دیکھو رے باصاب کا بڈگاں رکھ کو ہے۔

قیوم۔ (کونے کی طرف بتا کر) جی ادھر ہے۔

ڈاکٹر۔ (مددگار سے) اچھا تو ادرارے باکبوں کی پشینٹ کو پہلے بڈ پو اٹھا دیکو رہیں گے (قیوم سے) کیوں بڈ تیار ہی ہو کو ہے نا۔

قیوم۔ وہ تیار کر ہی رہے تھے (پریشان ہوتا ہے)

ڈاکٹر (تعجب سے) کیا رے وہ کہتا ہے ہو۔ کون اُنوں تیار کرنے کو۔ اُنوں تیرے اجمان نیں کیا رے کیا باناں کرتا سے ہو۔

قیوم (نباہنے کی کوشش کرتے ہوئے) جی ہاں۔ بستر تیار ہونے کے بعد وہ خود بھی درست کر لیا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ (مددگار سے) اوے محمد حسین وہ کار نرکا پیس تو اچھا ہیچ ہوں گا نا۔ (یہ کہہ کر دونوں مل کر احتشام کو اٹھا کر بستر پر لے جا کر لٹا دیتے اور بلانکٹ وغیرہ اچھی طرح اوڑھا دیتے ہیں۔ اس عرصے تک قیوم ادھر سے ادھر پریشان ٹہل رہا ہے۔ جب یہ دونوں پولٹس وغیرہ باندھ کر فارغ ہو گئے تب قیوم ان سے پوچھتا ہے)

قیوم۔ کیا میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر (ایک کرسی کو بتا کر) وہ دیکھتے تو بستاہے نا۔

قیوم۔ کیوں نہیں۔

ڈاکٹر۔ تو بس تو وھاں جا کو امرہا تو چپکے سے بیٹھ کو رہ۔ بھلا سمجھا نا۔ اِدیکھ ہمیں نرس کو بھیج دیتی۔ اُنے آکو سب کو پچ کر دیں گی۔ سمجھ کو ہے نا رے ہڑلی سے (قیوم گھور کر دیکھتا ہے) چوپ کیتے کی نا دکیا گھرتا ہے سو (دونوں جاتے ہیں)

منظر ۴

(قیوم کمرے میں بیٹھا ہے۔ گھنٹی بجتی ہے۔ قیوم جا کر دروازہ کھولتا ہے۔ نرس معہ بیگ داخل ہوتی ہے)

نرس۔ (داخل ہوتے ہوئے) کیا میں آسکتی ہوں۔

قیوم۔ ضرور شاید آپ کو ڈاکٹر صاحب نے بھجوایا ہے۔

نرس۔ جی ہاں۔ مگر میں تو یوں بھی آنے والی تھی۔

قیوم (پریشانی سے) اس کا آپ کا مطلب (نرس بیگ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

نرس۔ پہلے یہ بتاؤ کہ احتشام الدین آپ ہی ہیں نا۔

قیوم۔ یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

نرس (ہنستے ہوئے) یہ بھی خوب۔ اجی بھلے آدمی ڈاکٹر نے مجھے اس مکان میں جانے کے لیے تاکید کرتے وقت یہ کہا کہ ذرا دیکھ سنبھل کر تیمار داری کرنا۔ اس لیے کہ مشہور مصور محمد عبد القیوم پہلے سے نازک مزاج ہیں۔ بیماری نے تو انہیں اور بھی چڑچڑا کر دیا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ موجود ہیں۔ میں آپ کی مدد سے خدمت انجام دوں۔ غالباً احتشام آپ ہی ہیں۔

قیوم۔ جی جی۔ جی ہاں۔

نرس۔ تو پھر آپ اجنبیت کیوں برت رہے ہیں۔

قیوم۔ جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ آپ کا گھر ہے۔

نرس۔ خیر آج نہ سہی۔ کل تو ہو ہی جائے گا۔

قیوم بہت خوب! کیا ڈاکٹر نے آپ کو تیمار داری کے لیے بھیجا ہے۔؟

نرس۔ میں اس کو بہتر جانتی ہوں۔ یہ آپ پہلو تہی کیوں

کر رہے ہیں۔

قیوم۔ پہلو تہی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

نرس۔ بس میں بھی تو یہی چاہتی ہوں (ایک ملازم تیزی سے داخل ہوتا ہے)

ملازم۔ میم صاحب میم صاحب ایک بہت بڑا بیمار آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فوراً آ جاؤ بول رہے ہیں۔

نرس۔ (بیگ اٹھا کر) خیر پھر ملاقات ہو گی۔ (جاتی ہیں)

قیوم۔ (ہاتھ ملتے ہوئے) آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔

منظر ۴

(رستہ۔ ڈاکٹر صاحب نرس سے ساتھ باتیں کرتے کھڑے ہیں)

ڈاکٹر۔ اپنی ڈیزیز بھوت بڑھ گو ہے

نرس۔ آپ زبردستی بھی مجھے بیمار بنا رہے ہیں۔ حالانکہ میں اچھی ہوں۔

ڈاکٹر۔ ٹم اپنے کو سمجھ میں پڑا ہے۔ میں سمجھ کو ہوں۔

نرس۔ مگر مجھے تو کوئی مرض نہیں۔

ڈاکٹر۔ میں ڈاکٹر پہنچ کے ہوں

نرس۔ آپ نے کیسے پہچانا۔

ڈاکٹر۔ تمہارا فیس دیکھتے پکڑ لیا۔ کیوں ٹھیک نا۔

نرس۔ میں سمجھتی ہوں میرا چہرہ بھی تر و تازہ ہے۔

ڈاکٹر۔ چھی چھی چھی۔ ایسا مسٹیک نکو کرو۔ ڈیزیز پیچھے اور ہلو سے بڑ جائیں گا۔

نرس۔ آخر مجھے مرض کیا ہے۔ پہلے سے کوئی شکایت نہیں۔ میں اچھی خاصی ہوں۔

ڈاکٹر۔ ارے لاسٹ ایئر تمہیں سفر نیں کرتے تھے۔

نرس۔ معمولی بیماری تھی۔ آپ نے علاج کیا ہی اسی وقت اچھی ہو گئی۔ اور اب تک کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر۔ ہمیں سیول سرجن ہو گو ہیں۔ کیا گورنمنٹ سرجن جھوٹ بولیں گے۔ چھی چھی چھی۔

نرس۔ میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں مگر مہربانی فرما کر شکایت تو بیان کیجیے۔

ڈاکٹر۔ ادّے مرض بھوت بڑھ گو ہے جی (مددگار داخل ہوتا ہے ان کو دیکھ کر جھجکنے سے وہیں کھڑا رہتا ہے) اچھا علاج کرا لیتے

نرس۔ میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں جو بھی مرض ہو تشخیص کیجیے اور نسخہ لکھ دیجیے۔

ڈاکٹر۔ چھی چھی چھی۔ ابھی کیا لکھنا ہو وہ۔ آج نائٹ ہمارے روم کو آؤ وہاں دیکھ کو دیں گے۔

نرس۔ اب آپ کو کیا کام ہے۔

ڈاکٹر۔ ایک پیشنٹ کو اٹنڈ کرنے کو ٹمیں نائٹ کو آونا اچھا۔ (پلٹتا ہے مددگار کو دیکھ کر پریشانی سے) تمیں آ گئے محمد حسین۔

مددگار۔ جی ہاں۔

ڈاکٹر۔ میں بھی وہاں ہیچ آرا تھا۔ کیوں پیشنٹ اب کیسا ہو گو ہے۔

مددگار۔ اس وقت تو آرام ہے۔ اب سو رہا ہے کیا اب آپ چلیں گے۔ (ڈاکٹر منڈی ہلا کر مددگار کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ دونوں چلے جاتے ہیں)

نرس (پریشانی سے اپنے چہرے آنکھ، ناک، ہاتھ پاؤں، دل وغیرہ کو بار بار چھو کر) تعجب ہے مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ مگر ڈاکٹر کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ وہ کیوں جھوٹ بولنے چلا۔ اس کو مجھ سے زیادہ ہمدردی ہے۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے

ممکن ہے کوئی ایسی بات ہو۔ بہر حال میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ (چلی جاتی ہے)

منظر ۳

[احتشام کا کمرہ۔ قیوم ہاتھ ملتے ٹہل رہا ہے]

قیوم۔ میں حیرت میں ہوں کہ اس کی گفتگو کیسی تھی داروغی

احتشام۔ کس کی حضور۔

قیوم۔ نرس کی۔ مگر مجھے تو کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے (دروازے میں کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر (دروازے میں داخل ہوتے ہوئے محمد حسین سے جو ابھی قیوم کی نظروں سے پرے ہے) اکی سوجی وہ محمد حسین ہمیں نرس کو اطلاع دیکو بیج ہیں۔ انہیں اب تلک نیں آکو ہے نا۔ (محمد حسین مددگار بھی اندر داخل ہو جاتا ہے ہاتھ میں بیگ ہے)

مددگار۔ ممکن ہے کوئی خاص مصروفیت ہو گی۔ ورنہ وہ مقررہ وقت پر آجاتی (قیوم آگے آتا ہے)

ڈاکٹر۔ اچھا تو لیو اُس کو بھاڑ میںج جانے دیو بمنیج شروع کر دیں گے (اپنا بیگ کھول کر سامان نکالتا اور پچکاری وغیرہ صاف کرتا ہے)

مددگار۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ (اسپرٹ لیمپ نکال کر سلگاتا ہے)

ڈاکٹر۔ یہہ ہمنا معلومیج ہے۔ تمے کیئے ہیں کیا رے با۔ کیا میں تماشا دیکیتا رہوں گا۔ لے کیا ٹھٹھا کرتا سو۔ اب بمنیج کر دیں گے۔

قیوم۔ کون اہم کام ہے۔ اس میں نرس کی ضرورت ہی کیا۔

ڈاکٹر۔ کیسے باتاں کرتا سو رے تو جہ ورت نیں تو گیکو نرس سے مشغوریاں مذاقیاں کرنے کو بلائیں کیا کی چل رے ہیڑلی کا کہیں کا۔

قیوم۔ (گھبرا کر) جی نہیں۔ مجھے کیوں اعتراض ہونے چلا۔ میری تو یہہ آرزو ہے کہ ان کا علاج بہتر سے بہتر طریقے پر ہو۔ مگر حسب حیثیت.... (فوراً پریشان ہوتا ہے)

ڈاکٹر۔ (تعجب سے) کیا کیا سو رے وہ۔ بولتو جرا صیحیت سے تیرا کیا مطلب ہے سو رے با۔

قیوم (زیادہ پشیمان ہو کر) جی نہیں کچھ بھی نہیں۔ جلدی میں زبان سے غلط لفظ نکل گیا۔ میرا مقصد حسب حیثیت نہ تھا۔

ڈاکٹر۔ (پچکاری صاف کرتے ہوئے) ہاں لے اب میں آرڑکو ہوں۔ تیرا سرغونیس بول کو ہے شات

قیوم۔ جی ہاں۔ آپ دیکھ رہے ہیں میں کس قدر پریشان ہوں۔ میرا دماغ بہت ہی کمزور اور حافظہ تو بلکل بیکار ہو گیا ہے۔ اور اس وقت واقعی سر میں درد بھی ہے۔

ڈاکٹر (وہیں کھڑے کھڑے احتشام پر ایک نظر ڈال کر) آدمے قیوم صاب کچھ رُسے رُسے دس رین۔

قیوم۔ جی ہاں بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔ شروع سے یہی حالت ہے۔ جب سے میں جانتا ہوں سب ان کی یہی حالت ہے۔ آپ کو بھی یاد ہو گا جب آپ نے ان کی پہلی تصویر بڑی نمایش میں دیکھی تھی۔ وہ ایک معمولی بات پر کیسے بگڑ بیٹھے تھے۔ کیوں وہ تصویر تو آپ کو یاد ہے نا؟

ڈاکٹر (پچکاری ایک ہاتھ میں پکڑ کر کچھ غور کے بعد) نیں رے بابنجے تو کچھ بی یاد نیں سے لے۔

قیوم۔ تعجب ہے کہ اتنی مشہور تصویر آپ کو یاد نہیں رہی۔ پولیس والا سیٹی بجا رہا ہے۔ کیوں اب یاد آگیا۔

ڈاکٹر (سر کھجا کر) اینچ کیا نوا سر اٹھا کر) اونہہ نوئینگا

لے (پچکاری دھو کر دوا وغیرہ نکالتا ہے)
قیوم۔ خوب! آپ جانتے ہیں کہ اس شخص نے یہہ تصویر کس محنت سے بنائی تھی۔
ڈاکٹر۔ کون کیا تمارے آکھا عبد القیوم۔
قیوم۔ ایں (سنبھل کر) جی ہاں! جناب قد آدم تصویر کا بنانا کوئی کھیل نہیں اور وہ بھی ایک پولیس والے کو سیٹی بجاتے ہوے ظاہر کرنا۔ ہاں مگر اس میں ذرا سی خرابی ضرور تھی۔
مددگار۔ نہیں۔ اس تصویر میں کوئی خرابی نہ تھی۔ وہ تو بڑی بانکی تصویر تھی۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ دیکھا ہے۔
قیوم۔ واہ یہہ بھی خوب اتنی بڑی تصویر پر نظر دوڑانے کے بعد بھی آپ اس کی خامی معلوم نہ کر سکے۔ شاید آپ نے اس کو غائر نظر سے نہیں دیکھا۔
مددگار۔ تم یہہ کیا مہملات بک رہے ہو۔
قیوم۔ (کھسیانی ہنسی کے ساتھ اپنی گفتگو کا جاری رکھتے ہوے) وہ بڑے موقع شناس آدمی ہیں عوام کا رجحان دیکھ کر کام کرتے ہیں میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ بغیر مال و دولت کے انہوں نے کیسے نام کما لیا۔
مددگار۔ دولت کے بغیر؟۔ وہ تو بڑے دولت مند ہوں گے۔ میں ان کی تصویروں کی خرید و فروخت کے پورے حالات سے واقف ہوں۔ چنانچے مجھے اس کا علم بھی ہے کہ اس پولیس والے کی تصویر مصور الدولہ نے گذشتہ سال دس ہزار روپے میں خریدی تھی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟
قیوم۔ نہیں نہیں۔ مصور الدولہ نہیں بلکہ عتاب یار جنگ نے خریدی تھی۔
ڈاکٹر۔ عتاب یار جنگ کون ہے سور ہے وہ۔
قیوم۔ اجی وہی۔ بسمت نگر کا بڑا رئیس۔
ڈاکٹر۔ آئی۔ ایچ کیا سو۔ سچی سچی۔ وہ تو میرا بھی یار رہو کو ہے۔ (پچکاری میں دوا بھرتا ہے)
قیوم۔ ہاں وہی آپ کے یار (بیمار کو پچکاری دیجاتی ہے۔ اس کے بعد سامان بیگ میں رکھتے ہیں)
قیوم (سگریٹ کیس نکال کر ڈاکٹر کے سامنے پیش کرتا ہے) سگریٹ۔
ڈاکٹر۔ (بیگ بند کرتے ہوے انگور سے با ہمنا کو۔
قیوم۔ (مددگار کے سامنے پیش کرتے ہوے) لیجے۔
مددگار۔ (کیس کو غور سے دیکھ کر) کیس تو بڑا شاندار ہے۔ یہہ تو تمہارے صاحب کا معلوم ہوتا ہے۔ (سگریٹ لیتا ہے)
قیوم (کھسیانے پن کے ساتھ) ہاں ہاں۔ آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔ یہہ کیس انہوں نے مجھے دیدیا ہے۔ وہ آے دن مجھے کچھ نہ کچھ دیتے رہتے ہیں (واسکوٹ کو بتا کر) یہہ واسکوٹ بھی انہیں کا عطا کردہ ہے اور قیمتی قیمتی سوٹ بھی دے رکھے ہیں۔ (قیوم مددگار کا سگریٹ سلگا کر اپنا سگریٹ بھی سلگاتا ہے)
مددگار۔ تب تو تم بڑے خوش قسمت انسان ہو۔
قیوم۔ جی ہاں ہم دونوں آپس میں بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں۔
مددگار۔ یہہ بھی خوب! (دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)
قیوم۔ وہ بہت سخی آدمی ہیں۔
ڈاکٹر۔ ہوں گا سے چپ کے بی ہو۔
قیوم۔ ڈاکٹر صاحب ابھی تک حالت نازک تو نہیں ہوئی نا
ڈاکٹر۔ کچھ بی نیں سے۔ ٹر ٹر نکو کر دبک کو کونیاں میں جا سمجھ کو سے کچھ۔
قیوم۔ جی ہاں۔
مددگار۔ کیوں کیا حال ہے۔

ڈاکٹر۔ ہے لے کیا کتنا کی رات گذری تو دھکیں گے۔ چل اٹھ اب اپن گھر کو جائیں گے چل۔

قیوم۔ (پریشانی سے) لیکن لیکن جناب۔

مددگار۔ کیا لیکن ویکن لگا ئے ہو۔ خاموش بھی ہو۔

ڈاکٹر۔ ارے چلتا نیں کیا رے وہ۔ (دونوں جاتے ہیں)

قیوم۔ مگر جناب عالی (مددگار پلٹ کر دیکھتا ہے) ایک سخت بیمار کے ساتھ رات گذارنا نہایت مشکل امر ہے۔

مددگار۔ کوئی مضایقے کی بات نہیں۔ اچھی طرح دیکھ بھال کرو (جاتے ہیں۔ قیوم پریشانی کے ساتھ ٹہلتا ہے)۔

(باقی) آوارا (عثمانیہ)

ہندوستان ہمارا

(تضمین برترانۂ ہندی)

ہم ہند کے ہیں تارے یہہ آسماں ہمارا
ہم پھول اس چمن کے یہہ بوستاں ہمارا
دلکش و دلربا ہے آرام جاں ہمارا
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہہ گلستاں ہمارا

حب وطن کا ہر دم ہے خوں رواں بدن میں
اس پر نثار ہوئیں یہہ آرزو ہے من میں
کوہسار کا سفر ہو یا ہو قیام بن میں
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

اچھا یہاں کا گرما دلکش یہاں کا سرما
ہر جا سے ہے نرالا موسم یہاں کا برکھا
شاداب وادیاں ہیں شفاف سارے دریا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

ہاں وہ پہاڑ اونچا ہے ہند کا نگہباں
پانی کا اک خزانہ اس پر وہ برف تاباں
گنگا کا روپ اس سے جمنا بنی پرستاں
گودی میں کھیلتی ہیں جس کے ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جس کے دم سے رشک جناں ہمارا

اے آسماں کے تارو اے ہند کے پہاڑو!
بھولی ہوئی کہانی سب کو ذرا سنادو!
یاں حکمراں تھے ہم بھی کیوں بھول تم گئے ہو
اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا تیرے کنارے جب کارواں ہمارا

یہہ سرزمیں ہنس کر کہتی ہے آسماں سے
کتنے مٹے ممالک اس گردش زماں سے
باغ و بہار جو تھے اجڑے وہ سب خزاں سے
یونان مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

مغرب کی بستیاں بھی اب مٹ گئی ہیں ساری
تاراج ہو رہا ہے مشرق کی اب ہے باری
آباد ہے ہماری بستی یہہ پیاری پیاری
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

یاد نسیم کی جا صرصر ہے گلستاں میں
دنیا کی کل بہاریں کیسی لٹیں خزاں میں
جو تھے رفیق اپنے سب جا بسے جناں میں
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

وحیدہ خاتون نسیم

بیوہ اور برسات

چھائی ہوئی ہے تیرگی، اپسیہ پپینہ کی ہے جھڑی
رات کٹے گی کس طرح حشر نما ہے ہر گھڑی
دیکھتی ہے سوئے فلک ہائے ترس ترس کے آنکھ
اور مجھے ڈبوئے گی آج برس برس کے آنکھ
گریہ بے اثر مرا اپنا اثر دکھائے کیا
دل کی لگی بجھائے کیا دل کی لگی بجھائے کیا
آج یہ ابر کی گرج خوب رلائے گی مجھے
لوں گی ہزار کروٹیں نیند نہ آئے گی مجھے
سینے میں دل کباب ہے مجھ سے ہو صبر کس طرح
ایک بلا شباب ہے مجھ سے ہو جبر کس طرح
کوندرہی ہیں بجلیاں ابر کا زور شور ہے
میں ہوں کہ بیقرار ہوں تم ہو کہ خواب کو رہے
میں نے سہے ہیں ولولے دکھ عمر کٹے گی یاس میں
طبع کو انتشار ہے اور خلل حواس میں
ضبط کہاں سے لاؤں میں سرد ہوا کو دیکھ کر
جان پہ ہے بنی ہوئی شب کی فضا کو دیکھ کر
برق کی تیغ ہے ستم سینہ فگار کیوں نہ ہو
زخم جگر ہرے ہوئے یاد بہار کیوں نہ ہو
رات کی بات یاد ہے رات کا پیار یاد ہے
نیند بھری وہ چشم مست اس کا خمار یاد ہے
ہے یہ جنازہ شباب یا کہ مرا پلنگ ہے
آہ انہیں خبر نہیں جان سے کوئی تنگ ہے
کیسی وہ خوش نصیب ہیں راج ہے اور سہاگ ہے
موتیوں سے بھری ہے مانگ رنگ ہے اور راگ ہے
کیسی وہ خوش نصیب ہیں جن کے لیے سنگار ہے
آہ مرا شباب جس رنج سے ہم کنار ہے
کوک رہی ہیں کوئلیں جھوم رہی ہیں ڈالیاں
پاپی پپیہا اس طرف بول رہا ہے "پی کہاں"
پی ہے کہاں بتاؤں کیا قصہ غم سناؤں کیا
موت بھی راہبر نہیں پی کا سراغ پاؤں کیا
اف یہ کلیجے کی دھڑک ہائے یہ آہ و زاریاں
خلق ہے میٹھی نیند میں مجھ کو ہیں بیقراریاں
جوش ہے پائمال غم پست ہیں جی کے حوصلے
رسم و رواج کا اثر مٹ رہا ہے ولولے

ثاقب (کانپوری)

معراج تصور

کب سے جگر فگار ہے لے جان آرزو
گریاں ہے کب سے میری نگاہوں کی جستجو
شعلے دہک اٹھے ہیں فضا میں بہار کے
ڈستے ہیں دل کو آہ یہ دن انتظار کے
بہتے ہیں اشک صبح کی پہلی کرن کے ساتھ
وابستگی نہیں ہے کسی انجمن کے ساتھ
سینے میں یاد عشرت ماضی کے داغ ہیں
اجڑے ہوئے دیار میں جلتے چراغ ہیں
یہ جوش اضطراب میں ڈوبی ہوئی نظر
الفت کا راز فاش نہ کردے یہ چشم تر
کمبخت دل کو آہ میں سمجھاؤں کس طرح
اس کشمکش سے ہائے اماں پاؤں کس طرح
ہر لحظہ ایک جلوہ رنگیں ہے سامنے
لایا کہاں تصور عالی مقام نے
یہ بھی یقیں نہیں کہ جدا ہوگئے ہو تم
نظروں سے چھپ کے میرے خدا ہوگئے ہو تم

رشید احمد (عثمانیہ)

چاند تاروں بھری رات اور شاعر

رات وہ بھی چاندنی رات اور پھر شاعر کی رات
ہر طرف جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی کائنات
چھٹکی چھٹکی چاندنی اور ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوا
دل میں وجد و کیف کا ہر لحظہ طوفاں تھا بپا
چپہ چپہ سے رہا تھا دعوت ذوق نظر
ذرہ ذرہ تھا زمیں تا آسماں رشک قمر
ایک نامعلوم احساس تمنا دل میں تھا
اک اضافی اور عنصر جیسے آب و گل میں تھا
فطرت رنگیں تھی خود صورت گر نقش خیال
ہر نگاہ شوق تھی آسودۂ حسن و جمال
کائنات حسن رقصاں تھی نظر کے ساتھ ساتھ
ہستی شاعر تھی گردش میں قمر کے ساتھ ساتھ
راز فطرت اب نہ تھا پنہاں حجاب راز میں
سب کچھ آتا تھا نظر چشم ستارہ ساز میں
سایہ افگن سر پہ تھی تاروں بھری پرنم فضا
دور ہی سے حسن فطرت دل میں جاتا تھا کھبا
ایک تصویر خیالی زینت آغوش تھی
دل سے تھی نزدیک آنکھوں سے مگر روپوش تھی
دل کو تھا احساس جس کے حسن جاں افروز کا
ساز فطرت میں تھا اک نغمہ جگر کے سوز کا
شاعر فطرت ہوا نغمہ طراز زندگی
اس کا ہر ہر شعر تھا تفسیر راز زندگی
ہر نفس ڈوبا ہوا جذبات کی آواز میں
ہر صدا جس کی ترنم بن گئی خود ساز میں
ہر طرف تھا پیکر حسن مجسم جلوہ ساز
غرق تھا جلووں میں جب کے شاعر نغمہ طراز
چاند کس کا، رات کیسی، شاعر خوش کام کیا
ہر لباس ناز میں فطرت تھی خود جلوہ نما
خالق و مخلوق کا تھا ارتباط باہمی ٭ عشق میں بھی ہے افقر اک مقام بندگی

افقر موہانی وارثی

گیت

تیری یاد میں دنیا چھوڑی — آس لگن، سنسار سے توڑی
ٹوٹی بنسی رو رو جوڑی — جگ میں پھیلی پریم پکار
آن ملو اک بار
پریتم
آن ملو اک بار

تیرے عشق نے پھونکی ہستی — بھول گئی سب حسن کی مستی
جوگن بن گئی چھوڑ کے بستی — ڈھونڈوں جنگل پربت غار
آن ملو اک بار
پریتم
آن ملو اک بار

سونی جھیلیں اجڑے ساحل — وادی وادی جنگل جنگل
راہ ڈھونڈھ چکی جل تھل — تیرے عشق نے کی لاچار
آن ملو اک بار
پریتم
آن ملو اک بار

میں دکھیاری ہیت کی ماری — پریم کے چشمے آنکھ سے جاری
دل میں ہر دم یاد تمہاری — عشق میں ڈوبے روح کے تار
آن ملو اک بار
پریتم
آن ملو اک بار

کالی رات گھٹا گھنگھور — من میں چمکے عشق کا نور
درد بھرے دن رات سے دور — ڈھونڈوں ایک نیا سنسار
آن ملو اک بار
پریتم
آن ملو اک بار

کیف اسرائیلی

ادبی چٹخارے

ہمارے ملک میں ایسے بہت سے بزرگ گذرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اور بات چیت میں ہزاروں دلچسپ باتیں کہی اور لکھی ہیں۔ بعض کا تو یہ حال ہے کہ آج ان کی شہرت ان کے اشعار یا کتابوں سے زیادہ ان کی بات چیت لطیفوں، چٹکلوں اور ان کی زندہ دلی سے ہے۔ گذرے ہوئے زمانے میں ہندستانی شاعری میں ہجو کا بہت رواج تھا...... اتنا رواج کہ ہر وہ شخص جو زمانے کے ہاتھوں ستایا ہوا ہوتا اور جس میں مصرع سیدھے کرنے کی ذرا بھی قابلیت ہوتی۔ دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے ہجو کا رخ کرتا اور صفحے کے صفحے کالے کرتا۔ اگر طبیعت میں مناسبت، ظرافت اور شوخی ہوتی تو ہجو اتنی مزے دار ہو جاتی کہ ہر شخص تفریح، مذاق اور دل لگی کے لیے بھی پڑھتا اور لطف اٹھاتا۔ یہی وجہ ہے کہ میر جعفر زٹلی (سنہ ۱۶۵۹ء تا سنہ ۱۷۱۳ء) کا نام آج بہت سے لوگوں کی زبان پر ہے۔ اس نے کئی لوگوں کے متعلق ایسی ہجویں لکھی ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے اور بہت سے مخالفوں پر ایسی پھبتیاں کسی ہیں کہ وہ ہنسی اور قہقہوں کا نشانہ بن گئے۔ آخر میں اس کی ہزل اور ہجو رنگ لائی اور وہ بادشاہ فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

ان لوگوں میں جنہوں نے ہجو نگاری کو ایک مستقل فن کی حیثیت دی۔ مرزا محمد رفیع سودا (سنہ ۱۷۱۳ء تا سنہ ۱۷۸۱ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دلی میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ لیکن جب شہر نادر شاہ، احمد شاہ اور مرہٹوں کے حملوں سے ویران ہو گیا تو پہلے فرخ آباد گئے۔ پھر فیض آباد کا رخ کیا اور آخر میں نواب آصف الدولہ کے ساتھ لکھنو پہنچے اور وہیں مر کر اٹھے۔ مرزا اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہجو کو تمام لوازمات کے ساتھ استعمال کیا اور اسے شاعری کی ایک صنف بنا دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس فن سے فطری لگاؤ تھا انہوں نے جس طنز اور ظرافت کے لباس میں خیالات ادا کیے ہیں وہ گدگدی اور سنسناہٹ پیدا کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے وہ نشانہ ملامت نہ بناتے ہوں۔ جوانوں کی کمزوریاں، بوڑھوں کی گمراہیاں اور اس وقت کے نوابوں کی عیاشیاں ان کا تختۂ مشق بنیں۔ اپنے زمانے کی مختلف برائیوں کی بھی انہوں نے ایسی خبر لی کہ ایک اصلاحی پہلو نکل آیا۔ دشمن تو دشمن دوستوں کو بھی نہ چھوڑا اور جب کسی کا پیچھا کیا تو آخر وقت تک ہاتھ نہ دھویا۔ جب کسی سے چل جاتی تو فوراً اپنے غلام "غنچہ" نامی کو آواز دیتے اور وہ قلم کاغذ اور دوات لیکر خدمت میں حاضر ہو جاتا اور یہ طنز، ہزل اور ہجو کے ایسے پھول تراشتے کہ مخالفین تڑپ تڑپ کر رہ جاتے۔ اس طرح تو اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔ لیکن لوگوں کے دلوں پر سانپ لوٹ جاتے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ان کی ہجو سوز اور ساز، آنسوؤں اور قہقہوں کا سنگم ہوتی ہے۔ اپنے موضوع پر اتنا حاوی ہوتے کہ چھوٹی سی بات ان کی باریک نظر سے نہیں بچتی۔ اس سے ایک وسیع معلومات، زبان پر قدرت اور نظر کی باریکی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

نواب آصف الدولہ والی اودھ ایک نیک صفت اور صاحب ذوق انسان تھے۔ نواب صاحب مرزا صاحب کو بہت چاہتے تھے۔ انہوں نے مرزا کو نہ

صرف "ملک الشعرا" کا خطاب دیا تھا بلکہ سالانہ چھ ہزار کا منصب بھی مقرر کر دیا تھا۔ مرزا نے ان کی تعریف میں بہت سے قصیدے کہے ہیں۔ اور ان کے دشمنوں کی مذمت کی ہے۔ یہ اکثر نواب کے ساتھ ہوتے اور باتوں میں لطیفے ہنسا کے دل بہلاتے۔ ایک وقت کا ذکر ہے کہ نواب محل میں آرام فرما رہے تھے۔ ان کی انا کی تیز لڑکی نے ایسا شور مچایا کہ نواب اٹھ بیٹھے۔ گربڑ کی وجہ معلوم ہوئی تو آپ نے سودا کو طلب کیا اور ایک ایسی ہجو لکھنے کی فرمایش کی کہ وہ شوخ لڑکی پھر سے دم نہ مارے۔ نواب کا کہنا مرزا کے لیے سر آنکھوں پر تھا۔ فوراً دوات قلم لے کر بیٹھ گئے اور وہیں ایک ہجو لکھ ماری۔ جس کا یہ شعر اب تک لوگوں کی زبان پر ہے۔

لڑکی وہ لڑکوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کر ڈنٹر پیلے

مرزا میں خاص بات یہ تھی کہ وہ ندا قیہ پہلو میں بات سے بات نکال لیتے تھے۔ چنانچہ شیخ قایم علی جو کہ ایک اچھے شاعر تھے شاگردی کے خیال سے خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی خواہش ظاہر کی سودا نے تخلص دریافت کیا تو شیخ نے کہا "امیدوار" اس تخلص نے مرزا کی آنکھوں میں شرارت کی چمک اور ہونٹوں پر ایک ہلکی سی ہنسی دوڑا دی اور کہہ اٹھے۔

ہے فیض سے کسی کے شجر ان کا باردار
اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

شیخ جی بہت بھنائے اور اس عہد کے ساتھ لوٹے کہ اس قسم کے بھکڑ استاد کی شاگردی کا خیال تک دل میں نہ لائیں گے۔ انہوں نے پرانے تخلص امیدوار کو سلام کیا اور نیا تخلص قایم اختیار کیا۔

مرزا کی زندہ دلی نے بڑھاپے میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ گو بڑھاپے کا زمانہ تھا مگر طبیعت جوان تھی۔ ایک مشاعرے میں سید انشا اللہ خاں انشا اپنی غزل سنا رہے تھے۔ جس کے ایک دو شعر یہاں سنائے جاتے ہیں

جھڑکی سہی ادا سہی چین جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

انشا کا جوانی کا زمانہ تھا اور بہار کے دن۔ خدا نے صورت شکل بھی دی تھی۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے

گر ناز نیں کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھیے میں ناز نیں سہی

تو مرزا سے رہا نہ گیا اور مسکرا کر پکار اٹھے "دریں چہ شک" اس پر مشاعرے میں کھلی پڑ گئی۔

سودا ہجو کے معاملے میں اکثر اپنی طرف سے پہل نہ کرتے تھے۔ لیکن جب کسی سے ٹھن جاتی تو بقول مولانا آزاد کے "اس طرح پیچھے پڑتے کہ انسان جان سے بیزار ہو جاتا تھا"۔ مرزا کی ہجویں گلی کوچوں میں آگ کی طرح پھیل جاتی تھیں۔ لیکن ان کے مخالفین کے اچھے شعر بھی مقابلے میں پنپنے نہ پاتے تھے۔ یہ ان کی زبان کا جادو تھا۔ اس زمانے کے بعض شعرا مثلاً میر منا بقا اللہ خاں بقا، ندوی، پنجابی اور مرزا فاخر نے بھی سودا پر چوٹیں کسیں۔ مرزا کے متعلق ندوی کا ایک شعر اب تک لوگوں کو ہنساتا ہے۔

کچھ کٹ گئی ہے بیٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا
دم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا

ایک دوسرا مصرع۔

بھڑوا مسخرا ہے سودا سے ہوا ہے

مرزا کے متعلق دوسروں کے زخمی احساسات ظاہر کرتا ہے۔ مرزا سودا نے بھی ان لوگوں کی دل کھول ہجو کی اور ایسی گت بنائی کہ خدا کی پناہ۔ خاص طور پر مرزا ناصر کا بری طرح سے پیچھا کیا۔ جب ناصر سودا کی

تلخ جو ئوں، رکیک اشعار اور ہجو سے تنگ آ گئے تو شاگردوں کی مدد چاہی۔ فاخر کے شاگرد لکھنو میں بہت سے تھے اور انہیں اپنے استاد کی ذلت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ چنانچہ اشارہ ملتے ہی بہت سے مرزا کے گھر گھس آے۔ گالیاں دیں اور پیٹ پر چھرا رکھ کر کہا کہ چلو اب ہمارے استاد کے پاس اپنے کلام کے ساتھ اور ان سے معافی مانگ لو ورنہ تمہارا کام تمام۔ مرزا یہہ حال دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ مگر آدمی تھے ہوشیار۔ اس لیے چپ چاپ ان اٹھائی گردوں کے ساتھ ہو گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد یہہ لوگ پھر ان سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیے۔ اتنے میں نواب آصف الدولہ کے بھائی نواب سعادت علی خاں ہاتھی پر ادھر آ نکلے۔ بیچ بچاو کیا۔ آخر مرزا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ نواب آصف الدولہ کو جب یہہ حال معلوم ہوا تو بہت بگڑے اور حکم دیا کہ فاخر مکیں دربار میں فوراً حاضر کیا جاے اور اس کے شاگردوں کے گھر اکھیڑ کر پھینک دیے جائیں۔ سودا نے اسی وقت ہاتھ باندھ کر التجا کی کہ وہ اس جھگڑے میں نہ پڑیں۔ کیونکہ یہہ تو صرف قلم اور دوات کی لڑائی کا نتیجہ ہے اور اس کا تصفیہ کاغذ اور قلم کے میدان میں ہوگا۔ اور پھر گھر آکر فاخر اور ان کے شاگردوں کو ایسی سنائی کہ ان کی ہجو بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی۔

مرزا رفیع سودا کے مرنے کے تیس سال بعد (۱۸۰۱ء) میں اردو کے ایک دوسرے ظرافت پسند شاعر..... شیخ قلندر بخش جرات اس زمانے میں لکھنو پہنچتے ہیں۔ جب انشا اور مصحفی کی نوک جھونک کے چرچے نہ صرف دربار میں بلکہ شہر میں مشہور تھے۔ جرات پہلے نواب محبت خاں کے ہاں ملازم ہوے

ایک وقت جاڑے کے موسم میں نواب محبت خاں کے مختار نے انہیں مقررہ موسمی کپڑے نہیں دیے جرات نے مختار جی کے سامنے یہہ رباعی کہی اور کھڑے کھڑے سرمائی حاصل کر لی۔

مختاری پہ آپ کیجے گا نہ گھمنڈ
کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیخ ارنڈ
سرمائی دلا دیے ہماری ورنہ
تم کھاوگے گالیاں جو ہم کھائیں گے ٹھنڈ

اس واقعے کو انہوں نے کس دل چسپ انداز میں باندھا ہے۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

ادبی چٹخاروں کے لحاظ سے ماشا اللہ خاں کے بیٹے انشا اللہ خاں کا درجہ شیخ قلندر بخش جرات، میر اثر نارنولی، میر غلام حسین ضاحک، مرزا قتیل، سعادت یار خاں رنگین اور مرزا رفیع سودا سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ انشا بنگال کی راج دھانی مرشد آباد میں پیدا ہوے اور سچ مچ باتوں کے بنگالے نکلے۔ شاہ عالم کے زمانے میں ۱۷۸۶ء میں دلی آے اور میٹھی میٹھی باتوں سے سب کا دل موہ لیا۔ دل چسپ حکایتوں لطیفوں اور ہنسانے والے اشعار سے بہت جلد دوسرے درباری شاعروں کو نیچا دکھایا۔

اس زمانے میں دلی کے شاعروں میں حکیم ثنا اللہ خاں فراق، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، شاہ ہدایت میاں شکیبا۔ میر قمر الدین منت، شیخ ولی اللہ محب اور مرزا عظیم بیگ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن انشا کے آگے ان کی شاعری پھیکی پڑ گئی دلوں میں میل آیا اور یہہ ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ سودا کے شاگرد مرزا عظیم بیگ انشا سے خاص

طور پر بگڑے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے جب اپنی ایک غزل جو بحر رجز میں تھی انشا کے سامنے پڑھی تو اس وقت انشا نے بڑی تعریف کی اور مشاعرے میں پڑھنے کی تاکید کی۔ لیکن جب عظیم نے وہی غزل اس مشاعرے میں سنائی تو انشا نے انہیں ٹوک کر آڑے ہاتھ لیا اور کہا کہ اس کے بعض شعر تو بحر رمل کے ہیں پھر یہہ کہ ان کی خدمت میں ایک مخمس پڑھ ڈالا جن کے چند شعر یہہ ہیں:-

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی اپنی حد سے نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

مرزا عظیم بیگ نے بھی جواب میں ایک مخمس لکھا جس میں انہیں دہقان بنا ڈالا۔ کہتے ہیں۔

وہ فاضل زمانہ ہو تم جامع علوم
تحصیل صرف و نحو سے جن کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی حکمت و ہیئت جفر نجوم
منطق بیان معانی کہیں سب ہیں کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

اسی طرح انہوں نے مخمس میں انشا کو جگہ جگہ طفل مکتب، جاہل، بدتمیز، بیوقوف اور آفت کا پرکالا بتایا ہے۔

دلی سے جب دل اکتا گیا تو انشا لکھنو پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ، شاہزادہ شاہ عالم کے مصاحب اور پھر مصحفی کو ہٹا کر خود ان کی جگہ استاد بن بیٹھے مزاج کے منچلے تھے۔ اس لیے یہاں بھی دیر تک نہ رہے تفضل حسین خاں علامہ کے ذریعے نواب سعادت علی خاں وزیر اودھ کے دربار میں پہنچ گئے۔ یہہ ایسی عزت، دولت اور شہرت حاصل کی کہ شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ لیکن زندگی کے آخری دن ایسی ندامت اور غربت میں کاٹے کہ اب تک لوگ افسوس کرتے ہیں۔

یہہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو شاعری نوابوں راجاؤں اور امیروں کے درباروں سے وابستہ ہو چکی تھی۔ عام پستی کے زمانے میں یہہ دربار بے فکر خوش مزاج اور عیش پسند امیروں اور ان کے دوستوں کے اڈے تھے۔ جہاں وہی شعرا کامیابی حاصل کرتے جو چکنی چپٹی باتوں میں استاد، شوخ اور ظریف ہوں، یہہ باتیں انشا میں کوٹ کر بھری ہوئی تھیں نہ صرف ان کا کلام بلکہ ان کی معمولی بات چیت بھی ہنسی مذاق میں ڈوبی ہوتی وہ نہ صرف ایک بڑے درجے کے ظریف تھے بلکہ ایک بہت بڑے عالم اور فاضل بھی۔ ان کی معلومات نہایت وسیع اور خیالات انوکھے تھے۔ وہ کئی زبانوں مثلاً عربی، فارسی، ہندی، مارواڑی پنجابی، کشمیری پوربی مرہٹی پشتو اور ترکی سے واقف تھے۔ انہیں خاص طور پر ہندستانی زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی ان میں خاص خوبی تھی وہ ہر بات آسانی سے مذاق میں ڈھال لیتے تھے وہ نہایت حاضر دماغ اور حاضر جواب بھی تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ شیخ قلندر بخش جرات سے ملنے گئے جو ایک زمانے سے آنکھوں کی قوت کھوے ہوے تھے اور ایک ہی مصرع کو بار بار دل میں پڑھ رہے تھے۔ انشا نے انہیں جب اس حالت میں دیکھا تو وجہ پوچھی۔ جرات نے کہا۔ بھئی ایک مصرع ہاتھ لگا ہے مگر جب تک دوسرا نہ ہو جائے، تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ نوجوان شاعر نے جب اصرار کیا تو جرات نے یہ مصرع پڑھا۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

اور اسے گھڑی گھڑی دہرانے لگے۔ انشا نے فوراً دوسرا مصرع سیدھا کیا اور اس طرح سے شعر پورا کر لیا۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

اس پر جرأت بے اختیار ہنس پڑے اور یہہ کہتے ہوئے کیوں صاحبزادے ہم ہی پر ہاتھ صاف کرتے ہو۔ لکڑی لے کر مارنے اٹھے اور انشا یہہ حال دیکھ کر کھڑے ہوئے۔

لکھنو کے غریب اور پریشان حال شاعر فایق کو انشا کی ترقی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انہوں نے انشا کی ہجو لکھی اور غضب یہہ کیا کہ خود انشا کے ہاں گئے اور وہی ہجو ان کے سامنے مزے سے پڑھ ڈالی۔ انشا تھے بہت تیز۔ ہجو سن کر پھڑک گئے تعریف کے پل باندھے واہ واہ سے گھر گونج اٹھا۔ جب فایق خوشی خوشی واپس ہونے لگے تو انہیں ٹھہرا لیا اور وہیں کھڑے کھڑے یہ قطعہ موزوں کیا اور ان کے حوالے کر دیا۔

فایق بے حیا چو ہجوِ م گفت
دل من سوخت سوخت سوختہ بہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم
دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

برخلاف دوسرے شاعروں کے انشا غیروں کی لکھی ہوئی ہجو یا ہزل سے ہرگز ہرگز گھبراتے نہ تھے ان کا ذاتی خیال تھا کہ کسی کے کہے ہوئے پر پریشان ہونا ذاتی کمزوری اور بزدلی ہے۔ وہ مخالفوں کی گندہ سے گندہ ہجو یا تیز سے تیز چوٹ پر بھی اف نہ کرتے بلکہ خوش ہوتے، قہقہے لگاتے، اچھلتے اور کودتے۔ اس پر ان کے دلوں پر اور بھی آرے چل جاتے۔ گو انہیں ہندستانی زبان پر قدرت تھی۔ لیکن خود اپنی زبان پر قابو نہ تھا۔ زبان کی اسی بدلگامی اور طبیعت کی بے پناہ شوخی نے آخری زمانے میں ایسے مخالف حالات پیدا کر دیئے کہ ان کی جان پر آ بنی۔

لکھنو میں بہت سے شعرا کسی نہ کسی کی تعریف کر کے شاہزادہ یا امیر کے پاس سے ماہانہ یا سالانہ تنخواہ یا وظیفہ پاتے اس کے بدلے میں وہ اپنے سرپرست کی تعریف میں شعر کہتے اور اس کے دشمنوں کی خدمت میں ہجو یا ہزل۔ شاعر کا کام لطیفوں، چٹکلوں، مذاق اور دل لگی کی باتوں سے نواب یا راجہ کو دربار یا محل میں خوش کرنا رہ گیا تھا۔ بعض بڑے بڑے نوابوں کے ہاں ایک سے زیادہ شاعر بھی موجود ہوتے۔ یہہ لوگ بڑھائی حاصل کرنے کے لیے ہجو اور ہزل پر اتر آتے جس کی وجہ سے ایک دوسرے پر مزاحیہ انداز میں حملے کرتے تھے۔ ان چوٹوں سے ان کے محسن خوش ہوتے تعریف کرتے اور اندرونی طور پر ان کی ہمت بڑھاتے کیونکہ اس قسم کی باتوں میں انہیں لطف آتا اور وقت ہنسی خوشی سے گذرتا۔ اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ شعرا ایک دوسرے کے سخت دشمن ہو گئے۔ ذہن کی صلاحیتیں اور زبان کی ظرافت کی قوتیں ایک دوسرے کے خلاف خرچ ہونے لگیں جس کی وجہ سے ہندستانی زبان میں ادبی چٹخاروں کا ایک قیمتی اور دلچسپ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ان ادبی چٹخاروں میں انشا اور مصحفی کی باہمی نوک جھوک کا کافی حصہ ہے۔

مصحفی امروہہ کے رہنے والے تھے جوانی میں دلی پہنچے اور کچھ دنوں کے بعد دوسرے اہل فن لوگوں کی طرح دلی چھوڑ لکھنو جا بسے اور سینکڑوں شاگرد پیدا کیے۔ طبیعت میں شوخی اور مزاج میں رنگینی تھی بڑھاپے میں دوسری شادی کی اور مرتے وقت زندہ دلی نہ

چھوڑی۔ شاعری میں قدیم محاروں کا خاص لحاظ کرتے
بندش میں وہ حسن اور ترکیبوں میں وہ چستی نہیں۔ جو
سودا، میر، درد، میر حسن اور سوز میں پائی جاتی ہے
لیکن ان کے بعض اشعار موتی کی طرح صاف اور ہیروں
کی طرح چمکدار ہیں۔ شیخ مصحفی پہلے مرزا سلیمان شکوہ کے
استاد تھے۔ لیکن سید انشا سلیمان شکوہ کے دربار میں
پہنچ گئے تو شاہزادے نے شیخ کو چھوڑ سید کو اپنا کلام
دکھانا شروع کیا اور ساتھ ہی بوڑھے استاد کی تنخواہ
بھی کم کردی اس پر مصحفی آگ بگولہ ہو گئے اور اپنی تمام
ناکامیوں کا ذمہ دار انشا کو قرار دیا۔ شاگردوں نے
رقابت کی آگ کو ہوا دی اور ان کے سرپرستوں نے
اس پر تیل چھڑکا۔ یہاں تک کہ انشا اور مصحفی کے
شاعرانہ جھگڑوں سے لکھنؤ میں دھوم مچ گئی نہ صرف
ان کے سرپرست، ان کے شاگرد بلکہ عوام بھی پارٹیوں
میں تقسیم ہو گئے۔ ہر وہ مشاعرہ جس میں یہ لوگ شریک
ہوتے۔ طنز، نوک جھوک اور چوٹوں سے چمک اٹھتا

ایک مشہور مشاعرے میں جس میں انشا کے ظریف
اور بعض حکمت پیشہ شاعر بھی موجود تھے انہوں نے
ایک ایسی غزل سنائی کہ لوگ حیرت سے ان کا منہ تکنے
لگے۔ اس کے کچھ اشعار یہاں سنائے جاتے ہیں۔

اک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے
کیا منہ ہے ارسطو کرے جو چوں مرے آگے
ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے

مصحفی نے جب یہ غزل سنی تو اسی طرز میں جواباً
ایک دوسری غزل لکھ ماری۔ کہتے ہیں۔

خاموش ہیں ارسطو و فلاطوں مرے آگے
دعوی نہیں کرتا کوئی موزوں مرے آگے
لاتا نہیں خاطر میں سخن بیہودہ گو سکا....
اعجاز مسیحا بھی ہے افسوں مرے آگے
دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بہت سست
واللہ، وہ شخص ہے مجنوں مرے آگے

انشا نے زندگی کے جو دن نواب سعادت علی
خاں کے ساتھ گذارے وہ خانگی حیثیت سے اچھے
تو تھے۔ لیکن ہندستانی شاعری کے لیے بہت خراب
ثابت ہوئے کیونکہ ہر بات میں نواب صاحب کی
ہاں میں ہاں ملانا ضروری تھا۔ انہوں نے شاعری
کی دولت محض درباری عزت، شہرت اور کچھ سکون
کے بدلے نواب کے ہاتھوں بیچ دی تھی۔ نواب
جو کچھ چاہتے ان سے کہلوا لیتے۔ اور جب جی چاہتا
وقتیہ غزلیں، ہجو، تاریخیں، مقطع، رباعی تیار
کروا لیتے۔ ایک وقت نواب صاحب اور انشا
کشتی میں سوار پانی کی سیر کر رہے تھے۔ سامنے کنارے
پر ایک کوٹھی نظر آئی جس پر مادہ تاریخ "حویلی علی نقی خاں
بہادر کی"، لکھا ہوا تھا۔ نواب نے انشا سے خواہش
کی کہ وہ اسے رباعی میں کھپا دیں۔ انشا کے پاس تو
حرف کہنے کی دیر تھی انہوں نے اسی وقت یہ رباعی
گھڑ دی۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لڑکی حویلی علی نقی بہادر کی

اس طرح کی حاضر جوابی اور اسی قسم کی باتوں
سے انہیں نواب کی طبیعت میں بہت دخل ہو چکا تھا
اس کی بدولت نہ صرف وہ اپنا کام بلکہ ان لوگوں کا
بھی کام نکالتے جو دلی سے لکھنؤ آتے اور ان کا دروازہ
کھٹکھٹاتے۔ ایک وقت انہیں بہت ضروری کام آن
پڑا اور وہ جلد جلد نواب کے محل جا پہنچے۔ لیکن دربانا
نے اطلاع دی کہ آج نواب روزے سے ہیں اور حکم
دے رکھا ہے کہ کوئی اندر آنے نہ پائے۔ اس زمانے

کے نواب..... خدا کی پناہ..... کسی کے چھینک آ جائے
تو انہیں زکام ہو جائے۔ پھر روزہ تو روزہ ٹھہرا۔ مگر انشا
کچھ ایسے ویسے آدمی تو تھے نہیں کہ یوں ہی ٹل جاتے
پہلے تو انہوں نے دربان کو رام کیا کہ تمہاری جان
میری جان۔ بھیا تو کچھ فکر نہ کر۔ پھر عورتوں کی طرح دوپٹہ
اوڑھ، سینہ ابھار، بجاتے شرماتے خراماں خراماں
نواب کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ نواب نے جب
انہیں دیکھا تو یہ ڈومنیوں کی طرح کمر پر ہاتھ، ناک پر
انگلی رکھ بڑے تپاک سے کہنے لگے۔

میں تیرے صدقے نہ رکھ اے میری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی تیرے بدلے ہزاری روزہ

اس پر نواب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے ان کا
کام فوراً نکالا اور انعام اکرام سے واپس کیا۔

نواب کے زمانے میں جان بیلی اودھ کے رزیڈنٹ
تھے۔ یہ خود نواب سے اپنے میر منشی علی خاں کے
ساتھ آیا کرتے تھے۔ رزیڈنٹ بہادر انشا کی پیاری
باتوں اور ظریفانہ حرکتوں سے بہت خوش تھے اور
آتے ہی پوچھتے "سید انشا کجا است" ملاقات کے
بعد جب وہ واپس ہوتے تو انشا مسکراتے ہوئے
کہتے "میر منشی صاحب کا اللہ بیلی" ایک دن باتوں
باتوں میں لفظ "ہجر" کے متعلق کہ آیا زیر ہے یا
زبر ہے۔ رزیڈنٹ بہادر اور نواب سعادت علی
خاں میں بحث چھڑ گئی۔ نواب کا خیال تھا کہ ہَجر صحیح
ہے اور صاحب بہادر ہِجر پر اڑے ہوئے تھے۔
اتنے میں انشا بھی آ گئے۔ رزیڈنٹ نے ان سے
دریافت کیا۔ انہیں کیا معلوم کہ یہاں کیا ہو رہا ہے
اس لیے جو صحیح بات تھی زبان پر آئی اور کہہ دیا کہ
ہِجر صحیح ہے۔ اس پر نواب خفا ہو کر انہیں دیکھنے لگے
ان کی نظر سے تاڑ گئے کہ کچھ دال میں کالا ہے اور فوراً
بول اٹھے کہ حضور ہَجر بھی صحیح ہے اور ساتھ ہی سند
میں یہ شعر پڑھ دیا۔

شب وصل است و طے شد نامہ ہجر
سلامٌ ھِیَ حتّٰی مطلع الفجر

ایک طرف تو نوابوں اور امیروں کے خاص جلسوں
میں انشا بہکی چٹپٹی باتوں اور ہنسانے والے ٹٹکلوں سے
محفل کو گرما دیتے تو دوسری طرف عام مشاعروں میں
سنجیدہ اور مذاقیہ اشعار سے لوگوں کا دل موہ لیتے
سارے لکھنو میں اگر کوئی شخص ان کا مقابل ہو سکتا
تو وہ مصحفی تھے۔ مصحفی کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ لکھنو ان
کی استادی کا لوہا مان چکا تھا۔ ہر گلی کوچے میں ایک
نہ ایک شاگرد نظر آتا۔ غزل اور قصیدہ دونوں میں
نازک فارسی ترکیبیں اور بلند پایہ مضامین باندھتے ہیں
گو بڑھاپے کا زمانہ تھا مگر طبیعت میں اتنی روانی تھی کہ
بیٹھے بیٹھے کئی غزلیں کہہ دیتے وہ لوگ جو خواہ مخواہ
شاعر بننا چاہتے اور وہ شاعر جن کے دلوں میں مشاعرے
میں اپنی تعریف سننے کی خواہش ہوتی تو مصحفی کے پاس
آتے فرمائشیں کرتے ان کی کہی ہوئی غزلیں خرید کر لے
جاتے۔ آخری زمانے میں جب کہ آمدنی کے دوسرے
ذرائع کم ہو چکے تھے وہ اپنے اشعار بیچ کر زندگی گذارتے
کئی لوگ محض ان کے کلام کی وجہ سے کچھ دنوں کے
لیے مشہور ہو گئے اور کئی لوگ ان کی شاگردی کی وجہ
سے شاعر بن گئے۔ جب انشا سے باتوں باتوں میں
چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی تو بھلا مصحفی کس طرح خاموش
رہ سکتے۔ انہوں نے اپنی بڑھائی اور انشا کی کم مائگی
کے متعلق ایک غزل دعوے کے ساتھ لکھ ماری
فرماتے ہیں۔

مدت سے ہوں میں زخوش صہبائے شاعری
ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

میں لکھنو میں زمزمہ سنجان شعر کو
برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
پھبتا نہیں ہے بزم امیران دہر میں
شاعر کو میرے سامنے غوغائے شاعری
اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے
سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

انشا پہلے تو اس غزل کے اشاروں کو ٹال گئے مصحفی نے انشا کی وقتی خاموشی کو ان کی کمزوری خیال کیا اور ایک مشاعرے میں طرح مصرع پر اس طرح طبع آزمائی کی۔

سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موئے پری ایسی نہ یہہ حور کی گردن
دل کیونکہ پری حور کا پھر اس پہ نہ پھسلے
صانع نے بنائی تری بلور کی گردن

اب تو انشا سے رہا نہ گیا۔ بارود کے لیے صرف دیا سلائی کی ضرورت تھی۔ انہوں نے پہلے اس غزل پر ہجو کے لباس میں بہت سے اعتراضات کیے جس کے چند اشعار یہہ ہیں۔

سن لیجیے گوش دل سے مرے مشفقانہ یہہ عرض
مانند بید غصے سے مت تھرتھرائیے
بلور گو درست ہو۔ لیکن ضرور کیا
خواہی نہ خواہی اس کو غزل میں کھپائیے
کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر
مردوں کی باس زندوں کو لا کر سونگھائیے
بخرے میں آپ ہی کے یہہ آئی ہے شاعری
بس منہ ہی منہ میں رکھیے اسے مت سراہیے
مخلص کا التماس پذیرا ہو سوچ کر....
کہنے سے ایسے ریختہ کے باز آئیے
سرکار کے یہاں نہیں گلنے کی دال کچھ
روٹی جو کھائی ہوئے تو پنجاب جائیے
خشکا گدھوں کو دیجیے لوزینہ کاؤ کو
واں جا کے بین بھینس کے آگے بجائیے

جب اس چھیڑ چھاڑ ہجو سے بھی دل نہ بھرا تو انشا نے مشاعرے میں مصحفی کی غزل کے جواب میں اسی بحر و قافیے میں ایک دوسری غزل کہی۔ جس کے دو اشعار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

توڑوں گا خم بادہ انگور کی گردن
رکھدوں گا وہاں کاٹ کر اک حور کی گردن
آئینہ کی گر سیر کرے شیخ کو دیکھے
سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

مصحفی اپنی یہہ گت دیکھ کر بھڑک اٹھے خصوصاً اس مصرع پر "سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن" اب تو خاموشی حرام تھی۔ یہہ پرانا شاعر جو بیسیوں شاگردوں کا استاد اور جس کا کہا ہوا لکھنو اور دہلی میں سند کے طور پر پیش کیا جاتا تھا کیسے چپ رہتا۔ اس نے بھی انشا کے جواب میں ایک قطعہ لکھا۔ اس میں انہوں نے اپنی کہی ہوئی باتوں کی تائید اور انشا کے کلام پر سخت نکتہ چینی کی اور آخر میں بہت کچھ برا بھلا کہا شائستگی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ پورا قطعہ سنایا جائے۔ اس لیے چار پانچ اشعار لکھدیے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

لنگور کو شاعر نہ تو باندھے گا غزل میں
کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن۔
گردن کی صراحی کے لیے وضع ہے ناداں
بیجا ہے خم بادہ انگور کی گردن
اس سے بھی میں گذرا غلطی اور یہہ سنیے
باندھے ہے کوئی خوشۂ انگور کی گردن
اتنی نہ تمیز آئی تجھے ربط بھی کچھ ہے

ہر قافیہ میں تو نے جو منظور کی گردن
ٹوٹے ہوئے نیچے کی طرح میرے قلم سے
جاتی ہے پچک شاعر مغرور کی گردن

سید انشا گلے میں باریک ململ کا کپڑا ڈالے رہتے اس کا ایک سرا سامنے ہوتا اور دوسرا پیچھے لٹکتا رہتا مصحفی کے شاگرد نے صرف اتنی بات پر اس طرح ان پر پھبتی اڑائی۔ مصرع ہے۔

باندھی دم لنگور میں لنگور کی گردن

انشا نے شاگرد کی گستاخی کا بدلہ بیچارے استاد یعنی شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے اس طرح لیا۔

سفرہ پہ ظرافت کے ذرا شیخ کو دیکھو
سر لعون کا منہ پیاز کا اچور کی گردن

اگلے زمانے کے لوگ بڑے زندہ دل تھے اسی قسم کی باتوں سے خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ ان میں انشا تو ظرافت کے بادشاہ اور ہجو کے شہنشاہ تھے۔ زندگی کا کوئی مذاحیہ پہلو ان کی نظر سے بچ نہ سکا۔ زبان پر اتنی قدرت اور معلومات میں اتنی وسعت اور ذہن میں اتنی تیزی تھی کہ ہر چیز کو مذاق یا مسخرے پن میں ڈھال لے سکتے تھے۔ ان میں ایک طنزیہ اور مذاحیہ نگار کی وہی خوبیاں ہیں جو انگلستان کے سوفٹ اور اسٹیل، فرانس کے والٹیر اور روپیاس اور یونان کے ہیونا میں ہیں۔ لیکن ان میں وہ تعمیری خوبی نہیں جو ان لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اس فن کو اس لیے اختیار کیا تھا کہ سماج کی کمزوریوں کی دھجیاں اڑادیں اور ملک و قوم کی حقیقی خدمت بجالائیں انشا نے اس گلی میں اس لیے قدم رکھا کہ انہیں دولت، عزت اور سستی شہرت کی ضرورت تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ لکھنے اور بولنے کی خاص مذاحیہ طرز، حاضر جوابی اور شوخی میں وہ ان سب سے آگے ہیں۔ غرض کہ جب تک زبان ہندستانی زندہ رہے گی۔ اس وقت تک ان بزرگوں کے ادبی چٹخارے، مسکراہٹ، ہنسی اور قہقہوں کی دنیا میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ **محمد بن عمر ام-اے (عثمانیہ)**

غزل

دل بیتاب کیا پایا جہاں کو بدگماں پایا
مگر ہاں پا لیا سب کچھ جو تجھ کو مہرباں پایا

کوئی دیر و حرم میں جا بسا ہم کوئے جاناں میں
یہ اپنی اپنی قسمت ہے جہاں چاہا وہاں پایا

کسی ٹوٹے ہوئے دل میں جسے دنیا نے ٹھکرایا
مری ذوق نظر نے تجھ کو بے شان و گماں پایا

مجھے سنگ در جاناں ہر ایک ذرہ ہے عالم کا
جہاں سر جھک گیا جلوؤں کو بے تاب و تواں پایا

کسی کی حسرت دیدار کیا باقی ہے جاں باقی
کسی کی یاد کو ہم نے بہار بے خزاں پایا

دل مومن کو عرف عام میں کعبہ بھی کہتے ہیں
اسی میں عرش پایا اور مکین لامکاں پایا

دل حیدر بھی کیا ہے اک تماشہ گاہ عالم ہے
کہ جس میں راز ہستی کو عیاں پایا نہاں پایا

حیدر محمد خاں حیدر

عشرت نایاب

ہم نشیں اس خواب عشرت کی پریشانی نہ دیکھ
کس طرح بہتا ہے بنکر خون کا پانی نہ دیکھ
میں نے دیکھا ہے امارت کا گلا گھٹتے ہوے
عمر بھر کی دولتیں اک رات میں لٹتے ہوے
آ دکھاوں تجھ کو میں اک جشن شادی کا سما
اک مغرز دوست کی طرفہ تباہی کا سما
جمع تھا کچھ تو غریبوں کا گلا کاٹا ہوا
اور کچھ تھا قرض کے پیسوں پہ اترایا ہوا
صرف بیجا میں تھا یوں مشغول وہ دیوانہ کار
جیسے اس کے ہی لیے ہے دولت و عز و وقار
جاذب ذہن و نظر یوں حسن محفل کا نکھار
مست کر دیتی ہو جیسے رات رانی کی بہار
ہر طرف نوری تموج ہر طرف گل کاریاں
دیدنی تھی ساری محفل کی ضیا بر دوشیاں
دور تک شور مبارک کی صدا گونجی ہوئی
شادیانوں سے فضا اندر فضا گونجی ہوئی
ہر نظر گلشن بداماں ہر روش گلگوں قبا
ہر نظارہ کوثر و تسنیم میں ڈوبا ہوا
بجلیوں کے قمقمے پھولوں کے گملوں کی قطار
فرش صبح مرمریں قالیں شام زرنگار
چاند کی ٹھنڈی شعاعیں جلوہ کار و بادہ بار
رات کی رنگیں مناظر صبح عشرت در کنار
وہ کملی کلیوں کے ساغر جام جم سے بھی سوا
اللہ اللہ یہ نظر افروز منظر یہ سما
صحن میں رعنائیاں بکھری ہوئی تھیں چارسو
غنچہ و گل بن کے پھوٹا تھا غریبوں کا لہو
دیکھ کر یہ رنگ محفل یہ نشہ آور سما
محو حیرت تھی ابھی میری نگاہ حشر زا
دفعتاً احساس نے مجھ کو وہاں پہنچا دیا
تھی جہاں بیتاب لاکھوں بیکسوں کی التجا
سہم کر دل رہ گیا یوں عشرت نایاب سے
جیسے ڈر کر چونک جائے کوئی بچہ خواب سے

ساغر چشتی

مجبوری

مذاق گریہ ہائے بے اثر دیکھا نہیں جاتا
یہ انداز خلش اے چشم تر دیکھا نہیں جاتا
تعجب ہے میں جنکی راہ میں مٹ مٹ گیا اکثر
اب ان سے بھی میرا چاک جگر دیکھا نہیں جاتا
بہار آئی ہوئی ہے ان دنوں صحن گلستاں میں
تہی اب اپنا دامان نظر دیکھا نہیں جاتا
خودی نے اس قدر گھر کر لیا دل میں کہ اے توبہ
خیالوں میں بھی ان کے در پہ سر دیکھا نہیں جاتا
ترے غم کی قسم تیرے زبون و زار حالوں سے
شکستہ دامن قلب و جگر دیکھا نہیں جاتا
بہ ہر سو ان کے جلوے دعوت نظارہ دیتے ہیں
مگر تجھ سے ہی کچھ اے چشم تر دیکھا نہیں جاتا
تجسس میں کسی کے دیدہ بیتاب کو اطہر
خراب منظر شام و سحر دیکھا نہیں جاتا

اطہر (لکھنوی)

اے میرے دل

اے مرے دل، اے مرے بے آبرو بے آب دل
اے مرے بے رنگ دل، بے چین دل بیتاب دل
دیکھ یہ امڈا ہوا ساون یہ موسم کا شباب
کالی کالی بدلیاں اور بجلیوں کا پیچ و تاب
یہ ہجوم گل رخاں یہ التزام و اہتمام
یہ شباب افروز منظر یہ نشاط انگیز شام
کالے کالے آنچلوں میں چاند سے چہروں کا نور
روح میں انگڑائیاں لینے لگی موج سرور
آہ یہ اڑتے ہوئے بکھرے ہوئے شبرنگ بال
گرد جن کے سامنے رعنائی حسن خیال
آہ! یہ سانسوں کی موسیقی کہ جن کے مست راگ
روح کی گہرائیوں میں بھی لگا دیتے ہیں آگ
آہ! یہ آنکھیں کہ جن کی سرخیوں کے درمیاں
لے رہی ہے ناز سے دوشیزگی انگڑائیاں
پھول سے لب مسکراتے پھول برساتے ہوئے
خار‌و‌خس میں زندگی کا خون دوڑاتے ہوئے
آہ! یہ نازک بدن نازک ادا ناز آفریں
اک جواں افکار شاعر کے یہ "خواب مرمریں"
تیرے بہلانے کو آمادہ ہیں یہ سارے مگر
ڈالتا ہی تو نہیں ان پر پچھلی اک نظر

اے مرے دل اے مرے بے آبرو بے آب دل
اے مرے بے رنگ دل بے چین دل بیتاب دل
تو ابھی روتا ہے! اس ناآشنا کی یاد میں
یہ وفاداری ارے اک بے وفا کی یاد میں
تجھ میں رقصاں ہی نہیں ہیں زندگی کے وہ شرار
اے مرے دل تیری خوں گشتہ امیدوں کے مزار
آہ! تو بھولا نہیں وہ چاندنی راتیں ہنوز
یاد ہیں تجھ کو گئی گذری ملاقاتیں ہنوز
یہ جوانی اور کملایا ہوا رہتا ہے تو
سطح سے آہ! مرجھایا ہوا رہتا ہے تو

اے مرے دل اب وہ لمحے بھول جانے دے مجھے
آنسوؤں کی گود ہی میں مسکرانے دے مجھے
میری پژمردہ جوانی پر بہار آنے بھی دے
مجھ کو پھر اک مسکراتا پھول بن جانے بھی دے
پھر فضائے لامکاں کی سمت اڑ جانے بھی دے
بربط زہرا پہ کوئی راگنی گانے بھی دے
بیخودی میں حسن کے قدموں پہ گر جانے بھی دے
آسمانوں سے ستارے توڑ کر لانے بھی دے
آج پا لینے دے مجھ کو میرا گم کردہ شباب
آج بھر دے میری رگ رگ میں محبت کی شراب
آج پی لینے دے ان مے فروش آنکھوں کا نور
دوڑنے بھی دے رگوں میں شعلہ برق سرور
مرمریں باہوں کو سینے سے لگا لینے بھی دے
آج حسن و عشق کی معراج پا لینے بھی دے
چوس بھی لینے دے ان امرت بھرے ہونٹوں کا رس
پھر ابھر آنے بھی دے سینے میں جینے کی ہوس
دیکھ! پیمانہ بکف پیر مغاں بیتاب ہے
آج سجدے کے لیے خود آستاں بیتاب ہے

م۔ اے اختر انصاری (اکبرآبادی)

مضامین صاف اور خوشخط لکھا کیجیے۔

خاموش آہیں

حال دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں .... اپنا
جفا شعار۔ ستم آگاہ رشیدی۔

ایک ناکام آرزو کی زندگی کو تباہ کرنے والے۔ ایک حسرت نصیب کی آرزوؤں کو پامال کرنے والے۔ میرے سنہرے سپنوں کو تباہ کرنے والے میری ارمانوں کی دنیا کو ڈھانے والے۔ میری مسکراتی ہوئی تمناؤں کو مسمار کرنے والے۔ میرے جیون۔ میرے جیون کے رنگین خوابوں کو تہ خاک کرنے والے۔

بھلا تم کو میری بربادی کا درد کیا؟ تم کو میری زندگی کی تباہی کا احساس کیا؟ تم تو مجھے بھول گئے۔ جس طرح ایک اچھا خواب دیکھ کر بھول جاتے ہیں۔ جس طرح پھول سونگھ کر اس کی خوشبو کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بلکل اسی طرح تم نے بھی مجھ کو بھلا دیا اور میرے اگلے سکون کو جلا ڈالا۔ میری روح میں فراق کی آگ لگادی۔ میری زندگی کو برباد کر کے مجھے برباد کر ڈالا۔ بلکل اسی طرح جس طرح آسمان پر قوس قزح نمودار ہو کر غایب ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک ستارہ ٹوٹ کر فضا میں معدوم ہو جاتا ہے۔ جس طرح شہاب ثاقب اپنی چمک دکھا کر پھر روپوش ہو جاتا ہے۔ بلکل اسی طرح تم نے مجھے بھی بھلا دیا۔ آہ! مجھے.... اپنے جال میں پھانسا۔ اپنے جھوٹے وعدوں پر مجھے زندہ رکھا اور اس کے بعد مجھے فراموش کر بیٹھے۔ پہلے میری زندگی کو مسرتوں میں بسایا اور پھر مجھے اپنے سے اس طرح علیحدہ کر دیا۔ جس طرح کوئی دودھ میں سے مکھی نکالتے ہے۔ جس طرح گلچیں اپنی ٹوکری سے پژمردہ پھولوں کو علیحدہ کر دے مگر میں تم کو ایسا بیوفا نہ سمجھتی تھی رشیدی.....

تم کو وہ دن یاد ہیں جب تم نے مجھ سے کہا تھا کہ رباب میں بجز تمہارے اور کسی کو نہیں چاہتا۔ اس دن مجھے موت آجائے جس دن میں تمہارے خیال کو دل سے نکال دوں۔ آہ! رشیدی وہ دن کدھر گئے وہ باتیں کون سے گوشہ عافیت میں پناہ گزین ہو گئیں

ہاں ٹھیک ہے۔ رشیدی مردوں کی تو فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر شے کو اپنے دام فریب میں اسیر کریں اور پھر اس کو ایک حرف غلط کی طرح دماغ سے مٹا دیں۔ بے شک تم لوگوں کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے..... خیر میں جس طرح بھی زندگی گذار رہی ہوں اس کا اندیشہ بد ہے۔ اب آگے بھی زندگی گذر جائیگی۔

اگر تمہاری بیوفائیاں اور دلچسپیاں تم کو اجازت دیں تو تم اس کا جواب دیدینا.... فیروزہ کو ایک بدنا سا سلام کہنا۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

تمہاری
سوگوار محبت رباب

رشیدی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کچھ اشعار گنگنا رہا تھا کہ ڈاکیے نے آواز دی۔ رشیدی کا ملازم باہر گیا۔ اور ایک گلابی رنگ کا معطر لفافہ لا کر اس کو دیا۔ رشیدی نے کھولا پڑھا اور وہ خط لفافے میں رکھ کر میز پر ڈال دیا اور نوکر سے کہا کہ جا کر فیروزہ بی بی کو بھیجدو۔ نوکر اندر گیا۔ اور فیروزہ سے کہدیا۔ وہ حکم سنتے ہی اندر کمرے میں آئی تو رشیدی نے کہا کہ دیکھو فیروزہ یہ خط رباب کا آیا ہے۔ تم اس کو پڑھو اور تم ہی اس کا جواب دیدو یا صرف میری شادی کی

اطلاع اس کو دیدو۔ فیروزہ نے رشیدی کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اندر گئی۔ جاکر دیکھا اور بہت روئی اس کو رباب کی بیچارگی پر رنج ہوا۔ اس کو اگلا پرکیف زمانہ یاد آگیا۔ اس نے ایک خط اس مضمون کا لکھکر رباب کو بھیج دیا۔

پامال تمنا پیاری رباب۔

ابھی تمہارا پیار در د محبت نامہ یا داستان غم آگئیں۔ بھائی جان کے نام پہنچا۔ جس کا جواب میں دے رہی ہوں۔ آہ کس قلم سے رباب تم کو لکھوں کہ رشیدی بھائی کی پرسوں شادی ہے اور وہ بھی ان کی ہم جماعت نعیمہ جعفر کے ساتھ۔ یہہ میرا خط تمہارے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا۔ اس کے پڑھنے کے بعد تمہارا کیا حال ہوگا۔ کاش یہہ دیکھنے سے پہلے میں ختم ہو جاتی۔ آہ وہ دن جب تمہاری زندگی مسرور تھی اور جب محبت کے سائبان کے نیچے تم اپنے آرزوں کے پودے کو اپنے خون جگر سے سینچ سینچ کر پروان چڑھا رہی تھیں۔ وہ دن جب امید ول کے سایے تلے تم نخل آرزو کو بار آور کرنے کی سعی میں منہمک تھیں۔ وہ دن جب قلعہ محبت کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اور تم دونوں اس کے معمار تھے۔ وہ دن جب پریم مندر کی بنیاد پڑرہی تھی اور تم اس کی دیوی تھیں۔ رشیدی اس کا پجاری تھا وہ دن جب تمہاری باتیں مسرت آگین تھیں۔ جب غم کو تم سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ جب تمہاری مسکراہٹیں تمہارے مسرت بھرے دل کی سچی ترجمان ہوتی تھی جب فلک پیر کی آنکھیں بند تھیں اور جب جدائی میں دور کنج بن میں پڑی ہوئی سورہی تھی وہ دن بھول جاو۔ رباب چونکہ اس کے یاد کرنے میں کوئی فائدہ نہیں بجز اس کے کہ زندگی تباہ ہو جائے۔ رشیدی کو بھولنے کی کوشش کرو۔ میں تمہاری حالت کو اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہارے غم کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی بجز اس کے کہ زبانی تسلی دے کر تمہارے غمگین دل کو سکون پہنچاوں۔

اچھا رخصت ہوتی ہوں۔ زندگی رہی تو پھر لوں گی۔ تمہاری

دلشکستہ فیروزہ

یہہ خط جب رباب کو ملا تو اس کی جو کچھ بھی حالت ہوئی اس کا اظہار ناممکن ہے۔ لیکن اس نے اپنے کو سنبھالا اور ضبط سے کام لیا۔ اور اپنے غم کو صرف دل کی دنیا تک محدود رکھا۔ جب زیادہ کسک بڑھی تو اپنی آنکھوں کو اس میں شریک کیا ورنہ زیادہ تر وقت تو اس کا خاموشی ہی میں گذر جاتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں نے ضبط کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تو میری محبت کی توہین ہو جائے گی۔ اس لیے میرا خاموش رہنا بہتر ہے۔ آخرش ۲۹ مارچ کو رشیدی کی شادی نعیمہ کے ساتھ ہوگئی اور وہ اس نئی زندگی کی رنگینیوں میں رباب کو بلکل بھلا بیٹھا۔ مگر رباب اس کی یاد کی شمع کو بجھا نہ سکی۔ گو اس واقعے کے بعد ہی رباب کی شادی رئیس جعفری کے ساتھ ہوگئی۔ جو ایک نامور ڈاکٹر اور نیک جوان تھا۔ لیکن رباب رشیدی کو نہ بھول سکی۔ اور کبھی کبھی رشیدی کی یاد کو لاکر آنسو بہالیتی تھی۔۔

(۲)

نعیمہ اور رشیدی آجکل کلکتہ میں بغرض تفریح گئے ہوئے تھے اور خوب سیر ہو رہی تھی۔ مسلسل ایک ماہ تک رہنے کا ارادہ تھا۔ ان دونوں کی شادی کو ایک سال ہوچکا تھا۔ رشیدی نے یہاں آکر اپنے کام ملنے جلنے

والوں سے نعیمہ کا انٹروڈیوس کروا دیا تھا اور نعیمہ جس کے مزاج میں حد سے زیادہ شوخی تھی۔ ان سے بیباکانہ طور سے ملی اور خوب ان کے ساتھ سیر و تفریح کی جانے لگی شروع میں تو رشیدی کچھ نہ بولا جب معاملہ بگڑتا ہوا نظر آیا تو اس نے نعیمہ کو تنبیہ کی تو اس کا جواب نعیمہ نے یہہ دیا کہ "میں ایسی قید میں رہ کر زندگی نہیں گذار سکتی۔ اگر ایسے ہی تم مشکوک تھے تو مجھے مجبور کیوں کیا کہ میں ایسی زندگی گذاروں اب تو میں ضرور جاؤنگی" رشیدی نے سنا اور جل کر خاموش ہو گیا اور تقریباً ایک ماہ یوں ہی رنگ رلیوں میں گذر گیا۔ ایک دن رشیدی نے نعیمہ سے کہا کہ آج میں "فیشن ایبل انڈیا" کا فرسٹ شو دیکھنے جا رہا ہوں کیا تم چلو گی۔ جس کے جواب میں نعیمہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ رشیدی چلا گیا اس کے جاتے ہی نعیمہ نے اسد کو فون کیا کہ تم فوراً آو۔ میرا دل اس وقت بہت گھبرا رہا ہے۔ اور رشیدی پکچر دیکھنے گئے ہیں۔ اسد فون سنتے ہی فوراً آ گیا۔ یہہ نعیمہ کا بہت عزیز دوست تھا۔ بلکہ ایک حد تک دونوں میں محبت بھی تھی۔ اسد کی موٹر کی آواز سنتے ہی نعیمہ باہر آگئی اور تھوڑی دیر میں دونوں موٹر میں بیٹھ کر "اڈورڈ پارک" چلے گئے اور دیر تک وہاں روشوں پر ٹہلتے رہے۔ قریب آٹھ بجے کے گھر آکر دونوں نے شب کا کھانا کھایا اور پائین باغ میں جا کر ایک بنچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ان دونوں کو بیٹھے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ رشیدی آ گیا۔ چونکہ اس کو کھیل پسند نہیں آیا تھا اس لیے وہ انٹرول ہی میں گھر واپس آ گیا گھر میں آکر جب اس نے نعیمہ کو نہ پایا تو پائین باغ میں پہنچا اور وہ اندر داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہیں دونوں پر پڑیں جو کہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مگر ان لوگوں نے رشیدی کو نہ دیکھا یہ دیکھ کر وہ الٹے پاوں ہی پلٹ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بیدم ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا کہ جس نعیمہ کی خاطر میں نے رباب کی وفادار محبت کو ٹھکرا دیا۔ وہی نعیمہ اب مجھ سے بیوفائی پر تلی ہے۔۔۔۔ بہتر یہہ ہے کہ میں ہی اپنا منہ یہاں سے کالا کروں۔ یہہ سوچ کر اپنا مختصر سا اسباب ایک جا کیا اور اسی موٹر میں بیٹھ کر چل دیا اور جاتے وقت ایک پرچہ نوکر کو دیدیا کہ بیگم صاحب آئیں تو ان کو دیدینا۔ رشیدی گھر سے نکل کر سیدھے اپنے ایک دوست کے پاس گیا اور ایک رات رہنے کی اجازت لے کر وہیں ٹھیر گیا۔ شدت رنج والم سے اس کو رات بھر نیند نہ آئی وہ سوچتا رہا کہ شاید یہہ رباب کی خاموش آہوں کا نتیجہ ہے اور اسی کی پھٹکار پڑی ہے جو میں خانہ آباد ہو کر برباد ہو رہا ہوں۔ وہ رات بھر اسی کرب و بلا میں مبتلا رہا۔ صبح اٹھ کر ایک خط اس نے اپنے والدین کو لکھا جس میں اس واقعے کا ذکر تھا اور لکھا تھا کہ آپ لوگ مجھے ڈھونڈھنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ میں اس قابل نہیں کہ آپ لوگوں کو صورت دکھا سکوں اس نے یہہ خط آنسوؤں کی بارش میں بند کیا اور سپرد ڈاک کر دیا اور فوراً ہی کلکتہ سے ایک نامعلوم جگہ پر چلا گیا۔ ادھر جب نعیمہ باغ سے واپس آئی تو ملازم نے وہ پرچہ اس کو دے دیا۔ وہ سر پکڑ کر رہ گئی اور اسد کو بہت لعن طعن کیا لیکن آہ اب کیا ہوتا۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ نہ وہ اب اس قابل تھی کہ سسرال جاسکے نہ اس قابل تھی کہ والدین کے پاس جا کر زندگی گذارے۔ بہت دن وہ کلکتہ میں پریشان رہی۔ جب کوئی سبیل نہ نکل سکی تو اسد نے اس کے ساتھ عقد کر لیا۔ اور عقد کے دس ماہ بعد اس کے لڑکا ہوا اور اسی حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ادھر جب

رشیدی کے والدین کو یہ خط ملا تو وہ سر پیٹ کر رہ گئے فیروزہ نے رباب کو یہ سب حال لکھ بھیجا پڑھ کر وہ مسکرائی اور بعد میں ایک آہ بھر کر رہ گئی۔

(۳)

اس واقعہ کو ۸ سال گذر گئے اور رشیدی کا پتہ نہ چلا۔ اب رباب کے ایک چھ سال کا بچہ بھی تھا اس کی پیدائش کے بعد سے رباب علیل تھی۔ اور برابر رئیس جعفری اس کے علاج میں منہمک رہتا تھا۔ مگر ایک مہینے سے اس کی حالت بہت خراب تھی۔ نہ جانے کیوں رباب اپنی اس بڑھتی ہوئی علالت سے خوش تھی اور رئیس متفکر و حیران تھا۔ انیس بچہ تھا اس لیے وہ اس کو سمجھ نہ سکا۔ رباب کی اسی خوفناک علالت کی وجہ سے رئیس آجکل صرف چار گھنٹے ہاسپٹل میں صرف کرتا تھا اور باقی اپنا سارا وقت رباب کی تیمارداری میں صرف کرتا تھا ایک دن حسب معمول وہ اپنے گھر آکر بیٹھا ہوا رباب سے باتیں کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی یہ فوراً اٹھ کر گیا تو معلوم ہوا کہ ایک مریض آیا ہے جس کی حالت خراب ہے آپ بہت جلد آجائیے۔" رئیس نے فون پر کہدیا کہ میں ابھی نہیں آسکتا تم مددگار کو بلا لو۔ لیکن رباب نے بہت اصرار سے کہا کہ آپ چلے جائیے شاید اس کی دعا سے میں روبصحت ہو جاؤں یہ سن کر رئیس لباس تبدیل کر کے چلا گیا اور خلاف معمول بہت دیر سے واپس آیا۔ جب وہ آیا تو رباب نے پوچھا رئیس نے کہا کہ آج جو مریض آیا ہے وہ دق کے آخری درجے پر ہے اور وہ ایک شریف خاندان کا لڑکا ہے وہ اپنا نام رشیدی بتلاتا ہے۔ مجھے اس کی ناتوان حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا وہ کہتا ہے کہ میں اس کو ایسی دوا دوں کہ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن میں نہیں دوں گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ دن اور زندہ رہے گا۔ رباب نے رشیدی کا نام سن کر کہا کہ اگر میں اس کو دیکھوں تو پہچان جاؤں چونکہ ہمارے والد کے ملنے والوں میں ایک تھے ان کے لڑکے کا نام رشیدی تھا یہ کہہ کر اس نے آہ بھری مگر جعفری نے کہا کہ نہیں رباب تم اس قابل نہیں کہ حرکت کر سکو اگر تم حرکت کرو گی تو سخت نقصان ہوگا۔ یہ کہہ کر اس کو بہت سمجھایا تو رباب خاموش ہو گئی......

اور اس کے بعد روز رشیدی کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر جعفری جاتا رہا۔ اور نہایت انہماک سے اس کا علاج کرتا رہا۔ بعد میں رئیس نے رباب سے پتہ پوچھ کر رشیدی کے والدین کو اطلاع دے دی۔ اور وہ لوگ تار ملتے ہی آگئے۔ لیکن رشیدی اچھا نہ ہو سکا اور ایک شام کو جعفری کے سامنے دم توڑنے لگا۔ مشیت ایزدی کے سامنے جعفری کچھ نہ کر سکا۔ سب سر پیٹ رہے تھے۔ جعفری کھڑا حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی رشیدی میں کچھ دم باقی تھا کہ جعفری کے گھر سے فون آیا کہ "جلدی آیئے بیگم صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہے" یہ سن کر ڈاکٹر گھبرایا ہوا رشیدی کے کمرے میں آیا اور اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ان آخری جملوں کے بعد رشیدی نے دم توڑتے ہوئے کہا۔ "آہ رباب یہ سب تمہاری خاموش آہوں اور دلدوز آنسوؤں کا نتیجہ ہے" جعفری اس کے منہ سے رباب کا نام سن کر چونکا اور بغیر کچھ کہے وہاں سے چل دیا۔ اور موٹر میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ اور راستے میں یہ سوچتا رہا کہ وہاں جا کر اس کی وجہ رباب سے دریافت کریگا۔ مگر جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ رباب کی سانس اکھڑ چکی ہے اور وہ سسکیاں لے رہی ہے۔ رئیس قریب گیا اس کو دیکھ کر رباب نے آنکھیں کھولدیں اور بولی کہ دیکھو رئیس تم انیس کو دکھ نہ دینا اور میری خطاؤں کو معاف کرنا اچھا ڈاکٹر بتاؤ تمہارا وہ مریض کیسا ہے جس کا نام رشیدی تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ تو ختم ہو گیا یہ کہہ کر اس نے رباب کے سیمیں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ رباب مسکرائی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ رئیس سر پکڑ کر رہ گیا۔ آہ!

نازاصغر بلگرامی

خم خانۂ فطرت

ہر وادیٔ نسریں کہ ہے فردوس بداماں
ہر غنچۂ سیمیں کہ ہے اک شمع شبستاں
ہر لالۂ رنگیں کہ ہے خورشید درخشاں
یہ موج نظر ہے کہ تجلی کے اشارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

وہ دامن مشرق کہ بس اک چشمۂ زریں
وہ ابر خرامیدہ میں اک جلوۂ رنگیں
رشحات درخشاں کا وہ اک جام بلوریں
جلوے کہ تڑپتے ہوئے دریا کے کنارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

ہر چشمۂ سیمیں کی وہ خورشید جبینی
گلگشت قمر کی دم شب ابر نشینی
جگنو کی فضاؤں میں وہ یاقوت نگینی
بھیگی ہوئی راتوں میں جھلکتے ہوئے تارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

یہ صبح بہاراں ہے کہ ہے گلگونی راحت
شام چمنستان ہے کہ تنویر صباحت
باد طرب آگیں ہے کہ پیمانۂ عشرت
راتیں کہ حسیں جیسے کوئی بال سنوارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

کاشانۂ راحت ہے شبستان تمنا
میخانۂ عشرت ہے خمستان تمنا
شاداب مسرت ہے گلستان تمنا
وہ کیف خرامیدہ کے خاموش اشارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

وہ چاندنی راتوں میں تبسم کے قرینے
وہ کیف وہ دریا کے دھڑکتے ہوئے سینے
پانی پہ جھلکتے ہوئے گرداوں کے نگینے
جیسے کوئی آئینے پہ تصویر اتارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

ہر غنچۂ نورس میں چٹکنے کی وہ مستی
شبنم ہے کہ اک عشرت شبگوں ہے برستی
اونچے پہ پپیہے کی صداؤں کی وہ پستی
جیسے کہ مری روح کہیں مجھ کو پکارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

طفلی کی بہاریں وہ جوانی کے زمانے
وہ عشق کے چرچے، وہ محبت کے ترانے
تابندہ خیالات میں تابندہ فسانے
سینوں میں مچلتے ہوئے ارمان ہمارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

عالم ہمہ نیرنگی خوابیدہ نغمہ
ہر موج نظر جلوہ نمدیدہ نغمہ
ہر تار نفس، گرمی شوریدہ نغمہ
وہ کشتی دل موج ترنم کے سہارے
فردوس نظر بن گئے ہستی کے نظارے

صہبا (لکھنوی)

بیرسٹر کی بیوی

[مسٹر ورما حال میں بیرسٹری پاس کر کے ولایت سے آئے ہیں الہ آباد میں پریکٹس کرتے ہیں ان کی بیوی شانتی دیوی شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ بڑی نیک شوہر پرست اور صبر کی دیوی ہے بیرسٹر صاحب باہر کی عورتوں سے زیادہ مانوس ہیں غیر عورتوں میں زیادہ رہتے ہیں۔ بڑی رات تک انہیں کے ساتھ کلب میں تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ گانا بجانا ہنسی دل لگی سیر و تفریح انہیں کے ساتھ۔ شانتی دیوی ایک عرصے سے یہ سب تماشے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ لیکن شوہر کی ناراضگی کے خیال سے منہ سے اف تک نہیں نکالتی مگر جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو ایک روز شوہر سے کہنا شروع کرتی ہے۔]

پہلا سین

شانتی دیوی۔ (شوہر سے) پران ناتھ۔ برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔

بیرسٹر۔ کہو کیا کہتی ہو۔

شانتی دیوی۔ آپ تو ولایت میں رہ کر آئے ہیں۔ کیا اس دیش کی یہی ریت ہے کہ بیوی گھر میں ہوتے ہوئے میاں گلیوں گلیوں مارے پھرتے ہیں۔

بیرسٹر۔ (غصے سے) میں کچھ نہ سمجھا کہ تمہارے سوال کا مطلب کیا ہے صاف صاف کہو۔

شانتی دیوی۔ آخر آپ کن کن آوارہ گرد۔ اچھال چھکوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے پھرتے ہیں۔ ادھر کچہری سے آئے اور سیدھے کلب میں۔ وہاں سے آئے تو گیارہ بجے۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ کالی میموں سے ہر وقت گھرے رہتے ہیں۔ جب دیکھو موٹر میں ایک نہ ایک کوا پری موجود ہے۔ آخر میرا بھی تو آپ پر کچھ حق ہے۔ آخر آپ کی دل بستگی کے لیے میں کیا کم ہوں تاش مجھ سے کھیلئے۔ باجہ میرا سنیے۔ گانا بھی مجھے آتا ہے۔ شکل صورت کا اگر سوال ہو تو کسی دن اس کا بھی مقابلہ کرا لیجیے۔

بیرسٹر۔ (غصے میں) بس بس۔ طول طویل تقریر سے میرا دماغ پریشان مت کرو۔

مجھے معلوم ہو گیا تم ہندستانی ہو۔ تمہارا دل پاپ سے بھرا ہوا ہے۔ تم ہر شخص کو اپنی طرح بے ایمان اور دغاباز سمجھتی ہو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں انگلستان میں رہ کر آیا ہوں وہاں کے مرد اور عورتیں صاف دل اور پاک محبت کے ساتھ آپس میں میل جول رکھتے ہیں اور کوئی کسی پر ناپاک شبہ نہیں کرتا۔ آخر تم چاہتی کیا ہو۔ کیا میں رات دن چوبیس گھنٹے تمہارے دامن سے بندھا بیٹھا رہوں نہ کہیں آؤں نہ جاؤں نہ کسی سے ملوں نہ جلوں نہ اپنے یہاں کسی کو آنے دوں۔ خوب! تو پھر اپنے پیشے کو بھی ترک کر دوں جس میں میل جول اور جلت پھرت کی بیحد ضرورت ہے۔ بس مہربانی کر کے آج تو یہ بات کہی ہے آیندہ نہ کہنا۔ میں تمہاری خاطر اپنے کو بداخلاق اور ان سوشل کہلانا پسند نہ کروں گا۔

شانتی۔ بس بس پران پیارے اتنے ناراض نہ ہو۔ معاف کرو۔ بھول ہو گئی۔ اب آیندہ نہ بولوں گی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اتنے ناراض ہوں گے۔

(شانتی رونے لگتی ہے)

دوسرا سین

[شیتلا کماری پڑوسن بابو گجادھر سنگھ ایڈوکیٹ

کی بیوی آتی ہیں اور شانتی دیوی سے باتیں کرتی ہیں]
شیتلا کماری۔ بہن آج تمہارا منہ بہت اترا اترا ہے خیر تو
ہے۔ کچھ بیمار تو نہیں ہو۔
شانتی۔ نہیں بہن بیمار تو نہیں ہوں مگر بیمار سے بدتر
کیا کروں کرموں کے پھل بھوگ رہی ہوں۔ پیدا ہوتے
ہی مر گئی ہوتی تو آج یہہ دکھ تو نہ دیکھنا پڑتا۔
شیتلا کماری۔ آخر کچھ معلوم تو ہو۔ کیا دکھ تم پر ہے
میں بھی تو سنوں۔
شانتی۔ بہن وہی دکھ جو تم سے چھپا ہوا نہیں ہے
بیرسٹر صاحب کی آوارہ مزاجی کل میں نے دل مضبوط
کرکے کہدیا کہ آپ کیا کر رہے ہیں اسی پر وہ بہت
بگڑے اور وہ وہ باتیں مجھے سنائیں کہ بس میرا ہی دل
جانتا ہے۔ بس اب میرے سامنے دو کام ہیں جن کو
میں کرکے ہمیشہ کے لیے اس ٹنٹے کو ختم کر دوں۔ ایک
تو یہہ کہ زہر کھا کر مر جاوں یا پھر ماں باپ کے گھر چلی
جاوں۔ مجھ سے یہہ تماشے اب نہ دیکھے جائیں گے
کلیجہ پیپ ہو گیا۔ آخر کب تک ضبط کروں۔
شیتلا کماری۔ اری بہن تم بھی یوں ہی ہو۔ ذرا سی بات
میں ایسی گھبرائیں کہ پران دینے پر تیار ہو گئیں
یہہ مرد سارے دنیا کے ایسے ہی ہوتے ہیں کہتے تو ہیں کہ استری
ذات بیوفا ہوتی ہے۔ اس پر بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالی
ہیں۔ مگر کوئی انصاف والا دیکھے تو پتہ چلے کہ بیوفا
اور مطلبی کون ہے؟ ان کے ہاتھ میں قلم ہے جو چاہیں
لکھ لیں ان کی بابت تو یہہ مثل سچی اترتی ہے۔
بھونرا لوبھی پھول کا کلی کلی رس لے۔ گھبرائیں نہیں وقت
آ گیا ہے ان کی وفاداریوں کی قلعی عورتیں کھولیں گی
ذرا ویمن کالجوں کو گریجوئیٹ لیڈیاں نکلنے تو دو
وہ ان صدی کھوڑ من والے مردوں کو مزہ چکھا دیں گی
تم بیرسٹر صاحب سے کہو کہ تم جس دیس میں پڑھ کر آئے
ہو وہاں کی عورتیں تو مردوں کے دلوں پر یا دلوں پر
نہ سہی جسموں پر راج کر رہی ہیں۔ تم انگریزوں کی خالی
آزادی سیکھ کر آئے ہو یا ان کی اور اچھی باتوں پر بھی
دھیان دیا ہے۔ بہن تم مت گھبراو۔ میں بھی پہلے
ان پریشانیوں میں پڑ گئی تھی۔ مگر مولانا خاموش فتحپوری
ایڈیٹر دلچسپ اخبار فتحپور ہسوہ کی لکھی ہوئی کتاب
"ساجن موہنی" پڑھ کر نشچنت ہو گئی۔ ایشور ان کا بھلا
کرے کہ ہم استریوں کی سہایتا اپنے قلم اور زبان
سے ایسی کر رہے ہیں کہ ہمارا رواں رواں شکریہ ادا
کر رہا ہے۔ مہاتما ہیں۔ مہاتما اس کتاب میں عورتوں کو
ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ ان کے پتی اپنے آپ
بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے خود بخود تابعدار بن جاتے
ہیں خیر اب تم اپنا من شانت رکھو۔ تمہارا تو نام شانتی
ہے۔ پھر ایسی اشانت اور بے صبری کیوں ہوئی
جاتی ہو۔
[شیتلا کماری شانتی کے کان میں منہ لگا کر کچھ کہتی
ہے اور یہہ کہتی ہوئی چل دیتی ہے]
شیتلا کماری۔ دیکھو یہہ بات پھوٹنے نہ پائے۔
ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔ کسی سے ذکر نہ کرنا۔ دیکھو تو ٹوٹکا
کیا کرتا ہے۔

تیسرا سین

[اتوار کی تعطیل ہے ورما جی آج بیفکری سے
چائے پی کر اپنے ڈرائنگ روم میں اپنے دوست مس
ٹولیس اور مسز واڈیا کے ساتھ کیرم کھیل رہے ہیں
شانتی دیوی آج خلاف معمول تیار ہو کر بالوں کو
سنوار کر نئی ساڑی پہنے ہوئے کسی کے انتظار میں سامنے
والے برآمدے میں کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔
[ایک موٹر ہارن بجاتی ہوئی بنگلے کے صحن میں
داخل ہوتی ہے۔ ایک سکھ نوجوان سر پر صافہ باندھے

ہوئے سوٹ بوٹ میں موٹر سے اتر کر شانتی دیوی کے پاس آتا ہے اور ہاتھ ملا کر کہتا ہے]

نوجوان۔ چلو جمنا پر سیر کریں۔ آج ساون کا پہلا دن ہے بڑا لطف آرہا ہے۔

[شانتی دیوی اٹھتی ہے اور زور سے پکار کر کہتی ہے]۔

شانتی۔ بیرسٹر صاحب!! بنگلے سے خبردار! میں ذرا تفریح کے لیے باہر جا رہی ہوں۔ رسویا سے کہدیجے (؟) رسوی تیار رکھے میں ۱۲ بجے کے قریب لوٹوں گی۔

[بیرسٹر صاحب بیوی کے منہ سے نئی بات سن کر چونک پڑتے ہیں اور کھیل چھوڑ کر ڈرائنگ روم سے باہر آکر پریشان اور گھبراہٹ اور غصے میں کہتے ہیں۔]

بیرسٹر۔ ہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیسی تفریح کہاں کی سیر اور کس کے ساتھ جا رہی ہو یہہ کون ہے۔

شانتی۔ آپ تو ولایت میں رہ کر آئے ہیں۔ ایسی تنگ خیالی! ہمارا من صاف ہے۔ پاپیوں کی طرح بدگمانی اچھی نہیں۔ آخر میری بھی جان ہے۔ میں بھی ذرا دل بہلاؤں۔

[اتنا کہہ کر شانتی پھرتی سے موٹر کار میں جا بیٹھتی ہے اور موٹر پوں پوں کرتی ہوئی چل دیتی ہے۔

بیرسٹر صاحب بدحواس ہو جاتے ہیں نوکروں سے پوچھتے ہیں۔]

بیرسٹر۔ کیں تم لوگ جانتے ہو یہہ سکھ کون تھا کیا پہلے بھی کبھی یہاں آیا ہے؟

نوکر۔ نہیں حضور ہم نے تو آج ہی دیکھا ہے۔ یہاں ہمارے بنگلے پر مرد تو مرد کوئی عورت بھی کبھی نہیں آتی۔ بس ایک وکیل صاحب کی بیوی کبھی کبھی آجاتی ہیں۔ کل بھی آئی تھیں۔

[بیرسٹر صاحب غصے سے کانپتے ہوئے]

بیرسٹر۔ ڈرائیور ہے۔

ڈرائیور۔ حضور حاضر ہوں۔

بیرسٹر۔ موٹر جلدی لاؤ۔

ڈرائیور۔ حضور پٹرول نہیں ہے۔

بیرسٹر۔ او ظالم کیا وقت پر عذر نکالا ہے۔ کیا تو بھی اس مردود عورت سے سازباز کر چکا ہے۔

ڈرائیور۔ حضور وہ تو میری ماتا سمان ہیں۔

بیرسٹر۔ بکومت جلدی پٹرول لاؤ۔ بس موٹر لاؤ۔ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔

نوکر۔ حضور چاے تیار ہے۔

بیرسٹر۔ سور کا بچہ۔ تجھے چاے کی سوجھی ہے۔ چولھے میں جاے تو اور تیری چاے۔ ہٹ میرے سامنے سے۔

دوسرا نوکر۔ سرکار بڑے کمرے میں تالا تو ڈال دیجیے مالکنی تو ہیں نہیں۔ آپ بھی باہر جا رہے ہیں۔ ہم غریب ڈرتے ہیں۔ کوئی کچھ لے جاے۔ نام ہمارا لگے۔

بیرسٹر۔ پاجی کہیں کا۔ بنگلے میں آگ لگا دو۔ لٹ جانے دو۔

ڈرائیور۔ ڈرائیور۔ موٹر لاؤ۔ پٹرول نہیں ہے۔ نہیں ہے تو یوں ہی لے چلو۔

نوکر۔ آج بالشٹر صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ کہتے ہیں۔ بغیر پٹرول ہی کے موٹر لے چلو۔

[ڈرائیور نے پٹرول ڈالا۔ موٹر تیار ہے۔ بیرسٹر صاحب نے کچھ لکھا اور لفافے میں بند کر کے نوکر کو دیا اور کہا]

بیرسٹر۔ دیکھو اگر ہم نہ آئیں تو تم ہمارا یہ لفافہ تھانہ دار صاحب کو دیدینا۔

[یہہ کہہ کر ریوالور صندوق سے نکالا اور اس میں کارتوس بھرے۔ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور موٹر میں بیٹھ گئے۔]

بیرسٹر۔ (ڈرائیور سے) تم کو معلوم ہے کہ وہ بدمعاش سکھ کدھر گیا۔

ڈرائیور۔ وہ جمنا کنارے کہہ رہے تھے۔ بس تربینی کے سنگم پر گئے ہوں گے۔ وہیں لوگ سیر کو زیادہ جایا کرتے ہیں۔

بیرسٹر۔ بس وہیں لے چلو جلدی کرو۔

[موٹر روانہ ہو گئی اور جمنا کے کنارے پہنچی۔ جہاں شانتی دیوی اپنے سکھ دوست کے ساتھ تاش کھیل رہی ہے۔ خاصدان میں گلوریاں بھی بنی رکھی ہیں۔ ایک طرف دونوں میں کچھ مٹھائی اور دال سیو بھی رکھے ہیں۔ سکھ ہنس ہنس کر بار بار شانتی دیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھدیتا ہے۔

بیرسٹر یہہ منظر دیکھ کر تھر تھر غصے سے کانپ رہا ہے اور پستول جیب سے نکالتے ہوے کہتا ہے]

بیرسٹر۔ اے بدمعاش اپنا نام پتہ بتا کہ تو کون ہے تاکہ بے نام و نشان کتے کی موت نہ مارا جاے۔ او بےحیا عورت باپ دادا کے نام پر کلنک کا ٹیکہ لگانے والی عورت تو بھی تیار ہو جا تاکہ ساتھ ساتھ اپنے یار کے نرک میں جا۔

شانتی۔ (ہنستے ہوے) بیرسٹر صاحب آپ کو کیا ہو گیا آپ تو ولایت میں رہ کر آے ہیں آپ کے من میں ایسا پاپ کیوں سما گیا ہم تو پاک محبت اور شدھ پریم سے دل بہلا رہے ہیں اور آپ بھی شریک لطف ہو جائیے۔ شک اور بدگمانی کے گناہ میں نہ پڑیے۔

[بیرسٹر کانپتے ہوے ہاتھ سے ریوالور کو سکھ جنٹلمن کی طرف نشانہ جماتے ہوے]

بیرسٹر۔ اچھا اچھا دیدہ دلیر زبان دراز بےحیا بےشرم فاحشہ عورت ابھی مزہ چکھاتا ہوں اب تیرے پاجی دوست کو دل بہلانے کے لیے نرک کنڈ کے کنارے بھیج رہا ہوں۔

[جب شانتی دیوی نے دیکھا کہ بیرسٹر واقعی ریوالور کا فیر کرنے کو ہے تو وہ چلا اٹھتی ہے]

شانتی۔ بیرسٹر صاحب ذرا صبر کیجیے۔ ٹھیریے، بات تو سنیے۔ [سکھ نوجوان اپنی داڑھی نوچکر پھینکدیتا ہے اور صافہ اتار کر لمبے بال کھول دیتا ہے اور کوٹ پتلون بھی جدا کر دیتا ہے]

ایک آواز۔ بھیا ورما جی کیا کر رہے ہو میں تو تمھاری بہن شیلا کماری ہوں یہہ دیکھو ذرا ہوش تو کرو۔

[بس یہہ منظر دیکھ کر بیرسٹر صاحب ریوالور پھینک کر زمین پر گر کر بیہوش ہو جاتے ہیں۔ دونوں عورتیں منہ پر پانی چھڑک اور ساڑیوں کے آنچل سے ہوا دیکر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی ہیں آخر موٹر میں ڈال کر بنگلے پر لاتی ہیں۔ وکیل صاحب گجادھر سنگھ بھی آ جاتے ہیں اور باتیں ہو رہی ہیں]

وکیل۔ (بیرسٹر سے) واہ حضور آپ نے تو اپنے گھر کے ساتھ میرا گھر بھی برباد کر دیا تھا۔

بیرسٹر۔ ارے بھائی میں تو پاگل ہو گیا تھا میں ارادہ کر کے گھر سے نکلا تھا کہ ان دونوں کو ختم کر کے ایک گولی اپنے بھی ماروں گا۔ غضب کیا ان دونوں نے۔ ابھی تین لاشیں تھانے میں جاتیں۔ رام رام ایسی دل لگی بھی کس کام کی۔ میں تو اپنے بنگلے اور سامان کا مالک یہاں کے اناتھ رسے کو لکھ گیا تھا۔ دیکھو لفافہ رکھا ہو گا۔

شانتی دیوی۔ یہہ قصور تو میں آپ سے بعد میں معاف کرالوں گی اب یہہ بتاییے کہ میرے دل کو بھی وہی دکھ ہوتا ہے یا نہیں جو آپ کو ہوا ہے۔ آخر نہ ہونا کیا معنی میں بھی تو وہی انسان ہوں۔

بیرسٹر۔ ہاں بابا میں مانتا ہوں اور آیندہ کے لیے یورپ کی نقل سے توبہ کرتا ہوں۔ بس اب معاف کرو مجھ سے ایسی حرکت کبھی نہ ہو گی۔

خاموش (فتحپوری)
ایڈیٹر "دلچسپ"

حسین پنہاری

کس شان سے پنگھٹ کو چلی ہے وہ ستمگر
اک ہاتھ سے پہلو میں دبائے ہوئے گاگر
اٹھلاتی ہوئی جاتی ہے مستانہ ادا سے
خورشید بناتی ہوئی نقش کف پا سے
پازیب کی جھنکار سے محشر سا اٹھاتی
سوئے ہوئے جذبات کی بستی کو جگاتی
احساس کی دنیا میں تلاطم سا اٹھاتی
ان چشم سیہ مست سے جادو کو جگاتی
ہیں کیف میں ڈوبی ہوئی مستانہ ادائیں
دو جام چھلکتے ہوئے مخمور نگاہیں
چلتا ہوا تعویذ محبت کی نگاہیں
گرویدہ بنا سکتی ہیں اپنا جسے چاہیں
نکھرے ہوئے دو پھول ہیں رخسار گلابی
غمزے بھی شرابی ہیں وہ آنکھیں بھی شرابی
گردن وہ صراحی سی تو چہرہ وہ کتابی
دو مصرع ہیں رنگیں وہ دو ہونٹ گلابی
یاقوت سے ہونٹوں پہ ہے یہ پان کا لاکھا
یا حسن کے جلووں کی ہے سمٹی ہوئی دنیا
ہونٹوں پہ ہے امڈا ہوا سیلاب تبسم
بجتی ہوئی چوڑی کا وہ میٹھا سا ترنم
یہ چاند سے ماتھے پہ ہے سیندور کا ٹیکا
یا حسن کے آکاش پہ روشن سا ستارہ
کانوں میں جھلکتے ہوئے سونے کے کرن پھول
وہ پھول سراپا ہے نظر پھول بدن پھول
پیچیدہ سی زلفیں ہیں شکستہ خط تقدیر
قدرت کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کی ہے تحریر
ابرو ہیں کماں تیر وہ مژگاں ارے توبہ
غارت گر دیں رہزن ایماں ارے توبہ
سینے پہ حمایل کی بہاریں ارے توبہ
وہ پھول سے چہرے پہ نکھاریں ارے توبہ
موتی سے چمکتے ہوئے دانتوں کی قطاریں
نکھری ہوئی رنگت پہ جوانی کی بہاریں
اللہ رے یہ حسن یہ جوبن یہ جوانی
نظروں میں یہ تاثیر کہ پتھر بھی ہوں پانی
ماتھے پہ جھلکتے ہوئے آثار جوانی
پلکوں سے ٹپکتا ہوا انگور کا پانی
شاداب سے چہرے پہ عرق شرم کے مارے
یا حسن کے آکاش پہ بکھرے ہوئے تارے
ہے گوشۂ ابرو کے قریں خال دلآرا
یا چاند کی منزل میں ہے دمدار ستارا
پرکیف پسینے میں چنبیلی کی سی خوشبو
وہ عطر عروسی سے مہکتے ہوئے گیسو
بھونچال کو دامن میں لیے جنبش ابرو
دنیا کو ہلا سکتے ہیں ہلتے ہوئے بازو
خوش وضع خوش اخلاق خوش اطوار پری رو
ہر بات میں اعجاز ہر آواز میں جادو
اعضا میں تناسب ارے سبحان تعالے
صد حشر در آغوش ہے گویا قد بالا

صابر (امنھیالوی)

مسافر

مسافر یہاں تیری منزل نہیں ہے

—— ۱ ——

حدود جہاں سے گذرتا چلا جا
ہر اک بوستاں سے گذرتا چلا جا
زمان و مکاں سے گذرتا چلا جا
یہ رنگ جہاں تیرے قابل نہیں ہے
مسافر یہاں تیری منزل نہیں ہے

—— ۲ ——

ترا ہر قدم کیوں نہیں تازیانہ
ترا ہر عمل کیوں نہیں باغیانہ
تری ہر نظر کیوں نہیں شاعرانہ
بلا سے اگر کوئی محمل نہیں ہے
مسافر یہاں تیری منزل نہیں ہے

—— ۳ ——

غرض کیا تجھے آسمان و زمیں سے
تجھے کیا تعلق کسی مہ جبیں سے
بدل اپنی دوزخ کو خلد بریں سے
وہاں چل جہاں فکر حاصل نہیں ہے
مسافر یہاں تیری منزل نہیں ہے

—— ۴ ——

یہ دنیا تری راہ میں آئے بھی کیوں
کوئی تیرا افسانہ دہرائے بھی کیوں
محبت تری روح پر چھائے بھی کیوں
کہ تو وقف سوز سلاسل نہیں ہے
مسافر یہاں تیری منزل نہیں ہے

—— ۵ ——

فضا رقص میں ہو، ہوا گنگنائے
گھر لاکھ باد بہاری لٹائے
مگر ہاں لبوں پر تبسم نہ آئے
کہ پہلو میں جیسے ترے دل نہیں ہے
مسافر یہاں تیری منزل نہیں ہے

—— ۶ ——

پیے جا مئے عشرت نوجوانی
ہے تیرے لیے راز کی نغمہ خوانی
یونہی بہنے دے کشتی زندگانی
سمجھ لے کہیں تیرا ساحل نہیں ہے
مسافر یہاں تیری منزل نہیں ہے

راز ہاشمی

غزل

اللہ رے معجزہ یہ نسیم بہار کا
آنے لگا خیال پھر اس گلعذار کا

ساقی کی یاد دل سے نکلتی نہیں کبھی
عالم ہے مجھ پہ ایک نوکھے خمار کا

اب فرق کچھ نہیں ہے سیاہ و سپید میں
یہ رنگ ہے جہان کے لیل و نہار کا

مجبور ہو کے میرے کہے میں نہیں ہے یہ
اب کیا علاج اس دل بے اختیار کا

کیا کیجیے تمیز اب اپنے پرائے میں
ہاں وقت یہ نہیں ہے کسی اعتبار کا

عزت سے آبرو سے گذرتی ہے زندگی
احسان مجھ پہ ہے مرے پروردگار کا

عاجز خدا کی دین جوانی ہے آ چکی
اب ہے ریاض دہر میں موسم بہار کا

[illegible] سکینہ عاجز

چھکڑا

کچے راستے پر بیل گاڑیاں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بیل بلکل تھک گئے ہیں۔ دور مغرب میں ارغوانی پہاڑیوں کے پیچھے چاند چھپ رہا تھا۔ دھندلی دھندلی چاندنی کہسار سے ہم آغوش ہوکر وداعی بوسے لے رہی تھی، ایک آم کے درخت پر کوئی فراق آشنا کویل اپنی مخصوص اور دردانگیز آواز میں کوک رہی تھی، کوئی الم نصیب میٹھے اور وجد آگین راگ الاپ کر کسی کی جدائی کے احساس کو مٹا رہا تھا۔ پرندے فضائے بسیط میں اپنے پروں کی آواز پھیلاتے ہوئے گذر رہے تھے لمبا لڑن نیلی زادِ سفر باندھے راستہ پر چھکڑوں کا انتظار کر رہی تھی۔

”ذرا یہ رکھ لیگا دادا؟“ اس نے ایک بنڈی والے کو مخاطب کیا۔

”کہاں جاسے گی؟“ نوجوان بنڈی والے نے پوچھا۔

”[illegible]“ نیلی نے جواب دیا۔

”اچھا!“ نوجوان نے چھکڑا روکتے ہوئے کہا۔

راجو کی بنڈی رکتے ہی پیچھے کی تمام بنڈیاں رک گئیں۔ نیلی اپنا سامان تیزی سے رکھنے لگی وہ جب سامان لینے جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ایک کبک ہے جو نازک خرامی کر رہا ہے یا ایک مور ہے جو مست ہوکر ناچ رہا ہے اس کے پیر کے پیتلی زیور کی دلفریب آواز ساز کا کام دے رہی تھی۔

نیلی اور اس کے والدین یہاں سے دور چلے جا رہے تھے اس واسطے کہ یہاں مویشیوں کے لیے چارے اور پانی کی قلت تھی کبھی کبھی خود ان کو بھی پانی میسر نہ ہوتا تھا۔ اب وہ ایک ایسی جگہ جا رہے تھے جہاں جانوروں کے لیے چارے اور پانی کی فراوانی ہو، پیس اور پٹیل کے مظالم کم ہوں اور کچھ مزدوری بھی مل سکے۔ یوں تو ان کی گذر جانوروں ہی پر ہوا کرتی تھی لیکن گھر کے بیکار افراد کو مزدوری کے بغیر چین کہاں۔

”ہوگیا دادا!“ نیلی نے راجو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”دور دیکھنے والے راجو نے چونک کر کہا ”بیٹھیگی نا؟“

”اوں ــــ نہیں بیٹھوں گی ــــ تھوڑی دور تو ہے یہاں سے!“ نیلی نے اپنی غزالی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا ”یہاں بیٹھ ــــ جگہ بہت ہے!“ نوجوان راجو نے اپنے بازو کی خالی جگہ پر ہاتھ مار کر کہا۔ نیلی بیٹھ گئی چھکڑا چلنے لگا۔ صبح ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی سردی پڑ رہی تھی۔ لمبا لڑن نیلی دوشیزگی کی لطیف مسکراہٹوں سے راجو کو دیکھ رہی تھی راجو بھی مسکراہٹوں کا جواب دے رہا تھا۔ ایک دفعہ راجو نے بیل کو مارنے کے لیئے چابک جھٹکے سے جو گھمایا تو نیلی کے سینے پر لگا۔ نیلی کے سینے میں قیامت خیز تلاطم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی جوانی کے پورے ساحرانہ اور پرخمار انداز سے راجو کو دیکھ کر ایک ہلکا سا تبسم کیا۔ بنڈی کو ایک زوردار دھچکا ہوا۔

”کیوں ــــ یہاں آئی ہے ناچوٹ؟“ راجو نے چابک کی لکڑی سے نیلی کا رخسار چھوتے ہوئے کہا۔

”نہیں ــــ یہاں“ اس نے سینے پر رکھے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے سر سے اوڑھنی ڈھلک گئی اور وہ ہل کر سیدھے بیٹھ گئی۔ بنڈی کا ایک چاک پتھر سے ٹکرا گیا۔

”وہ ٹیلے پر اترے ہیں ہم!“ نیلی نے ندی کے پار اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا ــــ میں تو بنڈی ادھر ہی سے لیجایا کرتا ہوں۔“

”تو روز آتا ہے ادھر سے!“ نیلی نے کسی جذبہ کے تحت خوش ہوکر پوچھا۔

"ہاں میں روز بھرتی لیجایا کرتا ہوں"، راجو نے بیل کو مڑنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ندی آگئی۔ نیلی تصورات اور مستقبل کے تخیلات میں کھوگئی۔ ندی کے چاروں طرف رنگینی بکھری ہوئی تھی۔ پانی کی سہمیں دھاریں طلوع ہونے والے سورج کی ہلکی شعاعیں بنفشئی رنگ پیدا کر رہی تھی۔ کنارے کی مخصوص بو قلب و دماغ کو معطر و معنبر کر رہی تھی۔ ریت میں بیل گاڑی چلنے سے ایک ہلکا نغمہ پیدا ہو رہا تھا۔ بنڈی دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ نیلی نے ایک رخصتی نگاہ سے راجو کو دیکھا وہ سوچ رہا تھا نہ جانے کیا۔ معاً۔ وہ نیلی سے مخاطب ہوکر بولا "جائے گی نا یہاں سے"۔

"ہاں دادا" نیلی نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

"اچھا!" راجو نے ایسا کہا جیسے اسے کچھ صدمہ پہنچا ہے۔

نیلی اپنا سامان اتار کر ایک وداعی اور تشکر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ میخانہ بدوش نگاہوں سے راجو کو دیکھتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

دوسرے دن نیلی کھڑی راجو کا انتظار کر رہی تھی آج وہ بھرتی لیجانے والا تھا۔ سورج پہاڑ اور ابرپاروں کی اوٹ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کوئی عروس نو محجوب انداز سے دیکھ رہی ہو۔ بادلوں کے کاررواں کے کارواں اڑے جا رہے تھے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے موسم خوشگوار اور ندی کا منظر دل فریب معلوم ہو رہا تھا دور تک پھیلے ہوئے جوار کے کھیتوں کا سلسلہ کسی کی کامیابی پر خوب جھوم جا رہا تھا کوئی چھکڑے والا گیت الاپ کر اپنی تھکاوٹ کے احساس کو مٹا رہا تھا۔ گیت کو سن کر نیلی کا دل دھڑکنے لگا۔

راجو بھرتی لے کر آیا آج بھی اس کا چھکڑا آگے تھا نیلی اسے دور ہی سے دیکھ کر مسکرائی۔ راجو بھی مسکرایا پہلے تو وہ چھکڑے کے بازو بازو چلنے لگی اس کے بعد پیچھے چھکڑے کے لکڑیوں کا سہارا لے کر۔ راجو نے پوچھا "چلے گی کیا کہیں؟"

"نہیں تو ——— مجھے کہیں جانا تو ہے نہیں" نیلی نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"بیٹھ تو جا" راجو نے نیلی کی جانب مڑ کر کہا۔

وہ بیٹھ گئی تھوڑی دور جا کر اس نے اترنا چاہا۔ کیونکہ وہ اپنے مسکن سے دور ہوئی جا رہی تھی۔ اب اسے لوٹ جانا تھا پہلے تو راجو نے روکا۔ لیکن دوری کے خیال سے بعد میں اجازت دیدی ——— اس کے بعد روز اسی طرح ہونے لگا۔ روز راجو آتا اور نیلی کو بیل گاڑی میں بہت دور تک لیجاتا۔ وہ دونوں بھری جوانی کی امنگوں اور دل کی دھڑکنوں کو ایک دوسرے سے کہتے اور اس طرح اپنی آتما کو شانتی دیتے انھوں نے ایسی موزوں و مناسب راہ اختیار کی تھی کہ کسی کو ذرہ برابر شک و شبہہ کی گنجائش اور انگشت نمائی کا موقع نہ مل سکتا تھا۔

نیلی کا تصنع و تکلف سے بری حسن ہر روز نیا قیامت تماشے دکھانے لگا تھا ادھر گھر میں شادی کی فکر ہونے لگی تھی ادھر راجو عجیب و غریب خیالات اور موہوم امیدوں میں الجھا رہتا تھا۔ سوچتا کہ کتنی خوشگوار زندگی ہوگی اگر نیلی میری شریک زندگی بن جائے ...... ہم کتنے خوش و خرم رہیں گے۔ جوانی اور بھرپور زندگی ——— لیکن جب اسے اپنے شادی شدہ ہونے کا خیال آتا تو اس کے چہرے کی رنگینی غائب ہو جاتی اور مایوسیوں کی لہریں دوڑ جاتی۔ افق جوانی پر طلوع ہونے والا سورج ایکدم [illegible] میں غروب سا ہو جاتا اور وہ کچھ ملول آشفتہ سا ہو جاتا....

مگر جب نیلی سامنے آجاتی تو وہ اس کی جاذبیتوں اور رعنائیوں میں گم ہوجاتا اپنے تمام افکار بھول کر ایک ایسی لامحدود خوشی اور نامعلوم جذبات کو انگڑائیاں لیتے ہوئے محسوس کرتا جن کی شرح و تفہیم سے وہ خود قاصر تھا اس کے دل کا ضعف و عجز اس کی اجازت نہ دیتا کہ اپنے محسوسات نیلی سے کہدے اپنے جذبات کی ترجمانی کرے کبھی وہ اس خیال سے بھی گھبرا سا جاتا کہ اس کے شادی شدہ ہونے کی اطلاع نیلی کو مل جائے تو وہ یقیناً اور ضرور برہم ہوجائے گی اور اسے دکھ ہوگا۔ اس نے دانستہ یہ ساری باتیں چھپا رکھی تھیں۔ اور ان انبساط انگیز لمحوں میں یاس کی رنگ آمیزی کے خوف سے ہمیشہ ادہر ادہر کی باتیں کرتا غرض یوں ہی دن گزرتے گئے۔

نیلی کی سگائی ہوگئی وہ مضطرب و ملول ہوئی۔ اس نے کیا کیا امیدیں باندھی تھیں کیا کچھ سوچا تھا۔ اس کا کیا ذکر وہ تیرہ بختی پر آنسو بہانے لگی اور کوشش کرتی رہی کہ اس شادی کے چنگل سے آزاد ہوجائے۔ لیکن کوئی صورت نہ ہوئی آخر بڑوں کا کہنا ماننا پڑ رہا تھا۔

آج نیلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجو سے سب کچھ کہدے۔ وقت سے پہلے ہی وہ انتظار کرتے کھڑی تھی۔ اس کے سر سے آج اوڑھنی بار بار ڈھلکتے ہی تھی، دل میں رہ رہ کر ایک عجیب کیفیت اور ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ انتظار اور پیہم انتظار کے باوجود بھی راجو کا چھکڑا نہیں آیا۔ وہ ناامید ہوکر لوٹ جانے کو ہی تھی کہ دور ایک بیل گاڑی گرد اڑاتے دکھائی دی مایوسیوں کی سطح پر امیدوں کے کنول کھل گئے۔ چھکڑا آتو آیا آج اس میں تھیلوں کی بھرتی کی۔ بجائے آدمیوں کی بھرتی تھی۔ ایک جوان لڑکی ایک بوڑھیا اور ایک بچہ ــــ نیلی حسب معمول راجو کو دیکھ کر مسکرائی اور بادل ناخواستہ راجو بھی مسکرایا لیکن اس جوش و انہماک اور خلوص کے ساتھ نہیں جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ نیلی کی ساری آشائیں اور تمنائیں عالم جانکنی میں سسکیاں لینے لگیں راجو نے پوچھا " چلے گی کیا نیلی"۔

نیلی نے یاس انگیز لہجے میں خشک مسکراہٹ کے ساتھ کہا "نہیں ــــ یہ کون ہیں ــ؟"

" یہ میری ماں ــــ اور یہ میرا بچہ ــــ اور یہ ــــ !"

نیلی نے ایک یاس آمیز آہٹ سے تینوں کو بہ یک نظر دیکھا۔

" ہم شادی میں جا رہے ہیں" راجو نے بیل کو ہانکتے ہوئے کہا۔

چھکڑا دور نکل گیا۔ نیلی کا سارا جسم ڈھیلا پڑ گیا ہر طرف موت کا سناٹا اور اداسی چھاگئی۔ نیلی اپنی اوڑھنی میں منہ چھپائے چپکے چپکے رو رہی تھی ــــ اس کے بعد نیلی کبھی چھکڑے کا انتظار کرنے آئی اور نہ راجو سے ملی۔

ساحر دیہاتی

رنگین نظارے

(۱)

وہ چاندنی رات اور وہ تابندہ ستارے
وہ سبزۂ ساحل کے طرب خیز نظارے
پانی پہ مچلتی ہوئی موجوں کے اشارے
جس طرح کوئی کاکل برہم کو سنوارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

(۲)

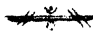
وہ ڈوبی ہوئی نشہ و مستی میں ہوائیں
بھیگی ہوئی وہ شبنم و صہبا میں فضائیں
پھیلی ہوئی ہر سمت وہ نورانی ردائیں
دریا میں نہائے ہوئے معصوم ستارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

(۳)

تم دل پہ گراتے تھے مرے برق تبسم
برساتے تھے ہر سمت فضاؤں سے ترنم
جذبات میں ہوتا تھا قیامت کا تلاطم
رقصاں تھے نگاہوں میں محبت کے شرارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

(۴)

وہ ناز وہ انداز وہ شوخی وہ تماشا
آغوش محبت میں محبت کا مچلنا
وہ رات کہ تھی ماحصل فردوس تمنا
اک جنت نظارہ تھی دریا کے کنارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے



(۵)

کس درجہ تھے دلچسپ وہ ایام محبت
ملتا تھا مجھے غیب سے پیغام محبت
چھٹتا نہ تھا ہونٹوں سے کبھی جام محبت
شاہد ہیں مری عشرت ماضی کے ستارے
کیا یاد ہیں تم کو بھی وہ رنگین نظارے

شوق ہاشمی

غزل

جھوٹا بھی ہائے وعدۂ فردا نہ ہو سکا
بندہ نواز آپ سے اتنا نہ ہو سکا

آتے ہیں وہ بھی میری عیادت کے واسطے
اچھا ہوا کہ میں کبھی اچھا نہ ہو سکا

جلوے نہاں تھے حسن کے سو سو حجاب میں
لیکن نگاہ شوق سے پردا نہ ہو سکا

ساقی کی چشم مست ہی صہبا بدوش تھی
ساقی رہین بادہ و مینا نہ ہو سکا

تھی عرض شوق باعث تسکین غم مگر
یہ بھی مزاج دل سے گوارا نہ ہو سکا

شاید یہی ہے شان مسیحائی آپ کی
بیمار غم بھی آپ سے اچھا نہ ہو سکا

حسن ازل کو دیکھتے سو بار دیکھتے
کیا حضرت کلیم سے اتنا نہ ہو سکا

دیکھیں ستم ظریفیاں تقدیر و وقت کی
سب کچھ ہوا پر ہم سے جو چاہا نہ ہو سکا

کیا اعتبار کیجئے محبت کسی پہ ہم
اپنا دل عزیز جب اپنا نہ ہو سکا

محبت امام آبادی (عثمانیہ)

ہندستانی ادب معاصروں کی نظر میں

ندیم
جولائی ۱۹۴۱ء

"ہندستانی ادب" ادب اور زبان کی خدمت ہی کیلیے جاری ہوا ہے۔ اور اس نے حیدر آباد کے ان ادیبوں اور شاعروں کو اپنے حلقے میں لے لیا ہے جن کے مضامین ملک کے علمی و ادبی رسالوں میں مدت سے پڑھے جا رہے ہیں۔ ان میں سے جناب عبدالقادر سروری، جناب ڈاکٹر حمید اللہ ام۔اے، پی ایچ ڈی، جناب علی اختر صاحب اختر، جناب علی منظور صاحب حیدر آبادی اور جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدر آبادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"ہندستانی ادب" کے نام جناب محمد عبدالرحمن خان صاحب سابق صدر کلیہ جامعۂ عثمانیہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبہ عربی الہ آباد اور مولوی سید سلیمان ندوی مدظلہ نے حوصلہ افزا پیامات بھیجے ہیں "ہندستانی" کے عنوان سے جناب سروری صاحب کا ایک قابل قدر مضمون ہے۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ یورپ کے مصنفین نے "ہندستانی زبان" سے مراد اردو ہی کو لیا ہے۔ پھر "سلطنت بہمنی کا اخلاقی سرمایہ ..... مرزا غالب کے خطوط دکنیوں کے نام" (جناب عمر یافعی) اور "شہاب ثاقب کے چند ٹکڑے" (جناب عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر کلیہ) وغیرہ، مفید اور پر از معلومات مضامین ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ ماہنامہ حیدر آباد کے ادیبوں اور شاعروں کی مساعی سے پروان چڑھے گا اور اس کے ذریعے سے ملک میں علم، ادب اور زبان کے مفید خدمات انجام پائیں گے۔

ادبی دنیا
جولائی ۱۹۴۱ء

حیدر آباد دکن سے یہ نیا رسالہ بعض خاص مقاصد کو لیکر اٹھا ہے۔ اس کے مدیر جناب غلام محمد خاں ام۔اے (عثمانیہ) ہیں اس رسالے کا سب سے بڑا مقصد ہندستانی ادب کو فروغ دینا ہے۔ لیکن زبان کے بارے میں یہ ایک خاص اصول کا پابند رہیگا یعنے فارسی رسم الخط میں خالص اردو الفاظ کی تبلیغ کرے گا۔ تاکہ ہندستان کی مشترکہ قومی زبان کی بجا خدمت ہو سکے۔ مضامین میں علم ادب، سائنس، ہر شعبے کی چیزیں اسمیں دکھائی دے سکتی ہیں۔ اور افسانوں کے علاوہ حصہ نظم بھی موجود ہے۔ بنیادی طور پر یہ رسالہ حیدر آباد دکن کی جواں سال روح حیات کا ترجمان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کے کارکنان میں بھی جوانی کا جوش اور ولولہ موجود نظر آتا ہے۔

امید کہ حیدر آباد کے دوسرے رسایل کے صف بصف یہ مجلہ بھی اپنے مقاصد کو پورا کرے گا۔ اور ہر قدم ترقی ہی کی طرف اٹھائے گا۔

چندہ سالانہ للعہ چار روپے فی پرچہ ۶ر ملنے کا پتہ
دفتر ہندستانی ادب حیدر آباد دکن

جامعہ
اگست ۱۹۴۱ء

جون ۱۹۴۱ء سے یہ ماہوار رسالہ غلام محمد خاں صاحب نے نکالنا شروع کیا ہے ہر قسم کے ادبی مختصر مضامین کے علاوہ دنیائے سائنس معلومات، دلچسپیاں اور علمی معلومات بھی دی گئی ہیں رسالے کی ترتیب اچھی ہے۔ ہر قسم کے مذاق کا خیال رکھا گیا ہے۔

ہمایوں
جولائی ۱۹۴۱ء

"ہندستانی ادب" غلام محمد خاں صاحب ام۔اے (عثمانیہ) نے حیدر آباد سے جاری کیا ہے، افسانے نظمیں اور تنقیدی و ادبی مضامین شایع کیے جاتے ہیں معیار تقاضا بتعریف ہے۔ حجم ۴۸ صفحات چندہ سالانہ للعہ
پتہ دفتر "ہندستانی ادب" حیدر آباد دکن

(باقی)

ایک غمزدہ دوست کے نام

میں جانتا ہوں تجھ کو بہت انتشار ہے — تو دولت سکون کے لیے بیقرار ہے
احساس ہے مجھے ترے حال تباہ کا — لیکن مآل کچھ نہیں اس اشک و آہ کا
میں بھی تو دیکھ تیری طرح پائمال ہوں — جور و جفائے اہل جہاں سے نڈھال ہوں
ناآشنائے درد نہیں ہے مری حیات — مجھ پر بھی چل چکا ہے فسون تغیرات
میں بھی تو دیکھتا ہوں زمانے کی دار و گیر — میں نے بھی کھائے ہیں خلش مدعا کے تیر
بے مہریوں نے مجھ کو بھی پامال کر دیا — رسم و رواج دہر نے بے حال کر دیا
مجھ کو بھی آرزوئے نشاط و سرور ہے — میری نگاہ کو بھی تمنائے نور ہے
مجھ کو بھی ہے تلاش سکون و قرار کی — تصویر بن گیا ہوں غم آشکار کی
طوفان اشک میرے بھی آنکھوں سے ہے بپا — میرا دل تباہ بھی ہے کشتۂ جفا
میرے شباب نے بھی بہت سے سہے ہیں غم — میرے لبوں پہ بھی تو ہے آہوں کا زیر و بم
مجبور زندگی ہوں، اسیر الم ہوں میں — لیکن ہر ایک راہ میں ثابت قدم ہوں میں
راتیں کٹے ہیں بس نے جینے کے یہ اصول — پھولوں کی جستجو ہو تو کانٹوں کو کر قبول
جشن غم زندگی میں ہے ہیبو دسیم و زر — اس بزم میں اٹھے گی نظر کیا غریب پر
دنیا اسی کا نام ہے اے پیکر الم — کوئی نہیں سنے گا تری داستان غم

جینا ہے گر جہاں میں تجھے ظلم اٹھائے جا
چھیڑے نہ برق ستم مسکرائے جا

تحسین سروری

غزل

میں کیا ہوں کیا بتاؤں دل سوگوار ہوں — یا ہوں چراغ خانہ یا شمع مزار ہوں
ظاہر میں ہوں گرفتۂ دام حیات گو — سچ پوچھیے تو مرگ پہ دل سے نثار ہوں
ان کی نظر میں رتبہ اکسیر خاک ہے — مشق خرام کیجیے اک مشت غبار ہوں
دریا بہا دیے مژہ اشکبار نے — کس منہ سے اب کہوں نفس شعلہ بار ہوں
دل بھی نیاز مند ہے میں بھی ورائے ناز — سوز و گداز عشق ہوں صبر و قرار ہوں
اس درجہ ہے لطیف مرا عالم خیال — رقص نسیم و لرزش موج بہار ہوں
اب میں ہوں اور جلوۂ شان "محبوبیت" — "مسجود شوق و محرم اسرار یار ہوں"
لب تشنہ ہوں میں ساقیا تھوڑی سی بیخودی — کیسا غرور ہوش؟ میں رنج خمار ہوں

مخفی ہیں ایک ساز میں نغمے ہزار ہا
موج نوائے راز کا ٹوٹا سا تار ہوں میں

حمیدہ بانو مخفی

تمنا

سواد دل میں مرے تم نگار بن کے رہو
مثال ماہ مبین جلوہ بار بن کے رہو

تبسموں میں نہاں کیف شرمگیں ہو کر
خدائے حسن کے رخ کا نکھار بن کے رہو

جبین شوق پہ رنگینی سحر ہو کر
دھڑکتے دل کا مرے تم قرار بن کے رہو

بہار و کیف کی بد مست کن فضاؤں میں
مثال طائر نغمہ شعار بن کے رہو

وہ گیت جو کہ تمنا کو گدگداتے ہیں
تم ایسے گیت میں برق و شرار بن کے رہو

اداس رات میں جب چاند ہو نہ تارے ہوں
نگاہ شوق میں تم انتظار بن کے رہو

جو دل رہا متنفر جلال شاہی سے
تم ایسے دل میں شہ کامگار بن کے رہو

شباب و شعر کی رنگینیوں میں گم ہو کر
حریم دل میں مرے نغمہ بار بن کے رہو

عروس بن کے جیو اور بہار بن کے رہو

شاہد (عثمانیہ) مدیر الموسیٰ


پنچولی آرٹ پروڈکشن "خزانچی" کے بعد پھر ایک مرتبہ آپکو حسین تستریوں کی
دعوت نظارہ دیرہا ہے!
یہہ ایک مقناطیسی کشش رکھنے
والا فلم ہے جو دلوں پر انمٹ
نقوش چھوڑتا ہے
خاندان
پنجشنبہ
۲۶ امرداد
۱۳۵۱ف
سے
اداکار
نورجہاں، منورما
غلام محمد، اجمل
پران کشن وغیرہ
نشاط سینما میں دیکھیے



فہرست مضامین

ہمارے خیالات

پروفیسر سروری | ہندستانی ادب کے پڑھنے والے یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ اس رسالے کے ایک مشہور لکھنے والے پروفیسر عبدالقادر سروری لکچرار جامعہ عثمانیہ کا تقرر جامعہ میسور کے شعبہ اردو کی صدارت پر ہوا ہے۔

پروفیسر سروری جامعہ عثمانیہ کے ایم اے، ال ال۔ بی ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی آپ کا تقرر کلیہ جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت جونیر لکچرار عمل میں آیا کچھ عرصہ بعد آپ لکچرار بنا دیے گئے اور آج تک اس خدمت کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

پروفیسر سروری جامعہ عثمانیہ کی اس پیداوار میں سے ایک ہیں جس پر جامعہ کو ناز ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہم نے جامعہ عثمانیہ کے ایک قابل فخر فرزند کا تذکرہ کیا تھا جس کی بیش بہا خدمات کے صلے میں جامعہ نے ڈی۔ ایس سی جیسا اہم ترین اعزاز بخشا تھا۔ اور اب ہمارے لیے یہ کچھ کم خوشی کا موقع نہیں ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے ایک کامیاب فرزند کی خدمات کی ضرورت ایک دوسری جامعہ نے محسوس کی۔

ہم جس جلیل القدر علمی عہدے کا ذکر کر رہے ہیں اس کے لیے ہندستان کی مختلف جامعات کے ڈاکٹر اور پروفیسر نیز ہندستان کے بعض مشہور مصنفین بھی کوشاں تھے لیکن ان سب پر پروفیسر سروری کو ترجیح دی گئی اور کامیابی کا سہرا جامعہ عثمانیہ کے سر رہا۔

ایک درجن قابل افراد کے مقابل گوئے سبقت کا حاصل کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس شاندار کامیابی کا راز کیا ہے؟ سعی سفارش یا اثر نہیں بلکہ ذاتی قابلیت اور انتھک علمی ادبی خدمات ہیں۔ پروفیسر موصوف کو ابتدا ہی سے علم و ادب کی دھن رہی ہے۔ ان کا شمار اپنے دور کے مشہور مضمون نگاروں میں تھا اور اب تک انھوں نے ایک درجن سے اونچی ٹھیٹ علمی ادبی کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ ان کے ذوق ادب کی پیاس ابھی بجھی نہیں بلکہ آئے دن اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ وہ آخر دم تک اس کام کے لیے وقف رہینگے۔

آخر میں ہم جامعہ عثمانیہ کی پوری برادری کیطرف سے پروفیسر صاحب کی خدمت میں، ان کی اس نمایاں اور شاندار کامیابی پر مبارکباد کا پرخلوص ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

کاغذ اور حکومت | ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ آجکل کاغذ کے سلسلے میں حکومت کی امداد ناگزیر ہے۔ حیدرآباد جیسے بڑے شہر میں اول تو علمی ادبی قسم کے رسالوں کی کمی ہے اور جو ہیں کاغذ کی ہنگائی کے سبب دم توڑ رہے ہیں۔ خریداروں کو جنگ کی گرانی کا بہانہ ہاتھ آگیا ہے اور یہ لوگ آہستہ آہستہ ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ ان حالات میں رسالے کا جاری رہنا مشکل ہے۔ اگر حکومت تھوڑی سی توجہ سے کام لے تو ہماری پریشانیوں میں بڑی حد تک کمی ہو سکتی ہے۔

ہم حکومت سے مکرر درخواست کرتے ہیں کہ وہ اخباروں کی طرح ماہوار رسالوں کے ساتھ بھی کاغذ کی رعایت ملحوظ رکھے تاکہ حکومت کے گودام سے رعایتی نرخ پر کاغذ حاصل کر کے ہم اپنی اس علمی ادبی مہم کو جاری رکھ سکیں۔

ہمیں سرپور پیپر ملز لمیٹڈ حیدرآباد دکن سے اب تک شکایت باقی ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اس گرنی کے چالو ہو جانے سے ہماری شکایتیں دور ہو جائینگی مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ کراون سائیز کے کینڈا وغیرہ کے کاغذ سے سرپور کراون کاغذ کے دام بڑھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ مقامی پیداوار ہونے کے باعث نرخ میں بہت کچھ کمی ہونی چاہیے تھی۔ نرخ کے فرق کے علاوہ ایک اور بات قابل شکایت یہ ہے کہ سرپور کا کراون سائیز کا کاغذ بازار میں ملتا ہی نہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ سرپور ملز کے کام کرنے والے ضرور ہماری ان واجبی شکایتوں کی طرف توجہ کرینگے۔

پُرسہ ہمیں یہہ معلوم کر کے بے حد رنج ہوا کہ ہندستان کے مشہور مضمون لکھنے والے اور مصنف ام۔ اسلم صاحب (لاہوری) کی اہلیہ محترمہ نے کچھ عرصہ علالت کے بعد ۲۴ جولائی کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

جب سے ہندستانی ادب جاری ہوا ہے اسلم صاحب کی عنایات برابر اس کے شامل حال رہی ہیں اس لحاظ سے ادارہ بھی اس رنج میں شریک ہے اور صاحب معز سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ ہم اپنے ملول معاون کو سوائے صبر کی تلقین کے اور کیا کر سکتے ہیں۔

خریداروں سے ہندستانی ادب اپنے خریدار کرم فرماؤں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اگر عنایت نہ کریں تو کم سے کم ظلم کے آرے نہ چلائیں اس سے ہمارا مقصد یہہ ہے کہ ایسے خریدار جن کی مدت خریداری ختم ہو جائے خود اطلاع کر دیں کہ دوسرے سال خریداری منظور ہے یا نہیں۔ ہم جب دریافت کرتے ہیں تو بھی جواب نہیں دیا جاتا۔ خاموشی کو رضا مندی سمجھتے ہوئے وی۔ پی۔ بھیجی جاتی ہے تو بلا تکلف واپس کر دیتے ہیں۔ ایک خاص بات یہہ ہے کہ بعض حضرات کو شاید مذاق سوجھتا ہے یعنی مزید ایک سال کے لیے خریداری کی اطلاع دے کر وی۔ پی طلب فرماتے ہیں اور جب وی۔ پی جائے تو لینے سے انکار ۔۔ اس طرز عمل کے متعلق ہم یہہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہیں کہ یہہ فعل نہایت ہی غیر شریفانہ ہے۔

آخر میں ہم اپنے کرم فرماؤں سے یہہ عرض کرتے ہیں کہ اگر خریداری منظور ہو تو وی۔ پی طلب کرنے کی بجائے چندہ منی آڈر کے ذریعے بھیجد یا جائے تاکہ وی۔ پی کی واپسی سے ہم زیر بار نہوں۔

انعامی اسکیم سالگرہ نمبر کے سلسلے میں یہہ طے کیا گیا تھا کہ کامیاب مضامین اور نظموں کو انعام دیا جائے گا اس کامیابی کا انحصار ہم نے رائے عامہ پر رکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہندستانی ادب کے پڑھنے والے ضرور اپنی رائے لکھ بھیجینگے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ رائیں کم تعداد میں وصول ہوئی ہیں اور اتنی کم رایوں پر مضامین کے بھلے یا برے ہونے کا فیصلہ کر دینا مناسب نہ سمجھا گیا اس لیے اب ہم نے یہہ اہم کام ادیبوں اور شاعروں کی ایک ملی علمی کمیٹی کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کمیٹی کی رائے میں جو مضامین اور نظمیں انعام کے مستحق ہوں گے ان کا اعلان بعد میں کر دیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ سالگرہ نمبر کے لکھنے والوں کو نتیجے کے اعلان کا سخت انتظار ہو گا مگر کیا کیا جائے مجبوری مانع ہے ہم اس بات کی کوشش کرینگے کہ یہہ کام جلد ختم ہو جائے اور جون ۴۲ء یا اگست ۴۲ء کے پرچے میں اس کا اعلان ہو جائے لیکن یہہ یاد رہے کہ یہہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے اس لیے کہ اس کا انحصار ارکان کمیٹی پہ ہے اگر نتیجہ ہمیں اس مہینے میں مل جائے تو لازماً آنے والے نمبر میں اعلان کر دیا جائیگا۔

پارے ہمیں افسوس ہے کہ اس دفعہ ہم "پارے" جیسے دلچسپ عنوان کو شامل نہ کر سکے۔ ہمارے پاس مواد تو تیار تھا اور ہم نے حسب عادت صفحے بھی مختص کر دیے تھے لیکن جب مضمون "ہندی ہی قومی زبان بن سکتی ہے" ہماری نظر سے گذرا تو اس کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس دفعہ پاروں کا عنوان روک کر مذکورہ مضمون دیدیا جائے۔ چنانچہ اس مضمون کے پڑھنے کے بعد ہماری رائے اور مضمون کی اہمیت کی تصدیق ہو جائیگی۔ امید کہ ہندستانی ادب کے پڑھنے والے ہمیں معاف کر دیں گے۔ اس خصوص میں واضح کر دینا ضروری ہے کہ خاص نمبر کی شکل میں پارے یا تبصرے کے عنوان شامل نہیں کیے جاتے اس لیے اس وقت شکایت نہونی چاہیے۔

مضمون لکھنے والوں سے ہندستانی ادب کے مضمون لکھنے والوں سے ہماری عرض ہے کہ آپ جب کبھی مضمون لکھیں صحت کے ساتھ اور خوش خط لکھا کیجیے تاکہ پڑھنے میں سہولت ہو بعض اوقات شکستہ خط کے پڑھنے کے لیے ایک ماہر فن کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں

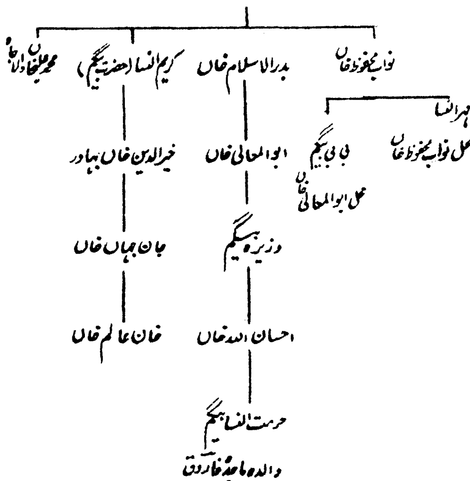
خان عالم خاں فاروق کا اردو کلام

محمد نام، فاروق تخلص، المخاطب بہ خان عالم خاں، خاندان انوریہ آرکاٹ کے بڑے ذی کمال، اہل علم وفضل اور ایک جید شاعر تھے۔ آپ کا ذکر تذکرہ صبح وطن[1]، گلزار اعظم[2]، معدن الجواہر[3]، ارشادات بخش[4] وغیرہ میں موجود ہے، مگر کسی میں آپ کا اردو کلام درج نہیں ہے۔ اتفاق سے مہدی واصف کا ایک اور تذکرہ جس کو انہوں نے معدن الجواہر کی تالیف سے پہلے مرتب کیا تھا جس کا نام تذکرۂ شاعراں[5] ہے جو دراصل کتاب مذکور کا پہلا مسودہ تھا، ہم کو فاروق کا اردو کلام دستیاب ہوا۔ نایاب ہونے کی وجہ سے فاروق کے حالات کے ساتھ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

نواب اعظم اپنے تذکرہ صبح وطن میں فاروق کے نسب کے متعلق اس طرح رقم طراز ہے کہ:-

"فاروق نامش محمد[6] المعروف بخان عالم فاروقی است مولدش بست وششم ربیع الاول سنہ یکہزار و دو صد و ہفت ہجری، والدش محمد جان جہان خاں بہادر فرزند خیرالدین خاں بہادر از بطن کریمۃ النسا المخاطبہ بحضرت بیگم صاحبہ خواہر عینیہ نواب والاجاہ، والدہ اش حرمت النسا بیگم بنت احسان اللہ خاں از بطن وزیرہ بیگم بنت ابو المعالی خاں بن بدرالاسلام خاں بن نواب انوارالدین خاں بہادر شہامت جنگ، و والدۂ وزیرہ بیگم بی بی بیگم بنت نواب محفوظ خاں بہادر خلف نواب انوارالدین خاں موصوف و والدہ بی بی بیگم، مہر النسا بیگم محل خان محفوظ خاں بودہ واحسان اللہ خاں از اولاد مشائخ فاروقیہ است"

اس لحاظ سے فاروق کا شجرہ حسب ونسب یہ ہے:-



اس طرح گویا فاروق کی والدہ بھی انوارالدین خاں شہید کی نواسی ہوتی تھیں اور فاروق کے جد امجد نواب خیرالدین خاں بہادر نواب شہید کے حقیقی بھانجے تھے۔ اور حسب ونسب کے اعتبار سے

---

[1] صبح وطن اعظم مولفہ نواب والاجاہ غلام غوث خاں مطبوعہ مدراس [2] تذکرہ گلزار اعظم مولفہ غلام غوث خاں محفوظ آصفیہ ۱۳۵۱ [3] معدن الجواہر مولفہ مہدی واصف مطبوعہ مدراس کتبخانہ سعیدیہ [4] مولفہ محمد مرتضیٰ بخش مطبوعہ مدراس [5] محفوظ آصفیہ، فن تذکرہ فارسی - [6] گوہر نے اپنے تذکرہ محفوظ بلند نظر میں فاروق کا نام محمد کے بجائے محمد معروف لکھا ہے۔

جناب فاروق کی . . . . . ننھیال شیوخ فاروق سے تعلق رکھتی ہے، اور ان کے نانا احسان اللہ خاں بہادر مشایخ فاروقیہ سے تھے ۔ آپکے علم و فضل کے متعلق آپکے ایک ہمعصر مہدی واصف اس طرح رطب اللسان ہیں ۔

"(۱) چوں بسن شعور رسید، از مستعدان روزگار در ہر فن"
"استفادہ کردہ بجودت طبع خداداد و رسائی ذہن روشن"
بدرجہ استادی رسیدہ، در نظم و نثر فارسی و قوانین"
آں محقق زمان است و ہم در فقہ و اصول فقہ و تفسیر
و حدیث و علم معانی و تصوف و علم حساب و ہیئیات
و ہندسہ و حکمت و طب و علم نجوم و رمل و علم عقود و
فن تکسیر و عروض و قافیہ و صنایع و بدایع و لغات
عربی مہارت کلی دارد و سوائے ایں در فن موسیقی
و زبان ترکی و السنہ دیگر ہم آشنائی دارد"

غرض فاروق ۲۶ ربیع الاول ۱۲۰۷ھ کو آرکاٹ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائے ۔ نظم و نثر فارسی کے بڑے استاد تھے طبیعت میں جدت اور ذہن رسا، رکھتے تھے نیز جملہ علوم و فنون معقول و منقول، خواہ وہ مذہبی ہوں یا علوم متداولہ مثلاً نجوم، ہیئت و طب میں کامل مہارت حاصل تھی، ترکی انگریزی و تلنگی میں بھی انکو بڑا عبور تھا، جن میں وہ شعر بھی کہا کرتے تھے ۔

جناب فاروق، باوجود اس قدر تبحر علمی، خصوصاً علم و حدیث و فقہ و تفسیر کے عالم ہونے کے، موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے اور ہمیشہ راگ و رنگ سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ مختلف راگ اور راگنیاں بھی ایجاد کی تھیں، متعدد قسم کے آلات موسیقی آپکے پاس موجود تھے اور اس غرض کے لیے آپ کے مکان میں ایک خاص کمرہ تھا، اور خاص طور پر ایک داروغہ بھی اس کے انتظام کے لئے متعین تھا ۔ چنانچہ جناب فاروق کے صاحبزادے اپنی ایک کتاب "ذکر جلی فی کرامات محمد علی" میں فرماتے ہیں ۔

(۲) "قطع نظر دوسرے کمالات خداداد کے موسیقی میں بھی بڑا مقام حاصل تھا یہاں تک کہ راگ میں نادر نادر اختراع کیا کرتے تھے، اور فرنگی راگ بالون کے رستوں پر ہند کے راگ کے سر ایجاد کرتے تھے، غرض گھر میں ہمیشہ راگ رہا کرتا تھا، اس کے ساز و سامان کے لیے ایک مکان ہی علیحدہ تھا جہاں بیش قیمت فرنگی راگ مالے بھی تھے اس کے میر ایک قدیم خاص سید بدھن علی صاحب تھے تقریباً چالیس سال کی عمر اس عیش و عشرت میں گزری"

اس کے بعد آپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا، اور یہ مولانا محمد علی مصطفےٰ آبادی (رامپوری) خلیفہ سید احمد بریلوی کی نظر کیمیا اثر کا نتیجہ تھا ۔

سید محمد علی واعظ ماہ محرم ۱۲۴۵ھ میں مدراس وارد ہوئے اور مولوی عبد الوہاب فرزند مولوی عبد العلی بحر العلوم کے مدرسے میں قیام فرمایا آپکا وعظ نہایت پر اثر ہوا کرتا تھا، شہر مدراس میں آپ کی بڑی شہرت ہوی ۔ امرا، علما، فضلا، و شایقین آپ سے ملنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے، جناب فاروق کا مکان بھی قریب ہی تھا، انکو انکے یہاں ہجوم دیکھ کر بہت تعجب ہوتا تھا اس لیے کہ جناب فاروق بلحاظ علم و فضل کے علامہ تھے، کسی کو خیال میں نہیں لاتے تھے، تصوف سے بالکل لگاؤ نہیں تھا غرض آپ نے بھی ایک دن واعظ رامپوری سے ملنے کا تہیہ کیا ۔ اور ملتمس خاں عرض بیگی نواب کرناٹک کے ساتھ مولانا محمد علی سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے اور مولانا کی ایک ہی ملاقات کا یہ اثر ہوا، کہ فاروق نے انکے دست حق پرست پر بیعت کر لی ۔ اور

---

(۱) معدن الجواہر مطبوعہ مدراس (۲) ذکر جلی فی کرامات سید محمد علی مولفہ افسر الدولہ جان جہاں خاں فرزند فاروق، مطبوعہ سکندر آباد ۔ (۳) مولانا محمد علی رامپور کے رہنے والے تھے، مشہور مجاہد مولوی سید احمد بریلوی جنہوں نے سکھوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا، خلفاء میں سے تھے، پہلی مرتبہ مولانائے موصوف ۱۲۴۵ھ میں مدراس آئے، علوم ظاہری سے بھی بہرہ ور تھے، آپکا وعظ نہایت پر اثر ہوتا تھا، خاندان والاجاہی آپ کا معتقد تھا، چنانچہ جب بعزم حج کلکتہ وارد ہوئے تو والدہ

فوراً ہی آپ کا رنگ کچھ اور ہی ہو گیا، شریعت کی اتباع میں اعلیٰ سے اعلیٰ سامان موسیقی، سب تباہ و برباد کر ڈالا، چنانچہ آپ کے صاحبزادے لکھتے ہیں۔

"شرف بیعت نے اس سب ساز و سامان پر قیامت کی صبح کر دی راگ مالے وغیرہ شکستہ ہونے لگے، سید صاحب (میر موسیقی) مذکور تک ان پہنچے نہایت غم و الم کیا، بلکہ ماتم کیا، لاکن لاچار رہے، آخر انہوں نے بھی بیعت کر لی اس اثنا میں بعض خود غرض لوگوں نے ان راگ مالوں کی جنکی شہرت سارے شہر میں تھی، حضرت والد سے خواہش کی کہ اصل خریدی سے زیادہ قیمت پر دیدیے جائیں آپ نے فرمایا ان منہیات کو اپنے سے دور کرتا ہوں دوسرے کو ہرگز میں کیا گرفتار ہونے دونگا، غرض ان راگ مالوں کو توڑ کر غیرت و نابود کر دیا۔"

اس کے بعد فاروق نے تصوف میں وہ کمال حاصل کیا، کہ اپنے وقت کے مظہر جان جاناں ہوئے، جن کا فیض روحانی اب بھی جاری ہے۔ ان کا سلسلہ باطنی سید محمد علی داعظ رامپوری کے توسط سے ہندستان کے مشہور مجاہد و صوفی سید احمد بریلوی و شاہ عبد العزیز و شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ اجمعین کے سلسلہ بسلسلہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ تک پہنچتا ہے۔

فاروق نے اپنے مرشد کی منقبت میں ایک قصیدہ ہندستانی میں لکھا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

میرا پیر بیشک خدا کا ولی ہے ۔ لقب جس کا سید محمد علی ہے
وہ ریحانہ تقیس نبی کا ہے یہاں ۔ وہ زہرا کے گلشن کی زیبا گلی ہے

جناب فاروق کو درس تدریس کا شوق بھی تھا آپ کے یہاں اکثر علما و فضلا و طلبا کا مجمع رہا کرتا تھا، نیز آپ ایک بہترین مناظر بھی تھے آپکے نوک زبان و قلم مخالفین اسلام کے لیے سنان آبدار تھے۔ عیسائی مبلغین سے اکثر مباحثہ رہا کرتا تھا، اور مشہور مجتہد مولوی دلدار علی لکھنوی کے متعلق بھی ایک ہجو آمیز رباعی لکھی تھی جو یہ ہے۔

دلدار علی کہ داد تالیف بذاں ۔ اثنا عشریہ را نمودہ برباد
اغنی بصوارم و حسام اسلام ۔ برگردن ہر شیع منت نہاد

جس کا جواب سعید نے اور جواب الجواب عشق نے دیا تھا، جس کی اس مضمون میں گنجایش نہیں، فاروق فارسی کے جدید شاعر تھے، اور مشاعرہ اعظم کے ایک رکن بھی تھے۔

شاعری میں تلمذ جناب فاروق کو ریختہ میں مرزا علی بخت اظفری اور فارسی میں اپنے خسر اعزالدین خان مستقیم جنگ نامی سے تلمذ حاصل تھا

معاصر فاروق نواب عمدۃ الامرا نواب علی حسین خان کا آخری زمانہ و خان اعظم نواب غلام غوث خان اعظم اور نواب عظیم جاہ کا زمانہ پایا، اور مشاعرہ اعظم میں بحیثیت رکن خوب چمکے

نواب عظیم جاہ نے (۱۲۶۵ھ) نو چوپہر بلوایا۔ اور پہلی مرتبہ ورود کے موقع پر محلہ حجام بازار میں جہاں آپ مقیم تھے، امیر النسا بیگم نے ایک مسجد بنوائی تھی قطعہ تاریخ یہ ہے۔

امیر النسا مسجد خوب است ۔ بہ منزلگہ آن مبارک ولی
بگفتا خرد بہر تاریخ آں ۔ نیوشت شدہ دم محمد علی

مولانا موصوف کے تاریخ انتقال دستیاب نہ ہو سکی۔ ۔۔۔ رسالہ ذکر علی و کرامات سید محمد علی مطبوعہ مرغوب دکن سکندرآباد ۱۳۰۵ھ ۔۔۔ رسالہ ذکر علی ۔۔۔ تذکرہ اعظم مخطوطہ آصفیہ نمبر ۳۰۸ تذکرہ ۔۔۔ مرزا علی بخت اظفری المتوفی ۱۲۳۳ھ بابت بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۲۱۲ھ میں مدراس لائے، تو وہاں آرکاٹ نے آپکی بڑی قدر و منزلت کی جب آپ تشریف لائے تھے نواب آرکاٹ مرد قدر تعلیم کیلئے خود بیا ۔۔۔ مولف گلستان شیخ یہ لکھتا ہے کہ مدراس علی بخت اظفری ہی پہلے وارد نہیں ہوئے بلکہ آپ سے پہلے سلیمان بخت بھی تشریف لائے تھے، اور ۔۔۔ شہزادوں ۔۔۔ مدراس میں سکونت اختیار کر لی تھی، مولوی (محمد حسین) نے اظفری کے حالات مضمون میں تذکرہ ۔۔۔ کا قلمی نسخہ ۔۔۔ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد اور رسالہ اردو ۱۹۲۱ء ۔۔۔ تاریخ دکن گلزار اعظم۔

شاعرۂ اعظم[1] کے تمام اساتذہ سخن آپکے ہمعصر ہیں، اور اظفری کے ممتاز شاگردوں میں فاروق، شائق[4] منور، اور نادر[3] مصنف مثنوی رشک قمر و مہ جبین، تھے اظفری ریختہ کے استاد تھے، جنکی زبان مستند، فصیح و بلیغ اور ٹکسالی تھی جن میں قلعہ مبارک کی تمام خصوصیات موجود تھیں اظفری کی نسبت مولف گلزار اعظم لکھتے ہیں کہ " در زبان ریختہ علم استادی می افراشت" غرض فاروق کے کلام میں اپنے استاد اظفری کا بیحد اثر معلوم ہوتا ہے۔

وفات | فاروق کی وفات حسرت آیات بعمر ۶۵ سال ۱۲۷۱ھ میں بمقام آرکاٹ ہوی آخری لمحات میں اپنے خلفا کو سنت و توحید پر قایم رہنے کی وصیت فرمائی اور قرآن کی آیات تلاوت فرماتے ہوے جان بحق تسلیم ہوے۔ بعد وفات کے چہرہ مبارک پر نور برس رہا تھا، اور خاص بات یہ تھی کہ میت سے خوشبو مہک رہی تھی، اپنے باغ میں بمقام کوڑم پاک تدفین عمل میں آئی، نواب منور جنگ بہادر نظیر نے لاش کو قبر میں اتارا، نواب عظیم جاہ بہادر والی ارکاٹ تدفین میں شریک تھے۔

اولاد | آپ نے دو صاحبزادے چھوڑے ایک تو نواب خیرالدین خاں محمود بیگ، دوسرے نواب جان جہاں جہاں افسرالدولہ۔

خلفاء | مولوی اسمٰعیل ویلوری[2] آپ کے خلیفہ تھے، ان کے سوا دوسرے اصحاب کا حال معلوم نہوا۔ جناب فاروق کی یہ عجیب کرامت ہے کہ باوجود ترک وجاہ دنیوی منصب فقر و فنا پر فایز تھے، اور اب تک ان کا سلسلہ جاری ہے، چنانچہ ان کا سلسلہ بتوسط مولوی اسمٰعیل صاحب ویلوری و سلطان محمود اللہ حضرت شاہ کمال الدین حیدرآبادی مولوی محمد حسین ناظم بستان دنیرتی تک پہنچا ہے ان کا طریقہ مجددیہ تھا، ممکن ہے کہ دوسرے سلاسل میں بھی فاروق کو بیعت ہو۔

تلامذہ، آپکے ارشد تلامذہ میں مولوی حکیم عبدالباسط عشق مشہور ہیں، جن کا مجموعہ کلام ملا عبدالباسط صاحب ناظم عدالت ضلع نے حال ہی میں شایع فرمایا ہے۔

شاعری کے متعلق رائے | جناب فاروق اصل میں فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ انتخاب کلام فارسی، مدراس کے تذکروں میں جن کا ہم اوپر ذکر کیا ہے موجود ہے، دیوان فارسی دستیاب نہو سکا، ہندستانی کلام کا حال معلوم نہیں، کہ آیا انہوں نے اپنا ہندستانی دیوان مرتب کیا تھا یا نہیں، البتہ یہ تو واقعہ ہے کہ جناب فاروق نے ریختہ گوئی میں اظفری جیسے اہل سخن و اہل زبان سے مشق بہم پہنچائی تھی، کلام میں مدراسیت یا دکھنیت نہیں پائی جاتی، کلام شستہ و صاف ہے، اگرچہ ہمارے سامنے فاروق کے ہندستانی کلام کا مختصر نمونہ موجود ہے، جس سے ہم کوئی صحیح رائے قایم نہیں کر سکتے کہ فاروق کی شعرائے ریختہ گو میں کیا حیثیت تھی، تاہم یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ جناب فاروق اور انکے ہمعصر شعرا ریختہ گو نادر[3] غلام محی الدین شائق[4] تاج الدین بہجت[5] بہاء الدین مروت[6] اور فاروق کے استاد، اعزالدین خاں ناجی[7] نے فن ریختہ گوئی اور محاورہ بندی میں شمالی ہند کے بعض اہل زبان، مثلاً شاہ حسین حقیقت تلمیذ جرات لکھنوی، و مرزا علی نخب اظفری، و حیرت تلمیذ حقیقت کی رہنمائی و اتباع میں فرسودہ مدراسی اردو کو خوب مانجھا، اور معیاری ہندستانی کا درجہ دیا۔

---

[1] شاعرۂ اعظم رسالہ اردو ۲۳ سنہ صفحہ ۳۱۰، [2] شجرۂ تجدیدیہ مطبوعہ مرتبہ شاہ علی رضا حیدرآبادی۔ [3] نادر تلمیذ اظفری مصنف مثنوی رشک قمر و مہ جبین اردو۔ [4] شائق تلمیذ اظفری۔ مصنف مثنوی رشک بہشت اردو [5] بہجت تلمیذ حیات لکھنوی و مقبول اعظم تلمیذ ابوالحسن حیرت تلمیذ حقیقت (صفحہ ۱۶۳ گلزار اعظم)۔ [6] مروت تلمیذ بہجت مولف مثنوی باغ نوبہار (ریختہ) مطبوعہ مدراس کسی تذکرہ میں انکے حالات نہیں ملے، مگر اس مثنوی کی اردو نہایت فصیح ہے۔ [7] ناجی کو ریختہ گوئی میں کمال حاصل تھا، اردو میں کئی مثنویاں لکھیں، اور ایک مثنوی میں تو شمالی ہند کے بعض ذی کمال شعرا کا جواب دیا جن کا یہ اعتراض تھا کہ مدراسیوں کو اردو نہیں آتی، جس کا ذکر ہم کسی اور موقعہ پر کریں گے۔

فاروق کے کلام کے مطالعے سے تعجب ہوگا کہ مدراس میں آج سے سو سال پیشتر بھی ایسی فصیح ہندوستانی بولنے والے موجود تھے، اور ہمارے ملک کے مشہور تذکرہ نویس لالہ سری رام مولف خمخانۂ جاوید کی جا بجا ان اعتراضات پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ صوبہ مدراس کو ہندوستانی سے بالکل بے بہرہ جانتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے "جس تمام پر لکھنا تو کجا چند آدمی صاف اور شستہ زبان کے بولنے والے بھی نہ ہوں، وہاں ایسا باکمال زباندان (عبدالرحمٰن شاطر) نشو نما پائے جسے ماہرین زبان اہل زبان کے ہم پلہ ہونے کا سرٹیفکٹ عطا کریں"

غرض جناب شاطر تو بہت زمانہ مابعد کے شاعر ہیں، جناب فاروق نے کرناٹکی اردو کو ان سے بہت عرصہ قبل ترقی دینے کی کوشش کی جو قابل داد ہے۔ ہم یہاں فاروق کا منتخب ہندوستانی کلام "تذکرہ شعرائے ہندی و اصف سے بجنسہٖ نقل کرتے ہیں، جس سے آپ کی ہندوستانی دانی و محاورہ ہندی اور جولانی طبع کا پتہ چلتا ہے اور یہ انتخاب ہمارا نہیں بلکہ ایک باکمال سخن سنج و سخن فہم شاعر کا ہے۔

ہائے اس بے نشاں وہاں کی بات ؎ ہو نہ خاطر نشاں کہاں کی بات
شکوہ کرنا مرا جو پھر پوچھوں ؎ تو یہ کہنا نہیں جی یہاں کی بات
بھولتا ہوں جہاں کی بات ومیں ؎ مجھ سے مت پوچھو جہاں کی بات
تیری آنکھوں کے تیں غزال کہا ؎ کیسی ان وحشیوں نے ہانکی بات
دولت وصل خدا نے جو ہمیں پوزی کی ؎ بس غنی ہو چکے اب فکر نہیں روزی کی

قطعہ

ہم نے امید ملاقات پر اس گلرو کے ؎ غنچہ ساں خوں جگر پی کے زراندوزی کی
اس نے زر لے لیا اور ہاں پر اپنے آیا ؎ سوزن خار سے طعنوں کے جگر دوزی کی

وہ جو آرام در بستر ہے ؎ دل بے دسترس ترستا ہے
یار کے گھر کو مرتے چلیگا ؎ کر دم تیغ اسکا رستا ہے
ایک آنا نہ جیتے ان بول ؎ آکے لو یہ غلام سستا ہے
بجز میں ابر چشم سے فاروق ؎ سینہ لہو کا سدا برستا ہے

زمانے کے ہاتھوں جو غم دیکھتے ہیں ؎ تو آکر تمہارے قدم دیکھتے ہیں
ڈبونے کے دل کو مرے بحر غم میں ؎ کہے ہے کہ اب اس کا دم دیکھتے ہیں
ترے خط و رخ سے شب و روز ہم نے ؎ بہار و خزاں کو بہم دیکھتے ہیں
ترے لام زلف اور میم دہن سے ؎ الم کے مضارع پہ لم دیکھتے ہیں

جانب دل ہیں یار کی آنکھیں ؎ صید ہی پر ہیں باز کی آنکھیں
کسی پردے میں چھپ نہیں سکتیں ؎ شوخ عاشق نواز کی آنکھیں
ہے مگر وہ فرنگ کی تصویر ؎ ٹھیک ہر سمت باز کی آنکھیں
اس کے چاہ ذقن سے ہو وے خنک ؎ تشنگان حجاز کی آنکھیں
دیکھ سے میری مت ہو یوں تیرچھے ؎ پاک ہیں راستباز کی آنکھیں
کیا مرض میں علامت محمود ؎ دیکھتی ہیں ایاز کی آنکھیں
کھل گئی دید کی حقیقت یہاں ؎ بند کیجے مجاز کی آنکھیں
جگ میں ہیں اس طرف ہی اے فاروق ؎ سب کی راز و نیاز کی آنکھیں
جیسے رہتی ہیں جانب ساحل ؎ ناکہاں جہاز کی آنکھیں

اشک گلرنگ جمے آن کے مژگاں کے تلے
خوب گلزار بنا، خار مغیلاں کے تلے
اپنا رونا ترے قدموں کے تلے یاد آیا
دیکھ کر آب رواں سرو خراماں کے تلے
آہ! افسوس خیالی کی تعدا دیرے ہم
مفت سرگشتہ ہیں اس گنبد گرداں کے تلے
جس کے دامن کو نہ تھا کسی دلسوز کا ہاتھ
شمع خورشید کو بھی لے ہے وہ داماں کے تلے
حق پرستی میں نکر نفس پرستی فاروق
کفر کی جنس نہ رکھ دین کے ساماں کے تلے

<u>بعض شعرا سے موازنہ</u> قلندر بخش جرأت و حقیقت اور شیر محمد خاں ایمان کی بعض ہم قافیہ غزلوں پر فاروق نے بھی طبع آزمائی فرمائی ہے جسکو ہم بطور موازنہ یہاں نقل کرتے ہیں جس سے فاروق کی جولانی طبع کا اندازہ ہوگا۔

ع۱ مجموعہ دیوان جرأت [illegible] مخطوطہ آصفیہ [illegible]

جرأت — کیا چمک لخت جگر کی ہے بزیر اشک چشم
عشق نے رورو دیے یہ وانگ گوہر کے تلے

ایماں — گردش چشم ہے ایک آفت آفاق تھیں
فتنے سوتے ہیں کئی سایہ مژگاں کے تلے

شاخ گل رشک سے لوٹے ہیں زمیں کے اوپر
جب رکھے دست نگاریں وہ زنخداں کے تلے

شمع کافور اگر اوس کی ہے ساق سیمیں
وہ بھی روشن ہے چراغ اوسکے ہی داماں کے تلے

چشمہ خضر کا ایماںؔ اگر ہے تشنہ
دیکھ عارض کے تئیں زلف پریشاں کے تلے

فاروق — رشک گلرنگ جمے آن کے مژگاں کے تلے
خوب گلزار بنا خار مغیلاں کے تلے

شاہ حسین حقیقت — کس کی ہیں انتظار میں آنکھیں
جو کھلی ہیں مزار میں آنکھیں
نہ خفا ہو جو تک رہوں پیارے
کہ نہیں اختیار میں آنکھیں

فاروق — دیدے میرے مت ہوویں ٹیڑھے
پاک ہیں راستباز کی آنکھیں

سخاوت مرزا بی۔ اے۔ ال ال۔ بی (عثمانیہ)

مینوشیاں

چھپ کر شراب پی کہ سربزم آکے پی
ساقی تجھے قسم ہے کہ مجکو پلا کے پی
رندان تشنہ کام کو ہاں ہاں دکھا کے پی
اٹھلا کے پی کبھی تو کبھی مسکرا کے پی
یہ اور شے نہیں جسے زاہد چھپا کے پی
تنہا نہ پی شراب مجھے بھی پلا کے پی

عبدالرشید رشید صدیقی لکھنوی

یہ کون ہے؟

گوشہ گوشہ میں نظر آتا ہوا یہ کون ہے
راز عقل و ہوش پر چھاتا ہوا یہ کون ہے
کون ہے یہ کون ہے

رقص میں ہیں عالم احساس کی رعنائیاں
لے رہی ہے روح برق نظر انگڑائیاں
یوں پس پردہ ستم ڈھاتا ہوا یہ کون ہے
راز عقل و ہوش پر چھاتا ہوا یہ کون ہے
کون ہے یہ کون ہے

ہلکی ہلکی چوڑیوں کی یہ صدائے نغمہ باز
یہ ترنم — یہ محبت کا ترنم، یہ بہار
ں شکست ساز فرماتا ہوا یہ کون ہے
راز عقل و ہوش پر چھاتا ہوا یہ کون ہے
کون ہے یہ کون ہے

کس نے یہ چھیڑا نگاہوں سے محبت کا رباب
کس نے یہ بھر دی رگ و پے میں جوانی کی شراب
آج میرے دل کو اپناتا ہوا یہ کون ہے
راز عقل و ہوش پر چھاتا ہوا یہ کون ہے
کون ہے یہ کون ہے

کس نے یہ میری نگاہ شوق کو بہکا دیا
کس نے یہ بھولی ہوئی باتوں کو پھر دہرا دیا
پھر مجھے رہ رہ کے یاد آتا ہوا یہ کون ہے
راز عقل و ہوش پر چھاتا ہوا یہ کون ہے
کون ہے یہ کون ہے

راز ہاشمی

عورت گذشتہ کے دھندلکوں میں

تاریخی

(۱)

چندر گپت موریا کے عہد میں ریاست سسیل گڈھ دریائے نربدا اور تاپتی کے بیچ میں واقع تھی۔ مہاپدم نند یہاں کا راجہ تھا ۳۲۶ ق م قبل مسیح جب مقدونیہ کا زبردست شہنشاہ سکندر مغربی دنیا میں چاروں طرف فتح کا ڈنکا بجاتا فارس ترکستان افغانستان کو زیر کرتا ہندستان پر حملہ آور ہوا تو پنجاب کے راجہ پورس سے پہلے مقابلہ پڑا۔ پورس نے سکندر کا بہت بہادری سے مقابلہ کیا لیکن جب اس کو اپنی فوج کے پیر اکھڑتے معلوم ہوئے تو وہ فوراً سسیل گڈھ روانہ ہوا۔ اس وقت پورس نے آپس کی گذشتہ مخالفتوں کو دل سے بھلا دیا تھا۔ وہ مہاپدم نند کے پاس مدد کی غرض سے جا رہا تھا۔ پورس سکندر سے خوفزدہ نہ تھا۔ بلکہ اس کو عزت قومی کا پاس تھا وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اس کے سپاہی بے بس ہو کر سکندر کے سامنے ہتھیار ڈالدیں اور ہمیشہ کے واسطے نند خاندان پر بدنامی کا ٹیکہ لگ جائیں۔

برسات کا موسم۔ مغربی مانسونی ہوائیں موسلادھار بارشیں برسا رہی تھیں۔ چاروں طرف کی سخت مسافت کے بعد پورس دریائے نربدا کے کنارے تک پہنچا۔ دریائے [illegible] کا پاٹ [illegible] ایک میل کا ہو گیا تھا۔ انسان [illegible] تک نظر آتے تھے پورس نے بمشکل تمام دریا کو پار کیا [illegible] مقابل [illegible]

[illegible]

[illegible] گردھاری کے [illegible]

مٹھ میں کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ گردھاری مٹھ ریاست گڈھ کے شمالی گوشے میں نیرنگیٔ عالم سے دور اور بہت دور واقع تھا۔ خلوص اور پاکیزگی یہاں کے خدا پرست سادھوؤں کی جزو زندگی اور مذہب شمع محفل تھا۔ مٹھ کے عبادت گذار بندوں کو روحانی تلقین ان کے مقدس باپ گرو گردھاری سے ملتی تھی۔ گرو گردھاری کے خیال میں صنف نازک کا وجود صرف مہمل ہی نہیں بلکہ اس کا عقیدہ تھا کہ وہ مرد کو روحانیت کے اعلیٰ ترین مراتب کے حاصل کرنے میں زبردست رکاوٹ ہے۔ عورت کو اس نے گناہ کا سبب بتایا تھا۔ عورت کے حسن کو اس نے وہ دہکتی ہوئی آگ کہی تھی جس میں پڑ کر مرد کی تمام ریاضتیں جل کر خاک و سیاہ ہو جاتی ہیں۔ عورت کی جھوٹی محبت کو فرض کے راستے سے بھٹکا دینے والی وہ شئے بتائی تھی جو ہمیشہ کے لیے ذلت اور پستی کے عمیق غار میں ڈالکر مرد کے دل کو نیک امنگوں سے خالی کر دیتی ہے۔ عورت کی شیریں گفتگو دلفریب مسکراہٹ اور دلنشیں اداؤں کو اس نے وہ چیزیں بتائیں تھیں جو راہ مستقیم پر چلنے والے جنونی کے بےقرار خون کی گرماہٹ کو سلب کر لیتی ہیں۔ وہ یہ بتاتا ہوا کہ مٹھ کے دروازے انسان کی اس شیطان صنف کیلیے ہمیشہ بند رہیں گے ایک قلبی تسکین محسوس کرتا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ رقص کرنے لگتی تھی جب وہ [illegible] ہوا اپنے چیلوں کو نصیحت کرتا تھا کہ عورتوں کا کھیلنا اور [illegible] دنیا کے سب سے بڑے [illegible] گناہوں میں سے ہے۔

راجہ پورس گردھاری مٹھ کے قریب آیا۔ گھوڑے سے [illegible]

بیٹھا وہ دل کی چال سے برگد کے ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے رکا۔ مٹھ دربان نے اپنا بھالا سنبھالا۔ منڈھے ہوئے سر پر لٹکتی ہوئی سیاہ بالوں کی موٹی چوٹی کو اطمینان بخش ہاتھ سے ٹٹولا۔ بل کھائی ہوئی موچھوں پر ہاتھ پھیرا اور کھنکھارتا ہوا آگے بڑھا۔ راجہ پورس قریب آیا اور بولا "گرو گردھاری مٹھ میں ہیں۔ ہاں، ملنا چاہتا ہوں اطلاع کر دو کہ راجہ پورس آیا ہے۔ بڑی مصیبتوں میں پھنسا ہے۔ درشن ہو جائیں تو اس کا جنم آج سپھل ہو جائیگا"۔ مٹھ دربان نے دروازہ کھولا۔ ایک ملجا لگی پختہ دیوڑھی سے نکل کر وہ مٹھ کے کھلے صحن میں آیا جہاں سے سادھو گیروے کپڑوں میں ملبوس آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ دربان کو آتے دیکھ کر سادھوؤں میں سے ایک وجیہہ قد کا خوبصورت شخص آگے بڑھا اور دربان سے مخاطب ہو کر بولا "کہو اجیت کیا خبر لائے"؟ "راجہ پورس گروجی کے درشن کو آئے ہیں بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہیں یہی کہتا تھا"۔ اچھا میں گروجی کو اطلاع کیے دیتا ہوں"۔

گیانو اس جوان تندرست سادھو کا نام تھا۔ گرو گردھاری گیانو سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ انکو گیانو کی جسمانی خوبصورتی سے محبت نہ تھی بلکہ اس کی اطاعت پسند طبیعت۔ اس کا حسین اخلاق۔ اس کی غیر معمولی دیانت اور عبادت شاقہ نے اس کو گرو گردھاری کے دل میں ایک امتیازی جگہ دے رکھی تھی۔ گرو گردھاری دن اور رات میں جب کبھی گیانو کو دیکھتے تو ان کو وہ دن یاد آ جاتا جب وہ پہلے پہل مٹھ میں آیا تھا اور اس نے عورت کے متعلق یہ سن کر کہ وہ گناہ کا سبب ہے یہ کہنے کی اجازت چاہی تھی کہ دنیا کی روحانی قیمت اور جلال میں عورت کا اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا مرد کا۔ سوز و ساز تپش اور خلش۔ آگ اور آنسو۔ انکی تخلیق میں عورت کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا مرد کا۔ اگر مرد سورج کی تپش اور باد سموم کا جھونکا ہے۔ تو عورت چاند کی کرن اور نسیم صبح گاہی ہے۔ اگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے تو عورت

جام کوثر ہے۔ مرد نے ہل چلایا۔ عورت نے پانی سینچا۔ ان دونوں کی سنجوگ سے کھیتی لہلہا اٹھی۔ عورت سچی محبت کا سبق پڑھاتی ہے مرد کی وفا نا آشنا آنکھوں میں عورت ہی دردمندی کا کاجل لگاتی ہے۔ لیکن جب گیانو یہ سب کہہ چکا تھا تو گرو گردھاری مسکراتا ہوا گیانو کے قریب آ کر اس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے بولا تھا کہ بیٹا یہ تو ہین تیری نوجوانی کا وہ ہلاکت آفریں مادی جذبہ بول رہا ہے جو فنا ہونے کے بعد تیری آنکھیں کھولدیگا۔ وہ یہ کہتا ہوا گیانو کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں لے گیا تھا۔ جہاں تھوڑی دیر سکوت سے کھڑے رہنے کے بعد برق سے زیادہ چمکیلی روشنی ہوئی تھی اور ایک مجسم نور کی بے انتہا خوبصورت برہنہ پری ظاہر ہوئی تھی۔ جس نے گیانو سے کہا تھا کہ تو مجھکو اپنے مقدس باپ کی نصیحتوں پر عمل کرنے سے پا سکتا ہے۔ اگر دائمی جوانی حاصل کر کے میرے اس بلوریں سینے کا بوسہ لینا چاہتا ہے تو جا زندگی بھر خدا کی عبادت کر دنیا کے جھمیلوں کو چھوڑ اور گوشہ عافیت میں بیٹھ کر یکطرفہ دھیان سے اس پاک معبود کی یاد میں غرق ہو جا۔ سچی محبت اس عورت میں نہیں ہے جو ابتک تیرے دل پر حکمراں رہی ہے۔ سچی محبت میں تجھ سے کرتی ہوں۔ اگر تو میری محبت کا اہل بننا چاہتا ہے تو جا اپنے کو اس قابل بنا۔ اپنی آنکھوں میں وہ نور پیدا کر جس سے تو میری اس خوبصورتی کو دیکھ سکے اور اس کا لطف اٹھا سکے۔ میں اپنے ان نازک ہاتھوں سے امرت کے پیالے پلاؤنگی۔ ان عنابی ہونٹوں اور ان سنہرے عنبریں بالوں کے بوسے دونگی۔ کیا تو اس کا خواہاں ہے؟ اگر ہے تو جا میں تیرا بے چینی سے انتظار کرتی رہونگی۔

گرو گردھاری کی دھنسی ہوئی آنکھوں اور رستی ہوئی داڑھی دار چہرے پر مسکراہٹ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی لکیریں پڑ جاتیں جب وہ اپنی نگاہوں کو تھوڑی دیر کے لیے گیانو کے خوبصورت چہرے پر گاڑ دیتا اور وہ شرم و حیا سے

اپنی آنکھوں کو نیچا کر لیتا۔ گردہاری کے دماغ میں بارہ برس پہلے
کا وہ واقعہ دہرا جاتا۔ جب وہ گیانو کو تاریک کوٹھری سے باہر
بیہوشی میں اٹھا کر لایا تھا اور دیر تک ہوش و حواس میں نہ آیا
تھا۔ آسمان کی فراوانی میں اس کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں
سے یہ الفاظ نکل رہے تھے کہ میں تجھ سے سچی محبت کرتا ہوں۔

گیانو مٹھ کے صحن کو طے کر کے ایک کشادہ کمرے میں
داخل ہوا۔ کمرے کی پشت سے آشرم کو ایک دروازہ تھا۔
دروازے کے بھاری قفل کو گیانو نے کھولا اور آشرم کے پاس
باغ میں نکل آیا۔ آشرم تلسی کے چھوٹے چھوٹے گھنے درختوں
سے گھرا تھا۔ درختوں کے بیچ سے آشرم میں داخل ہونے
کے لئے چار تنگ راستے تھے۔ آشرم مخروطی قسم کی ایک خوبصورت
عمارت تھی جس کے اندر ٹمٹماتے ہوئے مدھم چراغ کی روشنی
جھروکوں سے معلوم ہوتی تھی۔ گردہاری کی بھاری آواز
عمارت کے اندرونی حصے سے باہر صاف سنی جاتی تھی۔ گیانو
آشرم کے دروازے تک آیا اور گرو کے منتروں کو سننے لگا۔
گرو گردہاری کی آواز دردانگیز اور پرحسرت تھی۔ یوں تو گیانو
کو اپنے مقدس باپ کی آواز کو سنتے ہوئے بارہ برس گذر
چکے تھے۔ لیکن آج اس کی آواز بہت زیادہ مضمحل اور تھکی ہوئی
معلوم ہو رہی تھی۔ گیانو کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بھکاری
اپنی پرسوز آواز سے رحم کی بھیک مانگتے مانگتے تھک گیا ہو اور
اس کی آواز بوجھل ہو کر حلق کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہو۔۔۔ گیانو
کی۔۔۔ ایک سسکیوں سے بھری آواز آشرم سے نکل کر رات
کی خاموش لہروں کے ساتھ بہگئی۔۔۔ گیانو کے مژگاں پر آنسو
کے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔

اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے پکارا 'گرو جی
کیا میں آسکتا ہوں۔'

'آؤ' گیانو ہچکیوں سے تھرتھراتی آواز آشرم کی تنگ
جگہ میں بھر گئی۔

گیانو آشرم میں داخل ہوا۔ گرو گردہاری زمین پر خاموش
لیٹا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو کے موٹے موٹے قطرے
ڈھلک کر داڑھی کے اندر غائب ہو جاتے تھے۔

'گرو جی' گیانو نے دوزانو بیٹھتے ہوئے ایک غم آلود لہجے
میں پکارا۔ 'کیا ہے بیٹا گیانو' گردہاری نے اپنی نگاہیں گیانو کے
صاف ستھرے ہوئے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ 'یہ آنسو کیسے
گرو جی' گیانو نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے گردہاری
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا۔ 'میں نے مہاپاپ کیا ہے گیانو'
گردہاری نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ وہ ابھی تک ترسی ہوئی
نگاہوں سے گیانو کو دیکھ رہا تھا۔ 'مہاپاپ' گیانو نے بوکھلاتے
ہوئے کہا۔ اس کا سفید چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

'ہاں مہاپاپ بیٹا میں نے آج یہ خواب دیکھا ہے کہ میری
زندگی بھر کی ریاضتیں ناس ہو گئیں'۔

'یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں گرو جی بیکار پریشان مت ہوئیے
خواب سچے نہیں ہوا کرتے'

'نہیں بیٹا یہ خواب بلکل سچا ہے۔۔۔۔' حسرت آمیز
لہجے میں 'گیانو میں ایک بات کہوں مانو گے'

'بسر و چشم گرو جی'

'تم مہاپدم نند کی اکلوتی لڑکی راج کماری سے شادی کر لو۔
وہ تم سے محبت کرتی ہے'۔

'شادی گرو جی۔۔۔ شادی' گیانو نے آنکھیں پھاڑ کر
ایک گھبرائے ہوئے انداز میں داہنے ہاتھ کی انگلیوں کو دانتوں
کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ جاگ رہا ہے
اور گرو سے کھڑا باتیں کر رہا ہے۔

'ہاں شادی بیٹا۔ یہ میری آخری آرزو ہے۔ اگر تم
میری ریاضتوں کو واپس دلانا چاہتے ہو تو اس درخواست
کو مت ٹھکراؤ'

'پاپ ہے۔۔۔ مقدس پاپ'

'پاپ نہیں یہ فرض ہے بیٹا دنیا کے جھمیلوں میں پھنس کر
خدا کی عبادت کرنا سب سے بڑی ریاضت ہے' گردہاری کھڑے

ہوتے ہوئے کہا اور گروجی آپ نے خواب کیا دیکھا تھا"
گیانو ایک ایسے انداز سے پوچھا جیسے کوئی بھولی ہوئی بات
یاد آ گئی ہو۔

"میں نے خواب یہ دیکھا تھا۔ کہ راج رشی مجھ سے خفا ہیں
اور غصے کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ
تو دو خون کر رہا ہے۔ جس کا پاپ تیری ریاضتوں پر چھا جائیگا
اور زندگی بھر کی کوششیں رائیگاں جائینگی۔

"خون گروجی" گیانو نے دونوں ہاتھوں کو اپنی پھڑپھڑاتی
ہوئی کنپٹیوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا

"ہاں خون بیٹا" گردھاری نے مسکراتے ہوئے کہا "تیرے
حسن اور ریاضت شاقہ کی دھوم سیل گڈھ کے بچے بچے کی زبان
پر ہے راج کماری ربھا اپنے پتا مہاپدم نند سے یہ کہہ چکی ہے
کہ اگر وہ شادی کریگی تو تجھ سے۔ نہیں تو وہ ساری عمر کنوارپن
میں گذار دیگی۔ یہ اس کا آہنی عزم ہے"۔

گیانو کے ہاتھ سے تسبیح گر پڑی۔ اس کے دانے فرش پر
بکھرے پڑے تھے۔

گرو گردھاری مسکراتا ہوا گیانو کو بیکراں شرم کے باہر نکل آیا۔
نیلگوں آسمان پر سفید بادل کے چند ٹکڑے ہوا کے
تیز گھوڑے پر سوار کسی غیر معلوم منزل کی طرف بھاگ رہے تھے
چڑیاں جوق جوق ہرے درختوں کی پتیوں سے ٹکریں لے کر
اپنی تیز سریلی آوازوں کو ننھے ڈھنگوں سے نکالتیں اور ایک
قلیل عرصے میں دلفریب آہنگ پیدا کر دیتیں ہیں۔ اندھیرا کالے
سلے کی طرح بڑھ رہا تھا۔

(۲)

سیل گڈھ کی فضا میں یکبارگی تبدیلی ہو گئی۔ ہر جگہ خاموشی
اور سکوت طاری ہو گیا۔ مہاپدم نند کی سخت علالت کے متعلق
ہر طرف خاموش چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ راج محل کے چاروں
طرف ایک افسردگی چھائی ہوئی تھی مہاپدم نند بستر علالت پر
خاموش پڑا تھا۔ آنکھوں سے بیچارگی کے آنسو بہہ بہہ کر اسکی
سفید لمبی داڑھی میں گم ہو جاتے تھے۔ اس کی پریشانی اور کرب
میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ محسوس کیا جا رہا تھا۔ وزیر سنگرام سنگھ
سر جھکائے کرسی پر خاموش کسی گہرے خیال میں غرق راجہ کے
قریب بیٹھا ہوا تھا۔ راج کے نامی گرامی طبیب اور راجہ کا
طبیب خاص دوسرے کمرے میں تبادلۂ خیالات کر رہے تھے
کسی کو مہاپدم نند کے صحیح مرض کا حال نہ معلوم ہو پاتا تھا۔ ہر طبیب
اپنی لیاقت اور تجربے کی بنا پر راجہ کے لیے ایک مشورہ پیش
کرتا تھا۔ تمام طبیب اس پر تبصرہ اور تنقید کر کے رد کر دیتے
تھے۔ کافی دیر ہو جانے پر بھی تمام طبیب کسی ایک نتیجے پر نہ
پہنچ سکے۔ ہر طبیب اپنا اپنا سر جھکائے پریشانی کے عالم میں
خاموش بیٹھا تھا۔ کمرے کی فضا میں کامل سکوت مستول تھا۔

سنگرام سنگھ ایک گہری سانس کے ساتھ کرسی پر سے اٹھ
کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں کمرے کا جائزہ لیتی ہوئیں مہاپدم نند کی اس
روغنی تصویر پر جم گئیں جس کو ہندستان کے مشہور مصور بھارتی
نے اس شیر صفت تیر انداز کو اس کی جوانی میں کھینچا تھا جو اب بستر
مرگ پر پڑا زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کے دماغ
میں ستناپور کی لڑائی کی وہ تصویر کھنچ گئی جب مہاپدم نند نے
تیر اندازی اور شمشیر زنی کے جوہر دکھا کر دشمنوں کو لرزہ براندام
کر دیا تھا۔ اور اس کی بہادری اور شہ زوری کی دھوم چاروں
طرف پھیل گئی تھی۔ سنگرام سنگھ کے پیش مہاپدم نند کی جوانی کا وہ
پر آشوب زمانہ تھا جب وہ سیل گڈھ سے پیدل ہی اپنی محبوبہ
مہامایا سے ملنے گیا تھا۔ اس پر خطر راستے کے ہیبت ناک حوادث سے
آگاہ کرنے والوں پر اس نے بڑا لمبا قہقہہ مارا تھا جس کی گونج
سنگرام سنگھ اپنے دماغ میں تا ہنوز محسوس کر رہا تھا۔ اس نے
مہاپدم نند کی دھنسی ہوئی آنکھوں کو ان معنی خیز نگاہوں سے
دیکھا جو اس کی مترجم تھیں کہ حسن کی شراب میٹھی ضرور ہوتی ہے
لیکن یہ میٹھاس کس قدر زہریلی ہوتی ہے؟ اس کا نتیجہ اس کے اس حال
سے ظاہر ہے۔

سنگرام سنگھ نے اپنے تفکرات سے بھرے سر کو نیچا پایا کی

خوبصورت مسکراتی ہوئی تصویر کی طرف پھیرا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خون کے لال لال ڈورے ابھر آئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے آہنی بازو پھول گئے۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ وہ تصویر سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ کہنے لگا کہ تیری صنف بیشک قابل نفرت ہے، آگے بڑھنے لگا لیکن جوں ہی وہ بڑھا تھا اس کو معلوم ہوا جیسے مہامایا کے لب فطرت کو جنبش ہوئی اور اس کے گوش حقیقت نے اس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مرد کی ہر فتح اور نصرت عورت کی قربانی کی منت پذیر ہے۔ تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خون بہایا۔ لیکن یہ کون بتلائے گا کہ اس کے لیے عورتوں نے کس طرح اپنا سہاگ اجاڑ دیا؟ اے بے درد مرد سن کہ عورت نے اپنا خون دیکر تجھے زندگی سے مالا مال کیا ہے تاریخ جن لوگوں پر ساری قربان کرتی ہے وہ سب خود غرضی کے ایک لمحے میں پیدا ہوئے تھے"۔ سنگرام سنگھ نے غضب ناک نگاہوں سے مہامایا کی لٹکی ہوئی تصویر پر نگاہ ڈالی اور ایک لات دی کہ سے تصویر کو زمیں بوس کر دیا۔ سنگرام سنگھ کو تصویر کے گرنے سے نسوانی لہجے میں ڈھلے ہوئے الفاظ کی یہ ایک آواز دی کہ اگر تو نہیں تو تیری آیندہ کی نسلیں مساوات کے گیت گائیں گی...... مہا پدم نند کی نیم وا آنکھوں سے دو موتی ہوتے آنسو ڈھل کر اس کی سفید داڑھی میں غائب ہو گئے۔ ایک نہ سمجھنے والی زبان میں اس نے یہ کہا تھا کہ اے مادر گیتی کی لاڈلی بیٹی صبر کر۔ یہ مذہبی دیوانے تیری آنکھوں کے تنکے دیکھتے ہیں اپنی آنکھوں کے شہتیر نہیں دیکھتے۔ یہ دنیا سیہ خانہ ہے۔ جہاں ہر مذہب کی پیٹھ پر ثواب کا خوشنما پالان پڑا ہے۔ یہاں سب پر لے پاپی ہیں لیکن ہر ایک اپنے گناہ کی ترازو پر دوسروں کی بدکاریوں کو تولتا ہے۔

سنگرام سنگھ حکما کے کمرے میں داخل ہوا کمرے کی خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا "محترم دوستو! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تین گھنٹے کامل بحث و مباحثے کے بعد آپ لوگ کس نتیجہ پر پہنچے اگر کوئی نسخہ مرتب ہو گیا ہے تو فراہمی ادویہ کا فوری انتظام کیا جائے۔"

"معزز وزیر صاحب! ہم تمام لوگ مسلسل بحث و مباحثہ تنقید و تبصرے کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ راجہ مہاپدم نند کا مرض ایسا پیچیدہ ہے جو ہماری قابلیت اور تجربے کے حدود سے بھی پرے ہے۔ ہماری ناقص رائے میں مرض دوا کی پرواز سے گذر کر دعا کی بلندی پر پہنچ چکا ہے اب دعا کی ضرورت ہے" راجہ کے طبیب خاص نے دوسرے حکما کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

"میرے لایق دوستو میں ابھی راجہ کے پاس بیٹھا ہوا اسی پر غور ہی کر رہا تھا۔ اور خیال کر کے وہاں سے چلا تھا کہ آپ لوگوں سے اس معاملے میں رائے لوں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں آپ لوگوں سے اس کے متعلق عرض کرتا۔ آپ لوگوں نے پیشتر ہی اس کی رائے دیدی اب میں راج رشی کی خدمت میں باریاب ہونے جا رہا ہوں۔ دیکھوں وہ اس معاملے میں کیا رہنمائی کرتے ہیں" وزیر یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ کمرے کی فضا میں دوبارہ مکمل سکوت چھا گیا۔

وزیر حکما کے کمرے سے نکل کر۔ دوسرے کمروں اور دالانوں سے گذرتا ہوا خاموشی کے ساتھ سڑک پر نکل آیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ ستارے آسمان پر مسکرا رہے تھے۔ ماہتاب نے اپنے رخ روشن کو ایک سحاب کے ٹکڑے سے ڈھاک لیا تھا رات کی دیوی ہوا کے تیز گھوڑے پر سوار انسانوں اور حیوانوں کو نیند کی ارغوانی شراب پلا رہی تھی۔ پیل گڈھ کی تمام مخلوق لیلی شب کے آغوش میں سو رہی تھی۔ تین گھنٹے کی سخت مسافت کے بعد سنگرام سنگھ راج رشی کی کٹی پہنچا۔ قریب نصف گھنٹہ انتظار کے بعد راج رشی اپنی کٹی سے برآمد ہوئے۔ سنگرام سنگھ نے راج رشی کے قدم چومے اور سر جھکا کر الگ کھڑا ہو گیا۔

"کیسے آنا ہوا سنگرام" راج رشی نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا

"راجہ مہاپدم نند بہت علیل ہیں راج رشی جی تمام حکما جواب دے چکے ہیں"۔

جگ کی لیلا نیاری ہے بہت سے کشٹ ایسے ہیں جو نش خود بھگوان کو منا کر دور کر سکتا ہے۔ راج کماری گروہار مٹھ کے چیلوں سے ایک یگیہ کرا دیں تو مہاپدم نند کا یہ کشٹ دور ہو جائے لیکن اس یگیہ کو جس قدر جلدی ہو کیا جاوے ورنہ پھر بیکار ہوگا۔ رانی اگر زندہ ہوتیں تو یہ کام رانی کا تھا انکی عدم موجودگی میں تمام فرائض راج کماری رمبھا کو انجام دینا پڑینگے۔ جاؤ اور جلدی جاؤ راج رشی نے وزیر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

راجکماری گروہاری مٹھ میں داخل کیسے ہو سکے گی راج رشی مٹھ کا دروازہ تو عورتوں کے لیے بند ہے ہمیشہ کے لیے۔

نہیں جاؤ تم رمبھا کو مٹھ روانہ کر دو۔ مٹھ کے دروازے آج سے ہر مرد اور عورت کے لیے کھلے رہیں گے۔

رات کی دیوی کا جوبن ختم ہو رہا تھا۔ صبح آبدار کے آثار شفق پھولنے سے نمایاں ہو رہے تھے۔ دور سے سنکھ و ناقوس کی مدہم آوازیں آ رہی تھیں۔ مرغان سحر اپنی خوش الحان آوازوں سے آمد صبح کا پیغام دے رہے تھے۔ نسیم سحری آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کے کنگھی کر رہی تھی۔ سنگرام سنگھ نے راج رشی کو آخری ڈنڈوت کیا۔ اور تیز قدموں کے ساتھ راج محل کی جانب چل پڑا۔

(۳)

"رمبھا.... رمبھا" مہاپدم نند نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے پکارا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی آج مہینہ بھر گذرا باقی رہی تھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر ایک منٹ کیواسطے بھی اس کے روشنی پیدا ہو جاتی تو وہ اپنی لڑکی کا آخری دیدار کر لیتا۔ وہ کس قدر بے بس تھا۔

'جی آئی پتا جی' رمبھا قریب کے شاہ نشین سے مہاپدم نند کے کمرے میں لپکتی ہوئی آ پہنچی۔

'کہاں ہو رمبھا'

'آپ ہی کے پاس بیٹھی ہوں'

'اچھا.... اچھا.... رمبھا اب تم کتنی بڑی ہو گئی ہو' مہاپدم نند نے افسردگی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

'اتنی ہی بڑی ہوں پتا جی'

'اچھا.... اچھا رمبھا تم میرے پاس ہی بیٹھی رہا کرو اور قریب آ جاؤ.... اور کھسکو... ہاں اب میرے سینے سے لپٹ جاؤ۔ ہاں لپٹی رہو اسیطرح کہ میں تمہارے دل کی دھڑکن کو محسوس کر سکوں.... مگر پھر بھی تم کسقدر دور ہو رمبھا'

رمبھا کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر اس کے کندنی رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ (سنگرام سنگھ آ جاتا ہے)

'رمبھا تم بہت جلد گروہاری مٹھ جانے کی تیاری کرو راج رشی نے یگیہ کرنے کو کہا ہے۔ میں یگیہ کا سامان فراہم کرتا ہوں جب تک تم گروہاری کے چیلوں کو بلا لاؤ'

"مگر میں داخل کیسے ہو سکونگی۔ مٹھ کا دروازہ تو ہمارے لیے بند ہے'

'نہیں رمبھا راج رشی کہہ رہے تھے کہ آج سے مٹھ کے دروازے سب کے لیے کھل گئے ہیں۔ جاؤ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ دیر کرنا اچھا نہیں ہے'

'اچھا' رمبھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بڑی دیر مسکراتی رہی شاید اس لیے کہ اب وہ گیانو کو دیکھ سکے گی۔ وہ اس وقت بالکل بھول گئی تھی کہ اس کا باپ چند گھنٹوں کا اور مہمان رہ گیا ہے۔

(۴)

راج کماری رمبھا پالکی کھوٹے محل سے سہیلیوں کی ہمراہی میں نکلی۔ پائین باغ سے نکل کر وہ پالکی میں سوار ہو گئی۔ آگے آگے چوبدار توڑہیوں کی دلخراش آوازوں سے راج کماری کی آمد کا اعلان کرتے جا رہے تھے۔ پیچھے پیچھے لونڈیاں۔ باندیاں برہنہ سر گھبراتی لڑکھڑاتی معدود تکا م تھیں۔ پیچھے گھوڑے

سوار سپاہی جلوس کے دونوں بازوؤں پر پہرہ دے رہے تھے۔ جلوس سیل گڈھ سے نکل کر ایک ایسی جگہ آگیا جہاں کی ساری فضا ایک پرسکون خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

گردھاری مٹھ کے پھاٹک پر پہنچ کر راج کماری پالکی سے اتری۔ پھاٹک پر کامل سکوت تھا صرف دو انسانوں کی سانسوں کی پیہم آوازیں آرہی تھیں۔ رمبھا نے آگے بڑھکر دربان سے پھاٹک کھولنے کو کہا۔

سیل گڈھ میں اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ گردھاری کے مٹھ کے دروازے عورتوں کے لیے بند ہیں۔ دربان نے پورس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"سمبھا واجب جانتی ہونگی" پورس نے دربان سے کہا۔

بیٹی۔ یہ مٹھ ان فقیروں کا استھان ہے جو دنیا کی تمام چیزوں سے منہ موڑ کر اپنے مالک کا دھیان انتہائی تنہائی کے اندر کرتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا کے کسی بڑے آدمی سے نہیں ملتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انکی عبادت کو درہم برہم کرنے والی ہستی صرف عورت ہے۔ چنانچہ اس کا داخلہ خصوصیت سے اس مٹھ میں بند ہے۔ جب سے ان لوگوں نے اپنی ریاضت شروع کی ہے اب تک انہوں نے کسی عورت کا منہ تک نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے وہ لوگ اپنی ریاضتوں میں خلوص اور پاکیزگی پاتے ہیں۔ تمام ہندوجاتی ان کو بزرگی اور پاکیزگی کی بنا پر عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کو اس زندگی میں زیادہ کیف حاصل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی دسعت کو چند حیثیت سے جان چکے ہیں۔ جاؤ واپس چلی جاؤ بیٹی اور اپنے اس مٹھ کی طرف آنیکا خیال نہ کرنا۔ ورنہ انکی شکتی تم کو فنا کر دیگی۔

مغرب سے کالی خوفناک گھٹائیں امنڈ رہی تھیں۔ فضا کا غیر معمولی سکوت ہولناک تھا۔ دور اونچائی پر اڑنے والے پرند اپنے بازوؤں کو سمیٹ کر جلد جلد ہی فضا کی نیچی سطح یعنی ہوا کی تہوں میں اترنے لگے۔ ہوا کے تند جھونکے پیڑوں کو جھلائے ڈال رہے تھے۔

رمبھا پالکی کے سیاہ چکنی بلی کو پکڑے انتہائی شرمندگی میں سر لٹکائے کھڑی تھی۔

"اجیت۔ اجیت" مٹھ کے اندر سے دروازہ کو تھپتھپاتے ہوے کسی نے پکارا۔

دربان نے دروازہ کھولا۔ گیانو دروازہ سے برآمد ہوا "رمبھا" گیانو ایک چیخ کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

"گیانو" رمبھا نے دھیرے سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے چمک رہے تھے۔

"میرے پتاجی بہت بیمار ہیں۔ راج رشی نے یگیہ کرنے کو کہا ہے۔ اس وجہ سے آپکو لینے آئی ہوں۔ جلدی چلیے۔

(گرد گردھاری آتے ہیں)

"نمسکار۔ گروجی"

"جیتی رہو بیٹی" گردھاری مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے گیانو اور رمبھا کے سروں کو تھپتھپاتے ہوے کہا "خوش رہو ہمیشہ"

ایک گھوڑے سوار دور گرد و غبار کی لپیٹ میں مٹھ کیجانب آرہا تھا۔ ٹاپوں کی آواز کبھی کبھی لونڈیوں۔ باندیوں اور چوبداروں کے دھیانوں کو اپنی طرف کرلیتی تھی۔

آسمان پر گہرے سیاہ بادلوں کی ہوشربا گھڑگھڑاہٹ کسی آنے والے حادثے کا اشارہ کر رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے نے سینکڑوں درختوں کو زمیں بوس کر دیا تھا۔

عورت کا چھونا گناہ ہے گروجی" رمبھا نے گردھاری کے ہاتھ کو اپنے سر سے جھٹکا دیکر ہٹاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی میں تم دونوں کے پرانے رشتہ جوڑنے آیا ہوں گیانو بارہ برس پہلے کی طرح آج پھر تیرے لیے بیقرار ہے آج پھر وہ تیری حسین دنیا کے لیے آرزومند ہے۔ کیا تو اس کی محبت کو ٹھکرا دینا چاہتی ہے"

"عورت گناہ کا سبب ہے۔ مقدس باپ

نہیں۔ نہیں بیٹی"

" عورت روحانیت کے اعلیٰ ترین مراتب حاصل کرنے میں زبردست رکاوٹ ہے ..... مقدس باپ"

"نہیں رمبھا کیا کہہ رہی ہے تو۔

"عورت مرد کی ریاضتوں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے .....

مقدس باپ'

'گیانو' تو کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔

'نہیں'

رمبھا پالکی میں بیٹھ گئی۔ جلوس روانہ ہو گیا۔

گیانو گر دھاری کے سر کو اپنے زانو پر رکھے ہوئے پالکی کے طرف بے قرار آنکھوں سے تک رہا تھا۔ اس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ وہ رمبھا کو اپنی ایک لمبی چیخ سے روک لے۔

جلوس کے قریب آ کر ایک برق رفتار گھوڑا رکا۔ گھوڑے سوار نے کہاروں کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی پوری رفتار سے راج محل جاویں۔

"رمبھا..... رمبھا" گیانو اپنی دردانگیز چیخوں سے پالکی کو روکنا چاہتا تھا۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ ہوا کے مخالف جھونکے اس کو روک رہے تھے۔

برگد کے ایک بھاری درخت نے گیانو کو اپنے چنگلوں میں لے لیا۔

'رمبھا' ایک تھرتھراتی ہوئی آخری چیخ طوفان کے تیز جھوکوں کے ساتھ بہہ گئی۔

پالکی ایک کالے نشان کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

عظمت حسین

غزل

وفور رنج و غم میں اشک افشانی نہیں جاتی
وہ دریا دل میں بہہ چھپے کہ طغیانی نہیں جاتی

کمال عشق کی یہہ نتنہ سامانی نہیں جاتی
کہ اب میری طرح ان کی بھی حیرانی نہیں جاتی

جنوں کی کارفرمائی سمجھتی ہے تال گل
مگر غنچوں کی ابتک چاک دامانی نہیں جاتی

نہ جانے کونسا ہے نقش باقی ذہن فطرت میں
جو اس سعی مسلسل کی فراوانی نہیں جاتی

یہ اپنا تجربہ ہے۔ لاکھ تدبیریں کرو لیکن
اجڑ جاتا ہے جو دل۔ اسکی ویرانی نہیں جاتی

نگاہ دوربیں دیکھ یہ فطرت نے غضب ڈھایا
خزاں پر بھی جنوں کی چاک دامانی نہیں جاتی

مثال آئینہ حیران ہے چشم تماشائی
مگر فطرت کی پیہم جلوہ سامانی نہیں جاتی

محبت کی خلش دل کیلیے بھی اک معمہ ہے
کہ یہ محسوس تو ہوتی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی

محبت عقل کو لاتی ہے جب آغوش رنگیں میں
نظر والوں سے۔ پھر یہ راہ پہچانی نہیں جاتی

زر و گوہر کو نرگس خاک سمجھے ہیں یہ اپنی حالت
فقیری پر بھی سرخوش شان سلطانی نہیں جاتی

آغا سرخوش قزلباش (دہلوی)

مضامین ہمیشہ صاف اور خوش خط لکھیے۔

جن خریداروں کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے براہ کرم وہ اپنا چندہ منی آرڈر کے ذریعے روانہ فرمادیں

منیجر

نطق محبت

جنون انگیز ہے بادِ بہاری — نہ ہوگی دردِ دل کی بیقراری

ابھی آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ واردا تیں — جوانی کی وہ اگلی واردا تیں

روش صحنِ چمن کی گفتگو کی سیریں — محبت کی طرب انگیز لہریں

امنگوں کا وہ سیلاب تلاطم — اشاروں کا امید افزا تکلم

حجاباتِ دوئی کی پردہ داری — فسانہ بن گئی تھی اشکباری

تمنّا زار و گے زمزمہ جھونکے — فریب حسن کے وہ چاؤ دھوکے

خراباتِ تفکر و امیانہ — کشیدہ تمنائی کا اک بہانہ

ملاقاتوں کا وہ اظہار پرجوش — نگاہوں میں ابھی تک ہے وہ آغوش

خودی ناآشنا معصوم باتیں — حجاب دلبری موہوم گھاتیں

شرابِ عشق سے سرشار و مخمور — نشہ میں اپنے ہی جذبات میں چور

خودی اور بیخودی کی پاسداری — رموزِ عشق کا الہام طاری

محبت اور وہ بھی پاک و معصوم — جدائی کا تخیل جنبشِ موہوم

یہی اسرار ہیں سوز دروں کے — یہی معیار ہیں جذب و فسوں کے

یہ افسانہ محبت کی زباں ہے

اسی تخیل سے دل بھی جواں ہے

عظیم حیدرآبادی (عثمانیہ)

ایک بندہ

دبلا، پتلا سا بدن اور اس پہ بوسیدہ لباس

نیچی نظریں سوچ میں کچھ اور ہے چہرہ اداس

جھریاں چہرہ کی ظاہر کر رہی ہیں ہے ملول

زرد چہرہ کیا ہے گویا ایک مرجھایا سا پھول

غمزدہ بیٹھا ہے وہ دنیا سے گھبرایا ہوا

اہل ثروت کی نظر میں ایک ٹھکرایا ہوا

وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کیا ہے دیوانہ کا خواب

کہہ رہا ہے دل میں یارب زندگی ہے یا سزا

کیوں گرا دیتے ہیں نظروں سے مجھے اہل جہاں

کس لیے بے چین رکھتا ہے مجھے دردِ نہاں

بے وفائی دوستوں کی اہل دنیا کا ستم

یاد سب کچھ آ رہا ہے اس لیے آنکھیں ہیں نم

طعنۂ اغیار کے سننے کی اب طاقت نہیں

یاالٰہی موت ہی دیدے اگر دولت نہیں

زندگی میں پیٹ بھر کھانا اگر ملتا نہیں

میں بھی کہہ سکتا ہوں یارب میں ترا بندہ نہیں

غلام خواجہ ذوقی بی۔ اے (عثمانیہ)

شیکسپیر اور اس کے ڈرامے

۱۵۶۴ء عہدالزبتھ کا سب سے اہم سال ہے۔ اسی سال فروری کے طوفانی موسم میں شوریدہ سر اور بدنصیب کرسٹو فرمارلو پیدا ہوا۔ اسی سال جب مارچ کا طوفانی مہینہ گزر گیا اور اپریل کی بارش اور دھوپ نے زمین کو خلعت نو بخشی تو مارلو سے بھی عظیم المرتبت اور اس سے بھی زیادہ خوش مزاج ہستی عالم وجود میں آئی جس نے ولیم شیکسپیر کا نام پایا۔ شیکسپیر نے ملک کے جس حصے میں جنم لیا وہ وسطی انگلستان کے حسین ترین اضلاع میں شمار ہوتا ہے۔ ایون کا خاموش دریا اس کے درمیان سے گزرتا ہے اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت دریا کے دونوں طرف وسیع و زرخیز مرغزار پھیلے ہوئے تھے۔ دریا کے کناروں پر ہر قسم کے خودرو رنگ رنگ کے لال پیلے، نیلے اودے پھول اگتے تھے۔ اس کے شمال میں آرڈن کا جنگل واقع تھا۔ اس زمانے میں یہ حقیقتاً ایک گھنا جنگل اور حسین قدرتی مناظر کا دلکش مرقع تھا۔ اگر ہمیں تخیل کو اکسانے کے لیے کسی پرعظمت و پرجلال شئے کی کمی بھی تھی تو اس کے بدلے وہاں ہر طرف ایک ایسا پرکیف سکون اور ایسی خاموشی و دلکشی برستی تھی جو دل میں سوز و گداز اور محبت کے جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایون کے بائیں کنارے پر جہاں قدیم رومی سڑک ایک بند کے ذریعے دریا کو کاٹتی ہے، اسٹراٹ فورڈ نامی ایک گاؤں واقع تھا۔ شیکسپیر کے زمانے میں پتھر کے بنے ہوئے عمدہ پل نے جو ابھی تک قایم ہے اس بند کی جگہ لے لی ہے۔ اور وہ بھورے رنگ کا گرجا، جو شیکسپیر کے لڑکپن میں بھی پرانا تھا اب تک دریا کے کنارے اپنا سر بلند کیے کھڑا ہے۔ چھوٹا سا گاؤں سیاہ لکڑی کے مکانات سے بنی ہوئی عجیب گلیوں پر پھیلا ہوا تھا۔ ہنلے اسٹریٹ کا وہ مکان جس میں شیکسپیر پیدا ہوا تھا چھجے دار اور خوبصورت تھا۔ آس پاس کے مکانات کی طرح پست چھت کے کمرے بنے ہوئے تھے اور چھت میں بلوط کے وزنی شہتیر لگے ہوئے تھے۔ شاعر کا باپ جان شیکسپیر اس مکان میں اپنے بیٹے کی ولادت سے کوئی بارہ سال پہلے سے ہی مکان میں تھا۔ یہ شخص ہر قسم کی زرعی پیداوار، خصوصاً اون چمڑے اور گوشت کی تجارت کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اس کو مختلف حیثیتوں سے پیش کیا ہے۔ کسی نے اس کو دستانے فروش بتایا ہے، کسی نے قصاب اور کسی نے کسان لکھا ہے۔ اسکا تعلق ایک قدیم معافی دار خاندان سے تھا جو کئی پشتوں سے وارو ک کے ضلع میں رہتا تھا۔ جان ایک محنتی اور خوشحال آدمی تھا اور اپنے گاؤں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۱۵۶۵ء میں وہ اپنے گاؤں کا چودھری بنا اور ۱۵۶۸ء میں بیلف اور میئر کے رتبہ تک ترقی کر گیا۔

ولیم شیکسپیر نے ایک ایسے آرام دہ گھر میں پرورش پائی جہاں ضروریات زندگی کی کوئی کمی نہیں تھی اور غالباً جیسے اس عہد کے بعض تکلفات بھی حاصل تھے۔ اس احساس کے ساتھ اس کی پرورش ہوئی تھی کہ وہ جس خاندان سے تعلق رکھتا ہے زیادہ مشہور ہے اور اس کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ یہ احساس عزت نفس کو تقویت دینے والے اہم محرکات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیکسپیر کو اپنے باپ سے کوئی مدد یا تربیت نہیں ملی۔ جان شیکسپیر ان بے چین اور کوتاہ اندیش رجائیت کے حامل جفاکش لیکن بے اثر لوگوں میں سے

تھا جو جوش وخروش کے ساتھ متعدد کاموں میں ہاتھ تو ڈالتے ہیں، لیکن نمایاں ترقی کیے بغیر ناکام رہ جاتے ہیں۔ وہ اکثر مقدمہ بازی میں مشغول رہتا تھا۔ اور جیسا کہ بعض ناقدوں نے لکھا ہے، اس کے ہونہار بیٹے ولیم کا قانونی طریقہ کار اور قانونی اصطلاحات سے واقفیت انھیں قانونی جھگڑوں کی مرہون منت ہے۔ بہرحال شیکسپیر کے ایام طفولیت میں اس کے باپ کو چھوٹے چھوٹے قرضوں کی بازیافت سے متعلق جو جھگڑے پیش آئے۔ وہ خاندان کی خوش حالی کو متاثر نہ کر سکے۔ جان شیکسپیر کی خوش اخلاقی، اس کی بیوی کی خاموش لیکن اعلیٰ تربیت یافتہ مہمان نوازی اور گاؤں میں اس کے مرتبے کی وجہ سے ہنلے اسٹریٹ کا مکان بہت سے لوگوں کے لیے نہ صرف "دارالمسرت" بن گیا ہوگا، بلکہ وہ سماجی اور خاندانی زندگی کا ایک مرکز بھی رہا ہوگا۔

زمانہ گذرتا گیا، اور جیسا کہ ہمیں یقین ہے کہ تعلیم و تربیت کے لیے ولیم شیکسپیر کو اسٹراٹ فورڈ آن ایون کے قدیم گرامر اسکول میں بھیجا گیا۔ یہاں اس کے وقت کا بیشتر حصہ لاطینی زبان کے حصول میں صرف ہوا اور اس نے مدرسے کے ایک عام طالب علم کی طرح لاطینی زبان کے بعض مصنفوں کی کتابیں پڑھیں۔ لیلی کی لاطینی صرف و نحو جو اس زمانے میں عام طور پر مدارس میں رائج تھی، غالباً اسے زبانی یاد تھی کیوں کہ وہ اپنے دو ڈراموں "لوز لیبر لاسٹ" اور "دی مری وائفز آف ونڈسر" میں اسی کتاب کے بعض جملے نقل کرتا ہے۔ سر ہیو ایوانز (مری وائفز ونڈسر کا ایک کردار) اپنی علمیت کی نمائش کرنے والا ہولو فرنز (لوز لیبر لاسٹ کا ایک کردار) اور بات بات پر قسمیں کھانے والے اسکول ماسٹر پنچ (کامیڈی آف اررز) یہ سب کردار غالباً بہت سے استادوں کے خاکے ہیں جن سے شیکسپیر نے اسٹراٹ فورڈ گرامر اسکول میں تعلیم پائی تھی۔

ہمارے پاس شیکسپیر کے زمانہ طالب علمی کی کوئی ایسی یادداشت موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آیا وہ محنتی اور شوقین طالب علموں میں شمار کیا جاتا تھا یا کم مغز اور بد شوق لڑکوں میں یا ان سب سے زیادہ اہم یہ بات کہ وہ مدرسے کے اوقات کے سوا کن مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔ بلا شبہہ وہ اور بچوں کی طرح ان کھیلوں میں حصہ لیتا ہوگا جو عہد الزبتھ میں عام طور پر رائج تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ اس حسین جنگل میں گھومنے میں صرف کرتا ہوگا جو اس کے گاؤں کے اطراف پھیلا ہوا تھا۔ اس جنگل کی یاد اس کے دل میں ایسی بس گئی تھی کہ لندن کے طویل زمانہ قیام میں بھی وہ اسے نہ بھول سکا۔ اس نے تمام گلہ بانوں، پھیری والوں بھٹیاروں، دیہاتی کانسٹبلوں۔ یہاں تک کہ گداگروں اور گاؤں کے "معصوموں" سے تک دوستی پیدا کر لی تھی۔ بہلا پھسلا کر ان سے کہانیاں سنا کرتا تھا، مقامی روایتوں، قدیم گیتوں، ضرب المثلوں اور عوام الناس کے مشہور قصوں کو جمع کرتا تھا۔ ایسی انگریزی سیکھتا تھا۔ جو گھریلو، شیریں اور جذبات سے مملو ہوتی تھی اور جس پر وسطی انگلستان کے ہر ایک کسان کو پوری قدرت حاصل ہوتی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ اسے میدانی شکار سے بڑی دلچسپی تھی کیوں کہ اس نے اپنے ڈراموں میں شکار، شکرے بازی اور تعاقب سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ تاہم اگر اس کے ڈراموں سے دو نمایاں حوالوں کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی ہمدردیاں اکثر شکاری کے ساتھ نہیں بلکہ شکار کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ ایک جگہ کہتا ہے، "غریب بے زبان ہرن کو شکاری کے ہاتھ سے کاری زخم لگ چکا ہے"۔ ایک جگہ تشبیہ دی ہے "بڑے بڑے آنسو یکے بعد دیگرے اس کی دلربا ناک پر سے بہ بہ کر ایک دوسرے کا رحمدلانہ پیچھا کرنے لگے"۔ اس نے خرگوش کو دیکھا تھا۔ اس کی تصویر کھینچتا ہے "بے زبان خرگوش دور، بہت دور پہاڑی پر اپنے اگلے پیر اٹھائے گوش بر آواز کھڑا ہے کہ دشمن ابھی تک اس کا پیچھا تو نہیں کر رہے ہیں"۔

زمانے کے ساتھ ساتھ جب شیکسپیر کی عمر دس سال کی ہوئی تو ہنلے اسٹریٹ کے مکان میں اس کے ساتھ کھیلنے کیلئے

اس کی ایک بہن اور تین بھائی پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن اب گھر کا آرام دہ ماحول آہستہ آہستہ بدلتا جا رہا تھا۔ جان شیکسپیر کے کاروبار میں اب وہ اگلی سی گرمی اور جان باقی نہیں رہی تھی۔ کاروبار کو سنبھالنے کے لیے اسے سرمائے کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے قرض لینا شروع کر دیا، اور گاؤں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ جان شیکسپیر جیسا خوش حال تاجر اب سخت مالی مشکلات میں پھنس گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان نے معاملات کو سدھارنے کی بڑی جان توڑ کوشش کی تھی، لیکن ہر سال حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے۔ ان دو کھیتوں میں جو اس کی بیوی کے نام پر تھے، ایک ۱۵۷۸ء میں رہن ہوا اور دوسرے کو ۱۵۷۹ء میں فروخت کرنا پڑا۔ قسمت کا چکر دیکھیے کہ اس الٹ پھیر میں ایک ایسا مقدمہ اٹھ کھڑا ہوا، جس نے جان کو اور بھی تنگ دست بلکہ مفلس بنا دیا۔ ۱۵۸۵ء میں رہی سہی عزت یوں گئی کہ اس کے مال و اسباب پر قرقی کے احکام صادر ہوئے۔ مگر اس کے پاس رکھا ہی کیا تھا۔ اعلان کر دیا گیا کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے قرق کیا جا سکے۔ دوسرے سال اسے چودھری کی خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا کیونکہ "وہ پنچایت میں شریک نہیں ہو رہا ہے، اور ایک عرصے سے اسے چھوڑ رکھا ہے۔" بے چارہ غریب شاید اپنی گرفتاری کے ڈر سے گھر سے باہر بھی نہ نکلتا تھا۔ اس طرح دوسرے مالی نقصانات کے ساتھ ساتھ اس کا وقار اور اس کی عزت بھی رخصت ہو گئی۔

ایک روایت کی رو سے شیکسپیر اس واقعے سے بہت پہلے ہی ۱۵۷۷ء میں مدرسہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کے ایسے ناموافق ماحول کا خیال کیجیے تو یہ روایت بہت زیادہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے باپ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اور ان برے دنوں میں جس طرح بھی بن پڑے اپنے خاندان کا ہاتھ بٹانا اس پر لازم تھا۔ ۱۵۷۷ء کے بعد کے چند سال اس نے کس طرح بسر کیے اس کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔ ایک سوانح نگار کا خیال ہے "اس نے اپنے باپ کا پیشہ اختیار کر لیا"۔ اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ۱۵۸۶ء میں جان شیکسپیر کو یکے بعد دیگرے اپنے تمام کاروبار سے ہاتھ دھونا پڑا ہوگا۔ اب وہ ایک قصاب کی حیثیت سے بقائے حیات کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسی زندگی اس کے بیٹے کے لیے کتنی تکلیف دہ ثابت ہوئی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے خود شیکسپیر نے اس سے بچنے کے لیے کوئی جان توڑ کوشش نہیں کی۔ اس زمانے کے اس کی زندگی کے جو گنتی کے چند شواہد ہمیں دستیاب ہو سکے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گھر سے باہر نکما بیٹھا گھر کے روح فرسا ماحول سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ ۱۵۸۲ء میں جب کہ وہ ابھی صرف اٹھارہ برس ہی کا تھا اور اس کے باپ کی مالی مشکلات کی انتہا ہو چکی تھی، اس نے شادی کر لی۔ اس کی بیوی این ہاتھ وے، شاٹری نامی ایک چھوٹے سے قصبے کے ایک کسان کی بیٹی تھی۔ یہ قصبہ اسٹراٹ فورڈ سے چند کھیتوں کے فصل پر واقع ہے۔ اس نئی ذمہ داری نے بھی شیکسپیر کو کسی غیر معمولی جد و جہد پر نہیں اکسایا۔ آگے کے اور چند سال اس نئے جوڑے نے کس طرح بسر کیے اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ این ہاتھ وے کو اپنے باپ سے ورثے میں ایک چھوٹی سی رقم ملی تھی۔ اس دوران میں ایک روایت کی بموجب شیکسپیر اسکول ماسٹر بن گیا تھا۔ ۱۵۸۳ء میں اس کے ایک بیٹی اور ۱۵۸۵ء میں دو توام بچے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شیکسپیر کو اپنی زندگی سدھارنے کا خیال پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے مشکلات زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اب تک تو وہ ناموافق حالات سے بد دل رہتا تھا، بغیر کسی مقصد کے زندگی بسر کر رہا تھا، اور اپنی ہر خواہش سے مغلوب ہو جایا کرتا تھا لیکن اب ایک نیا عزم آہستہ آہستہ اس کے دل میں جگہ لے رہا تھا۔ اس عزم نے اس کی آئندہ زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یہ عزم تھا اپنے باپ کے کاروبار کو سنبھالنے کا تاکہ شیکسپیر خاندان کو شرافت رفتہ د

میں پھر ایک بار باعزت بنانے کا، اور اپنے خاندان کو اپنے وطن میں ایک آرام دہ اور خوش حال گھر مہیا کرنے کا۔ اس لاابالی، خوش باش لڑکے نے اپنی خوش روی اور خوش ادائی سے بہت سے دوست پیدا کر لیے تھے۔ ان دوستوں کی صحبت میں بیکار رہنا نہ صرف آسان بلکہ خوش گوار بھی تھا۔ لیکن آگے چل کر دوستوں کی یہی جماعت اپنی ہمت اور جواں مردی سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دینے والی تھی۔

یہ یادگار تبدیلی ایک حادثے کی وجہ سے پیش آئی تھی جس نے شیکسپیر کو اسٹراٹ فورڈ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس کا اولین سوانح نگار نکولاس رو لکھتا ہے "بدقسمتی سے وہ ایسے نوجوانوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا جو بری صحبت میں پڑ گئے تھے اور ان میں سے بعض کو ہرن کے شکار کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ شیکسپیر کو اپنے ساتھ لے کر اسٹراٹ فورڈ سے قریب سر ٹامس لوسی آف چارل کوٹ کے باغ کو ناجائز طور پر استعمال کیا تھا۔ یہ دیکھ کر ان صاحب نے اس کا پیچھا کیا جسے شیکسپیر نے اپنے نزدیک ضرورت سے زیادہ سخت سمجھا۔ اس ناگوار سلوک کا بدلہ لینے کے لیے اس نے سر ٹامس پر ایک نظم لکھی۔ یہ نظم جو اب دستیاب نہیں ہوتی۔ غالباً صنف شاعری میں اس کی پہلی طبع آزمائی کا نتیجہ ہونے کے باوجود، کہا جاتا ہے کہ بہت ہی تلخ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیکسپیر کے خلاف الزامات میں چارگونہ اضافہ ہوگیا اور بات یہاں تک بڑھی کہ اسے اپنے کاروبار اور اپنے خاندان کو وارو ک شائر میں چھوڑ چھاڑ کر لندن میں پناہ لینی پڑی" یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ سر ٹامس نے اس کے کوڑے بھی لگائے۔ غالباً اس قصے کی تمام تفصیلات درست نہیں ہیں تاہم جو چھوٹے چھوٹے مختلف شواہد اب دستیاب ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر ٹامس کی زمین پر شکار کھیلنے کی علت میں وہ کسی جھگڑے میں مبتلا ضرور ہوگیا تھا۔ چھ یا سات سال بعد جب وہ اپنا ڈرامہ "مری وائفز آف ونڈسر" لکھ رہا تھا تو اسے یہ حادثہ پھر یاد آگیا۔ امتداد زمانہ کے باعث جذبات میں وہ تلخی باقی نہ رہی تھی، اس لیے اس نے اپنے قدیم دشمن کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ خود اپنا آپ مضحکہ اڑاتا ہے۔ اس کو بعد کی آنے والی نسلیں لافانی جسٹس شیالو کے نام سے یاد رکھیں گی۔۔

(۲)

ہمیں یقین ہے کہ سنہ ۱۵۸۶ء یا سنہ ۱۵۸۷ء میں شیکسپیر لندن میں بالکل گم نام اور افلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لندن میں رچرڈ فیلڈ نامی اس کا دوست رہتا تھا۔ یہ شخص اسٹراٹ فورڈ کا رہنے والا اور شیکسپیر کے باپ کے ایک دوست کا بیٹا تھا یہ ضرور ہے کہ فیلڈ نے اپنے نوجوان ہم وطن کے لیے بہتری کوشش کی ہوگی، لیکن شیکسپیر جس غرض سے لندن آیا تھا، اس معاملے میں وہ شیکسپیر کی بہت کم مدد کر سکتا تھا۔ ولیم شیکسپیر کو اپنی راہ آپ نکالنی پڑی۔ نہایت بے جگری کے ساتھ وہ روزگار کی تلاش میں نکل پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے اپنی روزی کمانے کے لیے شہر کو سب سے بہتر ذریعہ سمجھ رکھا تھا۔ اسٹراٹ فورڈ سے وہ بہت سے ایسے اداکاروں کی یاد اپنے دل میں لے کر آیا تھا جو مختلف اوقات میں گاؤں آیا کرتے تھے۔ غالباً اسے وہ ڈرامے بھی یاد تھے جو اس عہد کے مذاق کے مطابق ملک میں عام طور پر رائج تھے۔ غالباً اس نے وہ تاریخی جشن بھی دیکھے تھے جو کنل ورتھ میں (سنہ ۱۵۷۵ء) میں منائے گئے تھے۔ شاید ایسے مشہور اور یادگار موقع پر باپ خود اپنے بیٹے کو ساتھ لے گیا ہو کیونکہ کنل ورتھ اور اسٹراٹ فورڈ کے درمیان صرف پندرہ میل کا فاصلہ ہے۔ بہت سے اور نوجوانوں کی طرح اس نے بھی یہ خواب دیکھا ہوگا کہ اسٹیج پر آنے سے ایک نہایت کامیاب اور درخشاں زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن جس راستے سے اس نے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی وہ نہایت دشوار گذار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملازمت کی امید میں اسے بہت دنوں تک تھیٹر کے دروازوں پر

تاپڑا۔ چنانچہ ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ تھیٹر کے آنے والے شرفا کی نگرانی کرکے اپنی روزی کمایا کرتا تھا۔ بہت جلد تھیٹر کے مالکوں کی نظریں اس پر پڑنے لگیں شیکسپیر اس جماعت میں داخل کرلیا گیا جو اس وقت بہت ہی گری ہوئی حالت میں تھی مشہور ہے کہ شیکسپیر کو جو پہلی ملازمت دی گئی وہ "کال بائے" (ایکٹروں کو بلانے والا لڑکا) کی جگہ تھی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ اس نے یہ کام کیا بھی یا نہیں۔ شاید اگر کیا ہو تو اسے بہترین طریقے پر کیا ہو۔ یا اپنے آپ کو نہایت مفید اور کارآمد ثابت کیا ہوگا اور مختلف کاموں میں مشورے دیتا رہا ہوگا بہر حال وہ بہت جلد ترقی کر گیا۔ سنہ ۱۵۹۴ء کے قریب وہ لارڈ چمبرلن کے اداکاروں کی جماعت کا ایک رکن تھا اور بحیثیت اداکار تھوڑی بہت اہمیت بھی حاصل کرلی تھی۔

اس تمام مدت میں شیکسپیر غالباً نہایت افلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک گندی اور گمنام گلی کے ایک حجرے میں پڑا رہتا تھا۔ معمولی قسم کے گھٹیا ڈھابوں میں کھانا کھاتا تھا۔ کسب معاش کے لیے ہر طرح ہاتھ پاؤں مارتا اور بڑی مصیبتیں جھیل رہا تھا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ یہ زمانہ اسپینی آرمیڈا کے انگلستان پر حملہ آور ہونے سے چند سال پہلے اور اس کے تباہ ہونے کے بعد کا ہے۔ شیکسپیر ان تمام مصیبتوں کو ہنسی خوشی سے برداشت کرتا رہا اور جوش و خوش دلی کے ساتھ عہد الزبتھ کے لندن کی زندگی میں حصہ لیتا رہا۔ اس زمانے میں شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر تعطیل کے دن شاندار جلوس اور تماشے نظر آتے تھے تعطیل کے سوا کام کے دنوں میں بھی وہاں ایسی چہل پہل اور زندگی نظر آتی تھی جو ایک شاعر کو مسرور کرنے کے لیے کافی تھی۔ سنٹ پال گرجا کے صحن میں کتابوں کی دکانیں تھیں۔ ان میں "سیکڑوں قسم کی انگریزی کتابیں اور مطبوعہ رسالوں کے بے شمار گٹھے" رہتے تھے غریب سے غریب اداکار بھی ایک آدھ پنس پس انداز کرکے یہاں نئے فیشن کے "ناول" یا کسی اچھے کلاسک کا ترجمہ خرید سکتا تھا۔ غالباً انہیں کتاب فروشوں میں سے کسی کے پاس سے شیکسپیر نے

ہالن شڈ کا کرانیکل اور پلوٹارک کی کتاب مشاہیر یونان و روما کا ایک ایک نسخہ خریدا تھا۔ ان کتابوں کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ یقیناً شیکسپیر کے مطالعے میں رہی ہونگیں۔ تھیٹر کے مجمعوں میں بھی اس نے بہت سی ایسی باتیں دیکھی ہوں گی جو ڈراموں کی تصنیف میں بڑی کارآمد ثابت ہوئی ہیں۔ ان مجمعوں میں سماج کے ہر طبقے کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ ان میں پرشکوہ اہل دربار سے لے کر جو خود اسٹیج پر بیٹھتے تھے، ادنا گرہ کٹ تک شامل ہوتے تھے۔ یہ گرہ کٹ غریب اور مفلس شہریوں کے مجمع میں اپنا کاروبار جاری رکھتے تھے۔ عام لوگوں کا مجمع ایک دوسرے کو ڈھکیلتا، ریلتا پیلتا تھیٹر کے وسط میں ایک بڑی جگہ میں کھڑا رہتا تھا۔ یہ مقام گڑھا یا "پٹ" کہلاتا تھا۔ اس کے اوپر چھت ہوتی تھی اور نہ اس میں بیٹھنے کے لیے نشستیں شیکسپیر کے دوستوں میں زیادہ تر اس کے ہم پیشہ اداکار تھے ان میں سے اکثر کے ساتھ اس نے عمر بھر دوستی نباہی۔

شیکسپیر اور "عقلائے جامعہ" میں کس قسم کے تعلقات تھے اس کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انکی پاکباز زندگی میں شامل تو نہیں ہوا۔ البتہ ان سے شہر لندن کے ہوٹلوں اور تھیٹروں میں ملتا ضرور تھا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ مارلو کا دل سے مداح تھا اور اس نے اپنے ابتدائی ڈراموں میں اپنے اس بڑے پیش رو کی نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مارلو کو وہ فن ڈراما میں اپنا استاد مانتا تھا۔ مارلو اور شیکسپیر لندن میں کوئی سات سال تک رہے لیکن اس بات کی ہمارے پاس کوئی ایسی بدیہی شہادت موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہوسکے کہ یہ دونوں شاعر ایک دوسرے سے مل بھی سکے یا نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ رابرٹ گرین شیکسپیر سے بے انتہا حسد رکھتا تھا "گراٹس ورتھ آف وٹ" میں گرین کہتا ہے "یہاں ایک نو دولت کوا آیا ہوا ہے۔ یہ ہمارے پروں سے آراستہ ہے، اپنا شیر کا سا دل کھلاڑیوں کے بھیس میں رکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے قافیہ نظم لکھنے میں اتنی ہی مہارت رکھتا ہے جتنی کہ آپ

خود اپنے وطن میں مجہول الاسم ہونے کے باوجود اس ملک میں اپنے آپ کو ایک ہی "شیک سین" سمجھتا ہے"۔

گرین کا یہ جملہ کئی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ اول تو یہ کہ اس میں شیکسپیر کا حوالہ ملتا ہے۔ اور اسی سے ثابت ہوا ہے کہ اس نے ۱۵۹۲ء تک نہ صرف ایک اداکار بلکہ ایک ڈرامہ نویس کی حیثیت سے بھی تھوڑی بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔ "شیر کا سا دل کھلاڑیوں کے بھیس میں" یہ الفاظ ہنری چہارم کے تیسرے حصے سے لیے گئے ہیں اور ان کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈرامہ ۱۵۹۲ء سے پہلے لکھا جا چکا تھا دوسرے یہ الزام کہ شیکسپیر نے گرین اور اس کے دوستوں کے کام سے خود فائدہ اٹھایا، اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ شیکسپیر نے ایک معمولی ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ابتدا کی یعنی وہ قدیم ڈراموں کو صرف جلا دے کر چمکا دیا کرتا تھا۔ اُن دنوں ڈرامے بالکلیہ تھیٹر کے منیجروں کے ہاتھ فروخت کر دیے جاتے تھے جیسی ضرورت پیش آتی، تھیٹر کے عملے کو ڈرامے میں فک و اضافہ کرنے یا اسے صاف کرنے کے کام پر لگایا جاتا تھا کہ وہ پبلک کے بدلتے ہوئے مذاق کا آسانی سے ساتھ دے سکے۔ اسی طرح غالباً شیکسپیر کو بھی ہنری چہارم نامی ڈرامے سے متعلق ایسا ہی کام سپرد کیا گیا تھا۔ ڈرامے کے اصلی مصنف کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ غالباً یہ اس قسم کے کئی قصوں میں سے ایک تھا جو گلتے اور قومی جذبات کو ابھارنے کے لیے لکھے گئے تھے حب وطن کے یہ جذبات اسپین پر انگلستان کی زبردست فتح کے بعد لوگوں کے دلوں میں بہت زیادہ جوش مار رہے تھے ضرورت مند ڈرامہ نویس قدیم تاریخی کتابوں کو اٹھا لیتے تھے اور بعض ڈرامائی واقعات کو لے کر جلدی سے انہیں بھدے ڈراموں میں تبدیل کر دیتے تھے۔ یہی ڈرامے تماشائیوں کی طلب کو پورا کر دیتے تھے۔ اور اس طرح تھیٹر معمور رہتے تھے یہ کچھ بعید از قیاس نہیں کہ گرین، مارلو اور غالباً پیل قدیم ڈرامے تیار کرتے تھے اور ان پر بعد میں شیکسپیر نے نظر ثانی کی تھی۔

ہنری چہارم کا بڑے جوش وخروش کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ اس کے متعلق نیاش لکھتا ہے "یہ خیال کر کے ٹال باٹ (اہل فرانس کو سہما دینے والا) کو کتنی خوشی ہوئی ہوگی کہ قبر میں لٹا دیے جانے کے دو سو برس بعد پھر ایک بار اسٹیج پر وہ فتح حاصل کرے گا اس کی ہڈیوں پر دس ہزار ناظر (مختلف اوقات میں) آنسو بہا کر انہیں مقدس بنائیں گے۔ اور حزینہ اداکار کی شخصیت میں اس کو اپنا خون بہاتا دیکھیں گے"۔

اس کے فوراً بعد ہی دوسرا ڈراما "یارک اور لنکاسٹر کے مشہور خاندانوں کی کشمکش کا پہلا حصہ" پیش کیا گیا۔ پھر ۱۵۹۳ء میں "بادشاہ رچرڈ کا سچا حزینہ" کے نام سے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا گیا۔ ان تینوں ڈراموں پر شیکسپیر نے بعد میں پوری طرح نظر ثانی کی۔ جس حالت میں یہ ڈرامے ہمارے سامنے موجود ہیں، ان کا کتنا حصہ شیکسپیر کا لکھا ہوا ہے، اس کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔ ناقدوں کا خیال ہے کہ ہنری چہارم میں اس کا بہت ہی تھوڑا حصہ ہے۔ دوسرے میں اس کا حصہ غالب ہے۔ اور تیسرا آدھے کے قریب اسی کا لکھا ہوا ہے۔ شیکسپیر کی وفات کے بعد یہ تینوں ڈرامے ہنری چہارم حصہ اول، حصہ دوم اور حصہ سوم کے نام سے شایع ہوئے۔

اس کا بھی بہت قوی امکان ہے کہ نظر ثانی کے کام میں اور بھی ڈرامہ نویس شیکسپیر کا ہاتھ بٹاتے ہونگے۔ ناقدوں کا خیال ہے کہ یہ کام کرسٹافر مارلو انجام دیتا تھا۔ غالباً نظر ثانی کا کام ختم ہونے سے پیشتر ہی مارلو نے پہلی جون ۱۵۹۳ء کو وفات پائی۔ لیکن پہلے دو ڈراموں میں بعض حصے بالکلیہ اسی کے رنگ میں لکھے ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسی کے قلم سے نہیں ہیں۔

اس طرح تاریخی ڈراموں کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ یہ سلسلہ رچرڈ سوم، رچرڈ دوم، کنگ جان، ہنری چہارم، تک جاری رہا اور یہ سب غالباً ۱۵۹۹ء سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ (باقی)

مبارز الدین رفعت بی۔ اے (عثمانیہ)

غزل

اے شمع روتبا ترے دیوانے کیا ہوے
آتا تھا جن کو جلنا وہ پروانے کیا ہوے

ساقی کی کم نگاہیاں بے کیف کر گئیں
شیشے بھی دم بخود ہیں کہ پیمانے کیا ہوے

حسرت نصیب وہ ہیں کہ روز وصال بھی
ارمان عمر بھر کے خدا جانے کیا ہوے

بھولے ہیں ہم تو اپنی حقیقت تو ہی بتا
اے گنج معرفت تیرے افسانے کیا ہوے

تھا وجہ زیست جن کو تصور ترا شمیم
وہ طالبان دید وہ دیوانے کیا ہوے

شمیم (فاضل ادب) جالندھری

غزل

وہ حسن شہابی وہ روے کتابی
صبوحی، صبوحی، گلابی، گلابی

دلوں کو الٹ دیگی یہہ بے نقابی
ادائیں بلا کی، نظر انقلابی

بنا دینگے دونوں جہاں کو شرابی
یہہ آنکھوں کے ڈورے گلابی گلابی

انھیں میری نظریں، جھکیں انکی آنکھیں
یونہی لڑ رہی ہے کسی سے جوابی

مرا ذوق رنگیں، ترا حسن زریں
ادھر یہہ شرابی، ادھر وہ شرابی

قیامت سے پہلے، قیامت کا عنواں
مری بے زبانی، تیری بے نقابی

خدارا! خدارا! کہاں تک کہاں تک
یہہ دارائی حسن و افراسیابی

تغافل کو شہ دیتی جاتی ہے فرحت
مری بے خطابی، مری لاجوابی

فرحت (کانپوری)

غزل

میرے خوابوں کی دنیا میں کوئی پھر نیم خواب آیا
مجھے عہد جوانی میں پیام اضطراب آیا

قرار زیست ہے اب اور نہ لطف زندگانی ہے
میری ہستی کا یعنی پھر گہن میں آفتاب آیا

مجھے طعنہ تو دیتے ہو کہ تم ناکام الفت ہو
کوئی کیا امتحان عشق میں بھی کامیاب آیا

جہاں مفہوم ہستی بھی دماغوں میں نہیں آتا
محبت کے فسانے میں اب ایسا ایک باب آیا

نگاہ لطف جب تک تھی میری دنیا میں سب کچھ تھا
تیری نظریں پھریں کیا! مجھ پہ دور انقلاب آیا

کہاں اب ہے وہ رہوار و فور شوق کی تیزی
تمنا اب ہوئی رخصت سکوں پا در رکاب آیا

مصور کیا گلہ کیجیے پھر ان کی سرد مہری کا
وہی ہے کامران عشق جو زیر عتاب آیا

مصور قریشی (جموں)

مصور کا جنون

(مسلسل)

دوسرا پردہ

منظر (۱)

(قیوم کمرے میں کرسی پر دراز ہے۔ گھنٹی کی آواز آتی ہے)

قیوم تشریف لایئے

نرس (داخل ہوتی ہے) کیا میں آسکتی ہوں (قیوم اٹھتا ہے)

قیوم خوشی سے (دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

نرس کہیے اب تو اصل معاملے پر گفتگو ہو گی نا؟

قیوم یہ آپ کیا فرما رہی ہیں۔ آپ بیمار کی تیمارداری کے لیے آئی ہیں یا میری مزاج پرسی کے لیے

نرس کیا آپ نے کوئی مذاق کیا تھا۔ میں اپنے اس خط کا جواب چاہتی ہوں جو آپکے اعلان کے سلسلے لکھا گیا تھا اور ساتھ ہی ایک تصویر بھی بھجوائی تھی۔

قیوم آہا آپ ہی نے بھجوائی تھی۔

نرس پھر کس نے

قیوم مگر کس لیے؟

نرس ایں۔ یہہ کیا معنی۔ کس لیے کیا بات۔ کیا آپنے "استقلال" روزنامے میں شادی کے لیے اعلان نہیں دیا تھا

قیوم اوہو۔ وہ خط۔ ہاں یاد آگیا۔ میں بھول گیا تھا لیکن تصویر سے تو آپ کا چہرہ نہیں ملتا۔

نرس کیا کہا۔ نہیں ملتا۔ کہاں ہے وہ تصویر۔ لاو مجھے دکھاو (قیوم پریشان ہوتا ہے) لایئے۔

قیوم (جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چند کاغذات نکال کر دیکھتا ہے) مجھے یاد نہیں کہ کدھر رکھدیا ہوں۔

نرس دیکھو تلاش کر کے جلد لاو (قیوم پریشانی کے ساتھ دیوار کی طرف جاکر اعتمام کے کوٹ کے جیب تلاش کرتا ہے۔ اس میں سے چند کاغذات نکالتا ہے خط بھی اس کے ہاتھ آتا ہے خط لے کر آتا ہے۔ نرس خط اپنے ہاتھ میں لیتی ہے) ہاں یہی تو وہ خط ہے۔ (خط کو دبا کر) یہ کیا اس میں تصویر بھی موجود ہے آپ بھی بڑے باکمال آدمی ہیں ایسے اہم خطوط بھی کیا جیب میں پڑے رہتے ہیں۔

قیوم جی نہیں۔ صندوق میں رکھنا بھول گیا تھا۔ آپ جانتی ہیں کہ آجکل میں بہت پریشان ہوں۔ (ہاتھ بڑھا کر خط لیتا ہے)

نرس ہاں میں سمجھ گئی یہی سبب ہوگا۔ خط تو غالباً آپ نے پڑھ ہی لیا ہوگا۔

قیوم کیوں نہیں (خط کھولتے ہوے) اسیوقت (خط دیکھکر) یہہ کیا آپ نے ہی تو لکھا ہے (خط پڑھتا ہے) "جناب عالی! آپ کے اعلان کے جواب میں حسب ذیل تحریر روانہ کرتی ہوں۔

"میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ میرے شوہر کو مرے کچھ ہی عرصہ ہوا۔ میرے کوئی اولاد وغیرہ نہیں ہے۔ اس وقت میری عمر صرف ۲۰ سال کی ہے مگر ــــ"

نرس عمر کا اگر کسی کو شبہہ ہو تو میں بعض بوڑھوں سے اپنے سنہ پیدائش کا ثبوت دے سکتی ہوں

قیوم جی نہیں اس کی کیا ضرورت آپکی صورت خود سوال ہے (خط پڑھتا ہے) "مگر کثرت کار اور آے دن کی مختلف پریشانیوں کے باعث میں اپنی حقیقی عمر سے کچھ زیادہ دکھائی دیتی ہوں۔ آپ اس کا مطلق خیال نہ کریں"۔ (تصویر نکال کر دیکھتا ہے) تصویر تو بڑی اچھی ہے۔

نرس یہہ میری ہی تصویر ہے

قیوم (تصویر اور پھر چہرے پر ایک نظر ڈال کر) ہوگی۔

نرس ہو گی کیا معنی۔ میں کہہ رہی ہوں کہ میری ہے۔

قیوم — جی ہاں ٹھیک ہے۔

نرس — آپ نے خط کا نوٹ نہیں پڑھا۔

قیوم — جی معاف فرمایئے بھول گیا۔ کیا کوئی خاص بات ہے

نرس — تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلے بھی نہیں پڑھا تھا

قیوم — ایں یہہ کیسے ہو سکتا۔ ابھی پڑھ دیتا ہوں (خط کھولکر)
"نوٹ۔ مخفی نہ رہے کہ میں بالکل تنہا ہوں۔ چاہتی ہوں
کہ کسی شریف انسان کو اپنا شریک زندگی بناوں۔
اور میرا ایک ذاتی مکان ہے جس کا کرایہ ماہانہ سترہ روپیے
بارہ آنے آتا ہے۔ اور میری تنخواہ ۳۵ روپیے آٹھ
آنے ہے اس طرح میری جملہ ماہوار آمدنی ۵۲ روپیے
۴ ماہوار ہے"۔ آمدنی تو کافی ہے۔

نرس — مگر آپ نے جواب کیوں نہیں دیا میں عرصے سے
انتظار کر رہی تھی۔ شاید اور بھی خطوط آئے ہوں گے

قیوم — جی ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اسی لیے دیر ہو گئی۔

نرس — میرے خط کے ساتھ وہ دوسرا کاغذ کیا ہے۔

قیوم — (کاغذ دیکھکر) کچھ ہے ٹائپ کیا ہوا۔

نرس — شاید آپ نے اس کا جواب لکھا تھا۔ مگر ڈاک میں ڈالنے
کا موقع نہیں ملا۔

قیوم — ہاں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب یاد آگیا۔ جی ہاں
ایسا ہی ہے۔

نرس — ایسے خطوط بھلا ٹائپ کروائے جاتے ہیں۔ ہاتھ سے
لکھنا چاہیے تھا۔

قیوم — کہہ تو دیا کہ فرصت مطلق نہیں تھی۔

نرس — کیوں ہو گی۔ ایک مشہور آدمی کے معتمد خاص ہونا

قیوم — (آہستہ سے) معتمد خاص — ہ

نرس — جی ہاں! ذرا سنا تو دیجیے آخر آپ نے جواب کیا لکھا
تھا۔

قیوم — (دوسرا کاغذ پڑھتا ہے) "مائی ڈیر مس میریم۔ آپ کے
خط کا بیحد شکریہ۔ دوسرے اور بھی خطوط آئے ہیں مگر
مجھے آپ ہی پسند ہیں (نرس مسکراتی ہے) میں عبدالقیوم
صاحب مشہور مصور کا معتمد خاص اور ایک پر خلوص
دوست ہوں۔ آخر میں میں یہ کہے بغیر نہ رہوں گا کہ
مجھے آپ ہی کے جیسے ساتھی کی ضرورت تھی امید ہے
کہ آپکو میرے حالات سے تشفی ہو گی۔

نرس — ہاں مجھے کامل تشفی ہے۔ آپ تو شاید ابتک ان بیاہے
ہی ہیں۔

قیوم — جی ہاں

نرس — آپ کی عمر

قیوم — آپ سے بیس سال زیادہ

نرس — یعنی؟ ۴۰ سال۔ خیر کچھ زیادہ نہیں

قیوم — آپ تو بڑی ہی کم عمر معلوم ہوتی ہیں۔

نرس — (پریشانی سے) کیوں کیا آپکو اس میں شبہہ ہے

قیوم — ہرگز نہیں۔ میں تو آپ کی تعریف کر رہا ہوں

نرس — پھر تو آپ کا ہمارا بہتر جوڑا ہے۔ بھلا یہ تو بتایے کہ
اب آپکے آقا کا مزاج کیسا ہے

قیوم — حالت خطرناک ہے۔

نرس — افسوس

قیوم — مگر آپ تو ان کی دیکھ بھال کے لیے بھیجی گئی ہیں۔

نرس — ان سے زیادہ مجھے آپ کا خیال ہے آپکی حالت کب
اچھی ہے۔ خیر چلیے وہیں بیٹھ کر باتیں کریں

قیوم — بہت خوب (دونوں اندر جاتے ہیں)

منظر ۲

(قیوم کا سابقہ کمرہ۔ قیوم پیچھے ہاتھ باندھے پریشان حالی میں ٹہل
رہا ہے۔ مددگار رہنڈ بیگ لیے داخل ہوتا ہے)

قیوم — آداب عرض ہے چھوٹے ڈاکٹر صاحب

مددگار — آداب ہاں یہہ تو بتاو کہ بھئی مریض پر سے رات کیسی گذری

قیوم — بہت آرام سے

مددگار — ہاں کوئی خوف کی بات تو تھی نہیں۔ مرض بالکل معمولی ہے

قیوم اجی واہ جناب۔ کل تو آپ فرما رہے تھے کہ بڑا خطرناک مرض ہے اور اب ......

مددگار (چڑچڑے پن کے ساتھ) ارے تو کیا مرض میں کبھی کمی نہیں ہو سکتی۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔

قیوم بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپکی زبان سے یہ الفاظ نکلے ورنہ میں تو نا امید ہی ہو گیا تھا

مددگار نہیں کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرض کمزور پڑگیا ہے۔

قیوم تو آپکی نظر میں مرض بلکل معمولی ہے۔

مددگار بلکل معمولی۔

قیوم تعجب۔ خیر یونہی سہی۔ اچھا چل کر ذرا مریض کو دیکھ تو لیجیے۔

مددگار چلو (دونوں آہستہ سے اندر کے کمرے میں جاتے ہیں۔ مددگار مردے کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر) غالباً مریض ابتک آرام کر رہا ہے۔

قیوم اور شاید ہمیشہ کے لئے آرام کرتا رہیگا۔

مددگار اس سے تمہارا مطلب؟ (اضطراب کا ہاتھ لیکر نبض دیکھتا ہے۔ کچھ پریشانی کا اظہار کرتا ہے۔ قیوم کی طرف دیکھتا ہے۔ قیوم انجانی کا اظہار کرتا ہے۔ ڈاکٹر دوسرے ہاتھ کی نبض دیکھتا ہے اور پریشانی بڑھتی ہے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھتا ہے۔ پھر جلدی سے آلہ لگا کر دل کی حرکت سنتا ہے۔ اس کے بعد ناک کو ہاتھ لگا کر دیکھتا ہے۔ آخر میں جسم کی گرمی دیکھتا ہے۔ اس کے بعد پریشانی سے ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے سر کھجاتا ہے۔) یہہ کیا ماجرا ہے؟

قیوم (اطمینان سے) جو آپ دیکھ رہے ہیں چھوٹے ڈاکٹر صاحب

مددگار تم کیا کہہ رہے تھے۔

قیوم میں اپنی زبان سے آپکو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔

مددگار آخر یہ واقعہ کب پیش آیا۔

قیوم (جیب سے گھڑی نکال کر) میری گھڑی اسیوقت رکی تھی دیکھیے صبح چار بجے

مددگار حالت خراب تھی تو اطلاع کیوں نہیں کی۔

قیوم مریض کو کس کے حوالے چھوڑ آتا۔

مددگار عجیب آدمی ہو (گھنٹی کی آواز آتی ہے قیوم جا کر دروازہ کھولتا ہے۔ رحیم بخش داخل ہوتا ہے) آہا مسٹر رحیم بخش آپ ہیں آیئے تشریف لایئے۔ (نعش کی طرف بتا کر) آپکے بھائی ......

رحیم بخش کیوں اب کیا حال ہے۔

مددگار (ٹھنڈا سانس بھرتے ہوے) افسوس... کس کو معلوم تھا کہ مزاج اس قدر جلد خراب ہو جائیگا۔ نگرانی تو بڑی حد تک کیگئی۔ مگر صد افسوس وہ جاں بحق ہو گئے۔

رحیم بخش کیا کہا مر گئے۔

مددگار جی ہاں۔ (قیوم کو بتا کر) یہہ مرحوم کے وفادار ملازم ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ ہم نے کیا کچھ کوشش نہیں کی۔

رحیم بخش (قیوم سے) بڑے افسوس کا مقام ہے۔ اطلاع کرنا تمہارا فرض تھا۔ (مددگار سے) افسوس زندگی بھر بھائی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اب

مددگار کیا آپ ان سے کبھی نہیں ملے تھے

رحیم بخش بچپن میں انکی صورت دیکھی تھی۔ کچھ موہوم سا خیال ہے سنتے ہیں کہ بڑے ہی خشک آدمی تھے۔

مددگار واقعی لوگ ان سے ملنے کیلئے ترستے تھے۔ حالت بلکل رہگئی تھی رنگ تک بدل گیا تھا افسوس بڑا اچھا آدمی تھا۔

رحیم بخش (قیوم سے) شاید تم مجھے نہیں جانتے۔ میں مرحوم کا چچیرا بھائی رحیم بخش ہراجی اور ان کا واحد وارث ہوں۔ بہت ممکن ہے مرحوم نے کبھی میرا نام تک بھی نہ لیا ہو۔

قیوم ہاں میں جانتا ہوں تم تب چھوٹے تھے......

رحیم بخش (غصے سے) ایں کیا کہا تم نے

قیوم (جلدی سے) جی نہیں آپ جب آٹھ دس برس کے تھے
تو اپنے بھائی کے ساتھ خوب کشتی لڑتے تھے۔

رحیم بخش (تیوری چڑھا کر) دیکھو جی تمہارا نام کیا ہے

قیوم جی جی جی

مددگار احتشام

رحیم بخش احتشام

قیوم جی جی جی...

رحیم بخش سنو! تم ایک ادنا ملازم ہو تمکو ایسی گفتگو نہیں کرنی چاہیے
سمجھ گئے نا؟

قیوم جی ہاں۔ مگر میں نے تو ایک صحیح واقعہ بیان کیا ہے۔

رحیم بخش خاموش پھر وہی ٹرٹر تم کیا جانو

قیوم میں سچ کہہ رہا ہوں اس لیے کہ —

رحیم بخش خاموش فضول آدمی تم نے مجھے ان کی علالت کی اطلاع
کیوں نہیں دی۔

قیوم جی جی۔ جی

مددگار بھئی تعجب ہے۔ آخر آپکو یہ اطلاع کیسے ملی۔

رحیم بخش اجی جناب یہ (ہاتھ میں کا اخبار بتاتے ہوے)
دیکھیے کسی کے اطلاع دینے یا نہ دینے سے کیا ہو سکتا ہے
اس اخبار میں مرحوم کی علالت کی پوری تفصیل درج ہے
(قیوم کیطرف دیکھ کر) مجھے اطلاع دینا تو ممکن نہو سکا
مگر اخبار والوں سے پوری پوری کیفیت بیان کر دی

قیوم (پریشان ہوکر) اخبار کو کس نے اطلاع دی۔

رحیم بخش (خفگی کے ساتھ) ہوں یہ لاعلمی

مددگار ممکن ہے۔ مرحوم صاحب نے اپنے بھائی سے کہدیا ہو
اخبار کا نمایندہ ہے۔ اب چونکہ اصل وارث آگیا ہے
بہتر ہی ہے کہ میں چلا جاوں۔

قیوم تو کیا واقعی چلے؟

مددگار ہاں مگر سنو مرحوم کے وارث کے ساتھ اپنے مہربان و

محسن آقا کے ایک وفا شعار خادم کی حیثیت سے ممکنہ طور پر
بہتر سے بہتر سلوک کرنا (قیوم مونھ سے چڑاتا اور منھ
بناتا ہے)

قیوم (ہاتھ ملتے ہوے) عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں
(رحیم بخش واپس آتا ہے)

رحیم بخش کیا کہا

قیوم یہی کہ آپ نے اپنے چچیرے بھائی کو پہچان لیا۔

رحیم بخش نہ بھی پہچانوں تو کیا ہوا۔ قیوم مشہور مصور میرا نہیں تو
اور کس کا بھائی ہو سکتا ہے۔

قیوم اور آپ وہی ننھے سے رحیم بخش ہیں جو آج سے کئی
سال پہلے الطاف میاں کے ساتھ دھول دھپا کرتے تھے

رحیم بخش (غصے سے دیکھ کر) سنو۔ اب تمہارا تصفیہ ہو جانا
چاہیے۔ اچھا یہ تو بتاو کہ تم جیسے نالایق ملازم کو
مرا بھائی کیا تنخواہ دیتا تھا۔

قیوم (پریشان ہوکر) تنخواہ

رحیم بخش (ڈانٹ کر) ہاں ہاں۔ میں دریافت کر رہا ہوں کہ
کیا تنخواہ؟ کہو جلد بتاو۔

قیوم (کچھ سونچکر) جی

رحیم بخش کیا گذشتہ مہینے کی تنخواہ ملی تھی۔

قیوم (جھجکتے ہوئے) جی۔ جی۔ جی نہیں

رحیم بخش (جیب میں سے نوٹ نکال کر) یہ لو تمہاری تنخواہ
اور اب اپنا راستہ لو۔ میں تم جیسے نامعقول اور
بدتمیز انسان کو رکھنا نہیں چاہتا۔

قیوم جی جی۔ میں — اور بدتمیز —

رحیم بخش (بلند آواز سے) خاموش [illegible] ایک لفظ بھی سننا
نہیں چاہتا۔ تم فوراً یہاں سے چلے جاو۔

قیوم ذرا آپ سن تو —

رحیم بخش (تیزی سے اور ڈانٹ کر) [illegible] رہا ہوں کہ ایک
حرف بھی سننا نہیں چاہتا۔

رحیم بخش (تیزی سے اور ڈانٹ کر) بار بار کہہ رہا ہوں کہ ایک
حرف بھی سننا نہیں چاہتا یہاں سے فوراً نکل جاؤ
سمجھ میں آیا

قیوم آپ ذرا —

رحیم بخش (غصہ سے) خبردار! دوبارہ زبان نہ ہلانا (نوٹ
گنتے ہوئے) یہ لیتے ہو یا نہیں مجھے تم جیسے
ملازموں کی مطلق ضرورت نہیں۔ طبیعت چاہے
تو یہ رقم ابھی لے لو ورنہ بعد میں ایک پائی بھی نہیں
ملے گی۔

قیوم آپ کچھ سن تو —

رحیم بخش (جلدی سے ڈانٹ کر) انسان ہو یا پاجامہ۔ پاگل
کہیں کا۔ کہہ رہا ہوں کہ ایک لفظ بھی سننا نہیں
چاہتا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے آقا کے خانگی کاغذات
وغیرہ کہاں ہیں اور وہ رقم کس بنک میں رکھتے
تھے۔

قیوم بنک وغیرہ میں نہیں

رحیم بخش تو پھر کہاں

قیوم اپنے ہی ساتھ

رحیم بخش کیا صندوق میں بھی

قیوم جی ہاں

رحیم بخش (کمرے میں سامان کی طرف دیکھ کر) یہ سب سامان تو
کس کا ہے۔

قیوم میرا ہی ہے۔

رحیم بخش اتنا زیادہ اور اچھا سامان تمہارا کیسے ہو سکتا ہے

قیوم میں جبھی تو کہہ رہا ہوں کہ کچھ سن لیجئے یعنی —

رحیم بخش (جلدی) پاگل پن کی حرکت نہ کرو۔ سچ سچ بتاؤ کہ
یہ سب سامان تیرا ہے یا دھوکا دینا چاہتا ہے۔

قیوم (جھنجھلا کر) دھوکا کیا یعنی۔ یہ سب اسی کمرے
(رحیم بخش ایک شیشہ کا چینی ... اٹھا کر دیکھتا ہے)

دیکھو اس صندوق میں پلیٹ اور برتن ہیں۔ اگر ٹوٹ گئے تو۔

رحیم بخش ٹوٹ گئے تو مجھے کیا (ایک بند صندوق کو دھکیلنا
چاہتا ہے)

قیوم خبردار اس میں کانچ کا ایک خوبصورت مجسمہ ہے

رحیم بخش کیا یہ بھی تیرا ہی ہے۔

قیوم جناب آپ زبان سنبھال کر گفتگو کیجیے۔ آپکی بلا سے
میرا ہے یا اس کا۔ آپ کون بولنے والے

رحیم بخش (قہقہے لگا کر) ہاں میں کون۔ یہ بھی خوب۔ میں نہیں
تو شاید ایک ادنا ملازم مرحوم کا وارث ہوگا۔
خبردار ایسی لغو باتیں دوسری مرتبہ نہ کہنا۔

قیوم ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

رحیم بخش (غصے سے) نہیں ہو سکتا (ہاتھ میں کی لکڑی سے بتاتے
ہوئے) اس سے جب خبر لوں گا تو تیری سمجھ میں آئیگا
اور (ٹھوکر سے سامان کی طرف بتا کر) اور اس ٹھوکر
سے تیرے سامان کو دروازے سے باہر کر دونگا۔

قیوم (پریشانی سے) میں کچھ کہنا چاہتا —

رحیم بخش چپ۔ بدمعاش کہیں کا۔ میں ایک لفظ نہیں سننا
چاہتا۔ میں جو کچھ دریافت کر رہا ہوں ٹھیک۔
ٹھیک اس کا جواب دینا ورنہ اس سے دماغ ٹھکانے
لگا دونگا۔

قیوم بہت خوب

رحیم بخش کاغذات کس صندوق میں ہیں۔

قیوم (ہینڈ بیگ کو بتا کر) اس میں

رحیم بخش کنجی کہاں ہے

قیوم (جھجکتے ہوئے جیب سے کنجیوں کا جھیلا نکال کر) یہ لیجیے

رحیم بخش (حقارت سے) اہا (کنجیاں لیتے ہوئے) بڑا خناس
ہے۔ کنجیوں کا بھی مالک بن بیٹھا ہے۔ جب اس قدر
دخل تھا تو اور کیا نہیں کیا ہوگا۔ تیری حیثیت تو بس کچھ
اور یہ کپڑے پہنا۔ خوب (رحیم بخش ... صندوق کھولتا

ہے ۔ قیوم کرسی پر بیٹھکر ہنستا ہے) بدتمیز میں نیچے اور تو اوپر بیٹھا ہے (قیوم اور ہنستا ہے ۔ رحیم بخش اور غصے سے) بیوقوف ہنستا کیوں ہے ۔

قیوم (ہنستے ہوئے) جی ہنس نہیں رہا ہوں ۔

رحیم بخش (خفگی سے) بالکل جھوٹ بھی بولتا ہے ۔

قیوم جی نہیں ۔ بلکہ مسکرا رہا ہوں (کرسی سے اٹھکر صندوق کی طرف دیکھتا ہے) اس میں کیا خاک دھرا ہے
ع چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط ۔

رحیم بخش (تعجب سے) اوہو ۔ لارڈ صاحب شاعری بھی کرتے ہیں ۔ (کچھ کاغذات الٹکر) خیر غنیمت ہے کہ تو نے میرے لیے کچھ رقم بھی چھوڑی ہے ۔

قیوم (جلدی سے) خبردار ! وہ بارہ ہزار کے نوٹ ہیں اور اس کے بازو دس ہزار کے پرامسری بھی ہیں یہ سب میری ہی ملک ہے ۔ تم کو ہاتھ لگانے کا کوئی حق نہیں ۔

رحیم بخش (زور سے قہقہے لگاکر) تیرے ۔ خوب ۔ ہاں تیرے واہ واہ ۔ کیا خوب کہا ہے

قیوم ہاں ہاں ۔ میرے میرے اور میرے ہیں ۔

رحیم بخش خیر بھئی تیرے ہی سہی ۔ اچھا یہ تو بتا کہ بنک میں جو رقم جمع ہے اس کی پاس بک کہاں ہے (چند خطوط کے ایک بنڈل کو دیکھ کر ہاتھ میں لیتا ہے) یہ تو مراد علی کے بھیجے ہوئے خطوط ہیں ۔

قیوم ہاں انہوں نے میرے ہی نام بھیجے تھے ۔

رحیم بخش (پہلے قہقہہ لگاکر پھر منہ سے) بیوقوف کہیں کا ۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے نا ۔ شاید جنون کا بھوت تیرے سر سوار ہے ۔ اب تو یہ خطوط بیکار ہیں ۔ ان کو جلا دینا چاہیے ۔

قیوم نہیں نہیں یہ بڑے کام کے خط ہیں ان کو ہرگز نہیں جلانا چاہیے ۔

رحیم بخش پھر وہی دخل در معقولات ؟ (پھر کچھ کاغذات ادھر ادھر پھیلاتا ہے ۔ ایک کاغذ نکال کر) ادھو کیا یہ چیز ابتک موجود ہے ۔ خوب ۔ میں تو اسی کی تلاش میں تھا ۔ اوں ۔ کتنا عرصہ پہلے یہ وصیت نامہ لکھا گیا تھا ۔ اس کا علم مجھے اپنے [illegible] کے ذریعے ہوا تھا ۔

قیوم ہاں ٹھیک ہے ۔ اس کو لکھے بہت عرصہ گذر گیا ۔ تمہاری چچا جان کے انتقال کے بعد ہی یہ وصیت نامہ لکھدیا گیا تھا ۔ اور ایک خط کے ذریعے تم نے اس مکان کی ملکیت کا مطالبہ کیا تھا ۔ مگر تمہاری درخواست نامنظور ہوئی اور یہ مکان تصویروں کی نمائش کیلیے وقف کر دیا گیا ہے ۔ تمہارے بھی حق کا خیال رکھا گیا ہے ۔ یعنی صرف پانچ روپیے تمہارے ترکے میں لکھے گئے ہیں ۔

رحیم بخش خوب میں وارث نرینہ اور پانچ روپیے ۔ ہوں ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرا بھائی اس طرح لکھیگا ۔

قیوم ہاں بالکل صحیح ہے ۔

رحیم بخش کیا انہوں نے کبھی تجھ سے کہا تھا ۔

قیوم کہنا کیا معنی وصیت نامہ ہاتھ میں ہے دیکھ لو ۔

رحیم بخش بس ۔ بس خاموش بھی رہ ۔ میں کبھی اعتبار نہیں کر سکتا ۔ میرا بھائی بڑا نیک آدمی تھا ۔ اس نے نمائش گاہ کے لیے مکان جو وقف کر دیا ہے بہت اچھا کیا یہ چیز میرے اور میرے خاندان کے لیے فخر اور عزت کا باعث ہے ۔ میرے لیے بھیا کا دولت رکھ چھوڑی ہے ۔ کیا پرواہ ہے ۔

قیوم وہ کچھ عرصہ پہلے اس وصیت کو برباد کر دینا چاہتے تھے ۔

رحیم بخش تجھے کیسے معلوم ؟ کیا انہوں نے تجھ سے کہا تھا ۔ یا کوئی [illegible]

قیوم — جی نہیں

رحیم بخش — خیر جو کچھ بھی ہوا ٹھیک ہے (وصیت نامہ پڑھکر ٹھنڈے سانس لیتا ہے) ہوں تیرے لیے تو سالانہ آٹھ سو روپے کا حصہ ہے۔

قیوم — (سر ہلاتے ہوئے) نہیں میرے لیے نہیں بلکہ میں...

رحیم بخش — سن بھائی صاحب نے لکھا ہے (وصیت نامہ پڑھتا ہے) "میں اپنے ملازم احتشام الدین کے لیے جو کہ ایک پرلے درجہ کا بدمعاش شخص مگر لاثانی وفادار خادم ہے سالانہ آٹھ سو روپیے کی آمدنی کی جائیداد مخصوص کرتا ہوں مگر شرط یہہ ہے کہ وہ میرے آخر دم تک وفاشعاری کے ساتھ خدمت انجام دیتا رہے"۔ (قیوم مسکراتا ہے) کیوں تو تو بڑے مزے میں ہے نا؟ اگر بدمعاش کا لفظ اس حصے کے لینے سے تجھے روک رہا ہے تو صاف صاف انکار کردے۔

قیوم — انکار (سوچتا ہے)

رحیم بخش — (گھڑی دیکھ کر) اچھا تو ذرا میں ڈاکٹر سے ملکر ابھی آتا ہوں۔ میرے آنے تک بستر وغیرہ باندھکر تیار رہنا (آگے بڑھکر پلٹتا ہے) کیا کہہ رہا ہوں سمجھ گیا نا۔ تیرے جانے سے پہلے میں سب سامان کو دیکھ لوں گا۔ (جھک کر ہینڈ بیگ بند کر کے کنجیاں جیب میں ڈال لیتا اور ہینڈ بیگ کو ہاتھ میں لے کر سیدھا کھڑا ہوتا ہے)

قیوم — کیا آپ میرا سامان واقعی دیکھیں گے۔

رحیم بخش — یقیناً۔ ہاں اندر کے کمرے کی کنجی دیدے (قیوم کنجی دیتا ہے۔ رحیم بخش کنجی لے کر کمرے کو قفل کر دیتا ہے اسکے بعد باہر کی طرف جاتا ہے)

قیوم — میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

رحیم بخش — (پلٹ کر تیوری چڑھاتے ہوئے) پھر وہی گڑ گڑ لگایا ہے خبردار [illegible] دفعہ ایک حرف بھی نکالا تو —

قیوم — [illegible] کرکے (ذرا سنبھل کر) ...

(رحیم بخش تیزی سے چلا جاتا ہے۔ قیوم سر کو ہاتھ لگا کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ نرس داخل ہوتی ہے۔ قیوم اٹھکر آگے بڑھکر)

قیوم — (خندہ پیشانی سے) آیے تشریف لایے۔ (دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں) رحیم بخش نے میرا حساب چکا دیا ہے اور اب مجھے یہہ مکان چھوڑ دینا ہوگا۔

نرس — رحیم بخش کون

قیوم — وہی۔ مرحوم کا بھائی۔ اس نے آدھ گھنٹے میں گھر خالی کر دینے کیلئے کہا ہے۔

نرس — تو پھر کہاں جاؤ گے۔ چلیے غریب خانہ موجود ہے۔

قیوم — اب تو میں جہانگیر ہوٹل میں ٹھہروں گا ممکن ہو تو بعد میں آپ کے پاس آ جاؤنگا۔ آپ مجھ سے وہاں ملسکتی ہیں۔

نرس — بہت خوب

قیوم — اب وقت ہوگیا ہے۔ ممکن ہے رحیم بخش آ ہی رہا ہو مجھے اپنا سامان باندھ لینا چاہیے (بستر وغیرہ لپیٹتا ہے۔ نرس بھی سامان باندھنے میں مدد دیتی ہے۔ سامان باندھ کر بستر کندھے پر اور ہینڈ بیگ ساتھ لیکر جانیکے لیے تیار ہوتا ہے کہ اتنے میں رحیم بخش تیزی سے داخل ہوتا ہے)

رحیم بخش — (ایک نظر ڈالکر) ابتک نہیں باندھا (قیوم اس کو ڈر کر دیکھتا ہے۔ قیوم اور نرس باہر اور رحیم بخش اندر کے کمرے میں جاتا ہے) (باقی)

(عثمانیہ)

ہر قسم کی جائیداد کے لئے جس قسم کا معاملہ چاہو ہمارے توسط سے ممکن ہے تفصیلات کے لیے لکھیے یا ہمارے دفتر پر ایک مرتبہ زحمت فرمایئے۔

ایم۔ اے ذین، ایم۔ اے (عثمانیہ)، کمیشن ایجنٹ متعلم جاہی اسکٹ، حیدرآباد دکن

غزل

غرق تھا یوں جلووں میں حزیںؔ نظریں بھی اٹھانا بھول گیا
خود عین فسانا بن تو گیا عنوان فسانا بھول گیا

مانا وہ نگاہیں بجلی تھی مانا وہ تبسم شعلہ تھا
دل برق کی زد میں خود آیا یہہ بات نہ مانا بھول گیا

کچھہ رنگ شفق رخساروں پر کچھہ ننھے ستارے پلکوں میں
حسن اور یہہ عالم ہائے توبہ ہائیں اپنا فسانہ بھول گیا

ہونٹوں پہ تبسم کی موجیں نظروں میں تجلی کے طوفاں
اس طرح وہ آئے محفل میں میں نظریں جھکانا بھول گیا

خود حسن بھی جس کو سن نہ سکا وہ راز تھا راز ناکامی
دنیا کے فسانے کہہ ڈالے دل اپنا فسانہ بھول گیا

وہ برق گرانے والا بھی خود اس کی تلافی کر نہ سکا
دامن کی ہوائیں کیا کرتیں دل ہوش میں آنا بھول گیا

اس پھول سے نازک چہرے پر جب غم کی جھلک دیکھی نہ گئی
آخر کو حزیںؔ ہنسنا ہی پڑا ہائیں اشک بہانا بھول گیا

حزیںؔ بی اے (عثمانیہ)

انعامی اسکیم

ہم نے پہلے لکھا تھا کہ اگر سالگرہ نمبر کے مضامین وغیرہ سے متعلق کافی رائیں وصول ہوں تو ہم رایوں کے مطابق عمل کرینگے لیکن چونکہ رائیں کافی تعداد میں وصول نہیں ہوئی ہیں اس لیے ہم یہہ کام شاعروں اور ادیبوں کی ایک محکم کمیٹی کے تفویض کرتے ہیں۔ کمیٹی کے فیصلے کے بعد اعلان کیا جائیگا لہذا اس وقت تک کوئی استفسار نہ کیا جائے۔ منیجر

فانی اور کلام فانی

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانی
ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

حضرت شوکت علی خاں فانی موجودہ زمانے کے بلند پایہ شاعر اور باکمال شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کا کلام ہندستان کے گوشے گوشے میں زبانزد خاص و عام ہے۔ آپ سنہ ۱۸۷۹ء میں بدایون میں پیدا ہوئے اور وہیں کی باعظمت متبرک مردم خیز زمین میں پلے بڑھے۔ تیرہ برس تک وہ خاندانی طریقے سے ہندستانی فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بعدہٗ انگریزی کی طرف توجہ کی۔ اور بدایون سے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد بریلی کالج میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے داخل ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ کالج چھوڑنے کے بعد فانی تقریباً تین چار سال تک بیکار رہے البتہ سکون سے ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہ زمانہ فانی کا کچھ چین سے نہیں گذرا سنہ ۱۹۰۶ء تک وہ یونہی صرف شعر و شاعری میں وقت گزارتے رہے لیکن اسی سن میں ان کی توجہ قانون کی طرف ہوئی اور اسی وجہ سے ان کا رخ مسلمانوں کی واحد نمایندہ درسگاہ علی گڑھ کالج کی طرف ہوا۔ وہاں سے انہوں نے سنہ ۱۹۰۸ء میں ال۔ ال۔ بی کیا۔ اسکے بعد آپنے بدایون میں وکالت شروع کی۔ یہاں طبیعت نہ لگی لہذا انہوں نے اپنے وطن کے قرب و جوار کے اضلاع منتخب کر لیے۔ لکھنؤ۔ اناؤ وغیرہ اور آگرہ میں وکالت کی۔ لیکن شاعری کا شوق وکالت کی ترقی میں مانع رہا۔ وکالت کو خیرباد کہا اور بے یار و مددگار ہو کر حیدرآباد (دکن) کی ادب اور شعرا نواز سرزمیں میں پہنچے وہاں انکی ہمت افزائی کی گئی یہاں تک کہ وہاں وہ مستقل سکونت پذیر ہوگئے مگر تب بھی وطن کی یاد کو دل سے نہ بھلا سکے اکثر کہتے تھے۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

بہر حال انہوں نے جو بھی کہا تھا سچ تھا اور آج انتہائی رنج اور افسوس کے ساتھ یہ دلخراش الفاظ زبان سے نکالنے پڑ رہے ہیں کہ بتاریخ ۲۷ اگست سنہ ۱۹۴۱ء بدایون کی وہ مایہ ناز ہستی کہ جس پر نہ صرف بدایون بلکہ ہندستان کے جملہ ادبی خطوں کو ناز کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے جدا ہوگئی۔ آپ وطن سے دور حیدرآباد دکن میں ہی اس دنیا سے سدھارے اور مرحوم کی میت وہیں مسجد قطب شاہی کے احاطے میں سپرد خاک کیگئی اور بقول فانی فانی نے وہ دن بھی دیکھ لیا جبکی ان کو آرزو تھی اور زندگی نے ان کو مکمل طور پر پشیمان کر کے فانی سے غیر فانی کا مرتبہ بخشا۔ آپ کی آرزو تھی ؎

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے دنیا فانی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہوجائے

اب ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں ؎

ہجر نے کی مفارقت فانی
لے مبارک ہو موت کا آغوش

شعر و سخن سے دلچسپی تو فانی کو بچپن ہی سے تھی اور وہ ہندستان کے ان غزلگو شاعروں میں سے تھے جنھیں اس فن کو سیکھنے کے لیے اپنے ذوق طبع کے سوا کسی استاد کے آگے زانوے تلمذ طے کرنا نہیں پڑا بالفاظ دیگر وہ تلمیذ الرحمٰن تھے۔ چونکہ انہیں بچپن ہی سے شعر و شاعری سے قدرتی دلچسپی اور لگاؤ تھا لہذا ابیس برس کی عمر میں ان کا ایک پورا دیوان مرتب ہوگیا مگر شایع ہونیکی نوبت نہ آئی تھی کہ بدقسمتی سے ضایع ہوگیا۔ بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے شیکسپیر کے ایک مشہور ڈراما اور ملٹن کی مشہور نظم "کومس" کا ہندستانی میں ترجمہ بھی کیا اور علی گڑھ کالج میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان کا دوسرا دیوان بھی تیار ہوکر ضایع ہوگیا۔ سنہ ۱۹۱۷ء تک فانی کچھ تو کشمکش حیات کی پریشانیوں کے سبب اور کچھ اپنی گذشتہ کوششوں کے ضایع ہوجانے کے رنج سے شعر و سخن سے بیگانہ سے رہے لیکن اس کے بعد جو غزلیں

ہیں وہ چند قدیم رہی سہی غزلوں کے ساتھ نقیب پریس بدایون نے شایع کیں۔ گویا یہ فانی کا پہلا دیوان تھا جو شایع ہوا دوسرا دیوان باقیات فانی ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلی بار آگرہ سے شایع ہوا اور اس کے بعد وجدانیات فانی اور عرفانیات فانی دکن اور دہلی سے شایع ہوے۔ اور اب آخری یادگار فانی نظامی پریس بدایون سے شایع ہونے والی ہے۔

فانی کے کلام میں وہ کشش ہے کہ ہر شخص خواہ مخواہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے آپ کے کلام میں وہ اثر اور سوز و گداز ہے کہ بیٹھے بٹھاے پڑھنے والا آہیں کھینچنے لگتا ہے غم زدوں کے لیے ان کا پیام پیغام تسکین ہے مصیبت زدوں کے لیے تسلی بخش اور غربت کے مارے ہوے لوگوں کو اطمینان اور سکون دینے والا ہے فانی کی شاعری در اصل جذبات کا ایک فوٹو ہے جسے انھوں نے الفاظ کے جامے میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ ان کے اشعار پر میکالے کا یہ قول بالکل صادق آتا ہے کہ "شعر الفاظ کا ایسا استعمال ہے کہ اس سے تخیل دھوکا کھا جاے مصور رنگ کی مدد سے جو کام کرتا ہے اس کو الفاظ کے ذریعے سرانجام کرنے کا نام شاعری ہے"

فانی نے اپنے مفہوم کو ادا کرنے کا طرز ایسا دل نشین اور دلپذیر پایا تھا کہ پڑھنے اور سننے والوں کے سامنے تصویر پھر جاتی ہے اور طرفۃ العین سے ہمارا ذہن دماغ و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور سارا نقشہ اس طرح سامنے آجاتا ہے گویا سینما کی تصویریں ہیں۔ جو چشم زدن میں موجود اور غایب ہو جاتی ہیں ملاحظہ ہو ؎

چشم ساقی اثر مے سے نہیں ہے گلرنگ
دل ترے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

کیوں سادگی میں طور کچھ بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

ادھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو ادھر دیکھو
میری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

بقول رشید صدیقی فانی "یاسیات کے امام" ہیں افسردگی اور حزن کی ترجمانی ان کا خاص حصہ تھا۔ ہندستانی شاعری میں یہ چیزیں بالکل فرسودہ اور پامال ہو چکی ہیں۔ مگر فانی نے ان کو ایک خاص انداز سے پیش کیا ہے افسردگی اور حزن ہی نہیں جبر و اختیار خطرۂ دل فراق، و وصال۔ گریبان و دامن۔ حسن و عشق۔ ہجر و وصال اور روز محشر و فلسفۂ زندگی وغیرہ کے خیالات کو بھی باندھا ہے اور خوب باندھا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا

سینۂ فانی ہے یا جولانگہ برق فنا
دل ہے یارب یا بلاے آسمان اضطراب

خوناب دل نوازی درماں نہ لا سکے
میں ہوں وہ درد غم کدہ روزگار میں

یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے پوچھو زندگی کیا ہے

برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشر سکوت
تیرے شہید ناز کا ماتم خموش تھا

نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

اپنی خوشی میں میرے بھی غم کو پناہ دو
اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں

آپ کی غزلوں میں اس جدید طرز کی کافی چاشنی پائی جاتی ہے جس کے آپ زبردست علمبردار تھے اور جس کو موجودہ دور میں خصوصیت حاصل ہے یعنی آپ کا کلام اس قدیم روش سے قطعاً پاک صاف ہے جس میں عموماً چند معترہ جملوں مخصوص خیالات اور توہمات

کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور نیز عربی و فارسی کے موٹے موٹے الفاظ اور غیر مانوس ترکیبوں سے بھی آپ نے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔ ہر جگہ آپ نے اپنے دل کی گہرائیوں کو پیش کیا ہے۔ آپ کا سارا کلام نئے نئے خیالات اور انوکھے مضامین سے پر نظر آتا ہے ہر جگہ آپ نے موقع و محل کے لحاظ سے اس طرح الفاظ کو سجایا ہے کہ مطلق حرف رکھنے کی گنجائش نہیں۔ الفاظ کے ذرا تبدیل کر دینے سے شعر کا رتبہ شعر سے گر جاتا ہے۔ وہ شاندار الفاظ اور معنی خیز تراکیب سے غزل کو مزین کرتے تھے کہ پڑھنے والا پڑھے اور جھوم جھوم کر داد دے انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ انگریزی کے لطیف جذبات کو ہندستانی کے قالب میں ڈھالیں جس میں ان کو کسی حد تک کامیابی ہوئی اس کے علاوہ ہم کو کلام فانی پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب فانی نے پرانی روش کو چھوڑ کر انگریزی شاعری کی طرز کو بہت استعمال کیا ہے لیکن ہر جگہ آپ نے اس خوبی اور صفائی سے اس طرز کو نبھایا ہے کہ کسی جگہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جناب فانی نے کوئی نیا کام اپنے ذمے لیا تھا اور اسی وجہ سے آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فانی کی شاعری انگریزی کا ماخذ نہیں بلکہ اس میں خود ہی ایک نئی چیز ہے جو معاصرین شعرا کے کلام میں بہت کم ہے۔ وہ معمولی بول چال کو قوافی اور ردیف کا جامہ پہنا کر اتنا دل آویز اور مترنم نشستہ اور شیریں کر دیتے تھے کہ زبان دیر تک چٹخارے لیتی رہتی ہے ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

دل کیوں شب فراق تڑپ کر ٹھہر گیا
کیوں اضطراب کیا تیری صورت بدل گئی

ہائے کیا دن ہیں کہ نقش سجدہ ہی اور نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبال دوش تھا

یوں ہی کسی طرح کٹی جب میری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستان غم دل نے مجھے سلا دیا

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہل زنداں کو
گریباں نے گلے لگا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار رہیں ہم

فانی کو منظر نگاری میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی روز محشر کا کیا خوب خاکہ کھینچا ہے ملاحظہ ہو ؎

کیا جانیے کیا حشر ہو صبح حشر کا — بیدار تیرے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں
اپنے کمال شوق پہ حشر کا دن ہی ٹھہر — وعدہ وعید چاہیے زحمت انتظار کیا
حشر میں حشر چاہیے حشر پہ حشر چاہیے — دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیہ نیاز میں

فانی نے معاملہ بندی اور رگاوٹ کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

نہ بن پڑا عذر جفا کسی سے تو ہائے — ارادہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کا

فانی مقطع کے استاد ہیں۔ وہ مومن کی طرح اپنے تخلص کو بہت خوبی سے نبھا جاتے ہیں جس سے شعر میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ یاسیات کے امام تھے لہذا ان کا ہر مقطع یاس و رنج میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے جو پڑھنے والے پر برقی اثر کرتا ہے۔ پڑھیے اور سر دھنیے ؎

خاک فانی کی قسم ہے تجھے اے دشت جنوں
کس سے سیکھا تیرے ذروں نے بیاباں ہونا

پوچھتے ہو نشان فانی کیا — وہ ہے اک قبر بے نشان انجام
زیست تھی فانی بقید تمہید شوق — عمر بھر ہم پر تو نور بشر دیکھا کیے
آج روز وصال فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

فانی نے فلسفہ زندگی پر بھی مختلف نقطہ نظر سے طبع آزمائی کی ہے جس پر بے اختیار داد دینی پڑتی ہے زندگی کے فلسفے کو کس خوبی سے سمجھایا ہے۔

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدا ۔ زندگی آہ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ۔ رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی ۔ زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر ۔ موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش تھا

فانی نے آخر میں ایک غزل کہی جس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب دنیا سے بیزار تھے اور انھوں نے اپنا مسلک الگ بنا لیا تھا۔ وہ سکون کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ایک ایسی جگہ رہنا چاہتے تھے جہاں اطمینان کی زندگی ہو۔ ان کی یہ غزل یاس کا مرقع ہے ایک ایک فقرہ دل میں چبھا جاتا ہے غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ اس آسماں سے دور

شاید میں درخور نگہ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

تا عرض شوق میں نہ لگے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں تری آستاں سے دور

فانی دکن میں رہ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

(حبیب احمد حمیدی بدایونی)

اولاد کا داغ

نہ دے یارب کسی دشمن کو بھی اولاد کا داغ ۔ ہے مرکر بھی تیری ہی اولاد کا داغ

کھوئیں یعقوب نے روکر اسی غم میں آنکھیں ۔ نوح کے صبر کی لغزش ہے یہ اولاد کا داغ

ضبط آخر نہ ہوا سعد کو لاکھ جی ۔ اشک کی کر دیا جاری ہے یہ اولاد کا داغ

سینہ بریاں جگر افگار کلیجہ زخمی ۔ ہے یہ ہر پہلو عجب تپکی اولاد کا داغ

کیفیت ماتا کی صاحب اولاد سے پوچھ ۔ سوچ کیا ہے یہ غم واقعی اولاد کا داغ

لخت دل نور نظر خاک کا پیوند بنے ۔ دیکھے ان آنکھوں سے کیا جیتے جی اولاد کا داغ

پہلوان روئیں تن ہو کہ سکندر رسا جری ۔ کرتے ستم سے صدا ستی اولاد کا داغ

سنگدل لاکھ سہی اور ہو کیسا ہی شقی ۔ کر دے بے چین نہ ہر گھڑی اولاد کا داغ

یوں تو ہر غم ستم انگیز ہے لیکن احمد ۔ بخدا ہے یہ مصیبت بڑی اولاد کا داغ

(ابو الحامد محمد احمد امداد احمد)

غزل

حشر قریب ہے تو ہو تو نہ بدل شعار کو
اور ابھی بڑھائے جا وسعت انتظار کو

آتش شوق دیکھیے چہرہ کہیں بھڑک اٹھے
آپ نہ دیں تسلیاں کشتہ انتظار کو

آہ یہ دم بدم شکست میری نگاہ شوق کی
دیکھ کہیں الٹ نہ دے عالم اعتبار کو

خوف گناہ دل میں کیوں پرسش اور حشر کیا
بھول نہ کبھی نہ بے خبر رحمت کردگار کو

لاکھ سکوں کا درس دے چشم کرم حضور کی
چین نہ آئیگا کبھی اس دل بے قرار کو

ضبط فغان درد ہے مسلک عشق کا اصول
آج یہ ہو گیا ہے کیا دیدۂ اشکبار کو

آپ کی یاد کے نثار آپکو نام کیا بتاؤں
کہتے ہیں عرشی حزیں آپ کے جاں نثار کو

جاپان کے مقاصد جنگ

وسط انیسویں صدی تک جاپان کی حیثیت ایک پس ماندہ ملک کی تھی۔ اس کی ترقی کی ابتدا ۱۸۶۸ء سے ہوئی جب کہ شوگنی دور کا خاتمہ ہوا اور ملک کی حکومت دوبارہ اس کے اصلی حاکم یعنی شہنشاہ کے ہاتھ میں منتقل ہوئی۔ اس تاریخ کے بعد سے جاپان نے زراعت، صنعت اور تجارت میں ایک ساتھ ترقی کرنا شروع کی۔ جنگ چین و جاپان (سنہ ۱۸۹۴ء) جنگ روس و جاپان (سنہ ۱۹۰۴ء) اور گزشتہ جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ء) کی وجہ سے جاپان کو معاشی میدان میں ترقی کرنے کے غیر معمولی موقع حاصل ہوئے۔ اس نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا حتیٰ کہ اس کی صنعتی اور فوجی قوت بین الاقوامی نقطۂ نظر سے تسلیم کر لی گئی اور اس کا شمار بھی دول ہائے عظمیٰ میں ہونے لگا۔

ان بدلے ہوئے حالات کی بنا پر جاپان میں کئی مسائل پیدا ہو گئے ان میں سے ایک اہم مسئلہ کثرت آبادی کا ہے۔ حفظان صحت کی ترقی اور دیگر سہولتوں کی وجہ سے شرح اموات میں تخفیف ہوئی اور بحیثیت مجموعی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ ۱۸۷۲ء میں جاپان خاص کی جملہ آبادی تقریباً تین کروڑ سے زاید تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ء تک بڑھ کر چار کروڑ سے زاید ہو گئی۔ ۱۹۱۵ء تک اس میں روز افزوں اضافہ ہوا اور آبادی بڑھ کر چار کروڑ سے زاید ہو گئی۔ مزید پندرہ سال کے عرصے میں اس میں اور زیادتی ہوئی چنانچہ ۱۹۳۰ء تک وہ چھ کروڑ سے زاید ہو گئی۔ ۱۹۳۵ء میں اس کی تعداد چھ کروڑ نوے لاکھ سے زاید یعنی تقریباً سات کروڑ رہی۔ اس طرح ۱۸۷۲ء کے مقابل ۱۹۳۵ء میں یعنی ۶۳ سال کے عرصے میں تقریباً دگنی ہو گئی۔ جاپانی ماہرین کا خیال ہے کہ آیندہ چند سالوں میں آبادی دس کروڑ تک بڑھ جائے گی۔ زرعی اراضیات کی قلت اور آبادی کے لگاتار اضافے کی وجہ سے زمینات پر زیادہ بار پڑنے لگا۔ چنانچہ مزروعہ رقبے کے لحاظ سے دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ممالک کے مقابل جاپان میں آبادی کا بار بہت زیادہ ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں فی مزروعہ مربع میل (۲۲۹) النفوس بستے ہیں۔ فرانس میں (۴۶۷) جرمنی میں (۸۰۶) اٹلی میں (۸۱۹) بلجیم میں (۱۷۰۹) سلطنت ہائے متحدہ میں (۲۱۷۰) اور جاپان میں (۲۷۷۴) اوسط ہے۔ جاپان میں فی کاشتکار خاندان اراضیات کا اوسط بہت کم ہے (۷۰) فی صد سے زاید کاشتکار خاندانوں کے پاس دو ایکڑ سے کم اراضی ہے۔ صرف چار فی صد کاشتکار خاندان ایسے ملیں گے جو سات ایکڑ سے زاید اراضی پر کاشت کرتے ہیں۔ ان اعداد کی روشنی میں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ جاپان میں زرعی کثرت آبادی پائی جاتی ہے۔ اور اس کے لیے دو حل پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ زراعت آبادی کو قرب و جوار کے زرعی علاقوں میں منتقل کیا جائے یا یہ کہ اندرون ملک صنعت و حرفت کو مزید ترقی دی جائے تاکہ زرعی آبادی کی صنعت و حرفت میں کھپ سکے اور اراضیات پر آبادی کا بار کم ہو۔

صنعت و حرفت میں پیدائش کے پیمانے کو وسیع کرنا بہت آسان ہے لیکن جب تک مصنوعات کی کھپت کے لیے بازار نہ ہوں پیدائش کے پیمانے کو بڑھانا ایک بے معنی بات ہے لہٰذا جدید معاشی ترقی کی وجہ سے جاپان کے لیے دوسرا اہم مسئلہ مارکٹوں کا پیدا ہو گیا۔ شوگنی دور میں اور اس سے قبل جاپان کی تجارت درآمد پیشہ مصنوعات پر اور تجارت برآمد پیشہ ریشم اور دوسری خام اشیا پر مشتمل ہوتی تھی لیکن صنعتی ترقی کے ساتھ اس میں معکوس تبدیلی شروع ہوئی تجارت درآمد میں مصنوعات کا حصہ گھٹنے اور خام پیداواروں کا حصہ بڑھنے لگا اسی طرح تجارت برآمد میں خام پیداواروں کا حصہ گھٹنے اور مصنوعات کا حصہ بڑھنے لگا۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان اشیائے برآمد کا اوسطاً (۲۹ر۱) فی صد حصہ مصنوعات پر مشتمل تھا لیکن ۱۹۳۴ء

تک بڑھ کر (۶۲) فی صد ہوگیا۔ ۱۹۲۳ء میں برآمد کا ۲ ء ۳۹
فی صد خام پیداوار پر مشتمل ہوتا تھا لیکن ۱۹۳۴ء تک وہ گھٹ کر
صرف ۸ ء ۱۲ فی صد رہ گیا۔ ان حالات کے تحت جاپان کے لیے یہ
سوال پیدا ہوگیا کہ ایسے ممالک کے ساتھ رشتہ قایم کرے جہاں سے
وہ خام اشیا بمقدار کثیر ارزاں قیمت پر اور آسانی کے ساتھ حاصل
کرسکے اور ساتھ ہی اپنی مصنوعات ان کے بازاروں میں کھپا سکے
اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی تجارت خارجہ کا رخ یورپی
ممالک سے ہٹ کر ایشیائی ممالک کی طرف ہوگیا۔ ابتداً جاپان کی خارجی
تجارت میں یورپی ممالک کا حصہ زیادہ تھا اور ایشیائی ممالک کا حصہ
ناقابل لحاظ تھا لیکن جب جاپان نے صنعت وحرفت میں ترقی شروع
کردی تو اس کے مال کی کھپت ظاہر ہے کہ ایشیا کے پس ماندہ ممالک
ہی میں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء تک جاپان کی اشیاے برآمد کا
۵۳ فی صد حصہ ایشیائی ممالک کو جانے لگا۔ اگر جاپان کو ایشیائی ممالک
پر سیاسی تسلط حاصل ہوجائے تو وہ صنعت حرفت کی مزید ترقی
اور وسیع مارکٹوں کے مسئلے کو آسانی کے ساتھ حل کرسکتا ہے۔

مذکورہ دو مسایل کے سوا جاپان کے آگے تیسرا مسئلہ سیاسی
اقتدار اور قومی برتری کا ہے۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ کسی
فرد، جماعت، قوم کو جس قدر زیادہ ترقی ملتی جاتی ہے اسے،
ہیچ شمار کیا جانے لگتا ہے اور ساری کوششیں مزید ترقی کے حاصل
کرنے میں صرف کی جاتی ہیں۔ آج سے (۷۵) سال قبل دنیا
کے ترقی یافتہ ممالک میں جاپان کو کوئی رتبہ حاصل نہ تھا جب اسے
معجزانہ ترقی نصیب ہوئی اور اس کا شمار دول ہاے عظمیٰ میں
ہونے لگا تو اس کی ہمتیں بہت بلند ہوگئیں اب اس نے اپنا مقابلہ
برطانیہ سے کرنا شروع کیا۔ اس نے دیکھا کہ جب برطانیہ کے
(۴۸۰۰۰۰۰۰) باشندے جو (۱۲۰۴۸۹) مربع میل پر بستے ہیں
دنیا کے طول وعرض میں (۴۵۰۰۰۰۰۰۰) نفوس پر حکمرانی کرسکتے
اور (۱۴۰۰۰۰۰۰) مربع میل پر قبضہ رکھ سکتے ہیں تو کیوں وہ
(۱۴۷۶۲۱) مربع میل پر بسنے والی سات کروڑ آبادی کے ساتھ
ملک گیری کا بیڑا اٹھائے اور ایشیائی ممالک میں وہی رتبہ [illegible]
اور مرتبہ حاصل کرے جو یورپی ممالک میں برطانیہ کو حاصل ہے۔

متذکرہ تین مسایل کے حل کرنے کے لیے آج جاپان جنگ
آزما نظر آرہا ہے ملک گیری کی مہم سے تینوں مسایل آسانی کے
ساتھ حل ہوسکتے ہیں۔ زاید آبادی کو [illegible] مناسب
اور موزوں علاقوں میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ [illegible] مقبوضہ
علاقوں سے طرح طرح کی خام پیداوار [illegible] قیمت پر
حاصل کی جاسکتی ہیں۔ صنعت [illegible]
کے بازاروں میں کامیابی کے ساتھ [illegible] ہے۔
نیز وسیع مقبوضات کی وجہ سے سیاسی [illegible]
کا مقصد بھی پورا ہوجاتا ہے۔ جاپان کی موجودہ جدوجہد میں
صرف اس کا قومی مفاد اور دیگر ایشیائی قوموں کا سیاسی اور معاشی
استحصال مضمر ہے۔ آج کل جاپان کے [illegible] کا پروپگنڈا
اور تشہیر ہوتی رہتی ہے۔ اور طرح طرح کی [illegible] سے
ایشیائی قوموں کو اپنا ہمدرد بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔
لیکن ہوشیار قومیں اچھی طرح جانتی ہیں کہ جاپان ایشیائی ممالک
کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ ان کے استحصال کے لیے لڑ رہا
ہے۔

مثال کے طور پر مانچوکو کو لیجیے۔ ابتداً یہ علاقہ چین کے
تحت تھا۔ اس کا رقبہ چار لاکھ [illegible] مربع میل سے زاید اور
آبادی تین کروڑ (۳۶) لاکھ [illegible] یہ ایک
زرخیز علاقہ ہے اس لیے جاپان کی نظریں اس پر [illegible] لگی ہوئی تھیں۔
جاپان یہاں سے کوئلہ، لوہا [illegible] حاصل کرسکتا
تھا۔ مانچوکو میں کوئلہ کے محفوظات کا تخمینہ [illegible] لاکھ
ٹن کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ [illegible] پیدا
نہیں تاہم اس کا قرینہ ہے کہ [illegible] ترقی دی جائے تو
جاپان اپنی ضروریات کا بڑا حصہ یہاں سے حاصل کرسکتا ہے۔
سویابین کے نقطۂ نظر سے مانچوکو بہت ممتاز ہے۔ دنیا کی پیداوار
کا ۳ ء ۹۵ فی صد حصہ یہاں سے حاصل [illegible]
وسایل سے استفادہ کرنے کی [illegible]

بھالیا اور دنیا کو دھوکا دینے کے لیے اس کی نام نہاد آزادی کا اعلان کر دیا۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں سابق شہنشاہ چین مسٹر پو یی کو یہاں کا حکمراں بنا دیا گیا۔ دونوں حکومتوں کے مابین معاہدات طے ہوئے اور قرار پایا کہ وہ آیندہ سے ایک دوسرے کے دوست ہونگے اور اڑے وقتوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائینگے۔ یہ بھی قرار پایا کہ قومی حفاظت کی خاطر جاپان کی ضروری فوج مانچوکو میں رہیگی تاکہ —— داشتہ آید بہ کار۔

مانچوکو پر قبضے کے بعد سے جاپان نے وہاں کے مختلف کاروبار میں اپنے پاس کے سرمایے کا حصہ بڑھانا شروع کیا ابتداً سب سے زیادہ سرمایہ چینیوں کا لگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ، روس، برطانیہ، جرمنی، فرانس، اسکینڈ ینیویا اور زیکوسلوواکیا وغیرہ کا سرمایہ بھی مشغول تھا لیکن چند سال کے عرصے میں جاپانی سرمایے کی مقدار بڑھتے بڑھتے جملہ بیرونی سرمایے کا (۹۰) فی صد ہو گئی۔ نہ صرف سرمایہ کاری میں جاپان کا حصہ بڑھ گیا بلکہ اس نے مانچوکو کی تجارت درآمد برآمد کے رخ کو ذاتی مفاد کی خاطر اپنی طرف پلٹا لیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں مانچوکو کی تجارت درآمد میں جاپان کا حصہ صرف ۳۷٫۲ فی صد تھا۔ چین کا ۲۷٫۷ فی صد اور باقی ۳۵٫۱ فی صد تھا ریاست ہائے متحدہ امریکہ، ہندوستان، کوریا، جرمنی، برطانیہ، ہانگ کانگ اور روس وغیرہ شریک تھے۔ لیکن آئندہ سات سالوں میں باستثنائے ہندوستان اور کوریا دیگر ممالک کا حصہ بہت گھٹ گیا اور جاپان کا حصہ بہت بڑھ گیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے مقابل سنہ ۱۹۳۷ء میں مانچوکو کی تجارت درآمد میں جاپان کا حصہ (۳۷٫۲) فی صد سے بڑھ کر (۷۰٫۵) فی صد ہو گیا یعنی اس میں تقریباً دوگنا اضافہ ہوا۔ برعکس اس کے انہیں سنین میں چین کا حصہ (۲۷٫۷) فی صد سے گھٹ کر صرف (۴٫۴) فی صد رہ گیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، ہندوستان، کوریا، جرمنی، برطانیہ، ہانگ کانگ اور روس وغیرہ کا حصہ (۳۵٫۱) فی صد سے گھٹ کر (۲۵٫۱) رہ گیا۔

تفصیلی اعداد حسب ذیل ہیں:-

مانچوکو کی تجارت درآمد کا رخ

	سنہ ۱۹۳۰ء		سنہ ۱۹۳۷ء	
جاپان	۳۷٫۲	فی صد	۷۰٫۵	فی صد
ریاست ہائے متحدہ	۷٫۰	"	۶٫۵	"
ہندستان	۱٫۰	"	۵٫۱	"
چین	۲۷٫۷	"	۴٫۴	"
کوریا	۳٫۵	"	۴٫۴	"
جرمنی	۱٫۴	"	۱٫۹	"
برطانیہ	۳٫۵	"	۱٫۲	"
ہانگ کانگ	۴٫۳	"	۰٫۵	"
روس	۴٫۰	"	—	"
دیگر ممالک	۷٫۷	"	۵٫۵	"
جملہ	۱۰۰٫۰		۱۰۰٫۰	

نہ صرف تجارت درآمد بلکہ تجارت برآمد میں بھی جاپان کا حصہ بڑھ گیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں مانچوکو کی برآمد کا (۳۰) فی صد حصہ روانہ کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۷ء تک (۴۲٫۳) فی صد جاپان جانے لگا۔ گویا (۱۲٫۳) فی صد کا اضافہ ہوا۔ برعکس اس کے انہی سنین میں چین کا حصہ (۲۶٫۸) فی صد سے گھٹ کر (۱۷٫۵) فی صد ہو گیا۔ کوریا، نیدرلینڈز اور برطانیہ کے حصوں میں بھی کمی ہوئی۔ تفصیلی اعداد مندرجہ ذیل ہیں:-

مانچوکو کی تجارت برآمد کا رخ

	سنہ ۱۹۳۰ء		سنہ ۱۹۳۷ء	
جاپان	۳۰٫۰	فی صد	۴۲٫۳	فی صد
چین	۲۶٫۸	"	۱۷٫۵	"
جرمنی	۰٫۹	"	۹٫۱	"
کوریا	۱۰٫۹	"	۶٫۸	"
ریاست ہائے متحدہ	۱٫۸	"	۲٫۹	"
نیدرلینڈز	۸٫۹	"	۲٫۶	"

	سنہ ۱۹۳۰ء	سنہ ۱۹۳۷ء
روس	۱ء۱۲ فی صد	—
دیگر ممالک	۹ء۴ ″	۴ء۱۷ فی صد
جملہ	۱۰۰ء۰۰	۱۰۰ء۰۰

ان اعداد سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس طرح جاپان نے مانچوکو کی تجارت اور سرمایہ کاری میں اپنا حصہ بڑھایا۔ اگر جاپان کو مانچوکو کی سیاست پر قابو نہ ہوتا تو وہاں کی معیشت میں اس کے حصے کا بڑھنا محال تھا۔ تین لاکھ آٹھ ہزار جاپانی مانچوکو میں بستے ہیں اور مختلف کاروبار مثلاً زراعت، صنعت، تجارت اور نقل و حمل وغیرہ میں ان کا حصہ ہے۔ وہاں کام کرنے کی وجہ سے انہیں ایک طرف تو روزگار ملتا ہے اور دوسری طرف وہ مشغل اصل کا منافع اپنے ملک کو روانہ کر سکتے ہیں۔ مانچوکو بظاہر آزاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی سیاست اور اس کے توسط سے اس کی معاشی پالیسی جاپان کے ہاتھ میں ہے۔ موجودہ جنگوں کا مقصد براہ راست حکمرانی سے کہیں زیادہ بالواسطہ اور مخفی معاشی استحصال ہے۔

جاپان ایشیا میں ایک ایسا انتظام قائم کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعے اسکی قوت اور طاقت زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جائے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقوں کو دل خوش کن نام نہاد آزادی دے بیٹھے لیکن ان کی سیاست معیشت کی کنجی اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔ تمام مقبوضات اسی کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہونگے۔ وہ جس طرح چاہیگا اپنے مفید مطلب طریق پر ان کی سیاسی اور معاشی پالیسی کی بالواسطہ رہنمائی کریگا۔ یہ امر اچھی طرح واضح رہنا چاہیے کہ جاپان ایشیا کی دوسری قوموں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے فائدے کے لیے جنگ کر رہا ہے۔ اس جنگ کے ذریعہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی، ترقی پذیر صنعت، سیاسی اقتدار اور قومی برتری کے مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے ــــ یہی اس کے مقاصد جنگ ہیں۔

محمد ناصر علی ام۔ اے (عثمانیہ)

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۷۲)

لہذا میں نہایت سختی سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ ہر حالت میں بچوں کی تعلیم کے لیے ان کی مادری زبان ہی کو ذریعہ بنایا جائے اور ان کے دماغ پر عجیب و غریب اور نامانوس الفاظ اور ترکیبوں کا بوجھ نہ لادا جائے۔ یہ طریقہ کسی طرح بھی ایک قومی زبان کی ترقی میں مائل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہندی یا اردو دونوں میں سے کسی کو مقامی زبانوں کی ترقی سے نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ قومی زبان کو مقبول بنانے میں ہمیں اسوقت زیادہ آسانی ہوگی جب مقامی زبانوں کی بقا اور قیام کے متعلق ہم ان کے حامیوں کو اطمینان دلادیں گے۔ غرضیکہ وہ لوگ جو کوئی خیال ملک کے بڑے حصے میں پہنچانا چاہیں گے وہ قومی زبان کو استعمال کریں گے اور جو لوگ اپنی بات ایک خاص حلقے تک محدود رکھنا چاہیں گے وہ اپنی مادری زبان سے کام لیں گے۔ اس طرح قومی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبانیں بھی ترقی کرتی رہیں گی۔ اس ملک کے باشندوں کی تمام ذہنی صلاحیتیں اس وقت بروئے کار نہیں لائی جاسکتیں اور وہ کلچر سے اس وقت تک مالا مال نہیں ہوسکتے جب تک کہ ہندستان کی تمام زبانیں دوش بدوش ترقی نہ کریں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ ہمارا فوری مقصد ہندستان میں ایک متحدہ قوم بنانا ہے لہذا مقامی زبانوں کو ترقی دینے سے ایک عالمگیر قومی شعور کے پیدا ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ ہمیں نیشنلزم کے یوروپین معیاروں کی نقالی کو اب چھوڑ دینا چاہیے۔ اب ۱۹ ویں صدی کی چھوٹی چھوٹی متجانس قومی سلطنتوں کا زمانہ بھول جانا چاہیے۔ دنیا ہر آن اب بڑی سے بڑی سیاسی وحدت یا بالفاظ دیگر مرکب قوموں کی حکومتوں میں تبدیل ہورہی ہے۔ سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک کے متحدہ اسٹیٹ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس یونین میں اٹھارہ کروڑ انسان آباد ہیں اور وہ چھیاسٹھ مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اسی لیے انکی علیحدہ علیحدہ ٦٦ ریپبلک بھی ہیں۔ ان میں ہر قوم یا اسٹیٹ کی اپنی علیحدہ زبان اور علیحدہ کلچر ہے اور ان تمام کلچروں کو بڑھنے اور پھولنے پھلنے کا پورا موقع دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ان سبھوں کا ایک متحدہ کلچر بھی ترقی پا رہا ہے، جو سوسائٹی کی سوشلسٹ تنظیم سے پیدا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سوویٹ یونین میں بیس سال کے اندر سو فی صدی تعلیم ہوگئی اور وسط ایشیا کی معمولی بولیاں بھی اس قدر ترقی کرگئی ہیں کہ اعلیٰ تعلیم اسی زبان میں دیجاتی ہے۔ ہندستان ایک نیم براعظم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اندر بھی مختلف اور متضاد کلچر رکھنے والے لوگ آباد ہیں۔ لہذا کیوں نہ ہم سوویٹ کی اس مثال سے فایدہ اٹھائیں اور اپنے جھگڑوں کو اسی طرح طے کریں۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ زبان کی بنیاد پر ہندستان کے صوبوں کا دوبارہ بٹوارہ ہونا چاہیے اور اس طرح اگر سترہ اٹھارہ صوبے بھی بنا دیے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم اپنے مختلف عناصر کے کلچروں کو دبا کر قومی زندگی نہیں پیدا کر سکتے۔

ہندی ہی قومی زبان بن سکتی ہے؟

نئی زندگی سے ہم اس مضمون کو نقل کر رہے ہیں۔ اس کے نقل کرنے کی ضرورت اس لیے لاحق ہوئی کہ عوام پر یہہ ظاہر ہو جائے کہ بعض لوگ دل سے کسی چیز کے قایل ہوتے ہیں اور ظاہر میں کچھ کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی مضمون کے لکھنے والے کو لیجیے کہ عنوان تو بڑا ہی کٹر قسم کا دیا ہے لیکن متن کے پڑھنے سے عنوان کا تطابق مشکل ہی سے ہوتا ہے سوائے اس ایک جملے کے کہ "ہندی ہی قومی زبان بن سکتی ہے"۔ پورا مضمون پڑھنے کے بعد ہر شخص آسانی سے یہہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ راہل صاحب نے جس زبان کے رایج کرنے کی ترغیب دی ہے وہ ہندی نہیں بلکہ "ہندستانی" ہے اس لیے کیا یہہ بہتر ہوتا کہ وہ عنوان یہہ قرار دیتے کہ "ہندستانی ہی قومی زبان بن سکتی ہے"۔

راہل صاحب نے ایک قومی زبان کی ترقی کے لیے جو تدبیریں بتائی ہیں وہ واقعی عمل کرنے کے قابل ہیں۔ اگر دوسرے ہندی پرست بھی اسی طرح ہماری رہبری کریں تو ہم ان کے ممنون ہونگے۔ وہ ہندی کے قومی زبان ہونے کا راگ الاپتے ہی رہینگے اور ہم ہندستانی کو قومی زبان منوا کر چھوڑینگے۔ ایڈیٹر

ہندی اردو جھگڑا بہت پرانا ہے لیکن یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ بعض مذہبی اور سیاسی اسباب بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں جن کا زبان کے سوال سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ لہذا یہاں ہم جذبات سے قطعاً علحدہ ہو کر ہندی اور اردو کے دعووں پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس میں سے کونسی زبان قومی زبان بننے کے لائق ہے۔

اردو کے حامئین ہندی کی ترقی اور پھیلاو کو کسی قدر شک و شبہہ اور خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہیں اس کی مثال ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں اور اخبار "مدینہ" بجنور کا حوالہ دیتے ہیں جو ایک قوم پرست اخبار شمار کیا جاتا ہے اور جس سے ہم اس معاملے میں زیادہ وسیع النظری کے متوقع تھے "مدینہ" لکھتا ہے کہ "اس سلسلے سے متعلق متعصب اور تنگ خیال ہندوں کا جو نقطہ نگاہ ہے اور اس کے حل کے لیے جن تدابیر کو وہ پیش کرتے ہیں وہ بین طور پر اردو کے لیے خطرناک ہے۔ اس سے مسلمانوں کے دلوں میں کانگریس کی طرف سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور انھیں یہ شبہہ ہونے لگا ہے کہ اردو کو آسان بنانے پر اس لیے زور دیا جا رہا ہے تا کہ ہندی کا پرچار کیا جاے۔ صوبہ متحدہ کی حکومت کے اعلانات اور کمیونک جو فارسی اور ناگری دونوں رسم خط میں چھپتے ہیں، ان کی زبان بالکل جدا جدا ہوتی ہے حالانکہ کانگریس کے فیصلوں کے مطابق زبان ایک ہی ہونی چاہیے تھی اور رسم الخط مختلف"۔ ہندی بولنے والوں اور ہندی زبان کی وہی پوزیشن ہے جو ایران یا ٹرکی کے باشندوں کی پوزیشن ان کی مادری زبانوں سے متعلق ہے۔ ایران اور ٹرکی میں کسی نے بھی اس امر پر احتجاج نہیں کیا کہ ان زبانوں سے ہزاروں عربی الفاظ جو صدہا سال کے استعمال سے جزو زبان ہو چکے ہیں، خارج کر دیے گئے۔ اگر ان ملکوں کے مسلمان اپنی زبانوں سے عربی الفاظ کا اخراج غیر اسلامی نہیں سمجھتے تو ہندستان کے مسلمان کیوں ایسا سمجھتے ہیں۔ روحانی معاملات میں مذہب کو یہ اختیار ہے کہ وہ جہاں پر چاہے دخل دے لیکن ادبی سماجی اور سیاسی امور میں اسے دخل اندازی کا کیا حق حاصل ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اردو کے

راہل سنکرتاین جی لسانیات کے ماہر اور بودھ فلسفہ اور ادبیہ میں ساری دنیا میں سند مانے جاتے ہیں۔ قومی زبان کے مسئلے میں آپ ہندی کے حامی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس بحث کے تمام پہلو اور نقطۂ نگاہ سامنے آجائیں۔ اسی لیے ہم راہل جی کا یہ مضمون شایع کر رہے ہیں۔ ایڈیٹر (نئی زندگی)

تحفظ کو اسلام کے ایک رکن کا تحفظ سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ دنیا کی ترقی پسند مسلم قومیں اپنی بڑھتی ہوئی قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی زبان اور رسم الخط میں اصلاح کر رہی ہیں ــــ یہ واقعی ایک تعجب انگیز چیز ہے کہ اگر انہیں اصلاحات کی ہندستان میں وکالت کیجاتی ہے تو اس ملک کے مسلمان مخالفت کا ایک طوفان اٹھا دیتے ہیں۔ ہندی زبان ہندوں کی جاگیر نہیں اور نہ یہ ہندو مہاسبھا کے مطالبات کی نمائندہ ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ ہندستانی قومیت کا ایک نشان ہے اور یہ زبان ادب کو غیر اثرات سے اچھی طرح پاک رکھنا چاہتی ہے۔ جس طرح ہم اپنی سیاسیات کو غیر ملکی اثرات سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ ہندو جس طرح ہندی زبان کا پروپگنڈا کرتے ہیں اس سے بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان خاص انہی کی ملکیت ہے یہ خیال قطعاً صحیح نہیں۔ کیونکہ ہندی تقریباً چھ کروڑ ہندستانیوں کی زبان ہے جنمیں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ہندو نہیں۔

مختصر یہ کہ مذہب کا زبان کے مسلے سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ کوئی بھی خواہ مخواہ ہندو یا مسلمان جو اس مسلے میں مذہبی رخ اختیار کر رہے ہیں، ان پر صرف آنے والی نسلیں ہنسینگی، بلکہ وہ دنیا کی دوسری ہمعصر ترقی پسند قوموں کے نزدیک بھی اپنے کو مضحکہ خیز بنائیں گے۔

ہندستان کی ایک زبان ہونے کی حیثیت سے اردو کو عربی الفاظ اخذ کرنے کا وہ حق حاصل نہیں، جو ہندی کو سنسکرت الفاظ اخذ کرنے کا ہے کیونکہ سنسکرت ہندستان کی قدیم زبان ہے اور ہندی اس کی جائز وارث ہے۔ ہندستان میں عربی کبھی بھی سنسکرت کی جگہہ نہیں لے سکتی۔ غیر ملکی الفاظ ہم یقینی لے سکتے ہیں۔ لیکن اسی حد تک جس حد تک وہ ہمارے لیئے ناگزیر ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی زبان میں مذہب اسلام کے بعض خیالات کے اظہار کے لیے ہمیں بعض عربی الفاظ اور اصطلاحیں لینی پڑینگی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ملک کی سیاسی، سماجی اور سائنٹفک لغت میں عربی کے بے شمار الفاظ داخل کر لیے جائیں۔ یہ اسی حد تک ممکن ہے جس حد تک ان عربی الفاظ کے علاوہ دوسرے الفاظ سے ہمارا کام نہ چل سکے۔ اگرچہ ہم نے انگریزی زبان سے انجن ڈرائیور، مشین، ٹرام، وے موٹر، ریڈیو وغیرہ جیسے الفاظ لے لیے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی زبان میں یوروپین زبان کی بھرمار کریں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندی کے بعض لکھنے والے خواہ مخواہ بلا ضرورت موٹے موٹے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور انکی اس حرکت پہ سنسکرت کا صحیح علم رکھنے والے لوگ ہنستے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے پاس سنسکرت الفاظ کا ایک ناختم ہونیوالا ذخیرہ موجود ہے لیکن انھیں نہایت ہوشیاری سے اور قدم پھونک پھونک کر استعمال کرنا چاہیے۔ اردو کا ڈھانچہ بنیادی طور پر وہی ہے جو ہندی کا ہے اور اس کی گرامر اور شکل وصورت بھی ہندستانی ہی ہے۔ لیکن اس میں اس قدر غیر ملکی الفاظ بھر لیے گئے ہیں جو بعض اوقات ستر یا پچھتر فی صدی تک پہنچ جاتے ہیں اور اس زبان کے مداحوں کیلیے بھی اس کی حمایت مشکل ہو جاتی ہے۔ فارسی زبان، عربی زبان کی بہ نسبت ہندی اور سنسکرت سے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ ہندی اور فارسی کا تعلق زبانوں کے ایک ہی خاندان سے ہے۔ یعنی یہ دونوں ہیں جو کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ لہذا ہندستان کی زبان فارسی الفاظ کو زیادہ آسانی سے اخذ کرسکتی ہے۔ آج کل کی ادبی اردو عربی عناصر سے اس قدر بوجھل کر دی گئی ہے کہ اس کیلیے سرزمین میں قدم جمانا مشکل ہو گیا ہے۔ زبان اردو کی بحث میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے رسم خط پر بھی بحث کریں۔ یہاں اردو رسم خط کی خرابیوں اور دقتوں پر پوری تفصیل سے بحث ممکن نہیں یہ تو سبھی لوگ مانتے ہیں کہ ملک کے اندر زیادہ سے زیادہ تعلیم پھیلائی جانے لیکن اس راستے میں اردو رسم خط ایک زبردست رکاوٹ ہے کیونکہ اردو کے سالہا سال کے مطالعے کے بعد بھی یہ مشکل ہے کہ اس کے ان حرفوں کا صحیح استعمال کس طرح کیا جائے جو ایک ہی طرح کی آوازیں رکھتے ہیں۔ اس طرح کا رسم الخط کسی عالمگیر اور عوامی ضرورت کے لیے قطعاً مناسب نہیں۔ عربی رسم خط بھدا اور بدشکل ہے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ میرے اس خیال سے عربی کے حامی رنجیدہ ہونگے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل ٹھوس ہے۔ جب سے ایرانیوں نے عربی رسم خط میں اصلاح کر کے اسے نستعلیق بنا لیا ہے، ایران، افغانستان، ٹرکی اور ہندستان میں اکثر کتابیں اسی رسم خط میں چھپنے لگی ہیں اور اب عربی رسم خط صرف قرآن اور دوسری مذہبی کتابوں ہی تک محدود رہ گیا ہے۔ لیکن گرچہ

نستعلیق ایک حسین اور صاف رسم خط ہے۔ مگر اس کا لکھنا پڑھنا اور صحیح تلفظ ادا کرنا بھی عربی سے کچھ کم مشکل نہیں۔ عربی رسم خط میں تو یہ خوبی بھی ہے کہ اس کے ٹائپ ملتے ہیں اور انھیں چھپائی کی جدید مشینوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن نستعلیق ابتک لیتھو ہی کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔

عربی اور فارسی رسم الخطوں کی خرابیوں کو محسوس کرتے ہوئے بعض لوگ ناگری رسم خط سے اس طرح تعصب برتتے ہیں کہ رومن رسم خط کی وکالت شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن جب تک ان لوگوں کے سر پر مذہبی اور فرقہ وارانہ بھوت سوار رہے گا ان کی رومن رسم خط کی تائید بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ بعض اوقات میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ کانگریس دونوں رسم خط کو تسلیم کرنے کے بجائے ہندی اور اردو دونوں کو چھوڑ کر رومن لکھاوٹ کو لازمی قرار دیتی تو بہتر ہوتا لیکن اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ناگری رسم خط اس قابل نہیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ بعض معمولی اصلاحات کے بعد ہم ناگری رسم خط کو صرف ایک سو چار ٹائپوں میں محدود کر سکتے ہیں اور اس طرح اسے دنیا کی تمام لکھاوٹوں سے بہتر بنا سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے [illegible] اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ اردو کے حامیوں یا صرف ان لوگوں کی [illegible] کی جائے جو اس معاملے میں نہایت تنگ اور تعصب پسندانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اس پالیسی کا بالآخر یہی نتیجہ ہوگا کہ ناگری کے ساتھ ساتھ اردو رسم خط کا جاننا بھی لازمی قرار دیا جائے گا اسی طرح عدالتوں اور حکومت کے دفاتر میں بھی ہمیں بلا ضرورت دو لکھاوٹوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا حالانکہ اردو کے اکثر حامیین اس سے متفق ہیں کہ اس کا رسم خط نقائص سے بھرا ہوا ہے۔

ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ ہندی رفتہ رفتہ ہندستان کی قومی زبان بنتی جا رہی ہے اور آج ہم پینتیس کروڑ ہندستانیوں میں ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ اسے سیکھے۔ یہ سوال کہ اس زبان میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں یا عربی یا فارسی کے اسے ان علاقوں کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے جہاں ہندی اور اردو نہیں بولی جاتی ہیں۔ ملک کے دوسرے تمام حصوں کی زبانیں جیسے تلگو اور ملیالم بھی تامل سب [illegible] سنسکرت [illegible]

ہندی بلکہ اس ملک کی دوسری زبانوں میں بھی کثرت سے پایا جاتا کوئی حال کی اپج نہیں بلکہ یہ صدیوں سے یہ اسی طرح موجود ہیں۔ آج اگر ہم اسے کسی سبب سے متروک قرار دیں تو گویا ہم اس زبان کو اس کی قدرتی سرزمین سے اکھاڑ پھینک رہے ہیں۔

گرچہ زبان بنیادی طور پر ایک سائنس ہی ہے۔ لیکن اسے ہم عوام کو سائنس کی طرح نہیں پڑھا سکتے۔ عوام کے لیے زبان کچھ باتیں جاننے کا محض ایک آلہ ہے۔ جب بچہ اپنے پالنے میں ہوتا ہے اسی وقت وہ ایک زندہ زبان کے بنیادی عناصر اخذ کر لیتا ہے جو رفتہ رفتہ انھیں بنیادوں پر ایک بے پناہ قوت گویائی بنجاتی ہے۔ لہذا انسان اپنی مادری زبان ہی کے ذریعے زیادہ موثر اور آسان طریقے سے علم سیکھ سکتا ہے۔ اگر ہم زبان کے مسئلے کو اس نگاہ سے دیکھیں تو ہندی اردو جھگڑے کی تلخی ایک بڑی حد تک کم ہو جائے۔

اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہندی یا اردو زبان سارے شمالی اور وسطی ہندستان کی مادری زبان ہے۔ پھر جو لوگ اس چیز کو تسلیم نہیں کرتے ان سے لوگ بڑے جھگڑے کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم اس دعوے کو تسلیم کر سکتے ہیں؟ کیا یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ بہار، یوپی، سنٹرل انڈیا ایجنسی، راجپوتانہ، دلی، پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے لوگ اپنے بچپن ہی سے ہندی اردو سمجھنے لگتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یوپی کے چند ضلعوں کے ماسوا جیسے مظفر نگر، میرٹھ، بلند شہر، سہارنپور، بجنور وغیرہ — جہاں کی زبان کو ہم ہندی یا اردو کہہ سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا تمام صوبوں کے لوگوں کی مادری زبان ہندی یا اردو نہیں ہے، ان مقامات کے لوگ جو ہندی یا اردو بولتے ہیں، وہ بعد کو سیکھی ہوئی زبان بولتے ہیں۔

یہ چیز ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ان صوبوں کے لوگوں کو ہندی یا اردو زبان کے سیکھنے میں لگ بھگ آٹھ سال لگ جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ زبان سیکھ لینے کے بعد ان زبانوں میں علوم سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہم اپنے تعلیمی سسٹم میں اس قسم کے تضیع اوقات کو جائز رکھیں تو پھر اس ملک میں ہم کبھی بھی سو فی صدی علم حاصل نہیں کر سکتے

سلسلے کیلیے ملاحظہ ہو صفحہ [illegible]

ہندستانی ادب معاصروں کی نظر میں

شہاب

زیر ادارت غلام محمد خاں ایم۔ اے چندہ سالانہ للعہ ہنچل گوڑا حیدرآباد دکن امرداد ۱۳۵۱ف

میں پہلا پرچہ توقعات سے بڑھکر فردوس نظر ہوا تنوع مضامین اور ترتیب سے حسن سلیقہ اور معیار کا پتہ چلتا ہے توقع ہے کہ نقش ثانی بہتر از اول ہوگا۔ غلام محمد خاں صاحب سے بڑے بڑے توقعات وابستہ ہیں کہ ان کا نومولود ہندستانی ادب کا سنگم ہوگا' اردو اور ہندی کی جو ناگوار بحث چھڑی ہوئی ہے یہ اس کو سلجھا سکے گا۔ ایسے زمانے میں جب کہ سامان طباعت کی گرانی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اتنا نفیس پرچہ عزم بلند کی واقعی نمائش ہے۔

چمنستان

زمانہ قدیم سے ہی حیدرآباد علم و [illegible] کا گہوارہ رہا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے [illegible] نے حیدرآباد نے اردو کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ہندستانی ادب نے بھی حیدرآباد میں جنم لیا ہے۔ یہ ماہنامہ جناب غلام محمد خاں صاحب ایم۔ اے کی ادارت میں جون ۱۹۴۲ء سے شایع ہو رہا ہے رسالے کے جاری کرنے کا مقصد بیان فرماتے ہوے اڈیٹر صاحب رقمطراز ہیں کہ "اس رسالے کا جاری کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مشترکہ زبان کی خدمت کی جاے اور سچ یہ ہے کہ زبان کی خدمت ہی ملک و قوم کی حقیقی خدمت ہو سکتی ہے"۔ ہمیں اپنی برادری میں ہندستانی ادب کو خوش آمدید کہنے میں مسرت ہے کہ اس مہنگائی کے دور میں اتنا عمدہ کاغذ چھپائی اور لکھائی سے آراستہ رسالہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب نظر آ رہا ہے۔ تابش دہلوی اور ماہر القادری صاحبان کے علاوہ زیادہ تر لکھنے والے حیدرآباد کے مشاہیر ہی ہندستانی ادب کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں۔

رسالے کا چندہ چار روپے سالانہ قیمت فی پرچہ ۶ آنے اور منیجر ہندستانی ادب ہنچل گوڑا حیدرآباد دکن سے دستیاب ہو سکتا ہے

روزنامہ صبح دکن

ملک کے اس ماہنامے نے جو مسٹر غلام محمد خاں ایم۔ اے عثمانیہ کی ادارت میں شایع ہوتا ہے (۹۵) صفحات پر اپنا سالگرہ نمبر شایع کیا ہے' ٹیگور نمبر' صنعتی نمبر' اور نیا سال نمبر کے بعد یہ چوتھا خاص نمبر ہے کاغذ اور دوسرے وسایل طباعت کی گرانی کو مدنظر رکھتے ہوے' ہم بغیر خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی ادب کے اڈیٹر کو "لاٹری" میں کافی رقم مل گئی ہے' اور وہ اس رقم سے اپنے مذاق ادب کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ زیر نظر سالے کے قلمی معاونین میں ہر قسم کے لوگ شریک ہیں پختہ مشق اور مشاہیر بھی طلبا اور مبتدی بھی نئے اور پرانے لکھنے والوں کے اس امتزاج نے مجموعے کو خاص متنوع بنا دیا ہے' اور یہ اس کی ایک خوبی ہے۔ مجموعی حیثیت سے ہندستانی ادب ترقی کے راستے پر گامزن ہے اور اس کے ارباب کار مستحق مبارکباد ہیں! چندہ سالانہ للعہ خط و کتابت کا پتہ ہنچل گوڑہ حیدرآباد۔

حشر ہفتہ وار

اڈیٹر غلام محمد خاں ایم۔ اے (عثمانیہ)

تقطیع ۲۰×۳۰ بٹا ۸ ضخامت ۷۰ صفحے چندہ سالانہ للعہ۔ فی پرچہ ۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ۔ حد درجہ دیدہ زیب و اعلیٰ ترتیب موزوں۔ ماہ جون سے متعلق ہندستانی ادب جو اس کے ادارے کی زرین اولعزمیوں کا پہلا شاہکار ہے ہمیں بغرض ریویو دستیاب ہوا۔ ہندستانی ادب کو شروع سے آخر تک دیکھنے پر ہم انتہائی مسرت کے ساتھ ادب نواز طبقے کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ ماہنامہ مذکورہ اپنی نوعیت کا وہ پہلا معیاری ادبی پرچہ ہے جسے ہم بجا طور پر ہندستانی ادب کا گہوارہ کہہ سکتے ہیں۔ حصہ نظم و نثر میں بعض بعض فقرے اور اشعار تو ایسے ہیں جنھیں ہندستانی بحر ادب کے انمول موتی کہا جاے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی اپنی جگہ

جگہ قابل صد مبارکباد ہیں۔ ان علمی خوبیوں اور ادبی جولانیوں کی بنا پر ہم قارئین حشر سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ ہندستانی ادب کا مطالعہ ضرور کریں۔

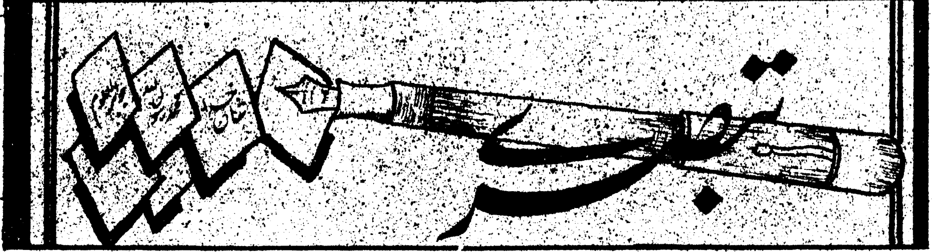
آخر میں ہم مسٹر غلام محمد صاحب ام۔ اے ایڈیٹر ہندستانی ادب کو ان کی اس قابل قدر اقدام اور ناقابل فراموش کارنامے پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ پتہ: منیجر ہندستانی ادب پنچل گوڑا حیدرآباد دکن۔

مصور ہفتہ وار اس ماہنامے نے جس قدر قلیل عرصے میں مقبولیت حاصل کر لی ہے وہ اس کی ہردلعزیزی پر دال ہے۔ لیکن عوام پسندی یا ہردلعزیزی کسی پرچے کے معیاری ہونے کی ضمانت نہیں ہوتی۔ کیونکہ لاہور وغیرہ کے بہت سے ایسے پرچے ہیں جو عوام میں بہت مقبول ہیں لیکن جن میں فحشیات اور سطحی مضامین کے سوا کچھ نہیں ہوتا اگر ہندستانی ادب کی مقبولیت اس کے اچھے مضامین اور اعلیٰ مقاصد ہیں جن کے تحت اس رسالے کا اجرا عمل میں آیا گو ابھی تک وہ ان مقاصد کو حاصل تو نہیں کر سکا ہے لیکن کوشش جاری ہے اور ہی چاہیے تھوڑے ہی عرصے میں ہندستانی ادب تین خاص نمبر پیش کر چکا ہے۔ یعنی ٹیگور نمبر، نیا سال نمبر، اور صنعتی نمبر یہ تینوں نمبر اپنے طور پر نہایت کامیاب اور مفید تھے اگر جنگ کی گرانباری نہ ہوتی تو شاید اور زیادہ دیدہ زیب صورت اور ضخامت کے ساتھ نکلتے۔ صنعتی نمبر کمال کر گیا۔ صد صفحات اور متعدد تصاویر پر مشتمل ہونے کے علاوہ بہترین صنعتی معلومات کا حامل ہندستانی ادب نے ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ مضامین دلچسپ ہونے کے علاوہ کارآمد بھی ہیں اور بلا۔ نوجوانان ہند ان کے مطالعے سے فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب سالگرہ نمبر کا اعلان کیا جا چکا ہے امید ہے کہ اسے پہلے نمبروں سے زیادہ بلند اور معیاری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایڈیٹر صاحب غلام محمد خاں صاحب ام۔ اے عثمانیہ اور دیگر شرکا کی کوششیں قابل ستایش ہیں۔

ظفر ہفتہ وار ہندستان کا ادب جس میں ہندستان کی صوبجاتی زبانیں بھی شامل ہیں۔ ہندستانی ادب کہلایا جا سکتا ہے مگر مجموعی طور پر ہم ہندستان کی مشترکہ زبان اردو کے ادب کو ہندستانی ادب کا صحیح نام دے سکتے ہیں۔ اور اسی زبان میں مفید لٹریچر پیش کر سکتے ہیں جو تمام ہندستانیوں کیلیے مشترکہ طور پر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

زبان اردو شاہان مغلیہ کے ایما سے عالم وجود میں آئی اور ان کے عہد حکومت کے ختم ہونے تک اس نے عنفوان شباب میں قدم رکھا تھا اور اب ہم اس زبان کا وہ بے پناہ شباب کہیں تو بے جا نہیں جو ہر قلب و جگر کو مستقل طور پر آغوش محبت میں ہوے ہے اس دور شباب میں ہندستان کے ہر صوبے سے متعدد اخبارات اور رسایل زبان کی بارگاہ حسن میں سر نیاز جھکاے نظر آتے ہیں اور ان میں بعض انتہائی کامیاب حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ اسی ماہ حیدرآباد دکن سے ایک ماہنامے نے اس کے گیسو سنوارنے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھاے ہیں۔

"ہندستانی ادب" زیر ادارت جناب غلام محمد خاں ام۔ اے (عثمانیہ) شایع ہوا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہندستان میں ایک ماہنامے کا اضافہ ہوا ہے جسے ہمیں ہر اعتبار سے معیاری کہنا چاہیے موجودہ مکدر فضا میں کسی پرچے کا اجرا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے اس لیے ہم جناب غلام محمد خاں صاحب کی اس جسارت کی قدر کرتے ہوے انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے موجودہ خلفشار میں ایک ایسی معیاری اور کامیاب جسارت کا ثبوت دیا ہے جسکی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہ پرچہ صوری اور معنوی اعتبار سے انتہائی جاذب نظر ہے اور ہمارے اردو ادب میں ایک بہترین ماہنامے کا اضافہ ہے۔ فاضل مدیر نے حسب معیار انتخاب کے ماتحت مضامین پیش کیے ہیں وہ اپنی جگہ اٹل ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آیندہ شمارے کے مضامین سے بھی زیادہ جامع ہونگے۔ چندہ سالانہ للعہ قیمت فی پرچہ ۶ آنے۔ ملنے کا پتہ: منیجر ہندستانی ادب پنچل گوڑا حیدرآباد دکن



کتابیں

شان خدا | خدا کے وجود پر اب تک ہزاروں ہی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔ زیر بحث کتاب بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ مولف عبدالرحمان صاحب سائل مترجم تفسیر جواہر نے یوروپین دہریوں کی اعتراضات کی رد یا خدا کے وجود کے ثبوت میں یورپ ہی کے بعض فلسفیوں، اور سائینسدانوں کے اقوال و استدلات پیش کیے ہیں جن میں سقراط، افلاطون، دیکارٹ، وان لو، دہبوز لیبنز، نیوٹن، والیر، روسو، ہربرٹ اسپنسر اور نتیس قابل ذکر ہیں۔ حجم پونے دو سو صفحے قیمت ایک روپیہ کتابستان پوسٹ بکس ۶۴-۱۳ بمبئی نمبر ۳ سے طلب کی جا سکتی ہے ۔

محمد رسول اللہ | یہ کتاب مشہور انگریز مصنف کارلائیل کی مقبول عام تصنیف "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے اس ترجمے کی کتابی شکل میں اس لیے ضرورت نہیں تھی کہ آج سے چار سال پہلے اعظم خاں صاحب ام ۔ اے (عثمانیہ) نے نہایت بہتر ترجمے کے ساتھ "سرور عالم" کے نام سے اس کو چھپوایا تھا ۔ ترجمہ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں ہے ۔ اگر یہ ترجمہ عبدالرحمان صاحب کی نظر سے گذرتا تو شاید وہ خود بھی اس زحمت کو گوارا نہ فرماتے ۔

کتاب کی قیمت ۸ ؍ ہے کتابستان پوسٹ بکس ۱۳۶۴ بمبئی ۳ سے طلب فرمایے ۔

جواہر العلوم | عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل پروفیسر عربی ۔ اسلامیہ کالج پشاور نے علامہ طنطاوی جوہری مصری کی کتاب "جواہر العلوم" کا ترجمہ کیا ہے جس کو کتابستان پوسٹ بکس ۱۳۶۴ بمبئی نمبر ۳ نے شایع کیا ہے کتاب بڑی تقطیع پر ہے قیمت (عہ)

اس کتاب کے مقدمے میں عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں اور موجودہ دور کے مصنفین میں ۔ ۔ ۔ مصر کے مشہور عالم علامہ طنطاوی جوہری نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس موضوع پر اور بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں ۔ جن میں سب سے زیادہ دلچسپ" آسان اور عام فہم جواہر العلوم ہے، جس میں انھوں نے ایک قصے اور مکالمے کی صورت میں بہت سے قدیم و جدید عجائبات، قدرت کے فواید و مصالح علمی اصول کے مطابق دکھلائے ہیں ۔ پیش نظر کتاب اس رسالے کا با محاورہ اور سلیس ترجمہ ہے جو لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے پڑھنے کے قابل ہے ۔

ہمیں ندوی صاحب کی رائے سے اتفاق ہے ۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب کو بڑی تقطیع پر سوا دو سو صفحے حجم کے ساتھ شایع کرنے کی بجائے چھوٹی سائز کی دو جلدوں میں شایع کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا ۔ موجودہ سائیز اور حجم کی کتاب بچوں کے نصاب میں قطعاً داخل نہیں ہو سکتی ۔ دو جلدوں میں تقسیم کرنے سے یہ فائیدہ ہوتا کہ پہلی جلد ایک جماعت کے نصاب میں اور دوسری دوسری جماعت کے نصاب میں شامل ہو سکتی تھی ۔ اس طرح تسلسل بھی جاری رہتا اور دو سال کے عرصے میں طالب علم پورے علوم سے واقفیت بھی حاصل کر لیتا ۔ اس شکل میں ناشر کا بھی مالی فائیدہ تھا ۔ بہرحال کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے ۔ موجودہ شکل میں پانچویں اور چھٹی جماعتوں کے نصاب میں شریک کیے جانے کے قابل ہے ۔ کتابستان نے مطبوعات کا جو سلسلہ قایم کیا ہے ہم اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اس بارے میں ہمارا یہ مشورہ ہے کہ کسی کتاب کے چھاپنے سے پہلے بعض



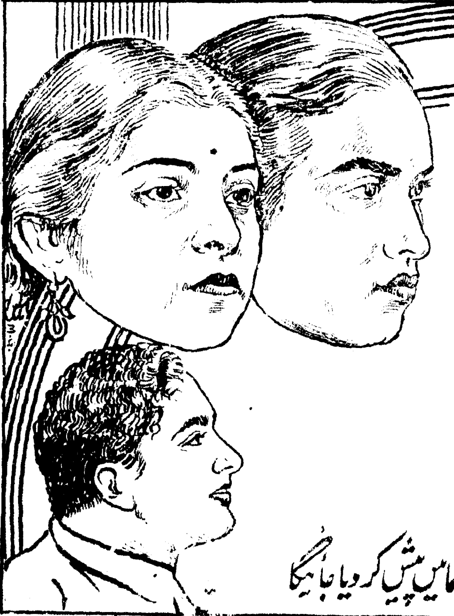
مشہور ادیب سید امتیاز علی صاحب تاج نئی فلم

خاندان

میں ایک مغرب زدہ نوجوان اقبال کا نہایت لطیف پیرایہ میں خاکہ کھینچا ہے۔ جو ہر چیز کو مغرب پرستی کی عینک سے دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہندستان کی ہر چیز مغربی رنگ میں رنگ دی جائے

اس کوشش میں آپ ہزاروں حماقتیں سرزد ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر سنجیدہ سے سنجیدہ انسان بھی ایک مرتبہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آج شب کو نشاط سینما میں دیکھیے۔



سوگند

اس فلم کو تیار کر کے ہیو ہیرز پھر ایک مرتبہ اپنا نہ مٹنے والا نقش بناتی ہے بھارتی فلم ڈاکٹر کی ہیروئن جو اپنی بے ساختہ اداکاری اور سریلی آواز کی بدولت درجہ اول کے اداکاروں کی پہلی صف میں شامل ہوگئی ہے پھر ایک مرتبہ آپ سے خراج تحسین حاصل کرتی ہے

اشت برن بنگال کا مشہور موسیقار سانیال اور روپ لکھانے اس فلم کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔

بہت جلد نمائش کیلیے نشاط سینما میں پیش کر دیا جائیگا







جلد (۲) مہر ۱۳۵۱ف اگست ۱۹۴۲ء نمبر (۱۱)

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

نایب معین امیر جامعہ

ہندستانی ادب کے پڑھنے والے یہہ سنکر خوش ہوں گے کہ ڈاکٹر رضی الدین پروفیسر جامعہ عثمانیہ کو نایب معین امیر جامعہ عثمانیہ کے عہدے پر ترقی دیگئی ہے۔

ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں کے لیے ڈاکٹر رضی الدین کا نام نیا نہیں ہے۔ اس سے پہلے دو مرتبہ نوبل پرائیز اور ڈی۔ ایس سی کے اعزازی طیلسان کے سلسلے میں انہی کالموں میں آپ کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ ہندستانی ادب کے لکھنے والونکی فہرست میں بھی آپ کا شمار رہا ہے۔

ڈاکٹر رضی الدین ٹھیٹ جامعہ عثمانیہ کی پیداوار ہیں۔ شروع سے ام۔ اے تک کی تعلیم جامعہ عثمانیہ ہی میں حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔

ڈاکٹر رضی الدین کا خاص مضمون ریاضی رہا ہے۔ شروع ہی سے انہیں اس مضمون سے دلچسپی رہی۔ اسی میں ترقی کی اور آگے چلکر اسی مضمون کی بدولت نام کمایا، یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء انہیں ریاضی کے نوبل پرائیز کا مستحق قرار دیا گیا۔ دنیا کے اس سب سے بڑے علمی اعزاز کے ملنے کے کچھ ہی عرصہ بعد جامعہ عثمانیہ نے انہیں ڈی۔ ایس سی کا اعزازی طیلسان بخشا۔

اب جب کہ جامعہ نے ایک ایسے بین قومی شہرت رکھنے والے عالم فاضل کو جامعہ کی نیابت سے سرفراز فرمایا ہے تو لازمی طور پر ہمیں یہہ کہنا پڑیگا کہ "حق بحقدار رسید"۔

یہہ خوشی صرف ڈاکٹر رضی الدین ہی کا حصہ نہیں بلکہ جامعہ عثمانیہ کی پوری برادری بھی اس کی حقدار ہے۔ ہماری یہہ تمنا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی ہر کرسی چاہے وہ لکچراری اور ریڈری کی ہو یا پروفیسری کی، جامعہ عثمانیہ ہی کے سپوت نظر آئیں۔

اس بڑے عہدے کے حاصل کر لینے پر ڈاکٹر صاحب کو پھولنا نہ چاہیے بلکہ ان کی حقیقی خوشی کا وقت وہ ہوگا جب کہ وہ اپنے کارناموں اور اسکیموں کو کامیاب ہوتا دیکھ لیں۔ یہہ شبہہ کرنا غلط ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب تو ابتک ایک پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اب یکایک جامعہ کی انتظامی باگ ان کے غیر مانوس ہاتھوں میں دیدیگئی ہے۔ یہہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس لیے کہ ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے یعنی ہر وہ شخص جس کا تقرر کسی خدمت پر ہوتا ہے اس کے کام سے ایک حد تک ناواقف ہی ہوتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھ لیتا ہے۔ خصوصاً ایک اہل اور قابل آدمی تھوڑے ہی عرصے میں اہم سے اہم رموز اور نکات پر قدرت حاصل کر سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک سوال ڈاکٹر صاحب کی انتظامی اہلیت کا نہیں بلکہ طلبا اور ان کے تعلقات کا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو ہمارا سب سے اہم مشورہ یہہ ہے کہ وہ اپنی طالب علمانہ زندگی کو کبھی نہ بھولیں۔ اس زمانے کو ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھیں اور اپنے اس بے لس دور کو ہدایت کی شمع بنائے رہیں تو یقین ہے کہ کبھی بھی وہ سیدھے راستے سے بھٹکنے نہ پائیں گے اور کسی وقت بھی ان کے بڑھتے ہوئے قدم نہ ڈگمگائینگے۔

بلاشبہہ استاد طالب علم کا ترقی پایا ہوا نام ہے، مگر وہ اساتذہ جو اپنی طالب علمانہ حیثیت کو بھلا بیٹھتے ہیں کبھی بہتر استاد یا پروفیسر ثابت نہیں ہو سکتے۔

ہر استاد کا فرض ہے کہ کسی طالب پر سختی کرنے سے پہلے اپنی اس حیثیت پر غور کرلے جب کہ وہ خود بھی اس قسم کی غلطی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ طالب علمی کا زمانہ الھڑپن کی حرکتوں سے بھرا ہوتا ہے۔ اس وقت طالب علم ہر چیز کو ایک تماشا سمجھتا ہے یہہ اس کی سمجھ کا قصور نہیں بلکہ اس کے طالب علمانہ شباب کا فطری نتیجہ ہے۔ ایسے جوان سال بچھیروں کی باگ دوڑ جن ہاتھوں میں ہو ان کا کام ہے کہ روک تھام کریں۔ ہم یہہ نہیں کہتے کہ ہر طالب علم بے قصور ہوا کرتا ہے۔ ان میں اچھے برے سب ہی ہوتے ہیں۔

بروں کے ساتھ بھی اچھا ہی سلوک کرنے کی کوشش کیجاے تو مناسب ہوگا۔ آخر وہ طالب علم ہی ہے کچھ نہ کچھ سمجھ رکھتا ہے، حسن سلوک سے اثر لیکر خود بخود اپنے کیے پر نادم ہوگا اس طرح نتیجہ اچھا ہی نکلیگا۔ مشرقی روایتوں کے مطابق استاد کو ماں باپ کا درجہ دیا گیا ہے اس لحاظ سے بھی طالب علموں کے ساتھ اساتذہ کا سلوک محبت بھرا ہی ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب تجربے کار ہیں اور طالب علمانہ زندگی کے اونچ نیچ سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ یہہ بھی جانتے ہیں کہ جب طالب علم اجتماعی شکل میں کوئی مطالبہ کر بیٹھتے ہیں تو اساتذہ اور خصوصاً صدر ادارہ ان کے مطالبے پر غور کیے بغیر کس بری طرح ان کے جذبات کو کچل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ جو بھی ہوتا ہے اس سے خود ڈاکٹر صاحب خوب واقف ہیں اس لیے ہمیں کسی ایسی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔
ہم ڈاکٹر صاحب پر یہہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ ہر واجبی مطالبے کے قبول کرنے سے ہرگز دریغ نہ کرنا چاہیے اور اگر اتفاقاً کوئی مطالبہ غیر واجبی بھی ہو تو طالب علموں پر مظالم توڑنے کی کوشش نہ کیجاے بلکہ جس طرح ماں باپ اپنی ضدی اور ہٹیلی اولاد کو اس کی غلطی سے واقف کرانے کی محبت بھری کوشش کرتے ہیں اسی طرح طالب علموں کے معنوی ماں باپ کا بھی فرض ہے کہ جہاں تک ہوسکے کسی ان سمجھ اور معصوم طالب علم کی پھلنے پھولنے والی زندگی کی شاخیں کاٹنے کی کوشش نہ کرے۔

ہماری راے میں ایک نایب معین امیر جامعہ کے لیے کسی جامعہ کے بہتر انتظام کے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ طلبا اپنے اساتذہ سے ایسے ہل جل کر رہیں جیسے بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ ورنہ دفتری حسن کارگذاری کے لیے تو اس قدر زیادہ اور قابل عملہ موجود رہتا ہے کہ صدر ادارہ کو شکل ہی سے اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کسی علمی ادارے کی حقیقی کامیابی کا انحصار طلبا کی بہتر تعلیم و تربیت، اچھے نتایج، اساتذہ اور طالب علموں کے خوشگوار تعلقات پر ہوتا ہے۔

اگر طلبا اور اساتذہ میں اختلافات کی رسا کشی ہوتی رہے تو ایسے ادارے اور اس کی باگ تھامنے والے کی کامیابی ظاہر ہے؟
بہر حال اپنے ان ناچیز خیالات کے بعد بہتر اور نیک توقعات کیساتھ ہم عثمانی برادری کے ایک ادنا فرد کی حیثیت سے برادرانہ مشوروں کے گلدستے کے اور اپنی مبارکباد کے قیمتی تحفے کو ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (عثمانیہ) کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، امید کہ ڈاکٹر صاحب اس تحفے کی خوب رکھوالی کرینگے تاکہ برادرانہ مشوروں کے اس گلدستے کی یاد ہمیشہ تازہ رہے اور وقت ضرورت کام آے۔

سر لور پیپر ملز | ہم صرف سنتے تھے اور ہمیں شبہہ ہی شبہہ تھا کہ سر پور کا کارخانہ کاغذ باہر بھیج رہا ہے۔ مگر روزنامہ اخبار "وقت" کا ۲۹ شہریور ۱۳۵۱ف کا اداریہ پڑھنے کے بعد ہمارا یہ شبہہ یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ "وقت" لکھتا ہے "اس سوال پر ہم آیندہ روشنی ڈالیں گے کہ آیا فی الواقعی کاغذ کی کمی ہے سرپور پیپر ملز کا موجودہ طریق کار کیا ہے؟ کتنا کاغذ مہیا کرتی ہے؟ حیدرآباد کی ضروریات کو روک کر اخبارات کی زندگی کو تنگ کرکے بیرونی ضروریات کو کس طرح پورا کیا جاتا ہے"۔

"وقت" کے کہنے کے مطابق تو اخباروں کی زندگی صرف "تنگ" ہوگئی ہے مگر وہ کیا جانے کے ماہوار رسالے تو زندہ دفن کردیے گئے ہیں ان کی چیخ پکار کو سننے والا کوئی نہیں۔ ہم نے حکومت سے بارہا کہا کہ اس مصیبت کے زمانے میں روزانہ اخباروں کی طرح ماہوار رسالوں کو بھی کاغذ رعایت کے ساتھ دیا جانا چاہیے مگر حکومت نے ایک نہ سنی اور یہہ کہہ کر ٹالدیا کہ باب حکومت کے فیصلے کے خلاف کوئی کام نہیں ہوسکتا مگر ہم نے کہا کہ باب حکومت کو توجہ دلائی جاے تو فیصلے پر دوبارہ غور ہوسکتا ہے مگر چونکہ صرف ٹالنے کی غرض سے ہمیں یہہ جواب دیدیا جاتا تھا اسی لیے آج تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔
ہم حکومت سے کھلے لفظوں میں یہہ کہہ چکے ہیں کہ اگر ادبیات ان خدمت گذاروں کی حفاظت اور سرپرستی نہ کیجاے تو خود ملک کو اس سے نقصان پہنچے گا۔
ہم اپنے معاصر "وقت" کی شکایت کو بالکل حق بجانب سمجھتے ہیں اور حکومت سے خواہش کرتے ہیں کہ نہ صرف سرپور کے کاغذ پر بلکہ ملک کے مختلف ذریعوں اور دوکانوں میں جس قدر بھی کاغذ موجود ہو اس پر نگرانی قایم کردیجاے اور سختی کے ساتھ ممانعت کا حکم جاری ہو کہ کسی صورت میں بھی ایک تختہ کاغذ ملک سے باہر نہ جانے پاے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس انتظام کے بعد یہاں کے اخباروں اور رسالوں کو پھر کبھی کاغذ کے نہ ملنے یا کمی کی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

سلسلہ شیکسپیر اور اس کے ڈرامے

ڈرامہ نویسی کے اس ابتدائی دور میں شیکسپیر نے دلکش اور تفریحی طربیہ ڈراموں کا ایک اور سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو زیبر لاسٹ" "دی کامیڈی آف اررس" "دی ٹوجنٹلمن آف ویرونا" "اے مڈسمرس نائیٹ ڈریم" یہ سب اسی دور کی یادگار ہیں اور سب کے سب کم و بیش جان للی سے متاثر ہیں۔ ایک حزنیہ "رومیو اینڈ جولیٹ" بھی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔

(۳)

اس تمام عرصے میں شیکسپیر کی شہرت ایک شاعر، ڈرامہ نویس اور اداکار کی حیثیت سے رفتہ رفتہ بڑھتی ہی گئی۔ اس دوران میں اسے دربار شاہی میں بھی رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۵۹۲ء کے کرسمس میں اس نے دو مرتبہ ملکہ الزبتھ کے آگے کام کیا۔ قسمت کی یاوری سے ارل آف ساوتھ ہیمپٹن جیسا امیر اس کا مربی بن گیا۔ یہ ارل الزبتھ کے دربار کو چار چاند لگانے والے نوخیز اور جوانمرد امیروں میں سب سے زیادہ پرشکوہ تھا۔ ساوتھ ہامپٹن ادب کا بھی بڑا زبردست مربی تھا اور شیکسپیر کے ساتھ تو اس نے نہ صرف نہایت اچھا سلوک کیا بلکہ اس سے وہ ایک سچے دوست کا سا برتاؤ کرتا تھا۔ ادھر ہمارا شاعر اپنے نوجوان مربی سے ایک پرخلوص اور گرم جوشانہ وابستگی محسوس کرتا تھا۔ اس نے اپنی دو نظمیں "وینس اینڈ اڈونس" اور "لیوکریس" جو علی الترتیب سنہ ۱۵۹۳ء اور سنہ ۱۵۹۵ء میں شایع ہوئیں، ساوتھ ہیمپٹن کے نام معنون کی ہیں۔ یہ بات بھی اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ حسین دوست جس سے شیکسپیر اپنے سانیٹوں میں محبت کا اظہار کرتا ہے ساوتھ ہیمپٹن ہی ہے۔

مسٹر فی لی نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ سنہ ۱۵۹۹ء کے بعد کے سالوں میں شیکسپیر کی آمدنی ایک سو تیس پونڈ یعنے موجودہ زر کے ایک ہزار چالیس پونڈ کے مساوی تھی۔ ان آرام دہ حالات کے تحت اب وہ اسٹراڈفورڈ کو زیادہ آنے جانے لگا تا اور اس میں قیام کی مدت بھی طویل ہو گئی تھی۔ یہاں وہ اپنے ان مقاصد کو روبہ عمل لانے میں ابتدائی قدم اٹھانے لگا جو سال ہا سال سے اس کے پیش نظر تھے۔ جان شیکسپیر اب اس وقت سے بھی زیادہ مالی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا جب کے اس کے بیٹے نے اسٹراڈفورڈ چھوڑا تھا۔ لندن کے دوران قیام میں شیکسپیر نے اتنی دولت جمع کر لی تھی جو اس کے والدین اور اس کی بیوی اور بچوں کے لیے بہت کافی تھی۔

سنہ ۱۵۹۶ء میں شیکسپیر کا اکلوتا بیٹا ہیمنٹ اسے داغ مفارقت دے گیا۔ اس سے شیکسپیر کے دل پر نہ صرف سخت چوٹ لگی بلکہ اپنے خاندان کی بنیاد رکھنے کی جو تمنائیں اس کے دل میں عرصے سے جاگزیں تھیں وہ بھی برباد ہو گئیں۔ بعض لوگوں کا قیاس ہے کنگ جان کے قصے میں شہزادہ آرتھر کا کردار اسی لڑکے کا چربہ ہے جس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تاہم اس صدمے کے باوجود شیکسپیر نے اپنے ارادے کو مضبوط بنائے رکھا۔ سنہ ۱۵۹۷ء میں اس نے "نیو پیلیس" نامی ایک مکان ساٹھ پونڈ یا موجودہ زر کے لحاظ سے چار سو اسی پونڈ میں خریدا۔ یہ مکان اسٹراڈفورڈ کا سب سے بڑا اور سب سے اہم رہائشی مکان تھا۔ جس وقت شیکسپیر نے اس کو خریدا ہے، اس وقت تقریباً کھنڈر بن چکا تھا۔ اس لیے چند سالوں تک شیکسپیر اس میں مقیم نہ ہو سکا۔ خریدتے ہی اس نے مکان کی تعمیر اور مرمت شروع کر دی، اس کو آراستہ کیا، نئے کوٹھے بنوائے اور اپنی جائیداد کو وسیع کرنے کے لیے اس سے متصلہ زمین خرید لی۔ اس کے بعد سے وہ سال کا بیشتر حصہ اپنے آبائی وطن ہی میں بسر کرنے لگا۔

اب شیکسپیر ابتدائی تجرباتی منازل سے گذر چکا تھا۔ وہ عہد ختم ہو چکا تھا جس میں وہ اپنا فن دوسرے ڈرامہ نویسوں اور تھیٹر کے حقیقی کاروبار کے ذریعے سیکھ رہا تھا۔ ۱۵۹۸ء میں تاریخی ڈراموں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آیندہ دو سالوں میں شیکسپیر نے اپنے تین مکمل طربیے "مچ اڈو اباوٹ نتھنگ" "آزیو لائیک اٹ" اور "ٹویلتھ نائیٹ" لکھے۔ ان تینوں میں سے کسی ایک ایسے ڈرامے کا انتخاب مشکل ہے جس کو باقی دو سے زیادہ توجہ کا مستحق قرار دیا جا سکے۔ تاہم غالباً "آزیو لائیک اٹ" دوسرے ڈراموں کی بہ نسبت شیکسپیر کی خصوصیات اور اس کی طرز ادا کو زیادہ واضح طور پر پیش کرتا ہے اس لیے ہم یہاں اس پر مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۵۹۰ء میں ٹامس لاج نے "روز لینڈ، ایوفس کا زرین ورثہ" نامی ایک ناول شایع کیا تھا۔ روز لینڈ کا قصہ ایک حد تک کسی قدیم قصے پر مبنی تھا۔ یہ باورچی کی زبان گیامن کا قصہ ہے جو غلطی سے چاسر کی طرف سے منسوب کیا جاتا ہے اور قصص کنٹربری کے اڈیشنوں میں شامل ہے شیکسپیر نے اپنے ڈرامے کی بنیاد اس ناول پر رکھی ہے۔ مگر اس نے کئی تبدیلیاں کی ہیں، کئی نئے کردار شامل کر دیے ہیں اور قدیم قصے کی روح اور لہجے کو بلکل بدل دیا ہے۔ یہ شیکسپیر کی دلکش طربیہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ "لوز لیبر لاسٹ" میں ہم اپنے آپ کو بادشاہ نویر کے باغ میں پاتے ہیں۔ شکار کی شاہی جماعت کو دیکھتے ہیں اور جمیز کے درخت کے فرحت بخش سایے تلے آرام کرتے ہیں لیکن جن لوگوں سے ہم ملتے ہیں وہ سب کے سب دربار سے تعلق رکھتے ہیں اور سب یوفس کی مصنوعی زبان بولتے ہیں۔ اس میں ذکاوت ایسی بجلیاں گراتی ہے کہ ہم اوپر نظر اٹھا کر سورج کو دیکھ نہیں سکتے۔ "مڈسمر نائیٹ ڈریم" میں ہم گرما کی ایک رات ایک سحر زدہ جنگل میں بسر کرتے ہیں۔ یہاں پرم روز کے بستر اور جنگلی صعتر کے ڈھیر جادو کے چاند کی نرگی آمیز چاندنی میں چمکتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ماحول کے انتہائی دلکش ہونے کے باوجود تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دن کی روشنی میں بھی ہم اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ کبھی تلاش نہ کر پائیں گے۔ "آزیو لائیک اٹ" میں ہم آرڈن کے دلفریب جنگل میں ہیں جس سے شیکسپیر نہ صرف خوب واقف تھا بلکہ اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ آزاد ہوائیں ہم پر سے گذرتی ہیں جو اگرچہ بعض وقت تکلیف دہ اور کانٹوں کی طرح چبھنے والی ہوتی ہیں لیکن ہمیشہ صحت بخش۔ ہر نیم روز اپنی پوری تاب ناکی کے ساتھ ضیا پاشیاں کرتا ہے۔ جنگل کی زندگی کی عام صدائیں ہمارے کانوں میں گونجتی ہیں۔ استاد سر والٹر رالے نے اپنے ایک پر مغز مقالے میں بتایا ہے کہ یہ اثرات کتنے بہترین طریقے پر پیدا کیے گئے ہیں۔ "ڈرامے کا غایر مطالعہ ایک عجیب و غریب نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ کسی چڑیا یا کیڑے پتنگے یا پھول کا نام تک نہیں لیا گیا ہے۔ "برگ و گل" کے الفاظ تک بھی ہمیں کہیں نہیں ملتے۔ جنگل کے درختوں میں شاہ بلوط، ہاتھارن کھجور کے پیڑ، اور زیتون کے درخت شامل ہیں۔ جانوروں میں ہرن، ایک شیرنی اور ایک سبز زہریلا سانپ ہے۔ موسم کا بھی یقین نہیں کیا جا سکتا جو غالباً سرما کا موسم ہے۔ ہم صرف کانٹوں کی طرح چبھنے والی سردی اور سرما کی ٹھنڈی ہوا کا ذکر سنتے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں غلط ہیں" جیسا کہ روز لینڈ کہتی ہے۔ اس ڈرامائی حقیقت کو ان ناقدوں نے ظاہر کیا ہے جو "پرندوں کے نغموں سے معمور ہرے بھرے جنگل کی دلنوازی خاموشی" کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ باغیوں کا جنگل نہیں جس میں اسٹیج کی چند معمولی ضروریات کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنا وقت ایک دل کش و دلربا جنت میں بڑے مزے اور خوشی کے ساتھ گزارتے ہیں اور ان کے دلوں میں موسم بہار کی ساری خوش فعلیاں سمائی ہوئی ہیں۔ اس طرح وہ نرم سبز گھاس کا ذکر کیے بغیر اپنا مطلب حاصل کر لیتا ہے جسے تھیٹر میں پردوں کے ذریعہ پیش کرنا پڑتا تھا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ شیکسپیر کے زمانے میں مناظر کا اثر پیدا کرنے کے لیے کوئی چیز استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ سر فلپ سڈنی کا بیان ہے" اداکاروں کو ہمیشہ یہ کہنا پڑتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں ورنہ قصہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر تین نازنینیں پھول چننے کے لیے نکلی ہیں تو آپ کو ماننا پڑتا ہے کہ اسٹیج ایک باغ ہے۔ اسی مقام

پر ہم رفتہ رفتہ کسی جہاز کے تباہ ہونے کی خبر سنتے ہیں اور اگر ہم یہ تسلیم نہ کریں کہ اسٹیج ایک بڑی چٹان ہے تو یہ ہماری غلطی ہوگی......

اسی دوران میں دو فوجیں داخل ہوتی ہیں، کل کائنات جس سے فوجوں کو پیش کیا جاتا ہے چار تلواریں اور بس اتنے ہی سپر ہوتے ہیں اور پھر اس کے بعد میدان کارزار میں گھمسان کا رن پڑتا ہے۔"

اس ڈرامے کی ہیروین روزلینڈ کے کردار میں وہ تمام خوبیاں اور دل آویزیاں موجود ہیں جس کی وجہ سے شیکسپیر کے کارنامے زندہ جاوید بن گئے ہیں۔ "لوز لیبر لاسٹ" کی روزلینڈ کی ہم نام ہیروین اور "مچ اڈو" کی بیٹرس کی طرح وہ ایک خوش مزاج اور شوخ و شنگ نازنین ہے۔ انہیں کی طرح وہ بھی بڑی طرار اور لسان ہے۔ اور فقرے بازی اور نوک جھونک میں کسی حریف سے نہیں دبتی۔ لیکن وہ دونوں کے برابر طباع نہیں بلکہ قدرے الھڑ اور بھولی بھالی ہے۔ وہ ان دونوں سے زیادہ کم عمر ہے۔ اور نسائیت بھی اس میں دونوں سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی اس کے بچپن کے دن گئے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیکسپیر نے اپنی نوخیز ہیروئنوں کے کردار کا مطالعہ اپنی بیٹی جوڈتھ کی ذات میں کیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ ۱۵۹۹ء میں جب شیکسپیر پہلی دفعہ اسٹراٹفورڈ میں بہت دنوں تک ٹھہرا تھا تو اس وقت جوڈتھ کی عمر سولہ سال کے لگ بھگ تھی۔ ایک نوخیز، صحت مند، حسین دہاتی لڑکی جس نے اپنے باپ سے اس کی ذکاوت اور ماں کی خوش روئی ورثے میں پائی تھی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اس بیٹی کی دلربا اداؤں نے شیکسپیر کا دل موہ لیا ہو اور جوڈتھ کو بھی اپنے باپ کی شخصیت میں ایک دوست اور ساتھی مل گیا ہو۔ اس لحاظ سے یہ ہو سکتا ہے کہ روزلینڈ جو ایک جلاوطن ڈیوک کی بیٹی ہے اور اپنے باپ کو فرانس کے جنگلوں میں ڈھونڈتی پھرتی ہے دراصل ولیم شیکسپیر کی بیٹی جوڈتھ ہی کا چربہ ہو جس نے ایک انگریزی جنگل میں دریائے ایون کے کنارے اپنے باپ کو یہ بتایا تھا کہ ایک ہیروین لڑکی کو کتنی دلربا، حسین اور محبت آگیں ہونا چاہیے۔

"ایز یو لائیک اٹ" میں اس امکان سے اور بھی دلچسپی بڑھ جاتی ہے کہ جب پہلی بار یہ ڈرامہ کھیلا گیا تو خود شیکسپیر نے اس میں آدم کا پارٹ لیا تھا۔ شیکسپیر کا ایک ابتدائی سوانح نگار کہتا ہے کہ شاعر کا ایک چھوٹا بھائی اپنے بڑھاپے میں بیان کرتا تھا کہ وہ اکثر لندن آکر اپنے بھائی کو ڈراموں میں کام کرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اس سے مزید تفصیل چاہی گئی اور اس پر متعدد سوالات کیے گئے۔ لیکن اس عمر میں جو کچھ اسے اپنے بھائی ول کے متعلق یاد تھا وہ بہت دھندلا اور گڈمڈ تھا۔ اس کے سوا اسے اور کچھ یاد نہ تھا کہ اس نے ایک دفعہ اپنے لکھے ہوئے طربیوں میں سے کسی میں کام کیا تھا۔ اس طربیے میں وہ ایک کمزور اور ناتوان بوڑھا نظر آتا تھا۔ اس کے ایک بڑی داڑھی لگی ہوئی تھی۔ اتنا کمزور اور بے حال نظر آتا تھا کہ چلنے کی بھی اس میں سکت نہ تھی۔ ایک شخص نے اس کو سہارا دیا اس کو گود میں اٹھا کر ایک دسترخوان تک لے گیا اور کچھ لوگوں کے درمیان اسے بٹھا دیا۔ ان لوگوں میں بعض کھانا کھا رہے تھے اور ایک نے گانا سنایا تھا۔

"مرچنٹ آف وینس"، "آل از ویل اینڈس ویل"، "میئر فار میئر"، "ٹرائلس اینڈ کرسیڈا"، "جولیس سیزر"، یہ سب ڈرامے اسی دور کی یادگار ہیں۔

(۴)

تقریباً سولویں صدی کے اختتام پر شیکسپیر میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی اس وقت تک وہ اپنی ابتدائی تمنائیں پوری کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے آبائی وطن میں اس کی کافی شہرت ہو چکی تھی اور وہ ایک صاحب حیثیت آدمی بن چکا تھا۔ وہ برباد شدہ قصاب کا کھلنڈرا اور نکما بیٹا ول شیکسپیر نہیں رہا تھا بلکہ اب وہ دولت مند مسٹر ولیم شیکسپیر نیو پیالیس کا مالک ایک شریف آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اسٹراٹفورڈ کی شہرت کو لندن سے بھی دور دراز مقامات تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے اپنے خاندان کی عزت بحال کر دی تھی اور اسے نہایت آرام و آسائش کے ساتھ اپنے خریدے ہوئے پرتکلف مکان میں رکھا

تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے باپ کے آخری دن اطمینان اور آرام میں بسر ہوئے اور اس نے سنہ ۱۶۰۱ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنی ماں کے لیے ہنلے اسٹریٹ میں الگ مکان خریدا تھا۔ اسی مکان میں سنہ ۱۶۰۸ میں اطمینان کے ساتھ اس نے سرائے فانی سے کوچ کیا۔

لندن میں شیکسپیر کی تعریف بھی ہوتی تھی اور اس کے ساتھ عزت بھی۔ وہ ایک مقبول اداکار اور ایک اہم ڈرامہ نویس بن چکا تھا۔ نیا گلوب تھیٹر دریا کے کنارے ساوتھ وارک پر تعمیر ہوا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ اس کی نگرانی میں تھا اور اس سے شیکسپیر کو کافی نفع ہوتا تھا۔ ملکہ الزبتھ کی طرح شاہ جیمس بھی اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اب بظاہر اس کی زندگی فراغت اطمینان اور آرام میں بسر ہو رہی تھی۔ اس کے ملنے والوں میں ہر قسم کے اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "مارمیڈ ٹاورن" واقع براڈ اسٹریٹ میں سروالٹر رالے نے ایک طرح کی ادبی انجمن قایم کی تھی یہاں جو قابل اور سمجھ دار لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا ان میں شیکسپیر کو ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

لیکن اس نئی صدی کے ابتدائی سالوں میں شیکسپیر نے جو ڈرامے لکھے ہیں ان کا جایزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فارغ البالی کے ساتھ ساتھ وہ ساری مسرت انگیز ضیا پاشیاں جو شیکسپیر کے اور ڈراموں کی جان ہیں، سب غایب ہو چکی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر کے دل و دماغ پر سیاہ اور گہرے بادل امنڈ آئے ہیں۔ یہ وہ بادل ہیں جو اس کی جہارت، قابلیت اور بدیع الخیالی کو تاریک بناتے ہیں، کیونکہ اس کی بعض سب سے زیادہ معرکۃ الآرا تمثیلیں اسی دور یاس و حرماں میں لکھی گئی ہیں۔ یہ وہ بادل ہیں جو کچھ عرصے کے لیے تابناک جنت اور ان تمام سادہ، حسین اور سرور آگیں چیزوں کو ساء کی نظر سے اوجھل کر دیتے ہیں، جن سے وہ پہلے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ یہ دنیا کو تاریک، اذیت دہ اور حسرتناک مقام بنا دیتے جہاں انسان ایک جبار و قہار خدا کی ظالمانہ اور درک سے فہم مرضی کے مطابق آنکھیں بند کیے چلتا ہے۔ شاید اس زمانے میں شیکسپیر پر کوئی ایسا صدمہ گزرا ہو جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ یا شاید یہ تبدیلی محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ اس جیسی طبیعت کے آدمی کو فطرت انسانی کے تمام عمیق اور تاریک ترین گوشوں کی بھی سیر کرنی ضروری تھی۔ اس قسم کے عمیق مسایل پر سوچنے والے مرد اور عورت کو زندگی کے راستے میں موانعات آتے ہیں شیکسپیر اگر ان مسایل کا کوئی حل پیش نہ کر سکا تو ان پر غور و فکر ضرور کیا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو، وہ تمام ڈرامے جو سنہ ۱۶۰۲ اور سنہ ۱۶۰۸ کے دوران میں لکھے گئے ہیں ان میں بدی کی قوت اور گناہ کی بے پناہ تاریک گہرائیوں اور الم نصیبیوں کو بڑھتی ہوئی شدت اور تلخی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بدی اور گناہ کی بے پناہ گہرائیاں اور الم نصیبیاں وہ ہیں جن کی طرف مجبور و معذور انسان بالکل بے خیال اور اندھا دھند بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اس کے چار زبردست حزنیے — ہیملٹ، اوتھیلو، کنگ لیر، اور میکبتھ — سنہ ۱۶۰۲ء اور سنہ ۱۶۰۶ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ اس دور میں شیکسپیر کے دل میں جو خیالات ہجوم کرتے تھے ان کو یہ تمثیلیں انتہائی وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ مثلاً کنگ لیر میں ایک ایسے عمیق اور دل توڑ دینے والے درد و غم کو مجسم کر دکھایا گیا ہے کہ جذبات سے خالی ہو کر اس کا تصور بھی کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ڈاکٹر جانسن ان لوگوں میں تھا جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس ڈرامے کو ایک سے زیادہ مرتبہ لکھنے یا پڑھنے کے خیال سے وہ خوف زدہ ہو کر تھرا اٹھتے ہیں۔ خیال کیجیے اس غریب دیوانے بادشاہ کی مصیبتوں نے ان لوگوں پر کتنا گہرا اور اندوہناک اثر کیا ہوگا۔ قصہ کی بنیاد جس پر شیکسپیر اپنے سب سے زیادہ الم ناک حزنیے کی عمارت کھڑا کرتا ہے، مطالعے کے لیے بڑی دلچسپ چیز ہے۔ اس میں کسی خطرناک قومی عداوت یا کسی ہولناک جنگ کا ذکر یا کوئی پیچیدہ پلاٹ نہیں۔ فطری انسانی رشتوں کی شکست و ریخت، اور فطری انسانی فرایض کی بجا آوری سے انکار — انہیں معمولی چیزوں سے یہ زبردست حزنیہ تیار ہوتا ہے۔

تاہم شیکسپیر نے یہاں بھی فطرت انسانی کا دوسرا پہلو نظر انداز

نہیں ہونے دیا ہے۔ اگر ایک طرف وہ اس حقیقت کو محسوس کرا کے خوف دلاتا ہے کہ والدین کے حقوق سے انتہائی غفلت برتنے سے ریگان اور گونرل جیسی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں تو دوسری طرف وہ یہ بتا کر مطمئن کر دیتا ہے کہ ایک چاہنے والی اطاعت شعار بیٹی کی خدمت گزاری ایک زبردست ہیروین پیدا کر سکتی ہے۔ یہ بادل بہت گہرے اور سیاہ تھے۔ لیکن شیکسپیر نے اس حقیقت سے کبھی انحراف نہیں کیا کہ ان کے پیچھے آسمان پر ایک تابناک سورج بھی موجود ہے۔ ان بادلوں میں سے بہت جلد یہ آفتاب چمکا اور شاعر کے تاریک دن شاندار طریقے پر انجام کو پہنچے۔

شیکسپیر کے آخری ایام زیادہ تر اسٹراٹ فورڈ ہی میں بسر ہوئے۔ اس کی بڑی بیٹی سوسانا نے ۱۶۰۷ء میں جان ہال نامی ایک مشہور طبیب سے شادی کر لی تھی اور اب گھر میں صرف ایک ہی بیٹی جوڈتھ باقی رہ گئی تھی۔ تنہائی اور خانہ نشینی کے ان دنوں میں لندن سے شیکسپیر کے دوست آ آ کر اس سے مل کر جایا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں رچرڈ بربیج، ہیمن گے اور کان ڈل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رچرڈ بربیج شیکسپیر کے تقریباً تمام المیہ ڈراموں میں ہیرو کا پارٹ ادا کرتا تھا۔ کان ڈل اور ہیمن گے اور بھی تھے جنہوں نے شیکسپیر کی وفات کے بعد اس کی تصانیف کا فولیو اڈیشن مرتب کیا تھا۔ بن جانسن اور ڈریٹن، یہ دونوں شعرا کم سے کم ایک بار تو ضرور اس سے ملنے آئے تھے۔ اطمینان اور خانہ نشینی کی اس زندگی میں شیکسپیر کے دل میں اخلاقی مسایل کا طوفان اٹھنا بند ہو گیا۔ وہ اب تشکک اور مایوسی کے دور سے گزر چکا تھا۔ اس نے مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ اذیت کے خوف سے ڈر کر بزدلی سے وہ کبھی ادھر سے ادھر بھاگتا نہیں پھرا۔ یا ان ناخوش گوار مسایل کا جواب دینے کے لیے کسی مناسب وقت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا۔ اس نے جہد مسلسل کے ذریعے امن و سکون حاصل کیا تھا۔

ان آخری سالوں میں اس نے تین ڈرامے "دی ونٹرس ٹیل" "سمبلین" اور "دی ٹیمپسٹ" — اور لکھے۔ ان کو کسی خاص نوع میں رکھنا دشوار ہے اس حیثیت سے یہ طربیے ہیں کہ ان کا انجام بخیر ہے۔ لیکن طربیے کی مسرور کن روح ان میں پائی نہیں جاتی ان میں ایک عجیب و غریب قسم کی دلکشی ہے۔ یہ دلکشی ان سے گرمیٔ حیات کا جزو علحدہ کیے بغیر ان کو ایک نئی دنیا میں تبدیل کر دیتی اور ان میں ایک "اثری" کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ان ڈراموں کو "رومانس" کا لقب دیا گیا ہے تا کہ ان میں اور ابتدائی طربیوں میں فرق کیا جا سکے۔

رومانوں اور طربیوں کا فرق ایک کی ہیروین کا دوسرے کی ہیروین سے مقابلہ و موازنہ کرنے سے واضح ہو جائے گا۔ پرڈیٹا، "اموجن" اور "میرنڈا" ایک الگ شان رکھتی ہیں۔ ان میں نہ وہ بذلہ سنجی ہے اور نہ وہ طباعی۔ ان میں وہ دلربا ادائیں اور نزاکتیں نہیں ہیں ان کی ہر ہر حرکت اور ہر ہر لفظ سے ان کے اعلیٰ کردار کا حسن اور طینت کی خوبی بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ ایک ہیروین کی حیثیت سے جوڈتھ اپنے باپ کے لیے اب بھی ایک نمونے کا کام دے رہی تھی۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی میں دلربائی اور دلکشی کے علاوہ اور بھی کچھ باتیں پائی جاتی ہیں اسی کی ذات میں شیکسپیر نے نسایت اور کنوارپن کا احترام سیکھا تھا اور اسی کو محترم بنانے میں اس نے اپنی ساری قوت اختراع صرف کر دی تھی۔

ہمارا خیال ہے کہ شیکسپیر کا لکھا ہوا آخری ڈرامہ "ٹیمپسٹ" ہے اور اس میں وہ اپنے تمام پچھلے ڈراموں سے بازی لے گیا ہے۔ راسنے اپریل ور اصل "مڈسمرس نائیٹ ڈریم" کا ایک ہے جو سحر زدہ جزیرہ کی دلکش فضا میں اور زیادہ تابناک اور اثری ہو گیا ہے۔ پورا قصہ ایک ایسے جزیرے کی مانند ہے جو ہوا کی دلربا اور میٹھی لوریوں سے معمور ہے جو مسرور کرتی ہیں۔ لیکن مغموم بنانا نہیں جانتیں۔ پراسپرو کے کردار میں ہمیں خود مصنف کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جب ہم ان سطروں کو پڑھتے ہیں تو یہ خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خود شیکسپیر نے اپنے کام کے ختم ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

میں اپنا عصا توڑ دوں گا اور زمین کی گہرائیوں میں
اس کو دفن کر دوں گا، عمق پیمانے بھی کبھی اتنی گہرائی
طے نہیں کی ہوگی جتنی گہرائی میں میں اپنی کتاب غرق
کر دوں گا"۔

یہ اس کا آخری پیغام تھا، اگرچہ اس کے بعد وہ اور چھ سال
سال تک جیتا رہا لیکن پھر کبھی قلم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء
کی صبح کو اس نے ۵۲ سال کی عمر میں اس سرائے فانی سے کوچ کیا
اور اسٹراڈفورڈ کے کلیسائی قبرستان میں اس کا کالبد خاکی سپرد
خاک کیا گیا۔

سید مبارز الدین رفعت بی۔ اے (عثمانیہ)

غزل

محبت آج تک منجملہ آلام ہے ساقی
تکلف برطرف تجھ پر پڑا الزام ہے ساقی

سنا ہے اضطراب غم سکوں انجام ہے ساقی
مگر تو بہ! سکوں تو بے حسی کا نام ہے ساقی

بھلا مستی میں کسکو ہوش ہے آغاز مستی کا
ہماری داستاں انجام ہی انجام ہے ساقی

حجاب در سے ٹکرا کر نگاہیں رک ہی جاتی ہیں
جنوں اپنی اداؤں میں ابھی کچھ خام ہے ساقی

ابھی لغزشوں میں رنگ ہے کچھ ہوشیاری کا
محبت کو ابھی اندیشۂ انجام ہے ساقی

ہمیں طوفاں کی موجوں میں بھی ساحل یاد آتا ہے
ہمارا ذوق بربادی ابھی کچھ خام ہے ساقی

کرم آمادہ وہ نظریں سکوں دشمن حزیں کا دل
یہ بے چارہ ابھی سے لرزہ براندام ہے ساقی

شعیب حزیں ۔ بی ۔ اے (عثمانیہ)

غزل

وفور رنج و غم میں اشک افشانی نہیں جاتی
وہ دریا دل ہیں یہ چشمے کہ طغیانی نہیں جاتی

جنوں کی کار فرمائی سمجھتی ہے مآل غم
مگر غنچوں کی ابتک چاک دامانی نہیں جاتی

نہ جانے کون سا ہے نقش باقی ذہن فطرت میں
جو اس سعی مسلسل کی فراوانی نہیں جاتی

مثال آئینہ حیراں ہے چشم تماشائی
مگر فطرت کی پیہم جلوہ سامانی نہیں جاتی

محبت کی خلش دل کے لیے بھی اک معمہ ہے
کہ یہ محسوس تو ہوتی ہے پہچانی نہیں جاتی

نگاہ دوربیں دیکھ یہ فطرت نے غضب ڈھایا
خزاں میں بھی جنوں کی چاک دامانی نہیں جاتی

آغا سرخوش قزلباش دہلوی

عصر نو

یہ عصر کہ ہے تارک امین براہیم
ہر لحظہ بناتا ہے جہاں میں نئے معبود

ظلمت میں ہیں اس کی شب آذر کے کرشمے
ہے اس کی تجلی میں نہاں آتش نمرود

اس دور کا آدم بھی ہے باطل کا پرستار
ابتک ہے شکم اس کی تگ و تاز کا مقصود

آفاق سیہ پوش ہیں ظلمت کے اثر سے
ہر ذرہ خاکی کی نوا ہے شرر آلود

ظاہر میں محبت ہے حقیقت میں فسوں ہے
ایاز سے سجدوں کا طلبگار ہے محمود

افسردہ و غمگیں ہے حیات ابھی جہاں میں
جاری ہے لہو پیکر ایام میں بے سود

وہ بندہ کہ ہو جس کا نفس صور سرافیل
یا رب تری دنیا میں وہ ہے بھی کہیں موجود

فضل حسین کیف اسرائیلی

عورت کی تخلیق

سرزمین قاف پر پھیلی ہوئی تھی چاندنی
اٹھ رہی تھیں سینۂ دریا سے موجیں نور کی

کرۂ ارضی تھا موجودات سے نا آشنا
تھی مذاقِ آفرینش کی ابھی تک ابتدا

حسنِ فطرت نے کے انگڑائی ابھی جاگا نہ تھا
نور سے لبریز دشت وادیٔ سینا نہ تھا

لالۂ خود رو سے تھی رنگیں بیاضِ کائنات
دامنِ فطرت میں آسودہ تھے آثارِ حیات

کرۂ ارضی تھا سراپا بہارِ اندر بہار
عرصۂ ہستی میں تھے ناپید لیکن جاندار

حسن کو فطرت نے سانچے میں ابھی ڈھالا نہ تھا
کوئی فطرت کے مناظر دیکھنے والا نہ تھا

اک فرشتہ دم بخود دریا کنارے تھا کھڑا
دلکشا قدرت کے نظاروں میں کچھ کھویا ہوا

ناگہاں چلنے لگی فردوس کی ٹھنڈی ہوا
یک بیک جوشِ تموج سے دریا اٹھا

پھینک دیں طوفاں کی لہروں نے زمیں پر بالیاں
تھا فرشتہ دم بخود انگشت حیرت در دہاں

ذہن میں نقشہ سا اک انگڑائیاں لینے لگا
دل میں ذوقِ آفرینش چٹکیاں لینے لگا

آب و گل کے ربط سے پیدا کیا اک خمیر
اور مٹی سے کیا تیار عورت کا شریر

ایک جا خوشبو کی لپٹوں کو فرشتے نے کیا
خاک کے تودے کا دامن نکہتوں سے بھر دیا

موتیوں کی آب سے دیدۂ زمین کو بھر دیا
[illegible] جلوۂ نمکین کو رنگیں کر دیا

نیلوفر کی نرم و نازک پتیاں ابرو بنیں
سنبل و ریحان و نسرین رونقِ گیسو بنیں

حسن کو سانچے میں ڈھالا اور موزوں کر دیا
صورتِ شفاف میں یکتائیت کو بھر دیا

جب فرشتہ کام سے تخلیق کے فارغ ہوا
ٹکٹکی باندھے رہے کچھ دیر تک دیکھا کیا

کچھ کمی محسوس کی ڈالی جو تنقیدی نظر
کیمیا میں رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر

وہ فرشتہ دیر تک اس بات کو سوچا کیا
گاہے گاہے چودھویں کے چاند کو دیکھا کیا

دفعتاً اک بات ایسی ذہن میں پیدا ہوئی
پھر نظر آنے لگی چہرے پہ رنگِ تازگی

چاند کی پرنور کرنوں کو اکٹھا کر لیا
دفعتاً سارے زمانے میں اندھیرا چھا گیا

چاندنی کے نور کو آنکھوں میں اس کی بھر دیا
روح پھونکی نامکمل کو مکمل کر دیا

وہ نظر آتی ہے اکثر خوبصورت رات کو
صانعِ قدرت نے کی تخلیق عورت رات کو

صابر مٹھیالوی

غزل

احساسِ غم بقدرِ محبت کہاں نہیں ۔ مرے جہانِ شوق میں گو آسماں نہیں
سرگرمِ رقص ہر رگ و پے ہے خوشا نصیب ۔ کیونکر بتا دوں درد کہاں ہے کہاں نہیں
مری نگاہِ یاس کے تیور نہ دیکھیے ۔ دل آپ کا ہے آپ سے وہ بدگماں نہیں
دیکھے تو کوئی جراتِ عشق و وفا کا رنگ ۔ دل الجھ رہا ہے اور مرے لب پہ فغاں نہیں

ہر دم ہے دل میں اک خلش دردِ بے پناہ
عرشی وہ مرے حال پہ کیا مہرباں نہیں

عرشی

ٹھنڈی چتا

اکبری عہد کا ایک تاریخی رومان

دو سو مغل سواروں کا رسالہ نہایت سرعت کے ساتھ راجپوتانے کی سرحد سے گذر رہا تھا۔ سواروں نیز گھوڑوں کا گرد آلود ہونا اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ وہ دور سے نہیں آ رہے ہیں تاہم اسلحہ اور فوجی لباس کی تکمیل اور رفتار کا جوش ظاہر کرتا تھا کہ ان کا مقصد کسی زبردست جنگی اقدام میں شرکت کرنا ہے۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی ارغوانی کرنیں روشن ہتھیاروں اور مرصع فوجی لباس کی چمک کو دوبالا کر رہی تھیں، اسلحہ کی کڑک، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ٹاپوں کی آواز اور گاہے گاہے بات چیت کی گونج اردگرد کے ماحول پر سکوت شب کے تسلط کو دبا رہی تھی۔

عباس خاں اس مختصر فوجی دستے کا سردار ایک مغل جاگیردار کا اکلوتا بیٹا اور جانشین تھا۔ وہ بلند قامت خوبصورت نوجوان تھا، پیشانی کی سرخی اور نگاہ کی تیزی اس کی بلند حوصلگی اور فوجی زندگی کے درخشاں باب کی حامل تھیں۔ بوڑھے باپ کی خانہ نشینی کے بعد غالباً عباس خاں کو اپنی تلوار کے جوہر دکھانے کا پہلا عملی موقع ملنے والا تھا۔ اور جس ترقی اور عزت کا وہ اپنے آپ کو مستحق پاتا تھا اس کا خیال اس نوعمر سردار کے عزم کو لحظہ بہ لحظہ مضبوط اور جوش کو تیز تر بنا رہا تھا۔ اکبر کی جوہر شناسی سے ایک خاندانی امتیازات اور ذاتی قابلیت رکھنے والے کو یہ توقعات رکھنا کچھ بیجا بھی نہ تھا۔

یہ فوجی رسالہ جس سمت کو بڑھا جا رہا تھا اس سے اس کا منزل مقصود اگر گجرات کو تصور کیا جائے تو شاید غلط نہ ہو کیونکہ اگر تاریخ کے چند ورق کو دہرایا جائے، تو بابر اور ہمایوں کے مصائب اور جلاوطنی کا راز اہل خاندان کی غداری اور چچوں اور بھائیوں کی سازشوں میں ملتا ہے۔ لہٰذا اکبر کسی طرح اس جائز ورثے سے محروم رہتا۔ چنانچہ ۱۵۷۳ء کی گجرات کی بغاوت جو تاریخ میں مرزاؤں کی بغاوت کے نام سے مشہور ہے اسی نوع کی ایک چیز تھی۔ اکبر نے اپنے لیے اس بغاوت کو ایک برے شگون سے تعبیر کیا۔ اور جس ناقابل قیاس سرعت اور دلیرانہ شجاعت کا مظاہرہ اس بغاوت کو فرو کرنے میں دکھایا۔ اس کا اندازہ نوروز کی قلیل فرصت میں آگرہ سے احمد آباد کا سفر ہے جو ایک وقیع اکبری کارنامہ خیال کیا جاتا ہے قدرتاً اس بغاوت میں اکبر کا ہاتھ بٹانے میں ان مغل سرداروں سے مدد لی گئی جو راجپوتانے کی سرحد سے قریب تھے......

چنانچہ معاملے کی اہمیت اور تنگی وقت بھی اس بات کی مقتضی تھی کہ عباس خاں نہایت سرگرمی کے ساتھ سفر طے کرے۔

تاہم شام کا سہانا وقت، دلفریب مناظر اور راجپوتانے کا ریتیلا فرش جو کچی چاندنی کے مانند چمک رہا تھا اس نوجوان سردار کو متاثر کیے بغیر نہ رہا۔ اس نے اپنے دماغ کو جنگی خیالات اور افکار سے آزاد کرنے کی زبردست کوشش کی، وہ اچک کر گھوڑے پر ابھر کر بیٹھا اور گرد و پیش پر نظر دوڑائی...... ایک نظر نے اس کو ایک ساعت میں ایک دوسرے جلوس سے روشناس کرا دیا جو چند فرلانگ کے فاصلے پر اس سڑک پر بڑھ رہا تھا جو ایک یا دو میل چل کر عباس خاں کے راستے سے مل جاتی ہے۔ یہ گروہ دراصل ایک پر امن ہندو بارات تھی جو تمام قدیمی رسومات اور شان و شوکت کے ساتھ

عروس کو اس کے ہونے والے گھر کو لیے جا رہی تھی، جہاں اس کو اجنبی لوگوں کو اپنا بنانے کا اہم اور ذمہ دارانہ فرض انجام دینا تھا جس پر اس کی آیندہ زندگی کا بہت کچھ انحصار تھا۔ عروس حسب دستور ایک مرصع پالکی میں تھی، ہمراہیوں کا لباس، وضع اور تعداد بتا رہی تھی کہ وہ ایک مالدار اور ذی عزت راجپوت قوم کی بارات ہے.....

غروب آفتاب سے فوراً بعد ہی جب کہ یہ پر امن جماعت روہنی ندی کے کنارے اس گھاٹ سے گذر رہی تھی جہاں ہندو اپنے مردوں کو نذر آتش کرتے ہیں اس کو ایک زبردست ڈاکوؤں کے گروہ سے دوچار ہونا پڑا ڈاکو اچانک بارات پر ٹوٹ پڑے اور بہت جلد ان چند مسلح راجپوتوں پر قابو پا گئے جو عروس کی محافظت کے لیے ہمراہ تھے، ظاہر ہے کہ ان کا مطمع نظر وہ پالکی تھی جس میں عروس اپنے قیمتی طلائی زیورات و جواہرات اور زرنگار جوڑے عروسی میں لدی پھندی بیٹھی تھی.......

پالکی روک لی گئی ...... اور بہت جلد پردوں کو ہٹا کر اس حسین "محل نشین" کو باہر کھلی ہوا میں کھینچ لیا گیا۔ تلسی بائی پندرہ سالہ نوعمر نازونعم میں پلی ہوئی لڑکی تھی۔ کوئی تعجب نہیں اگر اس نے ڈاکوؤں کو اپنی معصومیت کی وجہ سے وہ خیالی راکشش سمجھا ہو جنکا ذکر اس نے متعدد بار تو ہماتی مذہبی کہانیوں میں پڑھا تھا۔ وہ اب ظالم ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر تھی۔ اگر حسن اور معصومیت ان طمع زدہ وحشیوں کو نرم دل بنا سکتے تو ان کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ لیکن وہ انسان نما درندے جذبہ حرص و غضب سے مغلوب اس کی کیف فروش سیاہ آنکھوں کی التجا اور دل کی دھڑکنوں سے قطعی بے حس تھے۔ انہوں نے تلسی بائی کو نہایت کرخت لہجے میں زیورات اور جواہرات کے حوالے کر دینے کا حکم دیا لیکن وہ اس حکم کی تعمیل سے عاجز تھی، وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ محض دہشت کی وجہ سے اپنے گلے اور کانوں اور ہاتھوں میں سے زیور کو الگ نہیں کر سکتی تھی.....

یقیناً وہ ظالم نہ صرف زیورات پر اکتفا کرتے بلکہ بہت ممکن تھا کہ وہ اس کا قیمتی دوشالہ اور ملبوس کے دوسرے قیمتی لوازمات بھی جبراً چھین لیتے اگر ہمارا نوجوان مغل سردار اپنی زبردست جماعت کو لیے ہوئے اس ہنگامہ خیز لمحے پر وارد نہ ہو جاتا......

ڈاکو اس زبردست فوجی طاقت کے مقابلے کی یقیناً قدرت نہ رکھتے تھے لہذا انہوں نے فوراً راہ فرار اختیار کی۔

تلسی بائی فرش زمین پر بدستور مبہوت بیٹھی ہوئی تھی وہ اس قدر متاثر تھی کہ بہت دیر تک یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ وہ اس مصیبت ناگہانی سے بچ گئی ہے۔ عباس خاں مسکراتا ہوا اسکی طرف بڑھا اور اس حسن اور معصومیت کی تصویر کو نرم الفاظ میں تسلی دینے لگا.....

اگر یہ سچ ہے کہ حسن بحالت غم ایک نیا عنوان مطالعہ پیش کرتا ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ عباس خاں کے سامنے تخیل نسواں حسن و دلربائی کا اس بہتر مرقعہ پیش کرنے سے عاجز تھا...... ادھر تلسی بائی کی نظر میں یہ شکیل و جمیل بہادر مغل سردار انسانیت کا مجسمہ اور پریم کا دیوتا ضرور تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنے اپنے دلمیں محبت کا نقش محسوس کیا۔ عباس خاں نے نہایت سہولت کے ساتھ تلسی بائی کو پالکی میں بیٹھنے میں مدد دی۔ اس وقت اگرچہ عباس خاں استقلال سے کام لے رہا تھا تاہم اس کا دماغ ایک پرہیجان کش مکش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک ساعت میں متضاد خیالات اس کے ذہن میں آئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ تلسی بائی کو لیکر اپنے گھر واپس ہو جائے، یا کسی نامعلوم جگہ کو...... جہاں دنیا سے فراموش ہو کر وہ راحت اور سکون کی زندگی گذار دیں؟! پھر اس نے خیال کیا کہ اس کا یہ طرز عمل نہ صرف ایک سپاہی کی شان کے شایاں نہیں بلکہ ایک لڑکی کی مجبوری اور بے کسی سے فائدہ اٹھانا نہایت ذلیل بھی ہے۔

آخرکار قبل اس کے کہ تلسی بائی کے ہمراہی واپس آئیں عباس خاں فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ شرافت اور سچائی کا راستہ اختیار کریگا۔ چاہیے اس کے دل پر کچھ ہی کیوں نہ گذر سے۔ عباس خاں نے مناسب سمجھا کہ تلسی بائی کو اسکی منزل مقصود تک پہنچا دے تاکہ وہ واپس ہو کر اطمینان خاطر سے اپنا راستہ اختیار کر سکے چنانچہ

علاوہ چند سپاہیوں کے اس نے باقی دستے کو قیام کا حکم دیا اور بارات کے ساتھ اس حد تک گیا جہاں سے تلسی بائی کے نئے مکان کی عمارت نظر آنے لگی جو ایک عالیشان مکان سے کم نہ تھی۔ راستہ بھر عباس خاں خیالات میں گم تھا وہ تلسی بائی کو نہیں دیکھ سکتا تھا، لیکن تلسی بائی برابر اس کو پردوں میں سے جھانک رہی تھی اور اس کے دل میں احسان اور محبت کے جذبات پورے جوش کے ساتھ موجزن تھے۔

آخر کار عباس خاں نے کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں الوداعی الفاظ کہے ...... اور جس وقت کہ تلسی بائی کے ہمراہی شکر گذاری کا فرض ادا کر رہے تھے۔ وہ تمام رسوم و قیود کو پردوں کی مادی شکل میں اپنے ہاتھوں سے ہٹا کر ایک مرتبہ پھر عباس خاں کے سامنے رونما ہوئی اور اپنی انگلی سے ہیرے کی انگوٹھی نکال کر اپنے محسن کو پیش کر دی .... زندگی کے سمندر سے دو موجیں اٹھیں اور انہوں نے عباس خاں اور اس راجپوت لڑکی کو ایک دوسرے سے الگ مختلف ماحول میں پٹک دیا۔ عباس خاں کو میدان جنگ اور سپہ گری کی زندگی میں اور تلسی بائی کو گھریلو زندگی کی چار دیواری میں جہاں اس کو ایک مغل کو انگوٹھی پیش کرنے کی محبت آمیز جسارت پر کیا کچھ نہ کہا گیا ہوگا ....

(۲)

ایک سال کا عرصہ گذرنے پر عباس خاں ایک مرتبہ پھر دریائے روہنی کے کنارے کنارے سفر کر رہا ہے۔ وہ نہایت شاندار عرب گھوڑے پر سوار ہے۔ جو غالباً اس مال غنیمت کا حصہ ہے جو فاتح فوج کے سورت کی لڑائی کے خاتمہ پر ہاتھ آیا ہوگا۔ عباس خاں نے اپنے عزیز شہنشاہ کی رفاقت میں خاردار جھاڑیوں سے پٹے ہوئے ریتیلے میدان میں جو داد شجاعت دی تھی اس کا بین ثبوت اس کی آہنی خود اور سپر کے غیر فانی نشانات ہیں۔ ایک فوجی افسر کی پرشورش عملی زندگی کے بارہ مہینے ہرگز قلیل مدت نہیں۔ اتنے وقت میں اس کے خیالات اور خیالات میں نمایاں تغیر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ تغیر عباس خاں میں بھی محسوس کر سکتے ہیں جس کے اندر اب جوش پر استقلال کا جذبہ حاوی ہو گیا ہے۔

علاوہ ازیں ناکام محبت اور بوڑھے باپ کی دائمی مفارقت کے غم نے اس کو محض سنجیدہ ہی نہیں بلکہ سوچنے اور حالات سے نتیجہ اخذ کرنے کا بھی عادی بنا دیا ہے اور وہ اب پختہ کار انسان ہے ...... لیکن اس وقت عباس خاں پر جو کیفیت طاری ہے وہ سنجیدگی سے گذر کر تاسف کی حد کو پہنچ گئی ہے۔ اس کا رفیق سفر دریائے روہنی بھی شاید اس کے تاثرات سے آگاہ ہے جو غم انگیز نغمہ سرائی کے ساتھ بہہ رہا ہے۔

عباس خاں کی روانگی کے نظارے کا تصور کیا جائے تو یہ حالات کس قدر مختلف نظر آتے ہیں۔ تاہم اس تضاد کی تکمیل میں کچھ کمی رہ جاتی اگر سامنے سے ایک راجپوتوں کا گروہ ایک ارتھی لیے گھاٹ کی طرف نہ آ رہا ہوتا۔ جنازے کے ساتھ جانے والے برہنہ پا لوگ سفید پٹکے کمروں پر باندھے ہوئے سفید ریشمی ساڑیوں میں ملبوس اس انسانی زندگی کے ڈرامے کے آخری سین کو بھی عبرتناک بنا رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے عقاید کے مطابق اناج اور روپے پیسے دان کرنے کی غرض سے ساتھ لیے ہوئے تھے، اور ہانڈی میں آگ تھی جو برہمن لیے ہوئے ارتھی کے پیش پیش تھے۔ اور ایک عورت کی ہمراہی اس بات کی شاہد تھی کہ غالباً ستی کی رسم ادا کی جائیگی۔

عباس خاں کی بھٹکتی ہوئی نظریں اس ماتمی جلوس سے جا ملیں جس نے فوراً اس کی آنکھوں میں اس سے گذرتی ہوئی بارات کے جلوس کا سماں باندھ دیا۔ جہاں اس نے اس راجپوت لڑکی کو ڈاکوؤں کی دست برد سے بچایا تھا جس کے پر لطف تخیل نے اس کے بعض بے کیف لمحات کو رنگین بنا دیا تھا۔ عباس خاں خود اپنے بادشاہ کی سیاسی، ملکی اور اصلاحی تدبیر کا بھی سرگرم موید تھا اور اس بات کا خواہاں رہتا تھا کہ شاہی احکام کا احترام اصل معنے میں کل ممالک محروسہ میں ہونا چاہیے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک کسی قوم میں عملی کام کرنے والے نہیں ہوتے تب تک کوئی نئی تحریک اور اصلاح کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس موقع پر عباس کو معاً خیال

پیدا ہوا کہ اسے دیکھنا چاہیے کہ کس درجے تک "ستی" کے بارے میں شاہی احکامات کا احترام ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ اکبر اس قبیح رسم کو ترک کرنا چاہتا تھا۔ تاہم مصلحتاً یک قلم مسترد کرنا مناسب نہ سمجھ کر بیوہ کی مرضی پر ستی ہونا منحصر کر دیا تھا۔ لیکن سماج کی حالت اس وقت اس قابل نہ تھی کہ ایک بیوہ شوہر کے ساتھ ستی ہونے سے انکار کرنے کے بعد ذی عزت زندگی بسر کر سکے۔ لہذا بیوہ عورتیں ستی ہونے کو زندگی پر ترجیح دیتی تھیں۔ چنانچہ عباس خاں گھوڑے کی باگ موڑ کر گھاٹ کی طرف چلدیا، جہاں اس کا یہ فعل بہت بری نگاہ سے دیکھا گیا اور عباس خاں نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کو اس کا وہاں جانا ناگوار گذرا۔ لہذا مختصر الفاظ میں اس نے ظاہر کر دیا کہ وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے احکام کی پابندی کرنے کیلیے آیا بیوہ سے ستی ہونیکی اجازت لی گئی ہے یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں برہمنوں کے گروہ میں سے سب بڑے برہمن نے آگے بڑھ کر اس طرح کہا "مہاراج! آپ خود بیوہ سے پوچھ سکتے ہیں وہ اپنی خوشی سے ایک پتی ورتا بیوی کی طرح ستی ہو کر سرگباش ہونا چاہتی ہے"۔ اس بات کی اجازت حاصل ہونے پر عباس خاں اس طرف گیا جہاں وہ ناکردہ گناہ مجرم کی طرح آخری مرتبہ بہترین ملبوس سر سے پاؤں تک زیورات پہنے ہوئے موت سے مقابلہ کرنے کو تیار کھڑی تھی، اس وقت عباس خاں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے شعلہ بر انداز چتا میں کودنے والی بیوہ کو پہچانا کہ وہ وہی راجپوت لڑکی تھی جسے سہاگ کے جوڑے میں ملبوس دیکھا تھا اور جو اب اپنا سہاگ تج کر اس کا کفارہ ادا کرنے آئی تھی۔

تلسی بائی کا شوہر ایک کم عمر بیمار لڑکا تھا جو شادی کے فوراً بعد سنجار کا شکار ہو گیا تلسی بائی کو اس کے ساتھ ہمدردی تھی اور ایک طرح کا لگاؤ بھی تھا اور اگرچہ اس نے شوہر کی بیماری میں اس کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا تاہم اسکے [illegible] عشق [illegible] تھی جو انسان کو پیدا [illegible]

بجھی ہوئی شمع پر نثار کرنے پر مجبور کر دیتی۔

چند ساعتوں کے لیے عباس خاں کو اپنی نظروں کا یقین نہ ہوا، لیکن چتا کے شعلوں نے جو ایک ساکت اور دم بخود حسین مجسمے کی عرق آلود پیشانی میں بھڑک بھڑک کر عکس ڈال رہے تھے ...... اور جس پر حقیقت ناشناس نظروں کو وفور شوق کے باعث خون کے اجتماع کا دھوکہ ہو رہا تھا عباس خاں کے خیالات کو واقعیت کا جامہ پہنا دیا۔ اور اس نے صورت حالات کو سمجھ کر بیوہ کو اپنی طرف مخاطب کر کے اسطرح کہا کیا تم کو معلوم نہیں کہ بادشاہ سلامت کسی بیوہ کا اس کی منشا کے خلاف ستی ہونا نہیں چاہتے تو پھر کیا تمہاری اپنی خوشی یہی ہے کہ تم ناوقت اپنے آپ کو دوسری دنیا میں دھکیل دو"۔
.... وہ بدستور خاموش تھی۔ عباس خاں نے کہا "دیکھو تمہیں جس دروازے سے گذرنا ہے (اس نے چتا کی طرف انگلی اٹھائی) وہ کس قدر وحشتناک ہے"۔ عباس خاں کا ایک ایک لفظ سونچا ہوا تھا اور اپنی اپنی جگہ مخاطب کو جواب کے لیے آمادہ کر رہا تھا جو خطیب چاہتا تھا.....

اس نرم و گداز گفتگو نے تلسی بائی کی رگوں میں ایک مرتبہ پھر زندگی کے خون کا دورہ شروع کر دیا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر عباس خاں کو دیکھا، جس کے ساتھ ہی اس کے حسن کی تمام رعنائیاں نمایاں ہو گئیں اور عباس خاں نے محسوس کیا کہ کس طرح راجپوتانے کی گرم و خشک مگر صحت افزا آب و ہوا نے تلسی بائی کو ایک نازک اندام نوخیز لڑکی سے حسین اور متناسب الاعضا سڈول عورت میں تبدیل کر دیا ہے........ اس کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے کہا "اے نیک دل انسان! ایک دفعہ پہلے تو نے میری جان نہیں آبرو جو مجھے جان سے زیادہ پیاری ہے ڈاکوؤں کے ہاتھ سے بچائی تھی...... آج پھر........ مگر نہیں نہیں، تم اس خوفناک جگہ سے چلے جاؤ...... یہ ظالم تم کو بھی.... ابھی تلسی بائی کا جملہ پورا ہونے نہ پایا تھا کہ برہمنوں نے عباس خاں کو جتلایا کہ کس طرح خود اس کے الفاظ اس جواب

ذمہ دار تھے۔ اور مزید براں چالاک برہمنوں نے کہا کہ اگرچہ بیوہ خودستی کے لیے آئی تھی اور اس فرض کے ادا کرنے کی آرزومند تھی تاہم عین اس وقت جب کہ موت اس کی آنکھوں میں گھور رہی ہے اس کے یہ الفاظ کوئی وقعت نہیں رکھتے اور اس لیے قابل پذیرائی ہی نہیں۔" یہ کہتے ہوے اور دیکھتے ہوے کہ مغل نے انکے استدلال کا کوئی اثر نہیں لیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو چتا کی بچی ہوئی لکڑیوں سے مسلح کرنا شروع کر دیا۔

عباس خاں کا وقت بہت قیمتی تھا۔ اور وہ کوئی لمحہ بیکار کھونا نہیں چاہتا تھا اس نے گھوڑے کی باگوں کو نامعلوم حرکت دی اور وہ بلکل بیوہ کے قریب تھا۔ "اگر میں گھوڑے سے اترتا ہوں تو دونوں خطرے میں...... تم میری رکاب پر پیر رکھو ......" بہادر راجپوت لڑکی عباس خاں کا مطلب خوب سمجھ گئی جو اس کے الفاظ سے زیادہ اسکی نگاہوں سے مترشح ہوتا تھا اور چشم زدن میں عباس خاں کے پیچھے اس کے بائیں ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوے گھوڑے پر سوار تھی.... اور عباس خاں کا عربی النسل گھوڑا ایک غضبناک مجمع کو چیرتا ہوا نکل رہا تھا عباس خاں کے شانے سے آویزاں ڈھال تلسی بائی کے لیے بہترین آڑ ثابت ہو رہی تھی...... بہت جلد وہ کھلی سڑک پر تھے اور ہوا جو کافی دن چڑھنے کی وجہ سے گرم ہو چلی تھی ان کے پسینے سے بھیگے ہوے جسموں کو خوب ٹھنڈی لگ رہی تھی...... ابھی تک ان کے کانوں میں چند دہشت ناک صدائیں آ رہی تھیں جو یقیناً ان لالچی اور سنگدل برہمنوں کی تھیں جو بھوکے درندوں کی طرح شکار سے محروم رہ جانے پر چلا رہے تھے۔

تلسی بائی کا باپ ایک سمجھدار نیک انسان تھا جو اپنی اکلوتی بیٹی کا شیدائی تھا۔ عباس خاں کے لیے یہ امر دشوار نہیں تھا کہ وہ تلسی بائی کے ساتھ شادی کرنے کی رضامندی اس کے باپ سے حاصل کرلے...... یہ بات یک گونہ اطمینان بخش ہے کہ عباس خاں کی شادی کا اہتمام شہنشاہ اکبر کی طرف سے کیا گیا۔ کیونکہ ایک بہادر سردار کی شادی میں پدری فرائض کا انجام دینا شہنشاہ اپنے لیے باعث فخر بھی سمجھتا تھا۔ اور راجپوتوں اور مغلوں میں شادی ہونا عین مصلحت شاہی بھی تھی۔

قاضی خورشید الاسلام سیوہاری ایم۔اے

غزل

نہ فصل گل کے لیے ہے نہ ہے خزاں کے لیے
یہ داغ دل ہے فقط عشق جانستاں کیلیے

لبوں پہ آہ، کسک دل میں، آنکھ میں آنسو
ہزار شغل ہیں اک جان ناتواں کیلیے

بجھی بجھی سی طبیعت جھکی جھکی سی نگاہ
یہ تحفے لایا ہوں میں ایک مہرباں کیلیے

ذرا ٹھہر مرے مستقبل حیات افروز
میں رو رہا ہوں ابھی عمر رائیگاں کیلیے

یہ ابر و باد کی یورش یہ آمد آمد برق
میں جمع کرنے لگا ہوں خس آشیاں کیلیے

کدھر ہے عشرت رفتہ کہاں ہے ذوق نظر
وہ آ رہے ہیں علاج غم نہاں کے لیے

ہے صبح حشر کے بعد اور ایک شام ابد
چھپاؤں داغ جگر میں کہاں کہاں کے لیے

سرشک یاس، غم ہجر، رنج مجبوری
یہ سرخیاں ہیں محبت کی داستاں کیلیے

اب آستانہ خود ان کا ہے مضطرب اختر
کبھی جبیں مری مضطر تھی آستاں کیلیے

اختر ہوشیارپوری

کبھی اہل وفا سے بے وفائی ہو نہیں سکتی

بتوں کی دہر میں فرمانروائی ہو نہیں سکتی
خدا یہ ہو نہیں سکتے خدائی ہو نہیں سکتی

ترے ہوتے کسی سے آشنائی ہو نہیں سکتی
کبھی اہل وفا سے بے وفائی ہو نہیں سکتی

جناب شیخ مینا ہی پئیں اب تو کچھ بھی ہو
کہ میخانے میں آکر پارسائی ہو نہیں سکتی

مرے دل کے سوا کونین ہی کی کیوں نہ وسعت ہو
کہیں بھی تیرے جلووں کی سمائی ہو نہیں سکتی

قفس صیاد نے گلشن کے پھولوں سے سجایا ہے
اسیران قفس کی اب رہائی ہو نہیں سکتی

میں جھوٹا میرا دعویٰ ہی سراسر حشر میں جھوٹا
مگر جھوٹی خدائی کی خدائی ہو نہیں سکتی

بنا کر بندہ الفت ہمیں کیا آزماتے ہو
بھلائی کرنے والے سے برائی ہو نہیں سکتی

مری حاجت روائی کو نہ چھوڑو تم زمانے پر
زمانے سے مری حاجت روائی ہو نہیں سکتی

کہیں اہل نظر دیدار سے بیہوش ہوتے ہیں
کلیم اس طرح سے جلوہ نمائی ہو نہیں سکتی

ہوئی جاتی ہیں نظریں گم نقاب روئے تاباں میں
کسی صورت سے اب پردہ کشائی ہو نہیں سکتی

نہ چاہو تم تو مشکل ہے جو تم چاہو تو آساں ہے
کسی سے یوں مری مشکل کشائی ہو نہیں سکتی

مرے غم جو رہ جائے کسی پہلو میں دل باقی
تمہارے حسن کی وہ دل ربائی ہو نہیں سکتی

عبث ہے شرکت بزم سخن ہے آج کل افقرؔ
یہ محفل اگر غزل سرائی ہو نہیں سکتی

افقرؔ موہانی وارثی

یاد ماضی

غم کو بڑھا رہی ہے ۔ پھر یاد آرہی ہے
اک پیکر جفا کی
ناواقف وفا کی
معصوم دلربا کی
پھر یاد آرہی ہے ۔ تڑپائے جا رہی ہے
وہ شان بے وفائی
وہ طرز کج ادائی
اور میری جبہ سائی
پھر یاد آرہی ہے ۔ مضطر بنا رہی ہے
دل کی حسیں کہانی
نظروں کی ترجمانی
مدہوش زندگانی
پھر یاد آرہی ہے ۔ برمائے جا رہی ہے
دل کی نیازمندی
آہوں کی سربلندی
اور انکی خود پسندی
پھر یاد آرہی ہے ۔ بجلی گرا رہی ہے
آنکھوں میں کیف مستی
باتوں میں سادگی سی
ہر ہر ادا کی شوخی
پھر یاد آرہی ہے ۔ غمگیں بنا رہی ہے
گستاخیوں پہ پیہم
انکی نگاہ برہم
پھر گفتگوے باہم
پھر یاد آرہی ہے ۔ رلوائے جا رہی ہے
آزادیوں کی ساعت
بھولی ہوئی محبت
وہ چاند جیسی صورت
پھر یاد آرہی ہے ۔ پھر یاد آرہی ہے

سحرؔ صہبائی

ہندستان کے ہندو افسانہ نگار

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندستانی نے ہندستان ہی میں جنم لیا۔ یہیں پلی، یہیں بڑھی۔ اور ہندو و مسلمان دونوں نے اس کو پروان چڑھایا۔ میں ہماری اس زبان کے ہندو افسانہ نگاروں کا ذکر کر رہا ہوں۔

یوں تو اب تک اس قوم میں لاتعداد ادیب گذرے ہیں لیکن بہت کم لوگوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا بعض نے چند کہانیاں لکھیں اور بعض مستقل لکھتے رہے۔ ان سب میں نمایاں اور ممتاز جگہ منشی پریم چند کو ملی۔ ایک دو افسانے لکھنے والوں کی تعداد تو بہت ملے گی۔ افسوس ہے کہ پچھلے افسانہ نگاروں کے متعلق کوئی چھان بین پوری طرح نہیں کی گئی اور نہ ایسا مواد اکٹھا ہوا ہے۔ البتہ جناب ناظر کاکوروی نے جو کتاب "ہندو ادب" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شایع کی ہے اس میں بہت ہی مختصر طور پر بعض افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ بہت جلد مستقل افسانہ نگاروں کا تفصیلی تذکرہ کتابی شکل میں شایع کروں۔

افسانہ نگاری کی تاریخ تو بہت پرانی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے درمیانی دور سے اس میں حصہ لینا شروع کیا۔ فورٹ ولیم کالج کا زمانہ صرف نہال چند لاہوری للو لال کوی اور بینی نرائن جہاں قابل ذکر ہیں۔ نہال چند لاہوری کا افسانہ "مذہب عشق" اور بینی نرائن جہاں کا افسانہ "سنگھاسن بتیسی" مشہور ہے۔ درمیانی دور کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہیم چند کھتری۔ چرونجی لال۔ لالہ بنی لال۔ منشی طوطا رام شایان منشی ونایک پرشاد۔ منشی ٹھاکر پرشاد۔ منشی ہیم چند۔ منشی ملائی داس یا منشی امبی پرشاد مدہوش اور منشی دیوی پرشاد کے نام نمایاں نظر آتے ہیں لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس وقت یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ سب کے سب یا درمیانی دور کے افسانہ نگاروں کا تفصیلی حال بیان کر سکوں اس لیے کہ مضمون کی غایت صرف افسانہ نگاروں کے نام ہی گنا کر فہرست سنانا نہیں ہے بلکہ انکی مختصر سوانح اور افسانہ نگاری کے متعلق بھی کچھ بیان کرنا ہے۔ نئے دور کے افسانہ نگاروں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی ہے اس لیے میں اس مختصر سے مضمون میں صرف چند کا ذکر پنڈت رتن ناتھ سرشار سے شروع کرتا ہوں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار سب سے پہلے ہندستانی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ہندستانی قصوں میں اصلیت کا رنگ پیدا کیا۔ سرشار کی پہلی تصنیف جس نے ادبی دنیا میں انکی ناموری اور عظمت کے جھنڈے گاڑ دیے "فسانہ آزاد" ہے۔ اس افسانے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جدید اور قدیم رنگ کی آمیزش اس تناسب کے ساتھ کی گئی ہے کہ دونوں مذاق کے لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ طبیعت کی شوخی اور زبان کی پاکیزگی سرشار کا خاص حصہ تھا جو پورے قصے میں نمایاں ہے ان کے افسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ واقعات بلا استثنا انسانی طاقتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور پڑھنے والا محسوس کرنے لگتا ہے کہ سرشار کے افسانے کے کیرکٹر بول رہے ہیں۔ فسانہ آزاد میں آزاد حسن آرا اور سپہر آرا کی بات چیت کا حال اس طرح لکھتے ہیں۔

"الغرض بیگم صاحب نے میاں آزاد کو دن بھر بٹھایا اور اور ساتھ ہی کھانا کھلایا اور خوب دیکھا بھالا جانچا پرتالا۔ میاں آزاد گو بہ تسکین نے ہوئے ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں اور دل ہی دل میں کھل کھلاتے جاتے ہیں۔ جب دن قریب اختتام ہوا اور وقت شام ہوا تو بزرگ خجستہ خصال نے کہا کہ بھائی اب دو گھڑی حسن آرا اور سپہر آرا کے پاس بھی جاؤ۔ دو گھڑی وہاں بھی خوش گپیاں اڑاؤ پیرہ دار کو کنکھیوں سے اشارہ کیا کہ سایہ کی طرح قدم بقدم ساتھ رہو میاں آزاد

اور پیر مرد جو تھے اور بڑی بیگم سے رخصت ہو کر حسن آرا کے کمرے میں گئے۔ آزاد نے پیر مرد سے کہا حضرت ہمیں حیرت ہے کہ یہاں ہم ضعیف الاعتقادی اس قدر بے تکلفی کسی اور پرانے فیشن کے خاندان میں یہ بے تکلفی کب جائز رکھی جائیگی پیر مرد نے کہا یہہ سچ ہے مگر مجھے نصیحت ہو رہی ہے خبردار ساتھ نہ چھوڑنا۔"

آزاد بندہ حاضر ہے۔

سپہر آرا بسم اللہ آیئے بسر و چشم کہیے اماں جان سے کیا بات چیت ہوئی۔

آزاد آپ کی اماں تو بلکل سفید آندی ہیں مگر بلا کی ضعیف الاعتقاد آج تمام دن بھوت پریت چڑیل۔ جن مانس۔ چھلاوے جادو ٹونے ہی کی باتیں کرتی رہیں۔ میں بھی ہاں میں ہاں ملاتا گیا۔ آخر اور کیا کرتا مصلحت وقت کا تقاضا یہی تھا

سرشار کی بزلہ سنجی اور ظرافت آپکو خواجہ بدیع اللہ جناب خوجی کے کردار میں نظر آئیگی۔

۱۸۷۸ء میں منشی نولکشور نے اودھ اخبار کا انہیں ایڈیٹر مقرر کیا چنانچہ ان ہی کے زمانہ ادارت میں فسانہ آزاد اس میں بالتساط شایع ہوتا رہا جس کی وجہہ اخبار کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی جو اس وقت شاید کسی ہندستانی اخبار کو نصیب ہوئی ہو۔ اور وہ اخبار سے قطع تعلق ہو جانے کے بعد سرشار اپنا خاص رسالہ خمکدہ سرشار نکالنے لگے۔ اس کے شماروں میں بھی کہاں بچھڑی دلہن اور کرم دھم نارل کمل نکلتے رہے۔

سرشار ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آئے اور سر مہاراجہ بہادر کی سرکار میں جگہہ پائی اور یہیں ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء میں خاک کے پیوند ہوئے انکی دوسری تصانیف "فدائی فوجدار" جام سرشار کامنی کرم دھم جشو۔ سیر کہسار۔ بی کہاں بچھڑی دلہن ہیں جشو کو باعتبار مضمون ہندستانی میں وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی میں ڈان کوئک زاٹ کو ہے۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت وزیر دولت آصفیہ کا نام نامی و گرامی دنیائے ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مرحوم کی قدردانیوں کا غلغلہ ہندستان میں کسی سے مخفی نہیں۔ ہمیشہ اہل کمال اس دربار سے متعلق رہے۔ مہاراجہ بہادر نے کئی افسانے لکھے اور کئی کتابیں تصنیف کرکے ادیبوں میں ممتاز جگہ پائی۔ آپ کے افسانے بزم خیال اور مطلع خورشید بہت مشہور ہیں۔ یہ افسانے مہاراجہ مرحوم نے سرشار کے رنگ میں لکھے ہیں جو سرشار کی صحبت کے اثر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مہاراجہ بہادر نے ۱۳ مئی ۱۹۴۰ء کو اپنی جان جان آفریں کے سپرد فرمائی۔

منشی دھنپت رائے۔ پریم چند سمت ۱۹۲۷ء بکرمی میں مدھوالی گاوں میں پیدا ہوے جو بنارس میں پانڈے پور کے پاس ہے۔ منشی جی نے ۱۹۰۱ء سے اپنی زندگی کا ادبی باب شروع کیا۔ ہندستانی میں ان کے افسانے بہت بلند ہیں اور اتنے دلچسپ کہ بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہو تو پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی آپ بیتی پڑھ رہا ہے کبھی ہنس دیتا ہے۔ کبھی رو بھی پڑتا ہے منشی جی کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بلا کی دلکشی سادگی۔ اور مٹھاس ہوتی ہے۔ بقول مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی "شرافت پریم چند کی قلم کی جان اور روح انسانیت کی بیداری ان کے ہر افسانے کا عنوان ہے۔ شہری زندگی کی نقاشی تو بہتوں نے کی ہے لیکن دیہات کے چوپالوں اور فقیروں کی جھونپڑی میں منشی پریم چند ہی پہنچ سکے ہیں۔ دیہات کا منظر کھینچنے میں ان کو کمال تھا۔ پریم پچیسی کی دوسری جلد میں ایک جگہہ انہوں نے دیہاتی منظر اس طرح دکھلایا ہے۔

"اساڑھ کا مہینہ تھا کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں دربدر پھرتے تھے۔ گاوں کی بوڑھی نبیاین نویلی دلہن بنی ہوئی تھی۔ اور فاقہ کش کمہار باراتی کا دولہا تھا۔ مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوے تھے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں۔ ان کے نگاہ کرم کی منتظر۔ گھانس سے

جھکے ہوئے کھیت ان کے دست شفقت کے محتاج جسے چاہتے تھے بساتے تھے اجاڑتے تھے آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز منچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہر رات سے ٹپکے کی کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ باوجود پیرانہ سالی کے بھجن اور جاپ سے زیادہ دلچسپ اور پرمذاق شغل یہہ تھا۔ نالے پرشور ندیاں اتھاہ۔ چاروں طرف ہریالی اور سبزہ نزہت گاہ حسن بسیط۔ انہی دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کی طرح گاؤں میں آئے۔ ایک سجی ہوئی بارات تھی ہاتھی اور گھوڑے اور ساز و سامان لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ گاؤں کے لوگوں نے یہہ طمطراق اور کروفر دیکھا تو رہے سہے ہوش اڑ گئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے"

اسی کہانیوں کے ایک مجموعے میں ایک اور منظر اس طرح کھینچے ہیں۔

دوسرا سال آیا تو وہ گاؤں پھر رشک گلزار بنا ہوا تھا بچے پھر اپنے دروازوں پر گھرونڈے بنانے لگے مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دیے اور عورتوں کے سہانے گیت۔ چکیوں پر زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے۔

سال بھر اور گذرا جب ربیع کی دوسری فصل آئی تو سنہری بالوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگے تھے۔ سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں کہ اب کے نئے نئے گہنے بنوائینگی۔ مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے۔ اور دارو غہ جی کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آیند خبریں سنیں اور دیہات کی سیر کو چلے۔ وہی تزک و احتشام وہی لٹھیتوں کا رسالہ۔ وہی غنڈوں کی فوج گاؤں والوں نے انکی خاطر و تعظیم کی تیاریاں شروع کیں موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا۔ لکڑی کے انبار لگائے دودھ کے حوض بھر دیے۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہنچے تو پورے ایک سو آدمی انکی پیشوائی کے لیے دست بستہ کھڑے تھے"

منشی پریم چند کے افسانے نفس کو نہیں روح کو تڑپاتے ہیں جذبات کے سفلی نہیں علوی حصے کو گرماتے ہیں بدی کی نہیں نیکی کی قوت کو حرکت میں لاتے ہیں۔ بازار حسن ان ہی تخیلات کا نمونہ ہے۔ پریم چند تنگ خیال اور فرقہ پرست ہندو مسلمان دونوں کے مخالف اور دونوں سے نالاں رہتے تھے۔ تنگ خیال پنڈتوں اور متعصب مولویوں دونوں کو ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کی کہانیاں کتابی شکل میں نکل چکی ہیں۔ جن کے نام یہہ ہیں۔ سوز وطن۔ خاک پروانہ۔ پریم پچیسی۔ پریم بتیسا۔ پریم چالیسی۔ فردوس خیال۔ زاد راہ۔ دودھ کی قیمت واردات گرشتا۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ جلوہ ایثار۔ روٹھی رانی۔ بازار حسن گوشہ عافیت۔ چوگان ہستی۔ پردہ مجاز۔ نرملا۔ غبن۔ بیوہ۔ میدان عمل۔ آخری تحفہ اور گئودان۔ ان کے افسانوں کو آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈولوطو ہرسٹ نے بہت پسند کیا تھا۔ ان افسانوں کا ترجمہ غیر زبانوں میں ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ منشی جی ہم سے بچھڑ گئے۔ شاید ہی انکی جگہ پر ہو سکے۔

بدری ناتھ سدرشن پنجاب کے رہنے والے اور پرانے افسانہ لکھنے والے ہیں۔ کچھ عرصے تک چندن نکالتے رہے۔ اور اب یہہ نیو تھیٹرز میں مکالمہ نگاری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے افسانے بڑی حد تک منشی پریم چند سے متاثر ہیں۔ ان کی مشہور کہانیوں کے مجموعے یہہ ہیں۔

صبح وطن۔ راج سنگھ۔ پارس۔ بنگال تبی۔ قوم پرست تہذیب کے تازیانے۔ کنج عافیت۔ چٹکیاں۔ آنریری مجسٹریٹ۔ خوش انجام۔ بیگناہ مجرم۔ سدا بہار کے پھول۔ گناہ کی بیٹی۔ عورت کی محبت۔ چشم چراغ۔ طائر خیال۔ قدرت کے کھیل۔ زہریلا آب حیات۔ محبت کا انتقام۔ اور سولہ سنگار کے فرائض

انجام دیے ہیں۔

پنڈت کشن پرشاد کول سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ کے سرگرم رکن ہیں۔ ادب سے ذوق رکھتے ہیں۔ پرانے لکھنے والے ہیں۔ ان کی ایک کتاب "شامہ" چھپی ہے جس میں ایک دکھیا کی درد بھری داستان ہے۔

منشی شیوبرت لال کچھ سال ہوئے مرگئے۔ ان کا نام افسانہ لکھنے والوں میں مشہور رہے۔ انہوں نے کئی کہانیاں لکھی ہیں ان کی کتابوں میں شاہی لکڑہارا۔ شاہی بیمار۔ شاہی ڈاکو۔ شاہی بھکاری۔ شاہی جادوگر۔ قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اور کئی افسانے دلدار موتی۔ تڑپ دار موتی وغیرہ کتابی شکل میں شایع کردیے ہیں۔

منشی گوری شنکر لال اختر الہ آباد سے ماں سرو ماہوار رسالہ نکالتے ہیں۔ اب تک بہت سے افسانے لکھ چکے ہیں۔ چنانچہ لوکا ڈولی۔ آشیاں برباد۔ ترچھی چتون۔ بن باسی۔ منتر شکتی۔ زلفوں کا جال۔ پتی بھگتی۔ کال چکر اور کئی کتابیں ان کے افسانوں کی چھپ چکی ہیں۔

بابو مدن مراری لال سکسینہ لکھنؤ کے ایک مشہور کایستھ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا پرانا مکان محلہ مشک گنج میں مکان لالہ سید امام بخش کے نام سے مشہور رہے۔ ان کے پردادا لالہ شتاب رائے بڑے علم دوست تھے۔ جنہوں نے مولوی سید امام اشرف صاحب کی مصنفہ کتاب تزک شاہی تاریخ واجد علی شاہ کا حاشیہ لکھا ہے۔ ان کے والد منشی گوری پرشاد سکسینہ قلمی کتب اور تصاویر کے بڑے قدرداں ... کتب خانے میں رباعیات عمر خیام کا ایک قلمی نسخہ ... کا ہے جو دنیا کا سب سے پرانا نسخہ مانا جاتا ہے۔ بابو مدن لال اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ہمارا لنت جگر اور رات کے بارہ بجے بہت مشہور ہیں۔

رائے گوبردھن داس سکسینہ

غزل

بہار میں بھی ہمیں لذت بہار نہیں
کہ دست شوق کسی کے گلے کا ہار نہیں

ہزار شکر میں عیسیٰ کا شرمسار نہیں
دیا ہے درد مجھے وہ جو آشکار نہیں

تجھے جب آنا ہو آنا کہ اب ڈرا نہیں
کسی پہ مرچکے اب تیرا انتظار نہیں

ڈرو تم آہ غریباں سے ہے خزاں آور
یہ شاخ وہ ہے جو گلشن میں بے بہار نہیں

فضائے دہر میں جتنی مصیبتیں آئیں
میں سمجھا جیت ہے یہ مری اس میں ہار نہیں

تری ہی رحمت و بخشش پہ جی رہے ہیں سب
گناہگار نہیں کیا گناہگار نہیں

کہاں گیا دل راحت طلب مجھے کھو کر
سر مزار نہیں تو تہ مزار نہیں

دھڑک رہا ہے یہ دل بعد مردن بھی
تڑپ ہے اس لیے سینہ پر دست یار نہیں

مجھے تو درد میں لذت بلا کی ملتی ہے
دوائے لطف مسیحا بھی سازگار نہیں

کسی نے عاشق صادق کو یہ سنا ہی دیا
قرار اس کو ملے کیا جو بے قرار نہیں

ہے عالی زیست کا مقصد سکون قلب مدام
خدا کی یاد میں جینا ہمیں تو بار نہیں

(راجہ) نرسنگھ راج عالی

مطالعہ

اہلِ جہاں کے سامنے طرزِ کلام باثر
ادنیٰ سے التفات سے مٹ گئی سوزشِ جگر
تیغ عدو کا حوصلہ اور زباں کی سپر
تھے جو بلند غیض سے جھک گئے خود بخود وہ سر
خلق سمٹ کے آگئی اٹھ گئی جس طرف نظر
جزوِ حیات بن گیا ذوقِ مطالعہ اگر

سحر بھی بے اثر سا ہے لطف بھرے کلام سے
فکر نہیں غرض نہیں نامہ بر و پیام سے
دور کا واسطہ نہیں کشمکشِ دوام سے
کیفِ ثبات مل گیا کام رہا جو کام سے
خلق سمٹ کے آگئی اٹھ گئی جس طرف نظر
جزوِ حیات بن گیا ذوقِ مطالعہ اگر

سارے جہاں کی وسعتیں پنہاں ہیں اک نگاہ میں
سارے جہاں کے درد کی لذتیں ایک آہ میں
پھول ہی پھول بن گئے خار تھے جتنے راہ میں
دید کے آگئے مزے علم کی جلوہ گاہ میں
خلق سمٹ کے آگئی اٹھ گئی جس طرف نظر
جزوِ حیات بن گیا ذوقِ مطالعہ اگر

بات سمجھ میں آگئی کیا ہے ابد ازل ہے کیا
کیا ہے عالمِ وجود زیست ہے کیا اجل ہے کیا
کیا ہیں زمین و آسماں دشت ہے کیا جبل ہے کیا
فرق ہے نیک و بد کیا درس ہے کیا عمل ہے کیا
خلق سمٹ کے آگئی اٹھ گئی جس طرف نظر
جزوِ حیات بن گیا ذوقِ مطالعہ اگر

راز تھے جتنے کھل گئے جاتا رہا سب اختلاف
گردشِ دہر کو نہیں اپنی روش سے انحراف
چرخ کی کجروی کو ہے اپنے چلن پہ اعتراف
آئینہ رو برو ہے ایک کہتا ہے منہ پہ صاف صاف
خلق سمٹ کے آگئی اٹھ گئی جس طرف نظر
جزوِ حیات بن گیا ذوقِ مطالعہ اگر

ذوقِ نظر کا انحصار صبح پہ ہے نہ شام پر
سیرِ جہاں کی ہو گئی بیٹھ کے اک مقام پر
کھل گیا رازِ میکدہ ایک ہی دورِ جام پر
ختم نماز ہو گئی آخری اک سلام پر
خلق سمٹ کے آگئی اٹھ گئی جس طرف نظر
جزوِ حیات بن گیا ذوقِ مطالعہ اگر

رہبرِ راہِ حق ہے یہ خوب ہے اس کا اہتمام
کیفیتِ تخیلات کیوں نہ کرے پھر احترام
مستند اور علیحدہ دنیا سے اس کا ہے نظام
اس کے رفیقِ خاص کا بالا خیال سے مقام
خلق سمٹ کے آگئی اٹھ گئی جس طرف نظر
جزوِ حیات بن گیا ذوقِ مطالعہ اگر

صابر القادری

غزل

خوشی نہیں رہی مجھکو بہار آنے کی
میں جانتا ہوں یہ نیرنگیاں زمانے کی
جو التجائے نظر کو سمجھ نہیں سکتا
وہ خاک سمجھے حقیقت مرے فسانے کی
جنونِ بے خودی دورِ عشق کیا کہیے
نہ اب قفس کی خبر ہے نہ آشیانے کی
جگر میں درد نگاہوں میں سوز، لب پہ آہ
یہ روئیداد ہے سنیے مرے فسانے کی
وہ خوش نصیب ہیں تحسینؔ جن کو راس آئی
ہمیں تو راس نہ آئی ہوا زمانے کی

تحسین سروری



۸ جون کو ہم کشمیر کے لیے روانہ ہوئے جموں تک بدستور تپش رہی۔ جموں کے بعد ہوا خنک اور راستہ کسی قدر دلچسپ تھا۔ پرخطر نشیب و فراز اور پیچیدگیاں عقل انسانی کو متحیر کر دیتی ہیں۔ اوپر سے نگاہ ڈالو تو موٹر کی سڑک اونچی اونچی پہاڑیوں اور گہرے گہرے کھڈوں کے درمیان ایسی معلوم ہوتی ہے گویا کسی شوخ بچے نے صفحہ قرطاس پر کچھ ناہموار خط کھینچ دیے ہیں۔ سرسبز و شاداب سر بفلک پہاڑیوں۔ شوریدہ سر ندی نالے۔ شیریں و شفاف چشمے۔ چناب کی پرشور اور رقاص لہریں۔ ہری بھری کھیتیاں اور آتش چنار۔ غرضکہ قدرت کی نیرنگیاں محتاج بیان ہیں

ویری ناگ

یعنی چشمہ ورناگ راستے میں پڑتا ہے۔ اس چشمہ سار کو جہانگیر نے حوض کی شکل میں بنایا تھا۔ سرد و یخ بستہ پانی ایک مربع عمق میں جمع ہے۔ پانی انتہائی شفاف ہونے کے علاوہ قطعی نیلا ہے۔ یوں سمجھیے کہ نیلم کے کٹورے میں شبنم بھری رکھی ہے۔ یا آسمان کی ردائے نیلی کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر بچھا دیا گیا ہے حوض میں خوبصورت مچھلیاں بکثرت موجود ہیں جو کہ ہر آنے والے کا خیر مقدم کرتی ہیں متصل ہی ایک باغیچہ ہے۔ جہاں کی گھنی چھاؤں۔ سبزے کا فرش پھلدار درختوں کی جھکی ہوئی گھنیری ڈالیاں اور چشمے کا شفاف پانی قدرت کی فیاضی اور مہمان نوازی کی بہترین مثال ہے۔ کل کا دن بوٹ میں گذرا۔

جھیل ڈل

ڈل لیک" کو ایک وسیع و شفاف نالہ دریائے جہلم سے ملاتا ہے۔ ہم سرینگر سے بذریعہ بوٹ ڈل کے مناظر شالامار اور نشاط باغ دیکھنے روانہ ہوئے۔ "ڈل لیک" سبز پوش اور بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ نیلے پانی میں کنول کے پھولوں کی یہ کثرت ہے کہ گویا پھولوں سے بھری چنگیر رکھی ہے۔ کہیں کہیں مصنوعی زمین کے تیرتے ہوئے قطعات تو کہیں پانی کھیتیاں ان دلچسپیوں میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ بطخوں اور مرغابیوں کی کنول کے حسین پھولوں سے کلیلیں۔ ٹھنڈی اور عطر بیز ہوا کے سرد و نمناک جھونکے سرود کیف آفریں نسیم ـــ ایک ناقابل بیان سماں ہے۔

شالامار باغ

ڈل کے پرلطف اور دلفریب مناظر میں غرق ناب شالامار پہنچے۔ یہ جہانگیر کا بنوایا ہوا بہترین باغ ہے۔ سبزے اور پھولوں کی کثرت سے خالی زمین ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ خوبصورت فوارے ـــ مینا کار در و دیوار ـــ پچی کاری کی چھتیں ـــ نفیس منبت کاری اور اعلیٰ کاشی کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک ہی پتھر سے تراشیدہ بلند بلند سنگ سیاہ کے ستون ـــ سنگ مرمر میں سنگ موسیٰ کا کام قابل دید ہے۔ ان مناظر کے درمیان تخت شاہی۔ ملکہ کی نشست گاہ۔ اور کنیزوں کی گلدار چوکیاں لائق ستائش ہیں ـــ افسوس نہ اب مسلمانوں کی حکومت ہے اور نہ وہ سامان طرب۔ نہ کوئی بادشاہ اور نہ ہی کوئی ملکہ مگر نظر اٹھا کر دیکھو تو آج بھی سر بفلک پہاڑیاں شاہی جاہ و حشم اور رعب و داب سے سرنگوں ہیں۔

شاہی جزیرہ

یہاں سے روانہ ہو کر ہم جزیرہ شاہی میں پہنچے۔ جو کہ ڈل کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے وسط جھیل میں ذرا بلندی پر بنایا گیا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر جزیرے کی سیر کی۔ چنار کی گھنی چھاؤں

میں آرام کیا۔ اور بعض دور افتادہ ہستیوں کی یاد نے دل کی گہرائی میں چٹکیاں لیں

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

نشاط اب ہم نشاط کو روانہ ہوئے۔ راستے میں چلے پی۔ آہ انشاط کا نشاط آگیں منظر ناقابل بیان ہے۔ بلند اور حسین پہاڑیوں سے گھرا ہوا نشاط لائق توصیف ہے۔ اس باغ کے سات طبق ہیں۔ جو کہ سیڑھیوں کی مانند پہاڑ کو کاٹ کر اوپر نیچے بنائے گئے ہیں۔ ایک شفاف اور بہت بڑا چشمہ ایک دیو پیکر پہاڑ سے جاری ہے۔ بس یہیں سے باغ شروع ہوتا ہے۔ پھولوں کے قطعات سبزے اور بہترین پودوں کے علاوہ پانی کی تقسیم عہد جہانگیری کی زندہ جاوید یادگار ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ قوت کہربائی کو کوئی علاقہ نہیں۔ ہر ایک درجہ کے بعد پانی بصورت آبشار حوض میں گرتا ہے۔ اور وہاں سے کئی شاخوں اور فواروں میں منقسم ہو کر تخت شاہی کے نیچے سے گذرتا ہوا دوسرا آبشار بناتا ہے۔ فردوس بریں کے سات درجے ہیں۔ سبزے کی کثرت پھولوں کی فراوانی قدرت کی کاریگری اور عقل کی رسائی ہستی باری تعالےٰ کا ثبوت ہے۔

مغرب کے وقت ہم نشاط سے سرینگر لوٹے۔ ڈل کے نیلے اور خاموش پانی پر۔ کنول کے حسین پھولوں کے درمیان سورج کے غروب کا نظارہ۔ اور چاند کا طلوع سرو کے قطاروں کے درمیان۔ سنجیدہ اور متین پہاڑیوں کے پہلو میں زرد رو چاند۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں کسی ملکہ کے جنازے“ کی طرح اس کا سوگوارانہ عکس۔ عطر بیز فضا میں چپوؤں کی دھیمی آواز۔ مجبور دل پر قیامت کا اثر رکھتی ہے۔ ہانجی کا گیت۔ اس کی پر سوز آواز۔ مخصوص کشمیری لہجے میں نہ معلوم مجھے کونسی دنیا میں لے گیا۔ اس خود فراموشی میں مرغاب کی پر درد چیخیں اور مرغابیوں کی تیز آوازیں۔ میری دنیا سے میں رستخیز سے کم نہ تھیں۔

ناسنور اب ہم سرینگر سے ناسنور روانہ ہوئے۔ چند میل موٹر کی کچی سڑک ہے۔ جو کہ دریائے جہلم کے کنارے کنارے نہ معلوم کہاں تک چلی گئی ہے۔ یہاں سے ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ پہلے پہلے بہت ڈر لگا۔ اور طبیعت گھبرائی۔ مگر آخر کار راضی برضا چلتے ہی بنے۔ پہاڑ کا راستہ بہت ہی ناہموار اور تنگ تھا۔ ہر پندرہ دس منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی پہاڑی ندی یا نالہ آن پڑتا تھا۔ اور پھر اس کو گھوڑوں پر عبور کرنا پناہ بخدا — الغرض الغرض کرکے ”شوپیان“ پہنچے۔ یہ قصبہ پہاڑی ڈھلوان پر واقع ہے۔ قطعی بے چراغ تو نہیں مگر زیادہ آبادی نہیں۔ یہاں سے تازہ دم گھوڑے لیکر ہم اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ تنگ و ناہموار راستہ۔ دشوار گذار پگڈنڈیاں گہرے گہرے کھڈ — ہمالہ کی برف پوش سفید سفید چوٹیاں — راستے میں دریائے ویشو کو عبور کرنا پڑتا ہے یہ دریا دو سر بفلک سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان تیزی سے بہتا ہے۔ کہیں کہیں اسی وادی کے اندر کئی شاخوں میں منقسم ہوتا اور ملتا ہے۔ اس کی گذرگاہ نوکیلے پتھروں۔ گہرے غاروں۔ اور پر خطر نشیب و فراز کے درمیان ہے۔

ایک تو پہاڑی راستے کو طے کرکے دریا کی خوفناک وادی میں اترنا ہی قیامت تھا۔ اس پر یہ شور دریا کا گھوڑوں پر عبور کرنا کچھ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا گذری۔ گھوڑے تا بہ کمر غرقاب تھے — خدا خدا کرکے دریا تو عبور کیا۔ اب پھر چڑھائی تھی اونچے نیچے پتھروں پر پانی سے شرابور گھوڑے ڈگمگاتے ہوئے پاؤں سے یہ کٹھن منازل طے کر رہے تھے۔ کہیں پاؤں جمانے کو جگہ نہ تھی۔ اگر کہیں بھولے سے نیچے نگاہ جا پڑی۔ تو وادی ویشو کی پر خطر اور عمیق گہرائیوں میں ویشو کی متموج اور چھاگدار لہریں۔ اس کا تیز بہاؤ خون خشک کرنے کو کافی تھا۔

بعد از خرابیٔ بسیار ڈیڑھ گھنٹے میں آدھ میل کا راستہ طے کیا اور ناسنور پہنچے۔ یہ ایک پر فضا مقام ہے۔ پھلوں کی کثرت ہے۔ ہر چیز جو یہاں دستیاب ہوتی ہے نہایت ارزاں ہے۔ یہاں ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ جو کہ ایک باموقع۔ خوش وضع پہاڑی پر بہت بلندی پر بنایا گیا ہے۔ یہاں سے ناسنور کے نواح کی سیر آسانی ہو سکتی ہے۔ منظر نہایت ہی دلکش اور دلربا ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر آبشار اہربل ہے

اہربل

ہم آسنور سے علی الصباح گھوڑوں پر سوار ہو کر اہربل روانہ ہوئے۔ راستے کی پرخطر پہاڑی ڈھلوانیں اور بڑے بہاتے ہوئے چشمے۔ سبزہ زار۔ بے ترتیب و نوکیلے پتھر خالی از دلچسپی ہیں۔ "آمینہ" نے خوش ہو کر ایک "جرمنی" راگ الاپنا شروع کیا۔ میں بھی کچھ گنگنانے لگی۔ گھوڑوں کی سبک رفتاری اور چالاکی قابل تعریف تھی۔ دامن اہربل میں پہنچ کر گھوڑے عاجز ہو گئے۔ اب پیدل چڑھائی تھی۔ جوں توں کر کے چوٹی پر پہنچے۔ یہاں سے نظارہ قابل دید تھا۔

دریائے اہربل دو سلسلہ ہائے کوہ کے درمیانی تنگ و ناہموار وادی اہربل میں نہایت تیز روی سے بہہ رہا تھا۔ تیزی کا یہ عالم کہ تمام دریا جھاگوں کا جا در نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں بہتے ہوئے پانی میں نشیب و فراز انسانی حیرت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ دریا بہت بلندی پر سے آتا ہے۔ اس کا منبع کوثر ناگ ہے۔ جو یہاں سے ۱۲۴ فٹ اونچائی پر ہے۔ کوثر ناگ پہاڑوں میں گھرا ہوا برف کا ایک سمندر ہے۔ جسمیں کئی قدرتی چشمے ہیں۔ یہیں سے یہ برفانی دریا نکلتا اور میدانی علاقوں میں جا کر جہلم کے پانیوں میں مل جاتا ہے۔ اہربل کے مقام پر کئی آبشاریں ہیں جن کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ہم وادی میں اترے۔ یہاں عین آبشار کے۔ دہانہ ایک قدرتی چٹان آگے کو بڑھی ہوئی تھی سبزے اور پھولوں سے لدی ہوئی۔ چٹان اتنی بڑی کا ہے گویا کہ قطعہ زمین معلق ہے۔ اسی جگہ ہم نے ڈیرے ڈال دیے۔ جنگلی پھلوں۔ پھولوں اور پودوں کی کثرت ہے۔ غرض کہ وہ منظر ہے کہ ایک ایک پتی کو دیکھنے کے لیے عمر نوح درکار ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چشمہ ہے جو معدنی پانی اور گندھک کی آمیزش کی وجہ سے بہت مشہور ہے — تمام دن اہربل کے کنارے گذرا۔ آہ! شام کا نظارہ کس قدر دلفریب تھا میں سب سے علیحدہ ایک چٹان پر جا بیٹھی۔ اور اپنے پانوں یخ آلود پانی میں لٹکا دیے۔ دریا کی روح پرور روانی اور طرب افزا رفتار سے دھیمے اور تیز نغمے دصوت اور پنچم کا سریلا راگ الاپتے ہوئے نکل رہے تھے۔ میں خاموش تھی اور محو تخیل۔ میں نے کہا اے اہربل کے تیز پانی تو اپنی آہ و فغاں بند کر دے — بس اپنے درد بھرے راگ بند کر — میری روح کو جو کہ جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ساکت و صامت ہے متلاطم نہ کر۔ پانی کا ایک تیز ریلا آیا۔ یوں معلوم ہوا کہ دریا کچھ دیر کے لیے بہنا بھول گیا۔ مگر — آن واحد میں اپنے مجنونانہ انداز اور شوریدہ سری سے ناصیہ فرسائی کرتا ہوا آگے بڑھا۔ مشتاق وچشم براہ چٹانوں سے ٹکرایا۔ اور آبشار بنکر اٹھا گہرائیوں میں جا گرا۔ سورج پانی کی چمک سے خیرہ ہو کر شرما رہا تھا۔ تاب مجال نہ پا کر اپنا طلائی زرین تاج زمردیں کہسار کے سر پر رکھ دیا۔ اور خود مغرب کے خون آلود دامن میں منہ چھپا لیا۔

لو! عشق و محبت کا راز داں — تنہائی کا مونس — کلیوں کو پھول بنانے والا۔ غنچوں کو چٹکانے والا۔ عاشقوں کا پردہ دار۔ الفت کی باتوں کو افسانے کا رنگ دینے والا۔ نشۂ محبت سے مخمور — بادہ الفت سے معمور۔ شراب مسرت سے چور۔ چاند نکل آیا —

روح کی بے قراریاں — قلب کی بے چینیاں تا ہوں کی سوگواریاں عود کر آئیں۔ آ چلا آ!! — میرے چاند میرے محبوب! اس آتش نہانی پر اپنی ٹھنڈک کا چھایہ رکھ۔ اس ناسور کو

کو جو تراوش کا عادی ہے۔ اپنی نورانی شعاعوں سے منڈل
کر دے۔ مجھے اپنی ضوفشاں اور انوار ریز کرنوں سے
ڈھانپ لے! اے کشتۂ محبت کو اپنی چاندنی کے کفن
میں دفنا دے — پوشیدہ کر دے — چھپا دے۔
سب آب جو نظروں سے نہاں کر دے۔ اور وہاں لے چل
جہاں سے تو آیا ہے۔ جو تیرا ملجا و ماوا ہے — منبع ہے
آ چل! چلیں — دونوں مل کر — بارگاہِ حقیقی میں اس نئی دنیا
میں — نئے خوشگن ماحول میں — بلا کا سکوت —
مہیب نظارہ — عظیم خاموشی — وادیاں سنسان
ویران — راست قامت سرو خدنگ حیران و پریشان
ہوا ساکن — فضا متحرک — قدرت کا ذرہ ذرہ ساکت
و صامت — اور دریائے اہرلب ...؟ سب چیزوں
سے کنارہ کشی کرتا ہوا — اپنے پھیلے ہوئے راستوں کو
سمیٹتا ہوا — جنگا نہ وار مجنونانہ انداز سے۔ منزلِ مقصود
کی تلاش میں حیران و سرگردان — عالم یاس و ناامیدی
میں — اپنی پرشور و مشتاق لہروں کو دوش پر اٹھائے
ہوئے بہہ رہا تھا — اور میں —؟ قدرت کی برق پاشیوں
اور صاعقہ اندازیوں سے مسحور و مبہوت — اس کی کرشمہ
سازیوں سے مرعوب و مفتون — اس کی تجمل آفرینیوں
اور رعب و حسن و جمال سے حیران و پریشان — اس
ملکۂ حسن کی ضیا باریوں اور ضو افشانیوں سے مسرور و مبتہج
وفورِ جذبات و حسیات سے متزلزل و مرتعش۔ کنارِ اہرلب
پر محوِ تخیل تھی — چار سو سنگی چٹانیں — دیو پیکر سلسلہ ہائے کوہ
شعریت اور رومان سے پر وادیاں — میں گم تھی۔
کھوئی ہوئی تھی — پانی کے مناظر میں غرقاب تھی۔ کاش کہ ان
میرے غموں میں انحطاط — میری تکالیف میں کمی ہو سکتی —
ان شادابیوں کے درمیان — ان خوشیوں اور روح پرور
مسرتوں کے ہوتے ہوئے۔ ان مناظر کی موجودگی میں —
اس بہشت کی رہائش میں یہ غم کی آمیزش جو کسی کا شبہ پیدا
کرتی ہے نہ رہتی —

کنگ وٹن

سیدا اہرلب سے بیہرہ ہو کر ہم گھوڑوں پر کنگ وٹن روانہ
ہوئے۔ راستہ انتہائی پرخطر۔ بہت ہی دلفریب جاذب نظر
ہے۔ بلند لبند — سربفلک چیل و دیودار کی دو قطاروں کے درمیان
آسمان دوز چوٹیوں کے زیر سایہ — سبزہ بیگانہ سے ہمکنار یہ
جادہ پرپیچ عالم یاس میں شعاع امید کی طرح نظر آتی ہے
بائیں ہاتھ کو سنجیدہ متین چٹانیں — رواں دواں چشمے
خود رو عجیب و غریب درخت و پودے — پھولوں سے
ملبوس چٹانیں پر وقار چنار — روشن و منور لکہ ہائے ابر قابل
دید ہیں — اور دائیں طرف — اہرلب کا تیز و شوریدہ پانی
عمیق ترین گہرائیاں — زمردیں لہلہاتا ہوا سبزہ۔ انسانی
کمزوری سے خائف و متاثر نظروں کو نہایت ہی بھلا معلوم
ہوتا ہے۔ راستے کا زیادہ حصہ پیدل چلنا پڑا کیوں کہ گھوڑے
قاصر تھے۔ راستے میں ایک پرفضا مقام پر تھوڑی دیر قیام
کیا۔ اور پھر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ تین گھنٹے
کے سفر کے بعد مرغزار کنگ وٹن میں داخل ہوئے۔ یہ سلسلہ ہائے
کوہ کے درمیان ایک وسیع میدان ہے۔ اس کی سرسبزی و
شادابی حیطہ بیان سے باہر ہے۔ ہر طرف قدرت کی
نیرنگیاں اور اچھوتے سبزے کی ردائے مخملی پر رنگین پھولوں
سے گلکاریاں قابل دید ہیں۔ اس مرغزار کے زمردیں نشیب و
فراز سبز پوش پہاڑیوں کے پہلو میں ایسے معلوم ہوتے ہیں۔
گویا کہ حسینۂ قدرت نے اہرلب کے شوخ و شفاف
پانیوں میں غسل کرنے کے لیے۔ اپنی دھانی خمار۔ چمکیلے
خورشید خاور کی ضیا پاش کرنوں میں پھیلا دی ہو۔ اور
یہ نشیب و فراز اس حریری خمار کی شکنیں ہیں۔ نرم لچکدار اور
شاداب گھاس کا مخملیں فرش — خوش گلو اور دیدہ زیب
پہاڑی چڑیوں کی سہانی بولیاں ہمہ اقسام اور مختلف

الوون ٹیوں کی کثرت سے حسین اور خوبصورت پھولوں کے وسیع قطعات پر بے قراری سے منڈلاتا۔ ہر گل کی بولیناور چشم زدن میں دوسرے کا متلاشی۔ بنا ہیرت انگیز ہے۔ ہم یہاں ڈاک بنگلے میں ٹھہرے۔ جو کہ ایک مناسب باموقع اور نظر فریب جگہ۔ اسی شاداب سید ان کے ایک حصے میں اور وادی اہربل کی آغوش شوق میں بنایا گیا ہے۔ چار ہمالہ کی برف سے ڈھکی ہوئی سفید چوٹیاں بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں سورج کبھی تیز نہیں چمکتا۔ موسم برسات کی سی سہانی رت رہتی ہے۔ دوپہر کے وقت نرم نرم دھوپ نکلتی ہے۔ جو کہ نہایت ہی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں مشغول شہد کی مکھیاں مصروف تنا پرند۔ اور تروتازہ چمکدار چرند۔ اس باناتی فرش پر مصروف کار اور چشموں کے راگ میں محو ترنم نظر آتے ہیں۔

لیجیے مطلع ابر آلود ہے۔ بادل گھر گھر کر آرہے ہیں دیوبیکر پہاڑوں کے پس پشت گھٹاؤں کا ذخیرہ ہے۔ بادل بلندیوں پر سے امنڈ امنڈ کر آتے اور نیلے آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چشم زدن میں چاروں طرف سے سرمئی گھٹائیں چھٹیں۔ اور بستی کے رہنے والوں کے حال زار پر زار وقطار رونے لگیں۔ سیدھے سادے کشمیری۔ بھولے بھالے حسین ذمیل کو جرنکیے خوش ہونے اور تالیاں بجانے لگے۔ درختوں نے دھانی قبا زیب تن کرلی سبزہ لہلہانے لگا۔ کلیاں مسکرادیں۔ ننھے چٹک گئے۔ پھول کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نرگس نے اپنی پوشیدہ زخم عشق سے مندمل ہوئی بیمار آنکھوں کو کھول دیا۔ سوسن کی بے باکی اور زباں درازی میں نمایاں اضافہ ہوگیا۔ بنفشہ نے اپنے حلم سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اور اپنے مغرورانہ انداز سے دلوں کو مسخر کرنے لگا۔ سنبل پیچ پیچ نے اپنی زلفوں کے دام دور دور تک پھیلا دیے۔ لالے کے داغ نمایاں ہوگئے غرضیکہ گیتی کے ذرے ذرے اور عالم کے پتے پتے میں جوش نظر آنے لگا۔ کنول کے حسین و خوشنما پھولوں نے جب یہ منظر دیکھا۔ تو اپنے ماحول سے متاثر ہوکر نرگس شہلا سے ساز باز شروع کردی۔ گل شب بو کے حنائی شگوفے آتش رقابت سے سوختہ ہوکر آگ بگولہ ہوگئے۔ اس آتش بے دود نے نرم دل اور خالی از جذبات چاندنی کو بھی بیدار کردیا۔ وہ تو مدت سے ان رازوں کی حامل تھی۔ اس نے یہ سب کچھ دیکھا۔ ان آشفتگیوں پر ایک انداز، اور پر از اغماض دزدیدہ نظر ڈالی۔ اور اپنی نگاہیں اہربل کے تیز پانیوں پر جما دیں۔ چاندنی کا سیمیں اور بلوریں عکس اہربل کے شفاف جھاگوں میں کھو گیا۔ اب تو سبزے کو بھی اپنی بیگانگی کا احساس شروع ہوا اور وہ کسی نہ کسی کو اپنانے پر مجبور ہوگیا۔ اس کا معیار بہت بلند ہے۔ پہلے تو اپنے جوانب میں نگاہ کی۔ کسی کو نہ پاکر سوئے فلک دیکھا۔ خوبصورت و راست قامت بلندیاں اس کی سرکشی پر متحیر ہوگئیں بادلوں نے سر اٹھا کر دیکھنا شروع کردیا۔ اور سیاہ گھٹائیں ایک مرتبہ پھر۔ آسمانی نمینیوں کو پہلو میں لیے ہوئے۔ بیل بے زنجیر کی طرح ادھر سے ادھر سرگرداں پھرنے لگیں۔ بجلی اس منظر کی تاب نہ لاسکی اور اپنے ماضی کو بھول کر سب کو بڑھ بڑھ کر طعنے دینے لگی۔ اب پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ طاقت برداشت نہ رہی۔ پانی کی موٹی موٹی بوندیں دیوانہ وار نیچے اترنے لگیں۔ رم جھم۔ رم جھم کا ساز بجنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ہی وہ آتش شوق جو سوز عشق سے دہک رہی تھی سرد ہوگئی۔ سب کی دل کی لگی کا علاج ہوگیا —— افسوس۔ صد افسوس۔ اس دنیا اور اس کی فانی خواہشوں پر۔ تف اس کے شوق پر۔ اور حیا رحمت اس جوش پر جو آن واحد میں یوں سرد ہوجائے بجھ جائے۔ پامال ہوجائے —— یہ لو! ایک نیا شگوفہ کھلا۔ تمیدہ دل اور بے قرار قمریاں۔ دور دور دراز سے کٹھن منازل طے کرتی ہوئی۔ بادلوں کے دوش پر سوار پراں۔ افتاں وخیزاں۔ آن پہنچیں۔ اور خوبصورت شمشاد

سے ہمکنار ہونے لگیں۔ مدت کے بچھڑے مل گئے۔ قصہ ہجر اور افسانہ شوق باری باری کہہ سنایا اور ہر ایک نے اپنے مخصوص انداز میں ترانہ مسرت و بہجت گا سنایا — ؎

موسم گل میں بہم قمری و شمشاد ملے
اک ہمیں چھٹ کے نہ تجھ سے ستم ایجاد ملے

حمیدہ بانو مخفی

نظیر کو اس دنیا سے کوچ کیے ہوے تقریباً ایکسو پندرہ سال سے زیادہ گذر گئے۔ لیکن زمانے کی حالت وہی ہے۔ سنہری گیند مشرق سے اچھلتی ہے اور مغرب میں روپوش ہوجاتی ہے۔ لاجوردی چادر میں ستارے ٹکے ہوے ہیں ہر شے پر ایک صنعت صانع اعلیٰ نمودار ہے۔ بزم نظیر ان جذبات کے سیلاب میں پھنسی ہوئی ہے اور محسوس کر رہی ہے کہ فطرت کے سلسلے میں کونسا سلسلہ مفید ہے جو ہر علمی فن کے لیے اصول مقصد میں سب سے زیادہ مسرت اور فائیدہ پہنچانے والا ہے جس کے زیر اثر زیادہ سے زیادہ تعداد توجہ کرنے اور بار آور ہو۔

یہہ بساط دائرۂ علم کی توسیع ہے اور کلام نظیر ہندستانی زبان کا مجموعہ اور نصایح کی کنجی قطرہ میں دریا بھرا ہوا ہے جس کے لیے کتب خانہ ایک خاص جگہہ ہے جہاں ہزاروں مصنف ایک وقت میں زندہ ہوتے ہیں اور تدبیر منزل میں ترقی یا آبادی کا ذکر بھی ہی مقام ہے جہاں اہل معاملہ یا ذوق شوق کا مجمع ہوتا ہے۔ اور ایک دوسرے کو پیدا کرتا رہتا ہے مگر یہاں نظیر کے نام سے یہہ جگہ بھی خالی نظر آتی ہے۔ واقعات اور ترتیب نظم یا شاعر کی سوانح عمری جمع کرنے کا بھی یہہ ایک سبب ہے جہاں مختلف دور کی نظمیں مختلف عہد کے دیوان مختلف زمانے کے قصاید اور اصناف شاعری پر بحث کی جاتی ہے جس کے دیکھنے کے لیے۔ عمر نوح اور خریدنے کے لیے خزانہ سلطانی درکار ہے۔

تاہم آج کل اس قسم کے مشاغل جاری ہیں۔ کتب خانہ نہ سہی رسل اور رسایل اس مطلب کی ادائیگی میں حصہ لے رہے ہیں اور مفید ثابت ہوے ہیں۔ کچھ تو وہ جو کتاب کی شکل میں ترتیب دیے جاچکے اور کچھ وہ ہیں جو وقتاً فوقتاً اخبار اور رسالہ جات کے ذریعے عوام کے مطالعے سے گذرتے رہتے ہیں۔

لیکن قابل ذکر دارالترجمہ حیدرآباد دکن نیز جامعہ عثمانیہ ہے جہاں صدہا کتابوں کا مفید ترجمہ ہوچکا ہے اور ہو رہا ہے اور رسالہ ہندستانی ادب بیش بہا خدمات انجام دیرہا ہے۔

لامحالہ اس عمل سے یہہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شوق روز بروز بڑھ رہا ہے گویا دریاے نیل میں فطرت کا جہاز چلا جارہا ہے ہر شے اس طرف کھنچی چلی جارہی ہے اور جب یہ ساحل پر پہنچے گا تو دنیا کے بہت سے عجائبات اپنے ہمراہ لیے ہوے ہوگا ؎

رواں جنازہ ہے دوش نسیم پر بلبل
برنگ نکہت گل ہیں کسی پہ بار نہیں



افسانہ نگار کی حیثیت سے جب نظیر کی زندگانی پر نظر ڈالی تو ادبی۔ اخلاقی۔ علمی۔ تاریخی۔ معاشرتی اور تمدنی مسئلہ درپیش ہوگیا اس لیے کہ افسانہ نگار کا مقصد صرف واقعے کا بیان کرنا ہی نہیں ہوتا ہے جیسا کہ آجکل رواج ہے بلکہ تذکرہ یا ادبی ذخیرے کو موقع بموقع اس طرح کھپانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے کہ کسی شخص کو گمان بھی نہو کہ یہہ مسایل عمداً یہاں کسے گئے ہیں یا زبردستی درج ہوے ہیں اس کا ہی نام روزمرہ میں سلاست صفائی اور روانی ہے جہاں دو حدیں آکر مل جاتی ہیں جس سے حکمت اور عظمت کے اصول جھلکنے لگتے ہیں۔

اس نقطہ نظر سے نظیر لسانی حیثیت سے نہیں بلکہ ادبی ہند کے مجموعی خیالوں کا سرچشمہ معلوم ہوتا ہے جو غیر معمولی دماغ لے کر آیا تھا اور ہندی آرٹ کا بہترین نمونہ ثابت ہوتا ہے نہ صرف اسلامی نقطہ نظر سے بلکہ ہندو مسلم دونوں کی مشترکہ جائیداد ہے اور گمنام ہے۔

ادب کا تعلق براہ راست ہر ملک کی ایک خاص جماعت سے ہوتا ہے جس کے لیے شاہکار تصنیف کیے جاتے ہیں۔

ماہرِ فنِ ادب سنگ تراشی کرتے ہیں۔ مصورِ ادب قلم کو حرکت دیتے ہیں۔ مغنی اپنا راگ چھیڑتے ہیں تو انسانی دماغ اس مختصر جماعت سے فائدہ حاصل کر کے عملی زندگی کا ثبوت دینے میں مشغول ہو جاتے ہیں مگر نظیر کی زندگی میں یہ اتباع خال خال بھی نظر نہیں آتا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح سیاسی تقسیم نے صوبوں کی قدیم حدود کو مٹا دیا اسی طرح علم اور عمل کے پجاریوں نے خواہ شاعر ہوں یا غیر شاعر ایک صوبے سے دوسرے صوبے کو منتقل ہونے کے بعد بیگانوں میں شمار کرا دیا نظیر پر ہی کیا منحصر ہے آگرہ جو قدیم دار السلطنت بے نظر انداز کر دیا گیا۔

اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں ایک نہ ایک ہستی ضرور گذرتی ہے جو ملک کے ہر صوبے میں ممتاز حیثیت کی مالک ہو چکی ہے۔ لیکن سو سال گذر جانے کے بعد جب کہ ان کا نام لیوا تک نظر نہیں آتا ارباب ذوق و شوق میں بحث جاری ہے اور نہایت معقول تلاش اور جستجو ہے کہ میر کون تھے نظیر کس زمانے میں گذرے اور غالب کا وطن کیا ہے

ان تمام واقعات پر ایسے نازک وقت میں غور کرنا یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آفتاب کو چراغ دکھانے سے کم نہیں۔ روشناس کرانا مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں۔ اس لیے کہ میر اور سودا کا تارک وطن ہونا نام آوری کا باعث ہے شاگرد یا ہمدرد ادب نے اس طرح سراہا اور سراہ رہے ہیں۔ کہ اگر اس کے لواحقین بھی کوشش کرتے تو کامیاب نہ ہوتے اور نہ یہ صاحب دیوان کہلاتے بلکہ نظیر کی طرح گمنام رہتے اس لیے کہ یہ اپنے مرکز پر قایم رہا اپنی ہٹ پر اڑا رہا۔

نظیر کا وہ کلیات جو بلا امداد کسی کے سنہ ۱۸۶۷ء سے شایع ہوتا چلا آرہا ہے اور کسی خاص اہتمام کے ساتھ نذر عقیدت نہیں ہوا اور نہ مرحوم کے جانشین فرزند دلبند میاں امیر کو نظرثانی کرنے کا موقع دیا بلکہ نامعلوم طریقے پر عوام کے شوق نے نظیر کو شاعروں میں شمار کرا دیا۔ اکثر و بیشتر اوراق تشنہ ہیں ترتیب ابیات اور صحت العائل کے محتاج بھی ہیں جس میں نہ تو کسی ہمعصر کا مقالہ شامل ہے اور نہ کسی ادیب کے دماغ کا کوئی جز درج کلیات ہے۔ بلکہ کسی گمنام بزرگ کے خاتمہ طبع پر اس طرح لکھا ہے۔

" ارباب صافی مذاق کو مژدہ طرب افزا ہو کہ اس زمان مسرت افزا میں کلیات نظیر اکبرآبادی جس میں مصنف باکمال نے ہزاروں طرح کے پند و نصایح چٹکلوں اور مثالوں میں نظم فرما کر خواب غفلت اور میٹھی نیند سونے والوں کو کس کس حسن ادب سے جگایا ہے کہ جواب نہیں رکھتا۔ حق تو یہ ہے کہ اگلے لوگوں کے کلام بھی عجیب پر تاثیر ہیں کہ ہر زمانہ ہر وقت اس کا مداح اور ہر صغیر و کبیر اس کا گرویدہ ہے۔ اگر چشم ظاہر سے کلیات کو دیکھو تو طرح طرح کی دلگی کی باتوں اور مذاق کی حکایتوں سے مملو ہے اور اگر دیدہ حق بیں سے بغور تامل ملاحظہ ہو تو سراسر دنیا ناپائیدار کی مذمتوں اور چرخ کج رفتار کی شکایتوں کا دریا بہہ رہا ہے۔

وہ کون دل ہے جس میں محبت دنیا کا غم نہ بو یا گیا ہو۔ اور وقت درو ثمرہ ناکامی نہ ملا ہو اور وہ کون سر ہے جس میں الفت گیتی اور اس کی نیرنگیوں کا سودا نہ سمایا ہو اور سنگ حوادث سے چکنا چور نہوا ہو" ان چند جملوں کے بعد کوئی کتاب کوئی تاریخ ایسی نظر نہیں آتی جس میں نظیر کا ذکر تو ذکر نام تک درج نہیں ہے۔ ہاں۔ آب حیات جس میں مصنف نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی ہے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے استاد کو تمام پر ترجیح دینے کے بعد ہی نظیر کے نام پر عقل سے کام لیا ہے اور ہندستانی پرائمری کتاب میں اس طرح پھول چڑھائے ہیں۔

" نظیر۔ شیخ ولی محمد اکبرآبادی عوام ہندستان اس کی شاعری کا پایہ فرق شعری نازک سرمایہ بلند جانتے ہیں۔ اطراف و اکناف ہند میں ایسی شہرت پاتی ہے کہ غالباً آسمان اگر چاہے کہ اس کا نام صفحہ عالم سے مٹا دے تو یہ اس سے ممکن نہ ہو۔ پر گوئی کا یہ عالم ہے کہ تعداد ان کا مد ہوئی اور لشت سے

ہر ایک کی زبان پر سو سو خمس حد اگانہ سے کم نہوں گے جو کہ اس طرح کی زبان درازی سخن کو خبط کرنے میں اغلب وہ کلام بے انتقام شالیستہ آفریں نہ پایا۔

اس کے بعد حضرت الیاس صاحب برنی ناظم دار الترجمہ حیدر آباد کا نام نامی ہے جس کو شکایت ہے کہ لوگوں کے حالات زندگی کی فراہمی میں ضمنی دقتیں پیش ہوئیں کہ شاید کتاب لکھنے میں اتنی مصیبتوں سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ خود ہی خط لکھے دوسروں سے بھی لکھوائے مگر بہت کم حضرات نے اتنی زحمت گوارا کی۔ کہ زندگی لکھ کر روانہ فرماتے مجھے اس کی شکایت بہت کم ہوئی کہ حالات زندگی لوگوں نے دینا نہیں پسند کیا۔ انکی چیز ہے ان کو اختیار رہے دقت تو یہ ہے کہ لوگ تحریری وزبانی وعدے برابر کرتے تھے کہ انشاء اللہ جلد سوانح عمری بھیجدوں گا مگر یہ انشاء اللہ بھی وعدہ فردا سے کم ثابت نہوا۔ اس کے باوجود جو مواد آپ نے جمع کیا ہے بہت خوب ہے اور جو خیال آپ نے ظاہر کیا ہے وہ ادیب ہونے کا ثبوت ہے۔

بعد ازاں ڈاکٹر رام بابو صاحب سکسینہ کا نام نامی قابل توجہ ہے جن کی ذکر تلاش نے نظیر کو گزٹ میں شامل کرکے زندہ کر دیا۔ عوام کے روبرو سرخرو کر دیا مگر آخر میں ایک جملہ نہ معلوم کس ذہن میں کس خیال میں چسپاں فرمایا ہے کہ نظیر کا کلام قدیم طرز لکھنو کو چھو بھی نہیں گیا۔

رسالہ شاعر نے لکھا ہے اور بلا کسی دلیل کے لکھا ہے کہ نظیر نے شاعرانہ مذاق اور رنگین طبیعت پائی نہیں، اس لیے جوانی کے لہو لعب اور مختلف تفریحات میں مشغول رہے اور مختلف سوسائیٹیوں میں شامل ہو کر ان کے مختلف کھیلوں میں حصہ لینے لگے۔ بہرحال یہ خبر رسالہ نگار ۱۹۳۸ء اور رسالہ عالمگیر ۱۹۴۲ء ماہ مارچ میں درج ہے .... یہ ایک نکتہ اور دقیق نکتہ ہے .... کہ دار السلطنت آگرہ مسلمان بادشاہوں کے جاہ و جلال کی یادگار رہے۔ مسلم اولیا اللہ کی خانقاہوں کا محافظ ہے جہاں کی مسلم آبادی ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ نثر اور نظم اردو کی

نمایندہ ہے۔ جو ہر شے پر حکمراں تھا۔ اس کے دوسروں میں یاد ماضی اور حال میں فرق محسوس کرنا کوتاہ نظری ہے۔ ہر شاعر اپنے لفظوں کو چھوڑتا جا رہا ہے جس سے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ زبان کا ڈھنگ لوگوں کے دلوں پر حسن پیا کے پردے میں جلوہ فگن ہے یا اقرار رہا ہے کہ میں زمانہ ماضی کی یادگار ہوں جو تفریح وطبع کے ساتھ انشا پرداز یکا جز اعظم مانا جاتا ہے۔

یہ میراث صدیوں قبل سے آگرہ کو نصیب ہوئی۔ اس کاخ سے دولت کا سمندر بہتا تھا۔ نہ صرف دلپذیر باتوں کا منظر تھا بلکہ ٹکسال ہے۔ اور جب یہی شاہ جہاں غازی رحمۃ اللہ علیہ کے اشارے سے دہلی منتقل ہوا تو سند بنگیا اور جب یہاں بھی زوال آیا تو لکھنو کے رنگیں مزاج نوابوں نے قدردانی کی ہر اطاعت سے آزاد ہو کر ایجاد اور اصلاح میں پیش قدمی کرکے اپنا سکہ جاری کر دیا۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ وہاں یہی متروک اور مردود کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ زبان سے کچھ ادا ہوتا ہے قلم کچھ اور کہتا ہے گویا عالم گوناگوں خلق خدا ملک خدا کا مصداق ہو رہا ہے۔ جس کا امتیاز کرنا حد امکان سے گذر کر معذور اور مجبور رہے اور نہ یہ تمیز ہو سکتی ہے کہ محل اور ٹکسالی زبان میں فرق کیا ہے...... ہاں۔ حسن اور عشق کا ناگزیر عنصر افراط و تفریط پر ختم ہوتا ہے۔ نفسیاتی رعنائیاں جوش پر ہیں اور یہی مقبولیت کا درجہ ہے جس سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔

جس زمانے میں ۔نظیر۔ میدان عمل میں آیا۔ یہ نہایت خاموش مگر باعمل زمانہ تھا۔ اس وقت نہ تو ریل تھی نہ ڈاک و تار گھر نہ مطابع جس طرح کہ آج کل گرما گرمی ہے کلام کے پڑھنے یا پڑھانے کی ہما ہمی ہے ایسے ناگفتہ بہ زمانے میں مفکر شاعر نے بلند ادب کی تخلیق کو فکر و جمال کے آغوش میں پرورش کرکے ذہنی اور راحت کے گہوارے میں جوان کیا۔ جوں جوں مرحوم کے حالات یا کارنامے منصہ شہود پر آتے جائیں گے عظمت اور بڑھ گی کا سکہ دلوں پر بیٹھتا جائیگا۔ جس کی تائید میں ڈاکٹر فیلن کا قول ہے

کہ شعرا ہند میں نظیر ہی وہ شاعر ہے کہ شاعری کے معیار پر پورا اترا۔ جس میں شیکسپیر کی عظمت کا راز پنہاں ہے جس نے دنیا کی ہر شے کو جنگلوں میں نظم کرکے آنیوالی نسل کی ہدایت کے لیے جس حالت میں دیکھا اسی طرح پیش کرکے یادگار قایم کردی اور صحیح معنوں میں شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔

درحقیقت مغربی ادیب نے نظیر کو اور دنیا کو اچھی طرح سمجھ کر لکھا ہے مشرق اور مغرب کا اس طرح توازن قایم کردیا کہ جواب نہیں رکھتا۔ نظیر کو ہر سوسائٹی میں شامل دیکھنے والے ادیبوں کو دیکھنا ضروری تھا کہ جب نظیر نے ہوش سنبھالا ہے تو دارالسلطنت اکبرآباد کی ہر سوسائٹی سلطنت مغلیہ کی طرح دم نزع میں تھی۔ تمام بے فکری اور خرافات میں مبتلا تھے وہاں کی زبان نہایت شستہ اور تہذیب تسلیم کیجا چکی تھی اس لیے اس انقلاب نے مزاج میں تغیر بھی پیدا نہیں کیا۔ بلکہ بیرحم عالموں کے ظلم وستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع انسان کی دلسوزی اور ہمدردی کا مرقع بن گیا اکیس سال کا کشت خون جو سرزمین آگرہ پر ہوا بیسیوں خاندان آن واحد میں بگڑتے دیکھے خود بھی تباہی کے سرمایہ دار کہلائے نت نئے روز کے تغیر سے عزت حاصل کی تو قدرتاً نصایح اور مواعظ قلم کا موضوع بن گیا۔

جہاں قلم نے خوش طبعی یا بمعنی دیگر فحش نگاری کی طرف رجوع کیا ہے وہ دوسری معاشرت کا صحیح نقشہ ہے جو ایام ہولی میں اب بھی ظہور میں آتا ہے اور جو الفاظ وہ استعمال کرتے ہیں بدستور ملکیت میں شامل چلے آتے ہیں ورنہ پھر اس کے بعد کوئی شعر ایسا نہیں ملتا جو قابل گرفت ہو۔

اگر نظیر کے مزاج میں انسانی ہمدردی کا جوش موجزن نہوتا تو وہ اپنی زبان اور قلم کو پند ونصیحت کے لیے وقف نہ کرتا۔ بلکہ جرکین اور رجانصاحب کی طرح ظاہر ہوتا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک دو باتیں کسی انسان میں جمع نہوں تو وہ انسان کامل نہیں کہلاتا ایک توجہ فطری دوسر

زمانے کا انقلاب یہ دونوں چیزیں نظیر کی زندگی میں نمایاں ملتی ہیں۔ اور انصاف کی بات یہ ہے کہ نظیر نے اپنا فرض تو خوب ادا کیا لیکن ہماری بے حسی بھی قابل صد ستایش ہے کہ اس کی تعریف میں ایک حرف نہ لکھا اور لکھا بھی تو خرافات کا مجموعہ پیش کرکے مجرم ٹھہرایا یہ نہ سمجھے کہ ذوق اور شوق کے پھول ہمیشہ شبنم کے پیاسے ہیں بقول نظیر

عاشق کہو اسیر کہو آگرہ کا ہے ملا کہو دبیر کہو آگرہ کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرہ کا ہے شاعر کہو نظیر کہو آگرہ کا ہے

اس کسر نفسی نے معاشرت، تمدن، خیالات اور خدمات کو ایک جگہ جمع کرکے عقیدت کی چادر تیار کی اور وہ اس کی قبر پر پڑی ہوئی یہ ثابت کررہی ہے کہ وہ محض شاعر ہی نہ تھا بلکہ وہ اس مردم خیز خطے میں پیدا ہوا کہ جہاں کے ہونہار بچے کسب وکمال میں ترغیب اور کوشش میں محو رہتے ہیں۔

نام سید ولی محمد تخلص نظیر ابن سید محمد فاروق ہے پیدایش سنہ ۱۱۴۸ھ ضلع بہار میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار دہاں کسی نواب کے مصاحب تھے۔ چونکہ آپ کی شادی نواب سلطان خاں قلعدار آگرہ کی دختر سے ہوئی تھی اس لیے کسی بنا پر وہاں سے علیحدہ ہوکر تاجپوری دروازے میں مستقل طور پر بود وباش اختیار کرلی۔ اور جب میاں نظیر سن شعور کو پہنچے تو ان کی شادی عبدالرحمن خاں چغتائی خلف محمد علی بیگ جو سیدارحین کا سلسلہ نسب حضرت حبیب شاہ وزیر شاہجہانی سے ملتا ہے اور تاج گنج میں مقیم تھے ان کی دختر نیک اختر سے ہوئی جو انقلاب زمانے سے خایف ہوکر زیر سایہ نواب بیگم صاحبہ باندہ گئی بلکہ میں اکبرآباد ہوگئے اور آخر وقت تک یہیں رہے۔

میری نظر سے یہی ہے کہ مادام چونکہ شہر ابعد میں ادا نظیر نے باپ کی شاگردی میں فارسی اور عربی میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ کسی استاد کے آگے زانوے تلمذ نہ

نہیں کیا۔ زور فکر اور جودت طبع نے شعر و سخن میں خود سخود ید طولی عطا کر دیا اور حب الوطنی کی آہنی زنجیر میں ایسے جکڑے کہ ایک قدم آگے نہ بڑھایا نواب آصف الدولہ والی لکھنؤ کی نسبت مشہور ہے کہ ؎

جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ

کے پیغام آئے مگر اب جو کچھ خدا نے دے رکھا تھا قایم رہے اور کہتے رہے ؎

بادشاہ کو نہ لکھا رقعہ کبھی جس نے نظیر ٭ اس شہ حسن کے آئے مجھے فرمان کئی

نظیر نے جس طرح آزاد رہکر اپنے ماحول کو پیش کیا ہے جواب نہیں رکھتا جس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اس کا مقصد پیش نگاہ رکھتے ہوئے ہر نشیب و فراز سے آگاہ کرنے میں نظیر مفید ثابت ہوا۔ جس کے دربار میں نعت و ردیف۔ قافیہ سب غلام ہیں جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا نمونہ کلام ملاحظہ ہو صرف تین بند درج ہیں۔ اس خمسہ کے سات بند ہیں۔

فصل گل اور جوشش پر گلہائے لالہ نازنین
موتیا جوہی چنبیلی سیوتی اور نسترن
آہ بلبل کی طرح کیونکر نہوں ہم خندہ زن
گل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن
گلرخ گلگوں قبا و گلعذار و گلبدن

زلف پر خم خال مشکیں گوشہ گلرخ یاسمن
چشم نرگس لب شکر دنداں بھی ہیں در عدن
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

کس خوبصورتی سے فلسفی بن کر برستیوں اور ہنگامہ سازی کو واضح کیا ہے اس لیے نظیر کو مصور فطرت۔ نقاش حیات۔ الفاظ کا بادشاہ خیالات کا مالک خدمات کا قربانبردار کہا جائے تو بیجا نہوگا۔ رنگ تغزل اور خصوصیات شاعری کے دیگر محاسن مندرجہ ذیل تین بندوں میں ملاحظہ فرمایئے۔ اس گلدستے کے بارہ بند ہیں

دنیا کا چمن یارو ہے خوب یہ آراستہ ٭ سرسبز ہے اس کا ہر سبزہ ہے پیوستہ
ہر پھول کے آنیکا جاری ہے صدا رستہ ٭ ہر شاخ مقطع ہے ہر برگ ہے برجستہ
دنیا کہو تم اس کو یہ باغ ہے سربستہ
کیا دست سے قدرت نے باندھا ہے یہ گلدستہ

یہ ارض و سماں تارے جو آنکھے جھولے ہیں ٭ جن دیو پری آدم یا باد بوئے ہیں
سب وحشی و طائر ہیں یا گھاس کے پودے ہیں ٭ کچھ اور نہیں یارو یہ گل وہی پھولے ہیں
دنیا کہو تم اس کو یہ باغ ہے سربستہ
کیا دست سے قدرت نے باندھا ہے یہ گلدستہ

قدرت کی بنا جس نے اس باغ کی ڈالی ہے ٭ کیا تو ہے نظیر اس میں کیا خوب نہالی ہے
ہر شکل کو ڈھالا ہے ہر شاخ نرالی ہے ٭ سب کا وہی وارث ہے سب کا وہی مالی ہے
دنیا کہو تم اس کو یہ باغ ہے سربستہ
کیا دست سے قدرت نے باندھا ہے یہ گلدستہ

نظمی تخیلات سے دور مخمس۔ مسدس وغیرہ وغیرہ سے نظیر کی ہمہ دانی پر حیرت ہوتی ہے کہ ہر شے سے واقفیت اور یادداشت نے ہر فضا میں فطرت نگاری کے عناصر کا مزہ خود بھی لیا اور دوسروں کیلیے بھی چھوڑ گئے۔ یہ تصنیفیں تالیفیں اور حکایتیں رہتی دنیا تک اسی طرح لہرائی جائینگی جو ایک مورخ اور مصنف کے لیے سدابہار کے پھولوں سے کم نہیں۔ یہی وہ دولت اور حشمت ہے کہ جو نظیر کو ترکے میں ملی اور عبرت آموز ہے وسیع معلومات میں قدرت کی نیرنگیوں پر لکھتا ہے جس کے صرف چار شعر درج اوراق ہیں ؎

تیری قدرت کی قدرت کون پا سکتا ہے قدرت
ترے آگے کوئی فاور کہا جا سکتا ہے کیا قدرت
وہ تو یکتائے مطلق ہے کہ یکتائی میں اب تیرے
کوئی شرک دوئی کا حرف لا سکتا ہے کیا قدرت

زمیں سے آسماں تک تو نے جو جو رنگ رنگے ہیں
یہ رنگ آمیزیاں کوئی دکھا سکتا ہے کیا قدرت
نظیر اب طبع پر جب تک نہ فیضانِ الٰہی ہو
کوئی یہ لفظ یہ مضمون بنا سکتا ہے کیا قدرت

یہ زبان رایج الوقت ہے۔ مگر جس ملک میں اصولوں سے مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو وہاں کا ماحول بگڑ جاتا ہے ہر نئی نسل پہلی نسل سے بدتر ہوا کرتی ہے یہ جماعت ہے یا فرد واحد اس کا قدم روز بروز تنزل اور انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے یہاں تک مقاصد اور مسلک کا تصور بالکل ناپید ہو جاتا ہے بعد ازاں، نسل یا معاشرتی قومیت اس کی جگہ لے لیتی ہے اور وہ نام جو ابتدا میں اساتذہ کے لیے مخصوص تھا منسوبیت سے دور ہو کر ایک نئی دنیا بنجاتا ہے یہی کیفیت آگرہ کی ہے کہ غدر کے بعد سے جو مٹنا شروع ہوا مٹتا ہی چلا جا رہا ہے۔

زبان رایج الوقت نہ سہی فن اشعار کی جھلک حقیقی کیفیتیں سنہری زبان میں نصیحت سے پر ہیں اور شعبہ حیات کو نفع پہنچانے والی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں شاعر ہیں۔ ڈرامہ اور افسانہ نویس ہیں لیکن ان میں سے تعداد میں کتنے ہیں جن کی زبان اور قلم نے کوئی قابل شاہ راہ بنائی ہو تمام اصناف اور موضوعات پر جادو بیانی سے کام لیا ہو جن کے علمی شغف اور ذہنی تعلیم کا چرچہ ہو رہا ہو۔ دراصل شاعر وہ ہے جس کو سامعین سے کوئی غرض نہ ہو۔ انداز کلام سے متعلق یہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتا ہے یہ صفت اگر ہے تو نظیر کے کلام میں ہے جو فطرتاً مذاق سلیم کا اعظم ہے۔ اخلاقی۔ اور واعظانہ شاعری کا سرمایہ دار ہے جو طرز حکومت اور واقعات سے متاثر ہو کر اپنے لباس میں ظاہر ہوا جس کو مرج سے عار ہے۔ آخری غزل سات شعر نذر ہیں ؎

دل اس نے لیا میرا اکنوں بچپاں گیرم
ہے وہ تو کھلے بندوں میں پابہ زنجیرم
دیکھے نہ مجھے کیونکر از چشم حقارت او
وہ سرو جواں یارو من تا نفسیم پیرم
کہتا ہوں جو ٹک یہاں آ کہتا ہے برایں جا
اور جو نہ گیا یہاں سے زخمی شوی از تیرم
جب بیٹھوں تو کہتا ہے خاموش مرا ہستی
کچھ بولوں تو ہوتا ہے آزردہ ز تقریرم
ہر آن جھڑکتا ہے دشنام ہم از تلخی
ہر چند میں کہتا ہوں اے شوخ تقصیرم
کرتا ہوں رہائی کی فکریں تو بے تسکین
کچھ پیش نہیں جاتی تقدیر سے تدبیرم
کیا تجھ سے نظیر اپنا گویم غم خود اکنوں
دل دے کے غرض اون کو دل خستہ و دلگیرم

حمید (تاج محلی)

ماہنامہ **چمنستان** دلی

ہندوستان کے سب محکمہ ہائے تعلیمات سے منظور شدہ۔ دلی کی ٹکسالی زبان اور شستہ و رفتہ اردو کے بہترین نمونے آپ کو صرف چمنستان ہی میں مل سکتے ہیں۔ جو تین سال سے نہایت پابندی وقت کیساتھ شایع ہو رہا ہے۔ چمنستان سے سستا اور عمدہ علمی و ادبی رسالہ آپ کو اور کوئی نہیں مل سکتا۔ دیکھیے ہمارے ملک کے بہترین نقاد چمنستان کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

آغا شاعر صاحب کی ٹکسالی اردو تھی اس کا رنگ اس رسالے میں موجود ہے۔ (خواجہ حسن نظامی)

میں نے چمنستان میں جدید ادب اور قدیم آسان زبان کا دلچسپ امتزاج پایا۔ (احسن مارہروی)

یہ رسالہ دلی سے نکل رہا ہے اور مجھے یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ اس میں اچھے اچھے لکھنے والے شامل ہیں (سرعبد القادر)

نمونے کا پرچہ ۲ کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں۔
منیجر رسالہ چمنستان قصر شاعر دلی

مصور کا جنون

(مسلسل)

پردہ تیسرا

منظر (۱)

(نرس کا مکان۔ قیوم کھانے کی میز پر کھانا ختم کر کے اخبار دیکھ رہا ہے)

نرس (کمرے میں سے سگریٹ کیس اور دیاسلائی کی ڈبیہ لاتی قیوم کے سامنے رکھ کر پوچھتی ہے) اور کیا چاہیے (قیوم کوئی جواب نہیں دیتا) کہو اور کس چیز کی ضرورت ہے اب میں اپنے کام پر جاتی ہوں۔ بار بار پکار کر میرا کام خراب نہ کرنا۔ (قیوم پھر بھی خاموش ہے) کیا ہوا۔ زبان بند کیوں ہو گئی ہے۔ کہو نا کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ (قیوم پھر بھی کوئی جواب نہیں دیتا اخبار پڑھ رہا ہے۔ نرس خفگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے اخبار چھین کر پھینک دیتی ہے۔)

قیوم (گویا کوئی واقعہ ہی نہیں پیش آیا نہایت اطمینان کے ساتھ) ہاں کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔

نرس (غصے سے) کہہ تو دیا۔ کتنے بار کہوں۔ جن جن چیزوں کی ضرورت ہو ایک بار کہہ دو ورنہ میں دوبارہ آنگی نہاؤ نگی نہیں۔ آخر میرا بھی اپنا کام دھندا ہے یا نہیں۔

قیوم (مسکراتے ہوئے) کیوں نہیں ہے۔ کام ضرور کرنا اور خوشی سے کرنا۔ اچھا کچھ کافی اور مل سکے گی۔

نرس ہاں ہے۔

قیوم گرم ہے

نرس بہت گرم

قیوم (ہنستے ہوئے) تب تو مجھے ضرورت نہیں

نرس پھر پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔

قیوم معاف کرنا قصور ہوا بہت بڑا قصور۔ کیوں معاف کر دیا نا؟

نرس تو اب میں جاتی ہوں

قیوم ارے ذرا ٹھہرو ابھی۔ جاتی کیوں ہو۔ ہاں کچھ نمکین پستے ہیں

نرس نہیں مگر میں ابھی بنا دے سکتی ہوں

قیوم نہیں نہیں ضرورت نہیں۔ میں نے مذاق سے کہا تھا۔

نرس مجھے مذاق وغیرہ کی فرصت نہیں میں آپ کی طرح بیکار نہیں ہوں (قیوم کیس سے سگریٹ نکالتا ہے نرس فوراً سگریٹ سلگاتی ہے۔)

قیوم (سگریٹ کا کش لیکر) شکریہ۔ ہاں تو اب تم مجھے اکیلا چھوڑ کر جانا چاہتی ہو۔

نرس کب تک کوٹھے سے کو لگائے بیٹھی رہوں۔ اب تو تم اچھے خاصے ہو (قیوم انکار کے طور پر منڈی ہلاتا ہے) آجکل تو آپ بڑے ہی بحال ہیں۔ (نرس جانے کے لیے پلٹتی ہے)

قیوم (حسرت بھری آواز سے) پیاری....

نرس (پلٹ کر) تم مجھے اس طرح نہ پکارا کرو

قیوم (ضد کے طور پر) نرس تو نہیں اسیطرح پکاروں گا۔

نرس (احتشام یہ ضد اچھی نہیں

قیوم تم مجھے احتشام مت بولا کرو

نرس میں تو ضرور یہی پکاروں گی۔

قیوم تمہاری مرضی مگر کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

نرس خیریت بخشنا کچھ ہوئی۔ زیادہ باتیں نہ لو۔ اب جاؤ۔ بستر پر لیٹ جاؤ۔

قیوم اچھا تو مجھے اخبار دو۔ خبریں بڑی اچھی ہیں۔ اخبار پڑھ کر لیٹ جاؤں گا (نرس اخبار اٹھا کر دیتی ہے۔ قیوم اخبار دیکھتا ہے۔ نرس اس کے سر سے سر ملا کر اخبار دیکھتی ہے)

نرس (اخبار دیکھ کر) ایسی کیا دلچسپ خبر ہے۔

قیوم (ہاتھ سے بتاکر) اسے پڑھو

نرس (پڑھتی ہے) محمد عبدالقیوم مشہور مرحوم مصور کا فیاضانہ عطیہ بین قومی نمائش گاہ کا سنگ بنیاد۔ لسان العصر کی دل ہلا دینے والی تقریر (سر اٹھاکر) رہا۔ آخرکار افتتاح ہو ہی گیا۔

قیوم (تعجب سے) ہاں۔ دیکھو تو آخر افتتاح ہو ہی گیا۔

نرس اچھا ہی ہوا مرحوم کی دلی تمنا پوری ہوئی۔ مگر ـــــ

قیوم مگر۔ کیا

نرس میرے خیال میں مرحوم ملک کی اس سے بہتر خدمت کر سکتے تھے

قیوم وہ کیسے ؟

نرس میرا یہہ مطلب ہے کہ وہ اپنی دولت کا بہترین استعمال کر سکتے تھے۔

قیوم (زور سے) ہاں ہاں میں بھی تو یہی دریافت کر رہا ہوں کہ وہ کیسے

نرس لیکن اب اس سے حاصل جو نہ وہ دولت والا ہی رہا اور نہ تمہارے پاس سرمایہ ہے جو میں ترکیب بتادوں

قیوم (بازو کی میز سے قلمدان لیکر کھولتا ہے اور نوٹ نکالتا ہے) یہ لو یہہ پانچ ہزار کے نوٹ ہیں۔ بتاؤ کہ ان کا بہتر استعمال کس طرح ہو سکتا ہے۔

نرس (تعجب کے ساتھ نوٹ کی گڈیوں کو ہاتھ میں لے کر) پانچ ہزار یہہ رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی

قیوم محنت کی کمائی ہے۔ فرصت کے اوقات میں جو کام کیا تھا اس کا معاوضہ ہے۔

نرس ارے واہ۔ ناٹیڈ کو میں نے ایک تصویر بیچنا چاہی تو اس نے [illegible] سے انکار کر دیا خوشامد برآمد کر کے اس کی دکان پر رکھوا دی کہ اگر بک جائے تو اسکو معقول کمیشن دیا جائے گا۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تصویر کو کسی نے پلٹ کر تک نہیں دیکھا۔

قیوم (پریشانی سے) کونسی تصویر ؟

نرس (اپنی تصویر کو بتاکر) یہی۔ میں نے اس لیے ذکر نہیں کیا کہ آپکو شاید رنج ہو۔ آپ قیوم جیسے مشہور مصور کیساتھ کام کر چکے تھے۔ اس لئے میرا یہہ خیال تھا کہ آپ کے کام کی قدر ہوگی لیکن ـــ

قیوم خیر۔ میں خوش ہوں کہ تصویر واپس آگئی۔ (گھنٹی بجتی ہے نرس نوٹوں کے کٹے قلمدان میں رکھ کر جاتی ہے ساتھ ہی ایک شخص کے ساتھ واپس آتی ہے)

پاپنا (قریب آکر) آداب عرض ہے

قیوم آداب۔ کون ہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو ؟

پاپنا تصویر فروش ہوں۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں

قیوم ہاں۔ بیٹھو (پاپنا کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

پاپنا ایک دکاندار سے میں نے آپ کے بعض شاہکار خریدے ہیں۔ اسی سے آپ کا پتہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کیا اور کچھ نمونے مل سکتے ہیں۔ (بغل سے بستہ نکال کر میز پر رکھتا ہے)

قیوم اس وقت کچھ بھی نہیں ہے۔

پاپنا (نرس کی تصویر دیکھ کر) کم از کم۔ یہہ تصویر

نرس اس تصویر کو لے کر کیا کروگے

پاپنا ایک نظر دیکھوں (نرس اپنی تصویر لاکر دیتی ہے۔ پاپنا تصویر لیکر غور سے دیکھتا ہے) کس قدر مشابہت ہے۔ بڑا نازک کام ہے (نرس یہ سنکر تعجب کا اظہار کرتی ہے)

قیوم کیا یہہ تصویر تمہارے پسند ہے

پاپنا پسند! کیا معنی ـــ اس کو میں اپنی جان سے بھی زیادہ پسند کرتا ہوں۔ فرمایئے اس کی قیمت گذاراں دوں

قیوم نہیں۔ میں نہیں بیچنا چاہتا۔

نرس کیا دیوانے ہو گئے ہو (پاپنا سے) لے لو جی۔ تمہارے جی میں جو بھی آئے دیدینا ـــ

پاپنا (بستہ کھول کر سو سو کے نوٹ نکال کر) لیجیے یہ پانچ ہزار روپیے حاضر ہیں ـــ

نرس (انتہائی تعجب کے ساتھ) پانچ ہزار! کیا یہہ اس تصویر کی قیمت ہے؟
پاپنا جی ہاں
نرس پانچ ہزار۔!
قیوم میں اس کو دس ہزار میں بھی نہ دوں گا۔
نرس خاموش بھی رہو۔ کوئی دس کوڑیوں میں بھی نہیں پوچھ رہا تھا۔ اب بڑا دماغ پیدا کیا ہے۔ (پاپنا سے) لاؤ رقم مجھے دیدو۔
قیوم میں کہہ رہا ہوں کہ اس تصویر کو نہیں بیچوں گا۔
نرس تم کون بیچنے اور نہ بیچنے والے۔ تصویر میری ہے۔ میں اس کو بیچتی ہوں (نوٹ لے لیتی ہے)
پاپنا (تصویر ہاتھ میں لے کر دیکھتا ہے) واہ کیا کمال کیا ہے
نرس (تصویر کو غور سے دیکھ کر) آخر اس میں ایسی کیا خوبی ہے
قیوم تم کیا جانو۔ ایک فن داں ہی اس کی قدر کر سکتا ہے۔
نرس اوہو آئے ہیں بڑے نقداں کہیں کے
قیوم (نرس سے) خیر ذرا چائے تو بنا کر لاؤ (نرس نوٹ لیکر چلی جاتی ہے)
پاپنا (تصویر دیکھ کر) آہا اس پر آپ نے اپنا مونوگرام بھی بنا دیا ہے۔ خوب۔ محمد عبد القیوم۔ کس عمدگی سے بیٹھایا ہے۔ تاریخ نہیں لکھی۔ یہہ آپ کا شاہکار کب تیار ہوا۔
قیوم تم کیا جانو کہ میرا ہی کام ہے۔
پاپنا (ہنستے ہوئے) حضور آپ کی تصویریں دیکھتے بیچتے اور خریدتے ہوئے تو میں بوڑھا ہو گیا۔ اگر اتنی تمیز نہ ہوتی تو پانچ ہزار کیوں دیتا۔ (قیوم سگریٹ سلگاتا ہے)
قیوم (پاپنا کو سگریٹ دیتے ہوئے) لو۔ سگریٹ پیو (پاپنا سگریٹ سلگاتا ہے) میں نے تو اپنا طرز بالکل ہی بدل دیا ہے پھر تم میرے کام کو کس طرح پہچان سکے۔
پاپنا حضور آپ ہزار بدلیں مگر وہ استادانہ شان کہاں جائیگی حضور آپ نے اپنی موت کا کیا ہنگامہ بپا رکھا ہے۔

قیوم میں گمنامی کی حالت میں اطمینان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں مگر یہ تو بتاؤ کہ تم مجھے کس طرح پہچان سکے۔
پاپنا (ہنستے ہوئے) خوب۔ اجی سرکار۔ بولا تو سہی کہ آپکی تصویروں کا بیوپار کرتے کرتے عمر گذر گئی۔ ایک نہیں ہزار دفعہ آپ سے مل چکا ہوں۔ شاید آپ مجھے بھول گئے میرا نام پاپنا ہے۔
قیوم میں نہیں بھولا نہیں مگر میں یہہ سمجھتا تھا کہ دنیا کی طرح تم بھی مجھے بھول گئے ہوں گے۔
پاپنا واہ وا واہ۔ گیا سونے پر ملمع کر دیا جائے تو سنار اسکو پرکھ نہیں سکتا۔ اب بہت ہو چکا۔ مہربانی فرما کر آپ پھر سے اپنے وجود کا اعلان کر دیں۔
قیوم اں یہہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ میں مر چکا ہوں
پاپنا بلکل آسانی سے عدالت میں جا کر اصلی واقعات کا انکشاف اور اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینا پڑیگا۔
قیوم ارے میں تو دنیا کی نظروں میں مر چکا۔ اس کو تمام دنیا جانتی ہے پھر یہ کیسے ممکن؟
پاپنا جھوٹ بات کا ہونا تو ممکن ہے اور سچ کا اظہار ناممکن! واہ یہہ بھی خوب!
قیوم خیر بھئی یہہ بعد میں ہوتا رہے گا۔ میری طبیعت پریشان ہے اب تم چلے جاؤ۔
پاپنا بہت خوب (کہکر بستہ اور تصویر لیکر دوسرے دروازے سے چلا جاتا ہے۔ قیوم اٹھ کر نرس جدھر گئی تھی ادھر جاتا ہے اور دروازے کی آڑ میں نظر ڈال کر)
قیوم ایں تم یہاں کھڑی تھیں (نرس باہر آتی ہے)
نرس (مسکراتے ہوئے) جی ہاں
قیوم کیا ہماری گفتگو کو بھی سنا ہے
نرس آپ پریشان نہ ہوں حرف بحرف شروع سے آخر تک سنا ہے۔ آخر گمنامی کی زندگی کا باعث؟
قیوم چلو اندر چلو۔ اس کی پوری پوری تفصیل سناؤنگا (دونوں

جاتے ہیں)

منظر (۲)

(ڈاکٹر رستے سے گذر رہا ہے۔ دوسری جانب سے بابا شنگ تسبیح ڈھالتے ہوئے آتے ہیں)

ڈاکٹر (بابا کو دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر) رام رام بابا

بابا (تسبیح ڈھالتے ہوئے۔ ایک ہاتھ ڈاکٹر کے سر پر رکھکر) جیتا رہ بچہ۔ بول کیا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر مہاراج (دل پر ہاتھ رکھ کر) آ دے نہیں۔ ایک کہیے۔۔

بابا میں جانتا ہوں کہ تو کس مرض میں مبتلا ہے۔

ڈاکٹر نہیں نہیں۔ آپ ایسا نکو بولو۔ ہمیں تو کل آفریں۔ مرج گرج نہیں ہمنا کو

بابا ارے چپ بھی رہ۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تو کس آفت میں مبتلا ہے۔ بول تو کسی عورت کا دیوانہ ہے یا نہیں۔ سچ بول۔ دیکھ میرے سے چھپا مت۔ میرا روشن ضمیر مثل ٹیلویژن ہے۔ بول

ڈاکٹر (ہاتھ جوڑ کر) ہو ہو مہاراج آپ سچ بولتیں۔

بابا اچھا تو بول اب تو کیا چاہتا ہے

ڈاکٹر (ڈاکٹر روتے ہوئے بابا کے پاؤں پر گر کر) مہاراج مہاراج

بابا (ڈاکٹر کو ایک ہاتھ سے اٹھاکر) فکر نہ کر بچہ۔ تیرے سب کام بنجائینگے۔ دیکھ یہہ کام کوئی آسان نہیں۔ (کچھ سوچکر) تیری معشوقہ ذرا خوبصورت بھی ہے نا۔

ڈاکٹر جی ہو بولے سچ مہاراج۔ بڑی بیوٹی فل ہے مہاراج۔

بابا ہاں میں سمجھ گیا۔ اچھا تو کیا تو اسے دل سے چاہتا ہے۔ بول سچ بتا۔

ڈاکٹر ہونا

بابا ہاں میں سمجھ گیا۔ دیکھ تو اسے دل و جان سے پسند کرتا ہے نا۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ سن ایک خوش خبری سن وہ بھی تجھے دل و جان سے چاہتی ہے (ڈاکٹر خوش ہوتا ہے) مگر شیطان اسے روک رہا ہے۔

ڈاکٹر اماں شیطان۔ ارے باپ رے

بابا ڈر نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن کچھ صدقہ وغیرہ نکالنا ہوگا۔ بول کچھ خرچ کریگا۔

ڈاکٹر ہو۔ کتے روپیے ہونا اپنے کو۔

بابا صرف پچیس روپیے میرا گھر کو چہ بڑے بازار میں ہے مکان نمبر صفر بس وہاں رقم لیکر آنا پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ڈاکٹر بہوت اچھا۔ اب کیا ئیں تو میں بیے گھر کا کچھ سامان بچکو لاتوں (رضیہ داخل ہوتی ہے ڈاکٹر اس کو گھور کر دیکھتا ہے۔ اس کے بعد بابا ایک طرف اور ڈاکٹر دوسری طرف جاتے ہیں)

منظر (۳)

(رات کا وقت۔ قیوم کا سونے کا کمرہ۔ قیوم آرام کرسی پر لیٹے مطالعہ کر رہا ہے۔ دوسرے کمرے سے نرس داخل ہوتی ہے)

نرس (قریب آکر قیوم کے ہاتھ سے کتاب چھین کر میز پر پھینکتی اور صورت بنا کر کہتی ہے) ہوں۔ میں سمجھی تھی کہ ابتک کہیں سو گئے ہونگے۔ صحت کا بھی کچھ خیال ہے یا فقط کتاب ہی کتاب۔

قیوم (کرسی ہلاتے ہوئے) اس کرسی میں مجھے نیند سے زیادہ مزا آ رہا ہے۔

نرس لغویت۔ محض لغویت۔ میں ایسی فضول باتیں سننا نہیں چاہتی۔

قیوم لڑتی کیوں ہو۔

نرس میں لڑ رہی ہوں؟

قیوم (قہقہہ لگاکر) یہہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

نرس (غصے سے) کیا کہا۔ بتاؤ میں کب لڑی تھی۔۔۔

قیوم اررر۔ خفا نہو نا۔

نرس ہمیشہ ہاں میں ہاں ملانے کا نتیجہ ہے۔

قیوم اور ہو بڑی ہاں میں ہاں ملانے والی آئی ہیں۔ ذرا بتاؤ تو

ہی کس وقت ہمارا تمہارا خیال ملا تھا

نرس خیال ملے یا نہ ملے مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ۔ میں ہمیشہ تمہاری بات سنتی آئی ہوں ۔ حتا کہ جب تم مجھے یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ تم قیوم ہو اور میں اس کے قبول کرنے میں پس و پیش کر رہی تھی جس کے باعث تم پر اس کا اثر ہوا چنانچہ یہ دیکھ کر میں محض تمہارے خوش کرنے کے لیے کہنا مان گئی اور تمہاری ہم نوا بن گئی

قیوم (ہنسکر) خوب ۔ میرے خوش کرنے کے لیے کہنا مان لیا اور پھر کہتی ہو کہ میری ہم نوا بن گئیں ۔ واہ صاحب واہ کیا ہم نوائی ہے ۔ (سنجیدگی سے) آج تین مہینے سے متواتر سمجھا رہا ہوں کہ میں در اصل مشہور مصور قیوم ہوں مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے صداقت بھرے بیانات کو تم ہر وقت ہوا بر د کرتی رہتی ہو ۔ (صورت بنا کر) اس پر یہ بھی کہتی ہو کہ تمہارے خوش کرنے کے لیے کہنا مان لیا ۔ سنو ! میں اس طرح خوش نہیں ہو سکتا ۔ ایسی خوشی سے مجھے سخت نفرت ہے ۔ تم کو ایک شریف آدمی پاپنا ہی کے کہنے کا اعتبار آیا اور نہ مجھ پر ہی بھروسہ کرتی ہو ۔ (جھنجلا کر) کیا میں کوئی بدمعاش اور دغا باز ہوں ؟

نرس آپ خواہ مخواہ بھی بگڑ رہے ہیں ۔ اس وقت اس بحث کو طول دینے سے فائدہ ؟

قیوم اس کا فائدہ میں جانتا ہوں ۔ تمہیں کیا معلوم ۔

نرس اگر میں تمہیں عبد القیوم نہیں سمجھتی تو اس میں میرا کوئی قصور ہے ۔ اس کے ذمہ دار تو خود آپ ہیں ۔

قیوم میں ۔ میں ۔ ہشش ۔ میں ایسی لغو باتیں سننا نہیں چاہتا ۔ یہ تو بچوں کی سی باتیں ہیں ۔

نرس عجیب الجھے دار گفتگو ہے ۔ میں آپکا اصل مطلب مطلق نہیں سمجھ سکی ۔

قیوم اگر نہ سمجھیں تو بہتر ہے ۔ خیر اب جانے بھی دو ان جھگڑوں کو

نرس شکر ہے کہ آپکا غصہ بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا ۔

قیوم اب کتنے بجے ہیں (نرس گھڑی کی طرف دیکھتی ہے)

نرس ۹ بجکر ۲۰ منٹ

قیوم اوہ ۔ اسی پر کہہ رہی تھیں کہ سو گئے کیوں نہیں ۔ میں سمجھتا تھا شاید بارہ بج گئے ہوں ۔

نرس ہاں بیمار کے لیے یہی وقت زیادہ ہے ۔

قیوم اچھا چائے تو پلاؤ (نرس کمرے کی طرف بڑھتی ہے) دیکھو (نرس پلٹتی ہے) تیار کرنے میں کتنی دیر ہوگی ۔

نرس کوئی دیر نہیں ۔ بلکل تیار ہے ۔ (نرس جاتی ہے قیوم میز پر سے ایک اخبار لیکر پڑھتا ہے اس کے بعد نرس کشتی میں دو پیالیاں لیکر آتی ہے ۔ کشتی میز پر رکھکر قیوم کے ہاتھ سے اخبار چھینکر نیچے پھینک دیتی ہے کمر پر ہاتھ رکھ کر) بڑے ضدی آدمی ہو ۔

قیوم عجیب ٹیڑھی عقل پائی ہے ۔ تنہائی میں کیا کروں گا (نرس قیوم کو پیالی دیکر خود بھی پیالی لیکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ۔ دونوں چائے پی رہے ہیں ۔ باہر کی گھنٹی بجتی ہے ۔ قیوم نرس کی صورت دیکھتا ہے ۔ نرس چائے کی پیالی میز پر رکھ کر اٹھتی ہے) کہاں جاتی ہو بیٹھو

نرس کیسے لوگ ہیں رات میں بھی چین لینے دیتے (بیٹھ جاتی ہے ۔ چائے پیتی ہے ۔ گھنٹی کی آواز دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں) کون بلا ہے ۔ (گھنٹی کی آواز)

قیوم ہوگا کوئی اخبار کا نمایندہ (گھنٹی) عجیب نامعقول آدمی ہے ۔ (نرس باہر جاتی ہے ۔ قیوم فوراً اخبار اٹھا کر پڑھتا اور چائے پیتا ہے ۔ کچھ وقفے سے عاشق علی اور امداد حسین کے ساتھ آتی ہے ۔ قیوم ان کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے ۔ نرس قیوم کے قریب آتی ہے) کون لوگ ہیں ۔

نرس میں کیا جانوں ۔ ہوں گے کسی اخبار کے نمایندے

قیوم (عاشق علی سے) کیا میں آپ سے کچھ دریافت کر سکتا ہوں

عاشق علی (تسبیح پھیرتے ہوئے ڈاڑھی پر سے ہاتھ پھیر کر) ارشاد

قیوم آپ نے اتنی دیر تک گھنٹی بجانے کی زحمت کیوں گوارا کی
بہتر ہوتا بلا اجازت یکدم مکان میں گھس پڑتے۔ کیا یہ
بھلے آدمیوں کے ملنے کا وقت ہے۔
عاشق (منہ پھیرتے ہوئے) ہوں۔ (پلٹ کر امداد سے)
اماں کہاں ہے
امداد (پلٹ کر دیکھکر) شاید باہر کھڑی ہے۔ بلاتا ہوں
(امداد باہر جاتا ہے)
قیوم یہ آپ بت بنے کیوں کھڑے ہیں۔
عاشق ابھی عرض کرتا ہوں (امداد شہلا داخل ہوتے ہیں شہلا
امداد۔ عاشق کی کے قریب آتے ہیں۔ عاشق شہلا سے)
کیوں اماں پہچانتی ہو۔ ہمارے ابا یہی ہیں نا؟ (قیوم
اور نرس پریشانی کا اظہار کرتے ہیں)
شہلا ہاں بیٹا (امداد کرسی قریب کھینچتا ہے۔ شہلا بیٹھ جاتی ہے)
معلوم تو وہی ہو رہے ہیں۔ (قیوم سے) چھبیس سال کے
عرصے میں شاید تم مجھے بھول گئے۔ تم کو اچھی طرح یاد
ہوگا تمہارے گھر سے جاتے وقت (عاشق کو بتا کر)
یہ میرا بچہ ایک سال کا تھا اور (امداد کو بتا کر) یہ
ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔
قیوم تو یہ کتنے سال بعد پیدا ہوا
شہلا تین سال بعد
قیوم تب تو واقعی یہ میرا لڑکا ہے۔
امداد (شہلا سے) اماں۔ ابا کے جانے کے تین سال بعد
میں کیسے پیدا ہوا۔
شہلا بیٹا چونتیس سال پہلے بچے دیر سے پیدا ہوتے تھے
عاشق ہو گا بھی۔ چپ بھی رہو۔ کیا اماں جھوٹ بولیں گی۔
نرس (شہلا سے) اور یہ آپ کے بڑے شہزادے کتنے
عرصے میں برآمد ہوئے تھے
شہلا شادی کے تین مہینے بعد
قیوم آفرین صد آفرین (نرس سے) چائے (نرس جاتی
ہے۔ عاشق اور امداد کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)
عاشق اماں۔ تین مہینے میں کیسے ۔۔۔؟
شہلا بیٹا ۔۔۔۔۔۔
امداد ہو گا جی بھئی۔ چپ رہو۔ کیا اماں جھوٹ بولیں گی۔
(نرس چائے لیکر آتی ہے)
قیوم (شہلا سے) ہاں اور کہو داستان تو بڑی مزے دار ہے
امداد اب سب مزا نکلتا ہے ٹھہرو (قیوم کھلکھلا کر ہنستا ہے۔
نرس سب کو چائے دیتی ہے)
قیوم خوب۔ اچھا تو آپ نے مجھے پہچان لیا۔
عاشق کیوں ماں۔ ابا کو پہچان لیا نا؟
شہلا ہاں۔ بیٹا۔ معلوم تو وہی ہو رہے ہیں چھبیس سال بڑا
طویل عرصہ ہے۔
قیوم واقعی۔ بڑی گہری بھول ہے۔
امداد (نرس سے) تم کون ہو
قیوم (ہنستے ہوئے) تمہاری چھوٹی اماں (نرس ہنستی ہے۔)
عاشق (نرس سے) دیکھو جی چھوٹی اماں میں ایک مرتبہ تم کو چھوٹی
اماں پکار لیا ہوں اب آئندہ سے نہیں پکاروں گا۔
اور میں تم کو جتائے دیتا ہوں کہ اب تمہیں اپنے ابا کا اور
ہمیں اپنے ابا کا گھر سنبھالنا ہو گا
نرس تمہارے ابا کا نام
عاشق (شہلا سے) اماں اماں۔ ہمارے ابا کا کیا نام ہے۔
شہلا ان کا ان کا نام ۔ ان کا نام
امداد ابھی ابا کا نام اماں کیسے بتائینگی۔ خود ابا سے پوچھنا
شہلا (عاشق سے) دیکھو بیٹا (میز پر انگلی سے لکھ کر بتاتی ہے)
عاشق انتقام (شہلا جھنجھلا کر انکار کرتی ہے)
نرس انتقام نہیں۔ شاید وہ احتشام کہہ رہی ہیں (شہلا بطور
اثبات سر ہلاتی ہے۔)
امداد تو کیا ہمارے ابا تمہارے شوہر نہیں ہیں۔
نرس کیوں نہیں۔

امداد (تعجب سے منہ کو ہاتھ لگاکر) اوہ! کتنی بری بات ہے۔
نرس (قیوم سے) یہہ کس جہنم کی پیداوار ہے؟ (شہلا سے) ہاں تو چھتیس سال پہلے یہہ تم سے جدا ہوے تھے۔
شہلا جی ہاں۔ اس وقت میری عمر ۱۹ سال کی تھی۔
نرس خوب۔ شادی کس عمر میں ہوئی تھی
شہلا سولہ برس کی عمر میں
قیوم کاش کہ اس وقت میں تمہارا شوہر ہوتا!
امداد ابا اب ہوجاو نا
قیوم چپ خاموش رہ بیہودہ کہیں کا
امداد تھو۔ یہہ کدھر کا باپ ہے۔ محبت کرنے کی بجاے جھڑک رہا ہے۔ (قیوم سگریٹ سلگاتا ہے)
قیوم (کش لیکر) تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں اور آدھی رات کو شیطان کی طرح وق کرنے پہنچ گئے۔
عاشق ابا۔ سیٹھ جواہرل ہیرالال نے اخبار میں اشتہار دیا ہے کہ احتشام الدین کو پہچان کر جو شخص عدالت میں گواہی دیگا اسے انعام دیا جاے گا۔
قیوم اہا۔ تو تم انعام حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔
شہلا صرف انعام ہی نہیں بلکہ آپ کو بھی
قیوم بہت خوب!
نرس (عاشق علی سے) میرے خیال میں اب رات زیادہ ہوگئی ہے۔ ان کا مزاج بھی ٹھیک نہیں بہتر ہوگا اس وقت آپ حضرات تشریف لیجائیں اور پھر کسی وقت آنا۔
امداد چلو جی بھئی چلو۔ کیا فضول باتیں سن رہے ہیں۔
شہلا (اٹھکر) اچھا اب ہم جاتے ہیں۔ (عاشق تسبیح تیزی سے ڈھالتا ہے)
قیوم (عاشق کو بتاکر) یہہ شہزادے تسبیح کس علت میں ڈھال رہے ہیں۔
شہلا کہیں نوکری نہیں ملی تو مشایخ ہوگیا ہے۔
قیوم بہت خوب۔ پیٹ پالنے کا ڈھنگ تو خوب نکالا ہے۔ پھر تو بے روزگاری کا کوئی سوال ہی نہیں
شہلا اب ہم کو اجازت دیجیے۔
قیوم شوق سے جایئے۔ آپ کو روکا کون ہے۔
امداد چلو جی چلو۔ بیکار وقت خراب ہورہا ہے (تینوں جاتے ہیں۔ نرس بھی ان کے پیچھے جاتی ہے۔ ان کو چھوڑکر نرس واپس آتی ہے)
نرس اب فرمایئے۔ اگر میں نے آپکے خوش کرنے کے لیے کہا تھا تو کیا برائی کی۔
قیوم غلط۔ میں پھر بھی کہتا ہوں کہ تمہارا خیال غلط ہے۔
نرس جورو کی گواہی سے بڑھکر بھی کوئی ثبوت ہوسکتا ہے۔
قیوم عجیب پاگل عورت ہے۔ ارے اس بے حیا عورت سے میں کیوں شادی کرنے چلا تھا
نرس گویا بچاو کی یہہ ایک نئی صورت نکالی ہے۔
قیوم توبہ۔ کس طرح سمجھاوں۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ لوگ کس زبردست مغالطے میں مبتلا ہیں۔ (ٹہلتا ہے۔ پردہ)

(باقی) آوارا (عثمانیہ)

انعامی اسکیم

اپنے پچھلے اعلان کے مطابق ہم نے مضامین وغیرہ جانچ کرنے والی کمیٹی کے حوالے کردیے ہیں۔ ابتک کمیٹی نے اپنے فیصلے سے ہمیں اطلاع نہیں دی۔ توقع ہے کہ قریب میں نتیجہ مل جائیگا۔ اور آنے والے نمبر میں ہم اس قابل ہوں گے کہ کامیاب مضمون لکھنے والوں اور شاعروں کے ناموں کا اعلان کرسکیں۔

بہرحال سالگرہ نمبر کے لکھنے والوں کو اور ایک مہینہ صبر اور سکون کے ساتھ گذارنا پڑیگا۔ اس دیر کیلیے ادارہ ان تمام حضرات سے معافی چاہتا ہے جن کے مضامین وغیرہ سالگرہ نمبر میں چھپے ہیں۔

ہندستانی ادب معاصروں کی نظر میں

معارف ماہوار مارچ ۱۹۴۲ء

مرتبہ جناب غلام محمد خانصاحب ام ۔ اے تقطیع بڑی صفحات ۱۴۴ کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۸ عہ پتہ ہندستانی ادب چنچل گوڑا حیدرآباد دکن ۔

ہندستانی ادب حیدرآباد کے اچھے رسالوں میں ہے اس کا یہ خاص نمبر بھی اپنے سنجیدہ مضامین اور مفید معلومات کے لحاظ سے قابل قدر ہے، بقدر اعتدال شعر و ادب کی چاشنی بھی موجود ہے، "فصلی سنہ کی کہانی" "لالہ جواہر لال" "سطح قمر پر چند عرب اور عجم کے منجموں کے نام" عبدالرحمن خانصاحب سابق صدر کلیہ "ہندی زبان کی تاریخ پر ایک نظر" رشید الحسن صاحب ام ۔ اے مفید مضامین ہیں' افسانوں میں ہما و راسلم صاحب کے "مغوات" دلچسپ ہیں ۔

آئینہ ہفتہ وار ۶ جولائی ۱۹۴۲ء

اس نام کا ایک ماہوار مجلہ حیدرآباد دکن سے جناب غلام محمد خانصاحب ام ۔ اے کی ادارت میں جاری ہوا ہے جو بغرض ریویو ہمیں موصول ہوا ہے زیر تبصرہ نمبر اس پرچے کا پہلا نمبر ہے ۔ شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور پروفیسر عبدالرحمن صاحب کے پیغامات ہیں اور اس کے بعد "ہندستانی" کے عنوان سے ایک اہم مقالہ درج کیا گیا ہے جو ہر حیثیت سے عمدہ اور قابل غور ہے ۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عام رسالوں کی طرح محض افسانے نہیں ہیں بلکہ بلند پایہ علمی تاریخی اور ادبی مضامین کافی تعداد میں ہیں اور ملک کے نامور ادیبوں کے تحریر کیے ہوے ہیں "سلطنت آصفیہ کا تاریخی سرمایہ" "ڈرامہ میں عمل کی اہمیت" "مرزا غالب کے خطوط دکنیوں کے نام" خاص طور پر قابل ذکر ہیں حصہ نظم بھی خوب ہے ۔ مگر اس میں راز ہاشمی صاحب کی نظم "دوشیزہ گلچیں" اور ماہر القادری صاحب کی وہ غزل جس کا مطلع

> منزل دل پاس بھی اور دور بھی
> آدمی مختار بھی مجبور بھی

ہے مطبوعہ چیزیں ہیں ۔ جہاں تک ماہر القادری صاحب کی غزل کا تعلق ہے اس کے متعلق مدیر "ہندستانی ادب" بلکل بے قصور ہیں اس لیے کہ موصوف نے محض اپنے ذاتی پروپگنڈے کے لیے ایک ہی وقت میں ہندستانی ادب اور عالمگیر دونوں کو روانہ کر دی اور دونوں پرچوں میں بیک وقت ایک ہی مہینے میں شایع ہو گئی ۔ ادیبوں اور شاعروں کو چاہیے کہ اپنے ذاتی پروپگنڈے کے لیے ایسی حرکات نہ کیا کریں جن سے ملک کے موقر رسالوں کو ٹھیس لگے ۔ راز ہاشمی کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی نظم کو مدیر ہندستانی ادب نے ماخوذ کیا ہے یا خود راز صاحب نے ان کو یہ نظم شایع کرنے کے لیے روانہ فرما دی ہے بہرحال اگر راز صاحب نے یہ شایع شدہ نظم دوبارہ ہندستانی ادب کو روانہ کی ہے تو یہ ان کی سخت غلطی ہے ۔ مدیر محترم نے اپنے مقالے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور مشترکہ زبان کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ایک حد تک ہم کو اتفاق ہے مگر پھر بھی ہندی اور کانگریس کو جو انہوں نے برا بھلا کہا ہے اسے ہم پسند نہیں کرتے ۔ پرچہ بہرحال خوب ہے ۔ ملک کے نامور پرچوں سے ٹکر کھاتا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے ناظرین ضرور لیں گے ۔ فی پرچہ ۶ سالانہ للعہ پتہ چنچلگوڑا حیدرآباد دکن

قلم ہفتہ وار جمعہ ۱۲ آبان ۱۳۵۱ ف

مرتبہ مولوی غلام محمد خانصاحب ام ۔ اے عثمانیہ کتابت وطباعت و کاغذ عمدہ صفحات ۱۴۶ قیمت سالانہ للعہ ملنے کا پتہ ۔ منیجر ہندستانی ادب چنچلگوڑا حیدرآباد دکن ۔

ہندستانی ادب کے نام سے مولوی غلام محمد خاں صاحب نے
ایک علمی، ادبی ماہنامہ نکالنا شروع کیا ہے۔ اس کے اب تک
جتنے نمبر نکلے ہیں وہ ہمارے پیش نظر ہیں، جن میں ملک کے ممتاز
اہل قلم کے مضامین درج ہیں اور اس کے ہر نمبر کے دیکھنے سے
لائق مدیر کی محنت اور حسن ترتیب کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مجلہ اپنی
گوناگوں دلچسپیوں سے معمور، مضامین کے لحاظ سے جوانوں،
بوڑھوں، بچوں سب کے لیے یکساں مفید و کارآمد ہے، اور
اسے خواتین بھی بصد شوق پڑھ سکتی ہیں۔ اس لیے کہ اس میں کوئی
ایسی تحریر شایع نہیں کی جاتی جو اخلاق سے گری ہوئی ہو۔ ہندستانی
ادب کی یہی نمایاں اور قابل ذکر خصوصیت ہے جو بہت کم
رسائل میں پائی جاتی ہے۔ اس مفید علمی رسالے کے اجرا پر ہم
مولوی غلام محمد خاں صاحب کو صدق دل سے مبارکباد دیتے
ہیں، اور ان کی کامیابی کے دل سے آرزومند ہیں، اور ہم اپنے
ناظرین سے اس کی سفارش کرتے ہیں کہ وہ بھی اس کی سرپرستی
کریں۔

الواحد ہفتہ وار

۲۵ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء

یہ ماہواری رسالہ۔ غلام محمد خاں صاحب ام۔اے عثمانیہ
کی ادارت میں حیدرآباد دکن سے شایع ہوتا ہے اس کا پہلا پرچہ بغرض
تبادلہ و ریویو ہمارے پاس پہنچا ہے جو ۲۰×۳۰ سائز کے ۴۶
صفحات پر علاوہ ٹائٹل کے مشتمل ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ
سفید چکنا ہے۔ اس میں نظم و نثر کے ۳۵ مضامین درج ہیں۔ یعنی
علم و ادب اور نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ رسالے کے جاری کرنے کا
سب سے بڑا مقصد مشترکہ زبان کی خدمت کرنا بتایا ہے۔
حیدرآباد دکن اس وقت تک مشترکہ زبان کی ترقی کے لیے جو
کوشش بروے کار لاچکا ہے۔ اس کے پیش نظر توقع ہے کہ
یہ نیا ماہنامہ اس سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ثابت ہوگا۔ ضرورت
ہے کہ اہل علم اور مشترکہ زبان کے بہی خواہ حضرات رسالے کی
توسیع اشاعت کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش فرمائیں
تا کہ مدیر موصوف مشترکہ زبان کی خدمت کرنے میں کامیاب ہوں
چندہ سالانہ چار روپیہ (للعہ قیمت فی پرچہ ۶/) ملنے کا پتہ۔ منیجر
ہندستانی ادب چنچل گوڑا۔

اقبال ہفتہ وار

۱۹ شہریور سنہ ۱۳۵۰ف

ایک ماہوار علمی ادبی رسالہ ہے جو جناب غلام محمد خاں صاحب
ام۔اے (عثمانیہ) کی ادارت میں ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ء سے شایع ہو رہا ہے
اس وقت تک اس کے دو شمارے شایع ہو چکے ہیں جو زیر نظر ہیں
اس کے اجرا کی غرض و غایت ہندستان کی مشترکہ زبان اور اس کے
ادب کو ترقی دینا اور ہندستان میں مشترکہ ادبی فضا کے ذریعے ایک
متحدہ ذہنی و ادبی تصویر پیدا کرنا ہے پہلے شمارے میں علامہ سید
سلیمان ندوی، محمد عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ
عثمانیہ اور مولوی عبدالستار صاحب صدیقی کے حوصلہ افزا پیامات
کے علاوہ نہایت دلچسپ علمی ادبی و تاریخی مضامین شایع کیے گئے
ہیں نظمیں بھی خاصی ہیں عام دلچسپی کے مضامین و افسانے بھی درج ہیں دونوں
شماروں کی ترتیب اور مضامین کا انتخاب لائق ستایش ہے توقع
کی جا سکتی ہے کہ یہ رسالہ بہت جلد مقبولیت عام حاصل کرے گا سرورق
نہایت نفیس اور دیدہ زیب ہے کاغذ عمدہ طباعت و کتابت نہایت
نفیس حجم ۴۶ صفحات سالانہ چندہ (للعہ) روپیہ قیمت فی پرچہ (۶/)
منیجر ہندستانی ادب چنچل گوڑا حیدرآباد دکن سے طلب کیا جا سکتا ہے

دلچسپ ہفتہ وار

مورخہ ۱۶ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

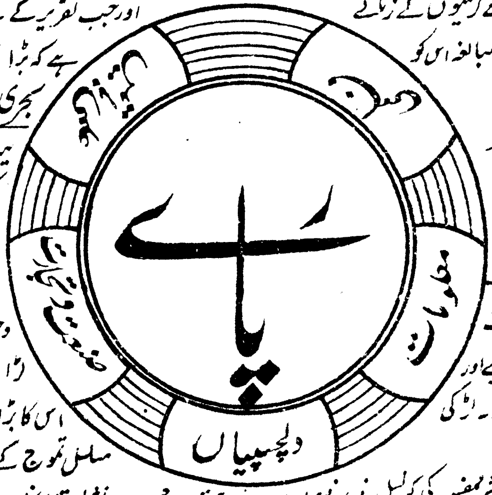
اردو زبان کے مرکز اب تک دہلی اور لکھنو مانے جاتے تھے
مگر حیدرآباد دکن کی آب و ہوا اس زبان کے حق میں آب حیات
کا اثر دکھا رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ شاید
وہ وقت دور نہیں جب دہلی اور لکھنو سے لوگ اردو پڑھنے کو حیدرآباد
جایا کریں گے۔ یوں تو حیدرآباد میں متعدد اخبارات اور رسائل ایک سے
ایک بڑھ کر نکل رہے ہیں مگر حال میں جو رسالہ ہندستانی ادب کے نام سے
نکلا ہے اسے دیکھ کر بیحد دل خوش ہوا ہے۔ رسالے کو پڑھ کر شائقین سخن

معلومات

انکم ٹیکس معاف یورپ اور امریکہ کے کسی شہر میں انکم ٹیکس کا نہ ہونا واقعی تعجب کی بات ہے۔ خصوصاً وینزویلا جیسے مالدار ملک میں جو ممالک متحدہ امریکہ اور روس کے بعد دنیا کا سب سے بڑا تیل کا مرکز ہے تیل اس ملک کی برآمد کا ۹۰ فیصدواں حصہ ہے۔ ملک کی جملہ آمدنی کا دو تہائی حصہ تیل ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حیرت ہے کہ وہاں ابتک انکم ٹیکس عاید نہیں کیا گیا۔

چھتری شہر جنوبی امریکہ کے شہر کولمبیا میں ہر شخص ہر موسم میں ہر وقت چھتری اپنے ساتھ رکھتا ہے گرمیوں کے زمانے میں جب چھتریاں کھلتی ہیں تو بلامبالغہ اس کو "چھتری شہر" کہنا پڑتا ہے۔

عجیب المخلوقات آرار کے صدر دواخانے میں حال ہی میں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کے دونوں کان اتنے بڑے تھے کہ موںھ ڈھک گیا تھا اور اس کے جسم کی ساخت ہاتھی جیسی تھی۔ پورے جسم پر لانبے اور گہرے بال تھے اور آنکھیں ندارد۔ لڑکی صرف آدھ گھنٹہ زندہ رہی۔



ہارن بجانا جرم علاقہ ٹینسی کے شہر ممفس کی کونسل نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ موٹر ہارن کو بطور یادگار نمائش گاہ میں رکھا جائے تاکہ آنے والی نسلیں یہ معلوم کر سکیں کہ دنیا میں ہارن بھی کوئی چیز تھی۔ یہ فیصلہ اس لیے صادر کیا گیا ہے کہ اس شہر میں ہارن بجانا قانوناً جرم ہے اسی لیے کسی بھی موٹر پہ ہارن نظر نہیں آتا۔

مافوق بچہ ...ہیو کے ایک مقام کلیفلینڈ میں ایک طالب علم ہے جس کی عقلمندی نے ایک دنیا کو حیران کر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چوتھے مہینے میں کمسنہ وولف نے بات چیت شروع کر دی تھی۔ ایک سال کی عمر میں پڑھنے لگا تھا اور ۱½ سال میں تو لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ عمر کے پندرھویں مہینے سے اس کو موسیقی کا شوق ہو گیا تھا وہ خود پیانو بجاتا اور گاتا بھی تھا۔

۹ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان کامیاب کر کے کالج میں داخل ہو گیا ہے اس وقت اس کی عمر دس سال کی ہے اور اس کا مضمون کیمیا ہے۔ کوئی طالب علم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مشہور ہے کہ جب وہ کسی چیز کو ایک مرتبہ غور سے دیکھ لیتا ہے تو کبھی نہیں بھولتا یہی حال پڑھائی میں بھی ہے۔ اس غیر معمولی سمجھ اور لیاقت کے باوجود وہ ایک بچہ ہی ہے چنانچہ عام بچوں کی طرح آئسکریم اور چاکلیٹ خوشی سے کھاتا ہے اور حرکات بھی بچوں کی سی کرتا ہے اور جب تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سنجیدہ مقرر روانی کے ساتھ بول رہا ہے۔

بحری لڑائی بحری لڑائی کے سلسلے میں یہ بات معلوم کرنے کے قابل ہے کہ طویل فاصلے سے جتنے بھی نشانے لگائے جاتے ہیں ان کا مکمل سے ۲ فیصد اوسط قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سمندر میں توپوں کی لڑائی اکثر ناکام رہتی ہے۔ غالباً اس کا بڑا سبب ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مسلسل تموج کے باعث جہاز کو حرکت ہوتی رہتی ہے جس سے نشانہ قایم نہیں ہو سکتا۔

دلچسپیاں

سزا سات روز تک پیدل ممالک متحدہ امریکہ کے شہر بوسٹن کے پولس والے نے ایک عورت کے بوسے کا عرصہ ۲½ میل قرار دیا۔ یہ عورت رات کے وقت ۴۲ میل فی گھنٹے کی رفتار موٹر چلا رہی تھی مجسٹریٹ نے سزا کے طور پر سات روز کے لیے اس کا لائسنس روک لیا اور اس کو ہدایت کی کہ اس عرصے میں روزانہ [illegible] لے کہ پھر کبھی راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے کی نوبت نہ آئے۔

لات مار کلب | شمالی کیرولینا میں ایک کلب ہے جس کے ارکان ایک ایسی مشین استعمال کرتے ہیں جو لاتیں مارتی ہے جب کبھی کسی رکن کو لاتیں کھانے کی سوجھتی ہے تو وہ مشین کے قریب جا کر بٹن دبا دیتا ہے اور پھر جی بھر کر لاتیں کھاتا ہے۔ غالباً اس طرز عمل سے ارکان کا مقصد یہہ ہے کہ ہر شخص تیل بن جائے تاکہ آیندہ کبھی موقع ہو تو زمانے کا مقابلہ کر سکے۔

صنف نازک کا مذاق | بکنگھم شائر کے گرجا میں ایک شخص نے ایک لڑکی سے شادی کی اور ایک سال تک گذر بسر کرتا رہا۔ بعض مشتبہ اسباب کی بنا پر اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولس نے اس شخص کا پیچھا شروع کیا اور آخر کار یہہ معلوم کر لیا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کو مذاق سوجھا تھا۔ حیرت تو یہہ ہے کہ ایک تعلیم یافتہ اور متمدن ملک کی دلہن کے موہنہ کو ایک سال تک کیسے قفل لگ گیا تھا۔؟

مرنے کے بعد بھی خسیس | شہر سیونک میں اولڈ ہانس ملر نامی ایک خسیس تھا جس نے ایک ایک کوڑی جوڑی تھی۔ یہہ شخص الماریاں تیار کرتا تھا جس سے اس کو کافی آمدنی ہوتی تھی۔ اس طرح اس نے بہت زیادہ دولت جمع کر رکھی تھی۔ لیکن اس میں سے ایک پائی بھی اپنے رشتہ داروں وغیرہ کو دینا گوارا نہ کرتا تھا۔ چنانچہ مرتے وقت بھی اس نے وصیت نامہ لکھنے سے انکار کر دیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے جملہ رشتہ دار قانونی وارث قرار پائے۔

اس نے مرنے سے پہلے اپنے رشتہ داروں سے صرف ایک خواہش کی تھی وہ یہہ کہ دفنانے سے پہلے اس کے جنازے کو بالائی منزل کے کمرے میں کچھ دیر رکھا جائے۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور جنازے کے اطراف جوں ہی سب رشتہ دار جمع ہوئے چھت دھم سے گر پڑی اور تقریباً سب عزیز اقربا اسی وقت مر گئے۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ اس خسیس نے چھت کو تھامنے والے لکڑی کے ستونوں کو اس طرح آرے سے کاٹ دیا تھا کہ وزن پڑتے ہی گر پڑیں۔

اسکوائیر یا مسٹر | برطانوی اخبار اسپکٹیٹر نے لفظی جنگ چھیڑ رکھی ہے یعنی یہہ کہ اسکوائیر استعمال کیا جائے یا مسٹر۔

انگلستان میں اسکوائیر اس شخص کو بولتے ہیں جو کھانے وقت میز پر کہنیاں نہیں ٹیکتا اور موہنہ بند رکھ کر غذا چباتا ہے مسٹر معمولی قسم کے ہر شخص کو کہا جاتا ہے۔

بحث یہہ ہے کہ اس تفریق کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیوں نہ سب کو مسٹر ہی لکھا جائے مگر اسکوائیر والا قدیم خیال کا طبقہ مصر ہے کہ اسکوائیر ایک اعزازی لفظ ہے جس کو کسی طرح ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ وار آف روزس کی طرح کہیں یہہ جنگ بھی سو سالہ نہ ہو جائے۔

صنعت و تجارت

آئسکریم پوڈر | آئیسڈ شوگر۔ کارن فلور۔ گم ٹراگاکانتھ
۲۰ پونڈ — ۱ پونڈ — ۱۴ اونس

رنگین کارن فلور۔ شکرین۔ قدرتی ونیلا ایسنس۔
۷ اونس — ½ اونس — ۴ اونس

ان سب اجزا کو اچھی طرح حل کر لیا جائے۔ بند ڈبے میں محفوظ رکھیے اور وقت ضرورت کام میں لائیے۔

حجامت کا صابن | سفید نرم صابن۔ اسپرمیٹی۔ سلیڈ آئیل
۴ اونس — ½ اونس — ½ اونس

ان اجزا کو ملا کر گرم کیا جائے۔ جب محلول تیار ہو حسب مرضی سانچوں میں ڈھال لیا جائے۔ اس کے بعد ٹین پیٹ کر محفوظ کیجیے۔

مصنوعی سونا | تانبا۔ الیومنیم۔ سونا
۹۰ حصے — ۷½ حصے — ۲½ حصے

پہلے سونے اور تانبہ کو گلا لیا جائے۔ جب یہہ محلول پگھلی ہوئی حالت میں ہو تب اس میں الیومنیم ملا کر اور پگھلایا جائے جب تینوں اجزا ایک جان ہو جائیں۔ محلول کو گیلی مگر ٹھوس مٹی کے سانچوں میں ڈھال کر کڈیاں بنالی جائیں۔ اس سونے کا رنگ پائیدار رہے گا۔

بال چھڑ | بیریم سلفائیڈ ۔ زنک آکسائیڈ ۔ میدہ
۱۰ حصے ۵ حصے ۵ حصے

ان اجزا کو حل کر کے بند شیشے میں رکھا جائے اور جب ضرورت ہو تھوڑا سا مرکب لیکر اس میں پانی ملایا جائے ۔ جس مقام پر چپا ہو لگا دیجئے چند ہی منٹ میں بال جھڑ جائینگے ۔

خوشبودار تیل | برنزوئڈ آئیل ۔ چنبیلی کا تیل ۔ آئیل آف برگاموٹ
۱۰ اونس ۱۰ ڈرام ۱۰ منم

گلاب کا عطر ۔ آئیل آف آرنج فلور ۔ آئیل آف تھائیمے
۱۰ منم ۲۰ منم ۴۰ منم

ان تمام اجزا کو خوب حل کر کے بند بوتلوں میں محفوظ کر دیجئے اور جب ضرورت ہو استعمال کیجیے ۔ نہایت خوشبودار تیل ہے ۔

ساس | سرکہ ۔ سفوف کالی مرچ ۔ سفوف لونگ
ایک کوارٹ ۱ ڈرام ۱ ڈرام

سفوف جمیکا پپر ۔ سفوف رائی ۔ سفوف سونٹھ ۔ نمک
۲ ڈرام ۲ اونس ۱ ڈرام ۲ اونس

پیاز پسی ہوئی ۔ ادرک پسی ہوئی ۔ گرم مسالہ معہ جوار ۔
۲ اونس ۲ اونس ۱ اونس

ان سب کو حل کر کے محفوظ کر لیجیے اور وقت ضرورت استعمال فرمائیے ۔

علمی باتیں

مصنفین کا معاوضہ | الیور گولڈ سمتھ کو اس کی مشہور آفاق کتاب وکار آف ویکفیلڈ کا معاوضہ صرف ۶۰ پونڈ ملا تھا ۔

لارڈ بائرن نے اپنی سوانح عمری کے صلے میں ایک لاکھ پونڈ پائے ۔

شیکسپیر اپنے ڈراموں سے سالانہ ۳۰ پونڈ کماتا تھا ۔

بال کنسن کی تصنیف لائف آف کرائیسٹ کے مخلوطے کی قیمت ۴۰ ہزار پونڈ ملی تھی ۔

شوبرٹ کو اس کی ایک نظم کا معاوضہ ۵ پونڈ ملا تھا ۔

گلی ورس ٹراولس" کے صلے میں جو تھا ان سوئیفٹ کو ...۲ پونڈ وصول ہوئے تھے ۔

کانن ڈائیل نے راڈنی اسٹون کے معاوضے میں، ہزار پونڈ پائے ۔

اے ۔ ایس ۔ ایم ہچنسن نے "اِف ونٹر کمس" کے لیے ۳۰ ہزار پونڈ وصول کیے ۔

آدم اسمتھ کو "ولتھ آف نیشنس" کا معاوضہ ..۵ پونڈ ملا تھا ۔

مورلی نے " لائف آف گلاڈ اسٹون" کے لیے دس ہزار پونڈ معاوضہ حاصل کیا ۔

لیڈی اکسفورڈ کو اپنی سوانح حیات کے صلے میں ۱۳ ہزار پونڈ ملے تھے مگر افسوس کہ تاس گرے کو اپنے لافانی شاہکار "ایلجی" کے صلے میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی ۔ اس کو کہتے ہیں ناقدری

تحفۃ المجاہدین | ملیبار میں مسلمانوں کی آمد اور اشاعت اسلام اور سواحل پر پرتگیزوں کے عروج و اقتدار کی نہایت معتبر اور شہرہ آفاق تاریخ ہے ۔ اس کے مصنف شیخ زین الدین معبری ہیں ۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور شہنشاہ اکبر کے عہد میں لکھی گئی تھی ۔ مغربی زبانوں میں اس کتاب کے کئی ترجمے مکمل اور خلاصے کے طور پر شایع ہو چکے ہیں لیکن ہندستانی زبان اس گرانقدر کتاب کے ترجمے سے محروم تھی ۔ آج سے تقریباً ۱۲ سال قبل جناب حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ماہر آثار قدیم نے اس کتاب کا عربی متن شایع کیا ہے ۔ اب اس کا ہندستانی ترجمہ جس کے مترجم بھی حکیم صاحب موصوف ہی ہیں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ نے شایع کیا ہے ۔ حکیم صاحب نے نہ صرف ترجمہ کیا ہے بلکہ اصل کتاب پر کئی ہزار معلومات آفریں ضمیموں کا اضافہ فرمایا ہے جس سے کتاب کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے ۔

کتاب الجرح والتعدیل | (عربی) رجال میں بڑی مشہور کتاب ہے اس کے مصنف امام حافظ شیخ الاسلام ابی محمد عبد الرحمن ابن الامام

الکبیرابی حاتم (المتوفی ۳۲۷) ہیں ۔ ابتک یہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھی ۔ اب متعدد نسخوں سے مقابلہ کرکے صحت و اہتمام کے ساتھ دائرۃ المعارف حیدرآباد اس کو شایع کر رہا ہے ۔

فلمی

دس ہزار بوسے | ہالی ووڈ کی مشہور سینما اسٹار اولیویا دے ہاویلینڈ نے فلم میں کام کرنے سے ابتک متعدد ایکٹروں کو جملہ دس ہزار بوسے دیے ہیں ۔

ستر بوسوں کا فلم | کولمبیا کمپنی نے ایک فلم تیار کیا ہے جس کا نام "می گرینڈ دی برائیڈ" ہے ۔ جس میں ستر ایسے مواقع پیدا کیے گئے ہیں کہ شوہر اپنی بیوی کے بوسے لیتا ہے فلم حقیقت میں اسم بامسمیٰ ہے مخفی نہ رہے کہ اس فلم میں جون کرافورڈ اور ملون ڈگلس نے کام کیا ہے ۔

ایک رات | ہندستان میں فلمی کمپنیوں کی کمی نہیں مگر اچھے فلم بنانے والی کمپنیاں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں ۔ شالیمار کو اس گروہ کا ایک مفید اضافہ سمجھنا چاہیے ۔

مذہبی اور تاریخی فلمیں اوراق پارینہ کی یاد تازہ کرسکتے ہیں لیکن سماج سدھار میں ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی ۔ پربھات بومبے ٹاکیز اور نیو تھیٹرز نے اس قسم کے بہت سے فلم تیار کیے جن سے دنیا کچھ حاصل نہ کرسکی ڈراما زندگی کا دوسرا نام ہے اور ڈراما اس وقت سے کھیلا جارہا ہے جب سے زندگی شروع ہوئی ۔ اور اس وقت تک کھیلا جاتا رہیگا جب تک زندگی کے آثار باقی ہیں ۔

مختلف دور اور زمانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ڈرامے کی شکل میں اسٹیج پر پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ اسٹیج ایک محدود مقام ہے جہاں پر صرف ایک محدود جماعت ہی ڈرامہ دیکھ سکتی ہے اس لیے ڈراموں کو ہر خاص و عام تک پہنچانے کے لیے اگر ین کیا کیا جانے لگا ۔ ان ڈراموں یا فلموں کا مقصد تفریح طبع یا محض حظ حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اپنی معاشرتی کمزوریوں کا غائر مطالعہ کرکے سبق حاصل کرنا اور ان کی اصلاح کرنا ہے ۔ ایسی فلم کمپنیاں قابل مبارکباد ہیں جو معاشرتی قسم کے سبق دینے والے فلم تیار کرتی ہیں شالیمار پکچرس بھی ایک ایسی کمپنی ہے جس نے پہلی ہی کوشش میں "ایک رات" جیسا بہترین معاشرتی فلم تیار کیا ہے ۔

ایک رات کا قصہ ہمارے معاشرے کی ایک زبردست خرابی یعنی جبری شادی کو پیش کرتا ہے ۔ اس قصے کی ایک اور خوبی یہہ ہے کہ ہماری معاشرت اور سماجی کمزوریوں کے مختلف ذیلی پہلوؤں پر بھی خود بخود روشنی پڑتی ہے ۔ مثلاً اپنی اولاد کے مقابل ایک ماں کا اپنی سوتیلی بیٹی کے ساتھ سلوک، شوہر کا اپنی نئی بیوی کی انگلیوں پر ناچنا، باپ کا اپنی مرحوم بیوی کی اولاد سے بے اعتنائی برتنا، موجودہ بیوی کی اولاد کی برتری، مرحوم بیوی کی اولاد کی بے بسی، ایک بے بس لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی، بظاہر یالدار بر کی تلاش اور جبری شادی کے نتایج کے ساتھ ساتھ سچے پریم کا بندھن بھی ایک خاص انوکھے انداز میں بتایا گیا ہے ۔

اداکاروں میں نینا کے متعلق ہم یہہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس نے پہلی مرتبہ کام کیا ہے اور اگر یہ واقعہ ہے تو ہم بلا تامل یہہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء کی بہترین اداکاری کا انعام نینا ہی کو ملنا چاہیے ۔

پرتھوی راج نے وہ کیا جو اس کو کرنا چاہیے تھا بلکہ اس فلم میں اس کا کام زیادہ بہتر رہا ہے ۔ مبارک اور گلاب کا جوڑا اچھا رہا ۔ کے ۔ این سنگھ کا کام عوام کو اصلیت کے شبہہ میں ڈالدیتا ہے اس کے علاوہ ذیلی اداکاروں نے بھی اپنا اپنا فرض بڑی حد تک عمدگی سے ادا کیا ہے ۔

فوٹوگرافی، صدابندی، ٹکنیک اور سٹنگ بھی کامیاب رہا ہے ۔ اس میں شک نہیں فلم میں بعض معمولی سی خامیاں رہگئی ہیں جنکی اصلاح کا خیال آنے والے فلموں میں ضرور رکھا جائیگا ۔ مگر بحیثیت اس پہلی کوشش کو شالیمار کا ایک شاندار کارنامہ کہنا چاہیے جس کی مبارکباد کے مستحق اس کے قصہ نویس، ڈائرکٹر اور پروڈیوسر مسٹر ڈبلیو ۔ زیڈ احمد ہیں ۔

اس میں شک نہیں ایک کامیاب فلم تیار کرنا ایک ڈائرکٹر اور

پروڈیوسری کا کام ہے لیکن اس کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنا کسی کمپنی کے پبلسٹی منیجر کا کمال ہے۔ یہ شالیمار پکچرس کی خوش قسمتی ہے کہ شہزادہ ایاز جیسا ماہر فن تشہیر جنرل منیجر اس کو مل گیا ہے۔ جس کی کوششوں سے ہندستان کے کونے کونے میں شالیمار ایک رات اور مینا کی آوازیں گونج رہی ہیں۔

چونکہ نقش ثانی عموماً اچھا ہی ہوا کرتا ہے اس لحاظ سے پروڈیوسر ڈائریکٹر اور جنرل منیجر کی آئندہ کوششوں سے ہمارا یہ توقع رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ شالیمار کا دوسرا تحفہ مقبول عام ہو کر رہیگا

خاندان پنجاب صحافتی نقطۂ نظر سے ہندستانی زبان کی جو بھی خدمت کر رہا ہے اس سے علمی دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ موجودہ زمانے میں زبان کی خدمت کا ایک اور اہم ذریعہ فلم ہے۔ فلموں کے ذریعے زبان اجاگر ہوتی ہے اور اس کا اچھا قاعدہ رچا رہتا ہے۔ شاید اس نظریے کے تحت پنجاب نے ہندستانی زبان میں فلمیں بنانا شروع کیا ہے۔

پنچولی آرٹ پروڈکشن نے خزانچی جیسا دلچسپ اور سراسر ترنم فلم بنا کر اپنے پہلے ہی پیشکش میں کافی سے زیادہ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد "خاندان" اس کا دوسرا شاہکار ہے

خاندان کا قصہ عام فلموں کے قصے سے ہٹا ہوا ہے۔ قصہ نہایت ہی دلچسپ اور ناصحانہ انداز میں لکھا گیا ہے عشق و محبت کی داستان کو ایک انوکھے انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔

یہ قصہ ہماری سماجی زندگی کے نقائص کو بے نقاب کرتا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ سچے پریم اور بازاری محبتوں کے مصنوعی عشق کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کے بھائی چارے کی ایک بہتر جھلک دکھائی گئی ہے۔ سب سے بڑھکر مسٹر آغا بال (اقبال) کا کردار مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کرنے والوں کے لیے ایک تازیانے کا کام کرتا ہے۔

اس کھیل میں بھی منور رہا اپنے فطری تمثیلی جوہر کے ساتھ پیش ہوگئی ہے۔ ہندستانی فلم میں نور جہاں اگرچہ پہلی بار ظاہر ہوئی ہے لیکن اپنے بہتر کام کے باعث عوام میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ غلام محمد جو فلمی دنیا میں غنڈے پن کی اداکاری کے لیے مشہور تھا اس فلم میں اس نے شاید پہلی بار ایک سنجیدہ باپ کا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ واقعی تعریف سے بالاتر ہے۔ مسٹر آغا بال کھیل کا ہیرو انور اور رما کا کردار بھی اپنی اپنی حیثیت سے ٹھیک ہے۔ سب سے بڑھکر تعریف کے قابل ننھی منی بے بی اختر کا کام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی ہر حرکت کسی حقیقی واقعے کا یقین دلاتی ہے۔

خاندان نہ صرف قصے کے اعتبار سے اچھا فلم ہے بلکہ گانوں کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ خزانچی کی طرح اس کھیل میں بھی موسیقی کی دلچسپی کے تسلسل کو قایم رکھا گیا ہے۔

مکالمے چونکہ ہندستانی زبان کے ایک مشہور ادیب کے زور قلم کا نتیجہ ہیں اس لیے نپے تلے ہیں۔ زبان نہایت صاف اور شستہ ہے مگر بعض بعض جگہ پنجابی جھلک موجود ہے۔

اداآموزی، کہانی اور صدا بندی وغیرہ قابل تعریف ہے۔ پنچولی جیسی کمپنی سے ہمیں توقع ہے کہ وہ ہر وقت سماج سدھار قسم کے ناصحانہ فلم ہی تیار کرتی رہیگی اور ملک ایک ملی جلی عام زبان یعنی ہندستانی کا خاص طور پر خیال رکھیگی۔

بہر حال بحیثیت مجموعی مذکورہ بالا فلم کو بلا شبہ ایک کامیاب فلم کہا جا سکتا ہے۔



جلد (۲) آبان ۱۳۵۱ف ستمبر ۱۹۴۲ء نمبر (۱۲)

فہرست مضامین

ہمارے خیالات

اس نمبر سے متعلق

عرصے سے ہمارا خیال تھا کہ ایک ایسا نمبر بھی ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کیا جائے جس میں ادبی جواہر پارے ہوں۔ اس خاص نمبر کے لیے ہم نے کوئی مواد خصوصیت کے ساتھ طلب نہیں کیا تھا بلکہ عام نمبروں میں چھپائی کی غرض سے اس قسم کا جو بھی چھوٹا سا مضمون آجاتا اس کو ہم محفوظ کر لیتے تھے۔ اس طرح "قطرے قطرے سے تالاب بھرتا ہے" کے مصداق ایک ایک چھوٹے مضمون کے جمع کرنے سے ایک نمبر ہی تیار ہو گیا ہمیں توقع ہے کہ ادب کے یہ انمول موتی ہندستانی ادب کے پڑھنے والوں کی نظر میں خاص اہمیت کا سبب بنیں گے

اس نمبر کے نام کا لحاظ کرتے ہم نے اس دفعہ ڈراما بھی چھوٹا سا پیش کیا ہے۔ "مصور کا جنون" والا سلسلہ طوالت کے خیال سے نہیں دیا گیا۔ اس ڈرامے کی آخری قسط آنیوالے نمبر میں پیش کر دیجائے گی۔

نیا سال نمبر

پچھلے سال ہندستانی ادب نے پہلی آذر ۱۳۵۱ف کے موقع پر اپنا خاص نمبر "نیا سال نمبر" کے نام سے پیش کیا تھا جو ادبی طبقوں میں ہر حیثیت سے کامیاب اور مقبول رہا۔ اس کے بعد ہم نے اور بھی خاص نمبر نکالے جو اپنی اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے کافی شہرت حاصل کر چکے خیال تھا کہ آذر ۱۳۵۲ف میں بھی ایک شاندار خاص نمبر نکالا جائے۔ ہم ضرور ایسا کرتے، اگر زمانے کے حالات بدلے ہوئے نہ ہوتے، کاغذ ضرورت سے زیادہ مہنگا ہوتا اور وقت ہمارا ساتھ دیتا مگر افسوس کہ ہم ہر طرف سے بے بس ہو کر رہ گئے ہیں اس لیے اس دفعہ اپنے خاص نمبر کو خاص شکل میں پیش نہ کر سکیں گے۔ بلکہ وہی معمولی نمبر شاید ایک آدھ چیز کے اضافہ کے ساتھ خاص نمبر کی شکل میں پیش کر دیا جائے۔ تیسرا سال نمبر کے لیے مضامین اور نظمیں اس مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بھیجی جا سکتی ہیں۔

انعامی اسکیم

ہمیں اس کا افسوس رہا کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ہم "سالگرہ نمبر" کی انعامی اسکیم کا نتیجہ جلد پیش نہ کر سکے۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اس دفعہ ہم اس نتیجے کا اعلان کر رہے ہیں۔

انعام پانے والوں کی خدمت میں بطور انعام کتابیں پیش کیجائینگی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ادبی کامیابی کا معاوضہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

آخر میں ہم انعام پانے والوں کی خدمت میں مبارکباد کا خلوص بھرا تحفہ بھی پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

"ابوالحنک"

(یعنی)

"ایک جبڑے والا انسان"

"میجر گلب ماوراے جاردن میں"

ایک انگریز جاسوس میجر جان بگٹ گلب کو جو عربوں کا لیڈر بنا ہوا ہے، عربوں نے اس کا نام "ابوالحنک" یعنی "ایک جبڑے والا انسان" رکھ دیا ہے۔ اور اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم کے کسی موقع پر یہ سخت زخمی ہو گیا تھا۔ اور اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا۔ عرب اس سے بہت خلوص و محبت رکھتے تھے۔ اور وہ ان سے مساوی طور پر مخلصانہ برتاو کرتا ہے، سرزمین ماوراے جاردن کی سرحدیں ان چار مختلف علاقوں یعنی فلسطین، عراق، سعودی عربستان، اور شام سے ملتی ہیں نقشہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ حصہ ملک فوجی نقطۂ نظر سے کس قدر اہم ہے، اس نئی ریاست میں سے عراق کے تیل کے نل، ساحل سمندر کی طرف حیفہ تک گزرتے ہیں۔ یہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں ہے کہ ہٹلر کے نقاد کی آنکھیں اُدھر بھی لگی ہوئی ہیں لیکن گلب نے، عربوں، اور بدوؤں کے طاقتور دستے، ان نالیوں کی حفاظت و نگرانی کے لیے تیار کر رکھے ہیں

اگرچہ گلب، اس قدر اہم کام میں مصروف ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ابھی تک یہ گوشہ گمنامی میں ہے۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت خاموش کارکن ہے۔ اس کو نہ تو کسی صلے کی پروا ہے اور نہ مقبولیت عام کی خواہش

میجر گلب تقریباً عرب زادہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ جس کے سرخ بال، جلد اور ناک بالکل عربوں کا سا ہے۔ پست قد اور چھریرا آدمی ہے۔ گویا کرنل لارنس مشہور عرب جاسوس سے ملتا جلتا ہے گلب کو کتب بینی کا شوق ہے اور اس نے مطالعہ کتب سے فن حرب میں تجربہ حاصل کیا ہے۔ اور اس میں سب سے خاص بات یہ ہے کہ عربوں کو اپنے قابو میں رکھنے کی اس کو بڑی مہارت ہے۔

خفیہ سیاحت وسفر

کسی ٹوپی یا اونٹ پر بدوں کی طرح صحرا میں گشت لگاتے رہنا اور قبیلوں کی موجودہ تعصبات کی پروا نہ کرکے جن سے وہ ہر وقت اپنے مکان میں لطف اندوز ہوتا تھا، مارے مارے پھرنا اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بعض اوقات یہ کسی شاہی ہوائیہ کے جہاز میں بیٹھ کر قلب صحرا میں پہنچ جاتا ہے، اور کچھ عرصے کے بعد گلب دفعتاً اپنے مستقر واپس آجاتا ہے اور ان سیاحوں سے وہ بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کو اسی طرح، حکومت کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیوں کی اطلاعیں بھی ملجاتی ہیں۔ اور بہت سے نئے دوست احباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کو خطرات کے وقت بڑی مدد پہنچاتے ہیں جب نازی عراق میں فساد کا جال پھیلا رہے تھے تو گلب کی خفیہ تنظیم نے اس کو اس ریشہ دوانیوں سے باخبر رکھا۔ اور ان کے خلاف اس کے موقتی اقدام نے ماوراے جاردن کو نازی خطرہ سے پاک کر دیا

گلب، انگریزی فوج میں ایک نوجوان انجینیر کی حیثیت سے داخل ہوا، اس پر بھی وہ بڑا ہی نڈر انسان ہے، ایک روز بعض فوجی لوگ، ایک بدمعاش گھوڑے کو جو بھاگ نکلا تھا قابو میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ کسی طرح قابو میں نہیں آتا تھا تب لفٹنٹ گلب، سیدھا گھوڑے کے پاس پہنچ گیا، اور اس کی پیٹ پر سوار ہو گیا، سب کو بہت حیرت ہوئی اور یہ گھوڑا اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے اپنی ہی سواری کے لیے رکھ لیا۔

جب اس کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی، تو زیست کی تمام امیدیں منقطع ہو گئی تھیں۔ لیکن وہ ایک ہی مہینے میں اچھا ہو کر واپس آگیا اور اپنے ساتھیوں سے مل گیا۔ تاہم اس کی قوت گویائی بالکل جاتی رہی، اور اس لیے وہ احکام بذریعہ تحریر جاری کرتا ہے وہ عراق بھیجا گیا۔ گویا عراق کو اپنے آدمی کا انتظار تھا اگرچہ اب لڑائی ختم ہو چکی تھی وہ اپنی ہی جگہ پر بحال رکھا گیا، اس ملک میں برطانوی سیاسی افسر کی حیثیت سے اس نے اندرون ملک باقاعدہ انتظام رکھا۔ اور اس بات کی نگرانی رکھی کہ باہر سے کوئی

حملہ نہونے پاسے ۔ بظاہر یہ کوئی معمولی کام نہ تھا، کیوں کہ یہاں فسادبرپا کرنے والوں کی خاصی تعداد موجود تھی ۔ لیکن گلب ایسا آدمی نہ تھا جو خطرات سے منہ پھیرے، اس ملک میں اپنے دس سالہ قیام کے زمانہ میں اس نے ملک میں امن ونظم قایم رکھا ۔

سخاوت مرزا بی۔اے۔ ال۔ال بی

آنسوؤں کی داستان

مجھے ایک بار اپنے دیوتا کے سامنے پیش کرو ۔ شاید میں اس کے حسین قدموں پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کرکے ابدی سکون حاصل کرسکوں ۔

میرے سرتاج! تم نہیں جانتے! میں تمہاری خاطر آنسو بہانا اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں، میرے آنسوؤں کو پانی کی رقیق بوندیں نہ سمجھو، یہ میرے دل کے بہتے ہوے افسانے ہیں ۔

دنیا میرے آنسوؤں کو تبسم سے خریدنا چاہتی ہے ۔ آہ دنیا کی ناقدر شناسی!

میں اپنے آنسوؤں کے ایک ایک موتی تارنگاہ میں پروتی ہوں ۔ اور اس کے ٹوٹ جانے پر سسکیاں بھرنے لگتی ہوں ۔

مجھے اپنے آنسوؤں کے ضایع ہوجانے کا اتنا رنج نہیں، جتنا کہ ان کے ختم جانے کا ۔

پیارے جب تم میرے پاس نہیں ہوتے تب میں تنہائی میں آنسو بہایا کرتی ہوں، میری آنسوؤں بھری آنکھوں میں تم آکر مسکراتے ہو، تب میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے اپنی دونوں آنکھیں میچ لیتی ہوں ۔ مگر آہ! تم میرے رخساروں کی راہ سے نہ معلوم کہاں غایب ہوجاتے ہو ۔

آہ پریتم! میں کیا کروں، تم میرے آنسوؤں کو محض کھیل سمجھ رہے ہو ۔ میرے آنسو صرف تمہیں پاکر تھم سکتے ہیں، میں اپنے آنسو دیکر موت اور زندگی نہیں چاہتی ۔

پیارے! میں اپنے جذبات پر کیسے قابو پاسکتی ہوں، جب کہ میرا دل خود آنسوؤں کے دھارے میں بہا جارہا ہے ۔

بالم! اب میں تمہارے سامنے کبھی نہ آؤں گی کہیں تم مجھے آنسو بہاتے ہوئے دیکھ کر نفرت کرنے نہ لگو میں اپنی دکھ بھری داستان سناکر تم کو متاثر کرنا نہیں چاہتی ۔ بلکہ اپنے سوگوار دل کو تسکین دینا چاہتی ہوں، میرے آنسوؤں کا صرف یہی مقصد ہے ۔

کاش تم میرے مقصد کو سمجھ سکتے!

صابر کوسگوئی

مشاہدات

عظمت شورش ادراک نظر آتی ہے
زندگی شعلہ بیباک نظر آتی ہے

سطوت زر کہ تھی خلاق نظام ہستی
آج خود دامن صد چاک نظر آتی ہے

بجھ رہے ہیں دل آفاق کی ظلمت کے چراغ
رحمت گردش افلاک نظر آتی ہے

اہل گلشن کی رعونت کا خدا حافظ ہے
برق زا قسمت خاشاک نظر آتی ہے

ظلمت پستی دل دور نظر آتی ہے
ہر نظر برق سر طور نظر آتی ہے

اب نہ تاریکی اوہام کی شاہی ہوگی
زندگی نور سے معمور نظر آتی ہے

پشت ہستی پہ جہانبانی سلطان وامیر
ایک رستا ہوا ناسور نظر آتی ہے

جھوم اے دل کہ بہ فرمان نگار گیتی
منقلب عظمت مغفور نظر آتی ہے

(لطیفہ ساجد (عثمانیہ)

زلفی کے خطوط

(سلسلے کے لیے ہندستانی ادب کا نیا سال نمبر ملاحظہ کیجیے یہ اس کی دوسری قسط ہے)

شاعر صاحب تسلیم۔

دیکھیے بات کا بتنگڑ ہو گیا۔ منہ سے نکلی خلق نے سنی۔ اس رسوائی سے آخر کیا حاصل، ہاں اگر آپ کا کوئی ذاتی فائدہ ہو تو بندی کو کوئی انکار نہیں یہ کوچہ ہی ایسا ہے۔ مگر بیکار ہیں ایسی باتیں مجھے بالکل پسند نہیں، لگی لپٹی رکھتی نہیں اس لیے صاف صاف منہ پر کہدیا۔

ہاں صاحب، آگ بجھانے لوہار جلانے دھونکنے والے کی بلا جانے آپ کو آخر اس بیچارے سے کیا ہمدردی ہو گی۔ یہ تو سب منہ دیکھی باتیں ہیں ورنہ بہت کچھ آپ خود کر سکتے تھے۔ مگر صاحب آخر آپ دلی والے ہیں نا؟ دلی والوں میں مروت کیسی۔ منہ پر کچھ پیٹھ پیچھے کچھ اور ہم تو دھڑلے سے سب کچھ کہدیتے ہیں چنانچہ اور بنیں آتی ہی نہیں۔

سنا بہت دیکھا خاک نہیں ان عامل صاحب سے کہدیجیے گا کہ خود ہی سونا بنائیں اور خود رئیس بنجائیں۔ مجھے کیا پڑی ہے۔ ہو آئے ناراض آپ کا منہ تھا کہ ان کی حسب مراتب خدمت بھی کی اور خاطر بات بھی، چلنے لگے تو زادراہ بھی دیا۔

کروشن کے پیپر اگر مل جائیں تو یہ ضرور بھجوائیے میرے ایک عزیز ریل ہی میں ملازم ہیں جب آپ کہیں ان کو پرچہ لکھ کر بھیج دوں دے دیجیے یا دلا دیجیے۔ آپ کا سلام بہت خوب ہے۔ پڑھتی ہوں اور پھڑک جاتی ہوں۔ والسلام

گنہگار زلفی

(دوسرا)

ہے مزا آ گیا۔ اوئی، منہ سوئی پیٹ کوئی۔ اتنا سا بچہ اور اس غضب کا لے ہے آفت کا پرکالہ ہے زبان ایسی چلتی ہے جیسے کلکتہ کی مقراض۔ بات تو منہ سے نکلنے نہیں دیتا معلوم ہوتا ہے آپ کا منہ چڑھا ہوا ہے۔ آخر اور بھی تو بچے ہیں کیا مجال جو ذرا بات ادھر کی ادھر تو کریں مگر وہ تو شعلہ جوالہ ہے۔

آپ کتنے پیارے خط لکھتے ہیں واقعی امید کی دیر ہے اس میں رشک کی کیا گنجایش معلوم ہوتا ہے کلیجہ نکال کر رکھدیا ہے۔ کاش آپ خطوط میں جیسے معلوم ہوتے ہیں ایسے ہی در اصل ہوتے یا ہوں۔ زندگی تب ہی دلکش ہو سکتی ہے۔

جو خواب میں دیکھ رہی ہوں وہ دیکھیے کبھی شرمندۂ تعبیر بھی ہوتا ہے یا یونہیں بے آس اور بے مراد ہاتھ ملتے ہوئے جانا پڑے گا۔ آپ کو تو افسوس کاہے کو ہونے لگا ہائے میری ہڈیاں قبر میں بھی چین سے نہ لگیں گی۔

اچھا .... کہدیا نا ... — .... ! زلفی

(دوسرا)

اجی نواب صاحب۔ بندی کورنش بجالاتی ہے۔

یہ تو فرمایے یا سائیں کون سے حضرت ہیں؟ بڑے مزے کے آدمی سنے جاتے ہیں۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے تو ہم بھی دیکھیں گے برے بھلے کی تمیز تو ہم کو ہے ہی نہیں۔ مگر آپ لوگوں نے اعزاز دیا ہے ہم بھی دو چار پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگے ہیں

خربوزے تو لال ہی گئے ہوں گے اس کو تکلف نہ جانیے گا کیریاں اس پیڑ کی ہیں جو میں نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے اس کو بڑی محنت سے تیار کیا ہے ابھی میں نے تو ایک امبیا منہ پر بھی نہیں رکھی ہے آپ چکھ لیں تو ہماری یاری ہے۔

یہ کیا کیا — یہاں کون — آپ کہیے کون؟

ہائے مجبوریاں .... زمانہ پڑا ہے، بات کی بات تھی

مگر آپ کا انتخاب ہی تو ہے

بیگم سہی — کچھ تو ہے ہی رہن نامے کے متعلق کیا ہوا کچھ خبر؟

حضرت نظم سے میرا سلام کہہ دیجیے گا اچھا بس جناب اب سر دکھنے لگا
پیاس معلوم ہو۔ یہی ہے

زلفی

(دوسرا)

زلفی آگئی ۔ آداب! آداب!!
کہیے کیسا مزاج ہے ——————

بھئی عجب لطیفہ ہے ۔ عقل دنگ ہے اور ناطقہ سرگریباں ہے
آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے یہ کیا مال ہے ——————

آپ کو میری قسم سچ کہیے ۔ بھیج دوں ۔ تکلف نہ کیجیے گا ۔ ——————

آج کل گرمی کے مارے جی مرا مرا رہتا ہے کل ایک غزل کہی ہے جو
کچھ یاد ہے سنیے ۔

وہ سنتے رہے اور کہتے رہے ہم
بڑی پر کشش تھی کہانی ہماری

———

لکھا ہے کہ ہم جلد آئیں گے واللہ
کہ راتیں بھی ہونگی سہانی ہماری

———

کہیں یہ بھی ہے قابل نذر تیرے
کہاں کی ہے ایسی جوانی ہماری

جو تم ہو گے اپنی تو دنیا ہے اپنی
زمانا ہمارا جوانی ہماری

یہ زلفی سے کہدو نہ وہ سامنے ہو
ستم ڈھانے گی نوجوانی ہماری

ابھی کیا ہے نوشتی آپ خود ملاحظہ کرلیں گے ۔ یہ اور بات ہے کہ
آپ زبردستی کی تعریف کردیں میں نے تو اپنی قسم ابھی نظر ثانی
بھی نہیں کی ہے ۔ اور ہاں میں نے آپکے مشورہ پر عمل کیا شعر کو
لکھ کر

چھا گلیں آگئی ہیں اب تو بدمزگی ذرا کم ہے
آپکی وہی (زلفی)

(دوسرا)

سلام مسنون ۔ لیجیے قبلہ ہمارے ملازم صاحب سات آٹھ
ہزار پر ہاتھ پھیر گئے ۔ چلتے چلاتے ہم کو بنا گئے خیر ان کے مقدر
کا تھا لیے اور کالا منھ کیا ۔ میں نے کچہری عدالت مناسب نہ
خیال کی میری تقدیر سے گیا تھا چلا گیا نہ اترا ہوتا تو کاہے کو اس کے
ہاتھ ہی لگتا ۔ سب تقدیر کے کھیل ہیں کیا شکوہ کرسکتی ہوں ۔
ہائے آپ نے نہ جانے کیا کر دیا ہے ۔ کوئی تسخیر کا عمل تو
نہیں —— آپ ہیں بھی ——————

جمیلہ آج کل بیمار ہیں دعاے صحت کے بجاے دعاے رحلت فرمایئے
بڑی مہربانی ہوگی ۔ اور کیا ؟

(زلفی)

جاوید قیصری ام ۔ اے (کانپور)

نقاش

مرے نقاش یہ بیکار ہے تیرا شہکار۔۔۔۔۔

اس کے ہونٹوں سے نمایاں نہیں غم کے جذبات
اس کی آنکھوں میں نہیں ——————
حسرت بیکسی بیتاب ——————
اس کے گالوں پہ نہیں گمندے کی زردی عریاں
اس کے ماتھے پہ نہیں ——————
غم کی سیاہی رقصاں ——————
لا ادھر تیرا میں شہکار بنا دوں نقاش
مرے نقاش یہ بیکار ہے تیرا شہکار

اس کی آنکھوں کو ذرا اور تو کر دے نمناک
اس کے چہرے کو ذرا ——————
اور تو کر دے غمناک ——————
اس کے بالوں کو ذرا اور پریشان کر دے
اس کے ہونٹوں کو ذرا ——————
اور بنا دے بیتاب ——————
لا ادھر تیرا میں شہکار بنا دوں نقاش
مرے نقاش یہ بیکار ہے تیرا شہکار

اس کی ہر بات میں پوشیدہ تھا اک راز نہاں
جانے کیا چاہتا تھا ——————
کر نہ سکا ہائے بیاں ——————
اس کو ہمدردی دنیا نے نہ دی کوئی اماں
یہی غنچہ کبھی کھلتا ——————
تو گلستاں ہوتا ——————
لا ادھر تیرا میں شہکار بنا دوں نقاش
مرے نقاش یہ بیکار ہے تیرا شہکار

آخری وقت میں دیکھا تھا اسے میں نے بھی
اس کے کھانے کو بھی ——————
باقی نہ تھی پھوٹی کوڑی ——————
بھی اسی چھوٹے سے بچے کا ہے
جس کی کل لاش ——————
غریبی سے پڑی تھی عریاں ——————
لا ادھر تیرا میں شہکار بنا دوں نقاش
مرے نقاش یہ بیکار ہے تیرا شہکار

جاوید قیصری ام۔ اے

حشر جذبات

جو کل تھا محو خودی آج اشکبار تو ہے
خطا معاف ہو یا رب کہ شرمسار تو ہے

سکون دید میسر اگر نہیں نہ سہی
ترے فراق میں اک ذوق انتظار تو ہے

بدل رہے ہیں ترے لیے تو نظام شمس و قمر
کہ تجھکو عالم ہستی پہ اختیار تو ہے

یہاں قفس میں تو رنگینیوں کا ذکر نہ کر
کہ اس میں کچھ نہ سہی کاوش بہار تو ہے

ابھی امید ہے نظارہ نشیمن کی
ابھی چمن کے لیے آنکھ اشکبار تو ہے

تری نظر سے ہے محفل میں کچھ تو رنگ حیات
کہ بزم شوق و تمنا میں فتنہ کار تو ہے

نہیں ہے نعرہ منصور اگر تو غم کیا ہے
کہ میری ذات سے دنیا میں شور دار تو ہے

اسی کو حاصل گریہ سمجھ رہا ہوں میں
کہ خون دامن ہستی پہ لالہ کار تو ہے

سکون اس پہ تصدق سکوں ہے کیا ثاقب
کہ میری جان حزیں غم سے بیقرار تو ہے

ثاقب (کانپوری)

ادب جدید

شمع حسن ——— اور میں

ذیل کے مضمون میں پہلی دفعہ ایک دوسرے سے قریبی مناسبت اور تعلق رکھنے والے محاورات و تلازمات کو مضمون کی شکل میں ڈھالا گیا ہے، اس قبیل کی کوششوں کو وسعت دی جائے تو شاید ادب کے لیے مفید ثابت ہوں۔

"چراغ جلے" جب وہ آئے، تو ایسے آئے کہ گویا، آنکھوں کا کاجل چرا"، کہیں کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے۔ پہلے ہی سے "آگ تو لگی ہوئی تھی" باتوں باتوں میں "چراغ پا" ہوئے جاتے تھے۔

منت کی، سماجت کی، بہت کچھ کیا، لیکن "کالے کے آگے چراغ نہ جل سکا" ایک طرف "لو لگی تھی" تو دوسری طرف "دل بھی جلتا تھا"۔ "شمع محفل" تھے ہی، بانکپن سے "نورٌ علیٰ نور" ہو رہے تھے اسی لیے جہاں جم رہے "چہرہ کا شاہد جس طرح چراغ ہوتا ہے" اسی طرح حسن بھی ان کی غمازی کر رہا تھا، یہی وجہ تھی کہ اہل مجلس میں بعض جو سوختہ جان عشاق تھے۔ .... ہے کہ "آگ پر لوٹ رہے تھے" کچھ تو ارباب نظر تھے کہ، جن کے "گرمی نظارہ" سے دل پگھلتے تھے" ایک گوشے میں اور "آتش جمال" بھی تھے، جو انہیں دیکھ کر "آگ ہوئے جاتے تھے"۔

اس محفل میں، چوں کہ میرا "دل بجھ چکا تھا" اسی لیئے زندگی اس وقت "بے چراغ" محسوس ہو رہی تھی لطف یہ کہ ساری ہنگامہ آرائیاں میرے آگے تھیں، مگر مجھے اپنے ہی "چراغ تلے اندھیرا" نظر آتا تھا۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ افسوس! نہ میں اس بزم میں آتا، اور نہ یہ رنگ دیکھتا۔ لیکن تعجب ہے کہ میرے ایک رفیق طریق نے حیرت انگیز طریقے پر میرے بشرے سے یہ کیفیات محسوس کریں، اور شانہ جھنجوڑ کر تسلی دینی چاہی، جب مجھے مایوس دیکھا تو "آگ بگولا" ہو کر کہا کہ ارے! ناامید نہ ہو "چراغ سے چراغ جلتا ہے" شاید کسی وقت نظر التفات ہو جائے میں نے کہا ———

اجی! قبلہ و کعبہ! "نہ نو من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچیگی" بے وفائیاں نہ بھولی جاتی ہیں، نہ صدموں کا اثر کم ہوتا ہے تو کس طرح تشفی پاؤں۔

اگر میرے سامنے "شمع حسن" ہے بھی تو سمجھ کہ "شعلی آپ اندھا ہوتا ہے"۔ ساری عمر دیے جلاتے پھرے" مگر پھر بھی ہمارا چراغ نہ جلا" افسوس! کس قیامت کے وعدے کیے "اپنی پروانہ وار" وفا شعاریوں کا مجھے یقین دلایا، اور پھر یکایک خلاف توقع یہ بے مہریاں۔ حیرت۔ تعجب۔

بھلا بتاؤ اگر! ؎

سوزش دردنہاں ہو اشک افشانی نہ ہو یا اس سے پوچھو جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو

اسی لیے آیندہ میں، اپنے منصب "شیفتگی" پر کسی کو سرفراز اور خود محبت کی "آتش سوزاں" میں جلنا نہیں چاہتا۔ بس اس محفل سے نکلو، اگر یہی لیل و نہار رہی، تو بہت جلد "چراغ زندگی گل اور عزت کی پگڑی غایب ہو جائے گی" کیوں کہ ؎

اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

رہبر فاروقی (منشی فاضل)

مضامین کی واپسی

ایسے مضامین جو ہمارے معیار پر نہ اتریں ٹکٹ آنے پر واپس کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن بغیر ٹکٹ آئے کے کوئی مضمون واپس نہیں ہو سکتا۔

تعاقبِ خیال

"زندگی ایک شیریں ملاپ ہے" شام کے دھندلے آسمان پر بادل کے ایک وارفتہ ٹکڑے نے دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں! پیارے محبت ایک رنگین خواب ہے" دوسرے نے اپنا پتلا اور نازک جسم اس کی آغوش میں گم کرتے ہوئے مشکل سے کہا۔

دفعتًا ایک خوفناک بجلی چمکی۔ فضا میں ایک تیز سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ دور ——— زمیں پر ایک سنسان میدان میں ——— ٹھیک ان بادلوں کے نیچے ایک "گرم لاش" پڑی ہے جہاں ہوا اس کے بے حس کانوں میں چپکے چپکے کچھ کہہ رہی ہے۔

نیلا آسمان پہلے کی طرح ابر آلود ہے دو بادل اب بھی ایک دوسرے کو اپنی دھڑکتی ہوئی آغوش میں لیے آہستہ آہستہ مغرب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

مگر خاموش فضا میں اب رنگین نغموں کی بجائے ایک تڑپتا ہوا گیت رواں ہے۔

"محبت خواب نہیں بلکہ ایک چنگاری ہے"

کیف اسرائیلی

انجام

شبنم کا ایک چھوٹا سا قطرہ پھول...... ایک حسین پھول کی نازک گود میں پڑا...... ہلکے ہلکے..... ہوا کے جھونکے چلنے لگے...... پھول مسکرا دیا....... شاعر نے دیکھا...... اور کہا فائدہ........ اے پھول تیرے اس کھلنے سے فائدہ!.... غلام......... غلام......... ہوا کا غلام......... خود مسکرا......... اے پھول خود مسکرا...... تیرا ساز اور تشنۂ مضراب ...... اے پھول خود مسکرا دوسروں کی مدد سے کھلنا....... ناپائیدار...... صرف چند لمحوں کے لیے...... زندگی..... مسکراہٹ....... دلفریبی...... بیکار...... سب بیکار ..... مسکرا...... اے پھول...... خود مسکرا" ...... شبنم کے قطرے نے یہ بات سنی..... شرم سے پانی پانی ہوگیا...... شاعر سے آنکھیں چار نہ کرسکا...... اور..... اور پھول کے دامن میں اپنا منہ چھپا لیا..... پھول نے سر اٹھا کر شاعر کو دیکھا ...... اور مسکرایا..... اور پھر اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا....... بلبل خوشی سے مست ہوگئی اور بیخودی میں پھول کا منہ چوم لیا...... پھول پھر مسکرا دیا..... مگر یہ کیا ...... ایک پنکھڑی گر پڑی...... دوسری..... تیسری..... سب پنکھڑیاں بکھر کر زمین پر گر پڑیں...... مرجھاتی ہوئی پنکھڑیاں ...... بلبل رونے لگی...... شاعر نے آہ بھر کر کہا "دوسروں کی مدد سے حاصل کی ہوئی خوبصورتی کا انجام......!!

عزمی (خیرآبادی)

مضامین

وغیرہ کے سلسلے میں ہمیشہ ایڈیٹر کو اور کاروباری سلسلے میں ہر وقت منیجر کو مخاطب کیجیے۔ امید کہ اس کا ضرور لحاظ رکھا جائیگا۔ منیجر

جواب طلب امور کیلیے ہمیشہ جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کیجیے۔ ورنہ جواب نہ آنیکی شکایت بے جا ہوگی۔ منیجر

فسطائیت

جہاں زبانوں پر قفلِ استبداد لگا ہو۔
جہاں قلم کو زنجیر پہنائی گئی ہو۔
جہاں حکومت کی باگ ڈور ایک نیرو، ایک چنگیز، ایک اسٹالن، ایک ہٹلر
اور ایک مسولینی کے ہاتھ میں ہو۔
جہاں بہیمانہ قوتوں کا راج ہو۔
جہاں آدم خوار درندے بستے ہوں۔
جہاں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے میں مسرت ہوتی ہو
جہاں زندگی موت کے سائے میں پلتی ہو۔
جہاں دل کی بجائے جسم پر حکومت ہوتی ہو۔
جہاں مار کر رونے نہ دیا جاتا ہو۔
جہاں ہمسایوں کی آزادیاں چھین لی جاتی ہوں
جہاں دہشت کی حکمرانی ہو۔
جہاں بین قومی اصول توڑ دیے جاتے ہوں۔
جہاں جمہور کی کوئی آواز نہ ہو۔

اے دوست! سیاست کی زبان میں ایسے نظامِ حکومت کو
"فسطائیت" کہتے ہیں

سید مہدی حسین (عثمانیہ)

تجلیات

تری تجلی وہ معجزہ ہے کہ جب اٹھا دی نقاب تو نے
کہ تو نے خاک کے "شب پرست" ذرے بنا دیے آفتاب تو نے

مجھے اگر ناز ہے بجا ہے کہ اس فرومائگی کے ہوتے
لیا ترے غم نے قلب میرا کیا مجھے انتخاب تو نے

سکون نام آرزو کی ہے ایک ہمت شکن حقیقت
حصولِ راحت کہاں نہ سمجھی جو فطرتِ اضطراب تو نے

گل و بر و بار بن گئے ہیں بجا خود ایک نظمِ دلکش
یہ اے مغنیِ بزمِ فطرت کہاں سے چھیڑا رباب تو نے

وہی نظر آزما حقیقت جو عقل کا رازِ جستجو تھی
اسی کو اے حسن اک تجلی میں کر دیا بے نقاب تو نے

سپاس اہلِ نظر ادا کر کے بن گئیں پردہ دار نظریں
حجاب ٹوٹا تو اور پایا لطیف تر اک حجاب تو نے

علی اختر حیدرآبادی

کہیں دور

اس پاپ کی دنیا سے کہیں دور چلونگی

ہے روح غم ہجر سے بیکل مجھے لے چل
بھاری ہے جدائی میں ہر اک پل مجھے لیچل
اے خضر محبت مجھے لے چل مجھے لے چل

فطرت ہنو جس دیس میں مجبور چلونگی
اس پاپ کی دنیا سے کہیں دور چلونگی

بھاتے نہیں اس عالم فانی کے نظارے
مرجھائے ہوئے پھول یہ ڈوبے ہوئے تارے
جیلے کوئی کب تک غم پنہاں کے سہارے

کچھ اور ہے اب عشق کو منظور چلونگی
اس پاپ کی دنیا سے کہیں دور چلونگی

یہ پاپ کا سنسار گناہوں کی یہ بستی
ہے جنس ہوس جس میں ہر اک چیز ہے سستی
اف کتنا ستم خیز ہے ہنگامہ ہستی

دل نشہ احساس سے ہے چور چلونگی
اس پاپ کی دنیا سے کہیں دور چلونگی

اس پاپ کی دنیا میں گذر ہو نہیں سکتا
ریحانہ کے نالوں میں اثر ہو نہیں سکتا
درمان غم شوق مگر ہو نہیں سکتا

رہتی ہوں بہت ہجر میں رنجور چلونگی
اس پاپ کی دنیا سے کہیں دور چلونگی

ریحانہ جمال ہاشمی

براہ کرم مضامین ہمیشہ صاف خط میں لکھا کیجیے ۔

دل کو سنبھالوں

اپنا افسانہ غم ہوش میں آلوں تو کہوں
ہو جو تسکیں تو کہوں دلکو سنبھالوں تو کہوں

صبر برخواست کہ ہے جوش جنوں دامنگیر
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑا لوں تو کہوں

حال دل اپنا اگر قابل اظہار نہیں
ہجر ہے بار گراں اس کو اٹھا لوں تو کہوں

اے مسیحا ترا احساں مجھے منظور نہیں
نقش ہستی کو ہر طور مٹا لوں تو کہوں

حال دل کا ہے کہ ہے غم کی کہانی ہے شمیم
خود کو میں خوگر فریاد بنا لوں تو کہوں

شمیم (اورنگ آبادی)

غزل

آ آ کے میری قبر پہ گریاں ہوئے تو کیا
مرنے کے بعد آپ پشیماں ہوئے تو کیا

میرا سیاہ خانہ ہی روشن نہ جب ہوا
میری بلا سے وہ مہ تاباں ہوئے تو کیا

صورت کے ساتھ چاہیے سیرت بھی نیک ہو
یوسف ہوئے تو کیا شہ خوباں ہوئے تو کیا

آلام غم نے فطرت دل کو بدل دیا
ارمان و شوق سلسلہ جنباں ہوئے تو کیا

کل بتکدے میں ہوں گے محبت ہی پیش پیش
مسجد میں آکے آج مسلماں ہوئے تو کیا

عظیم الدین محبت ایم اے (عثمانیہ)

اندھی محبت

تاریخی ڈرامہ

کردار

طیطوس ـــــ شہنشاہ روم
بنیرس ـــــ شاہ اگرپا کی حسین بہن
مارشیا ـــــ طیطوس کی بیوی
جولیا ـــــ مارشیا کی سہیلی
فوجی افسران ـــــ ملازم ـــــ کنیزیں وغیرہ

زمانہ ـــــ قدیم

پہلا منظر

(شاہی محل کے ایک زرین کمرے میں بنیرس کھڑی شہر کا دردناک منظر دیکھ رہی ہے ـــ مکانات شعلہ فشاں ہیں ـــ رومن سپاہی قتل و غارتگری کا بازار گرم کر رہے ہیں ـــ مقتولین کی دلدوز چیخوں سے فضا ہیبتناک ہے۔)

بنیرس آہ! دنیا کس قدر عبرتناک جگہ ہے۔ ابھی اسی مقام پر سرود سرائیوں سے کائنات مترنم تھی ـــ نشاط انگیزیاں غموں سے بدل گئیں۔

آہ! طیطوس۔ تم ظالم و جابر ہو ـــ تم نے میرے وطن کو جہنم سا بنا دیا ـــ خون کے دریا بہا دیے ـــ سیکڑوں خاندانوں کو خانماں برباد ـــ بچوں کو یتیم بنا دیا ـــ تم نے میرے خاندان کو خانہ خراب اور میرے بھائی کی حکومت غصب کر لی ـــ تم ڈاکو بنکر آئے لوٹ و غارتگری کا بازار گرم کر دیا ـــ مگر تم نے آہ! میرے دل کو بھی لوٹ ـــ میرے دل میں تمہارے خلاف نفرت کے طوفان اٹھتے ہیں میں تم کو خاک و خون میں تڑپتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم کو آتش بداماں دیکھنا چاہتی ہوں۔ مگر آہ!! جب تم میرے سامنے آجاتے ہو تو میں سب کچھ بھول جاتی ہوں۔

(حریری پردے کو حرکت ہوتی ہے۔ طیطوس داخل ہوتا ہے)

طیطوس (بازو پھیلائے ہوئے بڑھتا ہے)۔ جان طیطوس! تم کبیدہ خاطر کیوں ہو ـــ

بنیرس یہی المناک منظر دیکھ کر۔

(طیطوس بنیرس کی بلوریں گردن میں اپنے ہاتھ حمائل کر دیتا ہے ـــ دونوں ایک مخملیں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

طیطوس ہم لوگ جلد ہی روم کی جانب مراجعت کرنیوالے ہیں۔ کیا تم میرے ہمراہ نہ چلوگی؟ بنیرس میں تمہارے بغیر ماہی بے آب رہوں گا ـــ فلک کے آغوش سے اگر آفتاب جدا ہو جائے تو وہ ظلمت کدہ بن جاتا ہے ـــ اسی طرح جانمن تمہارے بغیر میری دنیا بھی تاریک ہو جائیگی ـــ تمہارا یہ سوختہ دل بچاری شمع سوزاں کے مانند پھنک کر رہ جائیگا۔

بنیرس طیطوس کیا تم صحیح کہہ رہے ہو؟

طیطوس یقین جانو بنیرس "قول مرداں جان دارد" ـــ اگر دنیا کا ذرہ ذرہ سرکشی پر آمادہ ہو جائے۔ تب بھی میں تم کو فراموش نہیں کر سکتا ـــ طیطوس مرسکتا ہے مگر تم کو چھوڑ نہیں سکتا ـــ تم میری ملکہ ہو ـــ جان سے زیادہ پیاری۔ میں تم کو روم کی قیصرہ بناؤں گا۔ تم شاہنشاہ کی ملکہ ہوگی۔ میں نہیں بلکہ تم بھی حکومت کر [illegible]

بنیرس (کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے) طیطو[illegible] ہو ـــ میں تازیست تم سے جدا نہیں [illegible] محبت کا ناچیز تحفہ تمہارے او[illegible]

طیطوس (مسکرا کر) بنیرس تم حسین ہو ـــ

بھولی بھالی ہو۔ تم بڑی اچھی ہو . .

(طیطوس کیف زا مسرت سے مدہوش ہو کر بنیرس کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے)

طیطوس تم میری روح ہو — جس کو میں نے پا لیا۔

(دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے — دونوں علیحدہ ہو جاتے ہیں — ایک فوجی افسر داخل ہوتا ہے)

افسر (آداب و کورنش ادا کر کے) حضور کے اقبال کا اوج ثریا نصیب ہو — ہماری فوجوں نے شہر کو مکمل تسخیر کر لیا ہے — ہماری کامرانی کا نشان — رومی پھریرا قلعہ کی بلندی پر نصب کر دیا گیا — ہماری فوج ظفر موج مسرت و کامرانی کے نعرے لگا رہی ہے۔

طیطوس اچھا اب کیا ارادہ ہے؟

افسر حضور! شاہنشاہ نے اس خوشی پر مبارکباد پیش کی ہے اور ایک شخص ایک اور پر مسرت خبر لے کر آیا ہے۔ — حضور کو یسوع مقدس نے ایک دختر نیک اختر عطا کی

طیطوس کچھ اور بھی کہا ہے۔

افسر شاہنشاہ کا حکم ہے کہ اس ماہ کے اختتام تک ہم مکمل سکون کر کے واپسی کا عزم کریں — تفصیلات کے لیے آپ خود گفتگو کریں۔

طیطوس اچھا چلو ہم ابھی آئے۔

(افسر جاتا ہے)

طیطوس بنیرس کیا تم بھی ہمراہ چلو گی۔

بنیرس ہاں! کہہ تو دیا۔

طیطوس اچھا تو پھر تم تیار ہو جاؤ۔

بنیرس میں تیار ہوں۔

طیطوس تو میں جا کر انتظام کرتا ہوں۔

(اٹھ کر جاتا ہے)

پردہ ———

دوسرا منظر

(قصر شاہی کی چھت پر جولیا اور شہزادی مارشیا محو گفتگو ہیں)

مارشیا آخر یہ لوگ آئیں گے کب تک

جولیا بس ملکہ — اب آنے ہی والے ہیں

مارشیا یہ انتظار کی گھڑیاں تو مدت العمر سے زیادہ طویل ہو جاتی ہیں

جولیا ملکہ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں۔

مارشیا تم کیا جانو! میرے دل میں جو مسرت و انبساط کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ اگر پر مل جائیں تو اڑ کر وہاں پہونچ جاؤں۔

جولیا ہاں کیوں نہیں۔ وہ بھی تو آپ سے اس قدر محبت کرتے ہیں

مارشیا جولیا کیا تم جانتی ہو۔ کہ شادی کے بعد وہ میری محبت میں اس قدر سرشار ہو گئے تھے کہ مجبوراً شہنشاہ نے ان کو مہم پر روانہ کر دیا تاکہ ان کا منجمد خون پھر اسی سرعت سے شریانوں میں رواں ہو جائے — ورنہ ان کو خوف تھا۔ کہیں یہ عیش و عشرت میں بزدل نہ ہو جائے۔

جولیا مجھے اچھی طرح یاد ہے ملکہ — میں نئی نئی آئی تھی — شہزادے والا ہر وقت قصر ہی میں رہتے تھے۔

مارشیا ہاں — دیکھو تو آج روم میں کیسی رونق ہے — آج ہر شخص خندہ زن ہے۔

جولیا کیوں نہیں ملکہ — آج ان کا وہ ہیرو — بہادر جنرل آ رہا ہے۔ جس نے ان کے نام کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا دیا۔ جس نے ان کو دنیا کی قوموں کی صف اول میں لا کھڑا کیا۔

(مارشیا کھلکھلا کر ہنستی ہے۔ باجوں کی ملی جلی آواز جلوس کی آمد کی خبر دے رہی ہے۔ جلوس رفتہ رفتہ قصر شاہی سے قریب ہوتا جا رہا ہے)

مارشیا جولیا — جولیا — وہ آ رہے ہیں — مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا میں بہشت میں پرواز کر رہی ہوں۔

جولیا وہ بھی آپ کے لیے اسی قدر بیتاب ہوں گے۔

مارشیا جس وقت وہ اپنی نورِ نظر کو دیکھیں گے تو فرطِ مسرت سے دیوانے ہو جائیں گے۔

جولیا کیا وہ ان کی لختِ جگر نہیں۔

(دیموسس محلِ شاہی کے نزدیک آکر رکتا ہے۔ ایک کنیز گھبرائی ہوئی آتی ہے)

کنیز ملکہ! غضب!

مارشیا (غصہ سے) کیا ہے؟

کنیز ملکہ غضب ہو گیا۔ ایک یہودی حسینہ نے شہزادے کا دل چھین لیا۔

مارشیا (سراسیمہ ہوکر) کیا کہا۔ کیا یہ سچ۔

کنیز حضور وہ بھی تو دیموسس کے ساتھ۔ وہ دیکھیے اس پالکی میں لیٹی ہے۔

(مارشیا۔ پالکی میں لیٹی ہوئی بنیرس کو دیکھتی ہے)

مارشیا ہاں دیکھا! میری دشمن۔ مگر پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے۔

جولیا نہیں شہزادی ۔۔۔ ایسا نہیں ۔۔۔

مارشیا جولیا! آؤ ہم اب اس خوشی میں شریک نہ ہوں گے۔۔

(مارشیا حزن و ملال کا مرقع بنی اٹھکر چلی جاتی ہے)

(پردہ)

تیسرا منظر

(شاہی باغ میں سینٹ اور طیطوس ٹہل رہے ہیں)

سینٹ شاہ مرحوم کی آخری وصیت یہ تھی کہ جس وقت تک آپ یہودن کو علحدہ نہ کریں گے اس وقت تک آپ تخت کے حقدار نہیں ہو سکتے۔

طیطوس مقدس باپ ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ولی عہد سلطنت موجود ہو۔ تخت کا حقدار کوئی اور ہو۔ طیطوس اس کو کبھی نہیں برداشت کر سکتا۔

سینٹ آپ کو خود پر قابو رکھنا چاہیے ۔۔۔ بادشاہ رعایا کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے ۔۔۔ اس کی مرضی کا طابع۔

طیطوس تو میں رعایا پر کون سے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہوں

سینٹ وہ ایک یہودی نسل عورت کو کبھی تخت روم پر نہیں دیکھ سکتے

طیطوس تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بنیرس کو چھوڑ دوں ۔۔۔ اپنی روح سے جدا ہو جاؤں ۔۔۔ خود گردن پر چھری پھیر لوں میں نے رومن قوم کی کس قدر خدمت کی ہے ۔۔۔ میں حب وطن کی خاطر سربکف میدان میں کود پڑا ۔۔۔ صرف اس قوم کا نام بلند کرنے کے لیے ۔۔۔ مگر وہی قوم میرے ساتھ غداری پر تلی ہوئی ہے۔

سینٹ یہ آپ کا خیال ہے ۔۔۔ قوم آپ کے مہتم بالشان کارناموں کی اب بھی معترف ہے ۔۔۔ مگر آپ کا موجودہ رویہ واقعی غیر واجب ہے ۔۔۔

طیطوس تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس معصوم ہستی کی آرزوؤں کو کچل ڈالوں ۔۔۔ اس کی محبت کو شکستہ کر دوں ۔۔۔ وہی جس نے میری خاطر اپنے عزیز و اقربا کو قربان کر دیا ۔۔۔ وطن کو خیرباد کہا ۔۔۔ مقدس ولی ذرا سوچو تو سہی

سینٹ مگر آپ تصویر کے دونوں رخ پر نظر رکھیں ۔۔۔ جہاں فرق آپ اپنی خوشنودی کے لیے اور اس یہودن کے لیے کوشاں ہیں ۔۔۔ وہاں قوم کی لاکھوں ہستیاں بھی ہیں ۔۔۔ جنکی زندگی کی قیمت آپ کی زندگی سے کم نہیں۔ پھر مارشیا کا حال بھی آپ سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ وہ صحیح حقدار ہے اور پھر "حق بحق دار رسید" ہو کر رہیگا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ آپکی بے اعتنائیوں کا اسکو آپ پر زیادہ حق ہے ۔۔۔ کیا وہ ایام آپ بھول گئے۔ جب آپ نے شہزادی مارشیا کی خاطر تخت و تاج سے کنارہ کش ہو جانے کا عزم کر لیا تھا۔

طیطوس آہ! آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی زندگی کو سوگوار بنا لوں ۔۔۔ روح کو دائمی بے چینی دیدوں ۔۔۔ کیا میرے جگر پر چھری پھیر دینا چاہتے ہیں ۔۔۔ مقدس ولی میں تباہ ہو جاؤنگا

سینٹ آپ شاہنشاہ ہونے والے ہیں ۔۔۔ ملک اور قوم کے

ناخدا — آپ کو اپنی ہستیوں کی خاطر کچھ نہ کچھ تو ایثار کرنا پڑیگا۔

(مکمل سکوت)

طیطوس (گلوگیر ہو کر) مقدس ولی! میں اس کو فراموش کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکتا — یاد رکھیے آپ کہ میں روم کا شاہنشاہ ہوں گا — مگر ایک انسان نہیں — اپنی ناکامیوں کی صدائے بازگشت۔

(بے اختیار روتا ہے)

چوتھا منظر

(قصر شاہی — بیرنس کا کمرہ آج غیر معمولی تزئین کا شرمندہ احسان ہے — عطر کی لپٹوں سے فضا مہکی ہوئی ہے)

بیرنس آؤ میری شبستان کے منور چراغ — میری دنیائے محبت کے آفتاب — دیکھو تو میں تمہارے انتظار میں چشم براہ دیدہ و دل وا کیے بیٹھی ہوں —

آج کس قدر نشاط آفرینیاں فضا میں لہرا رہی ہیں — فضا ساغر بکف — کائنات خوشی کے نغمے الاپ رہی ہے —

آؤ — دیکھو تو میرے آغوش وا تمہارے لیے بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ کل جب تم روم کے شاہنشاہ ہو گے تو میں تمہارے تخت پر ملکہ کی حیثیت سے جلوہ فگن ہونگی

(طویل سکوت)

بیرنس نہ جانے کیوں آج اس قدر رات گئے تک وہ نہیں آئے خدایا میرا دل دھڑک رہا ہے۔

(کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوتی ہے)

بیرنس لو آ گئے — میری روح —

(ایک ملازم داخل ہوتا ہے)

بیرنس (پریشانی سے) تم کس لیے آئے ہو۔

ملازم حضور! آج شہزادہ عالم نے دیر سے آنیکو کہا ہے۔

بیرنس تم بیوقوف بیہودہ کبھی ایسا نہیں کہہ سکتے — جاؤ ابھی نکل جاؤ — گدھے — نامعقول۔

(ملازم جاتا ہے)

بیرنس (ایک صوفے پر گر کر) خدایا آج کیا ہونیوالا ہے۔ میرا دل کیوں اس قدر دھڑک رہا ہے۔

(طیطوس داخل ہوتا ہے)

بیرنس میرے محبوب آج تم خلاف امید مضمحل کیوں؟ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آج مجھ پر کوئی افتاد پڑنے والی ہے۔

طیطوس (بیرنس کو آغوش میں لے کر) نہیں میری دیوی تم پریشان مت ہو — تم میرے معبد کی وہ روح نواز دیوی ہو جس کے آستانہ پر میں ہمیشہ جبیں سائی کرنا چاہتا ہوں — تم بربط ناہید ہو جس کے سحر انگیز نغموں نے مجھکو مسحور کر لیا — کیا تمہیں میری محبت پر کچھ شک ہے۔

بیرنس نہیں میرے معبود — مجھے تم پر اعتبار ہے — مجھے کامل یقین ہے کہ تم میری تمناؤں کو مکمل کر دو گے — مگر نہ جانے کیوں آج میرا دل خود بخود دھڑک رہا ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج میرے غنچہ مسرت کو مسل ڈالا جائے گا۔

طیطوس (اٹک اٹک کر) بے — بیرنس

بیرنس میرے محبوب (ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیتی ہے)

(طلسم سکوت)

(طیطوس اٹھکر دیوانہ وار کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگتا ہے)

طیطوس (غم آلود لہجے میں) بیرنس تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج میں روم کا شاہنشاہ بنا دیا گیا ہوں۔ میں تم کو بھی ملکہ بنا کر شریک بنانا چاہتا تھا۔ مگر! مگر!! قوم سرکشی پر آمادہ ہے۔ میں ان کی خاطر اپنی مسرتوں کو قربان کرتا ہوں۔ اور امید ہے کہ تم اس کو صبر و سکون سے برداشت کرو گی

بیرنس (دیدہ تر سے) طیطوس! مجھے یقین نہیں — میں کس قدر ڈراونا خواب دیکھ رہی ہوں — کیا قدرت مجھ سے انتقام لینے پر تلی ہے —

طیطوس بیرنس تم ایک شاہنشاہ کے فرائض سے واقف ہو —

— آج میرے کاندھوں پر حکومت کا بوجھ ڈالا گیا —
— مجھے قوم کی رہنمائی ودیعت کر دی گئی —
— میرے سامنے سابق شاہوں کی عظمت و جلال کا
نقشہ متحرک ہے — ایک بادشاہ کو صاحب دل نہیں ہونا چاہیئے

بیزس (سسکیاں بھر کر) .... طے .... طوس ...... تم نے
میرے دل کو ویران کر دیا — میری زندگی کو مجسم آہ بنا دیا

طیطوس بیزس میں اس وقت دو متضاد جذبات کے تحت حق و باطل
کے فیصلے پر غور کر رہا ہوں، مارشیا میری جایز بیوی ہے
اور اس کا حق ہے۔

بیزس اور تمہارے وہ وعدے

طیطوس یاد ہیں۔

بیزس مگر ایک شاہنشاہ پر خلاف ورزی زیب نہیں دیتی۔

طیطوس یہ محبت و فرض کی جنگ ہے۔ فرض محبت پر غالب ہے
— ایک شاہنشاہ کو محبت میں فرض بنا سہنا ہوتا ہے۔

بیزس میں نے کونسی خطا کی تھی۔ جس کے نتیجہ میں تم نے میرے ارمانوں
کو مسل ڈالا — میری دنیا کو تاریک بنا دیا — مجھکو ایک
عضو معطل کی طرح بیکار کر ڈالا۔

(خاموشی)

طیطوس (بیزس کو اپنی آغوش میں لے کر بوسہ لیتا ہے)
بیزس یہ الوداعی بوسہ ہے۔ تم جا رہی ہو مگر میری دنیا
مسرور کو ویران کر کے — صحرا بنا کے — میرے دل سے
تم کبھی فراموش نہیں ہو سکتیں۔
— تم اس پر ایک کبھی نہ ڈوبنے والے آفتاب کی طرح
منور ہو گی —

(طیطوس بے اختیار روتا ہے) (پردہ گرتا ہے)

نکہت لکھنوی

دوست سے

اے دوست! زندگی کو سمجھ ہیکلی نہ دیکھ
زخموں کو چھو کے قلب کی افسردگی نہ دیکھ
شعلوں سے کھیل! آگ میں رہنا تو سیکھ لے
خاروں میں رہ کے ناز سے ہنسنا تو سیکھ لے
ٹھوکر پہ ہر حیات کی تو مسکرائے جا!
غمگین رہ کے عیش کے نغمے بجائے جا!
غم کو چھپا زمانے میں تو ہین غم نہ کر
اشکوں کو لا کے آنکھ میں پلکوں کو نم نہ کر

اے ہمدم عزیز! میری زندگی نہ دیکھ
میری ہنسی نہ دیکھ تو میری خوشی نہ دیکھ
آہوں پہ جس کی منزل ہستی کو ہو قرار
وہ کیوں بھلا جہان میں خوشی سے ہو ہمکنار
ہمدم! نہ کر تو جامہ ہستی کو تار تار
بکھرا نہ پھول خار میں ہمدم ترے نثار
آہوں کو لب پہ لاکے نہ کر بے قرار تو!
صبر و سکون سے کھیل تو اے تیرے نیک خو!

اے دوست! زندگی کو بقا دے تیرے لیے
تو اپنی حسرتوں کو سجا دے میرے لیے
ہمدم! نہ کھیل تو میرے خاموش ساز سے
شعلے بھڑک نہ جائیں کہیں دل کی آگ کے
آنکھوں میں اشک دل میں تمنائیں ہیں نڈھال
پوچھو نہ اے ندیم کے میں کم
اجڑے جہان ناز کی پوچھو نہ رنگ و بو
اس بوستان کی

معبدِ شکستہ

اچھی اور پیاری روحی! السلام محبت حیات ثریا کے لیے تمہارے پیہم اصرار اور بار بار کے تقاضوں نے آخر میرے قلم میں انتشار پیدا کر ہی دیا۔ سنو روحی! جیسے بیمار غم کی دو ہچکیاں اس کے انجام کے لیے کافی ہیں اسی طرح ثریا کے یہ دو خط اس کے ماضی، حال و استقبال کے آئینہ دار ہیں۔ اور میں تو انہیں سسکیوں سے چیخوں سے فلک شگاف آہوں سے زہرہ گداز نالوں سے تعبیر کرتی ہوں۔ ان پارہ ہائے قرطاس کے لیے ہمیں شاہد کا ممنون ہونا چاہیے۔ دیکھو روحی! یہ اس قوم کے لوگ ہیں جنہیں اپنی تہذیب، اپنے تمدن پر ناز ہے جن کے رہبر کے ہاتھ میں ایک نورانی مشعل ہے اور اس کی روشنی میں فانکو ما طاب بکم سنہرے اور نمایاں حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر ان میں سے گم کردہ راہ وجود اب بھی جسموں کی تجارت کرتے ہیں۔ ان معصوم جسموں کی جن کی تڑپتی ہوئی روحیں ان سے نکل جانے کے لیے بیقرار اور مضطرب نظر آتی ہیں فقط

تمہاری تنویر

ثریا نواز شاہد! کسی کے دل کی دھڑکنیں تمہاری سلامتی مانگ رہی ہیں۔ شاید غالب نے کسی ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہوگا ؎

> پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
> جاں نذرِ دلفریبی عنواں کیے ہوئے

متعدد نامہ ہائے روح نواز ملے۔ اف! کیا چوبیس گھنٹے یہی شغل رہ گیا ہے؟ یہ کیا ایک ہی دن میں تین تین خط ——— دیکھو شاہد ہمیں یہ تمہارے نرالے فلسفے اور محبت کے متعلق تمہارا انوکھا نظریہ ایک مدت سے کھٹکتا تھا۔ مگر تم تھے کہ بلطائف الحیل ٹال جاتے۔ فوراً ہی موضوع گفتگو بدل دیتے شاید میری حسین جبیں سے خائف تھے جو تمہارے باندرو لیک کے سینے کو کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔ کچھ بھی ہو اتنا تو ہم کہے دیتے ہیں کہ ہم مان گئے تمہارے صبر و استقلال کو۔ قائل ہو گئے تمہاری قوت برداشت کے، تمہاری عالی ظرفی اور خودداری کی انہیں خوبیوں کی بدولت تو تم وہاں پہنچ گئے جہاں قدسی بستے ہیں۔ جہاں سفلی جذبات رکھنے والے صنفی تقاضوں کی کشمکش میں مبتلا دل و دماغ کسی صورت میں نہیں پہنچ سکتے۔ شاہد! تم نے کئی برس تک میری انوکھی طبیعت کا مطالعہ کیا۔ میرے کیف زندگی سے متعلق میرے فیصلے کو بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر میرا ارادہ ایک مضبوط چٹان تھا جسے اپنی جگہ سے ہلانا کچھ ذرا نا ممکن سا تھا حتا کہ ہماری دنیا میں ایام مسرت کے ہلکے ہلکے قدموں کی دھیمی دھیمی چاپ سنائی دینے لگی۔ اور ایک عرصے کے بعد ہم ایک بار پھر افراد خاندان کے ساتھ وادی گل میں ملے۔ اب کیا تھا۔ دامن کوہ میں تمہارے طویل گیت، وہ کوہستانی راستوں پہ تمہاری معقول تجسّس مجھے مضطرب کرنے لگیں انہوں نے میرے عزم کے سنگین قلعے کی بنیادیں ہلا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ چاندنی راتوں میں حسن و عشق کے نرالے فلسفے جن کا لفظ لفظ مجھے دعوت محبت دیتا تھا مجھے پریشان رکھنے لگے حتا کہ ایک حسین شام کو جب کہ چہرہ فلک اپنے دامن پر خون آفتاب کے سرخ دھبے دیکھ کر غم سے تاریک ہوا جا رہا تھا میں ایک خوبصورت اور جاذب نظر مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر اپنی عظمت و برتری کا اعلان کر رہی تھی۔ تم چپکے چپکے دبے پاؤں آ گئے اور میرے قدموں میں بیٹھ گئے اور نہ جانے کیا کیا کہہ گئے، میں محو حیرت تھی، تشکل تصویر تھی مگر سب سن رہی تھی۔ اب تم ایک شوریدہ سر ندی تھے اور میں ایک تنکا۔ واپسی پر میرے تھکے تھکے قدم اسیر محبت ہونے یا کر دیے جانے کا اظہار کر رہے تھے۔ میں اب بھی خاموش تھی اور تم ایک

ایک کامیاب قانون داں کی طرح اپنا ہر نظریہ مجھ سے منواتے اور فتح پر فتح حاصل کرتے جا رہے تھے ۔ نہ جانے تم نے کہاں اور کس قیمت میں فصاحت و بلاغت کو ان گھڑیوں کے لیے خریدا تھا اور میری قوت گویائی نہ جانے کیوں سلب ہو چکی تھی ۔ میں حیران تھی اپنی اس حماقت پر کیوں کہ میں محبت کو اسی نام سے موسوم کرنے کی عادی تھی ۔ مگر آج میرا زاویہ نگاہ بدل چکا تھا ۔ اور میں اس جنس خام کو اپنی ہستی گرانمایہ کے عوض خرید چکی تھی ۔ یعنی ہم دونوں بلند معبود کے متبرک معبد میں اپنی لافانی اور کوہ شکن محبت کا اقرار کر چکے تھے ۔ اب تم میرے تھے اور میں تمہاری ۔ یہ سب کچھ نہ جانے کیوں کر اور کیسے ہو گیا ۔ تاہم اب تمہارا وجود میرا سرمایہ حیات، تمہاری محبت میرا ایمان اور تمہارا خیال میرا سہارا ے زیست ہے ۔ تمہارا انتظار میرا محبوب ترین مشغلہ اور معمول بن گیا ۔ تمہارے آتے ہی میری بے کیف دنیا میں ایک نیا کیف آ جاتا ہے ۔ اور تمہارے جاتے ہی جب کہ لمحات فرقت مجھے مضطرب اور میرے ماحول کو غم آگین بنا دیتا ہے تب مجھے اپنی بیچارگی کا احساس اس شدت سے ہوتا ہے کہ میں اپنی ہستی کو قابل رحم خیال کرنے لگتی ہوں ؎

کب مجھے کوے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں — فقط

اسیر محبت ثریا

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا

پابند دگر، رہیں غیر شاہر ! شاد رہو آباد رہو ۔ یہ کیا ! تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو اجازت مانگتے ہو ۔ کس لیے ؟ نہیں، نہیں ! ! شاید ! اس اسٹیج کا آخری سین تمہارے سامنے ہے اس المیہ کا خاتمہ ہو گیا ۔ اب کسی نئے منظر کو فلمانا قطعی بیکار اور ناممکن ہے ۔ تم کسی کے ہو چکے یا کر دیے گئے مجھے اس کا شکوہ نہیں ۔ مجھے آج بھی اپنی محبت اور وفاداری پر ناز ہے ۔ صورت موجودہ میں تجھ سے ملاقات، میرے احساسات سے کھیلنے کے مترادف ہو گی ۔ تمہارے سماج اور تمہارے والدین نے تم پر ایک بڑی ذمہ داری عاید کر دی ہے ۔ جاؤ اس کا خیال رکھو اسے نباہو ۔ اور اچھی طرح سے نباہو ۔ سنو ! وفاداری کا بیج سنگلاخ چٹانوں کے سینے پر گر پڑا تھا فیض باراں سے وہ پھوٹ تو نکلا، پودا بھی بن گیا، مگر بڑھنا پھلنا اس کے مقدر میں نہیں تھا ۔ یہ کیا ؟ یہ مجبوری کا دکھڑا وہ فلسفہ کیا ۔ میرے نزدیک بزدلی کا دوسرا نام مجبوری ہے میں یہ مضحکہ خیز اور ناقابل قبول جملے سننے کے لیے تیار نہیں ایک حد تک اگر مجبور ہو سکتی ہے تو عورت، مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا ایسے الفاظ لکھ کر کیوں تقدس محبت کی توہین کرتے ہو ۔ تم نے بہت اچھا کیا جو اپنے اقربا کی خواہش کا احترام کیا ۔ اپنے سماج کی دو دھاری انگلیاں اپنی گردن میں پیوست ہوتی دیکھ کر گھبرا گئے کانپ گئے ۔ ذات برادری کے ذلیل جھگڑوں سے خائف ہو گئے ۔ ہوا کیا دنیا کو مزدور اور سرمایہ دار کا ظرف معلوم ہو گیا ۔ میں کہاں ہوں تمہیں اس درد سر سے مطلب ۔ تو سنو ! آبادی سے دور بہت دور ایک گوشۂ عزلت ، ایک کنج عافیت ہے یعنی ایک معبد شکستہ، اپنی کتاب حیات کے بوسیدہ اور شکستہ اوراق اپنے بوڑھے اور رعشہ دار ہاتھوں میں لیے ہوئے کھڑا ہے ۔ مگر اسی عظمت و وقار سے ۔ اسی شان خودداری کو قایم رکھتے ہوئے ۔ کیوں ؟ شاید اسے اپنی اجڑی ہوئی محراب عبادت پر ناز ہے ۔ ہاں تو میں خداے محبت کی تباہ کردہ زندگی کو اس ویرانے میں کھو دینا چاہتی ہوں ۔ میری حیات مضطرب، میرا سماج زدہ اور مردم گزیدہ وجود، میری غم زدہ روح اور دل شکستہ ہستی ہر لحہ سکون و اطمینان کی جویا تھی ۔ بالآخر اس نے اسے ڈھونڈ لیا ۔ اسے پا لیا ۔ معبد شکستہ کی ٹوٹی ہوئی دیواریں میرے لیے باعث سکون اور وجہ تسلی ہیں ۔ یہ عمارت کہ یہ بزرگ و جہاندیدہ عبادت گاہ نہ جانے کب سے

بے چراغ تھی لیکن اب آباد اور روشن ہے۔ آہ! اس کو میرے خانۂ دل سے کس قدر مشابہت قریبہ ہے۔ یہ شکستہ اور مائل بہ انہدام، میں بھی دل برداشتہ۔ اس کے اجڑے بام و در گریۂ بے اختیار کے بہانے۔ میرا ویران اور حسرت نصیب دل نالہ ہائے پیہم کا خوگر۔ یہ خیر آباد و بے چراغ۔ میرا من مندر بھی ویران و سنسان جس میں امید کی مدھم سے مدھم کرن بھی باقی نہیں۔ آہ! کون جانے قدرت نے اس کھیل کی ابتدا اور انتہا کے لیے معبد ہی کو کیوں انتخاب کیا۔ ممکن ہے کہ معبد شکستہ کی طرح ٹوٹا ہوا دل بھی آئینہ ساز کی نگاہوں میں عزیز تر ہو جائے فقط

ساکن ویرانہ ثریا

شمیم (اورنگ آبادی)

سنہری قہقہے

تمہارے وہ حشر بپا کر دینے والے قہقہے مجھے یاد ہیں! وہ گذرے ہوئے دن جنہیں میں عہد رفتہ کے نام سے یاد کر لیا کرتا ہوں مجھے کبھی کبھی مسرت کی شراب پلا دیا کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا پر تم چھائی ہوئی ہو اور قہقہے لگا رہی ہو۔ کبھی کبھی بیخود ہو کر میں بھی مسکرانے کی ناکام کوشش کرتا ہوں لیکن میری مسکراہٹ تمہارے سنہری قہقہوں میں گم ہو جاتی ہے۔

جب چاند اپنی نورانی چادر کرۂ عرض پر بچھا دیتا ہے اور ستارے ٹمٹما کر مجھے اشارے کرتے ہیں اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند میں تم کھڑی ہو اور تاروں کے ٹمٹمانے پر خندہ زن ہو۔ میں عالم بیخودی میں ٹکٹکی باندھے چاند کو گھورتا ہوں یہاں تک کہ تمہارے سنہری قہقہوں کی آواز مجھے سنائی دیتی ہے جیسے کوئی دور سے بانسری بجا رہا ہو......!!

چاند بادلوں میں منہ چھپا لیتا ہے اور تم بھی غائب ہو جاتی ہو۔ میں چونک پڑتا ہوں جیسے کوئی خواب دیکھا ہے ......!! مگر میں سوچتا ہوں کہ میں نے عالم ہوش میں بھی یہ سنہری قہقہے سنے ہیں!! ....

کلیاں جب موسم بہار میں چٹک چٹک کر پھول بن جاتی ہیں اور کالا بھونرا ان پر منڈلاتا ہے تب میں دیکھتا ہوں پھولوں کی پنکھڑی میں تم گویا قہقہے لگا رہی ہو۔ پتے تالیاں بجاتے ہیں ہوا چلتی ہے اور اپنے ساتھ تمہارے سنہری قہقہوں کو مجھ تک پہنچاتی ہے۔ تمہارے قہقہوں میں نغمے ہیں جن کی شیرینی کلیوں کو پھول بنا دیتی ہے گلچیں جب پھولوں کو توڑ لیتا ہے تو تم غائب ہو جاتی ہو۔ شبنم کے ننھے ننھے قطرے جو ہنوز ہری ہری پتیوں پر جمے ہوئے ہوتے ہیں مجھے آواز دیتے ہیں میں دیکھتا ہوں کہ تم پھر قہقہے لگا رہی ہو! ـــــ وہی ہوشربا سنہری قہقہے!!

سورج نکلتا ہے اور معصوم شبنم کے قطرے فنا ہو جاتے ہیں۔ میں حیران ہو جاتا ہوں اور خشمگین نگاہوں سے سورج کو دیکھتا ہوں اور یہ دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہوں کہ تم اپنے سیاہ گھونگر والے دراز بالوں کو اپنے شانوں پر بکھرائے ہوئے کرنوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہو اور تڑپ تڑپ کر قہقہے لگا رہی ہو!! اس وقت میرے دل میں ایک آرزو پیدا ہوتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے قریب تر ہو جاؤ اور میں تم کو چھو سکوں! آہ آرزوئے ناکام ـــــ!

میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور رخساروں سے ڈھلک کر صفحۂ قرطاس پر جم جاتے ہیں۔ اس وقت میں دیکھتا ہوں کہ تم ان میں کھڑی قہقہہ لگا رہی ہو! ابھی میں تمہیں دل بھر کر بھی نہیں دیکھنے پاتا کہ آنسو کاغذ میں جذب ہو جاتے ہیں میرا ہاتھ کانپنے لگتا ہے اور قلم چھوٹ جاتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کوئی میٹھا خواب دیکھا تھا! مگر میں پھر سوچتا ہوں کہ میں نے اس خواب کو عالم ہوش میں بھی دیکھا ہے

اے سنہری قہقہوں کی مہارانی کیا تم بتا سکتی ہو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جی۔ام۔عمر خاں (عثمانیہ)

مت جاو پردیس

مت جاو پردیس پیا تم مت جاو پردیس

مرجھائیں گی من کی کلیاں
کاٹنے کو آئیں گی کلیاں
سونا ہو جائے گا دیس

مت جاو پردیس
پیا تم
مت جاو پردیس

پڑ جائے گا مجھ کو ترسنا
آنکھ کو آ جائے گا برسنا
کھل کر رہ جائیں گے کیس

مت جاو پردیس
پیا تم
مت جاو پردیس

ہو جاونگی میں دیوانی
روٹھے گی بدمست جوانی
دل کو لگ جائیگی ٹھیس

مت جاو پردیس
پیا تم
مت جاو پردیس

پردیسی! انجان نہیں تم
مالک ہو مہمان نہیں تم
چھوڑتے ہو کس کارن دیس

مت جاو پردیس
پیا تم
مت جاو پردیس

عارفہ بیگم انجم صدیقی

غزل

زمانہ اب نیا ہوگا ہر اک دل شادماں ہوگا
خوشی کی زندگی ہوگی مقدر مہرباں ہوگا

جلا جو شب کو پروانہ تو رو کر شمع یہ بولی
سحر تک راز الفت کا ہمارے بھی عیاں ہوگا

نشیمن پر گرے گی کس کے تو اے برق مضطر کل
نہ شاخ آشیاں ہوگی نہ اپنا آشیاں ہوگا

مصیبت جب پڑی مجھ پر ندا یہ غیب سے آئی
مرے صبر آزما بندے ترا پھر امتحاں ہوگا

نسیم اپنی زباں میں آہ مرنا جس کو کہتے ہیں
فسانہ زندگی کا اختتام داستاں ہوگا

وحیدہ نسیم

غزل

ہم فرط بیخودی میں جدھر دیکھتے رہے
جلوے انھیں کے پیش نظر دیکھتے رہے

ہم اپنے دل کا حال دگر دیکھتے رہے
کچھ اس نگاہ سے وہ ادھر دیکھتے رہے

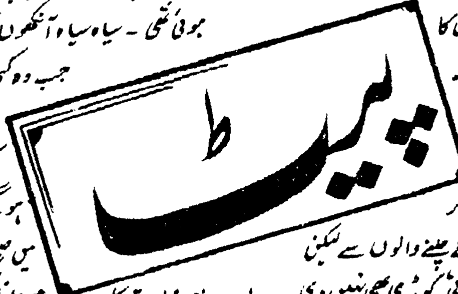
کچھ اس ادا سے آئے وہ بزم بہار میں
حیران برگ و گل تھے، شجر دیکھتے رہے

ایسا بھی وقت ہم نے گذارا ہے عشق میں
گھر کو لگی تھی آگ، مگر دیکھتے رہے

تحسین اپنے بخت کی کم مائگی کیساتھ
نظم جہاں کو زیر و زبر دیکھتے رہے

تحسین سروری

ادب کے متعلق صرف دو ہی تصورات ہیں۔ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی"۔ پہلا تصور مدت ہوئی کہ مٹ چکا اور اگر اس کے کچھ مضمحل اثرات بعض ذہنوں میں پائے بھی جاتے ہیں تو وہ اس قدر دھندلے اور غیر شفاف ہیں کہ ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ کشمکش کا یہ صبر آزما دور، ابتلا و آزمائش کا یہ کٹھن وقت نظام حیات کے ہر اصول کو الٹ پلٹ کر دینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج زندگی کے ہر شعبے میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی ہے۔ زندگی کی راہیں اب اتنی زیادہ تاریک اور غیر معین ہو گئی ہیں کہ ہماری ایک منزل الجھی ہوئی پگڈنڈی کی طرح "منزل منزل" ہو گئی ہے۔ اسی لیے ادب نے بھی "دماغی عیاشی" اور "ذہنی عیش پرستی" کے ناپاک راستوں کو کاٹ کر "تنقید حیات" کی منزل کی طرف اپنے پاؤں بڑھا دیے۔ ایسا میتھو آرنالڈ کہتا ہے "ادب تنقید حیات ہے"۔ ہندستان کے ادب نے بھی اپنی پیدائش سے اب تک مختلف چولے بدلے، وہ ذہنی کرب بے چینی، وہ انقلاب پسند عناصر جو آتشگیر مادوں کی طرح غدر ۱۸۵۷ء کی شکل میں پھوٹ بہے تھے۔ ہندستانی نظام حیات کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے …… اور آج ہمارے فسانہ نگار مزدور، کسان، افلاس، بیروزگاری، بھوک اور پیٹ کے "بنیادی خیالوں" کے گرد اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنتے ہیں۔ تنقید حیات کی یہ تلخی جو مشاہدات اور حقایق کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے کبھی کبھی سنجیدہ طبایع کو مکدر بھی کر دیتی ہے لیکن کیا کیجیے سوائے اس کے کوئی اور چارہ بھی تو نہیں! "پیٹ" افسانہ نہیں ایک مطالعہ ہے۔ اس مطالعے میں یقین ہے کہ آپ کہیں کہیں بدمزگی بھی محسوس کریں گے۔ اس کے لیے حقایق نگاری مجبور ہے۔



دن بھر شہر میں ماری ماری پھری۔ آباد اور روشن سڑکوں کی خاک چھانی۔ پر رونق بازاروں کا چکر کاٹا۔ ایک ایک کی خوشامد کی۔ بے حد بے بس ہو کر دست سوال دراز کیا۔ موٹر کے نرم نرم گدوں پر بیٹھنے والوں سے۔ تانگے، بگی اور سیکل سواروں سے۔ راستے کے چلنے والوں سے لیکن کسی اللہ کے بندے نے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دی۔ —!

دو دن بھر سے بھوکی تھی — ایک کھیل کا دانہ بھی اس کے منہ میں نہ گیا تھا — اس کا پیٹ۔ مرے ہوئے بوڑھے انسان کے چہرے کی طرح جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان جھریوں میں اس کی زندگی کی تمام الجھنیں لپٹی ہوئی تھیں۔

دن بھر کی تھکن سے اس کا چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح زرد پڑ گیا تھا اور اس کے سیاہ اڑتے ہوئے بال بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی طرح اس کے زرد چہرے پر منڈلا رہے تھے اس کی آنکھوں میں وہ تمام تمنائیں سمٹ آئیں

تھیں جن کے سہارے وہ آج پو پھٹنے سے پہلے ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ سیاہ سیاہ آنکھوں کے سرخ سرخ ڈورے کس کام کے جب وہ کسی کی توجہ کو اپنی طرف نہ پھیر سکے۔!

اس کے نرم نرم نازک ہاتھ سردی کی لپٹوں کے باوجود ہلکے ہلکے گرم ہو گئے تھے۔ اس کڑاکے کے جاڑے میں صبح سے شام تک پھرتے رہنے کے بعد حرارت کا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ پاؤں جواب دے چلے، نہ اٹھتے تھے اس کے لیے بیکار تھے —

وہ سڑک کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی — ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ بنایا اور پھر مٹا دیا — پھر بنایا اور پھر مٹا دیا — وہ زندگی کی تصویر بنا رہی تھی — اس کی اپنی زندگی کی تصویر —!

غالباً دن بھر کی تھکن اور بھوک کی شدت پر قابو پانے اور دماغ کی تمام الجھنوں کو دور کرنے کے لیے اس نے مٹی سے کھیلنا شروع کیا۔ لیکن پیٹ —! غریبوں کو اگر خدا پیٹ نہ دیتا تو کیا بگڑ جاتا اس کا —؟ اس نے اپنی گرتی ہوئی امیدوں کو

سہارا دیا اور ہمت کر کے اٹھی۔ کوئی خیال ۔ حسین خیال جو اس کی پژمردہ آنکھوں سے جھانک رہا تھا، اس کے دماغ میں رینگنے لگا اور وہ تیز تیز چلی۔ اپنی تمام آرزوؤں کو مناتے ہوئے ۔ امیدیں دلاتے ہوئے وہ گلی کے اس نکڑ پر پہنچ گئی جہاں ایک دفعہ ایک شریف زادی نے اس کے حال پر رحم کرتے ہوئے اپنے گھر میں بلا کر پیٹ بھر کر کھانا کھلایا تھا اور چلتے وقت کچھ پیسے بھی ہاتھ میں رکھ دیے تھے اس نے اس گھر کو تلاش کرنا شروع کیا جو اس کی آرزوؤں کا مرکز تھا ـــــ اس کے پاؤں چلتے چلتے ایک گھر کے سامنے آ کر رک گئے ۔ دروازے میں قفل پڑا ہوا تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور اس کی امیدیں کو پامال کرتا ہوا نکل گیا ـــــ اس کی تمام آرزوئیں روٹھ گئیں اور دھم سے زمین پر گر پڑی۔ اسی دروازے کے سامنے اس کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے موتی ڈھلکے اور گالوں کے ننھے ننھے گڑھوں میں کھو گئے۔ دنیا کے سارے مظلوموں کی فریادیں اس کی آنکھوں میں کھنچ کر آ گئیں۔ وہ کچھ دیر یونہی پڑی رہی ۔ سوچتی رہی ۔ اس کی آنکھوں کے پردوں پر تصویریں کھنچنا شروع ہوئیں ۔ چند گھناونے خیال آئے اور اس کی متلاشی تیلیوں کو آلودہ کر گئے ـــــ !وہ گھر لوٹ جاتی ۔ اور اس رات بھی اپنی تھکی ہوئی آرزوؤں کو تھپک تھپک کر سلا دیتی اور پیاسی تمناؤں کو بہلا بہلا کر خاموش کر دیتی ـــ لیکن اس کا باپ ۔ اس کے بوڑھے باپ کا بے رونق چہرہ ۔ جس پر موت کا عکس پڑ رہا تھا ۔ اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوسیدہ ٹاٹ کے ٹکڑے پر ۔ جو زندگی سے زیادہ کثیف اور موت سے زیادہ ڈراونا ہے ۔ اس کا باپ، اس کا بیمار باپ کرب کی حالت میں کنمناتے ہوئے چاند کی طرح دم توڑ رہا ہے ۔ کھانسی اور بلغم ـــ جو اس کے منہ سے نکل رہا ہے زندگی کے ایک ایک لمحے کو اس کے کمزور جسم سے کھینچ لے رہا ہے ۔ دن بھر کا فاقہ ـــ علاج تو دوسری بات ہے ۔ وہ باپ، جس نے گڑا کے کے جاڑوں میں ـــ جب فطرت کا ذرہ ذرہ مارے سردی کے کانپ اٹھتا ہے ـــ گرمی کے تیز تیز مسموم ہوا کے جھونکوں میں ـــــ جب زندگی تک مارے گرمی کے سرد پڑ جاتی ہے ۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک میں ۔ جب بڑے بڑے سورماؤں کے دل بھی تھر تھر کانپنے لگتے ہیں ـــ اپنی بیٹی ـــ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے ان سب آفتوں کا مقابلہ کیا ـــ اور اپنی زندگی کی تک بازی لگا کر اپنی بیٹی کو پالا پوسا ۔ وہی بیٹی ـــ اپنے مرتے ہوئے باپ کے لیے روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا بھی مہیا نہیں کر سکتی ـــ ؟ ناممکن ـــ چند معصوم خیال آئے اور اس کی معصوم تیلیوں کو آلودہ کر گئے ـــ !! وہ اٹھی اور چلی ـــ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح ۔ بل کھاتی ہوئی پھنکارے مارتی ہوئی ـــ اپنے گرتے ہوئے شباب کو ابھارتے ہوئے ۔ سینہ تانکر ـــ جیسے دنیا بھر کی تمام ہستیاں دو سڈول پیالوں میں بھر گئی ہوں۔ وہ ایک طرف چلی۔ اس طرف جہاں کل ایک نوجوان غنڈہ ۔ اس کے مانگنے پر ۔ بازو کی کھڑکی سے پانچ روپے کا نوٹ دکھا رہا تھا۔ اور بائیں آنکھ کے اوپر کے کٹے ہوئے سے نیچے کے پپوٹے کو مارتے ہوئے ۔ کچھ کہہ رہا تھا جس کو کل اس نے بالکل نہ سمجھا تھا اور بغیر جواب دیے ہوئے لوٹ گئی تھی ـــــ لیکن آج وہ اسی طرف گئی غالباً اس کے پپوٹے کا علاج کرنے کے لیے ـــ پانچ روپے کا نوٹ کیا ہوتا ہوگا بھلا ـــ ! وہ کھنچی چلی جا رہی تھی ـــــ ایک جگہ آ کر رک گئی ـــــ ایک دروازے پر اس نے صدا دی ـــــ وہی کل والی ـــ بازو کی کھڑکی پر ایک نوجوان آیا ـــ وہ ہنس پڑی ۔ اس غنڈے کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اس کے بدبودار منہ سے چند بھاپیں نکلیں اور ساری فضا کو مسموم کر گئیں ۔ اس نے دروازے سے ہاتھ بڑھا کر ۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر لیا ـــ کمرے کی روشنی گل کر دی ـــ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ہنسی اڑاتا ہوا نکل گیا ـــــ آسمان سے ایک تارہ ٹوٹا اور تاریکی میں گم ہو گیا

......وہ دوشیزگی سرحد پار کر چکی تھی۔

اس کا بندھا شباب کچھ گرا گرا سا جا رہا تھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ جب اس غنڈے نے اس کے ہاتھ میں دو چاندی کے ٹکڑے رکھ دیے ـــ پانچ روپے کا نوٹ کیسا ہوتا ہوگا جلا ـــ! اس احساس سے اس کے دل میں ایک چبھن سی ہوئی۔ لیکن دو روپے کم تھوڑے ہی ہیں دن بھر میں جو دو روپے نہ پیدا کر سکی وہ پانچ سات، منٹ میں دو روپے کمانے وہ کمرے سے فوراً نکل پڑی۔ اپنی مٹھی بھینچے ہوئے۔ اس کا بلوری حسن بوسیدہ چولی میں سے چھن چھن کے نکل رہا تھا۔ اس کا شباب جھانکنے لگا تھا۔ وہ اپنے پلو سے اپنے بے شرم شباب کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے تیز تیز بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ شاید یہ روپیوں کی حرارت ہو۔ اس کی بھوک بالکل مر چکی تھی۔ اس کی تھکن دور ہو گئی تھی۔ وہ اپنے باپ کے پاس دوڑی چلی جا رہی تھی ـــ دو روپے ـــ کھانا پینا، دوا دارو ـــ سب ہی کچھ تو ہو سکتا ہے ان دو روپیوں میں ـــ دو روپے ـــ اس کی زندگی بھر کی کمائی۔ مرتے ہوئے باپ کے کام نہ آئے تو پھر کیا حاصل ـــ؟ وہ جس وقت اپنی جھونپڑی کے پاس پہنچی۔ اس کے باپ کے کھانسنے کی آواز اسے سنائی دی۔ وہ چاہتی تھی کہ جائے اور دوڑ کر اپنے باپ سے لپٹ جائے۔ یہ کہتے ہوئے کہ باپ تیری بیٹی نے اپنی زندگی دیکر تجھ کو موت کے خونخوار جبڑوں سے کھینچا ہے لیکن اس کے پاؤں بندھ گئے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی سانس پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ـــ اپنے وزنی پیروں کو آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے اپنے باپ کے قریب چلی۔ ایک دم سے اس کا پاؤں پھٹی ہوئی ساڑی میں الجھا اور وہ زمین پر آ رہی۔ ہاتھ سے روپے نکلے اور چل گئے۔ آواز پیدا کرتے ہوئے۔ روپیوں کی جھنجھناہٹ فضا میں بکھر کر بوڑھے باپ کے کانوں میں گھس گئی۔ وہ یکایک اٹھ پڑا۔ کھانستا ہوا ـــ یہ ـــ روپے ـــ کہاں ـــ سے لائی کھانستے ہوئے کہاں۔ تھی۔ جھمیا ـــ سے ـــ جواب ـــ دے۔ جواب ـــ کیوں نہیں دیتی، ایک دم سے اس کی کمزور نظریں اس کی چولی پر پڑیں۔ اس کا شباب جھانک رہا تھا، یہ کیا ـــ یہ کیا کیا تو نے ـــ اور یہ بال کیوں کھلے ہوئے ہیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے کمزور اور کانپتے ہوئے پیروں میں فولاد کی سی طاقت آگئی اور اس کی زبان، اس کی سوکھی زبان پانی کے تیز دھارے کی طرح چلنے لگی اور اس کی کھانسی ـــ اس کا تمام روگ دور ہو گیا ـــ، ہائے افسوس یہ تو نے کیا غضب کیا۔ اسی دن کے لیے میں نے تجھے پالا تھا جواب دے۔ بے غیرت۔ عزت دینے سے پہلے مر ہی کیوں نہ گئی ـــ یہ تو نے کیا کیا ـــ بول ـــ تو نے ایسا کیوں کیا ـــ جواب دے ـــ بول ـــ بول ـــ بو ـــ، کھانسی، شدید کھانسی۔ وہ دھم سے زمین پر گر پڑا وہ بولی ـــ بیٹ ـــ کھانسی کا ایک جھٹکا آیا اور اس کی آنکھوں کو ہمیشہ کیلیے بند کر گیا ـــ آسمان سے ایک تارہ ٹوٹا اور تاریکی میں گم ہو گیا ـــ!!!

اظہر رضوی

تصور کی ملاقاتیں

"تم نے تمہارے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا"

"آؤں بھی تو کس لیے ؟"

"پہلے کیوں آتے تھے ؟"

"آپ کی خاطر"

"تو میں اب بھی زندہ ہوں"

"لیکن آپ کی دوشیزگی تو فنا ہو چکی"

"تو کیا تمہیں میرے کنوارپن سے محبت تھی ؟"

"شاید"

"پھر وہ بے غرض اور بے غرض محبت کیا ہوئی ؟"

"بے غرض تو دنیا میں کوئی کام بھی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ دنیا کا قیام بھی کسی غرض ہی سے وجود میں آیا"

"وہ کیا ؟"

"ہم دن کا کام ختم کر کے دماغی عیاشی چاہتے ہیں اور کچھ تو سینما میں بے جان تصویروں ہی سے دل بہلاتے ہیں۔ ایسے ہی جب خدا فرشتوں کی صحبت اور ان کی یک رنگ پارسائی سے تنگ آگیا تو اس نے دنیا کا اسٹیج بنا دیا۔ جہاں اس کی اداکاری میں ہر روز نت نئی تمثیلیں ہوتی ہیں اور کردار اس کی ہدایت سے کٹھ پتلیوں کی طرح ناچا کرتے ہیں"

"تو یہ تو کیا خدا نے بھی یہ سب کچھ محض تماشا یا تفریح کے طور پر پیدا کیا ہے ؟"

"ہاں اس میں شک ہی کیا"

"تم تو مذہب سے بلکل دور ہو گئے، سنا ہے اب تم نماز بھی نہیں پڑھتے"

"نماز کیوں پڑھوں ـــــ یہ تو اسی وقت ممکن تھا جب آپ نے میری نارسائی کا خیال کیا ہوتا۔ اب جب کہ آپ اپنے ہونٹوں کی عفت جسم کی عصمت کھو چکیں یا رسائی کا مطالبہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا اور ایسی نماز بھی کس کام کی کہ پڑھی جائے واسطے اللہ کے لیکن دماغ میں تصور رہو اس کے ایک بندے کا اس سے تو یہ اچھا کہ کبھی رات کے بیکراں سناٹے میں جب دوری کا خیال ستائے تو بیساختہ خدا یاد آ جائے۔

"اچھا میں ذرا نماز پڑھ لوں"

"کوئی دعا میرے لیے بھی"

"یہ دعا کروں کہ اے خدا اک دیوانے کو عقل سلیم دے"

"آپ دور چلی گئیں جیسے دعائیں افق کے پار جاتی ہیں اب کوئی عقل سلیم لے کر ریگزاروں میں خاک اڑاتا پھرے تو کیا"

"میں دہلی جا رہا ہوں، بتلایئے آپ کے لیے کیا لاؤں ؟"

"میں نے پہلے کبھی بتایا تھا"

"نہیں تو"

"پھر اب کیوں بتاؤں ؟"

"اس لیے کہ جب چند تحفے آپ کی نذر کروں تو آپ ان کو واپس نہ کر سکیں۔ مانا کہ اس سے قبل آپ ایک بار ایسا ہدیہ قبول کر چکی ہیں لیکن آپ کا برتاؤ تو ڈھنگ سے متا ہے۔ اس کی طرح کبھی تیز رنگ اختیار کرتا ہے کبھی خود بخود پھیکا پڑ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ تکیہ کے غلاف میں اپنے گیسوئے شکناب کی نکہت بسا دیتی ہیں۔ لیکن دوسری دفعہ اس کو بے رخی سے پھینک دیتی ہیں۔ اس خیال سے کہ کہیں اس پر اس جگہ بوسے تو نہیں ثبت کیے جاتے جہاں زلفوں کی ڈالیوں میں چھپے ہوئے گلاب سے رخساروں نے سہارا لیا تھا ـــــ ہاں تو پھر اپنی پسند سے کچھ لیتا آؤں"

"تم جاؤ تو لیکن لانے کی ایسی ضرورت ہی کیا ؟"

"جی نہیں چاہتا کہ آپ کا شباب سولہ سنگار نہ کرے"

"لیکن میں تمہارے تحفوں کی تو بھوکی تو نہیں ہوں"

"غریب کی نذر کا کوئی بھوکا تو نہیں ہوتا ــــ اور خصوصاً
اس حال میں جب لکشمی دیوی گھر میں خود براجمان ہوں"

"اور کام دیوی بھی"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے ایک فردوس بنالی ہے
"شاید ــ بشرطیکہ اس میں ایک شیطان کا گذر نہ ہو پائے
"شیطان کو تو اب دنیا میں بہت سے کام کرنے ہیں ــ
آنکھوں کی گلابی سے عمر بھر جو لوگ شرابی رہتے ہیں ان کو اس
نشۂ محبت سے جگانا ہے تاکہ ملک کے لیے مفید ہوں"

"مقصد نیک ہے خدا کامیاب کرے"

"کیا مجھے جگانے آئے تھے ــ میں تو بہت دیر سے جاگ
رہی ہوں ــــ تم تو ایسے آئے جیسے کوئی چور رات کو باہر
نہ نکل سکے اور پکڑے جانے کے خوف سے صبح ہوتے ہی سامنے
آجائے اور اپنی خاموشی سے کچھ اظہار کرے تاکہ آپ جو سزا
تجویز کریں، میں حاضر ہوں۔"

"جی ہاں اب حاضر ہوں جو سزا آپ تجویز کریں"

"سزا ــــ اچھا آئندہ سے اب یہ باتیں نہ ہوں گی۔
اس وقت تو ہم اس لیے آزاد ہیں کہ وہ دورے پر گئے ہوئے ہیں
اور ان کی ماں اپنی بیٹی کے یہاں، سو ہم اتنا کلام کر رہے ہیں۔
ورنہ تم نے تو کوئی کسر اپنی محبت کو رسوائے عالم کرنے میں اٹھا
نہ رکھی ــ محبت محبت اس لفظ کو سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے
یہ تو بیکاروں کا شغل ہے تم کیوں اپنے وقت کو اس بے سرے
راگ میں رائیگاں کرو۔ اچھا اب بیکار باتیں بنا نا ترک۔"

"لیکن محبت ہی کا جذبہ جد و جہد کی تحریک کرتا ہے"

"ٹھیک ہے لیکن جب محبت کا صلہ نہ مل جائے تو اس کی
طرف راغب ہی نہ ہونا چاہیے"۔

"رغبت اور چاہت کا سوال اپنے بس کی بات نہیں"

"لیکن ایک جوان مرد کو اتنا بے بس و لاچار نہیں ہونا چاہیے"

"ابھرنے کی برابر کوشش کر رہا ہوں لیکن ایک کرتے ہوئے
سر کو حسین بازوؤں کا سہارا مل جاتا تو شاید اس کو کوشش میں
کامیابی کی زیادہ توقع ہوتی"

"تم نے وقت کی قدر نہ جانی"

"وقت کی قدر ــــ یہ لیجیے اس کا اظہار، یہ بندے نذر
کو لایا ہوں، یہ آپ کے چمپی رخساروں کو چوما کریں گے"

"وہ نہیں ہیں تب ہی تم کو یہ کہنے کا موقعہ مل گیا ـــــ
لاؤ رکھ لیتی ہوں لیکن ایک شرط پر کہ اب تم ایسی باتیں نہیں کروگے"

"کیسی باتیں ؟"

"یہی پیار و محبت کی باتیں ــــ یہ ہم غیروں سے سننا
نہیں چاہتے اور نہ نذریں قبول کرنے کا حق رکھتے ہیں ـــــ
ہم تمہارے لیے ایک ہی سزا تجویز کرتے ہیں کہ آئندہ تم ہم سے
ملنے بھی نہ آیا کرنا"

"اجازت"

"اچھا ــــ ارے یہ تم ہاتھ جوڑے کیوں کھڑے ہو کیا
ہمارا کوئی قصور کیا ہے تم نے"

"جی ہاں ــــ جب سے آپ مسلمان ہوئی ہیں۔ میں
ہندو ہو گیا ہوں"

"کیا کسی ہندی لڑکی کو پسند کر لیا ہے ــــ تو یہ بت کا یہی
ایک نادر تصور تو تمہارے جدت پسند دماغ میں سما گیا ہے"

"اب اسی تصویر کی تشکیل کرنے جا رہا ہوں"

"میں شریمان جی کو آشیرباد دیتی ہوں"

"شریمتی جی نمستے!!"

اختر انصاری (اکبرآبادی)

ایثار

شام کا سنہرا وقت تھا اور شاہ مشرق آہستہ آہستہ دامن افق میں چھپا جا رہا تھا۔ اس وقت آسمان ایک نئی دلہن کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس لیے کہ اس کے رخسار شرم کے مارے سرخ ہو رہے تھے۔ سورج کی آخری اور زرد زرد کرنیں شہر کے گنبدوں اور بڑے بڑے میناروں پر رقص کر رہی تھیں ـــ کچھ ہی دیر بعد یہ نظر فریب سماں نظروں سے اوجھل ہو گیا ـ سورج ڈوب چکا تھا۔

آج تمام لوگ خوشی کے گیت گا رہے تھے۔ کیونکہ کپل وستو کے یوراج ایک مدت بعد وارد شہر ہوئے تھے۔ رعایا نے نہایت مسرت و شادمانی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا ـــ شام کی دھندلکی چہار سو پھیل چکی تھی۔ اتنے میں ایک ستارہ کانپتا ہوا آسمان پر نمودار ہوا ـــ یہ رات کا پیش خیمہ تھا۔ ہوا خاموش تھی اور ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ چند مزدور اور کسان نہایت تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔

رات نے اپنے پر شہر پر پھیلا دیے تھے۔ ہوا زوروں سے چل رہی تھی۔ ایسے وقت میں ایک سایہ نہایت آہستہ آہستہ شاہی محل کے ایک وسیع ہال میں متحرک نظر آیا۔ یہ گوتم بدھ تھے۔

وہ اس وقت خیالات کے بحر ناپیدا کنار میں غوطے لگا رہے تھے ـ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئے ـ نہ معلوم اس وقت وہ کس سوچ میں تھے کہ ان کا سلسلہ خیال کسی کے پاؤں کی آہٹ پاتے ہی ٹوٹ گیا ـ ان کی زوجہ گوپی آ رہی تھیں ـ

بہت دیر تک اپنے سوامی کا انتظار کر کے بعد وہ خود انکی تلاش میں ادھر نکل آئیں ـ آخر کار انکی متجسس نگاہوں نے اپنے سوامی کو ڈھونڈھ لیا ـ وہ بے قرار ہو کر ان کی طرف دوڑیں۔ لیکن گوتم کا پریشان چہرہ دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئیں گوپا کا پھول سا چہرہ زرد پڑ گیا گوتم کی اس حالت کو دیکھ کر گوپا کی آنکھیں نمناک ہو گئیں ـ اور نہایت بے قراری کے عالم میں دریافت کیا ناتھ! ـــ یہ کیا آج آپ اس قدر اداس کیوں ہیں؟ ـــ اور آپ کا یہ لباس! آخر ناتھ! یہ سب کیا ہے بتلایئے ـــ اپنا سلسلہ خیال ٹوٹنے کی وجہ سے وہ بہت بے چین ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی یاس آلود نگاہیں گوپا کے چہرے پر گاڑ دیں گوپا نے بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ـــ گوتم کی آنکھوں سے آنسو کے دو بڑے قطرے ڈھلک کر ان کے رخسار پر آ گئے۔ شاید یہ وداعی آنسو تھے ـ تب انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ہاں ـــ گوپا! ـــ تم نہیں سمجھ سکتیں ـ میرے دل کی حالت کو ـــ میں دیکھ رہا ہوں ـــ ہاں مجھے وہ بخوبی دکھائی دے رہی ہیں ـــ " "لیکن کیا؟" وہ تمام چیزیں جو اس دنیا میں دیکھی جاتی

انعامی اسکیم

ہم بڑی خوشی کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہماری انعامی اسکیم کے سلسلہ میں ذیل کے حضرات انعام کے مستحق قرار پائے۔

پہلا انعام ـ فارسی نثر ساتویں صدی ہجری میں ـ جناب سردار علی صاحب

دوسرا انعام ـ آبشار شعلہ (نظم) محترمہ مس انوار اللہ

تیسرا انعام ـ دھوبن ـ (افسانہ) جناب ام ـ اسلم صاحب

چوتھا انعام ـ بیوہ اور برسات (نظم) جناب ثاقب صاحب کانپوری

دوسرے انعام

(۱) سماج کا شکار (افسانہ) جناب محمد مہدی صاحب ـ (۲) ہندستان ہمارا (نظمیں) محترمہ وحیدہ خاتون صاحبہ نسیم (۳) حسین پنہاری (نظم) جناب ثاقب صاحب مٹھاوی (۴) مسافر (نظم) جناب راز ہاشمی صاحب (۵) رنگین نظارے (نظم) جناب شوق ہاشمی صاحب

یہ جملہ انعامات آئندہ مہینے کی ۱۵ تاریخ تک متعلقہ حضرات کی خدمت میں روانہ کر دیے جائیں گے ـ

ہیں — میرا جسم کانپنے لگتا ہے — میری روح بیقرار ہو جاتی ہے۔ جب — جب میں ان بھیانک واقعات کو یاد کرتا ہوں — جب وہ خوفناک مناظر میری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ آہ! ہر جا مصیبت — ہر طرف بے چینی — موت! — اف انسان کتنا مجبور ہے — ہم ابتک تاریکی میں ہیں — ہم ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے — آخر ایسا کیوں ہوتا ہے — آہ! — ایک اندھا اس دلفریب دنیا میں رہتے ہوے بھی اس کی دلفریبیوں سے محروم ہے — دنیا! — مصیبتوں اور کلفتوں سے پر دنیا! — ،، یہ الفاظ نہایت رنج کی حالت میں شہزادے کی زبان سے نکل رہے تھے —

گوتم نے دنیا میں تکالیف و مصیبتوں کو دیکھا اور دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ لوگوں کو کسی نہ کسی طرح سے نجات دلانا چاہیے اس لیے انہوں نے سچائی اور نیک نیتی کا سبق دینا شروع کیا وہ چاہتے تھے کہ "نروانا" حاصل کرلے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے تخت و تاج کو بھی چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں — نہ ہی ان کی بیوی آڑے آسکتی تھی — اور نہ ہی ان کا بچہ — اس وقت ایک سچے رہبر کی ضرورت تھی — دولت ثروت شاہی شان و شوکت بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر حصول مقصد کی خاطر مصیبتوں کا سامنا کرنے پر تیار ہوگئے — گوپا! میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ غریب دنیا طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار رہے اور ہم اس طرح بستر راحت پر کروٹیں بدلیں — افسوس! — گوپا! دنیا ایک سایہ ہے اور ہماری زندگی ایک خواب — لیکن لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں — وہ نہیں جانتے کہ اس چار دن کی زندگی میں کیا کریں — شانتی کیسے حاصل کریں — گوپا! — میں ان کے لیے ایک راستہ ڈھونڈنا چاہتا ہوں —

گوپا پھر خواب گاہ میں گئی اور شوہر کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرنے بیٹھ گئی — کچھ ہی دیر بعد ان کی آنکھ جھپک گئی — اور گوتم جو ابتک موقع کے انتظار میں تھے اٹھے — اور ۴ اور باہر نکل گئے۔ اپنے وفادار نوکر چنا کو جگایا اور ایک رتھ تیار کرنے کا حکم دیا — گوتم نے آخری بار ایک حسرت آمیز نگاہ اپنی محبت کی دیوی اور لخت جگر پر ڈالی اور روانہ ہوگئے۔

گوتم اب شہر سے دور — بہت دور تھے۔ انہوں نے اپنا شاہی لباس اتار کر چنا کو دیدیا اور خود معمولی لباس میں لیا۔ چنا کو حکم دیا گیا کہ وہ واپس چلا جاے — چنا حسب حکم رتھ اور شہزادہ کا سندیسہ لے کر شہر واپس ہوا۔

یہ گوتم کا ایثار تھا — زبردست ایثار —

سورج کی مدھم سرخ کرنیں آہستہ آہستہ پہاڑ کی چوٹی — گنبدوں اور میناروں پر پھیلنے لگیں۔ اور — ایک اور مرتبہ تاریک راستے روشن ہوگئے — (آزاد ترجمہ)

سجے۔ آر۔ ویسائی

فلسفۂ محبت

(شیلی سے ترجمہ)

نالے چاندیوں میں ملیں اور ندیاں سمندر جائیں
اور ہوائیں باہم مل کر میٹھے نغمے گائیں
کوئی نہیں دنیا میں اکیلا، مل جل کر کرتے ہیں بسیرا
پیت کے مارے بس اک ہم ہیں، ٹھکرے جو تا سکھ بہایا
اونچے پربت چومیں فلک کو، موجیں لپٹی جائیں
پھول ہوا کے جھونکے کھا کر، ہونٹ سے ہونٹ ملائیں
سورج کی آغوش میں دنیا، چاندنی چومے موج کا سینہ
پر یہ بوسے کس مصرف کے، ہم جو نہ بوسے پائیں

سید خیرات علی زیدی

فلسفۂ محبت

(شیلی سے ترجمہ)

ناگے ندیوں میں ملتے ہیں اور ندیاں سمندر میں! آسمان ہوائیں لطیف ترنم کے ساتھ بغلگیر ہوتی ہیں۔ دنیا کی کوئی شئے تنہا نہیں کائنات کی تمام اشیا قانونِ قدرت کے تحت ہم آغوش ہوتی ہیں۔ تو پھر تیری زلفیں میرے بازوؤں پر کیوں پریشان نہ ہوں؟۔

دیکھو! پہاڑ آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور موجیں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ نرگس نے گلاب کو نہ دیکھا تو اس کا جرم کبھی معاف نہ ہوگا۔

سورج کی روشنی زمین بوس ہے اور چاند کی کرنیں سمندر کے بوسے لے رہی ہیں۔

کیا محبت کی یہ داستاں کوئی قیمت رکھتی ہیں اگر تو مجھے پیار نہ کرے۔!

محمد نیر الدین

غزل

جام مجھے پلائے جا نرگسِ نیم باز سے
مست مجھے بنائے جا اپنی نگاہ ناز سے

نغمہ میں تیرے سوزِ جاں نغمہ میں تیرے ساز دل
ساری فضا پہ چھائے جا نغمہ جاں نواز سے

عشق ہے حسن زندگی عشق ہے حسن کائنات
عشق کے عکدہ میں آ پردہ سرِ ناز سے

تیری ہنسی سے کھل گئی صحنِ چمن کی ہر کلی
سبزہ میں جان آگئی تیرے خرامِ ناز سے

میری رگوں میں گردواں اپنا ہی درد زندگی
آگ جگر میں پھونک دے اپنے ہی سوز و ساز سے

حسن حقیقت آشنا اپنی نگاہ کی قسم
جلوہ مجھے دکھائے جا بارگہ مجاز سے

یزدئ خستہ کی طرح کون و مکاں ہیں منتظر
دہر پہ آشکار ہو پردۂ سرائے راز سے

معین الدین یزدی۔ بی اے
(عثمانیہ)

رازِ حیات

ذروں کو وقفِ سوزِ دروں پا رہا ہوں میں
شرمندۂ حیات ہوا جا رہا ہوں میں

پھر التجائے ضبط کو ٹھکرا رہا ہوں میں
اپنی نظر سے آپ گرا جا رہا ہوں میں

خود ان سے اپنی داد نظر پا رہا ہوں میں
کس کا نصیب آج بنا جا رہا ہوں میں

سرمایۂ حیات کو اس در پہ ہار کر
اے بیخودی شوق کہاں جا رہا ہوں میں!

یہ رات، اور یہ پرسشِ احوال ہچکیاں
کس جانِ بیقرار کو یاد آ رہا ہوں میں

آئینہ خیال کا منظر نہ پوچھیے
شرما رہے ہیں وہ کبھی شرما رہا ہوں میں

کاٹے ہے راز میں نے بھی مغرور زندگی
برسوں خود اپنے ناز اٹھاتا رہا ہوں میں

راز ہاشمی
(امروہوی)

تصویر کھینچنے کی کوشش کروں ـــــ

"اتنی حسین نہیں ہے۔ فلم ضائع ہو جائیگی" محسن نے جواب دیا

"آپ کا خیال ہے" میں نے کہا "یہ دیکھو مستانہ چال، سرو قد رسیلی اور مدھ بھری آنکھیں، زلفیں جیسی بھیگی ہوئی شب کی سیاہی اس کا ٹھمک ٹھمک کر چلنا مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ جو اپنی طرف کھینچے ہی لے جاتا ہے"

اچھا! ٹھیرو! پھر ایک بار دیکھوں

یہ کہہ کر محسن ٹھیرا۔ اور اپنی عقاب نگاہوں سے دیکھنے لگا "وہ بت طناز" سراپا ناز پھر آئی۔ اور نگاہوں کے دو تیر مار کر سے آنچل کو جھٹکا دیکر آگے نکل گئی۔ میری آنکھیں اس سے دو چار ہوئیں۔ زمین و آسمان کے درمیان ایک خلا سا پیدا ہوا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ تیر تاثیر محبت کا خطا نہیں ہوا۔

بے وفا نہیں بننا چاہیے ـــ

ایک راہگیر دوسرے سے کہتا تھا

"یہ فدائے ماتعنی ہے" ـــ

کہہ کر محسن بولا۔ ہمیں بھی بے وفا نہیں بننا چاہیے اور وہ ابھی اس کی تصویر کھینچنے کے قابل ہے۔ تاکہ میں یا آپ اس کو اپنے سینے پر چھاپا کر لیں۔

تو پھر دیر کاہے کی۔ کیمرہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کھینچ لو تصویر۔

"نہیں یہ زیادہ تمہارے ہی طرف دیکھتی ہے۔ اس لیے زیادہ تر آپ ہی مستحق ہیں۔ کہتے ہوئے محسن نے کیمرہ میرے سپرد کیا۔

یاس میں آس

ہم حیدر پورہ سے واپس آرہے تھے۔ جو سرینگر سے کوئی چار میل کی فاصلہ پر واقع ہے۔ وہاں ایک چھوٹا سا باغ ہے جو یاسمین کے پھولوں کے لیے مشہور ہے۔ اتوار کا دن تھا اس لیے میں ابھی گھر ہی میں بیٹھا مطالعہ میں محو تھا۔ کہ مسٹر محسن بھی آئے۔ چونکہ میں ان کی آمد سے بخوبی واقف تھا۔ کہ جب کبھی آتے ہیں سیر و تفریح کے لیے پروگرام سوچکر آتے ہیں۔ اس لیے میں نے پوچھا کہیے صاحب! کہاں کی تیاری ہے؟

"آج بٹہ مالو کا عرس ہے۔ اس نے جلدی سے جواب دیا

"وہ تو کل تھا"۔ میں نے کہا۔

"نہیں! کل مردوں کے لیے جانے کا دن تھا۔ اور آج صنف جمیل کی باری ہے"

ـــ اس نے آنکھیں مٹکا کر جواب دیا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا" حیدر پورہ وہاں سے نزدیک ہے۔ آجکل وہاں خوب رونق ہوگی۔ اس لیے وہاں بھی جائینگے"

مجھے بھی کونسے دربار میں شرکت کرنی تھی۔ اس لیے اٹھا اور کیمرہ اس کے ہاتھ میں دیکر ـــ لگے دونوں چلنے

فلم نئی روشنی ـ چونکہ گذشتہ شب کو ہی ملاحظہ کی تھی۔ اس لیے اس کا خمار آنکھوں میں موجود تھا۔ خراماں خراماں

چل کر ہم حیدر پورہ پہنچے۔

یاسمین کے شگفتہ پھولوں کا دلآویز نظارہ پورے جوبن پر تھا۔ بھینی بھینی خوشبو سے دماغ وجد میں آتا تھا۔ فضاؤں میں مستی چھا رہی تھی۔ کیسا پر کیف عالم تھا۔ آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہو کر۔ بے ساختہ زبان سے کسی کا یہ شعر ادا ہوا کہ

ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

الغرض! مختصر قیام اور گلگشت کرنے کے بعد ہم بٹہ مالو کی راہ سے لوٹے ہم دونوں کے ہاتھوں میں یاسمین پھولوں کے دو حسین اور جاذب نظر گلدستہ تھے۔ اور مناظر قدرت کا لطف اٹھاتے اٹھاتے ـــ چلتے جاتے تھے۔ ایک جگہ کسان ہل چلا رہے تھے اور سریلے، موثر راگ الاپ کر۔ فضاؤں میں عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ جو بھی راہگیر اس طرف چلتا۔ تو سینہ تھام کے بجد تر

ان ہی کی تان میں تان اڑا کر۔ اپنے آپ کو بھول جاتا تھا۔

یکایک آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں۔ بادل گرجنے لگے بارش کے ایک دو قطرے ہمارے چہروں پر گرے۔ اور ہم بادل ناخواستہ اٹھکر قدموں کی رفتار تیز کرنے لگے۔

دونوں یار باشی ہیں"۔ سامنے سے آنے والی ایک بوڑھی عورت دوسری بوڑھی کو کہنے لگی" ہیں! اندر سے خود جل رہے ہیں۔ باہر سے اوروں کو جلا رہے ہیں۔" دوسری بوڑھی عورت ہمارے گلدستوں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"قسم خدا کی۔ برابر لاکھ روپے کی بات کہی" محسن نے اچھل کر کہا" ہوامینڈ کی کوز کا محبت" میں گویا ہوا۔

میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور ہم آگے بڑھتے گئے۔ بٹہ مالو قریب آیا۔ بادل چھٹ کر۔ آکاش صاف ہو گیا تھا۔ اور شاہ خاور۔ اپنے روئے منور سے ہر چیز کو منور کئے جا رہا تھا۔

بٹہ مالو کے احاطہ میں قدم رکھتے ہی دیکھا۔ کہ ہر طرف تتریاں ہی تتریاں تھیں چنچل، شوخ، محسن کے حواس اڑ گئے اور کہنے لگا

ہر شئے پہ پڑتی ہیں ظالم کی نگاہیں
کمسن ہیں کہ تلوار سنبھالی نہیں جاتی

وہ بے قابو ہونے لگا۔ لیکن میں نے ناصحانہ انداز میں کہا

ذرا ہوشیار رہنا یہ دغا کا کارخانہ ہے

"نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی" کا نعرہ لگا کر وہ گویا ہوا کہ "دیکھو تو کس طرح یہ مشق ستم ناز کر رہی ہیں۔

جب اس کے اطوار اوٹ پٹانگی ہونے لگے۔ تو تیر درویش بر جان درویش کے مطابق میں نے اپنی خواہشات کو قتل کر دیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر۔ اسے اس رنگین جھرمٹ سے باہر گھسیٹ لایا وہ چلاتا رہا۔ رحم! رحم۔ لیکن میں نے ایک نہ چلنے دی۔ تو حواس بجا ہوئے۔ اور دونوں چلنے لگے۔

ابھی تحصیل گراونڈ کے قریب ہی پہنچے تھے۔ کہ ایک مختصر سا قافلہ چلا جا رہا تھا۔ جس کی کمانڈ۔ ایک طوفانی ناوک فگن کر رہی تھی جو کہ خس و خاشاک پر بجلیاں گراتی۔ اور کشت و خون کرتی ہوئی۔ پیش قدمی کرتی جا رہی تھی۔ کہ ہم سے سامنا ہوا۔ لیکن اس "تندخو" نے مدمقابل مجھے ہی جانکر۔ وار کرنے شروع کیے۔

بخشا بخشی کے بعد جب محسن نے اصرار کیا۔ کہ آپ زیادہ مستحق ہیں۔ اس لیے آپ ہی تصویر کھینچ لیں" میں نے کیمرہ ہاتھ میں لیکر مناسب وقت پر تصویر کھینچنے کا ارادہ کر لیا۔ چونکہ فلم "نئی روشنی" کی یاد تازہ تھی۔ اس لیے میں بھی اسی حالت میں تصویر کھینچنی چاہتا تھا جس صورت میں فلم مذکورہ میں ہیروئن نے شوہر سے انتقام لینے کی غرض سے اپنے گویے استاد کی لی تھی۔ لیکن موقع نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ہر چند سعی کی۔ کہ یہ ہنسکر میری طرف دیکھے۔ مگر یہ سراپا ناز" خوب جھک دیکر۔ ہمارے خون کی روانی تیز کر رہی تھی اسی حالت میں ہم سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے کہ آگے دوراہا آیا۔ وہ پل پار کر گئی۔ ہمیں اگرچہ اس طرف جانا ناگوار گذر رہا تھا۔ لیکن نہ معلوم کونسی کشش تھی۔ جو ہمیں کھینچے ہی لے جا رہی تھی۔

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

یہ حسینہ ہمیں تڑپانے کی غرض سے لا ابالیانہ انداز میں رخ رخشاں کی جھلک دکھا رہی تھی۔ اور مسکرانے بہانے میں ترچھی نگاہوں سے برچھیاں مار رہی تھی۔ کوئی دو میل چلنے کے بعد۔ اس قافلے کی معمر عورت اپنے ایک شناسائی سے ملاقاتی ہوئی۔ اور باتیں کرنے کے لیے ٹھہری۔ سارا قافلہ ٹھہر گیا خوش قسمتی سے سامنے سے ایک مدرس صاحب آ رہے تھے۔ جو کہ محسن کے واقف تھے بس پھر کیا تھا۔ پانچوں گھی میں تھیں محسن نے اس سے خواہ مخواہ کی باتوں میں لگایا۔ اور سڑک پر ٹھہرنے کا اچھا خاصا بہانہ بنایا۔ میں بھی کیمرے کا منہ اس ناظورہ دلفریب کی طرف کر کے موقعے کی تاک میں رہا۔ لیکن یہ "شوخ تندخو" حد سے زیادہ چالاک

تھی۔ اس نے پشت میری جانب کر لیا۔ اور کبھی کبھی چور نگاہوں سے کچھ اس انداز سے دیکھتی کہ تصویر کھینچنے کا مدعا عنقا ہو جاتا تھا۔ راہگیر چلتے تھے۔ اور ہماری طرف دیکھ کر۔ آہ! سرد لیتے تھے۔ گویا ہم نے میدان مار لیا تھا۔ اور وہ محروم تھے۔ ادھر محسن کی جسارت قابل داد تھی۔ جس نے خواہ مخواہ ایک چلتے آدمی کو اناپ شناپ اور لایعنی باتوں میں الجھا کر۔ سڑک پر ٹھیرنے کا انتظام کیا تھا۔ کہ اتنے میں۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔

اور رنگین قافلہ مدھم رفتار میں چلنے لگا۔ صبا مستانہ وار چل رہی تھی۔ سالار قافلہ صنف جمیل "جس کی زلف گرہ گیر کے اسیر اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ اٹھکیلیاں کرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اسی تگ و دو میں ہم ذرا آگے نکل گئے۔ اس امید پر کہ کسی مناسب جگہ پر ٹھیر کر۔ اپنے مقصد کی تکمیل کریں گے۔

لیکن ہوا کیا؟

چند قدم آگے نکلکر۔ مڑ کر دیکھا۔ کہ سارا قافلہ ایک تنگ و تاریک گلی میں سے جا رہا تھا۔ اور ہماری ہیروئن مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی رسیلی آنکھیں شاید پیغام دے رہی تھیں۔ کہ

اے دیس والو مجھکو ہرگز نہ بھول جانا۔ یا یہ کہ۔

کہ کوئے جاناں اس طرف کو ہے۔

موقعہ بالکل نازک تھا۔ میں نے مڑ کر کیمرہ محسن کو دیدیا۔ محبت اندھی ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بہرے کی طرح اس کا تعاقب کرتے ہوئے چل دیا۔ اور میں نے تقلید کی۔ گلی میں مختلف راہیں تھیں۔ اور میں نے کسی کو نہ دیکھا۔ اتفاق سے ایک راہ کی طرف گذرا۔ تو دیکھا۔ کہ وہ "مدھ مستانی" اپنے مکان کے اندر داخل ہو چکی ہے۔ اور قافلہ منتشر ہو کر نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ مسرت کی ایک لہر اس پر دوڑ گئی۔ نگاہوں میں پیام چلے۔ کہ پھر ملیں گے۔

میں سڑک پر واپس آیا۔ تو مسٹر محسن کو حاضر پایا۔ وہ مرجھائی ہوئی آواز میں بولا۔ یار! یاس!!

میں نے جواب دیا۔ نہیں یاس میں آس۔

وہ کیسے؟۔ اس نے پوچھا۔

ایسے کہ اگرچہ تصویر کھینچنے میں ناکامی ہوئی۔ لیکن کم از کم اس کا مسکن بھی تو میں نے دیکھ لیا۔ جب چاہیں۔ درجنوں تصاویر کھینچ لیں گے۔ اور اگر نصیب چمکا۔ تو راز و نیاز بھی ہو گا۔

یہ بات ہے کہ کر محسن اچھل پڑا

یہ جذبات ابھی اگرچہ ہمارے دلوں میں موجود تھے کہ لیکن دیکھیے کہ قسمت کیا یاوری کرے۔ جب اس طرف جانے کی فرصت ملے گی۔

عزیز کاشمیری

غزل

عشق کی دشواریوں سے یوں گذرتے جایئے
ایک موج تہ نشیں بن کر ابھرتے جایئے

ہو کے مخمور تمنا، عشق کی مستی میں چور
حسن کے رنگین نظاروں سے گذرتے جایئے

دل سے اٹھتا ہو دھواں اور کروٹیں لیتا ہو شوق
اس طرح ہی ایک عالم سے گذرتے جایئے

عشق کی منزل سے آگے، ہوش کی منزل سے دور
ہو کے مست بیخودی خود سے گذرتے جایئے

یاد سب کرتے رہیں اہل جفا اہل وفا
زندگی میں کام کچھ ایسے بھی کرتے جایئے

اے خوشا ذوق تمنا شوق پیہم اضطراب
مست و بے پروا زمانے سے گذرتے جایئے

کچھ نہ ہو جس میں سحر ان کی محبت کے سوا
دل کی دنیا اسطرح آباد کرتے جایئے

سحر مرادآبادی

غزل

میری مصیبتوں پر ہرگز نہ دل دکھانا
اشکوں کی تم کو سوگند اکبار مسکرانا

مجھ سے نظر ملا کے اب تم نہ رُخ پھرانا
بے درد ہے یہ دنیا گستاخ ہے زمانا

کیوں برق آسا نظریں معصوم ہوں تمہاری
اے خرمن تجلی حاضر ہے آشیانا

سنتی وہی جوانی دکھ درد کی کہانی
میں اپنے آنسوؤں سے کہتا رہا فسانا

کلیاں چٹک رہی ہیں بھونرے دائیروں میں
اکبار مسکرا کر پھر یونہی گھوم جانا

ہے خودکشی کا منظر غمگین ہیں وہ بھی
دہرا گیا ہے شاید کوئی مرا فسانا

غمگیں کہانیوں کو دہرا رہا ہے تسکیں
اے حاصل محبت پلکوں سے گر نہ جانا

قمر تسکین (لاہور)

غزل

عشق ہے نام غم اٹھانے کا
یاس عنواں ہے اس فسانے کا

ہیں کہ پابند وضع فطرت ہوں
شوق ہے ان کو آزمانے کا

ہائے عہد شباب کا عالم!
ہے یہ موسم فریب کھانے کا

برق بے تاب، روشنی ظاہر
ہائے انداز مسکرانے کا

دے کے دل پھر بھی شرمسار ہوں میں
یہ خلاصہ ہے اس فسانے کا

شاید ان کو بھی ہے عظیم ملال
شیشہ دل کے ٹوٹ جانے کا

عظیم حیدرآبادی (عثمانیہ)

پیام حیات

زعم خودی مٹا کے تو حاصل انتخاب بن
تجھ سے جو ہو سکے اگر ذرہ سے آفتاب بن

کبر انانیت نہ کر چشم عبودیت سے دیکھ
اپنی نظر کے سامنے آئینہ رکھ جواب بن

خودکشی

برہنہ ماہتاب پانی کی نیلی سطح پر عکس ریز۔
درختوں پر بسیرا کرتے ہوئے پرندوں کا شور۔
بڑھتی ہوئی تاریکی ——— ٹوٹتا ہوا سکوت۔
لب پرواز روح ———
اور درخت کی پیڑ سے ہوتے ہوئے لٹکتا ہوا ایک سر

ایک تصور، ایک خواب، ڈراونا اور وحشتناک!
ایک جھونپڑی! ——— جس میں دیے کی روشنی تک نہیں
ایک نیم برہنہ عورت! ——— اپنی بے دودھ چھاتیاں بچے کے
منہ میں دیے ہوئے۔
تین بچے اپنے پھٹے ہوئے نیلے دامن کو چباتے ہوئے
بھوک اور انتظار ——— انتظار اور بھوک
"تجو! آج کی مزدوری!" ایک التجا
"آج نہیں مزدوری نہیں ملی گی" ایک سادہ اور مختصر جواب
سکوت! سکوت!! سکوت!!!
"تجو! آخر غریب کا کھوٗر ——— ؟" انسان نما مخلوق کی شرکت
ڈراونی آنکھیں اور ملک الموت کا خونی چہرہ ——— اس کا جواب

"آہ مرا" پانی میں گرتے ہوئے ایک نیم برہنہ جسم کی صدا
ایک تصور، ایک اچانک خیال، ایک چھلاوہ۔
بھوک سے دم توڑتے ہوئے بچے اور دھاڑیں مار کر روتی ہوئی
مامتا۔
مرگئی! مرگئی!! ——— آخر وہ بھی مرگئی!!!
ایک جھونپڑی! ——— پانچ برہنہ لاشوں کا مدفن

قہقہہ! ——— فلک بوس قہقہہ! روپیوں کی جھنکار میں
تیز تیز قدم طوائف کے کوٹھے کی جانب اٹھتے ہوئے۔
شراب اور بازاری حسن۔
کشیدہ شراب اور کشیدہ حسن۔
اور پھر ایک قہقہہ ——— شراب کی مستی اور حسن کے نشہ میں
ایک محل ——— حسن کا لافانی بازار
ایک جھونپڑی ——— پانچ برہنہ لاشوں کا مدفن
دھم شرر ر ——— ر ر ———

لرزاں سطح آب پر لرزاں ماہتاب
پھڑپھڑاتے ہوئے پروں کی آواز!
بڑھتی ہوئی تاریکی! ——— ٹوٹتا ہوا سکوت!
اکیلا درخت پانی میں جھانکتا ہوا!
ارے کیا ہوا؟ ——— کچھ بھی نہیں ——— ہاں کچھ بھی تو نہیں ہوا

سید نعیم الدین احمد (عثمانیہ)

زندگی

زندگی نام ہے تخریبی و تعمیری قوتوں کے توازن کا — جو انسان کے جسم میں کارفرما رہتی ہیں۔ ایک فلسفی کا خیال ہے زندگی محض ایک اتفاق ہے لیکن ان کے لیے جو دنیا میں کچھ کرنا چاہتے ہیں ایک مشن — زندگی جب ایک حادثہ و اتفاق ہی ٹھیری تو پھر خالق نے بنانے کی زحمت ہی کیوں گوارا کی — جب حیات کے آخری مقصد تباہی و بربادی ہے تو پھر مقصد زندگی کیا ہے۔

زندگی کے مقصد کو معلوم کرنے میں جب ہم ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ زندگی ہے کیا — ایک نہ ختم ہونیوالا قہقہوں کا سلسلہ، محبت، ناکامی، غم، خوشی، غربت، افلاس اور کیا نہیں!

جہاں تک ذاتی رجحانات و نفسیات کا تعلق ہے دنیا میں دو گروہ ہیں — ایک رجعت پسند اور دوسرا قنوطیت پسند! ایک کہتا ہے کہ کشمکش، جد و جہد ہی زندگی کا دوسرا نام ہے اور جہاں کامیابی ہے وہاں ناکامی کا ہونا لازمی ہے لیکن ایک دوسرا گروہ بھی ہے جس کے لیے زندگی محض ایک سراب و خواب ہے — ایک ایسا خواب جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا اور دنیا ایک ایسی جگہ ہے جہاں خدا آدم کی اولاد کو آدم کے گناہوں کا خمیازہ بھگتنے کے لیے بھیجتا ہے۔

خیالات تو دوسری چیز ہیں غور کیجیے کہ اس زندگی میں عملاً کتنا تضاد ہے — ایک کامیاب محبت کرنے والے کے لیے زندگی ایک ابدی اور مستقل کیف کی حیثیت رکھتی ہے جس کے نزدیک زندہ رہنا ہی خود ایک اعلیٰ ترین مقصد کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کامیاب زندگی کے تاریک پہلو پر بھی غور کیجیے کہ جہاں قدم قدم پر ناکامیاں و تباہیاں اور جہاں نامرادی و یاس کا ایک مستقل سایہ دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ جہاں زندگی نام ہے ہر قدم پر ناکامی کا — جہاں انسانوں کی ہمدردی بہتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں اور جس مقام پر پہنچکر انسان اپنی شکست کی آواز بنجاتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ مسرت کے موقعے پر اظہار مسرت مقدار مسرت کو بڑھاتا ہے یا دکھ و غم کے موقعہ پر اظہار ہمدردی دکھ کی مقدار کو کم کرتی ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اس طریقہ و اظہار سے زیادہ برداشت کا اضافہ ہو جائے لیکن غم بہرحال برقرار رہتا ہے۔

فلسفیوں کے خیالات بھی صرف ہمارے احساسات کو تسکین دے سکتے ہیں — رسل نے کیا خوب کہا ہے کہ "فلسفیانہ مراقبہ ہمارے احساس رنج و دکھ کو بہت کچھ کم کر دیتا ہے۔

زندگی ایک مسلسل جد و جہد کا نام ہے جس میں ایک کی کامیابی دوسرے کی ناکامی ہے ایک خوش ہوتا ہے لیکن نہ جانے کتنوں کی خوشیوں کا خون کر کے — لیکن ایک لمحہ کا دکھ عمر جاودداں کی خوشی سے زیادہ سوہان روح ہوتا ہے۔ فطرت انسان کو خوش بھی نہیں دیکھ سکتی انسان جب انتہا سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو فطرت اس سے انتقام لیتی ہے اور اس کے آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں — فطرت کے نزدیک زندگی کا تخریبی رخ ایک کھیل ہے ملٹن نے کیا سچ کہا ہے کہ "فطرت کے دانت و ناخن ہمیشہ خون آلود و خونچکاں رہتے ہیں"

انسان ان ہی یاس انگیز و ناساعد واقعات سے گھبرا کر خودکشی کرتا ہے لیکن وہ حق بجانب ہے اس لیے کہ موت سے ڈرنا جو ایک جز ہستی ہے عبث خیال ہے بزدل تو وہ ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے صرف موت سے بچنے کی خاطر۔

پھر غور کیجیے کہ اس غیر محسوس قوت کے علاوہ جو ہمیں تباہ کرنے پر تلی ہوتی ہے ہم خود کیا کچھ کم تباہی نہیں لاتے — جنگ ہوتی ہے جس کا نتیجہ تہذیب و تمدن جو انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے جسے انسان نے ہزاروں سال کے دماغی ارتقا و کاوش کے بعد اس نقطہ پر پہنچایا۔ تباہ و برباد ہو جاتا ہے — بقول

وکسن کے" کہ یہ تباہیاں و بربادیاں یونہی ہوتی رہیں گی
اور انسان اپنی تباہیوں و برباد ہونے میں ترقی کرے گا۔
ایک فلسفی کہتا ہے کہ "ہم ماضی سے واقف ہوتے ہیں لیکن
مستقبل ہمارا نصب العین ہوتا ہے" ماضی کے تجربہ مستقبل کے
نصب العین کے حصول کے سامنے صرف ایک مبہم اتفاقات بنکر
رہجاتے ہیں۔

"موجودہ انسان حسرت کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن
وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا بلکہ اس کی زندگی اور زیادہ
الجھکر رہ گئی۔

"زندہ رہنا اس دنیا میں ایک نہایت ہی مشکل امر ہے
ورنہ جینے کو ہر شخص جیتا ہے لیکن ایک اور شخص کہتا ہے کہ زندہ
رہنا لہذا یہ کوئی ارفع و اعلیٰ مقصد نہیں" —— ہوسکتا ہے۔
—— تو پھر زندگی ہے کیا —— ؟

سوگوار حیات

اورینٹل کالج کے پنشنین پروفیسر "مرزا مسعود" ایک عجیب
ہی فلسفیانہ ذہنیت کے مالک تھے، باتیں کرتے کرتے بعض اوقات
تو وہ اس قدر تیز ہوجاتے کہ مذہب کی بندشوں کو بھی توڑ تاڑ کے
علیحدہ پھینکدیتے" یہ دنیا سب فریب ہے، خدا کا تصور محض اک
لایعنی اور
بزدلانہ عقیدہ ہے، جس پر ناسمجھ انسان "زندگی"
جیسی پیاری چیز قربان کرتا چلا جا رہا ہے۔ جنت دوزخ
کا فرق صرف جاہلوں کو بہلانے کا ایک کامیاب پروپیگ
نڈا ہے" ورنہ جس نے ہمیں عقل دی ہے، اس نے اتنی
مکمل کیوں نہیں دی کہ ہم اس کو صحیح طور پر سمجھ سکتے" یہی
بس ان کی آخری دلیل تھی! ؟
کافی عمر گذر جانے پر بھی پروفیسر کے چہرے پر اک طرح
کی شان اور خوبصورتی پائی جاتی تھی، کچھ دن ہوئے تھے کہ وہ
لاہور سے پنشن لیکر مصطفےٰ آباد آئے تھے، اور یہاں پر بھی پنشنی
کے پروفیسر بنادیے گئے۔

"ثریا" مصطفےٰ آباد کی ایک مشہور اور کمسن رقاصہ تھی،
قدرت نے جس فیاضی کے ساتھ اس کو حسن بخشا تھا، اسی طرح وہ
ظاہری اخلاق میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، جس طرح ایک
مالدار نوجوان اس سے ہنس ہنس کے باتیں کرسکتا تھا اسی طرح ایک
غریب نوجوان بھی!

نہ معلوم کہاں اور کیسے پروفیسر اور ثریا کی ملاقات ہوگئی
اور یہی چند روزہ ملاقات بڑھتے بڑھتے محبت میں تبدیل ہوگئی
اور پھر اس کا اختتام شادی ہی پر ہوکر رہا۔

پروفیسر بہت منطقی اور تندمزاج انسان تھا، مگر حیرت ہے کہ
ثریا اس کے قبضے میں آگئی، روز و شب عیش و عشرت میں مصروف
رہنے والی تنہا اور ویران مکان میں رہنے کے لیے تیار ہوگئی
گھر کا تمام کام وہ خود کرتی تھی اور پھر پروفیسر کی خدمت تو اس
طرح کرتی جیسے کوئی دیوتا کی پوجا کرتا ہے! ؟

سب سے پہلے اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا! اور پھر ایک
لڑکی اسی طرح سلسلہ جاری ہوگیا اور کچھ ہی عرصے میں پروفیسر
اچھے خاصے خاندان کا مالک بن گیا لیکن کچھ دنوں سے پروفیسر
کی دماغی حالت بگڑنا شروع ہوگئی تھی حالانکہ یہی وہ زمانہ تھا
جب وہ دنیائے علم و ادب میں آفتاب بن کر چمک رہا تھا۔

ثریا کو پروفیسر کے پاس آئے کافی زمانہ گزر چکا تھا مصطفےٰ آباد
کے رہنے والے اب اس کو بھول چکے تھے، اور جنہیں وہ یاد تھی
ان کے دماغ میں بھی نقوش بہت ہلکے پڑگئے تھے، وہ چاہتی بھی
یہی تھی کہ دنیا اسے بھول جائے، وہ زندہ رہنا چاہتی تھی صرف
پروفیسر کی خاطر، اس کی ہر فرمائش پر خود کو نثار کرنے کے لیے ہمہ وقت
تیار، جب پروفیسر اس سے محبت آمیز باتیں کیا کرتا تو وہ اس قدر
مسرور ہوتی کہ انجان آدمی اسے دیوانہ سمجھنے پر مجبور ہوجائے
اور یہی چیز اس کے لیے زندگی کا اعلیٰ مقصد بن کر رہ گیا تھا۔

پروفیسر یکایک ایسا بیمار پڑا کہ اسے اپنے زندہ رہنے کا امکان بھی جاتا رہا لیکن ایک خیال تھا جو اس کو برابر پریشان کر رہا تھا اور وہ خیال تھا ثریا کے آیندہ گزر اوقات کا، وہ سمجھتا تھا ثریا میری منکوحہ بیوی نہیں ہے، میری جایداد سے اسے کچھ نہ مل سکے گا، اس لیے اس نے رجسٹرار کو بلا کر اپنی جایداد کا جایز وارث ثریا کو قرار دیدیا۔ مگر قدرت کو تو کچھ اور ہی مقصود تھا ادھر رجسٹرار کاغذات کی تکمیل کر کے واپس ہوا ادھر پروفیسر کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔

اس واقعہ سے ثریا پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا وہ جس طرح پہلے خوش و خرم رہا کرتی تھی اسی طرح اب بھی ایک رات کو ثریا کے سر میں درد شروع ہوا اور اس نے اس وقت تک کسی کو چین نہیں لینے دیا جب تک ثریا ہمیشہ کے لیے خاموش نہیں ہو گئی۔

یہ تھا اس محبت کا انجام جو پروفیسر کو ملا، وہ پروفیسر جو بڑے بڑے آلام و مصایب کو حالات کے نام سے تعبیر کر کے قہقہوں میں اڑا دیتا تھا۔ آج وہ خون کے آنسو رو رہا تھا، احباب سمجھا رہے تھے مگر آنسو تھے کہ تھمتے کا نام نہیں لیتے تھے سفید اور لمبی داڑھی پر اس طرح آنسو گر رہے تھے جیسے برسات کے موسم میں کسی سایہ دار درخت کے نیچے مسلسل بوندیں گرا کرتی ہیں!

برق زیدی

بیوی اور مشاعرہ

میر صاحب کو سب سے زیادہ خوشی اپنی شادی کی اس لیے تھی کہ اب وہ بجائے خیالی معشوق شاہد عینی کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہو کر شاعرانہ فکر کریں گے اور اسی طرح مشاعروں میں ان کی دھوم مچ جایگی۔ آپ نے اپنی شادی کے موقع پر بھی احباب کو جمع کر کے ایک صحبت مشاعرہ منعقد کی خود بھی شریک ہوے اور پس پردہ بیوی کو بھی دعوت شرکت دی۔ الغرض اب وہ مطمئن تھے کہ ان کی شاعری مشاعروں میں چار چاند لگا دیگی۔

مگر وائے ناکامی کہ وہ باوجود اپنی تمام تر استادیوں کے صرف اس معاملے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ادھر مشاعرے کا کارڈ ان کو ملا ادھر بیوی صاحبہ کا مزاج بدلا۔ یہ کہتے کہ آج کے دن تمام شہر میں میری غزلخوانی اور شاعری کی دھوم ہے کیسے نہ جاوں وہ کہتیں کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ تم رات کے کسی حصہ میں بھی مجھے چھوڑ کر گھر سے باہر جاو۔ الغرض اس رسا کشی میں میر صاحب اپنی جان سے بیزار تھے۔ بیوی کو سامنے بٹھا کر جذبات شاعری کو تازہ کرتے اچھی سی اچھی معاملہ بندی کرتے۔ مگر وائے بر جان سخن تا بسخندان نہ رسد۔ کے مصداق دل ہی دل میں کڑھتے اور مشاعروں کی شرکت سے بالعموم محروم رہجاتے۔

بیوی کی طرف سے صرف اس قدر اجازت تھی کہ اگر ایسا ہی جوش سخن ہے تو اپنے گھر میں مشاعرہ کر لیا کرو۔ مگر یہ کہاں تک ہو سکتا تھا اول تو ہر ماہ کے غیر معمولی مصارف۔ دوسرے بار بار انہیں کے یہاں مشاعرہ کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا اور میر صاحب کو جو لطف مشاعرہ دوسری محفلوں میں آ سکتا تھا وہ اپنے یہاں کب حاصل ہو سکتا تھا۔ نتیجہ میں جب زمانہ بے کیف حالت میں گذر جاتا تو معمولی دس بیس احباب کی صحبت اپنے گھر میں چند گھنٹوں کے لیے منعقد فرما لیتے اور اس طرح شاعری و مشاعرہ کی ہوس پوری ہو جاتی۔ مگر دل شگفتہ نہ ہوتا۔ ہمیشہ متفکر اور مضمحل ہی نظر آتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ آل انڈیا مشاعرہ کا دعوت نامہ ان کو ملا اور احباب نے خاص طور پر زور دیا کہ دیکھیے میر صاحب یہ مشاعرہ ناغہ نہ ہو خواہ کچھ ہی ہو۔ بات کا معاملہ ہے۔ باہر سے مشہور مشہور شعرا آئیں گے۔ ہمارے شہر میں آپ کی دھوم ہے۔ اگر آپ ہی نہ ہوے تو سارے شہر کی ناک کٹ جایگی۔ انہوں نے وعدہ تو کر لیا اور دل بھی بے چین تھا کہ اتنے بڑے مشاعرے میں ضرور داد سخن

حاصل کی جائے۔ مگر بیوی کا رعب اس درجہ غالب تھا کہ زبان سے
ایک حرف نہ نکال سکتے تھے۔ دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر رہتے۔
اب اس کو شامت اعمال کہیے یا سوء اتفاق کہ دعوتی کارڈ بیوی صاحبہ
نے شیروانی کی جیب سے نکال کر پڑھ لیا اور دن تاریخ بھی نوٹ
فرما لیا۔ انہوں نے بیوی سے اس مدت میں بہت اختلاط جو برتا
اس کی دو وجہیں تھیں اول تو جذباتی مضامین پیدا ہوتے رہیں گے
اور غزل بہت چست ہوگی۔ دوسرے اس اختلاط سے بیوی کو
بھی ایک رات کے لیے ہموار کر لیا جائے گا۔ مگر بیوی میر صاحب کی
تمام نقل وحرکت کو میر صاحب سے بھی پہلے سمجھ چکی تھیں انہوں نے
اس کا تو موقع ضرور دیا کہ میر صاحب غزل اچھی سی اچھی کہہ سکیں۔
بلا ارادہ بھی بن سنور کر ایک نگاہ غلط انداز سے میر صاحب کو دیکھ لیتی
کبھی زلف دراز کا منظر دکھا دیتی تھیں تو کبھی مصحف رخ کی زیارت
سے مشرف با یماں فرماتیں۔ القصہ مشاعرہ کا دن بھی آ گیا۔ مگر میر صاحب
کو بیوی کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر ہمت نہ ہوئی کہ عرض مدعا کریں
ادھر شام ہی سے احباب نے غل مچانا شروع کیا کہ میر صاحب
ٹھیک ۸ بجے پہنچ جانا چاہیے ورنہ فہرست مرتب نہ ہوسکے گی۔ بیوی صاحبہ
باہر کی باتوں پر بھی کان لگائے ہوئے تھیں۔ رات کو میر صاحب نے
حسب معمول کھانا کھایا اور کچھ پہلے ہی سے سو رہے۔ بیوی نے بھی
میر صاحب کا ساتھ دیا اور ٹھیک ۸ بجے کے اندر ہی اندر دونوں
محو خواب تھے۔ ادھر ۸ کا گھنٹہ بجا ادھر میر صاحب نے چارپائی
چھوڑی پاخانے کا لوٹا ہاتھ میں لیا۔ پاخانہ گئے اور لوٹا رکھ کر پاخانے
ہی کے اندر سے ہتر ائی کے آنے والے دروازے کا پٹ کھول کر
باہر بغیر لوٹا لیے نکل گئے۔ بیوی صاحبہ کو خواب ہی میں سب کچھ معلوم
ہوگیا تھا وہ اٹھ کر پاخانہ گئیں تو لوٹا پانی سے بھرا ہوا نظر آیا۔
خوش قسمتی پر ناز کیا کہ آج تو میر صاحب نے میرے واسطے بھی یہ
زحمت گوارا کی تھی آج تو شکریہ ادا کرنا چاہیے لوٹے کو استعمال میں
لائیں اور غضب یہ کیا کہ پاخانے کا ہتر ائی والا دروازہ بند کرکے
واپس آئیں۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ بیوی صاحبہ کو پھر نیند آئی یا
نہیں۔ ۳ بجے رات کو مشاعرہ ختم ہوتے ہی آنا فانا میر صاحب

میر صاحب اپنے مکان کے پاخانے کی طرف پہونچے۔ دروازہ کو سہارا
دیا وہ بیوی صاحبہ کے لب خاموش کی طرح بند تھا بہت کوشش
کی مگر کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی۔ دفعتاً خیال آیا کہ پشت کے کمرے کی
کھڑکی زیادہ تر کھلی رہجاتی ہے۔ چلو اس طرف دیکھیں شاید کوئی راہ
اندر جانے کی نکل آئے۔ کھڑکی کے کواڑ تو ضرور کھلے تھے مگر اندر کے
طرف لوہے کی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں جن سے گذرنا ناممکن تھا۔
میر صاحب نے مٹی کا ایک ڈھیلا اندر پھینکا جس سے ان کو یہ معلوم
کرنا تھا کہ لوگ سو رہے ہیں یا جاگتے ہیں جب اطمینان ہوگیا تو دبیانی
ایک سلاخ کو پوری طاقت سے جنبش دی وہ کچھ جنبش میں آئی اسی طرح
ایک اور سلاخ نکالی۔ آخرش تیسری سلاخ نکال کر چاہتے تھے کہ سر
ڈال کر نکل جانے کا اندازہ کریں کہ بیوی کی آنکھ کھل گئی اور بچے
نے رونا شروع کیا۔ گھر میں سب ہی جاگ پڑے بیوی کی نظر کھڑکی
کی طرف پڑی میر صاحب کا سر مبارک اس بری طرح سلاخوں میں
جکڑ چکا تھا کہ نہ اندر ہی بڑھ سکتا تھا نہ باہر نکل سکتا تھا۔ بیوی
نے بے تحاشہ چور چور کا غل کیا اندر سے گھر والے باہر سے اہل محلہ
دوڑے۔ گھر والوں نے سر کو تھاما۔ باہر والوں نے پچھلا حصہ
دبایا۔ میر صاحب ہیں کہ خرخر گل ہو رہے ہیں۔ لالٹین آئی اندر سے
پہچان لیے گئے۔ مگر باہر پھر شک رہا جب تک روشنی نہ آئی چوتھی
سلاخ نکالی گئی جب میر صاحب کا سر باہر کی طرف کھینچنے سے نکلا
پوچھا گیا میر صاحب یہ کیا معاملہ تھا آپ نے فرمایا کہ کل مجھے شک ہوا
تھا کہ چور کھڑکی سے آسکتا ہے میں نے امتحاناً آج ایسا کیا بارے
معلوم ہوگیا کہ یہ ناممکن ہے کہ چور کھڑکی کی طرف سے مکان میں آسکے۔
بیوی نے کہا کہ اگر ایسا ہی تھا تو یہ ۳ بجے رات کو امتحان کا
کونسا وقت تھا؟ فرمایا شام سے خیال ہی نہیں رہا ابھی پاخانہ
جانے کو اٹھا تو خیال آیا۔

بیوی۔ تو باہر جا کر سر ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ گھر ہی میں سر ڈال لیتے؟

میر صاحب۔ واہ۔ چور جب آئیگا تو باہر ہی سے آئیگا۔ آخر ہو نہ
عورت۔ ناقص العقل

بیوی۔ تو پھر پاخانہ جانا ہوا ہو نہیں۔؟

میر صاحب۔ اس کا اب ذکر ہی کیا۔

بیوی۔ اور شاعرہ

میر صاحب۔ ہاں "بیوی اور شاعرہ" وہ بھی نہیں ہو سکتا۔

عابد علی کوثر (فیض آبادی)

درسِ عبرت

لیلیٰ شب کی دراز زلفیں سارے عالم پر مسلط ہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ نیند کی آغوش میں محو ہے۔ لیکن ایک حرماں نصیب جو کسی کی یاد میں مضطرب ہے، سویا نہیں۔ اس بھیانک تاریکی کے سینوں کو چیرتا پھاڑتا جا رہا ہے۔ نہ اسے اندھیری رات کا خوف ہے اور نہ اکیلے پن کا ڈر

وہ ایک وسیع چار دیواری کے قریب جاکر رک گیا جیسے کوئی منزل مقصود پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔ کتبے پر "منزل آخر" کے الفاظ پڑھے۔ پھاٹک کھول اور اندر داخل ہوا سامنے کئی قطاروں میں مٹی کے بلند و پست ٹیلے تھے جو نگاہ حقیقت بیں کے لیے تازیانہ عبرت تھے۔ مٹی کے ایک تودے پر اس کی بے قرار نگاہیں جم گئیں آنکھوں میں آنسو امڈ آئے جیسے کوئی دردناک حادثہ یاد آگیا ہو دل پر غم و الم کی جو گھنگور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں وہ آنکھوں سے سیلاب اشک کی صورت میں رواں تھیں۔ وہ بے تابانہ اس تودے کے قریب آیا اور ایک عالم وارفتگی و دیوانگی میں اس سے لپٹ گیا۔

اے خاک لحد میں آرام کرنے والے تو نے یہ کیوں کر گوارا کیا کہ ہم تیری یاد میں آٹھوں پہر آنسو بہائیں۔ غم و الم کے پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑیں۔ اور تو ہمیں یوں روتا بلکتا چھوڑ کر اس عزلت کدے میں آ بسے۔ تو ہماری ذراسی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا۔ تیرا درد مند دل ہماری راحت و آسائش کیلیے مضطرب رہتا تھا کیا وہ ساری شفقتیں اب ختم ہیں؟ اے خفتہ خاک! اٹھ کہ اس تنگ وتاریک لحد میں بہت سو چکا۔ یہ دن جو ہم نے تیری یاد میں بیتے ہیں تو نہیں جانتا کہ اس قدر صبر آزما تھے۔ تجھ بن زندگی اجیرن ہے تیرے بغیر ہماری محفلیں سونی اور مجلسیں بے رونق ہیں۔ دل کی بستی کبھی کی ویران ہو چکی۔ اس کی ویرانی کو ختم کر دے۔ کیا تجھے لحد کی اس تنگی اور تاریکی کا غم نہیں؟ اس بھیانک فضا اور ہیبت ناک خاموشی کا ڈر نہیں؟ کیا ہماری محبت اور اپنی شفقت کا پاس نہیں۔

کسی غیبی آواز نے اسے دفعتاً چونکا دیا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ نشہ محبت میں اتنا سرشار نہ ہو کہ اپنی ہستی ہی کو بھول جا۔ تو کون ہے اور کس کو بلا رہا ہے؟ کس عالم کا رہنے والا ہے اور کس کی آمد کا مشتاق ہے؟ عالم کثیف کو عالم لطیف سے واسطہ! عالم شر و فساد کو عالم امن و سکون سے غرض!! عالم مادی کو عالم روحانی سے تعلق۔ ایک خاکی اور مادی انسان اور لطیف و منزہ روح سے ملاقات کا اشتیاق۔ تیرا رونا بے سود، تیری گریہ و زاری لاحاصل، تیرا نالہ و شیون بے اثر۔ اتنی رات گئے تو اس بستی میں کیسے آگیا؟۔ یہاں سے دور ہو۔ ان خفتگان خاک کو آغوش لحد میں آرام و چین سے سونے دے۔ انہیں بیدار نہ کر۔ جا اور اپنا راستہ لے۔

غلام معین الدین بی۔ ایس۔ سی۔ (عثمانیہ)



حسن و جمال نمائش کمال اور موسیقی
کی بے نظیر تصویر
پھر ملینگے
ڈائرکٹر:۔ سہراب مودی
اداکار
مینا ۔ سردار اختر
صادق علی ۔ کے ۔ این سنگھ
ایرچ تاراپور

بوڑھاپا اور پشیمانی

جب میں بچہ تھا :-

ایک نوخیز پودا تھا کہ دھوپ پڑے تو کملانے لگے اور پانی پڑے تو لہلہانے لگے ۔ زندگی میری ایک معمہ تھی اور دنیا میری بے حس ۔ احساس وجود تو تھا لیکن خود سے بے خبر ۔ خدائی اور دنیاوی قانون رایج تو تھے ۔ لیکن مجھ پر بے اثر ۔ روتے روتے ہنسنا اور ہنستے ہنستے رونا مجھے اچھا لگتا تھا ۔ خدا کو کو سمجھتا نہ تھا لیکن اس سے ڈرتا ضرور تھا ۔ ڈرنا میری ایک معصوم عبادت تھی ۔ شرارت کرتا پر گناہ سے بچتا تھا ۔ اگر بچ نہ سکا تو گناہ میری شرارت تھی ۔ ایک حسین دنیا میں رہتا تھا ۔ موسم گرما کی اندھیری راتوں میں، جگنو کو میں ایک بھٹکا ہوا تارا اور آسمان کو جگنوؤں کی ایک بستی سمجھتا تھا ۔ جگنو کا اپنے جلد جلد گل ہونے والے چراغ کو روشن کرنا بے پناہ اندھیرے میں اپنے راستے کو کبھی ادھر کبھی ادھر ڈھونڈنا، اور اوپر تاروں کا آنکھوں کے اشارے سے اپنی طرف بلانا مجھے بھلا لگتا تھا ۔

ایک سدا بہار درخت تھا ۔ کہ خزاں بھی آئے تو چند پتے گرائے اور مایوس ہو کر چلی جائے ۔ زندگی میری ایک کھلونا تھی اور دنیا میری باحس ۔ اپنے وجود کا یقین تھا اور خود سے بھی باخبر تھا ۔ اپنی خودی میں اتنا بے خود رہتا تھا ۔ کہ کسی دوسرے وجود کا خیال تک نہ آتا تھا ۔ خدائی اور دنیاوی قانون رایج تو تھے لیکن میں نے کبھی ان کی پروا نہ کی ۔ دہریت میں میرا نفس پوشیدہ تھا ۔ خدا ہے یا نہیں ؟ ۔ اس پر غور کرنے سے میرے نفس کو اذیت پہنچتی تھی ۔ میں ظاہر خدا پرست تھا ۔ لیکن تھا حقیقت میں ایک نفس پرست ۔ میرے نزدیک گناہ ایک بے معنی لفظ تھا ۔ گناہ فطرت کا منشا تھا ۔ گناہ نیکی تھی اور نیکی گناہ تھا ۔ حسن کا تو بچپن ہی سے شیدائی تھا ۔ لیکن اب حسن کو پھول کے رنگ و بو میں تلاش نہیں کرتا تھا یہ خشک و خاموش حسن تھا ۔ مجھے لطیف اور مضطرب حسن کی ضرورت تھی ایسا حسن جو میرے نفس میں گدگدیاں پیدا کر دے ۔ آنکھوں میں مستی اور بدن میں ایک ارتعاش پیدا کر دے ۔ یہ انوکھا حسن ملتا تھا کسی کی چھلکتی ہوئی جوانی میں، کسی کے ابھرتے ہوئے مچلتے ہوئے اور نکھرتے ہوئے شباب میں :-

اب میں بوڑھا ہوں :-

ایک پرانا کھوکھلا درخت، جو بہار کے زندگی بخش جھونکوں سے بھی کانپنے لگے ۔ زندگی میری کبھی ایک معمہ تھی جس کو میں نے اب حل کیا ۔ لیکن امتحان ختم ہونے کے بعد ۔ یہ ایک ٹوٹا ہوا کھلونا ہے ۔ میں نے خود کھیل کر توڑا ۔ ہر نئے دن جوڑنے بیٹھا ہوں لیکن جوڑتا دکھائی نہیں دیتا میں کوئی کھلونا ساز تو ہوں نہیں ۔ اب کیا ہوگا ؟ ۔ دنیا میری باحس اور حساس ہے ۔ اس حس اور احساس نے اب میری چین ہی چھین لی ۔ راتوں میں خود بخود جوانی یاد آتی ہے ۔ جوانی میں عبادت نہیں ۔ بغاوت یاد آتی ہے ۔ اور نیند خایف ہو کر غایب ہو جاتی ہے ۔ لوگ کہتے ہیں "ضعیفی میں نیند کم آتی ہے" آخر کیوں ؟ ۔ ہاں یہ ایک بھید ہے بڑھاپے کا، مجھ جیسا بوڑھا ہی سمجھے ۔ نوجوانوں کو آپ بیتی سناتا ہوں تو کہتے ہیں "عقل بوڑھی ہے" ۔ میں کیسے ان کے دماغ میں ڈالوں کہ میں بھی کبھی جوان تھا ۔ عقل بھی جوان تھی ۔ اسی جوانی کا ماتم کر رہا ہوں ۔ کیا وہ نہ کریں گے ؟ ۔ اپنے وجود کے فنا ہونے کا یقین ہو چکا ہے ۔ اور اب یہ فکر رہتی ہے کہ اس فنا کے بعد کیا ہوگا ؟ خدائی قانون سے لڑنے کی اب ہمت نہیں، سرکش گردن خود بخود قانون کے سامنے جھک چکی ہے ۔ قلق ہے تو اس بات کا کہ جب اس کو جھکنا ہی تھا تو پہلے ہی کیوں نہ جھک گئی ۔ دنیا میں سرکشی کی سزا موت ہے ۔ دنیا کے بعد جہاں موت نہیں، وہاں کیا ہوگی ؟

کالے بال سفید ہو گئے ہیں ۔ بتیس دانتوں میں صرف ایک باقی ہے ۔ وہ بھی سوکھے پتے کی طرح گرا ہی چاہتا ہے دانتوں کی

آئینہ پاکر گال پچک گئے ہیں۔ چہرہ دیکھتا ہوں تو وحشت ہوتی ہے۔ جب انگلیوں کو چھوٹے چھوٹے مگر عبرتناک گڑھوں میں اترتے دیکھتا ہوں۔ آئینہ دیکھتا ہوں اور پھر جوانی کی آویزاں تصویر۔ جوانی کا غرور حسن مردہ دکھائی دیتا ہے — جس قوت نے مجھکو بچے سے جوان، اور جوان سے بوڑھا بنایا۔ جس نے میرے سیاہ بالوں کو دیکھتے دیکھتے سفید کردیا۔ جس نے میرے دانت خود میرے ہاتھوں سے نکلوا کر باہر پھنکوا ے اور ایک کو ہلتا ہوا چھوڑ دیا۔ جس نے میرے چہرے کو ایک ایسے آم کے مانند بنا دیا کہ جس کے اندر گٹھلی ہو اور چھلکا ہو لیکن تمام رس چوس لیا گیا ہو — اسی کو ہاں اسی قوت کو اب یقین آیا۔ دنیا والے خدا کہتے ہیں .... اب میں نفس پرست نہیں خدا پرست ہوں۔ ..... لیکن اب جب کہ نفس اپنی موت مرچکا ہے کیا خدا پرستی کی کچھ قیمت ہے۔؟

میں اب ایک ایسے حسن کا شیدائی ہوں جو آنکھ سے دکھائی نہ دے۔ جس کا اثر تخیل کے راستے سے گزر کر روح تک رسائی کرے۔ اور اسے مست بنا دے۔ انسان ہی نے سنہری ذرے کو ریت میں ملا دیکھ کر سونے کی کان کا پتہ لگا لیا۔ اگر میں نرگسی آنکھوں کے حسن میں کھو یا نہ جاتا تو لیا میں حسن کے ماخذ کا پتہ نہ اٹھا لیتا۔؟ —

بچپن اور شادمانی، جوانی اور دیوانی، اور بوڑھاپا اور پشیمانی ..... یہ ہیں تین باب کتاب زندگی کے، جس کا جی چاہے پڑھ لے۔

باقی کیرانوی (عثمانیہ)

گل کا المیہ

باغ میں جھومتے ہوئے پودے کی ایک ٹہنی پر نو زائیدہ غنچے نے ابھی ابھی اپنی چشم خوابیدہ وا کی تھی کہ بلبل کو نثار ہوتے پایا اپنے سے پہلے گزرنے والوں کی بپتا سن چکی تھی۔ کھری کھری سنائی بلبل کو دل میں ٹھانی اور غصہ سے عرق لانے لگا

بلبل نے جو یہ صورت دیکھی اور مستی میں پروں کو پھڑپھڑایا۔ غنچے نے جب اسے پورے جوش میں پایا اور بھی زیادہ لب کھولے طرز تکلم سے غم ہویدا تھا۔ کہنے لگا تم کیا وہی بلبل بے وفا ہو، جس کا قصہ میں یہاں سے گزرنے والے گلوں سے سن چکا ہوں بس رہنے بھی دو بہت نثار ہو چکے تمہارے پروں کی گرم گرم ہوا سے میرا منہ جھلس رہا ہے آخر ہو نہ وہی بلبل مرجائی جوں ہی میرے رنگ و بو میں فرق آیا اور تم کسی دوسرے گل کی تلاش میں ہی نکلے ثبوت محبت میں تم نے یہ کیا کیا اپنی سخت پتھر سی چونچ کے ٹھونگے دیے واہ تم نے ہماری نزاکت کی خوب داد دی اپنی نوکیلی نشتر سی انگلیوں کے ناخون سے میرے رخسار پر گہرا نقش کیا اسپر بھی تمہیں چین نہیں آیا۔

تمہارے ہی وجود سے ہمارا پتہ گلچیں کو ملتا ہے غنچے نے جب خوب کھلکر اپنی داستان سنائی تو بلبل دم بخود بیٹھی اپنی بیوفائی کے احوال سن رہی تھی۔

غنچہ خوشی سے پھول رہا تھا۔ بلبل نے پر تولے دور سے صحن باغ میں بیٹھے ہوئے گلچیں کی نظر چشم نرگس سے ملی اور وہ سبحان اللہ کہتا آگے بڑھا بہت دیر سے اسے کچھ ہلکے رنگ کی نیم وا کلیوں کی تلاش تھی کسی بت کم سن کی بارگاہ ناز میں پیشکش کرنا چاہتا تھا۔ دست ہوس بڑھا کر غنچے کی نازک گردن مروڑ دی

بقول کسے۔ ع۔ گلچیں نے گل کو چھوڑا
بلبل بنا رہی ہے ماتم زدن کی صورت

چشم نرگس میں آنسو بھرے تھے۔ ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا ابھی اس نے اس فانی دنیا میں برابر آنکھ بھی نہ کھولی کہ فنا کا پیام آگیا جس وقت بت کم سن کی بارگاہ ناز میں پیش ہوا تو شدت حزن ملال سے کسی کے شیشہ دل کی طرح چور چور ہو کر اس کی ہر پتی ہوا کو ساز کا کام دینے لگے ان تاریک پردوں پر ہوا نے خوب نئی راگ فنا الاپا اور پھر پنکھڑی نے فانی فانی کا مین سجایا۔

منزباری داور

منگیتر

لب لعلیں یہ کیوں دلسوز آہیں تھرتھراتی ہیں
جوانی رقص فرما ہے نہ آنکھیں مسکراتی ہیں
شباب عیش پرور سوگوار زندگی کیوں ہو
فقط اندوہ و غم پر انحصار زندگی کیوں ہو
سحر آگیں جوانی اس طرح کمھلا کے رہ جائے
کہ جیسے کوئی نازک سی کلی مرجھا کے رہ جائے
دل معصوم پہ رنج و محن کا وار چل جائے
سراپا شعر و مستی درد کے سانچوں میں ڈھل جائے
مری خاطر لباس زندگانی دھجیاں کیوں ہو
نہ جانے عشق کو منظور آخر امتحاں کیوں ہو
محبت ننگ ہستی سے تری توہین ہے اے جان
ترا یہ ذوق الفت لائق تحسین ہے اے جان
ترے احساں کا بدلہ چکا سکتا نہیں ہرگز
رباب عشق پر نغمے سنا سکتا نہیں ہرگز
مری جاں ہم اسیر ظلم و استبداد ہیں جب تک
خداوندان باطل دہر میں آباد ہیں جب تک
خطا کار مجسم پیکر تقصیر ہوں گویا
میں شاکی مشیت کشتۂ تقدیر ہوں گویا
اثر اتنا تو پیدا ہو منگیتر کی دعاؤں میں
خوشی کی بجلیاں کوندیں کبھی غم کی گھٹاؤں میں

سردار الہام (عثمانیہ)

غزل

چھلک پڑے نہ یہ چشم پر آب رہنے دے
تو پوچھ حال یہ حال خراب رہنے دے
ہجوم حسن ہے ایسا کہ تاب دید نہیں!
پڑا ہوا ہے جو منہ پر نقاب رہنے دے
کہاں کا خطرۂ فردا دعشرت امروز
نہ چھیڑ اب مجھے غرق شراب رہنے دے
سکوں تو موت ہے میں زندگی کا طالب ہوں
دیا ہے دل تو یہی اضطراب رہنے دے
ہنوز درد محبت ہے تشنۂ تکمیل!
کرم نہ کر یہ نگاہ عتاب رہنے دے
وہ نامراد نہیں التفات کے قابل
ادیب زار کو خوار و خراب رہنے دے

سلیمان ادیب

غزل

غم صبر آزما کیا راحت و عشرت کے ساماں کیا
ہو دل ہی ٹھکانے جب تو صحرا کیا گلستاں کیا
کہاں تک انتظار دید کی یہ فکر سامانی
گناہ لطف پیہم کیجئے۔ یہ عہد و پیماں کیا
یہ کہہ سکتا ہے رحمت سے تجھے انکار ہے تو کیا
کہاں کی پرسشش فردا سزائے جرم و عصیاں کیا
یہ تبدیں دانش علم کرو منزل کے لئے ہونگی
جنوں شوق کے عالم میں بستی کیا بیاباں کیا
اگر مقدور ہو تو چاک کردوں جامۂ ہستی
دل وحشت زدہ کے واسطے یہ جیب و داماں کیا
اگر ان کی یہی کا فرادائیں ہیں تو اے عرشی
تجھے تو جان بھی دینا پڑیگی دین و ایماں کیا

عرشی

زندگی کے تین باب

(۱)

شادی کا گھر براتیوں کا ہجوم' دلہن والوں کی مصروفیات دولہا والوں کی دیکھ بھال' عزیزے غیرے کی مبارکبادیاں' باجوں کی دھوم دھام' نقاروں کی مہیب بول' غرض ایک دلچسپ مرقع تھا۔ ہر ایک اپنے میں مست و سرشار تھا۔ ایسے وقت رضا کی رائے ہوئی کہ زنانے مکان میں چلیں۔ پھر ہم دونوں بے دھڑک زنانے میں گھسے چلے گئے اور باورچی خانے کی دیوار کی سہارے کھڑے جوان لڑکیوں کو نگاہیں بھر کر دیکھ رہے تھے۔ ابھی ہمیں یہاں کھڑے کچھ دیر بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ کسی نے پیچھے سے جھنجوڑا اب جو ہم پیچھے پلٹ کر دیکھے تو بس دنگ رہ گئے۔ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کے گلابی گال' پر سیاہ خال' کالے کالے بھونرا جیسے بال' لانبی لانبی پلکیں اور اس میں بڑی بڑی رسیلی آنکھیں ایک انسان کو بے خود کرنے کے لیے کافی تھیں سڈول اور سرخ سفید جسم پہ باریک ہلکی ساری تبں غضب ڈھا رہی تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے ہم سے مخاطب ہوئی۔ آپ لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔

یہاں ...... یہاں ..... جی .... ہم" ہم ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

جی ہاں آپ صاحبان اس نے تنکر سوال کیا

"جی کچھ نہیں صرف آپ لوگوں کو دیکھ رہے تھے"۔ رضا نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے جواب دیا

بڑے بیہودے ہیں آپ لوگ" اس نے غصہ سے کہا ہم تو خدا کی قسم بڑے شریف انسان واقع ہوئے ہیں میں نے زنانہ مکان کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہ چلی گئی۔ یہ پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا۔ اف دل ہی تو بے قابو ہو گیا۔ خیر ہم بھی وہاں سے چلے آئے۔

(۲)

وہ پھر مجھے نظر آئی۔ اس مرتبہ وہ بالکل خاموش تھی اس کی بڑی بڑی آنکھیں سیاہ لمبی لمبی پلکیں غضب یہ دوسری بار ہماری ملاقات تھی۔ یعنی یہاں سے ہم زندگی کا دوسرا باب شروع کرتے ہیں۔ ہم دونوں کی آج شادی تھی۔ وہ اس مرتبہ حجلہ عروسی میں ملی۔ اب بھی اس کے معصوم چہرہ پر شرارت کے اثرات موجود تھے۔ لیکن حجلہ عروسی کا نام اسے شرما رہا تھا اس مرتبہ میں نے پوچھا۔

کیوں جی یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو۔

وہ اسی طرح دبکی پڑی رہی البتہ اس کے باریک لبوں پر مسکراہٹ رقص کر گئی میں نے پھر وہی سوال کیا۔ لیکن پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے گدگدایا۔ وہ ہنس پڑی

بہت ستاتے ہیں آپ" اس نے گھونگٹ نکالتے ہوئے کہا

اس روز تم نے جو ستایا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

اس روز"

وہ شرما گئی۔ لیکن مسکراہٹ اسی طرح اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ ایک وقت میں اس کو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا اور آج اس کا چہرہ دیکھ کر میں بے کل ہوں۔

(۳)

آہ۔ زندگی انسان کے لیے جب ہی خوشگوار معلوم ہوتی ہے کہ جب تک اس کا محبوب اس کی نگاہوں کے سامنے رہے آج اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہا تھا اور آنسو بہا رہا تھا وہ مر چکی تھی۔ لیکن اس کی بڑی آنکھیں اب بھی اسی طرح بڑی بڑی پلکوں میں ڈھکی ہوئی تھیں جیسی کہ حجلہ عروسی میں تھیں۔ اب بھی

اب بھی اس کے باریک لبوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جیسی کہ پہلی ملاقات میں تھی۔

آہ — وہ مرچکی تھی۔ ایک مرتبہ وہ مجھ سے مخاطب تھی دوسری دفعہ میں اس مخاطب تھا۔ لیکن آج میں اسے قدرت سے مخاطب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا تیسرا باب تھا۔ میں نے اسے تین مرتبہ دیکھا۔ مگر ہر وقت ایک نئے روپ میں

صدیق بیگ

عورتیں مردوں سے زیادہ درازعمر ہوتی ہیں

عورتیں مردوں کی بہ نسبت طویل العمری میں مشہور ہیں۔ اور زندگی کے مصایب کا مقابلہ مردوں کی نسبت زیادہ خندہ پیشانی اور ہمت آزمائی کے ساتھ کرسکتی ہیں۔ محققوں نے تحقیق و تدقیق کے بعد اس کی وجہ یہ معلوم کی ہے کہ قدرت نے عورت کو نسبتاً زیادہ محنت کش اور مستقل مزاج بنایا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ آیندہ نسل کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں زیادہ اہم ہیں۔ مرد اکثر حد اعتدال سے متجاوز ہو جاتا ہے اور اپنی قوت برداشت سے بڑھ کر کام کرنے لگتا ہے۔ اس کی یہ روش اس کی زندگی کے معرض خطر میں ڈال دیتی ہیں۔

قدرت نے یہ قاعدہ کلیہ قرار دے رکھا ہے۔ کہ بالغ عورتوں کی تعداد بالغ مردوں سے زیادہ ہو مگر پیدائش میں مردوں کا پلہ بھاری رہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایام شیرخوارگی سے لے کر عہد طفلی تک لڑکے لڑکیوں کی نسبت دگنی تعداد میں مرجاتے ہیں۔

مشہور ماہر نفسیات ہیولاک ایلس لکھتا ہے کہ ہر دو اصناف کے درمیان بچپن اور جوانی کا یہ بین تفاوت ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ اور فطرت کا یہ فعل واقعی حیرت انگیز ہے

جنگ آزمائیاں اور سفر کی صعوبتیں اور اسی قسم کی دوسری خطرناک مہمات جو ہمیشہ مردوں کو سر کرنی پڑتی ہیں۔ اور ان وجوہ کے باعث مردوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے سو اس اہم نظریہ کو بھی ہم پس پشت نہیں ڈال سکتے

عہد طفلی یا شیرخوارگی میں لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکے زیادہ تعداد میں عصبی امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ اور شرح اموات عمر کے پہلے سال کے اندر سب سے زیادہ ہوتی ہے جس عمر میں بچے کے دانت نکلتے ہیں۔ اس کے تیسرے سال سے لے کر ۳۵ سال کی عمر تک اعداد شمار اموات میں کوئی صنفی امتیاز نہیں رہتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوایل عمر میں شرح اموات کی کثرت دنیا میں لڑکوں کی تعداد کو ایک خاص حد تک کم کر دیتی ہے اور اس زمانہ عمر میں جو ۱۵ سال کی عمر سے لے کر ۲۰ویں سال کی عمر تک ختم ہوتا ہے اور تقریباً تیس سال کے بعد یا ۳۵ سال کی عمر تک عورتیں خوب تندرست اور توانا رہتی ہیں۔ یہ حصہ عمر عورتوں کے لیے بہت ہی بہتر ثابت ہوتا ہے۔ اور اس عرصے میں ان کی صحت بہت اچھی رہتی ہے۔

اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کے لیے شرح اموات کو پیش نظر رکھتے ہوے ایسے مختلف امراض پر نظر دوڑائیں جو اکثر موت کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔ اور واقعات اس امر کی شہادت دیں گے کہ عورتوں میں طاقت برداشت اور مدافعت کی صلاحیت مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے اس کے علاوہ ننھے لڑکے ننھی لڑکیوں کی بہ نسبت متعدی امراض کے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ صرف خناق اور کالی کھانسی لڑکوں کی نسبت لڑکیوں میں زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اعصابی امراض جن میں زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ عورتوں پر بیحد غلبہ پا رہے ہیں۔ مگر سخت ترین اور مہلک اعصابی امراض میں شاذ و نادر ہی مبتلا ہوتی ہیں۔

دس سال کی عمر سے لے کر ۱۵ سال کی عمر تک چیچک اور خسرہ لڑکیوں کے نسبت لڑکوں کے لیے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے

بلکہ ماہرین کا خیال ہے۔ کہ ہر عمر میں یہ مرض مردوں کے لیے زیادہ مہلک ہے۔ ہاں انفلوئنزائی شکار مردوں سے زیادہ عورتیں ہوتی ہیں اور اس کا حملہ اکثر ان پر بار بار ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود انفلوئنزا میں شرح اموات عورتوں سے زیادہ مردوں کی نظر آتی ہے۔ بچے سب سے زیادہ اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وجہ یہ کہ بار بار ایک کا چھوت لگ کے دوسرے کو خواہ گھر میں ہو یا اسکول میں یہ مرض ہو جاتا ہے۔ مگر بچوں کو اسے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر لانگ اسٹاف کا خیال ہے کہ حال میں شرح اموات میں جو کمی نظر آ رہی ہے۔ اس میں بھی زیادہ فایدہ عورتوں ہی نے اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لڑکیاں لڑکوں کی نسبت دق۔ کالی کھانسی، خناق اور قلب کے عارضوں میں زیادہ مبتلا ہوتی ہیں۔ جس کا انجام زیادہ تر ہلاکت ہوتا ہے برخلاف اس کے لڑکے عموماً لڑکیوں کی نسبت گردے کی بیماریوں، دماغی عارضوں اور پھیپھڑے کے امراض میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ دست پیچش چیچک خسرہ۔ اسکارلٹ فیور میں بھی عموماً بچے مبتلا ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ امراض زیادہ ہلاکت آفریں ثابت نہیں ہوتے تاہم بچوں کی بہ نسبت بچیاں ان امراض میں مبتلا ہو کر بھی زیادہ فائدے میں رہتی ہیں۔

جوانی سے لے کر درمیانی عمر تک عورتیں سرطان کے مرض میں مردوں سے کم مبتلا ہوتی ہیں۔ لیکن اگر مبتلا ہو جائیں تو یہ مرض ان کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے مردوں کی بہ نسبت ان کی تعداد بہت کم اس مرض میں مبتلا ہوتی ہے۔ کبر سنی کی شرح اموات میں بھی عورتیں مردوں سے کہیں کم نفع میں رہتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے عورتیں روز بروز تعداد میں زیادہ ہو رہی ہیں۔ اگر صورت حال یہی رہی تو بوڑھی عورتیں ان امراض میں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں۔

مشہور محقق ... نے معلوم کیا ہے کہ سینے کی ہڈیوں میں ربر کی طرح گھٹنے بڑھنے کا جو مادہ قدرت نے ودیعت کیا ہے یا پسلی کی کڑی اور مضبوط ہڈیوں کا سانس لیتے وقت اتار چڑھاو عورتوں میں خصوصیت سے زیادہ عرصے تک صحیح اور قایم رہتا ہے۔ اسی طرح یہی فاضل اور حقیقت آشنا ڈاکٹر بیان کرتا ہے کہ آنکھوں ایک خاص قسم کا مرض جو کبر سنی میں ہوتا ہے جس کو آرکس سینائلز کہتے ہیں یقیناً بوڑھے مردوں میں بوڑھی عورتوں کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ ذیابیطس بھی عام طور پر عورتوں سے زیادہ مردوں کو ہوتا ہے۔ اور یہ مرض مردوں ہی کے حق میں زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے لائڈ جو یز نے انکشاف کیا ہے کہ خرابی خون کے امراض میں بھی زیادہ تر مرد ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ کبر سنی سے دماغ کے باریک اور نازک پردوں میں نقایص پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا شکار بھی مرد ہی ہوتے ہیں۔

غرضکہ یہ تمام اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ نہ صرف دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مد مقابل ہے۔ بلکہ وہ مردوں کی بہ نسبت لمبی عمریں بھی پاتی ہیں۔

جمیلہ بیگم (کلکتہ)

دنیاے ساز

نغموں کا لطف مطرب کامل سے پوچھیے
پھولوں کے زمزموں کو عنادل سے پوچھیے
موجوں کا شور دامن ساحل سے پوچھیے
بانگ جرس کا جادہ منزل سے پوچھیے
ان کے علاوہ وسعت دنیاے ساز میں
جو چیز رہ گئی ہو مرے دل سے پوچھیے

بیٹے کی موت پر

(ایک جاپانی شاعر کا تخیل)

وہ تیتریوں سے کھیلتا ہوا بہت دور نکل گیا

نقاد

غزل

بے ستاروں کی انجمن کیا ہے
گل نہو جس میں وہ چمن کیا ہے

جس میں تو ہو نہو خیال تیرا
وہ سفر کیا ہے وہ وطن کیا ہے

ہار بیٹھے جو عزم مردانہ
وہ محبت میں کوہکن کیا ہے

جس کو دیکھو وہ تیری یاد میں گم
صرف بلبل ہی نغمہ زن کیا ہے

سننے والوں پہ جو اثر نہ کرے
وہ سخن میں بھلا سخن کیا ہے

جان دے کر تجھے بتائیں گے
یہ جبیں پر تری شکن کیا ہے

ایک اچٹتی نگاہ کیا جانے
چاند کیا شے ہے اور کرن کیا ہے

کیا بتاؤں میں تجھکو صبح بہار
یہ مرا چاک پیرہن کیا ہے

میں نے دیکھی ہے روشنی اطہر
مجھ سے پوچھو یہ انجمن کیا ہے

اے۔ ایچ۔ اطہر لکھنوی اوجین

غزل

عشق نے ایسے بدل دی مرے گھر کی صورت
کسی صورت نظر آتی نہیں گھر کی صورت

ہم سے دیکھی نہ گئی تیر نظر کی صورت
دیکھیے کیوں نہ رہیں زخم جگر کی صورت

خرمن عشق سے رہ رہ کے دھواں اٹھتا ہے
حسن حجر کا تھا فقط رقص شرر کی صورت

لذت عشرت نظارہ ہے سامان حیات
لے چکی ہے رگ جاں تار نظر کی صورت

حسن اعمال کی رندوں سے توقع ہے فضول
یاد عصیاں بھی نہیں زاد سفر کی صورت

قصہ طور کو دہرا نہ سکی برق نگاہ
دیکھ لی جب مرے انداز نظر کی صورت

حسن فطرت سے نمایاں ہے مذاق تقلید
پھول کھلتے ہیں مرے زخم جگر کی صورت

بن گیا تار نفس رشتہ دام آلام
نور اب غم سے نہیں کوئی مفر کی صورت

سید نور محمد نور اکیلوی

ہندی تمدن

ہندی کی بزم تمدن پہ مسلط ہے جمود
جادوے خواب ہے اسکے لیے ہر بانگ رحیل

مر گئی موت سے پہلے ہی جوانی گویا
آج تک پیر کہن سال ہے کنبے کا کفیل

تشنہ خون جگر ہے ابھی ہر نفس شباب
رہتی ہے یک دو نفس گرمیٔ افکار جمیل

حلقہ فکر میں تدبیر کی جرأت نایید
توڑ دیتی ہے ارادوں کی قدامت کی فصیل

یوں جوانی میں سکتی ہے تخیل کی کرن
جھلملاتی ہو شب تار میں جیسے قندیل

مطلع زیست پہ جب تک نہ ہو عورت کی نمود
سخت مشکل ہے طلسمات تمدن کی کشود

فضل حسین کیفی اسرائیلی

ہندستانی ادب معاصروں کی نظر میں

صبح دکن

۲۴ شہریور ۱۳۵۱ف

غلام محمد خاں صاحب ام۔ اے عثمانیہ کی ادارت میں ماہ جون سے شایع ہونا شروع ہوا ہے جس کی دو اشاعتیں ہمارے پیش نظر ہیں پہلی اشاعت میں فاضل مدیر نے رسالے کے مقاصد سے بحث کرتے ہوے ایک جگہ لکھا ہے۔

اس رسالے کے جاری کرنیکا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ مشترکہ زبان کی خدمت کی جاے۔

ہم معاصر موصوف کی اس کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں، بلاشبہ مشترکہ زبان کی خدمت ہی ملک و قوم کی حقیقی خدمت کہلائی جا سکتی ہے خصوصاً اس دور میں جب کہ زبان کے مسئلے نے نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر لی ہے ملک کے قابل اور اہل الرائے حضرات کا اس طرف متوجہ ہونا زبان کے لیے — اور اس واسطے سے — ملک کے لیے فال نیک ہے۔

پہلے پرچے میں محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب۔ عبدالستار صاحب صدیقی اور سید سلیمان ندوی جیسے مشاہیر ادب کے بیانات شامل ہیں مضمون نگاروں میں عبدالقادر صاحب سروری عبدالمجید صاحب صدیقی، سید بادشاہ حسین صاحب عمر یافعی صاحب عبدالرحمٰن خاں صاحب وغیرہ جیسے پختہ کار ادیبوں کے نام نظر آتے ہیں شعرا میں علی اختر علی منظور سکندر علی وجد صاحبزادہ میکش تابش دہلوی ماہر القادری وغیرہم کے نتایج افکار سے رسالے کو زینت دی گئی۔

رسالے کی ترتیب جاذب نظر ہے اگر فاضل مدیر آیندہ ان تصاویر کو نکال دیں جو بعض مضامین کے ساتھ شایع ہوئی ہیں اور جن سے ایک طفلانہ ذوق ظاہر ہوتا ہے تو ترتیب میں اور زیادہ سنجیدگی ظاہر ہو جاے!

پہلے نمبر میں، سید بادشاہ حسین صاحب کا مضمون "ڈرامے میں عمل کی اہمیت" خاص اہمیت رکھتا ہے، ماہر القادری کی "مسکراہٹیں" دلچسپ ضرور ہیں، لیکن انھیں ہندستانی ادب میں ہونے کی بجاے "مست قلندر" میں ہونا چاہیے تھا یا اگر دکن پنچ زندہ ہوتا تو اس کے صفحات اس کے لیے زیادہ موضوں ہوتے، اشفاق حسین صاحب کا افسانہ "پگلی" نہایت عمدہ ہے اور بڑی حد تک جدید معیار افسانہ نگاری کا ساتھ دیتا ہے نظموں میں علی اختر، وجد، اور میکش کی نظمیں بہت خوب ہیں اور ان حضرات سے بہت خوب نظموں ہی کی توقع ہو سکتی ہے۔

دوسرے نمبر میں اردو کے ظریف شاعر" نہایت دلچسپ اور مفید مضمون ہے عبدالقادر صاحب سروری نے یہ سلسلہ شروع کر کے اردو ادب پر ایک قسم کا احسان کیا ہے کاش وہ اس سلسلہ کو اور وسعت دے سکیں! ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب حسینی کا مضمون، فارسی زبان کا اثر دکن میں، ایک ٹھوس مقالہ ہے اس قسم کے مقالوں کی ہماری زبان کو بہت ضرورت ہے۔

رسالہ مجموعی حیثیت سے نہایت دلچسپ ہے اور ہم اپنے قارئین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کے خریدار بنیں اور اس کے علاوہ "قلمے و نسخے" بھی اس کی مدد کریں

چندہ سالانہ چار روپیہ ملنے کا پتہ۔ دفتر ہندستانی ادب: چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن۔

قواعد

۱۔ یہ رسالہ ہر فصلی مہینے کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

۲۔ حجم کم سے کم ۶۴ صفحے ہو گا۔

۳۔ دل آزار مباحث کے سوائے ہر موضوع پر مضامین قبول کیے جائیں گے۔

۴۔ بے لاگ تنقید اور تبصرے کے لیے اس رسالے کے صفحے ہر وقت کھلے رہیں گے۔

۵۔ مستقل خریداروں کو وقت پر رسالہ نہ پہنچے تو اطلاع دینے پر رسالہ بھیجدیا جائے گا۔

۶۔ مضامین کی واپسی اور جواب طلب امور کے لیے ٹپے کے ٹکٹ لازماً بھیجے جائیں۔

۷۔ اشتہار صاف ہوں ورنہ دفتر کسی قسم کی غلطی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

۸۔ جب تک اشتہاروں کی اجرت پہلے وصول نہ ہو اشتہار نہ چھاپے جائیں گے۔

۹۔ مضامین وغیرہ صرف ایک ہی رخ پر خوشخط لکھے جائیں۔

۱۰۔ اگر رسالے کی خریداری منظور ہو تو ایک سال کا چندہ پہلے ہی بھیجدیا جائے۔

عہد آفریں برقی پریس میں چھپا

لی ئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ پومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

جامعہ [illegible]

۱۔ ارکین جامعہ [illegible] کتابیں ایک [illegible] کے لیے [illegible] رکھ سکیں گے

۲۔ اساتذہ جامعہ [illegible] کتابیں [illegible] اور [illegible] سے

۳۔ طلبا [illegible] دو کتابیں [illegible] ایم اے ال ال بی [illegible] اپنے پاس رکھ سکیں گے

طلبا [illegible] کتابیں [illegible] رکھ سکیں گے

۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ کی جائیں [illegible] جرمانہ [illegible]

۵۔ کتب خانہ میں کتاب [illegible] کا لانا لازم ہے

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو [illegible]

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان سیاہی یا پنسل سے [illegible]

۸۔ قلمی نسخے [illegible] کی کتابیں جاری نہ کی جا سکیں گی فقط